بسم خداوند جان آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۷ | جنوری ۱۹۳۷ء | جلد ۴۳

فہرست مضامین

قیمت ۸ فی پرچہ ۵ روپے ۲ر

ارزاں ایڈیشن (بادامی سرورق کمرا کاغذ) عہ سالانہ

کتب خانہ

میں حسب ذیل اردو کتابوں کی ضرورت ہو تو ہم سے طلب فرمائیے۔ ادبی کتابوں کا اتنا عمدہ اور بڑا ذخیرہ ہندوستان بھر میں کہیں یکجا نہیں کیا گیا۔ قدردانوں کی توجہ سے ذخیرہ کو اور ترقی ہوگی۔

تاریخ ادب

- تاریخ زبان اردو عہ
- تاریخ ادب اردو لعہ
- تاریخ نظم و نثر اردو عا
- تاریخ نثر اردو حصہ اول عہ
- دکن میں اردو عا
- اردو کے اسالیب بیان عہ
- شعر العجم ۵ حصے لعہ
- سیر المصنفین ۲ جلد عہ
- مرحوم دہلی کالج عہ
- خطبات گارسن دتاسی عہ
- سخندان فارس عہ
- شعر الہند ۲ حصے عہ
- تاریخ ادبیات ایران للعہ
- عربی ادب کی تاریخ عہ
- مباحثہ حکمت و شعر عہ
- ہماری شاعری عا
- جدید اردو شاعری عہ
- نقد الادب عا
- روح تنقید ۱۲
- مراۃ الشعر سے
- مثنویات ۱۲
- دو میرزا ۱۲
- شرح دیوان غالب طباطبائی عا
- ” ” حسرت موہانی عہ
- ” ” نظامی بدایونی عہ
- ” ” آسی سے
- ” ” بیخود دہلوی عہ
- ” ” تنہا عہ
- غالب اور انکی شاعری ۲
- محاسن کلام غالب عہ

ادب و شاعری

- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- موازنہ انیس و دبیر عہ
- نیرنگ خیال ۲ حصے عہ
- ہماری شاعری عہ
- اقبال عہ
- بزم خیال عہ
- حسن خیال عہ
- مشاہدہ سخن ۲ حصے سے
- مقدمہ ادب اردو ۱۲

شعرا و مصنفین

- حیات انیس عا
- یادگار انیس عا
- حیات دبیر ۲ جلد للعہ
- یادگار نسیم عا
- یادگار غالب سے
- بہادر شاہ ظفر عہ
- طرہ امیر عہ
- تذکرہ رند ۴
- حیات حالی ۲
- حیات داغ ۷
- حیات النذیر سے
- سوانح مولانا روم عا
- حیات سعدی عہ
- خیام عہ
- حیات حافظ عہ
- حیات جامی ۸
- حیات خسرو عہ
- تذکرہ حزیں ۴
- البیرونی عا
- ضیاء الدین برنی ۸

تذکرے

- آب حیات سے
- ارباب نثر اردو عا
- تذکرہ آب بقا عا
- تذکرۃ الخواتین عہ
- تذکرہ خندہ گل للعہ
- تذکرہ کاملان رامپور سے
- تذکرہ مشاہیر کاکوری سے
- خمخانہ جاوید جلد سوم سے
- ” ” جلد چہارم عہ
- سخن شعرا عہ
- گل رعنا عہ
- نگارستان فارس سے
- ہندو شعرا عہ
- (بزبان فارسی)
- تذکرہ اردو میر حسن عا
- نکات الشعرا (میر تقی) عا
- چمنستان شعرا (شفیق) عہ
- گلشن بیخار (شیفتہ) ۱۲
- مخزن نکات (قائم) عہ
- محز…
- تذکرہ گردیزی عہ
- تذکرہ ہندی مصحفی عا
- ریاض الفصحا ” عا
- تذکرہ گلزار ابراہیم عہ
- مجموعہ نغز (قاسم) سے

خطوط

- اردوئے معلے عا
- عود ہندی ۸
- ادبی خطوط غالب عا
- مکاتیب امیر عہ
- خطوط سرسید سے
- مکاتیب محسن الملک عہ
- مجموعہ مکتوبات آزاد عہ
- مکتوبات … ۲ حصے سے
- مکاتیب شبلی ۲ جلد عہ
- خطوط اکبر عہ
- اتالیق خطوط نویسی عہ
- مرقع ادب ۲ جلد سے
- عورتوں کی انشا عہ
- مکاتیب اکبر عہ

الناظر بک ایجنسی۔

بنام خداوند جان آفرین

نمبر ۱ جلد ۲۳ جنوری ۱۹۳۲ء

خلیفہ معتصم باللہ

(از مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

تجزیہ :۔ فوج نے معتصم کو خلیفہ تسلیم کرنے سے اس وقت تک انکار کیا جب تک کہ عباس بن مامون نے اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرلی — طوانہ تباہ کیا گیا — قیصر تھیوفلوس (عربی: توفیل) سے صلح — خرمیہ کے خلاف جنگ — بازنطینی سپہ سالار مینوئل عربوں کی فوج میں شریک ہوا — آذربائیجان میں بابک کے خلاف جنگ — افشین نے بابک کو البذ کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا — البذ کا محاصرہ اور اس کی فتح — بابک کی گرفتاری اور سامرہ میں اس کا مصلوب ہونا — معتصم کی مذہبی سختیاں — معتصم کا غیر سپاہیوں اور مملوکوں کو ترجیح دینا — دارالخلافہ میں بے چینی — تعمیر سامرا — عربوں کی تلون المزاجی — زیرین علاقہ فرات میں زط کا آباد ہونا — اس قوم کی ابتدا — عُجیف بن عنبسہ کی ان کے خلاف جنگ — زط کا ایشیاے کوچک کی طرف نقل مکان — خراسان میں ایک علوی کا خروج — خلیفہ کے حکم سے اس کی گرفتاری اور انجام — قیصر توفیل نے دوبارہ جنگ شروع کی — دریاے فرات کی طرف ایک تباہی خیز مہم — معتصم نے عجیف کو زبطرہ کی طرف روانہ کیا — اس کے بعد خلیفہ خود ایشیاے کوچک گیا — معتصم کے سپہ سالار افشین نے دزمون کے قریب توفیل کو شکست دی — معتصم عموریہ پہونچا — اس شہر کا محاصرہ — اس کی

سلہ ترجمہ از جرمن

فتح اور بربادی — قیصر توفیل نے صلح کی درخواست کی — معتصم نے قیدیوں کا تبادلہ نہیں کیا — معتصم اور اُس کی اجنبی فوج کے خلاف سازش — عباس بن مامون نے خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی — معتصم نے یہ سازش فرو کی — عباس اور اُس کے ہمدردوں کی موت — افشین اور عبداللہ بن طاہر — طبرستان کے اسپہبد کی بغاوت — اس رئیس کے خلاف جنگ — اُس کی فوج اور سپہ سالاروں کی غداری — اسپہبد کے بھائی نے اُسے معتصم کے سپرد کر دیا — اُسے موت کی سزا دی گئی — آذربائی جان میں شورش — معتصم کے عہد کا عدالتی انتظام — احمد بن ابی داؤد کا اثر — افشین اور ابودُلف — معتصم کا تشدد — اُس کے وزرا اور علوم و فنون پر اُس کا اثر — الکندی فلسفی — معتصم کی وفات ۔

مامون کی وفات کے بعد، اُس کی وصیت اور انتظام کے مطابق، اُس کے بھائی ابو اسحاق محمد المعتصم کے ہاتھ پر بیعت کی جانی چاہیے تھی[۱] لیکن فوج نے جو ایشیائے کوچک کی مہم میں مامون کے ساتھ تھی، اس پر اعتراض کیا، اور عباس بن مامون کو خلیفہ بنانا چاہا۔ عباس سنہ ۲۱۳ھ سے شمالی شام اور عراق عرب کا حاکم تھا، اور بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ اُسے اُس کے باپ نے مقرر کیا تھا کہ وہ طوانہ کو آباد اور قلعبند کرنے کی نگرانی کرے[۲]۔ لیکن اب معتصم نے اُسے بسرعت تمام واپس آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ عباس اپنے چچا کے پاس آ گیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد فوج کو کوئی اعتراض نہ رہا، اور معتصم کی خلافت تسلیم کر لی گئی۔ معتصم کو یہ نامناسب معلوم ہوا کہ فوج کو دوبارہ عباس کے سپرد کیا جائے۔ اُس نے طوانہ کے قلعوں کو مسمار کرایا، اور عباس کو ساتھ لے کر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ ماہ رمضان کے شروع میں یہ دونوں دارالخلافہ پہونچے[۳]۔ اس کے بعد قیصر توفیل نے صلح یا کم از کم عارضی صلح کی درخواست کی؛ اور ریچنے نخوی[۴] کو نہایت

---

[۱] خلیفہ ہارون الرشید نے مامون کے بعد اُس کے ایک اور بھائی مؤتمن کو جانشین مقرر کیا تھا۔ تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ مامون نے اُسے کیوں برطرف کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن اثیر کے خیال کے مطابق، وہ امین سے مل گیا تھا۔ اور امین کے قتل کے بعد اسی جرم میں اُسے ولی عہدی سے الگ کیا گیا۔ ابن جوزی (مرآۃ الزمان) کے مطابق مامون کا ایک اور بھائی ابواحمد ولی عہد مقرر کیا گیا تھا، مگر اُس نے سنہ ۲۰۲ھ میں انتقال کیا۔ [۲] ابن اثیر مطبوعہ مصر۔ ج ۶ ۔ ص ۱۶۲ ۔ (مترجم)

[۳] ابن جوزی (مرآۃ الزمان) ورق ۱۰۸ + ابن اثیر۔ ج ۶ ۔ ص ۱۶۱ + طبری مطبوعہ یورپ ج ۲ ۔ ص ۱۱۶۴ +

[۴] مینوئل کے فرار اور ریچنے نخوی کی سفارت کے درمیان کا زمانہ، جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، بازنطینی سلطنت میں کچھ ایسا گذرا کہ حکومت کوئی خاص حکمت عملی اختیار نہ کر سکی، وہ وہاں برابر اختلاف برپا رہا۔ عرب مورخوں کی مدد سے ان حالات کا پتہ لگ سکتا تھا؛ مگر ان مورخوں نے اپنی عادت کے مطابق نہ تو ریچنے نخوی کی سفارت اور نہ ان خدمات کا ذکر کیا ہے جو مینوئل نے انجام دی تھیں، بہرکیف یہ تو معلوم ہے کہ مامون نے اگست سنہ ۸۳۳ء میں اُس وقت انتقال کیا، جبکہ وہ جنگ کو دوبارہ جاری کرنے اور طوانہ کو ایک عربی قلعے کی صورت میں

بیش قیمت تحائف دے کر بغداد بھیجا۔ اس سفارت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قیدیوں کے تبادلے کا انتظام کیا جائے، اور بازنطینی سپہ سالار مینوئل کو، جو قیصر سے ناراض ہو کر عربوں سے مل گیا تھا، دوبارہ قسطنطنیہ لایا جائے۔

مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ دوسرے اسباب بھی تھے، جن کی بنا پر معتصم بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگ ختم کرنا چاہتا تھا۔ مامون کے مذہبی خیالات[۵۱]، جن کی اُس نے اشاعت بھی کی تھی، ایک عام بے چینی پیدا کر دی تھی، جس کے سبب سے وہ خود بھی دارالخلافہ میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ دریائے فرات کے زیریں علاقے میں زُط کی، اور خراسان میں علویوں کی شورشیں برپا تھیں، عراق اور آذربائی جان میں بابک کے پیرو خُرمیہ کی بغاوت اب تک جاری تھی۔ سنہ ۲۱۸ھ میں مامون نے بغداد کے حاکم اسحاق بن ابراہیم کو، جو طاہر بن حسین کا چچازاد بھائی تھا، ایک زبردست فوج دے کر خُرمیہ کے خلاف روانہ کیا تھا۔ اس فوج نے غالباً مینوئل اور یونانی طریقِ جنگ کی مدد سے، ہمدان کی خطرناک بغاوت کا خاتمہ کیا تھا۔ اس لڑائی میں ساٹھ ہزار آدمی کام آئے تھے۔ بقیۃ السیف باغی کچھ تو بھاگ گئے، اور بعض نے بازنطینی علاقے میں پناہ لی[۵۲]۔ اسی فتح کے بعد معتصم اس قابل ہوا تھا کہ آذربائی جان میں خود بابک کے خلاف، جو سولہ برس سے وہاں کا تقریباً خود مختار مالک بنا بیٹھا تھا، جنگ کی تیاری کرے۔

سنہ ۲۱۹ھ میں[۵۳] معتصم نے پہلے ابو سعید محمد بن یوسف کو اردبیل بھیجا تا کہ اس شہر اور زنجان کے درمیان جو قلعے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) تبدیل کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ معتصم نے اُس کی موت کے بعد فوجوں کو فوراً ایشیائے کوچک سے ہٹا کر بغداد کا راستہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ عرب مورخوں کی تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسی سال خُرّمیہ نے عربوں سے شکست کھائی تھی۔

ابن جوزی ورق ۱۲۸ + ابن اثیر (مطبوعہ مصر ۶۔ ص ۱۶۴ + ابن خلدون (؟) طبری۔ مطبوعہ یورپ ج ۳۔ ص ۱۱۶۵ +

بازنطینی ماخذوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مینوئل کی فوجی قابلیت اور ان یونانیوں کی مدد سے، جو اُس وقت اُس کے ساتھ تھے، یہ عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔ مزید براں اُس زمانے کے بطریقوں کی فہرست دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یحییٰ نحوی ۸۳۳ء میں، بغداد سے واپس جانے کے بعد بطریق بنایا گیا تھا۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے اس میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ بغداد کو یحییٰ نحوی کی سفارت جہاں معتصم پہلے ہی ۲۰ ستمبر ۸۳۳ء کو پہونچ چکا تھا، یقیناً اسی سال کے آخری مہینوں میں آئی ہوگی، اور مینوئل خرمیہ کی شکست کے تھوڑے ہی عرصہ بعد قسطنطنیہ واپس چلا گیا ہوگا۔ بعض تحریروں کے مطابق یہ فتح یحییٰ کے دمشق آنے سے پہلے اور بعض کے نزدیک اس کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ سیمون مجسٹر، صفحہ بکر ص ۶۳۲۔ بھی اس سے متفق ہے کہ یہ واقعہ قیصر تونیل کے پانچویں سنہ جلوس میں پیش آیا تھا۔ تونیل ۸۲۹ء میں قیصر بنایا گیا تھا۔

[۵۱] ابن اثیر (مطبوعہ مصر ج ۶۔ ص ۱۶۲) نے اسے معتصم کے زمانے کا واقعہ بتایا ہے۔ مترجم۔

[۵۲] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) کے مطابق یہ واقعہ سنہ ۲۲۰ھ میں پیش آیا۔ مترجم۔

ان پر دوبارہ قبضہ کرلے، کیونکہ اس وقت ان سب پر بابک قابض تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان دونوں مرکزوں کے درمیان قلعوں میں فوج مقرر کرکے سلسلۂ رسل ورسائل قائم رکھا جائے[۵۱]۔ اس کے علاوہ محمد بن لاشعث[۵۲] کو بھی آذربائجان بھیجا گیا۔ محمدؐ نے اپنا فرض اس طرح ادا کیا کہ عصمہ نام ایک دہقان کو بدعہدی سے گرفتار کرکے بغداد بھیج دیا۔ عصمہ زمیندار تھا، بابک سے ملا ہوا تھا، اور اُس کی فوج کا ایک سپہ سالار بھی تھا۔ معتصم نے بابک کے خلاف تمام فوجی مہموں میں عصمہ کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کیا۔ اب اُس کی مدد سے بابک جیسے خطرناک باغی سے لڑنا بہت آسان ہوگیا۔ اس کے بعد بہت جلد یعنی ۲۲۰ھ میں خلیفہ نے حیدر بن کاؤس کو جبال کا حاکم مقرر کیا، اور بابک کے خلاف جو فوج لڑ رہی تھی اُس کا افسرِ اعلیٰ بنایا۔ حیدر بن کاؤس عام طور پر افشین کے نام سے مشہور ہے، اور اس سے قبل وہ مامون کے عہد میں مصر کی ایک بغاوت فرو کرچکا تھا[۵۳]۔ افشین کی کوشش یہ تھی کہ بابک کے جاسوسوں کو رشوتیں دے کر جہاں تک ہوسکے اُسے کمزور کردیا جائے۔ بہت جلد افشین کو اس کا موقع بھی مل گیا۔ تفصیل یہ ہے کہ معتصم نے ترک سپہ سالار بُغا کو فوج کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کے لیے بہت سامان دے کر افشین کے پاس بھیجا۔ بابک کے جاسوسوں نے اس کی اطلاع بابک کو کردی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ بُغا کا مال لوٹ لیا جائے مگر ایک جاسوس نے، جو افشین سے ملا ہوا تھا، بابک کے قصد کی اطلاع افشین کو کردی۔ وہ فوراً تیار ہوگیا، اور مقررہ دن اچانک بابک کی فوج پر جو بغا کو لوٹنے آئی تھی، حملہ کرکے اُس کے بے شمار آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ بابک کو مجبوراً پھر موقان یا موقان میں پناہ لینی پڑی، جہاں سے وہ بعد میں بھاگ کر اپنے مستحکم قلعہ البذ[۵۴] کو آیا۔ بابک اب درحقیقت دو طرف سے خطروں سے گھر گیا تھا۔ ایک طرف تو افشین البذ سے صرف چھ میل کے فاصلے پر چھاؤنی

---

۵۱ ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۶۴ + ابن خلدون۔ مطبوعہ بولاق۔ ج ۳۔ ص ۲۵۸ + مترجم۔

۵۲ طبری۔ (ج ۳۔ ص ۱۱۷۱) اور ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) نے اس سپہ سالار کا نام محمدؐ بن لبعیث بتایا ہے۔ مترجم +

۵۳ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) کے مطابق افشین نے برزند کے مقام پر چھاؤنی قائم کی تھی۔ غالبًا یہ مقام برزند ہے، برزند ادریسی کی تحریر کے مطابق، اردبیل کے شمال مغرب میں صرف ۵۴ میل کے فاصلے پر تھا۔ اردبیل اور برزند کے درمیان بہت سے قلعبند مقامات تھے۔ جہاں فوجیں مقیم تھیں۔ (مصنف نے ابن اثیر کے قلمی نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں اس شہر کا نام برزند ہی لکھا ہے۔ مترجم) +

۵۴ ابن اثیر، ابن خلدون (اور طبری) نے اس کا یہی نام لکھا ہے۔ مگر لسٹرینج نے اس میں شبہ ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ اس مقام کا نام بُدس یا بُذ یا کبدس لکھا ہے۔ مقدسی بُذ لکھتا ہے۔ ہر طوت نے بظاہر بَذ یا بُذ پڑھا ہے، کیونکہ وہ بابک کے کشابُذ میں گرفتار ہونے کا ذکر کرتا ہے تو اس میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ اُس کا مطلب قصبہ بذ سے ہے۔ میں اس رائے میں لسٹرینج سے متفق نہیں ہوں کہ کشا بذ سے قصبہ بذ کے سوا کچھ اور بھی مراد ہوسکتی ہے۔ بذ کا جائے وقوع معلوم نہیں۔ لیکن کوچ کے جو تفصیلی حالات معلوم ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر اردبیل کے شمال مغرب میں تقریبًا تین دن کی مسافت پر، ارمینیہ کی سرحد کے قریب، کوہستان طارم کے شمال میں واقع تھا۔ ۵۵ ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۶۹ + ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۵۹ + طبری ج ۳۔ ص ۱۱۹۳ + مترجم۔

ڈالے پڑا تھا؛ اور دوسری طرف بغا، دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ ان پہاڑوں میں گھوم رہا تھا، جو البذ کے گرد واقع تھے۔ بہرکیف، سنہ ۲۲۰ھ کے موسم سرما میں بابک نے ان فوجوں کو نہ صرف شکست دی، بلکہ انھیں مجبور کیا کہ البذ کا محاصرہ اٹھالیں، اور مراغہ میں ٹھہر کر کمک کا انتظار کریں۔ اس کے بعد افشین کا سلسلہ رسل و رسائل اردبیل سے منقطع ہوگیا؛ اور اُسے مراغہ سے رسد کا انتظام کرنا پڑا۔ لیکن اسی سال افشین نے بابک کے ایک سپہ سالار طرخان کو، جو مراغہ کے قریب ایک گاؤں میں موسم سرما بسر کر رہا تھا، غداری سے قتل کرا دیا + چونکہ معتصم نے دو سپہ سالاروں، ایتاخ اور جعفر الخیاط کی سرکردگی میں تازہ دم فوج اُس کی مدد کے لیے بھیج دی تھی، اس لیے سنہ ۲۲۲ھ کے آغاز میں افشین نہایت احتیاط سے آگے بڑھا۔ باغیوں نے خفیف سی مزاحمت کی، اور محصور فوج سے معمولی سی جنگ کے بعد افشین نے اُس پہاڑی تک جس پر البذ واقع تھا تمام کوہستانی دروں پر قبضہ کرلیا[1]۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کی گئی کہ اُس پہاڑ پر، جو البذ پر چھایا ہوا تھا، سپہ سالاروں کے ذریعے سے قبضہ کرلیا جائے۔ جعفر الخیاط نے متعدد مرتبہ کوشش کی کہ حملہ کرکے قلعہ پر قابض ہو جائے، لیکن ہر مرتبہ نقصان اٹھا کر پسپا ہوا۔ ان ناکامیوں کا اثر یہ ہوا کہ سپاہیوں نے شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا، اور مختلف تکالیف و مصائب اور رسد کی کمی کی بھی شکایت کی۔ افشین نے ایسی حالت میں البذ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا؛ اور بابک نے، جس کے آدمی برابر اُس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ افشین چاہتا تھا کہ بابک کو مع اُس کے اہل خاندان اور مال و متاع کے گرفتار کرلے۔ لیکن اُس کی فوج کا ایک حصہ، جیسا کہ دمشق کے محاصرہ میں ہوچکا تھا، غداری سے ایک دوسری طرف سے البذ پر حملہ کر رہا تھا[2]۔ بابک قلعہ سے فرار ہوا؛ اور تھوڑی مدت کے لیے آذربائیجان اور ارمینیہ کے درمیان جنگلوں میں اور اس کے بعد ارمینیہ کے پہاڑوں میں سرگرداں رہا[3]۔ آخر شوال سنہ ۲۲۲ھ (ستمبر ۸۳۷ء) میں وہ اپنے شیر دل خفار کی

[1] ابن اثیر کی تحریر کے مطابق افشین نے پہلے کلان رود میں اور پھر مرد الرود میں چھاؤنی قائم کی تھی۔ ابن خلدون نے مرد الرود کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک دریا کا نام ہے جو مراغہ کے قریب بہتا ہے۔

[2] قدرتی طور پر عرب مورخ اس غداری کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ لکھتے ہیں کہ جب افشین بابک سے خط و کتابت کر رہا تھا اُسے یہ اطلاع ملی کہ فوج کے ایک حصے نے، جو ایک پہاڑی پر البذ کے نیچے خیمہ زن تھی، ایک طرف سے شہر پر حملہ کر دیا ہے، اور قلعہ پر حملہ کی تیاری کر رہی ہے +

[3] اس اثنا میں کہ بابک ایک جنگل میں، جس کا نام ابن اثیر نے غداہ لکھا ہے، آوارہ پھر رہا تھا، معتصم کا معافی نامہ وصول ہوا۔ افشین نے اُسے بابک کے پاس بھیج دیا۔ مگر بابک نے دو قاصدوں میں سے ایک کو قتل کرا دیا، اور اپنے آپ کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے بیٹے کو، جسے عربوں نے گرفتار کرلیا تھا، اور جو اپنے باپ کو ترغیب دے رہا تھا کہ اپنے کو عربوں کے حوالہ کر دے لکھا کہ "اے فاحشہ کے بیٹے! اگر میرا بیٹا ہوتا تو میرے ساتھ رہتا۔ لیکن تو میرا بیٹا ہی نہیں۔ اگر تم صاحب قدر رہو کر ایک دن زندہ رہے تو اس سے بہتر ہے کہ ذلیل غلام کی حیثیت سے چالیس برس تک زندگی بسر کرے۔" ([illegible] ج ۰ ص ۰ ۲ ۔ مترجم) +

آپ کو خلیفہ کی فوج کے حوالے کر دیا، جو برابر اُس کا تعاقب کر رہی تھی[۵۱]۔ معتصم کے حکم کے مطابق بابک سنئے دار الخلافہ سامرہ میں زندہ لایا گیا۔ اُسے ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا گیا، اور پھر ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد اُس کا سر قلم کیا گیا۔ سر خراسان بھیج دیا گیا، اور جثہ سامرہ میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اہل بغداد نے بھی اس قسم کا ایک نظارہ دیکھا۔ کیونکہ بابک کا بھائی عبداللہ وہاں بھیجا گیا تھا۔ اور وہیں اُسے پھانسی دی گئی تھی۔ بابک نے بست سالہ بغاوت کے دوران میں دو لاکھ پچپن ہزار پانچ سو مسلمان قتل کیے؛ اور چھ سپہ سالار یکے بعد دیگرے اُس کے خلاف بھیجے گئے۔ بابک کے ساتھ تین ہزار تین سو نو باغی گرفتار ہوئے اور سات ہزار چھ سو عورتیں اور بچے، جو اُس کی قید میں تھے آزاد کیے گئے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے اس میں تعجب کی گنجائش نہیں رہتی کہ کیوں افشین کی، جس نے اس خطرناک بغاوت کا خاتمہ کیا، اس قدر عزت افزائی کی گئی۔ خود خلیفہ معتصم اور اُس کے بیٹوں، اور خصوصاً اُس بیٹے نے جو بعد میں واثق کے لقب سے خلیفہ ہوا، ہر طرح کے تحائف سے سرفراز فرمایا۔ سامرہ کے راستے میں جہاں کہیں افشین کا قیام ہوتا تھا، خلیفہ کا ہرکارہ اُسے ملتا، اور خلیفہ کی طرف سے ایک خلعت اور ایک گھوڑا تحفہ میں دیتا۔ واثق نے بھی راستے میں اُسے تحائف دیے۔ چنانچہ اُس نے ایک تاج اور دو کمربندوں کے علاوہ بیس لاکھ درہم خود افشین کے لیے اور ایک کروڑ درہم اُس کی فوج کے لیے بھیجے[۵۲]۔

اس کے بعد وہ بے چینی شروع ہوئی جس کے فرو کرنے میں معتصم کو بہت سا وقت صرف کرنا پڑا، اور تمام فوجی قوت خرچ کرنی پڑی۔ لیکن چونکہ ان معاملات کے متعلق ہماری معلومات بہت سطحی ہیں اس لیے ہم انھیں تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے۔ اکثر مرتبہ بغداد کے دیندار لوگوں نے اُس مذہبی ظلم و ستم کے خلاف، جو معتصم نے اپنے بھائی مامون کی وفات کے بعد جاری کر رکھا تھا، بدامنی پیدا کی۔ یہ مذہبی تعدی اور تعذیب اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حضرت امام احمد بن حنبل جیسے پارسا اور برگزیدہ بزرگ بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ امام صاحب نے خلق قرآن کے مسئلے کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اس کی سزا میں انھیں تازیانے لگوائے گئے تھے[۵۳]۔

بے چینی کا ایک دوسرا سبب وہ بے شمار غلام تھے، جنھیں خلیفہ نے ترکستان اور ماوراء النہر سے خریدا تھا، اور ان سے اپنی محافظ فوج مرتب کی تھی۔ ان اجنبی غلاموں کی وجہ سے عربوں کی عزت و توقیر میں کمی آ گئی تھی؛ حالانکہ عربوں کو

[۵۱] جس غدار نے بابک کو اپنے قلعہ میں پناہ لینے کی ترغیب دلائی تھی، اور پھر اُسے عربوں کے حوالہ کر دیا تھا، اُس کا نام سہل بن سنباط تھا، یا سینٹ مارٹن کی تاریخ کے مطابق سہل بن سمبد تھا۔ اسی طرح بابک کے بھائی عبداللہ کو بیلقان کے رئیس عیسیٰ بن یونس بن اصطفانوس نے اپنے ہاں عوت دی، اور پھر غداری سے اُسے افشین کے حوالے کر دیا (ابن اثیر ج ۶ - ص ۱۶۲، ۱۷۵ + مترجم)

[۵۲] ابن خلدون ج ۳ - ص ۲۶۱ + ابن اثیر ج ۶ ص ۱۷۵ + مترجم۔

[۵۳] ابن اثیر - ج ۶ - ص ۱۹۳ - مترجم +

علم وفضل کے لحاظ سے ان غلاموں پر ہر طرح کی ترجیح حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اہل بغداد ان سپاہیوں سے
جن کا رسوخ اور اثر بڑھتا جا رہا تھا، ناراض تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر آخر معتصم نے فیصلہ کیا کہ پرانے بدامن
اور بے چین دار الخلافہ کو خیر باد کہے، اور نیا دار الخلافہ تعمیر کرے۔ نیا دار الخلافہ بغداد کے شمال میں تین منزل کے
فاصلے پر بنایا گیا۔ سُرَّ مَن رَأی اس کا نام رکھا گیا۔ یہی نام آخر میں سامرہ یا سامَرہ بن گیا۔[1] معتصم، اپنے پیشرو خلفا کی

---

[1] ابن خلدون۔ (ج ۳۔ ص ۲۵۰) نے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "معتصم نے مصر و مغرب کے سپاہیوں کی ایک
بڑی تعداد جمع کی جو مغاربہ کہلاتے تھے۔ اس کے بعد اُس نے سمرقند، اشروسنہ اور فرغانہ سے ایک فوج مرتب کی جو الفراغنہ کے نام سے
مشہور ہے۔ ان نوجوان سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور وہ اپنے گھوڑے شہر کی سڑکوں پر اس تیزی سے بھگاتے تھے کہ بہت سی
عورتیں اور بچے ان کے پیروں میں روندے جاتے۔ اس کے بدلے میں اگر کبھی کوئی سپاہی اکیلا مل جاتا تو اہل شہر اُسے قتل کر دیتے۔
شہر میں ان واقعات کی وجہ سے بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، اور بعض مرتبہ لوگ علانیہ طور پر معتصم کو برا بھلا کہہ دیتے۔ ان وجوہ کی بنا پر آخر
معتصم نے القاطول کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ شہر اس سے قبل ہارون الرشید نے بسانا شروع کیا تھا۔ لیکن تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی،
اور شہر دوبارہ ویران ہو گیا تھا۔ معتصم نے ۲۲۰ھ میں اسے پھر بسانے کا ارادہ کیا، اور اس کا نام سُرَّ مَن رَأی رکھا۔ عوام نے اسے
بگاڑ کر سامرہ کر لیا۔ یہ شہر معتصم اور اُس کے جانشینوں کا دار الخلافہ رہا۔" اسی قسم کے حالات ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۹۹) نے بھی ظاہر
کیے ہیں۔ طبری بھی ایک حد تک اس سے متفق ہے۔ لیکن Cod. Goth. کے بیان کے مطابق ایک زاہد و عابد شخص معتصم
کے پاس آیا، اور اُس سے کہا کہ اے امیر المومنین مجھے خوف ہے کہ عوام تجھے مار ڈالیں گے۔ معتصم نے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے،
جب میرے پاس ایک فوج موجود ہے جو میرے ہر حکم کی تعمیل کے لیے آمادہ ہے۔ زاہد نے کہا وہ تجھے اپنی بد دعاؤں سے مار
ڈالیں گے جو ہر رات مسجدوں سے بلند ہو کر آسمان تک پہنچتی ہیں۔ یہ سن کر معتصم نے تلاش کے بعد سُرَّ مَن رَأی کی جائے وقوع کو پسند
کر کے وہاں بسرعت تمام شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔" مذکورہ بالا اسناد، طبری، ابن اثیر اور دوسرے مورخوں کے مطابق سب سے
پہلے ہارون الرشید نے قاطول پر ایک شہر بسانا شروع کیا تھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں بعد میں معتصم نے سُرَّ مَن رَأی آباد کیا۔
ادریسی (مطبوعہ یورپ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۶) نے غلطی سے لکھ دیا ہے کہ خلیفہ منصور، بانی بغداد نے اس شہر کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے
علاوہ فرانسیسی ترجمہ میں بھی بجائے ابو العباس کے ابن عباس لکھ دیا گیا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس جگہ پہلے سے ایک شہر موجود
تھا، جس کا نام کستلم سمیری (Castellum Sumere) یا بطلیموس اور زوسیموس کے مطابق
سُما (Suma) تھا۔ یہ نام بھی نیا نہیں۔ ممکن ہے کہ بعد میں اسی کو سُرَّ مَن رَأی کر لیا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل بغداد
چڑانے کے لیے اس شہر کو سُرَّ مَن رَأی کہنے لگے ہوں، کیونکہ اس شہر کی تعمیر سے اہل بغداد کو معتصم کی عزیز مگر مفسد فوج سے نجات
مل گئی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نہر قاطول، ابو الفدا کی تحریر کے مطابق، سامرہ سے جنوب کی طرف جرجرایا تک بہتی تھی (دیکھو
رٹر (Ritter) کی کتاب Erkunde ج ۲۔ ص ۲۰۹)۔ طبری لکھتا ہے کہ یہ نہر اسی نام سے شمال کی جانب

حکمت عملی کو ترک کرکے اس اجنبی فوج کو لے کر نئے شہر میں منتقل ہو گیا۔ عام طور پر اس نقل مکان کو ایک فاش غلطی تصور کیا جاتا ہے، اور ان تمام خرابیوں کا جو اس فوج کی وجہ سے خلافت اور خاندان خلافت میں پیدا ہوئیں، معتصم ہی کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عباسیوں نے خراسانیوں کی مدد سے بنی اُمیہ کو خلافت سے برطرف کیا تھا، اور ان کی جگہ لی تھی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر مامون نے ایرانیوں کی مدد سے اپنے بھائی امین کو، جو عربوں کا ہمدرد تھا، شکست دے کر خلافت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ خلافت عباسیہ کے مشہور ترین سپہ سالاروں، والیوں یا مدبروں میں بھی حقیقی عربوں کا نام دکھائی نہیں دیتا۔ خود ترک غلاموں کی خریداری بھی مامون کے عہد میں شروع ہو گئی تھی۔ کیونکہ عربوں کی تلون المزاجی اُسے پسند نہ تھی، اور ایرانیوں پر بھی وہ پورا بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اُس نے ترکی غلام بھرتی کرنے شروع کیے تھے[ل]۔ لیکن معتصم کے زمانے میں ان ترک غلاموں کی طاقت کا پورا اظہار ہوا۔ اُس نے مملوکوں کی جن کی تعداد ستر ہزار تک پہونچ گئی تھی، ایک فوج مرتب کی۔ معتصم غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے صرف اطاعت شعار لوگوں پر بھروسہ کرنا مفید ہوگا، اور عرب اپنے مختلف قبائلی عناد اور قومی جھگڑوں میں ایسے مبتلا تھے کہ ان سے بھلائی کی امید رکھنا بیکار تھا۔ اس زمانے میں کوئی باقاعدہ فوج بھی نہ تھی، اس لیے یہ ضروری تھا کہ ایسی فوج بھی مرتب کی جائے جو بیرونی جنگوں کے لیے وقف ہو، اور اندرونی فسادات کو فوراً فرو کر سکے۔ باقاعدہ فوج نہ ہونے کے نتائج بابک خرمی کی بغاوت میں دیکھے جا چکے تھے۔ عرب اور ایرانی اس وقت تک فوج میں کام کرتے تھے۔ مگر اب ان کی جگہ ان بیرونی مملوکوں نے لے لی۔ بدوؤں نے صدر اسلام کی جنگوں میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ لیکن اب چونکہ مال غنیمت کی کوئی امید نہ رہی تھی اس لیے یا تو وہ اپنے ریگستان کو واپس چلے گئے تھے، اور یا مفتوحہ علاقوں، خصوصاً ان بے شمار نئے شہروں میں اندلس، افریقیہ، مصر اور دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر بسائے گئے تھے، یا بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس کے ساحلوں پر آباد ہو گئے تھے۔ ان مقامات میں مستقل بود و باش اختیار کرنے کے بعد عیاشانہ زندگی کے سبب یہ لوگ بہت کمزور ہو گئے اور رفتہ رفتہ سپاہیانہ مشاغل ترک کرکے علم و فن، تجارت، زراعت اور بالخصوص تجارت اور لین دین کی طرف راغب ہو گئے۔ کیونکہ ان دنوں یہ پیشے انتہائے عروج کو پہونچے ہوئے تھے، اور بہت جلد عربوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷) موصل جاتی تھی۔ یہ مصنف لکھتا ہے کہ سامرہ نہایت قدیم زمانے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک ویران شہر تھا۔ موصل کے علاقہ میں دریائے دجلہ سے نکل کر یہاں ایک بہت بڑی نہر بہتی تھی جسے قاطول کہتے تھے۔ اسی نہر سے موصل کو پانی ملتا تھا۔ گو سامرہ دجلہ کے کنارے واقع تھا، مگر اسے بھی نہر قاطول ہی سے پانی پہونچتا تھا۔

[ل] مامون پہلا خلیفہ تھا جس نے ترکوں کو اپنی خدمت پر مقرر کیا۔ ان میں سے اکثر کو اُس نے ایک لاکھ اور دو لاکھ درہم میں خریدا تھا۔

انھیں بالکل اپنا کر لیا تھا۔ اُس زمانے میں بغداد نہ صرف خلافت کا، بلکہ جیسا کہ عرب مورخوں نے لکھا ہے، تمام دنیا کا مرکز تھا، اور دنیا کی تجارت یہاں مرکوز ہو گئی تھی۔ ہر حکمران کا فرض تھا کہ قافلے کے تمام راستوں کی حفاظت اور امن و امان کا ذمہ دار ہو۔ یہ قافلے ایران کے مختلف صوبوں، مثلاً اندرون فرغانہ، اور بخارا بلکہ چین و تبت کی طرف سے آتے تھے، اور شمال مغرب اور بازنطینی سلطنت کی صنعتوں کے نمونے اپنے ساتھ لاتے تھے۔ پھر دریائے فرات اور دجلہ کی بے شمار نہروں میں سے ہوتے ہوئے موصل اور رقہ پہونچتے تھے۔ جنوب اور خصوصاً عرب کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ کیونکہ حج کے موسم میں حاجی بکثرت عرب جاتے تھے، اور قدرتی طور پر ان کا مقصد حج کرنے کے علاوہ تجارت بھی ہوا کرتا تھا۔ مصر لوبیا اور شمالی افریقہ کے تاجر یا تو شمالی شام کے علاقے میں اُترتے تھے، اور وہاں اپنا مال کشتیوں میں بار کر کے دریائے فرات کے راستے بغداد آتے تھے، یا دریائے نیل سے ہو کر بحیرہ قلزم پہونچتے اور پھر ریگستان کے راستے سے عراق آتے۔ بغداد اور بصرہ میں بھی بحری تجارت کی کمی نہ تھی۔ یہ راستہ خلیج فارس میں ہو کر مکران کے ساحل کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ کے دہانے تک پہونچتا تھا۔ یہاں دَیبُل اور منصورہ جیسے بڑے بڑے شہر موجود تھے، جہاں عربوں کی تجارتی کوٹھیاں اور گدام تھے، جن میں ہندی اور چینی مال ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ یہ نئے اور ایک حد تک پرخطر مشاغل اور صنعت و حرفت کی ترقی ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے عرب فوجی خدمات سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس خدمت میں نہ کچھ فائدہ رہ گیا تھا، اور نہ اس سے عزت و مال میں کسی طرح کا اضافہ ہو سکتا تھا۔

عربوں کے خصائل کی اس پوری کایا پلٹ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو خلفا کو گذشتہ پچاس برس کے عرصہ میں اپنی فوج کو ایسے نئے سپاہی بھرتی کر کے تقویت دینی پڑی، جن میں جنگ و جدال کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو، اور دوسری طرف قدرتی طور پر قدیم فاتحین محض نام کے مالکان ملک رہ گئے۔ درحقیقت وہ اب مفتوح تھے۔ اصل قوت ان غلاموں کے ہاتھ میں تھی جو فوجی لحاظ سے ان فاتحوں سے ارفع و اعلیٰ تھے۔

اب ہمیں معتصم اور توفیل قیصر قسطنطنیہ کی جنگجوئی کے حالات دوبارہ شروع کرنے سے پہلے، زُط اور علویوں کی شورش اور بغاوت کے حالات بیان کر دینے چاہییں۔ زُط دراصل ایک ہندوستانی قوم کا نام ہے۔ یہ لوگ کسی زمانے میں دریائے سندھ کے علاقے میں آزاد گھومتے پھرتے تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان کے ایک گوشہ میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی، اور پھر شمال اور مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا تھا۔ اس قوم زُط کا ایک حصہ ایران کی طرف آیا، اور ایرانیوں سے شکست کھا کر بطور قیدی ملک میں لایا گیا۔ یزدجرد اور مسلمانوں کی جنگوں کے دوران میں ایرانی فوج میں زُط اور ان کے علاوہ دو اور جنگجو ہندی قبیلوں کے نام سُنے ....

جاتے ہیں۔ انھیں اساورہ اور سیابجہ کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ الاشعری شوس کا محاصرہ کر رہے تھے تو یہ

سب قبائل اہواز میں مقیم تھے۔ فتح سوس کے بعد وہ عربوں سے مل گئے، لیکن درحقیقت ان کی زیرِ سیادت نہیں آئے۔ اساورہ، جو بہت جلد دوسرے ایرانی مفرورین میں مل گئے تھے، بصرہ میں بس گئے؛ زُط (جاٹ)، کسکر کے نواح میں، اور بصرہ اور واسط کے درمیان بطیحہ کے دلدلی علاقہ میں رہنے لگے۔[11] مگر اس اجنبی قوم نے مختلف اوقات میں بہت سی لڑائیاں، خصوصاً بازنطینی سلطنت کے خلاف لڑی تھیں؛ اور اسی زمانے سے شام اور عراقِ عرب کے بعض سرحدی قلعوں پر قابض تھی۔ ۲۱۹ھ میں غالباً ایشیائے کوچک سے واپسی کے وقت، یہ لوگ عراق میں سے گذرے، اور طرح طرح کے ظلم و ستم کے مرتکب ہوئے۔ اُنھوں نے قریوں اور شہروں کو تاراج کیا، اور بصرہ سے عرب جانے والے قافلوں اور جہازوں کو بھی لوٹا۔[12] چونکہ ان جنگ جُو لٹیروں کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس لیے معتصم کو ان کے خلاف ایک بڑی فوج بھیجنی پڑی، جس کا سپہ سالار عجیف بن عنبسہ تھا۔ عجیف نے واسط کو فوجی نقل و حرکت کا مرکز بنایا۔ یہ جنگ مہینوں تک جاری رہی۔ ۲۱۹ھ[13] (جنوری ۸۳۴ء) کے آخر یا ۲۲۰ھ کے شروع میں، بہت سی خونریز لڑائیوں کے بعد زُط کے سردار محمد بن عثمان اور سماق مغلوب ہوئے۔ عجیف ان کے تمام خاندانوں کو، جن کی تعداد ستائیس ہزار تھی، کشتیوں میں سوار کرا کے خلیفہ کے پاس بغداد لے گیا۔ معتصم نے انھیں اناز ربہ کی طرف جلا وطن کر دیا، جہاں بہت جلد وہ بازنطینیوں کے ہاتھوں فنا ہو گئے۔

---

[11] یہ سب قومیں بنو تمیم کی موالی بنیں۔ لیکن اس قبیلے سے الگ ہو کر، زُط اور سیابجہ حنظلہ کے، اور اساورہ سعد کے موالی ہو گئے۔ صاحب قاموس نے اساورہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ یہ ایک ایرانی قوم کا نام ہے، جو بصرہ میں بس گئی تھی، اور کوفہ کے اخامرہ کی طرح ان کا نام ان کے جائے قیام کے مطابق اساورہ ہو گیا تھا۔ اس مصنف کا بیان ہے کہ انھیں اساورہ اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ وہ نہایت اچھے نشانہ باز تھے۔ اساورہ کا لفظ "اسور" یا "اسوار" سے مشتق ہے، جس کے یہی معنی ہیں۔ ان کا سردار جس کا نام بلاذری نے سیاہ الاسواری لکھا ہے، یزدجرد کی فوج میں مقدمۃ الجیش کا افسر تھا۔ شاید اسی سردار کے نام پر اس قبیلے کا نام سیابجہ پڑ گیا تھا۔ "زُط" اور "سیابجہ" کے الفاظ مشہور قاموس میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ بلاذری نے ایک اور قوم کا ذکر کیا ہے جس کا وطن مکران اور سیستان کی سرحد پر تھا، اور اندغار کہلاتا تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو، بلاذری۔ مطبوعہ مصر ص ۳۸۰ - ۳۸۲ ۔ مترجم) ۔

[12] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۳) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۵۷) + ابو الفداء اور المکین نے زُط کی لڑائی کا ذکر نہیں کیا۔ بلاذری (مطبوعہ مصر، ص ۳۸۲) نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے مامون کے عہد میں تاخت و تاراج شروع کی تھی۔

[13] ابن خلدون نے یہی سنہ لکھا ہے۔ مگر ابن اثیر نے ۲۲۰ھ بیان کیا ہے + (ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۵۷ اور ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۶۳۔ دونوں نے ۲۱۹ھ ہی لکھا ہے۔ نہ معلوم مصنف نے ۲۲۰ھ کیسے پڑھ لیا۔ مترجم) +

اس زمانے میں ایک علوی نے خلافت کا دعویٰ کیا۔ وہ حضرت امام حسین کی اولاد سے ایک شخص محمدؐ[1] بن قاسم تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے، تقریباً گمنامی کی حالت میں، مدینہ میں رہتا تھا، خراسان کے ایک حاجی نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ امامت کا دعویٰ کرے۔ یہ خراسانی محمدؐ بن قاسم کے ساتھ بہت عزت و احترام سے پیش آیا، اور تمام خراسان سے مدد دلانے کا وعدہ کیا۔ محمدؐ بن قاسم باتوں میں آگیا، اور ان سازشیوں کے ہمراہ جوزجان پہونچا؛ یہاں چند روز تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد جب سازشیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو محمدؐ نے علانیہ طور پر خلافت کا دعوےٰ کیا، یا یوں کہنا چاہیے کہ "الرضا[2] من آل محمد" کے لیے دعوت کا آغاز کیا گیا۔ عبداللہ بن طاہر نے جو اُس وقت خراسان کا حاکم تھا، محمدؐ کے خلاف فوج بھیجی، محمدؐ شکست کھاکر بھاگا، مگر آخرکار گرفتار ہوا۔ عبداللہ نے اُسے خلیفہ کے پاس بھیج دیا، جس نے اُسے قید کردیا۔ مگر غرہ شوال ۲۱۹ھ (۸۳۴ء) کی رات کو وہ قید سے فرار ہوا اور ایسا گیا کہ پھر اس کا پتہ نہ لگا۔

[1] اس کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:۔ محمدؐ بن قاسم بن علی بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ یہ ابن خلدون کا بیان ہے۔ مسعودی (مطبوعہ یورپ ج ۷۔ ص ۱۱۶)۔ ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۵۷) سے متفق ہے۔ مگر ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۲) اور طبری (ج ۲۔ ص ۱۱۶۵) نے یہ نسب نامہ یوں بیان کیا ہے:۔ محمدؐ بن قاسم بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (مترجم) ابن خلدون نے جس طرح یہ واقعہ نقل کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعی روایات سے بہت متاثر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "۲۱۹ھ میں محمدؐ بن قاسم معتصم سے ڈر کر بھاگا، اور زندگی زہد و عبادت میں گذارتا رہا۔ اس کے بعد وہ خراسان آیا؛ پھر طالقان گیا۔ یہاں لوگوں نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ زیدیہ فرقہ کے لوگ اُس سے مل گئے۔ عبداللہ بن طاہر نے اُس پر فوج کشی کی۔ محمدؐ بن قاسم کو شکست ہوئی۔ اور گرفتار ہوکر معتصم کے پاس لایا گیا۔ خلیفہ نے اُس کی موت تک اُسے قید میں رکھا، اور بقول بعض اُسے زہر دے دیا۔ (مصنف نے اس بیان کو ابن خلدون سے منسوب کیا ہے، مگر مطبوعہ تاریخ میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن مسعودی (ج ۷۔ ص ۱۱۶) نے یہ واقعہ اسی طرح لکھا ہے۔ مترجم)۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ محمدؐ بن قاسم قید کردیا گیا تھا۔ لیکن وہ غرۂ شوال کی رات کو قلعہ سے، جہاں وہ قید تھا، بھاگ گیا۔ المکین کا بھی یہی بیان ہے۔ لیکن اس مصنف نے محمدؐ بن قاسم کو ابن علی لکھ دیا ہے۔ یہ امر خلاف قیاس نہیں کہ معتصم نے، جو اس سے قبل بہت سے لوگوں کو قتل کی سزا دے چکا تھا، محمدؐ بن قاسم کو بھی قید میں قتل کرانے کے بعد اس کے بھاگ جانے کی خبر مشہور کرادی ہو۔ (مگر ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۵۰) ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۲) اور طبری (ج ۲۔ ص ۱۱۶۰) سب نے یہی لکھا ہے کہ محمدؐ بن قاسم قید سے بھاگ گیا تھا۔ کسی نے زہر خورانی کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ صرف مسعودی (ج ۷۔ ص ۱۱۶) نے محض ایک روایت نقل کردی ہے۔ یہ روایت بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔ وقد تنوزع فی محمد بن القاسم فمن قائل یقول انہ قتل بالسم۔ مترجم) [2] ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۵۰۔ مترجم۔

خلافت کی ان بدامنیوں سے توفیل، قیصر قسطنطنیہ، نے فائدہ اُٹھایا، اور چاہا کہ مامون کے عہد کی شکستوں کا بدلہ لے۔ چنانچہ عین اُس وقت جب معتصم کی بہترین فوجیں اور سپہ سالار آذربائی جان میں بابک کے خلاف لڑ رہے تھے، قیصر نے بلا کسی ہٹانے کے، محض بابک کی فرمائش پر، دریائے فرات کے اسلامی علاقوں پر حملہ کیا، اور زبطرہ اور سمیاط کو فتح کر کے اس علاقہ کو اس طرح لوٹا کہ ملطیہ سے شام اور عراق عرب کی سرحد تک کا سب علاقہ تہ و بالا ہو گیا۔ جو مال غنیمت قیصر نہ لے جا سکا اُسے برباد کر ڈالا۔ فوجی خدمت کے لائق جو مسلمان اُس کے ہاتھ لگے انھیں قتل کرایا، اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ مگر ان تمام بے رحمیوں کو توفیل اور اُس کے یونانیوں سے منسوب نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قتل و غارت میں اس نواح کے عیسائی باشندے بھی ایرانیوں اور دوسرے باغیوں کی دست برد، اور ظلم و ستم سے محفوظ نہ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہی ایرانی اور باغی، ہمدان کے قرب و جوار میں خلافت کی فوجوں سے شکست کھانے کے بعد یونانی علاقے میں پناہ گزیں ہوئے تھے، اور اس وقت توفیل کی فوج کا ایک حصہ انھیں پر مشتمل تھا۔ چونکہ معتصم کی بہترین فوجیں آذربائی جان میں برسر پیکار تھیں اس لئے ناممکن تھا کہ وہ اُس وقت توفیل کے

سلہ بازنطینی مورخوں، ابن اثیر، ابن خلدون، (اور طبری) میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ ملطیہ کے مسلمان حاکم نے اس سے قبل یونانی علاقہ پر حملہ کیا تھا۔ حالانکہ اس یونانی مہم کے متعلق انھیں عرب مورخوں کے لکھے ہوئے حالات سب سے زیادہ مستند ہیں۔ معتصم کے لئے اُس زمانے میں (۸۳۵ء) جبکہ وہ ہر طرح صلح و آشتی کا آرزو مند تھا، قیصر کے خلاف فوج کشی شروع کرنا ناممکن تھا۔ بار ہربوس (Bar Herbaus) نے اپنی کتاب تاریخ شام (Chron. Syr) (ص ۱۵۰) میں اس مہم کا حال لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ توفیل بھی اسوقت میدان جنگ میں موجود تھا۔ مگر اُس کا بیان مستند نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس مصنف نے مہم کے اسباب بیان نہیں کیے۔ لیکن اُس کی تحریر کے مطابق زبطرہ پر پہلا حملہ ۸۳۶ء میں ہوا تھا۔

سلہ بازنطینی اس شہر کو زبطرہ کہتے ہیں۔ اس کی جائے وقوع کے متعلق ادریسی اور ابو الفدا میں اختلاف ہے۔ ادریسی (ج ۲۔ ص ۱۳۱) کے مطابق زبطرہ، حصن منصور سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اور حصن منصور، سمیاط، اور ملطیہ کے درمیان سمیاط سے بائیس میل اور ملطیہ سے تیس کے فاصلے پر تھا۔ ابو الفدا (مطبوعہ یورپ ص ۲۳۳) نے لکھا ہے کہ زبطرہ، حصن منصور سے مغرب کی طرف، تقریباً دو دن کی مسافت پر، ایک میدان میں واقع تھا، اور اُس کے گرد پہاڑ تھے۔ چونکہ ابو الفدا نے بذات خود ۷۱۵ھ میں اس شہر کو شکستہ حالت میں دیکھا تھا اس لیے اُس کا بیان زیادہ مستند ہے۔

سلہ طبری (ج ۲۔ ص ۱۲۳۵) اور ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶) سے مصنف کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مترجم

خلاف جنگ کا اعلان کرے[1]۔ لیکن اُس کی مصیبت زدہ رعایا کی فریاد، اور خصوصاً ایک قیدی ہاشمی عورت کی دہائی نے معتصم کو مجبور کیا کہ عمر الفرغانی اور عجیف بن عنبسہ کو کچھ فوج دے کر سرحد کی طرف روانہ کرے تاکہ وہ اس قتل و غارت کا سدباب کریں، حالانکہ توفیل اس ہولناک قتل عام کے بعد فوراً اپنے دار السلطنت کو واپس ہوگیا تھا، اور صرف تھیوفوبُوس کو اپنے ایرانی حلیفوں کے ساتھ ایشیائے کوچک میں چھوڑ گیا تھا۔ اس عرصہ میں خلیفہ نے قیصر کے خلاف جنگ کی تیاری مکمل کی۔ خلافت کے تمام صوبوں سے فوجیں جمع کی گئیں، اور جونہی وہ فوجیں جو بابک کے خلاف لڑ رہی تھیں مستقر کو واپس آئیں ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) کے موسم بہار میں خلیفہ بذات خود انھیں لے کر ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوگیا۔ مقدمۃ الجیش پر اشناس اور محمد بن ابراہیم بن مصعب کو؛ میمنہ پر ایتاخ کو، میسرہ پر جعفر بن دینار بن عبداللہ الخیاط کو، اور قلب پر عجیف بن عنبسہ کو افسر مقرر کیا۔

---

[1] عرب مورخ اس سے متفق نہیں، وہ کہتے ہیں کہ توفیل نے پہلے ۲۲۲ھ (۸۳۷ء) میں زبطرہ اور سمیساط فتح کیا تھا۔ لیکن ان مورخوں میں خود اس طرح اختلاف واقع ہوتا ہے کہ وہ پہلے عجیف اور عمر الفرغانی کا یونانیوں کے خلاف بھیجا جانا بیان کرتے ہیں، اور پھر لکھتے ہیں (ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۷۷، ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۶۲) کہ بابک پر فتح پانے کے بعد معتصم نے عموریہ پر فوج کشی کا حکم دیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عجیف اور عمر کی پہلی مہم بابک کی جنگ کے خاتمے سے پہلے عمل میں آئی تھی۔ لیکن ہم بیان کر چکے ہیں کہ بابک کا شوال ۲۲۲ھ میں خاتمہ ہوا تھا، اور ۲۲۳ھ کے شروع میں افشین اُسے اپنے ساتھ لے کر سامرہ پہونچا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زبطرہ کی تباہی یقیناً ۲۲۲ھ (مطابق ۸۳۷ء) میں واقع ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ زبطرہ کی تباہی اور معتصم کی مہم کے درمیان، جس میں افشین اور دوسرے سپہ سالاروں نے، جو بابک کے خلاف لڑ رہے تھے، حصہ لیا تھا، دو برس کا وقفہ گذرا تھا۔ یعنی توفیل کی یورش ۸۳۷ء میں ہوئی تھی، اور عموریہ کا محاصرہ ۸۳۸ء میں پیش آیا تھا۔ اس دو برس کے وقفہ کو عرب مورخ مانتے ہیں۔ بازنطینی مورخ ان سے متفق ہیں۔ کیونکہ Theo Contin (ص ۱۲۵) نے Simeon Magister کی کتاب (ص ۶۳۴) کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ زبطرہ کی فتح توفیل کے سات سنہ جلوس میں، اور عربوں کی فوج کشی نو سنہ جلوس میں پیش آئی تھی۔ اس کے علاوہ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲) نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ بابک نے توفیل کو لکھا تھا کہ معتصم کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اُس نے اپنے درزی (جعفر) اور باورچی (ایتاخ) کو سپہ سالار بنا کر اُس سے لڑنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس لیے اگر جنگ کا ارادہ ہو تو اس سے بہتر دوسرا موقع نہیں ملے گا۔ یہ یقیناً ۲۲۲ھ کا واقعہ ہے کیونکہ معتصم نے اسی سال ان دونوں سپہ سالاروں کو آذربائیجان بھیجا تھا (مصنف نے اس سے قبل بھی ذکر کیا ہے کہ توفیل نے زبطرہ اور سمیساط پر حملہ کیا تھا۔ لیکن ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶)، طبری (ج ۲۔ ص ۱۲۳۴)، مسعودی (ج ۷۔ ص ۱۳۴) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲) نے سمیساط کے بجائے ملطیہ پر یونانی حملے کا ذکر کیا ہے۔ یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مصنف نے خود لکھا ہے کہ اس تباہی خیز مہم کی بدولت ملطیہ سے شام کی سرحد تک کا تمام علاقہ تہ و بالا ہوگیا تھا۔ اس کی تصدیق طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۲۳۵۔ سے ہوتی ہے۔ مترجم) +

معتصم نے اپنی چھاؤنی سلوقیہ کے مقام پر قائم کی ۔ یہ جگہ طرسوس سے ایک دن کی مسافت پر دریائے ایڈنوس (نہر السن) کے کنارے واقع تھی[۵۱]۔

جب تمام عرب فوج، جو بازنطینی اندازے کے مطابق دو لاکھ پچاس ہزار تھی، ایک جگہ جمع ہو گئی تو معتصم نے تیس ہزار آدمیوں کو افشین کی سرکردگی میں سروج اور درب الحدث کے راستے سے ملطیہ کی طرف روانہ کیا۔ اشناس اور وصیف کو درۂ سلیسیا کے راستے کپادوشیا بھیجا، اور حکم دیا کہ وہ طوانہ کی طرف جائیں۔ اشناس ۲۲ رجب کو روانہ ہوا۔ اُسے حکم تھا کہ صفصاف[۵۲] میں خلیفہ کا انتظار کرے اس کے دو دن بعد خلیفہ بذات خود روانہ ہوا۔ چونکہ اُسے معلوم تھا کہ بازنطینی اُس کے قراول پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اُس نے اشناس کو قیام کرنے کا حکم دیا، تاکہ یونانی فوج کی چھاؤنی کا پتہ لگایا جائے۔ اشناس نے عمر الفرغانی کو دو سو آدمی دے کر آگے بھیجا۔ ان لوگوں نے کپادوشیا میں ادھر اُدھر چھاپے مارے، اور چند قیدی ساتھ لے کر واپس آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ قیصر کپادوشیا میں جنگ کی تیاری کر رہا تھا، لیکن جب اُسے افشین کے آ پہنچنے کی خبر معلوم ہوئی تو وہ بھی اسی طرف روانہ ہو گیا[۵۳]۔

اب معتصم نے افشین کے پاس قاصد بھیجا اور حکم دیا کہ وہ آگے نہ بڑھے۔ لیکن باوجود اس کے کہ قاصد سے دس ہزار دینار کا وعدہ کیا گیا تھا وہ افشین تک نہ پہونچ سکا۔ اس اثنا میں معتصم نے اشناس کو فوج کا ایک حصہ دے کر آگے روانہ کیا۔ وہ انقرہ[۵۴] پہونچا۔ وہاں کے تمام باشندے بھاگ چکے تھے، اور بستی غیر آباد تھی۔ اشناس نے مفرورین کو اکٹھا کر کے ان کی تمام دولت اور کھانے پینے کا ذخیرہ ان سے چھین لیا۔ انقرہ میں ہی اشناس کو اطلاع ملی کہ افشین نے قیصر کو شکست دی ہے۔ اس جنگ میں پہلے یونانیوں کا پلہ بھاری معلوم ہوتا تھا، مگر ترک تیر اندازوں کی ہمت اور کوشش سے حالت بدل گئی، اور آخر

---

۵۱ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۸) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۳) کہتے ہیں کہ اُس نے نہر السن کے کنارے اپنا معسکر قائم کیا تھا، بازنطینی مورخ لکھتے ہیں کہ معتصم کا معسکر طرسوس کے قریب تھا۔

۵۲ میرا قیاس ہے کہ صفصاف طرسوس اور طوانہ کے درمیان غالباً دریائے سلیسیا کے ایک جانب واقع ہے۔

۵۳ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۷) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۳) اس واقعہ کے متعلق بازنطینی مورخوں سے متفق ہیں۔

۵۴ انقرہ نام ایک شہر شمالی گلاتیا میں اور ایک فرائگیا میں ہے۔ لیکن مورخوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان دونوں مقامات میں سے کسی سے بھی مراد نہیں ہے۔ تمام اسناد میں جو حالات بیان ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انقرہ کا شہر طرسوس اور انکونیم کے درمیان ہوگا۔ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۲۸) کے مطابق وہ عموریہ سے سات مراحل تھا۔ ادریسی (ج ۲۔ ص ۱۱۳) نے انقرہ کا ذکر کیا ہے جو قونیہ اور انطاکیہ کے درمیان واقع تھا۔

میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ یونانیوں کی فوج بالکل تباہ ہوگئی، اور قیصر نے بھاگ کر اپنی جان بچائی[1]۔ معتصم کو اس فتح کی خبر اُس وقت ہوئی جب وہ انقرہ کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ افشین بھی بہت جلد خلیفہ کے پاس آگیا۔

معتصم اپنی فوج تین حصوں میں تقسیم کرکے عموریہ کی طرف بڑھا۔ عموریہ قیصر تونیل کا جائے پیدائش تھا۔ خلیفہ نے زبطرہ سے عموریہ تک کا تمام علاقہ پامال کر ڈالا، تاکہ بازنطینیوں سے ان کے گزشتہ قتل و غارت کا قرار واقعی انتقام لے۔ افشین میمنہ پر، اشناس میسرہ پر، اور خود معتصم قلب پر افسر تھے۔ تونیل نے افشین کے خلاف روانہ ہونے سے قبل سب سے استدعا کی تھی کہ عموریہ کو بچانے میں اُس کی مدد کریں۔ عموریہ کو نہایت استحکام کے ساتھ چاروں طرف سے قلعہ بند کیا گیا تھا، اور یہ تیوس دوسرے بہادر سپہ سالاروں کے ساتھ یہاں کی مقیم فوج کا افسر اعلےٰ تھا۔ قیصر نے خود دُر دلیم (دردلیہ) کے قریب ایک مستحکم چھاؤنی قائم کی تھی۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ وہ دشمن کا، جس کی تعداد اُس سے تین گنا تھی، نہ مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ محصورین کو کسی قسم کی مدد پہونچا سکتا ہے۔ اس اثنا میں، باوجود مایوسی کے، محصورین نے نہایت ثابت قدمی دکھائی، اور اگر دو غدار اسلامی فوج سے مل کر شہر کی فتح کو آسان نہ بنا دیتے تو غالباً محاصرہ طول کھینچتا۔ ان میں سے ایک عیسائی عرب تھا، جو مسلمانوں سے مل گیا، اور انھیں فصیل شہر کا

---

[1] یہ نہایت مستند مورخوں کا بیان ہے۔ اسلامی فوج میں ترکوں کے موجود ہونے کا واقعہ نہ صرف بازنطینی مورخوں نے، بلکہ ابن اثیر نے بھی بیان کیا ہے۔ ترکوں کے افسر کا نام ایتاخ تھا۔ یہی شخص افریقیہ کے سپاہیوں کا افسر بھی تھا۔ عربوں نے میدان جنگ کا نام نہیں لکھا۔ مگر Theoph Contin (ص ۱۲۰) نے اسے "دتیزامونا" (Dasemona) لکھا ہے۔ ایک اور جگہ انزے (Anzo) تھی، جہاں سے قیصر تونیل تمام عربی فوج کو دیکھ سکتا تھا۔ ان دونوں مقامات کا صحیح محل وقوع معلوم نہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ افشین ملطیہ کی طرف سے آکر قیصر سے لڑا تھا، اور اس جنگ کے بعد، ایرانی معاون فوج کے غدر کی وجہ سے قیصر نے اماسیہ کے قریب خلوکم میں پناہ لی تھی، اس لئے میدان جنگ غالباً سیواس اور قیصریہ کے قریب کہیں واقع ہوگا۔ یونانیوں کے خلاف، ایرانیوں نے جہاں سازش کی تھی اُس جگہ اور میدان جنگ کے قریب ہونے کا ذکر گبن اور شلاسر (Schlosser) نے بھی کیا ہے۔ اس جنگ میں منیول نے متعدد مرتبہ قیصر کی جان بچائی، اور بالآخر خود قتل ہوا۔ ابن اثیر کے مطابق یہ جنگ ۲۵ شعبان ۲۲۳ھ (م ۲۱ جولائی ۸۳۸ء) کو ہوئی تھی۔

[2] بازنطینی مورخوں نے لکھا ہے کہ اس مہم کے آغاز میں معتصم نے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ اپنی ڈھالوں پر عموریہ کا نام لکھوائیں۔ ابن اثیر (ج ۶، ص ۱۷۷) لکھتا ہے کہ بابک کو مغلوب کرنے کے بعد معتصم نے دریافت کیا تھا کہ یونانی سلطنت میں کون سا شہر سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے عموریہ کا نام لیا تھا، جہاں اُس وقت تک اسلامی فوج نہیں پہونچ سکی تھی۔

وہ حصہ دکھا دیا جو طغیانی کی وجہ سے کمزور ہوگیا تھا۔ معتصم نے محاصرہ کے تمام آلات فصیل کے اسی حصہ پر لگا دیے۔ یوتیوس خوب جانتا تھا کہ وہ شہر کو بہت دنوں تک محفوظ نہیں رکھ سکتا، اور چاہتا تھا کہ رات کو شہر کے دروازے کھول کر باہر آ سے اور مسلمانوں کی صفوں کو چیرتا ہوا نکل جائے۔ مگر یوتیوس کی یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ قاصد، جسے اُس نے اطلاع دینے کی غرض سے قیصر کے پاس بھیجا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ ادھر اسی وقت اس سپہ سالار نے جو شکستہ فصیل کی حفاظت پر مامور تھا، معتصم کے ساتھ خط و کتابت شروع کرکے لڑائی موقوف کردی۔ مگر اس دوران میں مسلمان برابر فصیل شہر سے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ یونانی سپاہی اپنے افسر کے حکم کے منتظر بیٹھے تماشا دیکھا کیے۔ جب اُنھیں اُس کی غداری کا حال معلوم ہوا تو معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا، اور مسلمانوں کو پسپا کرنا ناممکن تھا۔ عرب بغیر کسی مزاحمت کے شہر کے اندر داخل ہوگئے۔ یوتیوس نے بھی مقابلہ بیکار سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے۔ اب مسلمان شہر پر قابض تھے، اور معتصم کو کوئی چیز بدقسمت شہریوں سے ان کے قیصر کی بداعمالیوں کا بدلہ لینے سے نہ روک سکتی تھی[۱]۔

---

[۱] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶۔ ۱۸۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲۔ ۲۶۴) نے فتح عموریہ کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں۔ عرب عیسائی غدار کا نام اُنھوں نے نہیں لکھا۔ مگر دوسرے غدار کا نام وندو یا ویدو بتایا ہے۔ بازنطینی مورخوں نے اس کا نام بویدیس (Boidises) لکھا ہے۔ اس سپہ سالار نے کاغذ کا ایک پرچہ مسلمانوں کے لشکر میں پھینک کر اُنھیں اُس جگہ کی اطلاع دی تھی جہاں وہ متعین تھا، اور دعوت دی تھی کہ اُسی جگہ حملہ کیا جائے۔ عربوں نے اُس کا نام بالکل مسخ کردیا ہے؛ مگر مسخ شدہ نام نہایت آسانی سے Boidises یا Woidises سمجھا جا سکتا ہے Simeon Magister: Geog. Monach دونوں نے اُس کا نام بویدیس اور مینی کو نیگوس (Manicophagus) لکھا ہے۔ بربریوس (Ber Herbaus) نے اسے بودن (Boden) لکھا ہے۔ مرخوں نے غداری کا الزام ایک عیسائی پر رکھا ہو لو فتح شہر کو ایک غدار وندو یا ویدو سے منسوب کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غداری کی خاص طور پر تشہیر کرنا چاہتے ہیں۔ بازنطینی مورخ بھی بویدیس کی غداری کے قائل ہیں، اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ معتصم نے اُسے رشوت دی تھی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس اثنا میں جبکہ وندو معتصم کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا، عبدالوہاب بن علی نے، جو مسلمانوں کا قریب ترین افسر تھا، شہر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یونانی ابھی خط و کتابت ہی میں مشغول تھے کہ مسلمان دھاوا کرکے شہر میں داخل ہوگئے، حالانکہ وندو کو حکم تھا کہ لڑائی روک دے۔ جب وندو نے یہ دیکھا تو اُس نے معتصم سے کہا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ معتصم نے کہا کہ تیری تمام آرزوئیں پوری کردی جائیں گی۔ اس طرح مسلمان دھاوا کرکے شہر میں داخل ہوئے، اور ایک گرجا کو، جسے عیسائی خاص طور پر مقدس سمجھتے تھے، آگ لگا دی۔ یونانی سپہ سالار یتیوس (Aetius) یا ایتوس (Talus) نے بھی، جو اب تک ایک برج پر قابض تھا، ہتھیار ڈال دیے۔ خلیفہ نے اُسے تازیانہ کی سزا دی۔

عرب مورخ لکھتے ہیں کہ یہ محاصرہ صرف پچپن روز رہا تھا، اور اواخر شوال ۲۲۳ھ (۲۳ ستمبر ۸۳۸ء) کو شہر فتح ہوا۔ جن معزز خاندانوں سے زرِ فدیہ کی بڑی بڑی رقمیں وصول ہونے کی امید تھی انھیں گرفتار کیا گیا۔ عوام الناس میں سے جو ہتھیار اُٹھانے کے قابل تھے، قتل کیے گئے؛ اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ شہر عموریہ کو، مال و دولت سے خالی کرنے کے بعد آگ لگا دی گئی۔ معتصم موسم سرما کے آغاز سے قبل ہی شام کی طرف واپس ہوا۔ اس غیر معمولی واپسی کی وجہ یہ ہوئی، کہ اُس کے غیاب میں فوج نے اُس کے بھتیجے، عباس بن مامون کو خلیفہ بنانے کے لیے ایک سازش کی تھی۔ عرب مورخوں نے اس جنگ کے بعد معتصم اور بازنطینیوں کی کسی خط و کتابت کا ذکر نہیں کیا۔ یونانی مورخوں کے مطابق توفیل نے اب صلح کی درخواست کی تھی؛ لیکن معتصم نے جو شرائط پیش کی تھیں وہ ناقابل قبول تھیں۔ اسی وجہ سے قیدیوں کا تبادلہ بھی نہ ہو سکا۔ بازنطینیوں کی حالت اب ایسی تھی کہ وہ نئے سرے سے جنگ شروع بھی نہ کر سکتے تھے، حالانکہ آئندہ سال ان کی دوسری سفارت خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ مگر بے نیل مرام واپس ہوئی، اور صلح نہ ہو سکی[1]۔

قیصر کو فرنیک قوم سے مدد کی امید تھی، جو پوری نہ ہوئی، اور بذات خود وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اکیلا جنگ جاری نہ رکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف معتصم اندرونی فسادوں کو دور کرنے میں مشغول تھا، اور طبرستان کے رئیس کے خلاف جنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔

---

[1] Theo Contis ص ۱۲۱ + Cedern ص ۱۳۷ + مجھے اس بیان کی صداقت میں بہت شبہ ہے۔ کیونکہ ابن اثیر اور ابن خلدون، جو ہمیشہ قیدیوں کے تبادلے کا ذکر کرتے ہیں، سب سے پہلے ۲۳۱ھ میں واثق کے عہد میں اس قسم کے تبادلے کا حال لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس دوران میں مسلمانوں اور یونانیوں میں کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ عرب اور بازنطینی مورخوں کے اس متفقہ بیان کو دیکھتے ہوئے ہم کسی اور سند کو کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد ۲۲۵ھ (۸۴۰ء) میں ابوسعید نے یونانی علاقہ پر ایک یورش کی اور بہت سے قیدی پکڑ کر لے گیا۔ لیکن بعد میں ابوسعید کو یونانیوں نے گرفتار کر لیا، اور مرعش اور ملطیہ کے علاقوں کو پامال کر ڈالا۔ اس وقت توفیل نے ایک اور سفارت، بہت سے تحفے دے کر، خلیفہ کی خدمت میں بھیجی۔ گو اب بھی باقاعدہ طور پر قیدیوں کا تبادلہ نہیں ہوا۔ لیکن دونوں حکمرانوں نے محض اپنی خوشی سے ایک دوسرے کو بہت سے قیدی تحفے میں پیش کر دیے۔ ایک صلح نامہ بھی مرتب ہوا۔ لیکن یہ سب واقعات ۸۴۵ء (۲۳۱ھ) اور ۸۴۶ء (۲۳۲ھ) میں واثق اور تھیوڈورا کے عہد میں پیش آئے۔ عموریہ کے بیالیس شہدا کا تعلق ان واقعات سے نہیں ہے۔ لیکن یہ واضح ہونا چاہیے کہ روایت کے مطابق یہ شہدا سات برس، یعنی ۲۲۳ھ سے ۲۳۱ھ تک قید رہے تھے۔ تبادلے کے وقت غلطی سے بیالیس عیسائی باقی رہ گئے تھے۔ یہ یا تو قید ہی میں مر گئے، اور یا بودیس کی خواہش پر اُس کے حوالے کر دیے گئے۔ اس طرح بیالیس شہدا کی حکایت مشہور ہو گئی۔

حیاتِ نیرّ

(جناب حاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے، پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۳)

مولوی نور الحسن جولائی ۱۸۹۱ء سے کیننگ کالج لکھنؤ کے بی۔اے کلاس میں داخل ہوئے۔ قیصر باغ میں قیام بدستور تھا۔ منشی شیدا علی عباسی بھی ساتھ رہتے تھے۔ مولوی مقبول الدین علوی کاکوری سے مڈل پاس کرکے انٹرنس کی تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے اور منشی شیدا علی کے ساتھ اُن کی نگرانی میں رہے۔ وہ کاکوری کی قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے اور علم الانساب سیکھنے کا شوق تھا۔ مولوی نور الحسن اُن کی قابلیت بڑھانے کے لیے گھنٹوں اُن سے گفتگو کرتے اور انگریزی علوم کا شوق دلاتے تھے۔

کاکوری کے دو بگڑے ہوئے رئیس منشی امجد حسین اور منشی اصغر حسین (جو منشی عاشق علی خاں سفیر بادشاہ اودھ متعینہ دربار گورنر جنرل کے لائق صاحبزادے امیر حسن خاں بسملؔ حریف وہم عصر غالبؔ کے نواسے تھے اور کلکتہ میں تعلیم پاتے تھے) بزرگوں کی جائداد تلف ہونے کے بعد دو سال ہوئے وطن آئے تھے۔ امجد حسین نے انٹرنس پاس کرلیا تھا اور اصغر حسین نے بھی انگریزی اور اُردو ادب میں اچھی لیاقت پیدا کی تھی۔ علم مجلس میں دونوں بھائی ماہر کامل تھے اور موسیقی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ تاش کھیلتے۔ ٹانگیں ہلاتے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے اور گنگناتے جاتے تھے کہ "رات بالم ہم سے روٹھے"۔

دونوں بھائی لڑکپن میں مولوی نور الحسن کے جلیس وانیس تھے۔ کلکتہ سے واپس آئے تو اپنے قدیم دوست کے پاس اکثر آتے اور دل بہلایا کرتے تھے۔ منشی امجد حسین تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بھوپال چلے گئے اور ریاست میں ملازم ہوگئے لیکن منشی اصغر حسین مدت تک کاکوری میں مقیم رہے۔ کبھی لکھنؤ آتے تو مولوی نور الحسن سے گھنٹوں ادب اُردو اور انگریزی ناولوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ مولوی نور الحسن کاکوری جاتے اور یہ وہاں موجود ہوتے تو صبح شام ان سے پُرلطف صحبت رہتی تھی۔ انھوں نے رسالۂ حسنؔ حیدرآباد دکن میں اعلےٰ درجہ کے مضامین لکھے تھے۔ اودھ پنچ کی نامہ نگاری کی تھی۔ کہتے تھے کہ کلکتہ کے بعض انگریزی اخباروں میں بھی مراسلات شائع کرائے تھے۔ ہر علم میں دخل ظاہر کرتے تھے اور مولوی نور الحسن کو بھی اُن سے بات چیت کے لیے ہمہ دانی کی ضرورت پیش آتی تھی۔ انگریزی ناولوں کے پڑھنے اور لٹریچر سے ذوق پیدا کرنے کے محرک اول اصغر حسین تھے اور اسی وجہ سے ان اوراق میں ان کا اسم گرامی درج کیا گیا۔

ایک جملۂ معترضہ سُنیے کہ چند سال کے بعد منشی اصغر حسین کی زندگی میں انقلاب ہوا۔ تلاش معاش میں

راجپوتانہ گئے تھے۔ اجمیر پہونچ کر ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ گھربار چھوڑ عزیزوں دوستوں سے منہ موڑ کر چشتی چمن کی سرسلے میں فقیر بن بیٹھے۔ برسوں اُن کی خبر نہ ملی سنہ۱۹۰۵ء میں راقم الحروف اجمیر گیا تو اُن کا نام سُنا۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ تاریک کوٹھری میں برہنہ بیٹھے تھے۔ ستر کے لیے سوائے ایک کمل کے کچھ نہ تھا۔ نہایت ضعیف ولاغر ہوگئے تھے۔ بال "وبال" سے بڑھے تھے اور ایک مجنوں یا وحشی کی سی صورت ہوگئی تھی۔ راقم کو فوراً پہچان لیا اور اپنے دوست مولوی نورالحسن کا حال دریافت کیا۔ بیس برس کے بعد دوبارہ سنہ۱۹۲۶ء میں زیارت نصیب ہوئی۔ عزلت و خلوت ترک کرچکے تھے۔ ہند ہوٹل اجمیر میں فروکش تھے۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی شروع ہوگئی تھی مگر ذوق تصوف بدستور تھا اور خواجہ غریب نواز کی ثنا و صفت سے عشق۔

راقم کی خاطر مدارات کی مگر بار بار اپنے دوست کا حال پوچھتے تھے۔ ایک حاضر مجلس سے فرمایا کہ میں اس شخص کی خاطر یوں کرتا ہوں کہ یہ میرے ایک مخلص رفیق کا بھانجا ہے اور میں نے اس لڑکے کو اپنے دوست کے ساتھ دیکھا ہے۔ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔

قصہ مختصر مولوی نورالحسن کالج میں پڑھتے تھے مگر صحت خراب تھی۔ نزلے کی شکایات مدت سے تھیں۔ مسوڑھے متورم ہوجاتے تھے۔ کئی کئی روز دانتوں میں سخت درد رہتا تھا۔ اب اس مرض کا دورہ جلد جلد ہونے لگا اور یہ عادت پڑ گئی کہ بغیر نشتر دیے درد کو سکون نہ ہوتا تھا۔ معدہ نہایت کمزور تھا۔ ریاضت کے لیے ٹینس کھیلنے کا شوق پیدا کیا تھا اور دو تین برس سے اس کی مشق کر رہے تھے۔ کبھی کبھی گھوڑے بھی ہلاتے تھے لیکن تندرستی میں نمایاں ترقی نہ تھی۔ اسی زمانہ میں اُن کے چچا مولوی محمد احسن کا انتقال ہوگیا۔ وہ بھوپال سے بیمار ہوکر آئے اور ۸ ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ کو (نومبر ۱۸۹۱ء کے دوسرے ہفتہ میں) بمقام کاکوری راہی جنت ہوئے۔

گفت دل ہر کہ کہ آمد در زوال آں آفتاب[1] مردہ در گور است احسن زندہ در گور من

اس صدمے نے قلب و دماغ کو بھی کمزور کر دیا۔ مولوی محمد محسن سا اپنے عزیز بھائی کی خبر رحلت سن کر سخت بیمار ہوئے۔ زندگی کی آس نہ رہی۔ مولوی انوارالحسن اُن کی تیمارداری کے لیے مین پوری گئے اور یہ کاکوری میں تنہا تھے۔ منشی اصغر حسین روزانہ آتے اور خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر ان کو قرار نہ آتا تھا۔ نہ کاکوری میں دل لگتا تھا نہ لکھنؤ میں اور اس سراسیمگی نے معدے کی حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی۔ دسمبر میں مولوی نظیر الحسن خلف مولوی محمد احسن مرحوم کی شادی قرار پائی اور ان کو تمام مراسم میں شریک ہونا پڑا۔ برات کے ساتھ بجنور گئے اور ثقیل غذائیں استعمال کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس موقع پر اپنے ماموں زاد بھائی حاجی ذکی الدین کے

---

[1] دوسرے مصرعے کے اعداد بقاعدۂ جمل ۱۸۴۴ ہیں۔ اس میں سے "آں آفتاب" کے اعداد یعنی ۵۳۵ منہا کیے جائیں تو ۱۳۰۹ حاصل ہوتا ہے اور وہی سنہ مقصود ہے۔

مشورے سے یہ طے کیا کہ معدے کی اصلاح اور نزلے کی شکایات دور کرنے کے لیے فنجرف کا تجربہ کرنا چاہیے چنانچہ جنوری ۱۸۹۲ء میں کانپور جا کر یہ علاج کیا۔ گھی اور دودھ کثیر مقدار میں ہضم کرنے لگے۔ نزلے کی شکایت گھٹی اور صحت نسبتاً درست ہو گئی۔

امیر اللغات کا دوسرا حصہ جس میں الف مقصورہ کے الفاظ مع مرکبات تھے اس سال شائع ہوا غور سے پڑھا اور امیر مینائی کی موشگافیوں کی داد دی لیکن اُس پر کوئی ریویو نہیں لکھا۔ سارا وقت انگریزی ادب پر صرف کرتے اور مغرب کی فلاسفی کا مشرق کے فلسفے سے موازنہ کیا کرتے تھے۔

کیننگ کالج میں مسلمانوں کا ایک جداگانہ لٹریری کلب تھا اور مولوی انوار الحسن ایک سال اُس کے سکرٹری رہے تھے۔ یہ اُس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور انگریزی میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ گرمیوں کی تعطیل میں حسب دستور مین پوری گئے اور جولائی ۱۸۹۲ء سے بی اے کے دوسرے سال میں قدم رکھا۔ راجہ بازار کا مکان سکونت کے لیے نہ مل سکا۔ نظیر آباد میں ایک نواب کی محلسرا کرایہ پر لے کر قیام کیا۔ شہر کا سیر و تماشہ چھوڑا فرائض و نوافل مؤکدہ کے بعد جو وقت بچتا وہ کورس کی تیاری میں صرف کرتے۔ لسان ثانی ہنوز عربی تھی "اقبال میڈل" حاصل کرنے کی آس لگائے تھے کہ ایک سانحہ سخت سے دوچار ہوئے۔ اُن کے قدیم ہم سبق اور مخلص عزیز شیخ اکرام علی اپنی ضرورتوں سے لکھنؤ آئے تھے۔ ناگاہ ہیضہ ہوا اور دو دن میں غلد کی جاگیر عنایت ہو گئی۔ نعش کے ساتھ بجنور گئے اور عالم بدحواسی میں بار بار کہتے تھے "زندگی بھر کے رفیق سے مفارقت ہوئی" ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد۔

نظیر آباد والے مکان سے نفرت ہو گئی۔ اور سفارشیں اُٹھوا کر چودھری محمد عظیم تعلقدار سندیلہ کی عالی شان محلسرا واقع قیصر باغ میں سکونت اختیار کی۔ رفع ملال اور تفریح خاطر کے لیے انگریزی اخبارات پڑھتے تھے۔ لیورپول سے ایک نومسلم انگریز نے اخبار جاری کیا تھا۔ اُس کو خرید کرتے اور من اولہ الی آخرہ پڑھتے۔ لاہور سے ایک اسلامی اخبار انگریزی میں نکلنا شروع ہوا تھا اُس کے بھی خریدار تھے۔ ادب اُردو سے بالکل تعلق قطع کر لیا تھا۔ راقم الحروف اُس وقت مڈل کلاس میں تھا۔ اُس کو بھی اُردو کی کتابیں دیکھنے سے منع کرتے اور صحیح انگریزی لکھنے کا شوق دلاتے تھے۔ چند ماہ کے بعد بی اے کے امتحان کی فیس روانہ ہوئی اور اُنھوں نے طے کیا کہ کورس کی تیاری کے لیے الہ آباد میں قیام کرنا چاہیے کیونکہ امتحان دینے وہاں بہرصورت جانا ہوگا اور قبل از وقت پہنچنے سے یونیورسٹی کالج کے پروفیسروں کا اندازہ تعلیم معلوم ہوگا اور ممکن ہے کہ وہاں کے طلبا سے ایسی مفید یادداشتیں دستیاب ہو جائیں جن سے امتحان کی کامیابی میں مدد ملے۔ چنانچہ آغاز بہار ۱۸۹۳ء سے دونوں بھائی الہ آباد گئے اور چوک کے قریب بابو ہنومان پرشاد وکیل کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔

ہنومان پرشاد اُس وقت ہائیکورٹ میں درجہ اول کے وکیل تھے اور اُن کی شہر میں وہی قدر و منزلت تھی جو بعد کو بابو سندر لال یا موتی لال وغیرہ کو نصیب ہوئی۔ وہ مولوی محمد محسن کے قدیم دوست تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی صاحب کو بھی ایک اپیل کے سلسلہ میں الہ آباد جانے کی ضرورت ہوئی۔ وہ بھی اسی جگہ رونق افروز ہوئے۔ جلال آباد ضلع شاہجہانپور کے ایک صوفی مزاج مولوی عبداللہ خاں نام مدت سے مولوی محمد محسن کے متوسلین میں تھے۔ وہ بھی الہ آباد بلا لیے گئے اور آقازادوں کی کامیابی امتحان کے لیے انھوں نے اعمال خوانی شروع کی۔

مولوی نور الحسن نے الہ آباد کالج کے طلبا سے ملاقات پیدا کی اور وہاں کے پروفیسروں کی تعلیمات و ہدایات سے فائدہ اُٹھایا۔ امتحان سے ایک دن قبل ہوا خوری کے لیے خسرو باغ گئے تھے۔ اثنار راہ میں ایک سائل ملا۔ فطرتاً سخی تھے اور ردِ سوال گناہ تصور کرتے تھے۔ اُس کو خیرات دی۔ مولوی عبداللہ خاں نے خواب میں دیکھا کہ امتحان کا پرچہ اُس فقیر سے خرید لیا گیا۔ صبح کو یہ قصہ بیان کیا۔ سُننے والوں کا دل خوش ہوا اور اطمینانِ قلب کا ثمرہ جوابات کی تحریر کے وقت ظاہر ہوا۔

"دعا برائے تسکین قلب است۔ او سبحانہ تعالیٰ میداند کہ چہ می باید کرد۔"

دونوں بھائیوں نے پرچے بہ دلجمعی تمام حل کیے اور امتحان سے بخیریت فراغت ہوئی۔ مولوی محمد محسن مین پوری تشریف لے گئے اور یہ دونوں بھائی لکھنؤ آئے۔ یہاں نظیر آباد کی سڑک پر کرایہ کے مکان میں مولوی نظیر الحسن، منشی ناصر علی اور راقم الحروف مسکن گزیں تھے۔ وہیں تشریف لائے۔ منشی ناصر علی نے شکایت کی کہ امیر احمد نے دو مہینے سے کچھ نہیں پڑھا ہے اور آموختہ بھی فراموش کر دیا ہے۔ نہایت ناراض ہوئے۔ شاگرد کو اپنے ساتھ کاکوری لے گئے اور زجر و توبیخ کے بعد اُس سے امتحان مڈل کی تیاری کرائی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ خود روزہ رکھتے مگر دن کا بیشتر حصہ کورس یاد کرانے میں صرف کرتے تھے۔ انگریزی، تاریخ اور قواعد و جغرافیہ خود سُنتے اور دیگر مضامین کی بھی تاکید کرتے تھے مگر وہ بازی پسند اس قید میں بھی اُستاد کی آنکھ بچا کر لہو و لعب میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اُس کے دوست[1] گھات دیکھ کر آتے اور شطرنج کی دو ایک بازی کھیل جاتے تھے۔

عید کے بعد بی اے کا نتیجہ آیا۔ مولوی نور الحسن اور انوار الحسن دونوں کامیاب ہو گئے۔ سُنتے ہی

---

[1] اشارہ ہے منشی اعجاز امین کاکوروی کی طرف جو اُس وقت تک وطن میں ایام گذاری کر رہے تھے۔ چند روز کے بعد وہ حیدرآباد پہنچے اور وہاں مدت سے سب جسٹرار ہیں۔ وہ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُن کی دلچسپ مثنوی "یادِ وطن" مولوی نور الحسن کی اصلاح کے بعد شائع ہو چکی ہے۔ انھوں نے ابتدا میں مولوی محمد محسن سے بھی اصلاح لی تھی مگر بعد کو ہمیشہ اُستاد مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔

سجدۂ شکر ادا کیا۔

امتحان مڈل کا وقت قریب آیا تو راقم کے ساتھ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ روزانہ امتحان کے پرچے نظر غور سے دیکھتے اور جوابات سن کر مسرور ہوتے تھے۔ ریاضی کا پہلا پرچہ بگڑ گیا تو جس قدر افسوس شاگرد کو تھا اُتنا ہی شفیق اُستاد کو بھی ہوا۔ فرمایا کہ خدا کرے دوسرا پرچہ آسان ہو ورنہ کامیابی کی توقع نہیں۔ اُن کی دعا قبول ہوئی۔ دوسرے پرچے کے جوابات شافی دیئے گئے اور اُستاد کے دل کو صبر آیا۔

منشی ارتضا علی شرر کاکوروی۔ مولوی نور الحسن کے عزیز۔ ہم سن اور دوست اس وقت لکھنؤ میں انسپکٹر آبکاری تھے۔

توبہ توبہ شرر کریں توبہ — اور خدمت ہو آبکاری کی

وہ روزانہ تشریف لاتے اور اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ راقم اگرچہ وقت کے امتحان کا زمانہ تھا اسلیے جب وہ غزلخوانی شروع کرتے تو پرچے دستے ہٹا دیا جاتا تاکہ پڑھنے میں ہرج نہ ہو مگر یاد ہے کہ ایک دن اُنھوں نے غزل سنائی تھی جس کا مطلع تھا:۔

جا بجا آپ رقیبوں کو بٹھاتے آئے — آج آئے بھی تو اک آگ لگاتے آئے

اور یہ شعر بھی سنایا تھا۔

لیا ہے دل تو نہ اب فکر کر جگر کے لیے — بس ایک داغ یہ کافی ہے عمر بھر کے لیے

شرر بڑے ذہین۔ تیز طبع اور نازک خیال تھے۔ داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے مگر شروع میں چند غزلیں ہلال لکھنوی اور امیر مینائی کو بھی دکھائی تھیں۔ چندسال کے بعد وہ "پاس یار" اور "پیاری برسات" وغیرہ مسلسل نظمیں لکھ کر تمام اودھ میں مشہور ہوئے لیکن اُس وقت تک اُن کی شاعری اور سخن سنجی کی دھوم نہ تھی۔ وہ "اودھ پنچ" کی نامہ نگاری کرتے تھے مگر بیشتر مضامین گمنام شائع ہوتے تھے اس لیے ملک کو اُن کی طباعی کی خبر نہ تھی۔

اُسی زمانہ کے قریب اودھ پنچ میں "عشق نیرانی" کا ایک قصہ شائع ہوا تھا اور اُس کا یہ شعر بہت مشہور ہو گیا تھا:۔

ماہ نو نیجبر تو دُمدار ستارہ بھاڑ د — مشتری یہ تمھیں سرکار مبارک باشد

شرر نے اقبال کیا کہ یہ مشہور مضمون اُنھیں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور استاد نے ظرافت کی داد دی۔

الغرض امتحان سے فراغت کے بعد راقم کو ہمراہ لے کر مین پوری تشریف لے گئے اور امتحان وکالت میں

لہ ولادت ۱۲۸۱ھ وفات ۱۰ اگست ۱۹۲۳ء مطابق ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ۔ مدفن سیتاپور متصل عید گاہ۔

شرکت کے لیے پروگرام بنانے لگے۔ بی اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قانون کے درجہ میں حاضری دی تھی مگر امتحان ایل ایل بی میں شریک ہونے کے لیے جس قدر فی صدی حاضری درکار تھی وہ پوری نہ ہوئی تھی اس لیے خیال تھا کہ ایک سال اور لکھنؤ میں قیام کرنا ہوگا۔ بقرعید کے دن ۲۵ ر جون کو مڈل کا نتیجہ آیا۔ گزٹ خود ہی کھولا اور اپنے شاگرد کا نام اس میں دیکھ لیا تب گزٹ دوسروں کو چھونے دیا۔ لڑکے کی پہلی کامیابی تھی سب اعزہ مسرور ہوئے مگر مولوی نورالحسن کے چہرے پر وہ بحالی تھی جو خود ان کے بی اے پاس ہونے کے دن دیکھی گئی تھی۔

وسط جولائی میں لکھنؤ پہونچے۔ قیصر باغ میں شیخ اکرام علی تعلقدار رسید نپور کا مکان قیامگاہ ہوا۔ ہفتہ میں دو تین بار قانون کا لیکچر سننے ایک گھنٹے کے لیے کالج جاتے تھے۔ وہاں تعلیم کچھ نہ ہوتی تھی، نہ استاد کوشش کرتا تھا کہ طالب علم پڑھیں نہ شاگرد چاہتے تھے کہ وہ کچھ سیکھیں۔

ہو رہی ہے بحث واں اسلام کے قانون کی   چھیڑ رکھی ہے یاں کسی کافر کی رنگیں داستان

کر رہا ہے شرح قانون شہادت لیکچرر   یاں ہے تیغ غمزہ سے دل کی شہادت کا بیان

طلبا کو صرف حاضری کی مقررہ تعداد پوری کرنے کی فکر رہتی تھی۔

حاضری کے "پی" کی ہے اُن کو رجسٹر میں تلاش   ہیں یہ قانونی پپیہے بولتے ہیں "پی کہاں"

مولوی نورالحسن بیشتر وقت انگریزی ادب کی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ انجمن تعلقداران اودھ کی طرف سے ایک انگریزی اخبار نکلتا تھا اس میں اپنے مضامین چھپواتے تھے۔ اس زمانہ میں بحث چھڑی ہوئی تھی کہ سول سروس کا امتحان ہندوستان اور انگلستان میں بیک وقت ہوا کرے مولوی نورالحسن اس تجویز کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے اور ایک مدلل مضمون اس کے خلاف "ایکسپریس" میں شائع کرایا تھا۔

خان بہادر منشی اطہر علی[1] کاکوروی لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور اس وقت شہر کے اول درجہ کے وکلاء میں اُن کا شمار تھا۔ انجمن تعلقداران اودھ کے مشیر قانونی تھے۔ نازک خیالی اور دیانتداری میں اقران و اماثل سے سبقت لے گئے تھے۔ مثنوی مولانا روم سے ذوق تھا اور کیمیائے سعادت اکثر پڑھا کرتے تھے۔ لڑکوں کو جھوٹ بولنے سے منع کرتے اور ہر خویش و بیگانہ کو مذہبی پابندی، صدق و خلوص کی نصیحت کیا کرتے تھے۔

مولوی نورالحسن سے رشتہ داری تھی۔ وہ گاہ گاہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور اُن کی بیش بہا تعلیمات سے فیضیاب ہوتے تھے۔

---

[1] ولادت ۔ شوال ۱۲۶۳ھ وفات ۔ ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ ۔ بمقام مدینہ طیبہ ۔ کبھی کبھی شعر کہتے تھے ۔ فرماتے ہیں :-

ہر گھر میں روشنی ہے ترے ہی جمال کی   ڈھونڈوں میں تجھ کو لے مہ کامل کہاں کہاں

اُن کا دسترخوان وسیع تھا اور کوٹھی مہمان خانہ۔ مولوی نورالحسن کے ایک عزیز مولوی سمیٰ علی اسی خوانِ نعمت سے مستفید تھے۔ وہ جوبلی اسکول کے سیکنڈ کلاس میں راقم کے ہم سبق تھے اور لسان ثانی عربی تھی۔ مولوی نورالحسن شام کے وقت روزانہ اُن کو الف لیلہ عربی جس کا ایک حصہ اُن کے کورس میں تھا پڑھایا کرتے تھے۔

مولوی مقبول الدین کا نام ان اوراق میں پہلے آچکا ہے وہ بھی اسی مہماں سرا میں مقیم تھے۔ ایف اے میں پڑھتے تھے۔ قدیم تعلقات کی وجہ سے اکثر مولوی نورالحسن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ سائنس پڑھتے تھے اور عقائد میں خلل کا خطرہ تھا۔ مولوی نورالحسن اُن کو فہمائش کرتے اور مذہبی پابندی کا شوق دلایا کرتے تھے۔

مولوی محمد محسن کی مثنوی "شفاعت و نجات" منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کے مطبع شام اودھ میں چھپ رہی تھی۔ اُس کی کاپی اور پروف کی صحت مولوی نورالحسن کے سپرد تھی اس وجہ سے منشی سجاد حسین سے اکثر ملاقات ہوتی اور ذوق ادب تازہ ہوتا تھا۔

غرض لکھنؤ میں ایام گزاری ہو رہی تھی کہ وسط ستمبر ۱۸۹۳ء میں مولوی نورالحسن کی والدہ بیمار ہوئیں دس بارہ دن علیل رہ کر ستمبر کے آخری ہفتہ میں عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں۔

پنجشنبہ۔ ہفتدہ از ماہ ربیع اولیں　　شد جناب والدہ راہی سوئے دارالسلام
بود بر اوج جلال و مکرمت مہر منیر　　بر سر افلاک مہر و مرحمت ماہ تمام
ہردم از یاد خدا اندر رکوع و در سجود　　دیدہ گریاں قلب بریاں اشک ریزاں صبح و شام
ہاتف تاریخ رحلت گفت از نورالحسن　　جان پاک او بود خلد آشیاں والا مقام
۱۳۱۱ھ

والدہ کی موت نے لکھنؤ کی زندگی بے لطف کر دی۔ طبیعت کی افسردگی سے صحت خراب ہوئی۔ شنجرف دوبارہ استعمال کیا مگر اب کے سودمند نہ ہوا۔ لا کلاس کی حاضری پوری ہو چکی تھی امتحان وکالت کی تیاری کے لیے مین پوری سے بہتر مقام نہ تھا کیونکہ وہاں والد ماجد سے قانون کے دقائق بہ آسانی حل کیے جا سکتے تھے۔ لہٰذا دسمبر ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ چھوڑا اور شروع ۱۸۹۴ء سے قانون کی کتابیں دیکھنے کا آغاز کیا۔

امتحان وکالت کی تیاری | مولوی محمد محسن عرضی نالش۔ بیان تحریری۔ موجبات اپیل وغیرہ صاحبزادوں سے لکھواتے۔ فرضی مسلیں مرتب کراتے اور قانون شہادت کی باریکیاں زود فہم مثالوں سے سمجھاتے تھے۔

؎۱ وہ منشی اطہر علی کے ماموں زاد بھائی حکیم حبیب علی کے صاحبزادے تھے۔ حکیم صاحب کا اسم مبارک ابتدائی اوراق میں آچکا ہے۔

مولوی سمیٰ علی ۸ ر نومبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۱ ر جنوری ۱۹۲۳ء کو انتقال کیا۔ وہ نسب نامہ مخدوم زادگان کاکوری موسوم بہ "نفحات النسیم فی تحقیق اولاد عبد الکریم" کے مؤلف تھے اور راقم الحروف کے مخلص خیر طلب دوست تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بیشتر وقت ضابطۂ دیوانی کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا مگر فرصت کے اوقات میں انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں پڑھتے انگریزی کے مشہور رسائل دیکھتے اور لاہور کے "مسلم آبزرور" کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے۔

اُن کو تعلیم اطفال کا بہت شوق تھا۔ زندگی کا شاید ہی کوئی سال ایسا گذرا ہو جس میں کوئی نو عمر بچہ تربیت کے لیے اُن کی نگرانی میں نہ ہو۔ تعلیمی مسائل سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ عربی کا درس نظامیہ پسند نہ تھا۔ منطق میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات تصور کرتے تھے۔ مولوی شبلی نعمانی نے اسی زمانہ میں ندوۃ العلما کے لیے ایک جدید کورس تجویز کیا تھا اُس کے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ اسی طرز پر اُن کے فرزندوں کی تعلیم ہو۔ امیر احمد اب مشن اسکول مین پوری میں پڑھتا تھا اُس کو زیادہ امداد کی ضرورت نہ تھی۔ مولوی نظیر الحسن عم مکرم کی خدمت میں حاضر رہتے اور عدالتی کارروائی سے واقفیت پیدا کرتے تھے لہذا اس سال سے اُنھوں نے اپنی چھوٹی ہمشیر کے لڑکے وزیر احمد[1] کی تعلیم اپنے ذمہ لی۔ اُس کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہو چکی تھی مگر ہنوز انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ فارسی کی استعداد بھی تھوڑی ہی تھی مگر کیمیا ساز اُستاد نے چند روز میں مس خام کو کُندن بنا دیا۔ آج وہ صاحبزادہ گریجویٹ ہے اور درجہ اول کا تحصیلدار!!

اکتوبر ۱۸۹۴ء میں کاکوری تشریف لے گئے اور راقم کی تقریب عقد[2] میں شریک ہوئے۔ مراسم شادی سے فراغت کے بعد شاگرد کو مین پوری واپس کیا اور خود وطن میں مقیم رہے۔ چند ہفتوں کے بعد دونوں بھائی الہ آباد گئے ایل ایل بی کا امتحان دیا مگر "اصول قانون وانصاف" کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں فیل ہو گئے۔ اور ۱۸۹۵ء کے آغاز سے دوبارہ امتحان کے لیے تیاری شروع کی۔

آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی احمد حسن اب نو دس برس کے تھے اور ہنوز کاکوری میں مولوی عبداللہ خاں جلال آبادی سے پڑھتے تھے۔ مولوی انوار الحسن کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد حسن جو اپنے چچا زاد بھائی احمد حسن سے پانچ مہینے چھوٹے تھے وہ بھی اُن کے ہم سبق تھے۔ اب یہ دونوں لڑکے مین پوری بلائے گئے اور مولوی نور الحسن کی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی۔

مولوی محمد محسن کے دو بھانجے شیخ ابوالحسن اور عزیز الحسن (پسران شیخ مہدی علی صدیقی بجنوری) بھی تربیت کے لیے ان کے سپرد ہوئے۔ شیخ ابوالحسن بدو فطرت سے گنگ تھے۔ مولوی محمد محسن کی نگرانی میں انکو لکھنا پڑھنا سکھلایا گیا۔ وہ نستعلیق میں خوش نویس ہوئے اور اپنے دیہات کا حساب کتاب دیکھنے سمجھنے کے چند سال میں قابل ہو گئے۔

---

[1] منشی وزیر احمد بن حاجی رشید الدین علوی کاکوروی۔ تاریخ ولادت ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۹ھ روز یکشنبہ مطابق ۷ ستمبر ۱۸۸۲ء۔

[2] تاریخ عقد ۱۰ اکتوبر ۱۸۹۴ء مطابق ۸ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ۔

شیخ عزیز الحسن - مولوی احمد حسن و محمد حسن کے ساتھ عربی اور فارسی کی تعلیم میں شریک ہوئے اور چند روز کے بعد انھیں کے ساتھ انگریزی پڑھنے لگے۔ مختلف مولوی اور ماسٹر یکے بعد دیگرے مقرر کیے گئے لیکن اخلاق و عادات کی نگرانی مولوی نور الحسن بذات خاص کرتے تھے۔

مولوی محمد حسن کے پھوپھی زاد بھائی حکیم محب علی کے دو صاحبزادے منشی منظور علی اور مشکور علی اس زمانہ میں زیر تعلیم تھے۔ ان میں سے شیخ منظور علی سرکاری مدرسہ میں پڑھتے۔ اور انگریزی میں مدد لینے مولوی نور الحسن کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ اور مشکور علی۔ احمد حسن وغیرہ کے مولوی سے فارسی پڑھتے تھے۔

غرض اس زمانہ میں چھ لڑکوں کی تربیت اُستاد مرحوم کے سپرد تھی۔ خود قانون کے یاد کرنے میں مصروف رہتے اور اس قدر فرصت نہ پاتے تھے کہ ان سب لڑکوں کی طرف کافی توجہ کر سکیں۔ ایک خیر اندیش نے شکایت کی کہ آپ نے جس قدر کوشش امیر احمد کی تعلیم میں کی اتنی اپنے لڑکوں کے لیے کیوں نہیں کرتے تو ارشاد ہوا کہ "امیر احمد اکیلا تھا۔ اس وقت چھ سات لڑکے میرے سپرد ہیں۔ اگر ان سب کا سبق روزانہ سنوں تو اپنا کام کب کروں۔"

با ایں ہمہ نگرانی میں کوتاہی نہ تھی۔ خبر گیری رکھتے تھے کہ لڑکے لہو و لعب میں وقت ضائع نہ کریں۔ نماز پنجگانہ ادا کریں۔ صبح کو تھوڑی دیر تلاوت کلام مجید کریں۔ اور رات کو نو بجے سے پہلے بستر پر نہ جائیں۔ اس زمانہ میں محلسرا کا زنانہ حصہ خالی تھا۔ امیر احمد۔ وزیر احمد اور نظیر الحسن وغیرہ اُس حصہ میں رہتے تھے۔ رات کو نو دس بجے یکایک اُس طرف تشریف لاتے اور لڑکوں کے شوق کی جانچ کرتے تھے۔ اگر دیکھتے کہ لڑکے پڑھتے نہیں بلکہ باتیں کر رہے ہیں یا سو رہے ہیں تو سخت زجر و توبیخ کرتے تھے۔ احمد حسن وغیرہ کا سبق بھی گاہ گاہ سنتے اور مولویوں کو ضروری ہدایتیں فرمایا کرتے تھے۔

اس نگرانی سے سب شاگردوں کو فائدہ پہونچا۔ امیر احمد انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوا حالانکہ اُس سال مشن ہائی اسکول مین پوری سے سوائے اُس کے کوئی دوسرا طالب علم انٹرنس میں پاس نہ ہوا تھا۔ نتیجہ دیکھ کر فرمانے لگے کہ "اس کی ابتدائی تعلیم کام آئی ورنہ مدرسہ کی حالت تو اس شرمناک نتیجہ سے ظاہر ہے۔"

دوسرے شاگردوں نے بھی لیاقت و قابلیت میں ترقی کی۔ مگر خود اُستاد قانون پر زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ چھوٹے بھائی دسمبر ۱۸۹۵ء میں ایل ایل بی ہو گئے مگر وہ ناکام رہے۔ امتحان دینے الہ آباد گئے ہوئے تھے۔ وہیں سے دگگڑھ ضلع الہ آباد میں اپنے شیخ سلسلہ حضرت شاہ باسط علی قلندر کے مزار پر حاضری دی۔ واپسی کے وقت اجمیر شریف کی زیارت سے فیض اندوز ہوئے۔ روحانی برکتیں شاید حاصل ہوئی ہوں لیکن کوئی مادی نفع ظاہر نہ ہوا۔

امتحان میں فیل ہونے کا سخت قلق تھا۔ صحت پہلے ہی خراب تھی۔ دانتوں اور مسوڑھوں میں درد کا دورہ تقریباً ہر ماہ ہوتا تھا۔ قبض دائمی تھا۔ اب ناکامی کے رنج نے قلب و دماغ دونوں مضمحل کر دیے۔ کتب بینی ترک کی اور احباب کی صلاح سے تفریح طبع کے لیے موسیقی کا شوق پیدا کیا۔ قانون ستار کا ایک ماہر استاد نوکر رکھا اور اپنا بیشتر وقت ہارمونیم کی مشق میں صرف کرنے لگے۔ چند روز میں اصطلاحات فن پر عبور ہو گیا اور ہارمونیم کے اصول و قواعد سے کما حقہ واقفیت۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان کے زائچہ ولادت کے خانہ پنجم میں عطارد اور زہرہ کا اجتماع تھا اس لئے موسیقی کی طرف رغبت ہوئی لیکن دقیقہ شناس سمجھتے ہیں کہ کارکنان ازل نے شاعر ادیب بنا کر بھیجا تھا۔ زبان کی مہتم بالشان خدمت ان کے ہاتھوں مقدر تھی۔ کلام میں روانی نغمہ سے آشنائی کے بغیر نہیں آتی۔ لہذا ضروری تھا کہ ان کو موسیقی کا ماہر بنایا جائے اور نغمہ و سرود سے ذوق پیدا کرایا جائے۔ وہ پابند شریعت۔ متقی اور پرہیزگار تھے۔ شباب کے وقت محفل رقص و سرود سے احتراز کا عہد کر چکے تھے۔ اعزہ اور احباب کے بیاں بھی باوجود اصرار شدید کے ناچ کے جلسوں میں شریک نہ ہوتے تھے اس لئے اُن کو موسیقی سے لطف اندوز بنانے کی بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ وہ امراض گوناگوں میں مبتلا کیے جائیں اور دوا کے طور پر سرود و نغمہ کا چاشنی خور بنایا جائے۔

گر خضر در بحر کشتی را شکست　　　صد درستی در شکست خضر ہست
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

مولوی انوارالحسن نے وکالت شروع کر دی اور والد ماجد کا کام سنبھالا۔ یہ مکان پر تنہا رہتے اور ہارمونیم سے وقت بچتا تو انگریزی ناول اور رسالے پڑھا کرتے تھے۔

بدایوں کے ایک موزوں طبع رضی الدین نام تحصیل مین پوری میں قانونگو تھے۔ وہ اکثر خدمت میں حاضر رہتے اور اپنا نعتیہ کلام سنایا کرتے تھے۔

محکمہ نمک کے ایک خوشرو نوجوان انسپکٹر بھی اکثر تشریف لاتے تھے۔ وہ شہر کی ایک پردہ نشین شریف زادی پر عاشق تھے۔ لڑکی تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی۔ انسپکٹر صاحب سے خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ ایک محبت نامہ میں عاشق نے لکھا تھا۔

خون جب تھوکتا ہوں پورے حنا آتی ہے　　　جس پہ پسی تھی تری منہدی وہی سل ہے مجھے

شعر میں معنی ہوں یا نہ ہوں مگر وصف یہ تھا کہ ایک مصرعے میں معشوقہ اور دوسرے میں معشوقہ کی ہمشیر کے خوبصورت ناموں کا ایک ایک حصہ نظم ہو گیا تھا۔

وہ مولوی نورالحسن کو اپنی داستانِ عشق سُناتے اور معاملاتِ محبت کے رو براہ ہونے کے لیے مشورے طلب کیا کرتے تھے۔ اُستاد مرحوم شکستن خاطرِ احباب گناہ سمجھ کر صلاح نیک سے دریغ نہ کرتے تھے۔ انجام یہ ہوا کہ دوستوں کی سعی مشکور ہوئی اور عاشق و معشوق کا نکاح ہوگیا۔

۱۸۹۶ء قریب ختم کے آیا مگر موسیقی سے سیری نہ ہوئی تھی۔ امتحانِ وکالت کے لیے فیس روانہ کرنے سے انکار کیا۔ والد ماجد نے ارشاد فرمایا کہ "ایل ایل بی کے لیے تیار نہیں ہو سکتے ہو تو ہائیکورٹ کے امتحان میں جو نسبتاً آسان ہے شریک ہوجاؤ" مگر یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور خرابی صحت کے باعث زیادہ اصرار بھی نہیں کیا گیا۔

اس عرصہ میں ترکی اور یونان کی لڑائی شروع ہوئی۔ روزانہ اخبارات پڑھتے اور ترکی افواج کی کامیابی پر اظہارِ مسرت فرماتے تھے۔

معمول تھا کہ گرمیوں کی تعطیل میں راقم حروف جب پوری جاتا تو اُس سے گھنٹوں جرح کرکے مختلف حیلوں اور منطقی چالوں سے شاگرد کی اخلاقی حالت، مذہبی پابندی اور انگریزی قابلیت کی جستجو کیا کرتے تھے۔ اُس سال راقم کے چند مضامین لکھنؤ کے بعض اخبارات میں شائع ہوئے تھے جس سے بعض بزرگانِ وطن کی اہانت ہوتی تھی لہٰذا زبان قلم پر قابو رکھنے کی نصیحت کرتے اور ملال آفریں مضمون نگاری سے منع فرماتے تھے۔ راقم کو تاریخ گوئی کا شوق تھا اُن کے اشارے سے ترکوں کی کامیابی پر ایک مصرعہ تاریخ کہا گیا۔

"ہلالِ تیغ چمکا بدر میں گویا محمدؐ کا"

مگر اُس میں ۹۹ کا تخرجہ تھا۔ اگر تاریخ پوری کی جائے تو مصرعہ ناموزوں ہوا جاتا تھا۔ مولوی محمد محسن سے عرض کی گئی۔ اُنھوں نے اس خوبی سے تضمین کی کہ تخرجہ پرلطف ہوگیا۔ سُنیے:

طلب ہے جنگ کا تاوان یوناں سے یہ مشکل ہے
خزانہ میں نہیں اک روپیہ باقی کسی مد کا

کہیں ننانوے کی پھیر سے تاریخ یونانی
ہلالِ تیغ چمکا بدر میں گویا محمدؐ کا

قطعہ تاریخ کے دوسرے اشعار نقل کرنا بے سود ہے لیکن ایک شعر اور لکھ دینا چاہیے کیونکہ اُس کے بغیر مصرعۂ تاریخی کا لطف آشکارا نہیں ہوتا۔

ہلالی معرکہ ہے شہ کا لَا یَعلُوْا وَلَا یُعلٰی
ہے رشتہ معرکہ سے بدر کے جس کے اب جد کا

"اکین یونین کلب" نام ایک دار التفریح جب پوری میں مدت سے قائم تھا۔ وہاں مولوی نورالحسن بھی ٹینس کھیلنے جاتے تھے۔ اُس کے علمیہ مذاکروں میں شریک ہوتے اور انگریزی میں تقریریں کیا کرتے

تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی شصت سالہ جوبلی کا جشن ہوا۔ اُس میں بھی انگریزی حکومت کے برکات پر ایک معنی خیز تقریر کی۔ صحت کسی قدر بہتر ہوئی۔ دماغ میں قوت آئی تو دوبارہ قانون کی طرف توجہ مبذول کی۔ ہارمونیم چھوڑا اور سارا وقت کتابوں کی ورق گردانی میں صرف کرنے لگے۔ تیسری بار امتحان وکالت میں شرکت کا عزم بالجزم کیا۔

جیتے ہیں تو اک روز پلٹ جائے گا پانسہ ہمت نہیں ہارا ہے دلِ زار ابھی تک

دسمبر ۱۸۹۸ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور طالب علمی کا عہد ختم ہوا۔

پیشۂ وکالت کا آغاز | موسم بہار ۱۸۹۹ء سے وکالت شروع کی۔ چھوٹے بھائی سال ڈیڑھ سال سے عدالت دیوانی میں کام کرتے تھے اور والد ماجد کے موکل ان کے ثنا خواں تھے۔ یہ فوجداری کے مقدمات کی پیروی کرنے لگے اور حکام ضلع سے میل جول بڑھایا۔

سید زین الدین ایم۔ اے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو کر مین پوری آئے۔ علی گڑھ کالج کے گریجویٹ سرسید کے دست راست کے فرزند اور صوم و صلوٰۃ کے پابند!! ان کی مذہب پرستی اور خوش اعتقادی کا شہر میں شہرہ ہوا۔ مولوی نور الحسن سے دوستانہ مراسم ہوئے روزانہ ایک دوسرے سے ملاقاتیں ہونے لگیں مگر وکالت میں کامیابی نہ ہوئی اور پیشہ میں فروغ حاصل نہ ہوا۔

مولوی انوار الحسن مین پوری کی کساد بازاری سے دل برداشتہ ہو کر جنوری ۱۸۹۹ء میں لکھنؤ چلے گئے اور یہ دیوانی عدالت میں بھی حاضری دینے لگے۔

راقم الحروف اسی سال بی اے پاس ہوا تھا۔ ملازمت کی جستجو میں مین پوری گیا۔ اُنھوں نے نوکری کی تلاش سے منع کیا اور قانون یاد کرنے کی صلاح دی۔ ضابطۂ دیوانی کے دلچسپ نکتے بیان فرماتے اور طرح طرح سے پیشۂ وکالت کے محاسن دکھاتے تھے مگر " با سیہ دل چہ سود گفتن وعظ" شاگرد پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے مولوی محمد محسن سے علم جفر کا درس لیا اور حکام کو مسخر کرنے کے اعمال سیکھے۔ وہ لکھنؤ واپس جانے لگا تو ضابطۂ دیوانی یاد کرنے اور ہائیکورٹ کے امتحان میں شریک ہونے کی فہمائش کی۔ شفقت و محبت سے حصول دولت کا ایک عمل " شجرۂ زر" نام جو اُن کو مارہرہ ضلع ایٹہ کے ایک بزرگ شاہ ابو الحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہدیتاً پہونچا تھا رخصت کے وقت مرحمت فرمایا۔ اُس عمل کے خاتمہ پر تحریر تھا " برخوردار نور الحسن را زکوٰۃ معاف کردہ شد۔ اگر دیگر راہ بند زکوٰۃ معاف نہ کنند" ارشاد فرمایا کہ تم کو اس عمل کی زکوٰۃ دینا چاہیے لیکن اس قدر محنت نہ ہو سکے تو بغیر زکوٰۃ کے ہی اس کو پڑھا کرو۔ افسوس ہے کہ راقم اس بیش بہا عطیہ سے اپنی کاہلی

اور آرام پسندی کے باعث کبھی مستفید نہ ہوا۔

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل — کہ خضر از چشمۂ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اُس وقت تک مین پوری میں ریل نہ تھی۔ اٹاوہ شکرم پر جانا ہوتا تھا اور وہاں سے ٹرین ملتی تھی۔ مولوی نظیر الحسن مین پوری میں مقیم تھے۔ اپنے لڑکپن کے دوست کو رخصت کرنے شکرم کے اڈے تک آئے اور دعا دی کہ جس طرح امتحانات میں پاس ہوئے ہو ویسے ہی حصول ملازمت میں بھی کامیابی ہو۔ شکرم روانہ ہوئی تب اُنھوں نے واپسی کے لیے مُنھ پھیرا اور اُس محبت کرنے والے دوست سے راقم کی یہی آخری ملاقات تھی۔ دوسرے ہی مہینہ میں ۷ رذی الحجہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۸۹۹ء کو تین روز بیمار رہ کر وہ فرشتہ صفت رفیق ملا اعلیٰ میں منزل نشین ہوگیا۔

نہ تھے تیرے مرنے کے یہ دن نظیر — خدا جانے کس کی نظر کھا گئی[1]

اس سانحۂ جانفرسا نے اعزہ واقارب کا دل ہلا دیا۔ چچا دل خستہ اور نیم جاں ہوگئے۔ مولوی نور الحسن بمشکل ہوش و حواس درست رکھ سکے۔ حیات مستعار کی بے اعتباری دل پر نقش ہوئی اور بندگی حق کا شوق بڑھا۔

والد ماجد وکالت ترک کر چکے تھے یہ موکلوں کے اصرار سے بادل ناخواستہ کچہری جاتے اور مقدمات کی پیروی کرتے تھے۔

حضرت اکبر حسین الہ آبادی ڈسٹرکٹ جج ہو کر مین پوری آئے۔ خود سخن گو سخن فہم اور مولوی محمد محسن کے قدر شناس تھے۔ کئی بار مداح رسول کی زیارت کے لئے دولتکدہ پر تشریف لائے۔ وہ بھی بازدید کے لئے اُن کی کوٹھی جاتے اور اپنے بیٹے پوتوں کو بھی لے جاتے تھے۔ اکبر مرحوم بڑے دیندار تھے اور فقہ پر عبور تھا۔ مولوی احمد حسن خلف مولوی نور الحسن اُس وقت شرح وقایہ پڑھتے تھے اُن کا دینیات میں امتحان لیا اور لڑکے کی ذہانت کی باپ دادا سے تعریف کی۔ کبھی کبھی مولوی نور الحسن کو اپنا تازہ کلام سُناتے اور اُن سے "شفاعت و نجات" کے اشعار سُنا کرتے تھے۔

مولوی نظیر الحسن کی جوانا مرگی کا غم فراموش نہ ہوا تھا کہ ۱۷ رشعبان ۱۳۱۸ھ (دسمبر ۱۹۰۰ء) کو اُن کی ہمشیرہ یعنی اہلیہ مولوی نور الحسن کا انتقال ہوگیا۔ دو لڑکے احمد حسن۔ حامد حسن اور دو لڑکیاں اس بطن سے یادگار رہیں۔ چھوٹی لڑکی شیر خوار تھی اور ماں کے وداع کے وقت صرف ۲۰ یا ۲۲ دن کی تھی۔ اُس کی پرورش مولوی محمد احسن مرحوم کی بیوہ (یعنی لڑکی کی نانی) نے اپنے ذمہ لی۔

[1] دوسرے مصرعہ کے آخری چار لفظوں سے تاریخ نکلتی ہے یعنی "کس کی نظر کھا گئی" ۱۳۱۶ھ

مولوی نورالحسن اس مصیبت سے سراسیمہ و بدحواس ہو گئے۔ خانہ ویرانی کی آفت ناقابل برداشت ہے اور اس زحمت و کلفت کا صحیح اندازہ وہی کر سکتا ہے کہ ہمیں مصیبت گرفتار آید۔

اُن کی صورت دیکھ کر جیتے تھے تم تو لے جلیل		اب کہو کیا دل پہ گزری اُن کا مدفن دیکھ کر

بھائی بہنوں نے نکاح ثانی کے لیے اصرار شروع کیا۔ یہ اولاد کو تکلیف پہونچنے کا اندیشہ ظاہر کرتے اور جدید ذمہ داری سے انکار کرتے تھے۔ آخر کار والد ماجد کو دخل دینا پڑا اور اُن کے حکم سے مجبور ہو کر ازدواج پر راضی ہوئے۔

۲۴ رجب ۱۳۱۲ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۹۴ء کو منشی محفوظ علی علوی ڈپٹی کلکٹر کی بڑی صاحبزادی سے نکاح ہو گیا۔

خانہ آبادی کے بعد جدید ذمہ داریوں کا احساس ہوا۔ وکالت میں فروغ حاصل کرنے کی تمنا ہوئی۔ نظائر قانونی کے مطالعہ میں وقت صرف کرتے اور موکلوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے۔ ذہن رسا تھا اور حاضر جوابی کی نعمت فطرت نے عطا کی تھی۔ جرح خوب کرتے اور فریق مخالف کے بیجا سوالات پر دنداں شکن اعتراضات وارد کرتے تھے۔

مولوی محمد محسن کی ایک قدیم موکلہ (رانی کشوری رئیسہ لکھنان ضلع اٹاوہ) کا ایک سخت نزاعی مقدمہ داخلخارج کا اٹاوہ میں چل رہا تھا۔ یہ مین پوری سے اس مقدمہ کی پیروی کے لئے اٹاوے بھیجے گئے اور باوجودیکہ عدالت کا میلان فریق مخالف کی طرف تھا قانون شہادت کے ایسے دقیق اور نازک نکتے اُنھوں نے برسر اجلاس بیان کیے کہ حاکم مرعوب ہو گیا اور تمام ضلع میں اُن کی قانوندانی کی دھوم مچ گئی۔

اسی زمانہ کے قریب "بابائے خلافت" مولانا شوکت علی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اُس وقت محکمۂ افیون میں سب ڈپٹی ایجنٹ تھے۔ انگریزی لباس زیب تن رہتا تھا۔ کرکٹ کا شوق تھا۔ مکان پر گیند بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ فرنگی معاشرت اور مذہب سے بیگانگی!! مولوی نورالحسن

سلہ وہ منشی امتیاز علی مرحوم وزیر ریاست بھوپال کے چھوٹے بھائی تھے۔ منشی سجاد حسین کے جلیس وہم صحبت تھے۔ اودھ پنچ اُن کے مشورے سے جاری کیا گیا اور عرصہ تک اُس کی نامہ نگاری کرتے رہے۔ ایک کتاب انگریزی اور اُردو میں سلطنت روس کی مذمت میں شائع کی۔ گورنمنٹ نے عہدۂ ڈپٹی کلکٹری سے سرفراز کیا۔ پنشن لے کر خانہ نشین ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ وہ بڑے طباع۔ عالی دماغ اور مدبر تھے۔ کیمیا سازی کا بھی شوق تھا اور اس تلاش میں فقیروں اور جوگیوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

"احیاء العلوم" کے شیدائی۔ تو ہے ہنسوڑ میں ہوں مُقطّع میرا تیرا میل نہیں!!! اتفاق سے اُس وقت مین پوری کے محکمہ افیون میں بھی ایک مسلمان افسر تھے اور وضع قطع میں بابائے خلافت کے مقلد۔ اُن پر تغلب اور خیانت مجرمانہ کا مقدمہ چلا۔ مولوی نور الحسن نے بہ تقاضائے اخوت اسلامی اُس مظلوم کی طرف سے حسبۃً للہ پیروی کی۔ سشن جج بھی حشمت اللہ تھے جو اُستاد مرحوم کی بہت خاطر و تکریم کرتے تھے۔ بہ ہزار کوشش اُس بے گناہ کی گلو خلاصی ہوئی اور اس وسیلہ سے چند بار مولانا شوکت علی سے صلاح مشورے کی نوبت آئی۔

اسی دوران میں مولوی نور الحسن نے اپنے جد امجد کے عطا فرمودہ اعمال و وظائف کی مشق شروع کی۔ نماز تہجد و سحر خیزی کی عادت ڈالی۔ تین بجے شب سے بیدار ہو کر طلوع آفتاب تک اوراد و اشغال میں مصروف رہتے اور دن میں سوائے نماز پنجگانہ کے کوئی وظیفہ نہ پڑھتے تھے۔ دن کا بیشتر حصہ فکر معاش اور رات کا آخری ٹکڑا عبادت کے لیے وقف کیا اور یہ معمولات زندگی بھر قائم رہے۔

دعائے حزب البحر کے عامل تھے اور اپنے عزیزوں کو اس ورد کی ہدایت کرتے تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس دعا کی اجازت دی اور مداومت کی تاکید کی۔

بڑی تعطیلوں میں وطن تشریف لاتے اور اعزہ کو شرف ملاقات سے بہرہ مند فرماتے تھے ورنہ سال کا بیشتر حصہ مین پوری میں صرف ہوتا تھا۔

مولوی نظیر الحسن کے انتقال کے تقریباً دو مہینہ بعد اُن کی بیوہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ بڑی منتوں اور مرادوں کا نونہال تھا۔ نبی حسن نام رکھا گیا اُس کی تہنیت ولادت کی یادگار میں ہر سال وسیع پیمانہ پر وطن میں ایک مجلس میلاد شریف ۲۰ رجب کو منعقد ہوتی تھی جس میں اُستاد مرحوم شریک ہوتے اور نعت خوانی فرماتے تھے۔ اُس کی تقریب بسم اللہ خوانی دھوم سے ہوئی۔ شاہ سلیمان پھلواروی اور علامہ شبلی نعمانی نے بھی قدم رنجہ فرمایا۔ ان باکمالوں سے ظاہری ملاقات کا پہلا موقع تھا۔ شاہ سلیمان کا وعظ ہوا۔ علامہ شبلی نے سیکڑوں اشعار فارسی اور اُردو کے سُنائے۔ مثنوی شفاعت و نجات دل لگا کر سُنی اور خوب داد دی۔ راقم الحروف کا ایک مضمون "اردو شاعری" پر اردوئے معلّٰی علیگڈھ میں اُسی زمانہ کے قریب شائع ہوا تھا اور علامہ کی نظر اقدس سے گذرا تھا اُستاد مرحوم سے اُس مضمون کی تعریف کی اور مضمون نگار سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ علامہ تعریف کرتے تھے اور استاد فرماتے تھے کہ "جی ہاں لڑکا ہے۔ خوب لکھا ہے"۔

المختصر، مین پوری میں مستقل قیام تھا۔ صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ معدہ کمزور تھا۔ مسوڑھوں کے

درد کا دورہ ہوا کرتا تھا۔ دانتوں کی تکلیف سے عاجز آکر ایک دن سب دانت اکھڑوا ڈالے اور مصنوعی دانت استعمال کرنے لگے۔

ادب اُردو سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ انگریزی اخباروں کی مراسلہ نگاری بھی ترک کر دی تھی۔ البتہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں انہماک بدستور رہا۔

منشی وزیر احمد اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ چلے گئے تھے اور کیننگ کالج میں پڑھتے تھے۔ منشی منظور علی سلسلۂ تعلیم ختم کر کے محکمۂ زراعت میں نوکر ہو چکے تھے۔ چند روز کے بعد ہندوستان میں مؤلف "واقعات کربلا" کے لقب سے مشہور اور بزم احباب میں "منجم" کے خطاب سے معروف ہونے والے تھے۔ صرف احمد حسن۔ محمد حسن اور عزیز الحسن کے لیے نگرانی کی ضرورت تھی۔ وہ انگریزی مدرسہ میں پڑھتے تھے مگر کبھی کبھی اُن کا امتحان لیا جاتا تھا اور پابندی صوم و صلوٰۃ کی تاکید ہوتی تھی۔ اب اپنے چھوٹے صاحبزادے مولوی حامد حسن اور بھتیجے مولوی مصطفیٰ حسن کو جو اُس وقت سات آٹھ برس کے تھے مین پوری بلایا۔ ان کی تربیت کی طرف توجہ مبذول کی اور عربی پڑھانے کے لیے مولوی مقرر کیے۔

اس عرصہ میں مولوی انوار الحسن لکھنؤ کا قیام ترک کر کے اُناؤ چلے گئے تھے اور وہاں اُن کی وکالت روز افزوں ترقی پر تھی۔ مگر مولوی نور الحسن ابھی تک اپنے پیشہ میں کامیاب نہ تھے۔ موروثی جائداد کی آمدنی اتنی کثیر تھی کہ فکر معاش سے فراغ تھا۔ راقم الحروف سے ایک دن برسبیل تذکرہ ارشاد فرمایا تھا کہ میری آمدنی ہزار روپیہ ماہوار سے کسی طرح کم نہیں ہے اور ایک تحصیلدار کی تنخواہ میں لڑکوں کی تعلیم میں خرچ کرتا ہوں۔

اطمینان سے عبادت کرتے اور راحت سے زندگی گذار رہے تھے کہ ۴ راپریل ۱۹۱۵ء سے مولوی محمد محسن اسہال کبدی میں مبتلا ہوئے۔

اُن کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ امراض پیری میں عرصہ سے گرفتار تھے۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے مگر دل حب رسول سے جوش زن تھا اور دماغ فکر نعت سے گرم ۱۹۱۰ء میں ایک صوفیانہ نظم "انیس آخرت" لکھی تھی جس کی تشبیب میں در پردہ اپنے عشق و محبت کا اظہار تھا:۔

نہیں آساں اُٹھانا عشق کی چوٹیں دل و جاں پر	کلیجا ہاتھ بھر کا لائے جو ہو مرد میداں کا
ستم محبوب سے پہونچے تو سمجھے مہربانی ہے	چلے سر پر جو آرہ بار ہو گردن پہ احساں کا
یہ وہ مقتل ہے جس میں اہل دل مرتے ہیں مرنے پر	نکلنا جان ہی کا ہے نکلنا پورے ارماں کا

مرض کو طول ہوا۔ ایک عزیز نے دریافت خیریت کے لئے خط بھیجا تو جواب میں اپنے قلم سے تحریر فرمایا:۔

اسی دار الشفا میں ہے یہ نسخہ حفظ صحت کا — کہ صد ہا درد ہوں لیکن خیال آئے نہ درماں کا

اشتداد مرض کی خبر سن کر مولوی انوار الحسن اُناؤ سے آ گئے۔ دونوں صاحبزادیاں حاضر ہوئیں۔ مولوی ذکی الدین اور منشی رشید الدین بھی پہونچ گئے۔ دوا علاج۔ تیمارداری اور خدمت گذاری میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی گئی لیکن

ہر دوا در کار خود سے کار بود — ضعف از حسبِ جواہر می فزود

۲۳ اپریل کو بعد نماز مغرب مولوی نور الحسن سے فرمایا کہ "مبطون" کو درجۂ شہادت نصیب ہونے کی بابت ایک حدیث میں بشارت ہے، اُس کی تفصیل کسی کتاب سے تلاش کر کے سُناؤ۔ خلف رشید نے دُرِ مختار سے باب الشہید نکال کر پڑھا۔ دوسرے روز دوشنبہ کے دن ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ کو دس بجے دن کے "راہی باغِ جناں ہوئے" اور عیدگاہ مین پوری کے صحن میں دفن کیے گئے۔

راقم الحروف اُس زمانہ میں انسپکٹر تا نونگویان تھا اور کیرانہ ضلع مظفر نگر کا دورہ کر رہا تھا۔ وہیں انتقال کا تار پہونچا۔ جمنا کو عبور کر کے پانی پت گیا اور وہاں سے بذریعہ ریل مین پوری آیا۔ سوم کا دن تھا۔ فاتحہ خوانی ہو چکی تھی۔ شہر کے وضیع و شریف رخصت ہو گئے تھے۔ محل میں سناٹا تھا۔ ہر در و دیوار پر اُداسی چھائی تھی۔ دونوں صاحبزادے محزون و غم زدہ بیٹھے تھے۔ راقم روتا ہوا پہونچا تو وہ بھی اشکبار ہوئے۔ دیر تک متوفی کے آخری وقت کا احوال بیان کرتے رہے۔ سہ پہر کو مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ "مزار مولوی محمد محسن غفر لہ" بے ساختہ تاریخ ذہن میں آئی۔ اُستاد سے عرض کی کہ یہ تاریخ لوح پر کندہ کرائی جائے۔ ارشاد ہوا کہ لوح پر کوئی نفیس نظم لکھی جائے گی اور عنوان پر یہ تاریخ بھی کندہ کرا دی جائے گی۔

ایک ہفتہ کے اندر سب مہمان رخصت ہو گئے۔ مولوی احمد حسن اُس سال انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے۔ وہ راقم کے ساتھ ہی شکوہ آباد تک گئے اور وہاں سے آگرے چلے گئے جو امتحان کا مرکز تھا۔ کامیابی کے بعد وہ علیگڈھ پڑھنے گئے۔ شیخ ابو الحسن اور عزیز الحسن کو اُن کی والدہ نے بجنور طلب کر لیا۔ مولوی محمد حسن ایک سال تک یتیم رہے اُس کے بعد انٹرنس پاس کر کے وہ بھی لکھنؤ چلے گئے اور دونوں بھائی کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ حضرت کے دو خورد سال لڑکے مولوی حامد حسن اور مصطفیٰ حسن اُستاد مرحوم کی نگرانی میں رہے اور مین پوری کی دنیا بدل گئی۔

داڑھی مونچھ

کچھ دن ہوئے میں نے "دکن ٹائمز" میں ایک مزاحیہ مقالہ "مونچھوں" کے متعلق دیکھا تھا، مقالہ نگار کی جدت طرازی جگہ جگہ بہت دلچسپ تھی لیکن داڑھی کے شامل نہ ہونے کے باعث مقالہ قدرے تشنہ تھا، اُسے پڑھ کر میں نے بھی "بشمول ریش" طبع آزمائی کی ٹھان لی اور نتیجہ ملاحظے میں پیش ہے۔ اس کو ترجمہ یا تلخیص تو نہیں کہا جا سکتا تاہم مجھے اس کا اقرار ہے کہ جگہ جگہ میں نے انگریزی مقالے میں مندرج واقعات سے مدد ضرور لی ہے۔

خاکسار "م ۵۶۰"

ترقی اور تہذیب کے اس کیسر غلط تخیل والے زمانے میں داڑھی مونچھ کی بقا یا فنا کا مسئلہ بھی ایک خاص اہمیت کا مالک ہے، شاید دورِ حاضر کے "نام نہاد تمدن" مردنے ان دونوں کا صفایا کرا کے دورِ حاضر کے "ترقی پذیر" طبقۂ صنفِ نازک کے مطالبۂ مساوات کو سب سے زیادہ سراہا ہے۔ موجودہ دور "مساواتِ اصناف" کا دور ہے اور گذشتہ پچیس سال میں "جنس لطیف" نے کشمکش حیات کی ہر رزمگاہ میں "جنس کثیف" کے دوش بدوش کام کرنے کی تعلیم حاصل کی ہے۔ آج زندگی کے ہر شعبے اور حیات کے ہر پیشے میں عورتیں اچھی خاصی تعداد میں نظر آتی ہیں۔ کوئی تجارت اُن کے لیے مشکل نہیں، کوئی پیشہ اُن کے واسطے محال نہیں، قانون داں اُن میں پائے جاتے ہیں، انجینیر اُن کی صف میں ملتے ہیں، معلم اُن کے زمرے میں موجود ہیں، طبیب اُن کے طبقے سے نکلے جاسکتے ہیں، (شاید موخر الذکر کے متعلق مجھ سے فروگذاشت ہوئی کیونکہ طب میں تو عورت کو ہمیشہ سے مہارت حاصل تھی) یہ سب سچ ہے یہ طوفان ابر اٹھا تھا اور دیکھتے دیکھتے تمام اُفقِ عالم پر چھا گیا، اور گو ابھی مشرقی ممالک مغرب کی برابری کے مدعی نہیں ہوسکتے جہاں عورتیں اب سول سروس میں بھی شریک ہونے کی مجاز ہیں تاہم "منزل مقصود" ہی کی طرف رُخ ہے رہی ہے۔ ع۔ آخر تو پیچھے پیچھے اُسی کارواں کے ہیں
اگر چارلس لنڈبرگ نے مرد ہوا بازوں کی صف میں ایک خاص امتیاز حاصل کیا تھا تو مسز امی جانسن مالیسن نے عورت ہوا بازوں کے زمرے میں وہی نام پیدا کیا ہے، برطانوی دارالعوام میں اگر مسٹر چرچل ہندوستانی آزادی کے مخالفین کے سرِ گروہ ہیں تو ڈچز آف ایتھول بھی تو انہی کی جانب سے اس مفتخر عہدے کی کرسی نشین ہیں، گول میز کانفرنس میں اگر پنڈت مالوی نے ہندوستانی قوم پروروں کے پردے میں ہندو مہاسبھا کی نمائندگی کی تھی تو بیگم شاہ نواز نے بالکل بے پردہ ہو کر ہندوستانی عورتوں کی رہنمائی کا بارِ گراں اپنے شانوں پر اُٹھایا تھا، اور ابھی زیادہ دن نہیں گذرے جب جنگ حبش واطالیہ کے دوران میں حبش کی ماؤں

بیویوں اور بیٹیوں نے میدان کارزار میں اپنے بیٹوں، شوہروں اور باپوں کے دوش بدوش استادہ ہوکر لڑائی میں برابر کا حصہ لیا۔ غرض مفکرین کی نظر میں اب مرد اور عورت میں کوئی چیز ما بہ الامتیاز نہیں رہی ہے حتے کہ مغرب کے "متمدن" ممالک اور جاپان کے مخصوص کلبوں کے داخلوں پر بھی اب بجائے اس نوٹس کے کہ "عورتوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے" یہ نوٹس آویزاں ہونے لگے ہیں کہ "ہندوستانیوں اور کتوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں" یعنی ہر شعبۂ حیات میں بے بس اور بے یارومددگار مرد کو "دندان سگ" اور "عورت کی قینچی" سے مقابلہ کرنے کے واسطے یکہ وتنہا چھوڑ دیا گیا ہے درانحالیکہ ابھی اس غریب کو اس کا بھی صحیح اندازہ نہیں کہ دونوں میں سے کونسا زخم زیادہ مسموم اور کس کے کاٹے کا علاج مشکل تر ہے۔

لیکن گو عورت نے ہر میدان میں مرد کو پچھاڑ دیا تھا (استثنائے کلیہ کا ثبوت ہی ملتا ہے) تاہم فطرت کے روبرو وہ سر جھکانے پر مجبور تھی، اس نے ہر شعبۂ حیات میں کامیابی کے ساتھ مرد کی نقل اتاری۔ ہر صیغۂ زندگی میں بڑے حسن سے مرد کا خاکہ اڑایا، اور کہیں اسکو ایسی دقتوں سے سابقہ نہیں پڑا جن پر وہ آسانی سے ظفریاب نہیں ہو سکتی تھی، وہ مرد کا سا لباس پہننے لگی، مرد کے سے بال کٹوانے لگی، مرد کی طرح حقے اور سگریٹ کا استعمال کرنے لگی، مردوں کے کھیل تماشوں میں حصہ لینے لگی لیکن باوصف اسکے ایک چیز میں مرد سے ہیٹی رہی، وہ منہ پر داڑھی مونچھ نہیں پیدا کر سکی، اس کا "بالائی لب" "گنج" کے مرض سے صحت نہ پا سکا "عارض" بے نموئی" کے عیب کو نہ مٹا سکے، اور ادھر مرد کا یہ رنگ کہ اس کی مونچھوں کی "اینٹھ" میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہی گیا، داڑھی کے "حسن" میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہی ہوتی رہی، اور اس میدان میں وہ بلا شرکت صنفے اپنی برتری کے جھنڈے اڑاتا رہا۔ لیکن بالآخر اسی جولان گاہ میں فطرت کی اس "شریف ترین آفرینش" ــــ مرد ــــ کی فطری فیاضی کا اعلےٰ ترین مظاہرہ دیکھنے میں آیا، اس نے اپنے اس "فطری تفوق" سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا اور بلا لحاظ اس امر کے کہ اس کے "صنفی امتیازات" پر روزانہ کتنی غاصبانہ یورشیں ہو رہی ہیں اور اس کے حقوق کس کس طرح پامال کیے جا رہے ہیں، اس نے اس حسین دیوی کی بنائی ہوئی "قربان گاہ ادعائے مساوات" پر اپنے واحد باقی امتیاز ــــ داڑھی مونچھ ــــ کو بھی بخوشی بھینٹ چڑھا کر صرف اس ایک ایثار سے "جنس لطیف" کو پوری پوری طرح اس کا اہل بنا دیا کہ وہ ہر طرح مرد کے ہم پلہ ہو سکے۔ اب روز صبح کو ہر مرد کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے اس خود ساختہ مندر میں جا کر کچھ دیر پوجا پاٹ کرے یعنے "جنس لطیف" کو گراں گذرنے والے اس "صنفی افتخار" کی "مرئی شہادت" کو برباد کر دے گویا "سفر حیات" کے ہر حصے (دن) کا آغاز کرے تو صاف اور سادہ ٹکٹ کے ساتھ۔

دیکھو اس عہد کے مخنث کو		مرد خوش حال اسکو کہتے ہیں
چار ابرو کا سب صفایا ہے		فارغ البال اسکو کہتے ہیں (اکبر الہ آبادی)

اگر آج ہمارے باپ دادا کو چند لمحوں کے واسطے از سرِ نو زندگی عطا کی جا سکتی اور وہ لحد کے "خواب گراں بار" سے جاگ کر ہم لوگوں کی "ہیئت کذائی" کو ملاحظہ کر سکتے تو شاید اُن کو سب سے زیادہ اچنبھا اور غم و غصہ ہمارے اسی فقدان پر ہوتا جس کی خاطر اُن کے عہد کے مرد اتنی محنت اور اتنی توجہ کرنے کے عادی تھے کیونکہ درحقیقت اُس زمانے میں داڑھی مونچھ "مردانہ صفات" اور "صنفی افتخار" کا نشان متصور ہوتی تھیں، بالفاظِ دیگر یہی دونوں "زیبائشیں" مرد کی شخصیت کا پیمانہ سمجھی جاتی تھیں "شدنی خوش دامنیں" اپنے "شدنی داما دوں" کی مونچھوں کے "پیچ و خم" اور داڑھیوں کی "فراخی" اور "گلدمی" کا ہر ممکن موقع پر بغور مطالعہ کیا کرتی تھیں اور جس طرح ہر انسان کی پوشاک اُس کے خیاط کے کمالات کی آئینہ دار ہوتی ہے یا اُسکا لب و لہجہ اُس کے وطن مالوف کے محل کا، اور اُس کے اخلاق اُس کی تعلیم و تربیت کا، ٹھیک اسی طرح مرد کی داڑھی مونچھیں اُسکے تمام و کمال عیوب و صفات کے لیے جام جہاں نما کا کام کرتی تھیں، اور انھیں سے مرد کے جملہ خصوصیات روشن ہوا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں مونچھ رکھنے کے طریقوں اور داڑھی کی "بوقلمونی" کی کوئی انتہا نہیں تھی، مونچھیں، "نمائشی"، "محض" "برائے بیت"، دھبوں سے لے کر جاپانی امیرالبحر کی طرح "چھ فیٹ" تک ہوتی تھیں۔ داڑھی "قوس قزح" کے سات رنگوں کی ترجمانی کیا کرتی تھی اور مہندی کے گہرے سُرخ سے لے کر (ماورائے نارنجی کے متعلق ابھی تحقیق نہیں ہو سکی ہے) "خضاب زدہ" گہرے سیاہ یا اودے (بالائے بنفشی کی بابت بھی کوئی بوثوق اطلاع نہیں) تک ہر رنگ عورت کی چُندری یا مرد کی داڑھی میں مل سکتا تھا۔ مونچھ کی "توڑ مروڑ" میں کسی خاص وضع کو انتخاب اور اختیار کر کے مرد گویا اپنی جملہ خصوصیات کا اظہار کر دیا کرتا تھا، مثلاً "غلطی ہوئی معاف کیجیے گا" والی مونچھوں والے عموماً بہت صلح کل اور صلح جو مرد ہوتے تھے، علیٰ ہذا داڑھی کی نوک پلک بھی مرد کے تمام عیوب و صفات کی نمائندگی نہایت کامیابی کے ساتھ کرتی تھی، جیسے "فرنچ کٹ" داڑھی والے عام طور سے "فرنچ رخصت" کے زیادہ شائق ہوتے تھے۔ لاریب کہ جس طرح آج ہم اس مقولے کی صداقت کے قائل ہیں کہ "مغربی یا مغربی نما مرد کی چند یا ہمکو دکھا دو اور ہم اُسکی بیوی کی افتاد مزاج سے واقف ہو جائیں گے"، اسی طرح ہمارے آبا و اجداد اس مقولے کی سچائی کے معترف تھے کہ "مرد کی داڑھی مونچھ دیکھ کر اُس کا تمام کچا چٹھا بیان کر سکتے ہیں"۔

افسوس کہ آج یہ سب کچھ محض خواب و خیال ہے، ہر "کسیر دنما چہرہ" یکساں معلوم ہوتا ہے اور کوئی خصوصیت ایسی نہیں جس کی مدد سے دورِ حاضر کے مرد کے "خوب و زشت" کی جانچ کی جا سکے، یعنی داڑھی مونچھ سے

بے نیاز چہرہ گویا ایک بے سراغ معمہ یا بغیر اشاروں کی ایک پہیلی ہے اور یہ "جنونِ تہذیب" اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب کے دماغوں میں سرایت کر چکا ہے۔ میرے خیال میں آنجہانی شہنشاہ جارج پنجم کی وفات کو "دورِ ریش و بروت" کا اختتام متصور کرنا چنداں بیجا نہ ہوگا، کیونکہ ہمارے نئے "ملکِ معظم" کی رائے میں "ریش و بروت" کا "بارِ گراں" اُن کے طفلانہ چہرے کی معصومیت کے لیے چنداں موزوں نہیں اور الحمدللہ کہ کم سے کم اس ایک معاملے میں ہمارے جدید "سبزہ آغاز" یا "سبزہ انجام" صدرِ کانگریس بھی "تاجِ برطانیہ" کے ہمنوا ہیں۔ داڑھی مونچھ رکھنا اب منجملہ عجائبات شمار ہونے لگا ہے، ہر روز صبح صبح ان گنت اُسترے اپنا کام بے خوف و خطر انجام دیتے ہیں اور اس ساری "کرزنیت" کی کامیابی کا بڑا سہرا "جی لیٹ اینڈ کمپنی" کے سر ہے۔

داڑھی مونچھ کی بقا و فنا کی اس جنگِ صلیبی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ پیشینگوئی کرنا چنداں مشکل نہیں کہ ایک آدھ قرن میں یہ دونوں بھی "دُم" کی طرح "اعلیٰ اللہ مقامہ" ہو جائیں گی، اس لیے وہ معدودے چند اصحاب جو اس وقت بھی رسالے عامہ کے خلاف داڑھی مونچھ رکھتے ہیں اگر وقتاً فوقتاً ان کی بقا اور ترویج کی خاطر "داڑھی یا مونچھ ٹورنامنٹ" منعقد کیا کریں تو نامناسب نہ ہوگا۔ موجودہ زمانۂ نسوانیت پسندی میں "بقائے ریش و بروت کی انجمنیں" خاصی قدر و عزت کی نظر سے دیکھی جائیں گی، اور مجھ کو یقین ہے کہ اس دورِ قحط الرجال میں بھی ایسے فیاض طبع سرپرستوں کی کمی نہ ہوگی جو "ریش و بروت" کے "مسابقوں" میں طلائی اور نقرئی جام عطا کرنے کی عزت حاصل کریں۔ ابھی کچھ ہی دن گزرے کہ لندن میں اسی قسم کی ایک انجمن کی جانب سے ایک "ٹورنامنٹ" کا اعلان ہوا تھا جو بہت کامیاب رہا۔ تقریباً دو درجن امیدواروں نے اس "مسابقے" میں شرکت کی۔ سب کو ایک مقررہ وقت پر "مجلسِ حکما" کے روبرو داڑھی مونچھیں صاف کرا دینا پڑیں۔ تین ہفتہ کے بعد "مجلسِ حکما" نے ہر امیدوار کی "ریش و بروت" کا پھر معائنہ کیا۔ اس وقفہ کے دوران میں ہر امیدوار کو اس باب میں کامل آزادی تھی کہ "ریش و بروت" کی ترقی کے واسطے جو ذریعہ چاہے اختیار کرے۔ جیتنے والے کو انعام میں ایک طلائی جام اور ایک "شیونگ سٹ" پیش کیا گیا۔ میری رائے میں اگر ہندوستان میں تمام لاسلکی نشرگاہیں اس امر کا تہیہ کر لیں کہ مہینے میں ایک مرتبہ ضرور ایک لکچر "ریش و بروت" کی بقا کے فوائد پر نشر کیا کریں گی تو اس تحریک کی بڑی ہمت افزائی ہوگی خصوصاً اگر دہلی سے چند ذی شہرت اصحاب اپنے مخصوص انداز میں ہر ماہ ایک تقریر اس موضوع پر کیا کریں اور پھر اس تقریر کے متعلق نصف شب کے قبل باہر سے آئی ہوئی آرا کو ادارۂ نشرگاہ ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کر دیا کرے۔ دیگر نشرگاہیں بھی اس سلسلے میں کم سے کم اتنا تو کر سکتی ہیں کہ کبھی کبھی "بقائے ریش و بروت" کے عنوان کے تحت کچھ تحت اللفظ کلام نشر کرا دیا کریں۔

ممکن ہے بعض اصحاب میرے اس مضمون کو پڑھ کر یہ خیال فرمائیں کہ میں نے ایک غیر ضروری موضوع پر

؎ یہ مضمون دسمبر [illegible] سے پہلے وصول ہوا تھا۔ اس وقت ایڈورڈ ہشتم بادشاہ تھے۔

قلم اُٹھایا، اگر اُن کا ایسا خیال ہو تو وہ غلط ہے، اور مجھ کو امید ہے کہ غور و فکر کے بعد وہ خود اپنی اس غلطی کو محسوس کرلیں گے کہ داڑھی مونچھوں کا مسئلہ ذرا بھی غیر اہم نہیں، درحقیقت "جزئیات روئے انسانی" میں سے صرف مونچھ ہی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ کچھ دن گذرے وہ ایک پارلیمانی بحث و تمحیص کا موضوع بنی تھی۔ جب ایک "کرنل اسٹریم گارڈ" نے مونچھ منڈوانے پر کورٹ مارشل کو ترجیح دی۔ یہ شخص یقیناً بے حد تعریف کا مستحق ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ شاید انگلستان کے درباری شاعر کی طویل خاموشی کا راز یہی ہے کہ وہ بہت عرصے سے اسی شخص کی توصیف میں ایک معرکۃ الآرا نظم لکھنے میں مصروف ہیں۔ مونچھوں کی اہمیت کو اس سے اور تقویت ہوتی ہے کہ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب انگلستان کے ایک بڑے لارڈ، ایسے گورڈن نے ایک خطیر رقم ادا کرکے اپنے ایک دوست مسٹر رابرٹ ہوپ جانسن کی مونچھوں کو خریدا تھا۔ یہ مونچھیں مخمل اور زربفت پر چپکا کر ایک طلائی کیس میں محفوظ کی گئی ہیں اور سنا ہے کہ ان کے سابق مالک اب بھی گاہ گاہ اُن پر حسرت بھری نظر ڈالنے پلیکن کلب جایا کرتے ہیں۔ داڑھی مونچھوں کی بابت بہت سے پرلطف اور ہنسانے والے قصے مشہور ہیں لیکن داڑھی کے لیے تو جونپور کے قاضی صاحب کے لطیفے سے زیادہ دلچسپ اور کوئی لطیفہ نہیں اور مونچھوں کے بارے میں انگلستان کے ایک مشہور رکن دار العوام کے واقعے سے بڑھ کر معنی خیز کوئی قصہ نہیں، یہ رکن صاحب ایک شب ایک خوبصورت، شوخ و شنگ، ایت طناز کو تھیٹر لیے جا رہے تھے، ٹیکسی میں بیٹھ کر جب "رفع شرم و حجاب" کے ابتدائی منازل طے ہو چکے تو مس صاحبہ نے شوخی سے حضرت کی طرف دیکھ کر کہا کہ "آپ میں دو چیزیں ایسی ہیں جن کو میں پسند نہیں کرتی"۔ "کون کون" حضرت نے دریافت کیا۔ "آپ کا سیاسی نصب العین اور آپ کی مونچھیں"۔ "مائی ڈیر" حضرت نے بڑے سکون سے جواب دیا "آپ اس بارے میں ذرا بھی خود کو متفکر نہ بنائیں کیونکہ آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی سابقہ پڑنے کا امکان نہیں۔"

لیکن میری اس تمام بحث و تمحیص کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ "جنس لطیف" کی یہ "مساعی جمیلہ" جنکی منزل مقصود "صنفی مساوات" ہے، قابل اعتراض ہیں، درحقیقت عورت نے اس معاملے میں بہت غور و خوض کے بعد سب بڑا مبارک اقدام کیا ہے جس کا مرکزی اصول ہے "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری"۔ تاریخ عالم دو اہم حقیقتوں کی شاہد ہے۔ پہلی حقیقت یہ کہ دنیا کے تمام جھگڑوں کی بنا "زر، زن اور زمین" ہیں، اسی چیز اگر اور وسیع نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل ان تینوں کے بجائے صرف ایک "زن" کا لفظ بنا زیادہ معنی خیز اور جامع ہوگا کیونکہ زر اور زمین، نفس الامر میں حصول زن ہی کی خاطر درکار ہوتے ہیں ع

جلوہ را ایک آرزو باشد وایں را جلوہ ہا

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں ہر دور میں مرد نے جتنے انواع عورت کے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا بدلہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ پہلا موقع ملتے ہی عورت مرد سے انتقام لینے کی غرض سے حتے المقدور اُس کے ہر حق کو ٹھکرا دیا کرتی لیکن عورت کی فطرت میں اللہ نے بڑی فیاضی پوشیدہ رکھی ہے اُس نے سوچا کہ انتقام لینے والا تو وہ منتقم حقیقی ہے، البتہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر کم سے کم اس امر کا اطمینان ضرور کر لینا چاہیے کہ پھر آئندہ کبھی مرد اپنے مظالم کا اعادہ نہ کرے گا، اس کے واسطے اس سے بہتر کیا ترکیب ہو سکتی تھی کہ "اصناف" کے امتیاز ہی کو فنا کر دیا جائے، جس سے ادھر تو "زر، زمین، زن" کا جھگڑا مٹ جاتا ہے اور اُدھر مرد و عورت کا امتیاز اُٹھتے ہی کسی ایک صنف کے دوسری صنف پر مظالم توڑنے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا ہے۔ ع بسیلے بہ یک نگاہ دو مجنوں نشانہ کرد

اس اعلےٰ تخیل اور مبارک مطمح نظر کو پیش رکھ کر اُس نے کام کرنا شروع کیا، اور ہمت کی بلندی، ارادوں کے استقلال، اور نیت کے خلوص کے سبب ہر جگہ فتح پائی "داڑھی مونچھوں" اور دیگر "جسمانی تفاوتوں" کے موقع پر جب وہ مجبور ہو گئی۔ تو اُس نے مرد کو بھی اپنا شریک اور رازداں بنایا اور مرد نے اپنی علو حوصلگی اور عالی ہمتی سے پہلا کام تو یہ کیا کہ "بے ریش و بے درد" ہونے کا تہیہ کر لیا، اُدھر عورت نے "بال تراشی" شروع کر دی تاکہ کچھ ادھر سے، کچھ اُدھر سے اور گوہر مراد ہاتھ آ جائے۔ ؎

مونچھ ادھر منڈی ہوئی زلف اُدھر کٹی ہوئی دونوں نے دھول جھونک دی دیدۂ امتیاز میں

لیکن اس تحریک میں مرد کی اعانت صرف اسی ایک ادنیٰ ایثار تک محدود نہیں رہی بلکہ بہت آگے بڑھ گئی۔ اُس نے دیگر "جسمانی تفاوتوں" اور "کالبدی امتیازوں" کی بیخ کنی کا بھی بیڑا اُٹھایا اور گو وہ ابھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہے تاہم "باب کامرانی" مسدود نہیں۔ اب وہ ہمہ تن اس کوشش میں مصروف ہے کہ تمام مردوں کو عورت بنا دے یا تمام عورتوں کو مرد، اور چونکہ اس صورت میں "توالد و تناسل" کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے اسلیے وہ اس کی بھی سعی کر رہا ہے کہ اس سلسلے کو بھی "اصناف" کے "امتیاز" سے بے نیاز کر دے، بہرحال ان مساعی کا ابھی زمانۂ طفلی ہے لیکن اس میں کلام کی گنجائش نہیں کہ ریش ترشوانے اور مونچھ منڈوانے کی ترغیب مرد کو عورت نے یا عورت کی سے نے دلائی، کیونکہ وہ اُس کے مبارک اور بلند ارادوں سے واقف ہونے کے بعد یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ محض چند موئے سیاہ، عورت کے تمام ارادوں کے حصول کی راہ میں روڑے اٹکائیں، اسلیے اُس نے ان چند بالوں پر اُسترا پھیرنا گوارا کیا مگر عورت کے ارمانوں پر پانی پھیرنا نہیں

"۵۶۰"

دیوان معروف

جناب معروف جن کا نام نامی خواجہ میرزا نواب الٰہی بخش خاں صاحب چشتی فخری دہلوی ہے اپنی خاندانی امارت و شرافت عارفانہ و متصوفانہ زندگی کے لیے بدرجہ اتم مشہور و معروف ہیں۔ اطراف عالم خصوصاً ادبی دنیا میں بھی مرحوم سے سب واقف ہیں۔ صوفیہ کرام کی صحبت سے فیضیاب ہو کر باوجود امیرانہ زندگی اور اسباب معیشت کی فراہمی کے فقیرانہ اور زاہدانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ انتظام خانہ داری دوسرے متعلقان قریبی کے سپرد تھا۔ علوم رسمیہ و متداولہ فارسی و عربی کے ماہر اور مذاق سخن گستری کے دلدادہ تھے۔ بلکہ خاص شغف و انہماک تھا۔ ایسا شخص جو صوفیائے کرام اور اولیائے عظام سے روحانی فیض حاصل کر چکا ہو اس کے حسن اخلاق اور پاکیزہ زندگی کا کیا کہنا۔ شاعری کا بہترین جزو تصوف و معرفت ہے بغیر اس کے کلام میں اصلی دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی اور نہ قلب پر تاثیر ہوتی ہے اُردو زبان کے شعرا میں متصوفانہ مذاق کے شعر کہنے والے کمتر ہیں۔ حضرت معروف کے دیوان میں متصوفانہ اشعار زیادہ تر ہیں۔ مگر ایسے اشعار بھی ہیں جو غیر متصوفانہ کہے جا سکتے ہیں۔ متصوفین شعرائے فارسی کا کلام بھی دو رنگی سے کم بچا ہے یعنی عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی کی جھلک پیدا ہو گئی اسی سے عشق مجازی کو عشق حقیقی کی نردبان کہا گیا ہے۔

حضرت معروف کو مشہور شاعر شاہ نصیر الدین مرحوم سے تلمذ تھا۔ ایک نظم مندرجہ دیوان ہذا میں معروف نے اُس عقیدت کو ظاہر کیا ہے جو اُن کو اپنے استاد سے تھی۔ معروف کی عمر اسّی سال سے متجاوز ہوئی ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ذوق سے بھی معروف نے مشورہ سخن کیا ہے اس خیال کی تردید بھی اسی دیوان میں باحسن الوجوہ کی گئی ہے۔ خیر اس اختلاف پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں۔

معروف کو فرائض شاعری ادا کرنے کی قابلیت جامعہ تھی اور جس نے شاہ نصیر ایسے اُستاد سے مشورہ سخن کیا ہو وہ دوسرے کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ ان کے دیوان میں ہر رنگ کے اشعار ہیں میر و سودا وغیرہ کے رنگ میں جو کچھ کہا ہے وہ نقادان فن کے نزدیک قابل قبول ہے۔ اور ہر سخن فہم اس کی تعریف و تحسین کرے گا اس دیوان میں غزلیات کے علاوہ ایک مختصر مثنوی اور ایک نظم مسمّٰی بہ تسبیح زمرد اور ایک نظم عشق مجازی کی حالت میں لکھی ہے۔ مخمس بر غزلیات اساتذہ۔ متفرق اشعار۔ قطعات۔ رباعیاں اور تقریظات و تواریخ ہیں۔ ناظرین کو پہلے یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ شاعر دور اولین کا ہے اور کلام پونے دو سو برس اُدھر کے مذاق سخن اور بول چال اور بندش کا نمونہ ہے اس کا تطابق زمانہ حال کی اُردو سے نہیں ہو سکتا صرف خیالات کی بلندی مضامین آفرینی مذاق کی لطافت توحید و عرفان اور تصوف کی چاشنی دیکھنا چاہیے۔ مشہور اساتذہ

اُردو کے رنگ و مذاق میں جو اشعار کہے ہیں وہ معروف کی سخن طرازی کا عمدہ نمونہ ہیں اور اس سے اُن کی قادر الکلامی بدرجہ اتم ثابت ہوتی ہے۔ دیوان معروف کی اشاعت سے ادبی دنیا میں ایک پسندیدہ اضافہ ہوا ہے۔ مولانا شاہ عبدالحامد صاحب قادری بدایونی کی مساعی جمیلہ قابل داد ہیں کہ دیوان معروف مطبوع ہو کر شائع ہوا اور معروف کے نام کو زندہ کیا۔ تذکرہ حیات مطبوعہ ہیں تذکرہ نویسوں نے معروف کا ذکر بہترین طریقہ سے کیا ہے۔ تفریح ناظرین کے لیے کسی قدر انتخاب دیوان معروف سے کیا جاتا ہے۔

مبصرین سخن کا یہ اولیں فرض ہے کہ وہ کسی شاعر کے کلام کو صرف اپنے مذاق کے موافق نہ رکھیں بلکہ شاعر کی سخن پردازانہ طبیعت کو جانچیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے معیار فن سے گرا ہوا ہے یا نہیں اگر وہ لوازم شاعری کے حدود میں ہے تو اس کی استادی یا کمال کو تسلیم کرنا چاہیے۔ رہی کلام پر نکتہ چینی یہ سہل بھی ہے اور مشکل بھی اچھی بھی اور بُری بھی اور میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام میں نکتہ چینی کی گنجائش نہ ہو۔ اس سے مشہور شعرائے فارسی بھی محفوظ نہیں رہے ہیں نہ اساتذۂ اُردو۔ چونکہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ مبصر و نقاد اس لیے نکتہ چینی سے محترز ہوں۔ یہ تنقید ضرورتاً لکھی ہے۔

انتخاب کلام معروف

(حمد)

کرم سے اُس کے اپنے پر ہے نازاں — اثر فریاد دلہائے حزیں کا

کہاں چھپ شمع فانوسی چھپے ہے — فروغ حُسن اس پردہ نشیں کا

بنایا جس نے بہر دشمن و دوست — فلک کا خوان اور سفرہ زمیں کا

پہلا شعر گو حمدیہ ہے مگر رنگ تغزل کی جھلک بھی پیدا ہے کہتے ہیں کہ عشاق محزوں کی فریاد کا اس کے کرم پر اثر ہوا دعا مقبول ہوئی یا گناہ معاف ہوئے۔ دوسرا شعر بھی صاف ہے خدا بہت گہرے حجابات میں ہے مگر اس کی قدرت اور ضیائے حسن ازلی عیاں ہے۔ تیسرا شعر سعدی کے اس شعر کے مفہوم سے ملتا ہوا ہے۔

ادیم زمیں سفرۂ عام اوست — چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

(نعت)

شافع محشر کا یاں دیکھو جمال نقش پا — تا رہے خواب عدم میں بھی خیال نقش پا

اس مطلع کا مفہوم اصلی صرف اتنا ہے کہ اگر تم (مسلمان) دنیا میں اپنے رسول مقبول کا خیال اور آپ کے ارشادات کا خیال رکھو گے اور پیروی سنت کی کرو گے تو خواب عدم یا قیامت میں بھی کامیاب ہوگے۔ واقعی دنیا میں احکام نبوی کی پابندی اور احکام نبوی کی پیروی عین احکام خدا کی اطاعت ہے۔

من یعلم اللہ الخ۔　　　　(دیگر)

ہو وے اگر نہ وعدۂ دیدار درمیاں　　　　دہ دوزخی ہے نام جو لے پھر بہشت کا

مسلمانانِ اہلِ سنت کا اعتقاد راسخ ہے کہ بہشت میں دیدارِ خداوند تعالیٰ ہوگا عارف اور متقی صرف اسی خیال سے بہشت کے طالب ہیں نہ کہ وہاں کے سامانِ عیش و راحت کے۔ (وہ دوزخی ہو) کا ٹکڑا تناسب الفاظ کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ اسی زمین میں یہ دو شعر بھی قابلِ داد ہیں۔

صحبت میں عارفوں کی زبس پائی ہے تمیز　　　　کچھ ہم کو امتیاز نہیں خوب و زشت کا

تکمیل تصفیہ نفس کے بعد انسان سب کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے اور تزکیہ نفس بغیر صحبت عرفا کے نہیں ہو سکتا۔

بیخود پھروں ہوں عشق بتاں میں یہاں تلک　　　　کعبہ میں پوچھتا ہوں میں رستہ کنشت کا

(دیگر)

شکل عکس و آئینہ مسجد تھی یا بتخانہ تھا　　　　آپ تو مہماں تھا اور آپ صاحب خانہ تھا

حسن سے تیرے ہوا ہے عشق کا بازار گرم　　　　تو اگر جلوہ نہ کرتا ہم کو بھی سودا نہ تھا

کس قدر بے پردہ ہے ہر رنگ میں شوق ظہور　　　　گل پہ بلبل تھا کبھی گہ شمع پہ پروانہ تھا

توحید و معرفت اور عشق و محبت کے لحاظ سے ہر سہ اشعار قابلِ تحسین ہیں۔

(دیگر)

آپ کو پہچان مشت خاک کو ایسا نہ جان　　　　دل نے تیرے بھی لقب پایا ہے بیت اللہ کا

عابدوں کو دین کا غم، عاشقوں کو دل کا خوں　　　　درد سے ہے سب کو توشہ اپنی اپنی راہ کا

پہلے شعر میں حضرت علی کے اس ارشاد (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) کا مفہوم موزوں کیا ہے۔ واقعی اس مشت خاک (انسان کامل) نے وہ مراتب اعلےٰ پائے ہیں جو فرشتوں نے بھی نہیں پائے اور دل کو بیت اللہ اور شعرا نے بھی کہا ہے۔ دوسرا شعر تصوف و معرفت کے جذبات کے ساتھ تغزل کا رنگ بھی لیے ہوئے۔ بالکل زمانہ حال کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

(دیگر)

ذیل میں بعض شعر ایک غزل سے لکھے جاتے ہیں۔ دراصل یہ ساری غزل مرصع ہے اور معروف کی طباعی نازک خیالی مضمون آفرینی کا بہترین نمونہ ہے۔ اُردو میں اساتذہ فارسی کا رنگ دکھا کر ریختہ کی شان قائم رکھنا استادی کی بیّن دلیل ہے اُن کو اساتذہ اُردو کا ہمپایہ کہنا بالکل صحیح و درست ہے۔

مثلِ زر دل ہے گداز اس بندۂ درگاہ کا　　　　نقش ہے منقوش خاطر ضرب الا اللہ کا

مردِ حق اندیش کو سولی پہ بھی معراج ہے — واہ کیا اقبال ہے منصورِ عالی جاہ کا
آبلوں سے بھر گیا دل واہ اے سلطانِ عشق — تھا یہی میداں تمہارے خیمہ و خرگاہ کا
پہلے اے معروف صورت کا تماشا دیکھیے — پھر وہاں سے کیجے قبلہ قصد بیت اللہ کا

آخری شعر (پہلے الخ) حافظ کے مشہور شعر کا ہمپایہ ہے۔

چہ درون کعبہ رفتم ز حرم ندا برآمد — تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

(دیگر)

بس ہے ہمیں یک نظر مثلِ شرر کے دیکھنا — کس کو ملے یا نصیب بار دگر دیکھنا

مطلع بالا میں شوقِ دیدار کو جس حسرتناک طریقہ سے موزوں کیا ہے سخن فہم اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس زمین کے سب شعر فصاحت اور عارفانہ مذاق سے بھرے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ اسی زمین کا یہ شعر میر و غالب کی روح کا خوش کرنے والا ہے بلکہ نظیری کی روح بھی محظوظ ہو گی۔

سہم کے ہو جائے جب چاندنی کا منہ سفید — کوئی ہنسی ہے کیا مرا زخم جگر دیکھنا

(دیگر)

جب مٹ گیا نشاں ہی تو نام رہ گیا — پھر ہستی خراب سے کیا کام رہ گیا
انجام کارداں کا سرانجام رہ گیا — جس کام کو ہم آئے تھے وہ کام رہ گیا

آخری شعر جناب خواجہ درد کے اس شعر سے کچھ کم نہیں۔

کس لیے ہم آئے تھے کیا کر چلے — تہمتیں چند اپنے سر پہ دھر چلے

(ولہ)

گریبان کا اور دامن کا کی طرح میں شعرا نے خوب خوب شعر کہے ہیں۔ معروف نے بھی پسندیدہ شعر کہے ہیں مگر تغزل کی شان کو نہیں جانے دیا ہے۔

خرابی میں پڑا ہے سینے والا جیب و داماں کا — جو یہ ٹانکا تو وہ اُدھڑا جو یہ اُدھڑا تو وہ ٹانکا
بشر کا کیا ہے منہ ناصح ہم اس کا ہاتھ کٹوا دیں — رفوگر ہو فرشتے سے بھی اس چاک گریباں کا
نمکداں جام مے میں گر پڑا ہو ناک کیفیت — کہ یاد چشم مست اس کی میں دھیان آیا زنخداں کا

(ولہ)

ظفر کا رنگ

یا مجھے شبنم گریاں ہی بنایا ہوتا — ورنہ یا رب گل خنداں ہی بنایا ہوتا

یہ مطلع بظاہر سیدھا سادا ہے۔ مگر معروف نے اس میں لطف معنوی پوشیدہ رکھا ہے جو کسی قدر صراحت کا محتاج ہے (بعض وقت انسان کو نہ ہنستے بنتا ہے نہ روتے یہ حالت انتہائی اضطراب اور مایوسی میں ہوتی ہے وہ اپنے خدا سے کہتے ہیں کہ میں ایک حالت پر ہوتا تو اس دورنگی سے چھوٹ جاتا اور مصائب کم ہوجاتے۔

(ولہ)

ربط خوبان عشوہ گر چھوٹا دیکھنے کا نہ لپکا پر چھوٹا
نہ وہ گھر کا ہوا نہ باہر کا یار کا اپنے جس سے در چھوٹا
نام لوں گا نہ زندگی کا پھر قید ہستی سے میں اگر چھوٹا

معروف کی کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس میں توحید و معرفت اور دنیا کی بے ثباتی نہ پائی جاتی ہو۔

(ولہ)

روح کب جسم میں آتی ہے نظر اے غافل یار گھر میں ہے ترے جان نہ گھر سے باہر

لا یدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار کا مفہوم نظم کیا ہے۔ واقعی اہل نظر و عارف ہی حسن ازل کا نظارہ کرتا ہے۔

(ولہ)

دکھلاتی اس کے کوچہ میں پھرتی تھی ساتھ ساتھ تھی آہ آتشیں مجھے مشعل تمام رات

(ولہ)

ذیل کے شعر میں جو خوبی عارفانہ رنگ میں پیدا کی ہے اُس کا اظہار لفظوں میں دشوار ہے۔ اللہ اکبر فرشتوں کو جان نہ دیں گے بلکہ فرشتہ معشوق کی شکل بن کر آئے تو جان دیں گے۔ اس رنگ کے اشعار بہت کم نظر سے گذرے ہیں یعنی

ہستی کیا جان کر فرشتے سے جائے بن کے جب تک کہ نہ آوے وہ اُسی کی صورت

(ولہ)

شب ہجراں کی وحشت اور گھبراہٹ کو ذیل کے شعر میں کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

بے طرح گھبرا گیا ہوں دل کے گھبرانے سے آج اے در و دیوار بھاگو میرے کاشانے سے آج

(ولہ)

ہوا ہے آکے مری آستین کا پیوند یہ طفل اشک الٰہی ہو نناک کا پیوند

(ولہ) کس غم و یاس والم خانہ احساں آباد ہو گیا حد سے زیادہ دل ویراں آباد

معروف کا یہ مطلع میر درد کے اس مطلع سے کچھ کم لطیف نہیں ہے۔

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا بس ہجوم یاس دل گھبرا گیا

دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

صاحب خانہ نہ جس گھر میں ہو وہ سونا ہے خانۂ تن ہے ترے دم سے ہی اے جان آباد

(ولہ)

یاد کر صبح چمن میں نفس سرد مرے سر پہ خاک اپنے اُڑاتی ہے صبا میرے بعد
کوئی مجھسا نہیں اطراف چمن میں یکسو کچھ اگر ہے بھی تو ہے قبلہ نما میرے بعد

(ولہ)

جس سرزمیں پہ تیرے نقش قدم ہوں ظاہر آنکھوں کی واں بناؤں درگاہ ہر قدم پہ

اسی کے قریب قریب جامی نے بھی ایک شعر کہا ہے مگر اسلوب بندش میں فرق ہے۔

بتقاضے کہ نشان کف پاے تو بود سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

(رندانہ)

جام دے اور نہ کر وقت پہ تکرار کہ بس سا تیا ابر اُٹھا ہے یہ دھواں دھار کہ بس

(ولہ)

زبان تیشہ فولاد کہتی تھی یہی ہر دم نکلتی ہے یہ عشق کوہکن کے سنگ سے آتش

(ولہ)

کرتا ہے نہ کچھ سوے عدم تو ہی سفر پیش اے نقش قدم سب کو یہی راہ ہے درپیش
ہوں قاعدۂ عشق سے محبوس بہ تصور ہے صفحۂ رخسار ترا شام و سحر پیش

(ولہ)

کاشکے سینہ میں جل کر ہو دل بیتاب خاک یعنے پھر اکسیر ہے ہو جائے گر سیماب خاک

مذکورہ بالا شعر میں دل بیتاب کو صبر کی تلقین دی ہے صبر بہترین شے ہے سیماب اگر خاک ہو جائے تو اکسیر کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔ اسی طرح آدمی اگر صابر ہو جائے تو شان ارفع حاصل ہو سکتی ہے صبر پیغمبروں اور اولیا اللہ کا شیوہ ہے صبر کی بلند پائگی واصبر علی ما اصابک انک من عظم الامور سے ظاہر ہے۔

(انقلاب روزگار)

موج دریا ہے انھوں کے گھر میں نقش بوریا جو کہ بیٹھے ہیں بچھا کر مسند سنجاب خاک

(انجام حیات)

یاں زمیں پر فرق کرلے تو گدا و شاہ کا پر ہے منزل زیر خاک اے ہمسفر دونوں کی ایک

سعدی نے بھی قریبًا اس مضمون کو خوب تر کہا ہے۔

نہ این است حال دہن زیر گل شکر خوردہ انگار با خون دل

(عاشقانہ)

تم کو دل کی بھی ہے کسی کے خبر دل میں خوش ہو کہ دلربا ہیں ہم
حیرت افزا ترا تصور ہے شکل آئینہ چشم وا ہیں ہم
لے چلو سوئے شہر خاموشاں کشتۂ چشم سرمہ سا ہیں ہم

(متصوفانہ توحید)

حق کی ہستی میں ہو گئے نیست کیونکہ ناپائدار ہیں ہم

(ولہ)

ہے کہاں ملک عدم دور کہ مانند حباب طرفۃ العین میں پہونچے ہے سبکبار رواں
گر یہیں تجکو نہ دیکھا تو پھر ان آنکھوں سے خاک دیکھے گا ترا طالب دیدار رواں

دوسرے شعر (گر یہیں الخ) میں من ھذہ اعمٰی فھو فی الآخرۃ اعمٰی کے مفہوم کو موزوں کیا ہے۔ ناصحانہ اور عارفانہ خیال ہے اور اس پر عمل کی ضرورت ہر مسلمان کو ہے۔ جس نے خدا کو یہاں نہ پہچانا وہ آخرت میں کیا پہچانے گا۔

(ولہ)

نگین دل پہ ترا نام کھودتے ہیں ہم جہاں میں تیشہ زنی بت تراش کرتے ہیں

قدیم زبان اور محاورات اشعار ذیل میں ملاحظہ ہوں مگر مذاق عشق کی چاشنی موجود ہے۔

اشک کی آنکھوں سے بوندیں کیا یہ ڈھلیاں دیکھیاں موتیا کی آج کلیاں ہم نے جلیاں[1] دیکھیاں
یہ ہوئی بلبل ترانہ سنج گلشن میں سحر گردنیں غنچوں کی تم پر ہم نے ہلیاں دیکھیاں

آخری شعر (یہ ہوئی) میرے خیال میں نازک خیالی کا بہترین نمونہ ہے بلبلوں کی ترانہ سنجی سحر کو اس قدر دلکش تھی کہ اس کے تال سُم پہ غنچوں کی گردنیں وجد میں ہلتی تھیں۔ نسیم سحر سے غنچوں بلکہ تمام ریاحین و اشجار میں جنبش ہوتی ہے بلبلوں کی ترانہ سنجی نے اس طربناک وقت میں خاص وجدانی عالت پیدا کر دی۔ اردو میں ایسے شعر ناظرین نے شاذونادر دیکھے ہوں گے۔ بالکل میرؔ کا طرز بیان معلوم ہوتا ہے۔

[1] شاید کھلیاں ہے۔

(ولہ)

قسمیں ہی جس شخص نے ملنے کی ہو کھائیاں کیا کرے واں صلح کار ہیچ ہیں حیرانیاں
عشق میں جو ہجر کے غم سے ڈراتے تھے لوگ آہ وہی باتیں اب آگے مرے آئیاں
دام سے تھا زلف کے دل کو سرو کار کیا ہائے یہ آنکھیں مرے سر پہ بلا لائیاں
خون جگر جائے مے کیوں نہ پیوں یار بن غم کی ہیں اب بدلیاں سر پہ مرے چھائیاں
بھیس بدل کر وہاں جائے تھا معروف تو ہم نے تری چوریاں رات کو سب پائیاں

(ولہ)

جیسے متاع گم شدہ کی جستجو کریں پھروں یہ آرزو ہے کہ کیا آرزو کریں
گر ہجر ہو تو وصل کی ہم آرزو کریں دلبر ہو جب بغل میں تو کیا جستجو کریں
بلبل نے دیکھ چاک گریبان گل کیا کاش اس کو میرے تار نفس سے رفو کریں
رسوائے عشق کی کبھی گر پاویں خاک پا اُس خاک پہ تو اپنی نثار آبرو کریں
کثرت میں دیکھتے ہیں جو وحدت تو ہم ابھی آئینہ پاش پاش ترے روبرو کریں
ہو جس کو اس سے دل کے لگانے کی آرزو یکبار مجھ کو اُس کے ذرا روبرو کریں

(ولہ)

ذیل کی مشکل طرح میں عاشقانہ رنگ اور لطف بیان ملاحظہ ہو۔ معشوق کے ساتھ گفتگو کس محبت اور پیار سے کر رہے ہیں۔

کیونکہ ہم ہوں مہر و مہ پوچھیں تو مت بتا کہ یوں جب شب مہ ہو مہر وش مُنہ سے نقاب اُٹھا کہ یوں
کوندے ہے برق کس طرح پوچھیں تو مت بتا کہ یوں مُنہ کو چھپا کے کھول دے کھول کے پھر چھپا کہ یوں
جو یہ کہے کہ جذب عشق کیونکہ اثر دکھائے ہے میرے گھر آ اور اپنے ساتھ اس کو بھی کھینچ لا کہ یوں
گر یہ کہیں کہ بعد مرگ دیجیے کسی کو کیونکہ دُکھ غیر کے ساتھ ایک بار قبر پہ میری آ کہ یوں

(عاشقانہ اضطراب و شوق)

دیکھو وفور شوق ابھی لکھ رہا ہوں خط دل مضطرب ہے پہلو میں خط کے جواب کو
اب دور سے بھی دیکھنے سے اُس کے رہ گیا کیا کوسوں آہ اپنی ہیں چشم پُرآب کو

جب عرصہ دراز کے بعد دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات ہوتی ہے تو دونوں پر مسرت آمیز حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کو معروف نے ذیل کے شعر میں نظم کیا ہے۔

بعد از مدت کل جو یکایک وصل ہوا تو ہم اور وہ یوں تھے حیراں آپس میں جیسے دھرے آئینے دو

(ناصحانہ)

مے پرستاں رہ جا ہے رونے کی　　　جس جگہ آب جو نہ ہووے گی

مصرعہ ثانی میں جس جگہ سے مراد میدان قیامت ہے، یعنی دنیا میں شراب نوشی مسرت ہے مگر قیامت میں تم کو شراب (ام الخبائث) سے رونا پڑے گا۔ وہاں شراب کیسی آب جو بھی نہ ہوگی کہ تمہاری پیاس بجھے چشمہ کوثر وغیرہ تو پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

(ولہ)

جمادات کی غیر ممکن رفتار کو ذیل کے شعر میں کس خوبی سے ثابت کیا ہے۔

خرق عادت اپنے دیوانے کی دیکھ　　　جس طرف کو وہ چلے پتھر چلے

(تلقین کسر نفسی)

اس کو یہ جان تو کہ کچھ ہی نہیں　　　جو کہ اپنے گمان میں کچھ ہے

(اجتماع ضدین)

ناتوانی سے تو جوں کاہ بنا ہوں لیکن　　　کوہ ہوں بارِ غم عشق اٹھانے کے لیے

اسی زمین میں ذیل کا شعر ملاحظہ کیجیے بالکل نیا آئینہ خانہ بنایا ہے۔ معشوق سے تخاطب قابل دید ہے۔

دل ہوا تیغ نگہ سے صد لخت　　　مجھے لڑنا تھا تو اک آئینہ خانے کے لیے

(ولہ)

یہ غم فرقت سے آہ پُراثر میں درد ہے　　　جو مرے پہلو میں ہے اُس کے جگر میں درد ہے

ہاتھ گلچیں نے مبادا گل پہ ڈالا ہو کہیں　　　آج پھر کچھ نالۂ مرغ سحر میں درد ہے

ناز سے ماری تھی ٹھوکر دستۂ گل میں سحر　　　جب سے اب تک ناخنِ رشک قمر میں درد ہے

اب میں جس کے پاس جاتا ہوں عجب ہوتی ہے سیر　　　بس کہ لے معروف میرے شعر تر میں درد ہے

(ولہ)

دید دنیا حباب کی سی ہے　　　اس کی تعبیر خواب کی سی ہے

ساقیا مے کہاں ہے شیشے میں　　　روشنی آفتاب کی سی ہے

ساقیا جام مے سے ہاتھ نہ کھینچ　　　ابھی صحبت حباب کی سی ہے

وشت میں فیض گریہ سے میرے　　　چاندنی سطح آب کی سی ہے

(رباعی)

فرقت میں تری جو ہم پہ دلبر گذری　　　کیا تجھ سے کہوں کہ آہ کیونکر گذری

دل کو تو کبھی آہ کی تکلیف نہ دی
جو کچھ گذری سو آہ جی پر گذری

(دیگر)

کہا میں قرض دے بوسہ تو مجھ کو
اگر ہے تجھ کو مجھ سے کچھ بھی الفت
تو بولا ہے مثل معروف مشہور
کہ ان القرض مقراض المحبت

(دیگر)

وہ مہروش اپنی زلف کھولے
کوٹھے پہ چڑھا ہوا کھڑا ہے
ساقی یہ دن ہے مے کشی کا
کیا ابر گھرا ہوا کھڑا ہے

(فارسی)

تا چند بگویم سحر و شام ترا
معروف خبر نیست ز انجام ترا
بگریز بحق کہ موسفیدی آورد
از مرگ رسیدہ است پیغام ترا

اشارہ بہ آیہ ففروا الی اللہ الخ۔

(قطعہ)

رستے میں اتفاقاً وہ مل گئے جو ہم کو
بوسے ضرور آنا کل تم مرے مکاں پر
ہم آج جو گئے تو انبوہ تھا نہایت
یکبار اُٹھ کے بولے بیٹھو مری زباں پر

(راقم ایک غیر معروف معروف کا ہمنام)

بادۂ کہن

(جناب مولانا فیض اللہ صاحب فیض خضری تونسوی)

کیوں عبث مصروف زاہد سعی لاحاصل میں ہے
ہیں دکھاوے کی نمازیں حب دولت دل میں۔
موجزن اک درد بے پایاں کا دریا دل میں ہے
ہر خلش ہر آرزو ہنگامہ آرا دل میں۔
آنکھ ہے وہ آنکھ جو دیکھا کرے صورت تری
دل وہی دل ہے کہ تو جلوہ نما جس دل میں۔
تیرہ بختی ہے ازل سے قسمت اہل کمال
دیکھ لو دھبہ سیاہی کا مہ کامل میں۔
ہم نشینی ہم کناری کے تو میں قابل کہاں
اک قدم بوسی کی حسرت ہے سو دل کی دل میں۔
ایک تیری یاد ہے دار و مدار زندگی
نام تیرا لب پہ ہے تیرا تصور دل میں۔
شکر ہے گو میں نہیں ہوں باریاب و فیضیاب
ذکر تو میرا مگر اُس شوخ کی محفل میں۔

"سرودِ زندگی" اور حضرت آزاد کاکوروی

(جناب چودھری حامد حسین صاحب پیشکار جنگلات بلرامپور)

جناب ایڈیٹر صاحب الناظر۔ السلام علیکم۔ میں اصغر صاحب کے انتقال پر ملال کا تار پاکر ۲۸ دسمبر ۱۹۳۶ء کو الہ آباد آیا۔ مجھے اصغر صاحب کے لکھنے کی میز پر اور کتابوں کے ساتھ رسالہ "الناظر" لکھنو ماہ جولائی ۱۹۳۶ء ملا۔ شغل بیکاری کے طور پر نظر ڈالی تو فہرست مضامین میں "سرود زندگی" کے محاذ میں جناب منشی اظہر علی صاحب آزاد کاکوروی کا نام پایا۔ اصغر صاحب کے معاملہ میں لکھنؤ سے میرے توقعات کچھ بہت زیادہ مایوس کن ہیں۔ اور کاکوری کو لکھنؤ ہی سمجھنا چاہیے۔ اس لیے میں نے امید و بیم کی حالت میں (جس میں بیم کا حصہ زیادہ تھا) جلد جلد مضمون پر نظر دوڑائی اور پہلا تمہیدی صفحہ دیکھ کر قدرے اطمینان تو ہوا۔ کیونکہ حضرت آزاد نے اصغر صاحب کے محاسن کے اظہار میں کوئی کمی نہیں فرمائی۔ اور یہ فرما کر کہ "مجھے اصغر صاحب سے کوئی خلش نہیں ہے" اپنا مقصد واضح فرمایا ہے کہ

"مجھے بعض اشعار میں کچھ شبہات ہیں اور نقاد کا کام ہے کہ اگر عروس نظم کے حسین چہرے پر اسے کہیں کہیں کچھ بدنما داغ نظر آتے ہوں تو اُن پر پردہ ڈالنے کی سعی لاحاصل نہ کرے۔ بلکہ آئینہ کی طرح انھیں صاف پیش کر دے۔ تاکہ یہ داغ دور کر دیے جائیں۔ حسن اپنی دلفریب رعنائیوں کے ساتھ چودھویں رات کا چاند بن کر آسمان ادب پر جلوہ افروز ہو جائے۔ اور گرد و پیش کی دنیا اس کی نورانی شعاعوں سے دیدہ و دل منور کر سکے۔"

لیکن ایک خلش میرے دل میں اب بھی باقی تھی۔ کیونکہ ادعائے باطل کے بہت سے نمونے پیش نظر تھے۔ اور شکر میں لپیٹ کر کونین پیش کرنے کی روش بہت عام ہے۔ لیکن حضرت آزاد کے تنقیدی نوٹ پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ کیونکہ موصوف نے کسی موقع پر بھی جادۂ اعتدال سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اور معلوم ہو گیا کہ وہ حقیقتاً طالب اصلاح ہیں نہ کہ معترض۔ اور یہی وہ طرز تنقید ہے جس کی اس وقت اُردو کو ضرورت ہے۔

کاکوری شریف سے مجھے یوں بھی عقیدت ہے۔ کیونکہ یہ وہ خطۂ پاک ہے جو ہمارے عہد اقبال سے آج تک علم دین اور تصوف کا گہوارہ رہا ہے اور ہے۔ اُس پر حضرت آزاد نے بار بار اپنی نسبت "فقیر" لکھ کر میرا سر نیاز اور بھی جھکا دیا ہے۔

خوش قسمتی سے "نشاط روح" پر اعتراضات کے جوابات بیشتر میں نے ہی دیے ہیں اور چونکہ تنقیدوں میں حد درجہ کھینچ تان سے کام لیا گیا تھا۔ لہذا قلم سے بے اختیار شوخ فقرے نکل ہی گئے ہیں۔ لیکن حضرت آزاد

سے جو کچھ عرض کرنا ہے نہایت مودبانہ عرض کروں گا۔

میرے خیال میں جو عیوب ظاہر کیے گئے ہیں اُن میں زیادہ تر غلط فہمی معلوم ہوتی ہے جس کا رفع ہو جانا ضروری ہے لہذا خیالِ ناقص میں جو کچھ آتا ہے عرض کرتا ہوں۔

شعر ۱۲ صغر | کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی — جب خاک کر دیا اُسے عرفان بنا دیا

ارشاد حضرت آزاد | فقیر کو شبہ ہے کہ آگ دینا محاورہ ہے۔ پہلا مصرع کہتا ہے کہ ہوس میں کچھ یعنی بقدرِ قلیل آگ کا اضافہ کارکنانِ قضا و قدر نے کر دیا۔ اور اس طرح عشق کی تعمیر عمل میں آئی۔ دوسرا مصرع بتاتا ہے کہ کچھ آگ لگا دینے کے بعد جب ہوس جل کر خاک ہو گئی تو عرفان بن گئی۔ اب یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہوس ایسی شے نہیں جس کا جل کر خاک کی صورت میں تبدیل ہو جانا ممکن ہو۔ جسم خاکی۔ دل یا جگر نہیں اگر آگ لگ گئی ہوتی تو البتہ وہ جل کر خاک بن سکتا تھا۔ پھر ہوس اور عشق سے بُعد المشرقین ہے۔ ایک نار ہے تو دوسری چیز نور ہے۔ ہوس میں اگر آگ کا اضافہ کیا بھی جائے تو حاصل کیا ہوگا۔ ہوس ترقی کر کے نارِ جہنم کا ایک شعلہ بن جائے گی اور جب نوبت اس حد تک پہونچ جائے گی تو وہاں عشق کا نام لینا ہی بیکار معلوم ہوتا ہے کیا ہوس بازی کے طوفانِ بے تمیزی کا دوسرا نام عشق ہے۔

گذارش | محاورہ کی بابتہ شبہ غیر ضروری ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ آدمی جو کچھ بولے محاورہ ہی بولے۔ کوئی سیدھی سادی بات زبان سے نہ نکال سکے۔ اب مطلب کی بابتہ التماس ہے کہ ایک چنگاری خواہ وہ کتنی ہی "بقدرِ قلیل" ہو ایک شہر کو جلا سکتی ہے۔ سادہ سادہ مطلب یہی ہے کہ ہوس میں آگ دی اور اس کو مشتعل کر کے عشق کی تعمیر کی۔ دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ پر مستقل بالذات ہیں۔ ایک دوسرے کا نتیجہ نہیں جس کا یہ مطلب لیا جائے کہ جب ہوس جل کر خاک ہو گئی۔ کیونکہ شاعر نے اگر یہ سلسلہ رکھا ہوتا تو بجائے خاک کے "راکھ" کہتا۔ خاک کر دیا کا مطلب ہے نیست و نابود کر دیا۔ مٹا دیا وغیرہ اب مطلب واضح ہے تشریح کی ضرورت نہیں۔

شعر ۱۳ صغر | اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن — آج اُس کو حُسن و عشق کا ساماں بنا دیا

ارشاد حضرت آزاد | "اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے محو خواب" فرمائیے اگر پسند ہو۔ موجزن تو اُس وقت ہوئی جب حُسن و عشق کا سامان بنی۔

گذارش | حضرت آزاد ہی انصاف فرمائیں کہ برق جیسی مضطرب اور بیقرار چیز کے لیے "محو خواب" ہونا کہاں تک موزوں ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اپنی فطرت کے موافق فطرت کے ضمیر میں بھی "موجزن" ہی تھی۔ تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

شعر ۱۴ صغر | زخم آپ لیتا ہوں۔ لذتیں اُٹھاتا ہوں — تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

ارشاد حضرت آزاد | زخم لینا شاید خلاف محاورہ ہو زخم کھانا غالباً صحیح محاورہ ہو۔

گذارش | میں پھر عرض کروں گا کہ بت محاورے کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت آزاد کو شاعر کے مفہوم پر توجہ فرمانا چاہیے۔ اصغر صاحب کی بابتہ یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ موصوف یہ محاورہ نہیں جانتے تھے جسے ہر اُردو خواں جانتا ہوگا پھر محاورے کو چھوڑ کر" زخم لیتا ہوں" کہنے کی کوئی وجہ ہونا چاہیے "زخم آپ کماتا ہوں" کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ" میں اپنی خوشی سے زخم کھاتا ہوں"، لیکن شاعر کا مفہوم اس سے بلند ہے وہ کہتا ہے کہ میں کوشش کرکے اور اسباب پیدا کرکے زخم کھاتا ہوں۔ قاتل کو چھیڑ کر اور غصہ دلا کر مجبور کرتا ہوں کہ وار کرے۔ وار کسی اور پر ہوتا ہے میں دوڑ کر خود ہدف بن جاتا ہوں اور یہ مفہوم" زخم آپ لیتا ہوں" ہی سے ادا ہو سکتا تھا۔

شعر اصغر | جز دل حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

ارشاد حضرت آزاد | اگر "یہ" کے بجائے "کچھ" ہوتا تو غالباً بہتر ہوتا۔

گذارش | ممکن ہے بظاہر "کچھ" اچھا معلوم ہوتا ہو۔ لیکن "کچھ" میں عمومیت ہے۔ اور شاعر نے "یہ" سے صرف اپنے دوسرے مصرع کے مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کیفیت کی کسی کو خبر نہیں اور اس اشارہ خاص کے لیے "یہ" ہی بہتر ہے۔

شعر اصغر | خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغر جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

ارشاد حضرت آزاد | "طرز" کی جگہ اگر "وہم" ہوتا؟

گذارش | یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ وہم غلط ہے۔ کیونکہ فلسفہ کا ایک نظریہ یہ بھی ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی صرف "وہم" کافی ہے۔ "وہم نظر" کچھ نامناسب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُس کے لیے "طرزِ نظر" ہی درست ہے۔ ایک گروہ دنیا کو "سجن المؤمنین اور جنۃ الکافرین" کہتا ہے۔ تو دوسرا جنت اور دوزخ کو ڈھکوسلا ہی سمجھتا ہے وہ کہتا ہے کہ اسی دنیا میں جنت بھی ہے دوزخ بھی۔ غرضکہ دنیا کو ہر شخص اپنے نقطۂ خیال سے دیکھتا ہے۔ اور یہی طرزِ نظر ہے۔

شعر اصغر | چاہیے داغ معصیت اُس کے حریم ناز میں پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

ارشاد حضرت آزاد | سرمد فرما چکے ہیں

سرمد خورسے خورد اگر خدا میخواہی نا کردہ گناہ ہیچ قاضی نہ برند

شاعر صاحب یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ "مستحق کرامت گناہگارانند"، لیکن مصرع اولیٰ میں جو الفاظ ہیں وہ شاید ان معانی کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اس مصرع کی نثر کیا ہوگی "اُس کے حریم ناز میں داغ معصیت چاہیے"

معنی بظاہر بہت صاف ہیں۔

گذارش | بیشک شاعر کا وہی مقصد ہے جو حضرت آزاد سمجھے "اُس کے حریم ناز میں داغ معصیت چاہیے" میں کیا خرابی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ "اُس کے حریم ناز میں داغ معصیت کی طلب ہے" یا اُس کے حریم ناز میں داخلے کے لیے داغ معصیت چاہیے۔ آخر شاعر کو اس کی اجازت ہے یا نہیں کہ ایک آدھ لفظ مقدر بھی رکھے یا خواہ مخواہ اُسے ہجے ہی کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

شعرِ مُصغر | گم ہے حقیقت آشنا بندۂ دہر بے خبر — ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

ارشاد حضرت آزاد | حقیقت آشنا یعنی اہل اللہ تو اس معنی میں گم کہے جا سکتے ہیں کہ سوا ذات باری تعالیٰ کے دنیا و ما فیہا سے اُنھیں مطلب نہ تھا۔ اس جہان فانی کے عارضی لذات یہاں کے فانی اور غیر حقیقی رنج و آلام اور مسرتوں سے وہ کوئی غرض اور واسطہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ایک لمحے کے لیے ادھر متوجہ ہونا پسند کرتے تھے اب رہے دنیا دار جنھیں شاعر صاحب بندۂ دہر فرماتے ہیں وہ کیونکر بے خبر ٹھہرے اگر اس وجہ سے بے خبر فرمائے گئے کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں تو "ہوش کسی کو بھی نہیں" قابل غور ہے۔ اگر وہ بیہوش ہیں تو اس کے ساتھ "بندۂ دہر" بھی تو ہیں۔ بیہوش ہوتے تو دنیا کے کاروبار بحیثیت "بندۂ دہر" ہونے کے وہ کیونکر انجام دے سکتے تھے؟

گذارش | نہایت سیدھی سی بات تھی جس میں حضرت آزاد اس طرح اُلجھ گئے۔ حقیقت آشنا تو گم ہیں اور "بندۂ دہر" بے خبر ہے کس سے؟ حقیقت سے۔ لہٰذا دونوں کو ہوش نہیں ہے۔ اب حقیقت کا پتہ کوئی کس سے پوچھے۔ بیہوش کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یوں تو دنیا کے کاروبار جیسے بندۂ دہر کرتے ہیں حقیقت آشنا بھی کرتے ہیں خواہ کتنے ہی بے تعلق کیوں نہ ہوں۔

شعرِ مُصغر | موجِ نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے — اور بھی جان پڑ گئی کیفیت نماز میں

ارشاد حضرت آزاد | "نسیم صبح" کی جگہ اگر "نسیم کعبہ" ہوتا؟

گذارش | مجھے حضرت آزاد جیسے خوش مذاق اور صوفی مشرب بزرگ سے ایسی خشک اصلاح کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ "نسیم کعبہ" اگر ہوتا تو شعر غارت ہو جاتا۔ اس لیے کہ "صنم کدہ" ہی شعر کی جان ہے۔ اس کو اگر نکال ڈالا جائے تو شعر قالب بے روح ہو جاتا ہے۔ ایک رند مشرب شاعر اور بلند نظر صوفی جو کعبہ و صنم کدہ کی تفریقات سے بالاتر ہو چکا ہو "صنم کدہ" ہی کہہ سکتا تھا اور اسی میں لطف بھی تھا۔ "نسیم کعبہ" کے اول تو کوئی معنی نہیں جب تک "کعبہ سے آئی ہوئی نسیم صبح" نہ کہا جائے۔ اُس وقت تک مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اور بفرض محال ادا بھی ہوتا ہو تو زیادہ سے زیادہ "کریما ببخشائے برحال ما" کی قسم کا شعر ہو سکتا ہے۔ شعریت سے اُس کو کیا علاقہ۔

"بوئے کعبہ" تو نماز میں بنیادی طور پر شامل تھی۔ لیکن کیفیت نماز میں جان بوئے کعبہ اور بوئے صنم کدہ کی متضاد کیفیات نے ڈالی۔

شعرِ اصغر | حسن ہزار طرز کا ایک جہان اسیر ہے　　ملحد با خبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں

ارشاد حضرت آزاد | اس شعر میں تجلیات صفات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اسم ذات ایک ہی ہے جسے اسم اعظم بھی کہتے ہیں۔ بعضوں کے نزدیک اللہ اسم ذات ہے۔ بقیہ اسمائے گرامی مثلاً ستار۔ غفار۔ رحمٰن۔ خالق۔ کریم۔ ذو الجلال والاکرام اسمائے صفات ہیں۔ خدا کی تجلیات کو شاعر نے حسن ہزار طرز فرمایا ہے۔ لیکن حسن ہزار طرز فارسی ترکیب ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اساتذہ عجم کے نزدیک اس موقع پر کون سا لفظ برمحل سمجھا جا سکے گا خالص اصفہانی فرماتے ہیں ؎

غبار راہ گشتم۔ سرمہ گشتم توتیا گشتم　　بچندیں رنگ گشتم تا بچشمش آشنا گشتم

"حسن ہزار طرز" کی جگہ اگر "حسن ہزار رنگ" ہوتا؟ ملحد بظاہر با خبر کہنے کے قابل تو نظر نہیں آتا۔ وہ تو شاید بے خبر ہی رہے گا۔ اگر باخبر ہوتا تو ایک لمحہ بھی ملحد رہنا گوارا نہ کرتا۔ سعدی نے خوب فرمایا ہے ؎

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند　　آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

گذارش | اس معاملہ میں حضرت آزاد نے زیادتی فرمائی ہے۔ آپ نے مثال جو پیش فرمائی اُس میں "رنگ" کا لفظ "بہ چندیں" کے ساتھ ہے "ہزار" سے اُس کا کیا تعلق۔ اور پھر خالص اصفہانی نے "بہ چندیں رنگ" کہہ کر کوئی ممانعت تو کر نہیں دی ہے کہ سوائے "ہزار رنگ" کے "ہزار طرز" کوئی نہ کہے۔ ورنہ غالب کی جرأت کیسے ہوتی کہ ع رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود۔ فرماتے لہذا اگر "ہزار شیوہ" پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو "ہزار طرز" نے کیا قصور کیا ہے۔ دوسرا اعتراض "ملحد با خبر" پر ہے۔ التماس ہے کہ شاعر اُسے خود "باخبر" کا خطاب نہیں دیتا بلکہ یہ لفظ طنزیہ ہے یعنی "بزعم خود باخبر" ملحد ذات باری کے انکار سے گویا اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ باخبری کا مدعی ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ شاید اصغر صاحب کی حیات میں حضرت آزاد کے اس فقرہ پر کہ "اگر اہل نظر نے کافی دلچسپی لی تو ممکن ہے کہ یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہے"، ممکن ہے کہ موصوف کے آئندہ مضامین کا خیر مقدم کرتا لیکن اب تو اصغر صاحب ایسے عالم میں پہونچ گئے ہیں کہ رد و قبول سے بے نیاز ہیں نیز اگر کوئی مشورہ قابل قبول ہوتا تو مرحوم خود ہی اپنے کلام میں تغیر و تبدل کر سکتے تھے اب تو یہ حق کسی کو بھی نہیں اس لیے میں جناب آزاد سے دست بستہ استدعا کروں گا کہ اصغر صاحب کے کلام کے حسین و جمیل پہلو کو مدنظر رکھ کر اُس سے لطف اندوز ہوں اور عیوب سے چشم پوشی فرما کر مرحوم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ کیونکہ سہو و خطا خاصہ بشری ہے۔ جس سے کوئی بڑے سے بڑا انسان بچ نہیں سکتا۔ والسلام

ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری

سنہ ۱۹۳۶ء ہی نہیں عصر حاضر کی تاریخ میں ۱۰ دسمبر ایک یادگار دن رہے گا جب شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم نے تخت و تاج سے اپنی دست برداری کا اعلان کیا۔ یہ عظیم الشان واقعہ تاریخ برطانیہ میں عدیم المثال ہے۔ پہلی مرتبہ ایک برطانوی بادشاہ نے برضا و رغبت تخت و تاج چھوڑا۔ یوں بھی تاریخ عالم میں اس کی نظیر ملنا دشوار ہے قصہ کہانیوں میں تو سنا کرتے تھے کہ فلاں بادشاہ نے کسی کے فراق میں سلطنت چھوڑ کر فقیری لے لی لیکن واقعات کی دنیا میں ایسی مثال دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ ایڈورڈ ہشتم نے ثابت کر دیا کہ ابھی دنیا میں معجزوں کا دور ختم نہیں ہوا۔ نپولین نے فرانس کے لیے جوزیفائن کو مصطفےٰ کمال نے ترکی کے لیے لطیفہ خانم کو چھوڑا تھا لیکن ایڈورڈ ہشتم نے مسز سمپسن کے لیے سلطنت برطانیہ کو تج دیا۔ نپولین اور مصطفےٰ کمال کی قربانیاں عظیم الشان سہی ایڈورڈ کا ایثار بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں۔

یہ واقعہ مختلف حیثیتوں سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس آئینہ میں دنیا والوں نے دنیا کی سب سے زبردست سلطنت کے ہر دلعزیز بادشاہ کی مجبوری و بیکسی کا منظر دیکھا۔ وہ تاجدار جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ اپنی مرضی سے شادی کر سکے۔ دنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال ملک میں آزادی رسائے کے علمبرداروں نے اپنے محبوب حکمراں کو انتخاب ازدواج میں آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ اور رسم و رواج کی قربان گاہ پر ایک جلیل القدر فرمانروا کو بھینٹ چڑھا دیا۔ ۱۰ دسمبر سے ایک روز قبل تک برطانوی رسائے عامہ متفقہ آواز سے ایڈورڈ ہشتم کی معزولی کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیتی رہی لیکن اس کے بعد اس نے سکون قلب سے اس دست برداری کو دیکھا اور اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

کیا یہ عبرت کا مقام نہیں کہ جس ملک میں ہر فرد کو اپنے نجی معاملات میں قطعی آزادی حاصل ہو وہاں کا فرمانروا رسم و رواج کے بندھنوں میں اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔

مسز سمپسن ایک امریکن نژاد خاتون ہیں اور طبقۂ عوام سے تعلق رکھتی ہیں ان کے پہلے دو شوہر ہنوز بقید حیات ہیں جن سے وہ طلاق حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی بارگاہ حسن میں ایڈورڈ ہشتم نے بھی نذرانہ دل پیش کیا۔ اخلاقیات عامہ کے خود ساختہ محافظ اس کی اجازت کب دے سکتے تھے ادھر شہنشاہ کے دل میں اس سودے کی لگن تھی۔ مجبوراً اُن کو تخت و تاج بعینامہ میں دینا پڑا اور وہ یہ کہتے ہوئے اپنے ملک اپنی قوم اور اپنی حکومت سے رخصت ہوئے۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم　　شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ہندوستانیوں میں چھوت چھات کے ذات پات کی تفریق ہے۔ فرقہ بندیاں ہیں انھیں میں سے کچھ لوگوں کے متعلق ترجمان حقیقت نے کہا ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یہاں شادیوں پر پابندیاں ہیں۔ نوجوانوں اور لڑکیوں کو اپنی مرضی سے شریک حیات کے انتخاب کا حق حاصل نہیں ہے۔ مہذب انگلستان اپنے باشندوں کو آزادی رسالے اور آزادی عمل کی نعمتیں بخشنے کا مدعی ہے لیکن دنیا نے دیکھا کہ ہندوستانی تو راجہ کے گھر آئی رانی کہلانے کے قایل ہیں اور انگلستان کا شہنشاہ محض اس وجہ سے شادی نہیں کر سکتا کہ اس کی محبوبہ طبقہ عوام سے ہے اور مطلقہ ہے۔ غیر ملکی ہونا تو کوئی وجہ اختلاف نہیں خود ملکہ میری بھی نسلاً انگریز نہیں ہیں۔ شاہی خاندان کا ہونا بھی ضروری نہیں کہ اکثر بیگمات برطانیہ کو یہ شرف حاصل نہیں تھا۔ عام ہندوستانیوں کے نزدیک بادشاہ کا تخیل یہ ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ انھیں حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ اتنا مجبور ہے کہ اپنی رائے سے شادی بھی نہیں کر سکتا۔

آج جب ایڈورڈ ہشتم محض ڈیوک آف ونڈسر ہیں ہر شخص اُن کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرنے کے لیے آزاد ہے جتنے مُنہ اتنی باتیں کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے سلطنت کے فرائض کو چھوڑ کر اور ایک معمولی عورت سے رشتہ محبت کو استوار کر کے کمزوری اور عدم اہلیت کا ثبوت دیا لیکن معترض بھُول جاتے ہیں

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق والوں کی دنیا میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

ایڈورڈ ہشتم بادشاہ ہونے کے باوجود ایک انسان تھے پہلو میں دل رکھتے تھے پھر جب وہ دل مسز سمپسن کے حُسن دیوانہ ساز پر وارفتہ ہو چکا تھا اور وہ شادی کا عہد کر چکے تھے کیا عہد شکنی کرتے اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا تو پھر دنیا میں مُنہ دکھانے کے قابل بھی رہتے کیا دنیا انھیں "رسوائے جہاں عاشق" کے لقب سے یاد نہ کرتی اور یہ سب کچھ بھی برداشت کر لیا جاتا تو کیا مسز سمپسن کی لگن ان کے دل سے نکل جاتی۔ ممکن تھا کہ وہ اپنا دل خون کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن کیا اس کی تلخ یاد اُن کی شاہانہ زندگی کو اجیرن نہ بنا دیتی کیا قدم قدم پر انھیں اپنی مجبوریوں کا دلشکن احساس نہ ہوتا۔ کیا وہ اُس کے بعد دیانتداری سے سلطنت کی خدمات انجام دے سکتے تھے۔ سلطنت چھوڑ دینے میں سوائے اپنی ذات کے کسی کا نقصان

نہ تھا۔ ان کا جانشین بغیر کسی قسم کی دقت کے عنان حکومت سنبھال سکتا تھا۔

جواں سال ایڈورڈ ایک اولوالعزم انسان ہیں۔ ان کو بادشاہی ترکۂ پدری میں ملی تھی وہ بادشاہ محض اس حسن اتفاق سے تھے کہ وہ جارج پنجم کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی ذاتی حیثیت کو اس میں دخل نہ تھا اس گراں باری کو انھوں نے ایک مقدس فرض سمجھ کر اختیار کیا تھا لیکن وہ اس کی خاطر اپنی انفرادیت کو فنا کر دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ بادشاہ سے زیادہ ایک انسان تھے اور بادشاہی کے فرائض سے زیادہ انسانی فرائض کو اہمیت دیتے تھے۔ جہاں بادشاہی اور انسانیت کا تصادم ہوتا نظر آیا انھوں نے کمال حوصلہ مندی بادشاہی کو خیرباد کہہ دیا جس امتحان و آزمائش میں ایڈورڈ ہشتم کو ڈالا گیا تھا اس میں بادشاہ کو شکست اور انسان کو فتح ہوئی۔

ایڈورڈ ہشتم خاندان ہنوور[۵۱] (بحالت موجودہ ونڈسر[۵۲]) کے چشم و چراغ ہیں۔ مسز سمپسن کے ساتھ ان کا رابطۂ محبت خاندان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ جارج اول نے مختلف خواتین کو اپنے عشرت خانہ کی زینت بنایا اور ان کو عوام کے زمرے سے نکال کر طبقۂ امرا میں شامل کیا۔ ڈچز آف کنڈل[۵۳] اور کاؤنٹس آف ڈیلنگٹن[۵۴] تاریخ سے ناآشنا نام نہیں ہیں۔ جارج دوم نے بھی اپنی ملکہ کی حیات میں اور وفات کے بعد اکثر نازنینوں سے عشق و محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ جارج سوم نے خفیہ شادی کی۔ جارج چہارم نے بزمانۂ ولیعہدی مسز فٹز ہربرٹ[۵۵] سے شادی کی جن کے وہ تیسرے شوہر تھے اور تخت نشین ہو جانے کے بعد "باغراض سلطنت" شہزادی کیرولین برنسوک[۵۶] سے عقد کیا۔ عیسائی ہوتے ہوئے بیک وقت دو بیویاں رکھیں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا لیکن پھر بھی یہ چاروں جارج سریر آرائے سلطنت رہے۔ ایڈورڈ ہشتم کا جرم صرف اس قدر تھا کہ انھوں نے اپنے عشق کے افسانہ کو حقیقت کا رنگ دینا چاہا۔ صنف نازک کے ایک فرد کو ایسی حالت میں جبکہ وہ صاحب اورنگ تھے جو زبان دی تھی اُسے نبھانا چاہا۔ ممکن تھا کہ وہ مسز سمپسن کے ساتھ معصیت کی زندگی بسر کرتے اور تخت و تاج بھی برقرار رہتا۔ مسز سمپسن سے ان کی شناسائی آج سے نہیں سنہ ۱۹۲۰ء سے تھی۔ شاہی محفلوں اور مجلسوں میں مسز سمپسن برابر شرکت کرتی تھیں۔ پرنس آف ویلز کے ساتھ رقص بھی ہوتے تھے۔ ہوٹلوں میں قیام بھی ہوتا تھا تفریحیں بھی کی جاتی تھیں لیکن انگلستان میں کوئی انگلی اُٹھانے والا نہ تھا۔ جسے دیکھو ایڈورڈ پرنس آف ویلز کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ فرمانروا ہونے کے بعد جب انھی مسز سمپسن کو

---

۵۱ Hanover ۵۲ House of Windsor

۵۳ Duchess of Kendal ۵۴ Countess of Dailinglon

۵۵ Mrs Fitzherbert ۵۶ Princess Caroline Burnswick

ایڈورڈ نے اپنے عقد میں لانا چاہا تو گویا ایک ایوان حکومت اور کلیسا میں زلزلہ آگیا۔ یعنی شروع میں سب کچھ آزادیاں دے کر قوم اس کا نتیجہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای   باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ایڈورڈ نے عصیت کی زندگی پر پاکبازی کو ترجیح دی اور برطانیہ کی قدامت پسندی پر قربان ہو گئے۔ انھیں شہید محبت کہہ لو یا کشتۂ رسم و رواج۔

اس ڈراما کے دونوں کرداروں کے لیے انسانی دل جذبات احترام و ہمدردی سے معمور ہو جاتا ہے۔ قیس و لیلیٰ، فرہاد و شیریں کی داستانیں پارینہ ہو چکی تھیں۔ اب ایڈورڈ اور مسز سمپسن کا دور تھا۔ بے درد دنیا نے قیس و فرہاد کو محروم التفات رکھا۔ ایڈورڈ کے ساتھ بہتر سلوک کیوں کرتی۔

مسز سمپسن کو ایڈورڈ کی حکومت میں شرکت کی تمنا نہ تھی خود ایڈورڈ بھی اس کے لئے تیار تھے کہ انھیں حکومت سے کوئی تعلق نہ ہو اسی لیے انھوں نے "مورگینے ٹک میرج"[1] کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن دنیا کو یہ بھی ایک آنکھ نہ بھائی۔ ایڈورڈ نے اپنی الوداعی تقریر میں قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے جانشین بھائی کے متعلق کس قدر پرحسرت انداز میں کہا تھا۔

"انھیں وہ نعمت غیر مترقبہ حاصل ہے جو آپ میں سے بھی اکثر لوگوں کو میسر ہے اور جو مجھے نہ بخشی گئی ایک خوش و خرم گھرانا بیوی اور بچے۔"

چالیس سال کی عمر تک تجرد کی زندگی بسر کرنے کے بعد انھیں تجربہ ہو گیا تھا کہ سلطنت کی خشک مصروفیات کی گرانباری کو ہلکا کرنے کے لیے حسن و عشق کی رنگینیاں ضروری ہیں اور وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ سرکاری فرائض کو اس وقت تک ادا نہیں کر سکتے جب تک کہ ایک سکون بخش نازنیں زینت پہلو نہ ہو۔

---

[1] Morganatic marriage. اس لفظ کا اُردو ترجمہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اُردو والوں میں اس قسم کی شادی کا کبھی رواج نہ تھا۔ اس کو غیر مساوی شادی کہہ لیجئے جس میں بیوی اور بچوں کو شوہر کی حیثیت وحشمت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ بیوی صرف ایک مقررہ تحفہ کی مستحق ہوتی ہے جو صبح زفاف میں بطور رسم شادی کے اس کو دیا جاتا ہے۔ شادی کے وقت دولھا بجائے دائیں ہاتھ کے دلہن سے بایاں ہاتھ ملاتا ہے اور یہ طریقہ شادی کا اس وقت برتا جاتا ہے جب شوہر ذی حیثیت ہو اور بیوی رتبہ میں اس سے کمتر۔ ایڈورڈ نے چاہا تھا کہ قوم کو اپنی ملکہ کے انتخاب کا حق حاصل ہے تو مجھے اپنی بیوی کے انتخاب کا۔ میں شادی کر لوں لیکن مسز سمپسن ملکہ نہ بنائی جائیں۔ وزیر اعظم نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ بادشاہ کی بیوی لازماً ملکہ ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ نوٹ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جارج چہارم نے مسز فٹز ہربرٹ سے ایسی ہی شادی کی تھی۔

جہاں تک قانون کا تعلق ہے سربرآرائے برطانیہ بھی مطلق العنان ہے۔ پارلیمنٹ کا کوئی بل بغیر شاہی
منظوری کے قانون نہیں بن سکتا اور بادشاہ جس بل کو چاہے مسترد کر سکتا ہے فوج کا تقرر اور برخاستگی
غیر ممالک سے صلحناموں کی تکمیل اور اعلان جنگ، دارالامرا کے اراکین کا تقرر، مقدمات کا آخری اپیل، یہ
سب امور بادشاہ کے اختیارات خصوصی میں شامل ہیں۔ لیکن یہ کاغذی باتیں ہیں عملی دنیا میں ان کا کوئی
اثر نہیں۔ اگر مجلس وزرا کے فیصلہ کے خلاف بادشاہ ان میں سے کسی ایک اختیار پر بھی عمل پیرا ہونا چاہے
تو شاید ایک دن بھی اپنی حکومت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ صدیوں سے ان کا استعمال نہیں ہوا ہے اور اب
حالت یہ ہے کہ جس طرح سلطنت مغلیہ کے دور انحطاط اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد عروج میں "ملک بادشاہ
کا اور حکم کمپنی بہادر کا"، تھا اسی طرح برطانیہ کے غیر تحریری آئین میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ "ملک بادشاہ کا
اور حکم وزیر اعظم بہادر کا"۔ منٹو مارلے اصلاحات کے عہد میں جب پہلی مرتبہ وائسرائے اور گورنر جنرل کی مجلس
انتظامیہ میں ایک ہندوستانی رکن مسٹر سنہا کے تقرر کا سوال پیش ہوا تو شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم نے آخر وقت تک
نہایت جوش اور خلوص کے ساتھ اس تجویز کی مخالفت کی لیکن کابینہ کے متفقہ فیصلہ کے سامنے اُن کو
جھکنا پڑا اور بالآخر مسٹر سنہا کا تقرر ہو کر رہا۔

بادشاہ کو اتنا بھی اختیار نہیں کہ اپنی زبان سے کوئی لفظ عوام کے سامنے کہہ سکے۔ اس کی تقریر میں
وہی ہوتا ہے جو اس کے وزرا اُس کے مُنھ سے کہلانا چاہتے ہیں۔ پارلیمنٹ کو جو شاہی پیغامات موصول
ہوا کرتے ہیں وہ دراصل حکومت وقت کے خیالات ہوتے ہیں جو بادشاہ کی زبان سے ادا کرائے جاتے
ورنہ بادشاہ کو پارلیمنٹ سے براہ راست تخاطب کا کوئی حق نہیں۔ ایڈورڈ ہشتم کی الوداعی تقریر کا پہلا جملہ
رسم زباں بندی کی غمازی کر رہا ہے۔

"بالآخر آج میں کچھ اپنے جی کی کہہ سکتا ہوں۔"

ایڈورڈ ہشتم نے جس زمانہ میں پرورش پائی وہ جمہوریتوں کا زمانہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد سے
یورپ کے براعظم نے متعدد انقلابات دیکھے ہیں۔ ایڈورڈ نے اپنی آنکھوں سے بہت تاج و تخت مٹتے
بادشاہتیں ختم ہوتے دیکھیں۔ ان کے زمانہ میں معمولی سپاہی اور آہنگر بڑی بڑی سلطنتوں کے ڈکٹ
اُنھوں نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی آویزش کا تماشا دیکھا تھا۔ زار و قیصر کے استبداد کی دھج
ان کے سامنے بکھیری گئی تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا اب تکلفات قیود اور استبداد سے آزاد ہونا
ہے۔ یہی چیز ان کی زندگی میں نمایاں تھی۔ سربرآرائے حکومت ہونے کے بعد سے اُنھوں نے اپنی جدت پسن
کا مظاہرہ کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا اور ہمیشہ روایات قدیم کی دھجیاں اڑانے کی کوشش کرتے ر

اس تھوڑے ہی عرصہ کی حکومت میں ان سے بہت سے ایسے کام سرزد ہوئے جن کی توقع برطانیہ کے قدامت پرست بادشاہ سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مزدوروں سے ملنا۔ عوام سے علانیہ ہمدردی کا اظہار کرنا۔ امور سلطنت میں اثرانداز ہونا حکومت وقت کے لیے اضطراب و کشمکش کا باعث ہو سکتا تھا۔ مسٹر اسٹینلے بالڈون نے اکثر ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ تاج برطانیہ اپنے بہت سے خصوصی اختیارات سے محروم ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے وہ بھی غالبًا اس کو سمجھتے تھے اور ترک سلطنت سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ آئین ملک کا ان کی نگاہ میں کس قدر احترام تھا اور وہ اپنی قوم کے جذبات کی کتنی پاسداری کرتے تھے۔

ان کی شادی میں کوئی آئینی دقت سد راہ نہ تھی۔ برطانیہ کی کتاب القوانین میں کوئی آئین ایسا موجود نہیں ہے جس کی رو سے بادشاہ وقت کو اپنی شادی کے لیے کسی دوسرے کی منظوری حاصل کرنا پڑے صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ بادشاہ کی بیوی پروٹسٹنٹ ہو گی۔ اگر وزیر اعظم اور ان کی حکومت بادشاہ کی شادی سے متفق نہیں تھے تو وہ ان کو مستعفی ہونے پر مجبور کر سکتے تھے اور پارلیمنٹ کی کسی دوسری پارٹی سے ترتیب وزارت کا کام لے سکتے تھے اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہوتی تو ان کو یہ اختیار تھا کہ وہ پارلیمنٹ کو برخاست کر دیتے اور اپنی شادی کے مسئلہ کو بنائے انتخاب قرار دے کر عوام کی رائے حاصل کرتے۔ عوام کے طبقہ میں ان سے ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ کشمکش کے زمانہ میں ان کو ہزاروں پیغامات ہمدردی کے موصول ہوتے رہے لیکن انھوں نے اس کا فائدہ اٹھانا مناسب تصور نہ کیا۔ کیونکہ ایسی صورت میں ملک کے اندر ایک بادشاہ پارٹی وجود میں آتی اور خانہ جنگی پھیل جاتی۔ یورپ جس نازک مرحلے سے اس زمانہ میں گذر رہا ہے اس میں یہ چیز حکومت برطانیہ کی استقامت کے لیے مخدوش ثابت ہوتی۔ ایڈورڈ کو اپنی ذات سے زیادہ اپنے ملک کا پاس تھا۔

ایڈورڈ ہشتم کی شادی کی مخالفت وزیر اعظم نے تنہا اپنی ذمہ داری پر کی۔ اس میں انھوں نے اپنے رفقا رکار سے بھی مشورہ نہیں لیا۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی جو وزیر اعظم نے اپنے سر لی۔ مسٹر چرچل نے بہت زور دیا کہ انقطاعی فیصلہ سے قبل پارلیمنٹ کی رائے ضرور حاصل کر لی جائے۔ کرنل ویجوڈ نے تو اس موضوع پر بادشاہ کی حمایت میں ایک ریزولیوشن دارالعوام میں پیش کرنے کا نوٹس بھی دیا لیکن حکومت اس نازک مسئلہ پر عام بحث و مباحثہ مناسب نہیں سمجھتی تھی اس لیے اس کی پیشی کی نوبت نہیں آئی۔ برطانوی قوم نے اس نازک موقع پر جس قدر ضبط اور نظام کا ثبوت دیا ہے وہ حیرت انگیز ہے اگر کوئی اور ملک ہوتا تو خدا جانے کیا صورتیں پیش آتیں۔ یہ واقعہ آئین برطانیہ کے استحکام کی ایک ناقابل تردید شہادت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایڈورڈ نے اپنے فیصلہ سے برطانوی تاج کو مستحکم کر دیا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ایڈورڈ رخصت نہیں ہوئے تاج برطانیہ کا اقتدار رخصت ہو گیا۔ اب تک سیاسی معاملات میں تاج کو مجبوریاں تھیں۔ اب نجی اور معاشرتی معاملات میں بھی تاج کے اختیارات سلب ہو گئے۔ تاجدار برطانیہ کی حیثیت اب محض زیبائشی ہے اور وہ اپنی بقائے حکومت کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری کا رہین منت ہے۔

اس کشمکش میں جو دسمبر ۱۹۳۶ء کے ابتدائی ہفتوں میں برطانیہ میں جاری تھی رعایا اور قدامت پرستی کو ایک جانب اور انسانیت و محبت کو دوسری طرف یادگار زمانہ فتوحات حاصل ہوئیں سلطنت برطانیہ کا مورخ ایڈورڈ ہشتم کے نام کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

"تماشائی"

جہان آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

سواد منزل موہوم گرد راہ کی ہے
فنا کا جلوۂ رنگیں تھکن نگاہ کی ہے

نہ کوئی حرف شکایت نہ کوئی کلمہ شوق
جگر سے تا بہ زباں اک لکیر آہ کی ہے

کرے گا کون تماشائے دُرّۂ تعذیر
بہت بڑھی ہوئی ہمت مرے گناہ کی ہے

نظر ہے رخ کے تغیر پہ بے پرسش حال
قلم نصیب کا اب تو زباں گواہ کی ہے

خودی مٹے تو نظر آئے شاہد مقصود
جو کچھ ہے آڑ اسی پردۂ سیاہ کی ہے

پڑے ہیں آنکھوں پہ جوش شباب میں پردے
اندھیری رات میں گل روشنی بھی راہ کی ہے

فریب خوردہ دل اس کا تو فیصلہ کر لے
یہ نور حسن ہے یا روشنی نگاہ کی ہے

تہ زمیں نگہ امتیاز کیا دیکھے
یہاں تو ایک ہی صورت گدا و شاہ کی ہے

خدا سے پوچھ نشان آرزو شہیدوں کا
جھلک لہو کی بھی سبزی میں اس گیاہ کی ہے

جہان آرزو

"دل کے بادشاہ" سے

(جناب منشی سید عقیل احمد جعفری صاحب خیر آبادی)

حریت، قید سے خورسند نہیں ہو سکتی
بو، چمن کی کبھی پابند نہیں ہو سکتی

نیک و بد، شاد بہم رہ نہیں سکتے ہرگز
روشنی، شب سے رضامند نہیں ہو سکتی

تاج زرتار کو بھی سر سے جدا کرتے ہیں
کہیں آزاد بھی پابند ہوا کرتے ہیں

سنت قیس کی تجدید مبارک ہو تجھے
حضرت عشق کی تائید مبارک ہو تجھے

شاہ اڈورڈ، عجب کام کیا ہے تو نے
یہ "بڑا دن" یہ "نئی عید" مبارک ہو تجھے

ہو مبارک تجھے یوں بے سر و ساماں ہونا
ہو مبارک تجھے اب صاحب عرفاں ہونا

حق سے آگاہ ہوا، کفر جو توڑا تو نے
حکمراں دل کا ہوا، تخت جو چھوڑا تو نے

محو تھی خواب اسیری میں شہنشاہی بھی
جاگ اٹھی خواب سے اس کو جو جھنجھوڑا تو نے

شاہ لندن کا تھا، اب شاہ جہاں کا ہے تو
ماہ مغرب کا تھا، اب "نور" یہاں کا ہے تو

خوش ہوئے دیکھ کے ایمان کا حامل تجھ کو
ہم سمجھتے تھے بہت پہلے سے کامل تجھ کو

عین اسلام ہے یہ، راہ مساوات تری
شرق سے نسبت دیرینہ ہے حاصل تجھ کو

رخ محبوب چھوئے کون بھلا، گل کے سوا
کوئی ثانی نہیں تیرا "شہ کابل" کے سوا

روح آزادی نہ داخل ترے تن میں تھی جب
شاہ تھا، دشت نوردی نہ یوں بن میں تھی جب

ہند شیدا تھا ترے نام کا جب بھی، یہ نہیں
مثلِ گل، بو تری محبوس چمن میں تھی جب

ہند سے ایک یہ نسبت بھی ہے تجھ کو اڈورڈ
ہم سبق تھا کبھی تیرا، مرا "نہرو" اڈورڈ

مثنویات

اردو زبان کی مثنویوں پہ قابل دید تبصرہ از منشی امیر احمد علوی صاحب۔ قیمت ۱۲؍
الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

نظرے خوش گذرے

ادھر چھ ہفتہ سے طبیعت برابر بدمزہ رہی۔ اُس پر انتخابی مہم کے سلسلہ میں دو ہفتے متواتر عام جلسوں میں شریک ہوکر تقریریں کرنا پڑیں۔ نتیجہ یہ کہ الناظر کی خدمت میں ہرج واقع ہوا۔ اور اس نمبر کے لئے کچھ لکھنے کا موقع نہ ملا۔

مرزا داغ کے شاگردان رشید میں منشی محمد حیات بخش رسا بھی شامل تھے۔ وہ کاسنہ ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے کچھ عرصہ تک دربار رامپور سے تعلق رہا اور ۱۹۳۱ء میں انتقال کر گئے۔ کوئی اولاد ترینہ نہیں چھوڑی اور جن عزیزوں یا شاگردوں کے پاس اُن کا کلام ہے اُنھوں نے بھی چھپوانے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ اُن کے شاگردوں میں حضرت جگر مرادآبادی، مولانا تاجور نجیب آبادی اور جناب آفسر میرٹھی جیسے حضرات بھی ہیں۔ اب مکرمی جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب وکیل غازی آباد نے مولانا احسن مارہروی اور پروفیسر عبداللہ صاحب کامل کی امداد سے جو کلام فراہم کیا ہے اُس سے سردست ایک مجموعہ مرتب ہو گیا ہے اور اس خیال سے الناظر میں شائع کیا جاتا ہے کہ ایک خوشگو شاعر کا کلام محفوظ ہو جائے۔ بقیہ کلام بھی اگر دستیاب ہو گیا تو آئندہ کسی وقت مکمل دیوان کی اشاعت ہو سکے گی۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنے سلسلۂ منتخبات میں رسا کا کچھ کلام شائع کیا تھا اور تذکرۃ الشعرا میں مختصر حالات قلمبند کیے ہیں۔ خمخانۂ جاوید میں لالہ سری رام نے بھی بہت کچھ ثنا و صفت کی ہے اور شعر الہند میں بھی مرحوم کا ذکر داغ کے ممتاز تلامذہ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ مولوی اظہار الحسن صاحب کا ارادہ ہے کہ اس مجموعہ کی طباعت کے بعد دیباچہ تحریر فرمائیں گے جس میں شاعر کے ضروری سوانح بھی آجائیں گے۔

یہ مجموعہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ امید ہے کہ اسی ششماہی کے اندر شائع ہو جائے گا۔

عزیزی محمد عارف سلمہ خلف منشی منظور علی صاحب (مولف واقعات کربلا) بی اے میں پڑھتے ہیں۔ اُن کے ادبی ذوق کا نتیجہ "غریب" ہے۔ اس ننھی منی کتاب میں غریب، قربانی، آزادی اور مزدور کے عنوان سے چار دلچسپ اور سبق آموز ملبسر او افسانے ہیں افسانوں کی زبان صاف اور سلیس ہے تو خیالات عمدہ اور نفیس۔ جو صاحب چاہیں ۳ کے ٹکٹ بھیجکر دفتر الناظر سے طلب کر لیں۔

بنامِ خداوندِ جہاں آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۲ | فروری ۱۹۳۷ء | جلد ۴۳

فہرست مضامین

قیمت:۔ فی پرچہ ۵ر، ۲ روپے

پرانے رسالے

حسب ذیل رسائل کا ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو طلب فرمائیں
(محصول وغیرہ ذمہ خریدار ہوگا)

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ اردو

نمبر	جلد	رسالہ	قیمت
نمبر۲	جلد اول	اپریل سنہ ۲۱ء	ع ر
۱۳	جلد ۴	جنوری سنہ ۲۴ء	ع ر
۱۴		اپریل سنہ ۲۴ء	ع ر
۱۵		جولائی سنہ ۲۴ء	ع ر
۱۶		اکتوبر سنہ ۲۴ء	ع ر
۱۷	جلد ۵	جنوری سنہ ۲۵ء	ع ر
۱۹		جولائی سنہ ۲۵ء	ع ر
۲۰		اکتوبر سنہ ۲۵ء	ع ر
۲۱	جلد ۶	جنوری سنہ ۲۶ء	عہ ر
۲۲		اپریل سنہ ۲۶ء	عہ ر
۲۳		جولائی سنہ ۲۶ء	عہ ر
۲۵	جلد ۷	جنوری سنہ ۲۷ء	عہ ر
۲۶		اپریل سنہ ۲۷ء	عہ ر
۲۷		جولائی سنہ ۲۷ء	عہ ر
۲۹	جلد ۸	جنوری سنہ ۲۸ء	عہ ر
۳۰		اپریل سنہ ۲۸ء	عہ ر
۳۱		جولائی سنہ ۲۸ء	عہ ر
۳۴	جلد ۹	اپریل سنہ ۲۹ء	عہ ر
نمبر ۳۵		جولائی سنہ ۲۹ء	عہ ر
۳۶		اکتوبر سنہ ۲۹ء	عہ ر
۳۷	جلد ۱۰	جنوری سنہ ۳۰ء	عہ ر
۳۸		اپریل سنہ ۳۰ء	عہ ر
۳۹		جولائی سنہ ۳۰ء	عہ ر
۴۰		اکتوبر سنہ ۳۰ء	عہ ر
۴۱	جلد ۱۱	جنوری سنہ ۳۱ء	عہ ر
۴۲		اپریل سنہ ۳۱ء	عہ ر
۵۵	جلد ۱۴	جولائی سنہ ۳۴ء	عہ ر
۵۶		اکتوبر سنہ ۳۴ء	عہ ر
۵۷	جلد ۱۵	جنوری سنہ ۳۵ء	عہ ر
۵۸		اپریل سنہ ۳۵ء	عہ ر
۵۹		جولائی سنہ ۳۵ء	عہ ر
۶۰		اکتوبر سنہ ۳۵ء	عہ ر

ہندستانی اکیڈمی کا سہ ماہی رسالہ ہندستانی

نمبر	جلد	رسالہ		قیمت
نمبر ۱	جلد ۱	جنوری سنہ ۳۱ء		عمہ ر
۲		اپریل سنہ ۳۱ء	مکمل جلد	عمہ ر
۳		جولائی سنہ ۳۱ء		عمہ ر
۴		اکتوبر سنہ ۳۱ء		عمہ ر

الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

بنام خداوند جاں آفریں

نمبر ۲ جلد ۴۳ فروری سنہ ۱۹۳۷ء

خلیفہ معتصم باللہ

(جناب مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے معلم تاریخ اسلامی جامعہ عثمانیہ)

(بسلسلہ ماہ گذشتہ)

سب سے پہلے اُس سازش کا ذکر کرنا ضروری ہے جو عباس بن مامون کے حق میں کی گئی تھی، کیونکہ افشین اور عُجَیف بن عنبسہ کے درمیان اسی وجہ سے دشمنی پیدا ہوئی تھی۔ افشین ماوراء النہر کے صوبۂ اشروسنہ[1] کا رہنے والا تھا، اور اُس کا تعلق قدیم ایرانی شاہی خاندان سے تھا۔ وہ خلیفہ کا ندیم اور معتمد علیہ تھا، اور اس سے قبل سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے مصر میں نام پیدا کر چکا تھا۔ اس کے بعد بابک کی طول وطویل بغاوت کا خاتمہ بھی اُسی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اب چونکہ معتصم نے افشین کو فوج کے میمنہ کا افسر مقرر کیا تھا، اس لیے وہ دوسرے سپہ سالاروں پر فائق تھا، اور فوجی ضبط وتنظیم میں بھی اُس کی بہت اہمیت تھی۔ اُس کی یہ ترقی عرب سپہ سالار عُجیف بن عنبسہ کو، جسے تھوڑی سی فوج دے کر زبطرہ بھیج دیا گیا تھا، ناگوار گذری۔ کیونکہ اب فوج میں اُس کی حیثیت محض ماتحت افسر کی سی رہ گئی تھی۔ عُجیف نے عباس کو، جسے مامون کی وفات کے بعد فوج کے ایک حصہ نے خلیفہ بنانا چاہا تھا، خلافت کا دعوے کرنے پر اُکسایا، اور اُسے

---

[1] دیکھو ادریسی (فرانسیسی ترجمہ) ج ۲۔ ص ۲۰۳ + اشروسنہ خجند اور سمرقند کے تقریباً بیچ میں واقع تھا۔ ابن جوزی (ورق ۱۱۰) کے مطابق افشین کوئی خاص نام نہ تھا، بلکہ اشروسنہ کے رئیسوں کا عام لقب تھا؛ اس کا اصلی نام حیدر بن کاؤس ہے۔

غیرت دلائی کہ وہ باپ کی وفات پر بے حس وحرکت بیٹھا رہا، اور لوگوں کو معتصم کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اجازت دے دی۔ عباس بھی آخر راضی ہوگیا۔ بہت سے عرب سپہ سالار اور بھی ایسے تھے، جنھیں ایتاخ اور اشناس کا عروج ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، کیونکہ وہ غیر عرب تھے، اور غلامی سے ترقی کرکے سپہ سالار بن گئے تھے۔ یہ لوگ بھی اس سازش میں شریک ہوگئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جوں ہی موقع ملے معتصم اور ان سپہ سالاروں کو، جو اُس کے ساتھ تھے، قتل کردیا جائے۔ چونکہ معتصم اُس وقت دریائے سلیسیا کے کنارے کوچ کررہا تھا، اور افشین کی ترکی فوجیں ملطیہ کے علاقے میں تھیں، اس لیے عجیف چاہتا تھا کہ فوراً کارروائی شروع کردی جائے۔ مگر عباس، باوجود اس کے کہ حکومت کا خواہشمند تھا، یہ نہ چاہتا تھا کہ خانہ جنگی شروع ہو۔ کیونکہ خلیفہ کے قتل سے یقیناً یہی ہوتا، اور فوج کے اتحاد کا خاتمہ ہوجاتا۔ محاصرہ عموریہ کے دوران میں احمد بن خلیل اور عمر الفرغانی دونوں سپہ سالاروں کی بے عزتی ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ معتصم تو افشین اور اُس کی ترکی فوجوں کی بہادری کا معترف تھا؛ اور دوسری طرف اشناس نے ان دونوں سپہ سالاروں کو، جو اُس کے ماتحت تھے، ولدالزنا کہہ دیا تھا۔ احمد بن خلیل مدتوں سے عباس اور اُس کے ہمدرد حرث السمرقندی سے ملا ہوا تھا، اور اس واقعہ کے بعد عمر الفرغانی بھی اس سازش میں شریک ہوگیا تھا۔ عموریہ کی فتح کے بعد عجیف نے انتظام کیا کہ مال غنیمت لوٹ لیا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طرح اہل فوج کو معتصم کے خلاف بھڑکائے، اور بے چینی سے فائدہ اُٹھاکر اپنا مقصد حاصل کرے۔ مگر سازشیوں کی یہ تجویز بارآور نہ ہوسکی۔ اول تو خود مفسدوں کا تذبذب سد راہ ہوا، اور پھر معتصم کے ذاتی تہور نے اُسے پورا نہ ہونے دیا۔ معتصم نے تلوار ہاتھ میں لے کر تمام فساد ختم کردیا، اور

سلہ ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۸۰ + ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۶۴ +

سلہ ایتاخ پہلے سلام الابرش کا غلام اور باورچی تھا۔ ۱۹۹ھ یا ۱۹۹ھ میں معتصم نے اسے خریدا اور اپنا باورچی بنایا۔ پھر بابک کے خلاف فوج دے کر بھیجا۔ اس کے بعد ایتاخ ترکی فوج میں ترقی کرتا گیا۔ اس کا نام ایتاخ، ایناخ اور ایتاخ لکھا جاتا ہے۔

سلہ یہ بھی ترکی غلام تھا۔ اس نے مامون کے عہد میں حلب کے قریب سندیس یا سندوس کا قلعہ فتح کیا تھا، اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ یہ ابن اثیر کا بیان ہے۔ اس نے قلعہ کا نام سدس بھی لکھا ہے۔

سلہ ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۴) نے بالکل صاف لکھا ہے کہ یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جب معتصم درہ میں سے گذر رہا ہو تو اُسے قتل کیا جائے۔ مگر ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۰) لکھتا ہے کہ یہ کام اُس وقت انجام پاتا جب کہ افشین ملطیہ سے ایشیائے کوچک جاتا، اور اُس کے بعد انقرہ پہنچتا، جہاں خلیفہ اُس کا انتظار کررہا تھا +

سلہ ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۷۹ +

کسی فرد بشر کو اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے بعد خلیفہ کے حکم سے تمام مال غنیمت مساوی طور پر تقسیم کیا گیا۔ [1] اس واقعہ کے بعد عمر الفرغانی کی بے احتیاطی سے خلیفہ کو سازش کا علم ہوگیا۔ معتصم کے خدام میں ایک نوجوان تھا، جس سے عمر کو بہت محبت تھی۔ مال غنیمت کے تاراج کی جو کوشش کی گئی اُس کے دوسرے دن شام کو عمر کی ملاقات اس نوجوان سے ہوئی۔ اس لڑکے نے تمام واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے معتصم کے عزم وحزم کی تعریف کی۔ عمر نے یہ سُن کر اُسے مشورہ دیا کہ ایسے شور وشغب سے دور رہا کرے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو خود خلیفہ کی خدمت میں زیادہ رہنے سے بھی پرہیز کرے۔ عمر اور احمد کی واپسی کے بعد، چونکہ ان دونوں نے اشناس کے ہاتھوں اپنی بے حرمتی کی شکایت کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں کسی دوسرے سپہ سالار کے ماتحت کر دیا جائے، اس لیے اس نوجوان کو عمر کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔ اُس نے تمام باتیں خلیفہ کے سامنے عرض کر دیں۔ اس کا علم ہوتے ہی معتصم نے عمر کو بُلایا، اور اُس سے پوچھا کہ اُس شور وشغب کی رات کو اُس نوجوان سے کیا کیا کہا تھا۔ عمر اُس وقت اتنا مدہوش تھا کہ اُسے معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور تمام گفتگو خلیفہ کے سامنے دُہرادی۔ معتصم نے عمر کو ایتاخ کے پاس نظر بند کر دیا۔ احمد بن خلیل نے جب یہ سُنا تو اُس نے خلیفہ کی خدمت میں باریابی کی درخواست کی۔ چونکہ اشناس مانع ہوا، اس لیے اُس نے حرث السمرقندی سے اس سازش کے متعلق جو کچھ سُنا تھا اشناس کو بتا دیا۔ اب حرث کو گرفتار کیا گیا۔ اُس نے جرم کا پورا اقبال کیا، اور مفسدین کے نام بھی بتا دیے۔ لیکن ان مفسدوں میں افسران فوج کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ معتصم کو یقین نہ آیا۔ واقعہ کی صداقت معلوم کرنے کی غرض سے اُس نے عباس کو خوب شراب پلائی، اور بہت سے وعدے کر کے حقیقت حال دریافت کی۔ حرث نے جو کچھ کہا تھا، عباس نے اُس کی تصدیق کی۔ اب معتصم کو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے فوراً مجرموں کو یکے بعد دیگرے گرفتار کرایا؛ چند کو موت کی سزا دی، اور بعض کو زنجیروں سے جکڑوا کر وحشی درندوں کے سامنے ڈلوا دیا۔ عباس افشین کے سپرد کیا گیا۔ اُس نے اُسے منبج میں قید کیا؛ کھانے کو پیٹ بھر کر دیا، مگر پیاسا مار ڈالا۔ یہی انجام عجیف بن عنبسہ کا ہوا۔ عمر الفرغانی کو نصیبین میں زندہ دفن کرا دیا گیا۔ باقی ماندہ مجرم افسران فوج قتل ہوئے۔ اُس وقت سے عباس کو لعین کہا جانے لگا۔ اُس کے سب بھائی بہنوں کو بھی قید کر دیا گیا۔ صرف حرث کو خلیفہ نے معافی دی، کیونکہ اُسی نے سب سے پہلے سازش کی پوری اطلاع خلیفہ کو دی تھی۔

---

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۵) نے لکھا ہے کہ عباس مال غنیمت کی لوٹ کے دوران میں معتصم کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

معتصم کے خلاف اس گہری فوجی سازش کا یقیناً ایک نتیجہ یہ تھا کہ فوج کو نئے سرے سے ترتیب دینا ضروری سمجھا گیا۔ خلیفہ کو پورا اندازہ ہو گیا کہ عرب شیوخ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، اور انھیں بے دخل کر کے فوج کا انتظام ترکوں اور ایرانیوں کو سپرد کرنا لازمی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نو دولت اجنبی غلاموں میں بھی اتحاد اور یگانگت بہت دنوں تک قائم نہ رہی۔ رشک و حسد، بلند نظری، مال و دولت کا لالچ، اور قوت حاصل کرنے کا جذبہ، یہ سب باتیں بے اثر نہ رہیں۔ یہ لوگ ملک و ملت میں اجنبی تھے، اس لئے انھیں ان کی بہبودی کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ہم خلافت کے اُس المناک دور تک پہونچ گئے ہیں جب کہ اہم ترین واقعات عموماً سیاسی یا مذہبی تخیل سے پیش نہیں آتے تھے، اور خلیفہ کی ذات بھی قابل توجہ نہیں رہی تھی۔ اب واقعات کا سرچشمہ وہ مختلف سازشیں اور فتنے ہیں جو صوبوں کے والی اور سپہ سالار ذاتی مفاد کے لیے برپا کرتے تھے۔

افشین کو عبداللہ بن طاہر کے والی خراسان ہونے پر حسد تھا۔ اُس نے طبرستان کے اسپہبد، مازیار بن قارن کو خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا، اور وعدہ کیا کہ وہ اپنی فوج سمیت اُس سے مل جائے گا۔ کیونکہ افشین سمجھتا تھا کہ جب حالت نازک ہو گی تو اُسی کو فوج دے کر بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیا جائے گا، اور فتح پانے کے بعد عبداللہ بن طاہر کو آسانی سے بے دخل کیا جا سکے گا۔ مازیار خود بھی بغاوت پر آمادہ تھا۔ کیونکہ فتح طبرستان کے بعد دفتری لحاظ سے خلیفہ اور اسپہبد میں عبداللہ بن طاہر حائل تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ والیٔ خراسان ہونے کی حیثیت سے عبداللہ طبرستان کا بھی والی تھا۔ مگر مازیار کو یہ گوارا نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا تعلق براہ راست خلیفہ سے رہے، اور خراج بجائے خراسان بھیجنے کے خلیفہ کے پاس بھیجا کرے[1]۔ دوسری طرف افشین اور عبداللہ بن طاہر میں ان بن تھی۔ بابک کی بغاوت کے دوران میں افشین بڑی بڑی سرکاری رقمیں غبن کر کے اپنے وطن اشروسنہ بھیجتا رہتا تھا، اور عبداللہ اس کی اطلاع ہمیشہ خلیفہ کو دیتا تھا۔ ایک مرتبہ یہاں تک ہوا کہ افشین نے کچھ رقم چند آدمیوں کے ہاتھ اشروسنہ بھیجی۔ ان لوگوں کو عبداللہ نے چوروں کے بہانے سے گرفتار کر لیا، اور جو رقم اُن کے پاس نکلی اُسے اپنی فوج میں تقسیم کر دیا[2]۔ بہرکیف مازیار بن قارن کی بغاوت اتنی خطرناک تھی کہ خوف تھا کہ اُس کی وجہ سے تمام آذربائیجان اور شمالی میسوپوتامیا میں آگ لگ جائے گی۔ مگر عبداللہ بن طاہر اُسے فرو کرنے، اور ملک میں امن قائم رکھنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ خود طبرستان میں

[1] ابن اثیر ج ۶ - ص ۱۸۶ + ابن خلدون ج ۳ - ص ۲۶۵ +

[2] ابن اثیر ج ۶ - ص ۱۸۸ + ابن خلدون ج ۳ - ص ۲۶۸ +

ایک زبردست فریق مازیار کا مخالف تھا، کیونکہ وہ خانہ جنگی برپا کرکے، اور اپنے پیشرو کو قتل کرکے اسپہبد بنا تھا۔[1] خلیفہ کی اطاعت سے انحراف کے بعد مازیار نے اپنی رعایا سے خود مختار بادشاہ ہونے کی حیثیت سے وفاداری کی قسمیں دوبارہ لیں، اور اس خیال سے کہ وہ اپنی قسموں سے پھر نہ جائیں اُن سے یرغمال لیے۔ اس کے علاوہ جنگ کی تیاری کے لیے اُن پر بھاری محصول لگائے۔ جو شہر میدان میں واقع تھے اور جن کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ وہ اُن کی حفاظت نہ کرسکے گا، اُن کی فصیلیں مسمار کرا دیں اور باشندوں کو مجبور کیا کہ کوہستان میں پناہ لیں۔ اس طرح اُس نے آمل اور ساریہ کے باشندوں کو، ان دونوں شہروں کے درمیان ایک کوہستانی مقام ہرمز آباد[2] میں منتقل کیا۔ اُس نے طمیس[3]، آمل اور ساریہ کی فصیلیں بھی مسمار کرا دیں، اور ایک فصیل، جو بحیرۂ خزر تک پھیلی ہوئی تھی، اور جسے ایرانیوں نے ترکوں کی یورشوں سے محفوظ رہنے کے لیے تعمیر کرایا تھا، اُس کی مرمت کرائی۔

عبداللہ بن طاہر نے اپنے چچا حسن بن حسین کو ایک زبردست فوج دے کر جرجان کی طرف بھیجا،

---

[1] خلیفہ منصور کے عہد میں طبرستان فتح ہوا۔ مہدی کے زمانہ میں ۱۶۷ھ میں یہاں کے دو رئیسوں ونداہرمز اور شروین نے شورش پھیلائی۔ ہادی نے انھیں مطلع کیا۔ ۱۸۹ھ میں عہد ہارون الرشید میں مہرویہ الرازی کو طبرستان کی ولایت سے معزول کرکے اُس کی جگہ پہلے عبداللہ بن سعید کو، اور پھر عبدالملک بن مالک کو وہاں کا والی بنایا۔ ۲۰۱ھ میں مامون کے زمانہ میں عبداللہ بن خرداذبہ طبرستان کے کوہستانی علاقے پر قابض ہوا، اور وہاں کے رئیس شہریان (یا شہریار) بن شروین کو مجبور کیا کہ وہ میدانوں میں رہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ایک اور شہزادہ، مازیار بن قارن بن وندا ہرمز کو مامون کے پاس بھیج دیا۔ ۲۱۲ھ میں، جب محمد بن موسیٰ بن حفص، طبرستان کا والی تھا، شہریار بن شروین نے، جو کوہستانی علاقے کا مالک تھا، وفات پائی؛ اُس کا بیٹا سابور اُس کا جانشین ہوا۔ مگر مازیار بن قارن نے بغاوت کی اور سابور کو برطرف کرکے طبرستان کا مالک بن گیا۔ یہ تمام واقعات ابن اثیر اور ابن خلدون نے مختلف سنین کے تحت نقل کیے ہیں +

[2] ابن اثیر (ج ۶۔ص ۱۰۳) اور ابن خلدون (ج ۳۔ص ۲۶۵، ۲۶۶) نے اس کا نام ہرمز یار لکھا ہے۔

[3] ادریسی (ج ۲۔ص ۱۷۰، ۱۷۹) طمس یا طامس نام ایک شہر کا ذکر کرتا ہے، جو طبرستان میں واقع تھا۔ فرانسیسی مترجم نے اس کا نام ایک جگہ تمش اور دوسری جگہ تمسا لکھا ہے۔ لاطینی ترجمہ میں تیسم (Teisam) ہے۔ ادریسی نے لکھا ہے کہ طمس، ساریہ اور استرآباد کے درمیان راستے میں واقع تھا، اور استرآباد سے ساریہ جاتے ہوئے یہ شہر سب سے پہلے آتا تھا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ طمس جرجان کی سرحد پر تھا۔ اسی سے ہم قدیم قلعہ بند فصیل کے جائے وقوع کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ دوسرے مصنفوں نے بھی اس فصیل کا ذکر کیا ہے، اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ فصیل کسی زمانے میں ضرور موجود تھی۔ دیکھو رٹر (Ritter) کی کتاب (Erdkunde) ج ۸۔ص ۴۵۹ + ابوالفدا (جغرافیہ ص ۲۳۲) نے طبرستان کے مشرقی شہر کا نام تمیشہ لکھا ہے +

تاکہ وہ اُس طرف سے مازیار کا راستہ روک دے۔ پھر اُس نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام حیان بن جبلہ کے ساتھ چار ہزار آدمی قومس کے راستے کوہستان شروین[1] بھیجے۔ خود معتصم نے حکم دیا کہ ایک فوج براہ دنباوند[2] روانہ کی جائے، تاکہ جنوب مغرب کی طرف سے مازیار پر حملہ ہو سکے۔ باوجود ان حملوں اور تیاریوں کے مازیار اگر اپنی رعایا کی وفاداری اور خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو طبرستان کے ناقابلِ گذار پہاڑوں میں مدتوں تک خلیفہ کی فوجوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے آپ کو ظالم و جابر ثابت کیا، اور رعایا اُس سے متنفر ہو گئی۔ ہر طرف لوگوں نے دغابازی سے کام لینا شروع کر دیا۔ مازیار نے ایک فوج اپنے سپہ سالار سرخاستان کی سرکردگی میں ان خندقوں کی حفاظت کے لیے مقرر کی تھی جو طمیس اور سمندر کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے یہی فوجیں حسن بن حسین سے مل گئیں اور سرخاستان اور اُس کے بھائی کو حسن کے حوالے کر دیا۔ پھر اس کے بعد ہی مازیار کے چچا زاد بھائی، قارن بن شہریار[3] نے، جس کا باپ کسی زمانے میں طبرستان کا مالک رہ چکا تھا، حیان بن جبلہ سے خط و کتابت شروع کی، اور کہا کہ اگر اُس کے آباواجداد کی ریاست اُسے واپس دیے جانے کا وعدہ کیا جائے تو وہ کوہستان شروین اور ساریہ حیان کے حوالے کر دے گا۔ حیان نے اس کی اطلاع عبداللہ بن طاہر کو دی اور اُس نے یہ شرط منظور کر لی۔ قارن بن شہریار نے بہت سے فوجی افسروں، اور مازیار کے بھائی عبداللہ بن قارن کو جو اُس نواح کا سپہ سالار تھا کھانے کی دعوت دی، اور انھیں گرفتار کر کے حیان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد حیان نے کوہستان شروین اور ساریہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ خود مازیار کے بھائی قوہیار نے قارن کی پیروی کی۔ بغاوت کے آغاز میں عرب والی محمد بن موسیٰ بن حفص کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ قوہیار نے اُسے رہا کر کے

---

[1] شروین غالباً کوہستان البرز کے جنوب مغربی حصہ کا نام ہے۔

[2] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۹۳) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۶) نے دنباوند لکھا ہے، دماوند نہیں لکھا۔ حالانکہ اس پہاڑ کو عام طور پر دماوند ہی کہتے ہیں۔ ادریسی (ج ۲۔ ص ۶۷۱، ۱۰۱) نے دماوند ہی لکھا ہے۔ ابن خلکان نے ابوبکر شبلی کے ترجمہ میں دنباوند لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ بہت سے لوگ رے کے علاقے کے اس شہر کو دماوند کہتے ہیں، لیکن اس کا صحیح املا دنباوند ہی ہے۔ یہی بیان ابوالفداء (جغرافیہ ص ۴۴۰) کا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنباوند اور دنیاوند دونوں ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں صرف نقطوں کا فرق ہے۔ اسی وجہ سے مختلف قلمی نسخوں میں یہ لفظ دنیاوند اور دنباوند دونوں طرح لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔

[3] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۲۶۶) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۴) نے قارن بن شہریار کو مازیار کا بھتیجا بتایا ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ قارن غالباً اُس شاپور یا سابور کا بھائی تھا جسے مازیار نے حکومت سے برطرف کیا تھا۔

حیان کے پاس بھیج دیا۔ اس کے صلے میں اُس نے استدعا کی کہ کوہستانی علاقے کی حکومت، جو اُس سے قبل اُس کے آباؤ اجداد کے ہاتھ میں تھی اُسے دے دی جائے، اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کو بھی حیان کے حوالے کر دے گا۔ ممکن تھا کہ اس تجویز کو قبول کر لیا جاتا۔ مگر حیان نے غلطی سے قوہیار کے ایک قاصد کا گھوڑا چھین لیا؛ قوہیار نے قسم کھائی کہ وہ ایسے شخص سے کوئی معاہدہ نہ کرے گا۔ چنانچہ قوہیار مقررہ دن حیان کے پاس نہ آیا، بلکہ حسن بن حسین سے خط و کتابت شروع کی۔ حسن بسرعت تمام خرم آباد آیا، جہاں قوہیار نے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ان تمام باتوں کی جن کا وعدہ حیان کر چکا تھا توثیق کر دی۔ اب قوہیار نے اپنے بھائی مازیار کو یقین دلایا کہ اُس کے پاس مازیار کے لیے خلیفہ کے پاس سے معافی نامہ آ چکا ہے۔ ان باتوں پر اعتبار کر کے مازیار خود عربوں کے عسکر میں آ گیا[1]۔ ان لوگوں نے اُسے انھیں زنجیروں میں جکڑا جو اُس نے اپنی خود مختاری کے اعلان کے وقت والی طبرستان محمد بن موسیٰ بن حفص کو مقید کرنے میں استعمال کی تھیں۔ مازیار کو اس طرح گرفتار کرنے کے بعد دنباوند کا فوجی افسر محمد بن ابراہیم اُسے لیکر سامرہ گیا۔ یہاں اُسے بابک کے پہلو بہ پہلو مصلوب کیا گیا[2]۔ لیکن مازیار کا بے شمار خزانہ خلیفہ کے ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ قوہیار اپنی غداری کے بعد جب یہ خزانہ عربوں کی فوج میں لے جا رہا تھا تو مازیار کے مملوکوں نے اُسے قتل کر دیا اور خزانہ آپس میں تقسیم کر کے دیلم بھاگ گئے۔

---

[1] یہ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۲۶۷) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۱۸۴، ۱۸۵) کا بیان ہے۔ ابن خلدون نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ایک روایت کے مطابق مازیار کے ایک چچازاد بھائی نے دغا کی تھی۔ یہ شخص طبرستان کے تینوں پہاڑوں کی حکومت کا حقیقی دعویدار تھا، اور مازیار کو صرف میدانوں پر حکومت کرنے کا حق تھا۔ مگر اس نے اس چچازاد بھائی کو بے دخل کر دیا تھا۔ اب جب مازیار نے عربوں کی حکومت سے انحراف کیا تو اس نے اس بھائی کو بلایا، اور اس خیال سے کہ وہ عربوں کے خلاف اُس کی مدد کرے گا اُسے ایک بڑا عہدہ دے دیا۔ لیکن اس شخص نے حسن کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی، اور افشین اور مازیار کے درمیان جو نامہ و پیام ہوا تھا اُس کا ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کا آبائی علاقہ اُسے واپس دے دیا جائے تو مازیار کا ساتھ چھوڑنے کو تیار ہے۔ مامون کے وزیر حسن بن سہل نے طبرستان کی حکومت مازیار کے سپرد کی تھی، اور مازیار نے اپنے برادر عمزاد کو اُس کے آبائی علاقوں سے بے دخل کیا تھا۔ حسن بن حسین نے عبداللہ بن طاہر کی ایک تحریر اس غدار کے حوالے کی، جس میں تمام دعووں کی توثیق کی گئی تھی، اور انھیں تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے درہ ہائے کوہ کو غیر محفوظ چھوڑ دیا۔ عربوں نے مازیار کا محاصرہ کیا، آخر باغی نے اپنے آپ کو خلیفہ کی فوج کے حوالے کر دیا۔ ایک بیان کے مطابق اُسے شکار میں گرفتار کیا گیا تھا (ابن خلدون ج ۳۔ ص ۱۸۴)۔

[2] مازیار کو فوراً قتل نہیں کیا گیا۔ بلکہ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا افشین کے مقدمہ کے بعد مازیار کو سزا دی گئی۔ جس کی نوعیت کچھ اور ہی تھی۔ معلوم نہیں کہ مصنف نے مصلوب کیوں لکھ دیا ہے۔ ـ مترجم

طبرستان کی بغاوت سنہ ۲۲۴ھ میں ختم ہوئی۔ لیکن اسی دوران میں ایک اور شورش آذربائیجان میں ہوئی۔ اس میں بھی افشین کا ہاتھ تھا، یا کم از کم اس بغاوت کی ذمہ داری اُسی پر عائد ہوتی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ بابک کی جنگ کے خاتمہ پر خلیفہ نے افشین کو آذربائیجان کا والی مقرر کیا تھا۔ یہاں وہ خود نہیں گیا، بلکہ اپنے ایک رشتہ دار منکجور کو بطور نائب بھیج دیا۔ منکجور نے خلیفہ کو اطلاع دیے بغیر بابک کے خزانہ پر قبضہ کرلیا؛ اور جب صاحب البرید نے حسب ضابطہ اس کی اطلاع خلیفہ کو دی تو اُسے بھی قید کر دیا، اور چاہتا تھا کہ قتل کر دے۔ اُدھر جب اہل اردبیل نے منکجور کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا تو وہ اُن سے بھی لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایسی حالت میں معتصم نے افشین کو مجبور کیا کہ وہ منکجور کو آذربائیجان سے واپس بُلا لے چونکہ منکجور نے اطاعت سے انحراف کیا تھا اس لیے خلیفہ نے بُغا ترک کو فوج دے کر اُس کے خلاف بھیجا۔ بُغا نے اُسے اردبیل سے نکال دیا۔ پھر منکجور نے بابک کے ایک قلعہ پر، جسے اُس نے دوبارہ مستحکم کر لیا تھا قبضہ کر کے وہاں پناہ لی۔ مگر مازیار کی طرح اُس کے چند ساتھیوں نے غداری کی اور ۲۲۵ھ میں اُسے بُغا کے حوالہ کر دیا۔ بُغا اُسے سامرہ لے آیا، یہاں اُسے قید کر دیا گیا۔

یہ دونوں بغاوتیں، اور افشین کے خلاف عبداللہ بن طاہر کے الزامات، درحقیقت افشین کی نکبت کے باعث بنے۔ افشین کو اس کا بخوبی علم تھا، اور اسی بنا پر وہ چاہتا تھا کہ ارمینیہ بھاگ جائے، کیونکہ یہ علاقہ اُس کی حکومت میں شامل تھا، اور پھر وہاں سے بحیرۂ خزر کو عبور کر کے اپنے وطن اشروسنہ چلا جائے۔ لیکن جلدی ہی اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ معتصم کے جاسوس سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، اور اُن سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے بہت بڑے پیمانہ پر ایک دعوت کی اور تمام اُن سربرآوردہ لوگوں کو جن کی جاسوسی سے وہ خائف تھا، بُلایا۔ اُسے اُمید تھی کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر وہ بچ نکلے گا۔ لیکن سوء اتفاق سے اُسی دن اُس نے اپنے ایک غلام کے ساتھ ایسا بے رحمی کا سلوک کیا کہ اُس نے افشین کی تمام تجویزیں من و عن ایتاخ سے بیان کر دیں۔ ایتاخ نے خلیفہ کے حکم سے افشین کو گرفتار کر لیا۔ لیکن اس واقعے کو

---

۵۱ ابن خلدون (ج ۳-ص ۱۹۸) نے اس کا نام منکبور لکھا ہے۔

۵۲ ایک اور بیان کے مطابق منکجور نے بُغا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ یہ غالباً اُس وقت ہوا جب کہ اُس کے ساتھی اُس سے منحرف ہو چکے تھے۔

۵۳ ابن خلدون (ج ۳-ص ۲۶۸) ابن اثیر (ج ۶-ص ۱۸۹) کے مطابق افشین چاہتا تھا کہ خلیفہ اور تمامی فوجی افسروں کو مار دے۔ لیکن اُس کے ایک دوست اواجن الاشروسی نے اس شقاوت کی علانیہ مخالفت کی۔ ایک ملازم نے جو اواجن کی باتیں سن رہا تھا، افشین کو اس کی اطلاع کر دی۔ اُس نے چاہا کہ اواجن کو قتل کر دیا جائے۔ مگر اواجن کو اس کی اطلاع

اُس کے بیٹے حسین کی گرفتاری تک راز میں رکھا گیا۔ حسین ماوراء النہر کا والی تھا، اور افشین کی طرح اُس کے پاس بھی موالی کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ خلیفہ نے عبداللہ بن طاہر کو لکھا کہ کسی طرح دھوکا دے کر حسین کو گرفتار کرے۔ عبداللہ نے حسین کو بخارا کا والی مقرر کیا، اور اس کے ساتھ ہی نوح بن اسد کو، جو اس وقت بخارا کا والی تھا، لکھا کہ حسین کو گرفتار کر کے اُس کے پاس بھیج دیا جائے[1]۔ اب چونکہ اس طرف سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا، اس لیے باضابطہ طور سے افشین پر غداری کا الزام لگایا گیا۔ مگر غداری کی کافی شہادت موجود نہ تھی، اور معتصم یہ چاہتا تھا کہ افشین کے بڑے بڑے موالی کو، جن پر اُس کی قوت کا انحصار تھا، اس کے مجرم ہونے کا یقین دلا دے، تاکہ آئندہ ان کی طرف سے فساد کا اندیشہ نہ رہے۔ اس لیے افشین کے ارتداد کو بھی فرد قرار جرم میں شامل کر لیا گیا۔ اس مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خاص عدالت قائم کی گئی۔ اس عدالت کی کارروائی بہت تفصیل سے ہم تک پہونچی ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ معتصم کے زمانے تک ایران میں اسلام کے پہلو بہ پہلو قدیم زردشتی مذہب زندہ تھا، اور ماوراء النہر میں اس کے پیرو علانیہ طور پر اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ قاضی احمد بن ابی داؤد، وزیر محمد بن عبدالملک بن الزیات اور تمام بڑے بڑے فوجی اور شہری افسروں کے سامنے عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے سغد کے رہنے والے دو مستغیث عدالت کے سامنے آئے۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ ان میں ایک مسجد کا امام اور دوسرا موذن ہے، اور انھیں افشین نے ان کے وطن میں درے لگوائے تھے۔ چنانچہ ان کے بدن پر اس سزا کے نشان موجود تھے۔ ابن الزیات نے افشین سے اس سزا کی وجہ پوچھی۔ اُس نے جواب دیا کہ ان دونوں نے ایک عبادت گاہ کو جبراً مسمار کر کے مسجد بنا لیا تھا۔ اسی لیے میں نے انھیں سزا دی تھی، کیونکہ عہد نامہ کے مطابق یہ عبادت گاہ اہل شہر کے لیے محفوظ تھی۔ ابن الزیات نے دریافت کیا کہ وہ مطلا و مرصع کتاب کیا ہے جو تمھارے گھر میں موجود ہے اور بے دینی کی تعلیم دیتی ہے۔ افشین نے کہا کہ وہ کتاب مجھے میرے باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے، اور اُس میں بڑے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے۔ جیسی مطلا و مرصع وہ مجھے ملی تھی، ویسی ہی اب تک ہے۔ میں نے اُس سے صرف اخلاق سیکھا، اور اُس کی بے دینی کی باتوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) افشین کے ایک اور ملازم سے مل گئی۔ وہ فوراً معتصم کے پاس گیا، اور سب باتیں اُس سے کہہ دیں۔ مگر افشین کے مقدمہ کے حالات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوشش یہ تھی کہ افشین کو ملزم ثابت کر دیا جائے۔ اس لئے ابن اثیر کا بیان قابل اعتبار نہیں، اور زہر خورانی کی حکایت بعد کی ساختہ پرداختہ ہو۔ غالباً اس سے مقصد یہ تھا کہ افشین کو موت کی سزا دی جا سکے۔

[1] ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۸۹، ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۶۹ +

توجہ نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں میں نے کسی طرح اسلام سے انحراف نہیں کیا۔ اب ایک موبد عدالت میں حاضر ہوا۔ اُس نے اظہار دیا کہ افشین مختنقہ جانوروں کا گوشت کھاتا ہے۔ بلکہ اُس نے اُسے بھی یہ گوشت کھانے کی یہ کہہ کر ترغیب دلائی تھی کہ ایسا گوشت مذبوحہ جانور کے گوشت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ایک دن یہ بھی کہا تھا کہ میں نے مجبوراً عربی پڑھی، زیتون کا تیل استعمال کیا، اور جوتا پہننا شروع کیا؛ مگر باوجود اس کے مسلمان مجھے ختنہ کرانے پر مجبور نہ کر سکے۔ افشین نے قاضی کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ ایک مسلمان کے خلاف بے دین مجوسی کی شہادت کہاں تک قابل سماعت ہے؟ موبد کے بعد سغد کا ایک رئیس عدالت میں آیا۔ اُس نے افشین سے پوچھا کہ آیا اشروسنہ کے باشندے اُسے خداوند کہتے ہیں یا نہیں۔ افشین نے جواب دیا کہ ہاں۔ یہ درست ہے۔ مگر یہ لوگ اپنے رؤسا کو اسی لفظ سے مخاطب کرنے کے عادی ہیں، اور میں نے انھیں اس وجہ سے منع نہیں کیا کہ کہیں میرے رعب میں کمی نہ آئے، اور یہ لوگ بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ اب مازیار کو، جو اس وقت قیدی کی حیثیت سے دارالخلافہ میں تھا، عدالت میں لایا گیا۔ اُس نے کہا کہ افشین کے بھائی نے اُس کی طرف سے مازیار کے بھائی قوہیار کو لکھا تھا کہ "ہمارا قدیم مذہب بابک، تمھارے اور میرے ذریعہ سے دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔ بابک کی میں مدد نہ کر سکا، اس لیے وہ اپنی جہالت سے مغلوب ہوگیا۔ اب تم بغاوت کر دو۔ میرے سوا تمھارے مقابلے کے لیے اور کسی کو نہ بھیجا جائے گا، اور میں اپنے بہادر سپاہیوں سمیت تم سے مل جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں مل کر عربوں، اہل افریقہ اور ترکوں سے لڑیں گے۔ عرب محض کتے ہیں، اور چند ٹکڑے دے کر اُن سے ہر طرح کا کام لیا جا سکتا ہے مغاربہ، یعنی اہل افریقہ، پلک مارتے تباہ کیے جا سکتے ہیں۔ رہ گئے ترک؛ وہ اُسی وقت تک مقابلہ کریں گے جب تک اُن کے پاس تیر باقی ہیں۔ اس کے بعد انھیں رسالہ فوج سے روند کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد قدیم ایران اور اُس کا مذہب دونوں زندہ ہو جائیں گے"۔ اس الزام کا جواب افشین نے یہ دیا کہ تحریر بغیر اُس کی مرضی اور دانست کے اُس کے بھائی کی ہے؛ اور وہ دوسروں کی تحریروں کا جواب دہ نہیں ہے۔ اگر خود اُس کی یہ تحریر ہوتی تو بھی اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک نیم مفتوحہ صوبے کو مستقل طور پر فتح کرکے وہ خلیفہ کے وقار میں اضافہ کرنا چاہتا تھا، جیسا کہ عبداللہ بن طاہر کی مہم میں ہوا۔

سلے ابن اثیر (ج ۶ ص ۱۹۰) لکھتا ہے کہ یہ موبد اُس وقت تک اپنے قدیم مذہب پر قائم تھا، اور بالآخر متوکل کے عہد میں مسلمان ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایرانی موبد اُس خلیفہ کے دربار میں علانیہ طور پر موجود تھا، جس نے حضرت امام احمد بن حنبل کو اس وجہ سے تازیانے کی سزا دی تھی کہ انھوں نے قرآن شریف کے متعلق دربار کے علما سے اختلاف کیا تھا۔

ان شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی افشین کو موت کی سزا قانوناً دینا ناممکن تھا۔ اُسے دوبارہ بُغا کی نگرانی میں نظر بند کیا گیا، مگر کھانا اتنا کم دیا گیا کہ آخر اُس نے ماہ شعبان ۲۲۶ھ میں فاقوں سے وفات پائی۔ مرنے کے بعد اُس کے گھر سے ایک بُت، اور زردشتی مذہب کی ایک کتاب برآمد ہوئی۔ اس کی پاداش میں لاش کو مصلوب کرنے کے بعد جلا دیا گیا۔[1] معتصم غالباً افشین کے خلاف مازیار کی فیصلہ کن شہادت کا منتظر تھا، کیونکہ عدالت میں اظہار دینے کے بعد ہی مازیار کو ڈنڈوں سے مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افشین کے باضابطہ عدالت میں پیش ہونے کی یہ وجہ نہ تھی کہ معتصم انصاف کا دلدادہ تھا۔ بلکہ درحقیقت وہ افشین کے بے شمار موالی سے خائف تھا، اور چاہتا تھا کہ انھیں ظاہری طور پر عدل و انصاف کا یقین دلا دیا جائے۔ بہ حیثیت مجموعی معتصم اپنے پیشرو خلفاء کے مقابلے میں کچھ کم مطلق العنان نہ تھا۔ عدالت تمام تر، خلیفہ اور اس کے بعد وزیر اور سپہ سالار اور پھر قاضی اور قاضی القضاۃ کے زیرِ اقتدار تھی؛ حالانکہ معتصم قاضی القضاۃ محمد بن ابی داؤد کی بہت قدر کرتا تھا، اور قاضی بھی ایک حد تک خلیفہ پر حاوی تھا۔ اس کی ہم آئندہ ایک مثال بھی دیں گے۔ مگر اس سے پہلے دو بغاوتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ دونوں بغاوتیں معتصم کے عہد میں شروع ہوئیں لیکن ان میں سے ایک اُس کے بعد فرو ہوئی اس لیے وہ اس میں زیادہ دخل نہ دے سکا۔ اس کے علاوہ معتصم نے ان واقعات کے بعد یونانیوں سے ایک اور جنگ لڑی۔

صوبۂ موصل میں کردوں نے جمع ہو کر جعفر بن فہر جس کو اپنا سرغنہ بنایا۔ تمام صوبے کے اوباش اور بدمعاش لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ان کے تاخت و تاراج سے رعایا کی جان و مال دونوں محفوظ نہ رہے، اور رفتہ رفتہ مرکزی حکومت کا اثر بالکل اُٹھ گیا۔ ان لوگوں نے شمالی میسوپوٹامیا

---

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۹۰)۔ افشین نے اپنی موت سے قبل معتصم سے کہا تھا کہ "میری مثال ایک بچھڑے کی سی ہے، جسے کوئی نہایت احتیاط سے پالے پوسے۔ مگر اُس کے دوست بچھڑے کا گوشت کھانا چاہتے ہیں۔ یہ شخص اُسے ذبح کر کے اپنے دوستوں کی آرزو پوری نہیں کرتا۔ آخر دوست یقین دلاتے ہیں کہ یہ بچھڑا نہیں بلکہ شیر ہے، اور بڑا ہو کر اپنی جنس میں مل جائے گا۔ دوسرے اس رائے کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر وہ شخص اس بچھڑے کو ذبح کر ڈالتا ہے (ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۹۱)۔ ابن خلدون نے ایک روایت نقل کی ہے (ج ۳۔ ص ۲۶۹) کہ افشین قتل کیا گیا تھا۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ عدالت میں اظہار دینے کے بعد مازیار کو ۲۲۵ھ میں قتل کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے برعکس افشین نے ۲۲۶ھ میں انتقال کیا۔ اثبات جرم کے بعد اُسے اتنے دن تک زندہ چھوڑنا اور پھر قتل کرنا ناممکن ہے۔ معتصم غالباً اس کے قتل کی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا، اور اسی لیے اُس نے اُسے آہستہ آہستہ مارا۔

تک قتل و غارت کا سلسلہ قائم کیا۔ آخر معتصم نے ایک فوج تیار کی اور عبداللہ بن السید بن انس الازدی کی سرکردگی میں اُسے جعفر کے خلاف بھیجا۔ عبداللہ نے ان لٹیروں کو زبردست شکست دی، اور ماتعیس سے، جہاں اُنھوں نے اپنی چھاؤنی بنائی تھی، نکال دیا۔ شکست کھا کر باغی کوہستانی علاقے میں پناہ گزیں ہوئے، اور عبداللہ بھی بے سوچے سمجھے، عقب کی حفاظت کا انتظام کیے بغیر، ان کے تعاقب میں پہاڑوں میں داخل ہوا۔ قبل اس کے کہ اسے ذرا بھی خطرہ کا احساس ہو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک گھاٹی میں دشمنوں سے گھر گیا ہے۔ اُس نے چاہا کہ دشمنوں کو تلوار سے کاٹ کر راستہ بنائے۔ لیکن اس کوشش میں اس کے بہت سے آدمی یا تو ترکوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور یا اُن پتھروں سے کچلے گئے، جو دشمن پہاڑوں پر سے لڑھکا رہے تھے۔ اس ناکامی کے بعد معتصم نے ایک نئی فوج موصل بھیجنے کے لیے تیار کی، اور آئندہ سال یعنی ۲۲۶ھ (۸۴۰-۴۱ء) میں ایتاخ نے، جو عبداللہ کی جگہ سپہ سالار مقرر ہوا تھا، کوہ دسیر کی جنگ میں شورشیوں کے سرغنہ جعفر کو قتل کیا اور بغاوت فرو کی۔[1]

میسوپوٹامیا میں امن و امان قائم ہوا ہی تھا کہ فلسطین ایک خطرناک بغاوت کا میدان بن گیا۔ یہاں اب تک بنی اُمیہ کے ہمدرد باقی تھے، اور اس شورش کا مقصد یہ تھا کہ خاندان خلافت کو تباہ کر دیا جائے۔ فوری سبب یہ ہوا کہ ایک سپاہی نے فلسطین کے رہنے والے ایک شخص ابو حرب الیمنی کے گھر میں داخل ہو کر ایک عورت کو قتل کر دیا۔ جب ابو حرب گھر آیا، اور اس واقعہ کی اطلاع اُسے ہوئی تو اُس نے اُس سپاہی کو قتل کر دیا، اور جبال اردن میں پناہ لی۔ یہاں اُس نے، نقاب پوش ہو کر، خلیفہ سے خود مختاری کا وعظ کہنا شروع کیا۔ ابو حرب نے دعوے کیا کہ وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہے۔ بہت جلد لوگوں کی ایک بڑی جماعت اُس کے گرد جمع ہو گئی۔ رجا بن ایوب الحضاری کو معتصم نے فوج دے کر فلسطین بھیجا؛ لیکن رجا کو اُس وقت حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر آئندہ سال معتصم کی وفات، اور واثق کے خلیفہ ہونے کے بعد رجا نے ابو حرب کو، جو نقاب پوش ہونے کی وجہ سے مبرقع کہلاتا ہے، جنگ پر مجبور کیا۔ مبرقع کے بیس ہزار آدمی کام آئے؛ وہ خود گرفتار ہوا، اور سامرہ بھیجا گیا۔[2]

---

[1] ابن اثیر ج ۶ ص ۱۸۰؛ ابن خلدون ج ۳ ص ۲۶۲ ؛ ان مصنفوں کا بیان ہے کہ یہ شورش ۲۲۵ھ میں فرو ہوئی تھی۔ مترجم)

[2] ابن اثیر ج ۶ ص ۱۹۳؛ ابن خلدون ج ۳ ص ۲۷۰۔ کل ایک لاکھ آدمی مبرقع کے ساتھ تھے۔ یہ سب اُسے سفیانی سمجھتے تھے۔ یمنیوں کا سردار ابن بہیس بھی مبرقع کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔

مندرجہ ذیل واقعہ سے معتصم کے زمانے کی عدالتی کارروائی کے متعلق ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معتصم نے افشین کو مجرم ثابت کرنے کے لئے محض سیاسی اغراض کے تحت ظاہراً عدالتی انتظامات کیے تھے؛ اور دوسری طرف اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہوسکے تب بھی معتصم سخت ترین سزا دینے میں تامل نہ کرتا تھا۔

افشین کو مشہور سپہ سالار ابودُلف سے، اُس کی بہادری، فصاحت و بلاغت، اور عربی زبان میں بے انتہا عبور رکھنے کی وجہ سے حسد تھا۔ اسی بنا پر اُس نے ابودُلف کے خلاف ایک سازش کی، اور اُس کے قاتل و غدار ہونے کے ثبوت میں گواہ بھی فراہم کرلیے۔ افشین نے انھیں الزامات کی بنا پر ابودُلف کو گرفتار کرایا۔ اُس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ آخر انھیں اجیر گواہوں کی شہادت پر اُسے سزاے موت سُنادی گئی۔ اس کی اطلاع قاضی القضاۃ احمد بن ابی داؤد کو ہوئی۔ وہ عدالت کے چند آدمی ساتھ لے کر افشین کے پاس گئے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جلاد عدالت کے فیصلے کی تعمیل کے لیے تیار تھا، اور ابودلف کی گردن مارا ہی چاہتا تھا۔ احمد نے افشین سے کہا کہ امیرالمومنین نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میں تجھے یہ حکم پہونچا دوں کہ ابودُلف کو کسی قسم کا گزند نہ پہونچے، اور اُسے میرے حوالے کردیا جائے۔ یہ کہہ کر احمد عدالت کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ گواہ رہنا کہ امیرالمومنین کا حکم میں نے افشین کو پہونچا دیا ہے، اور ابودُلف کو زندہ اور سلامت پایا ہے۔ افشین نے مجبوراً ابودُلف کو رہا کردیا۔ اب احمد خلیفہ کے پاس گئے، ابودُلف اور افشین میں جو کچھ گذرا تھا اُس کی اطلاع دی، اور کہا کہ ابودلف کی جان بچانے کے لیے گو کوئی احکام صادر نہیں ہوئے تھے، لیکن ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ کا قاصد ظاہر کریں، تاکہ افشین کو سوائے تعمیل حکم کے کوئی چارہ نہ رہے۔ معتصم نے احمد کی گفتگو روک دی اور ابودلف کی خطا معاف کردی۔ مگر افشین کو محض زبانی سرزنش کی گئی۔ حالانکہ خلیفہ اور قاضی القضاۃ کے ہوتے ہوئے قاضی القضاۃ کے آخری اور قطعی حکم کے بغیر وہ دارالخلافہ کے ایک جلیل القدر عہدہ دار کی جان لینے کے لیے تیار ہوگیا تھا[1]۔

معتصم محمد بن الجہم برمکی سے ناراض ہوا، اور اُس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اُس کے قتل کی تیاری ہوچکی تھی۔ احمد بن ابی داؤد جانتے تھے کہ وہ بے گناہ ہے۔ وہ اُسے بچانا چاہتے تھے، مگر خلیفہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انھیں سوا اس کے اور کوئی تدبیر نہ سوجھی کہ خلیفہ کے ذاتی مفاد کا حوالہ

[1] ابن خلکان (مطبوعہ یورپ) ج ۱ - ص ۲۶۳

ـدے کر اُسے اس کام سے باز رکھیں۔ اُنھوں نے خلیفہ سے پوچھا کہ اُس نے اس قتل کا ارادہ کس کے حکم سے کیا ہے۔ خلیفہ نے کہا: مجھے روک ہی کون سکتا ہے؟ احمد نے جواب دیا کہ خدا اور اُس کا رسول اور خلفار کا انصاف تجھے اس سے باز رکھتے ہیں کہ تو وارثوں سے ان کا مال چھینے۔ خصوصاً جب تیرے پاس اُس جرم کی، جس کی پاداش میں تو اُسے موت کی سزا دے رہا ہے، کوئی واضح شہادت موجود نہیں۔ جب تک وہ زندہ ہے تو اُس سے غبن شدہ رقم واپس لے سکتا ہے۔ یہ سُن کر معتصم نے محمد بن الجہم کی جان بخش دی، اور اُسے دوبارہ قید کر دیا۔ اس معاملے کا تصفیہ آخر اس طرح ہوا کہ محمد نے بہت بڑی رقم دے کر دوبارہ رہائی پائی۔

یہاں ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ قاضی کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ خلیفہ سے صاف کہہ دیں کہ اس شخص کی زندگی پر تمھیں کوئی اختیار نہیں۔ یتیموں کا مال ضبط کر لینا معمولی بات تھی، مگر زندہ لوگوں کا مال ضبط کرنے میں بھی تامل نہ کیا جاتا تھا۔ وزیر فضل بن مروان سے خلیفہ ناراض ہوا، اور اُسے معزول کیا تو اُس سے دس لاکھ دینار اور اتنی ہی قیمت کے سونے چاندی کے برتن اور جواہرات وصول کیے گئے[۵۱]۔ فضل کے بعد احمد بن عمار اور پھر محمد بن عبد الملک ابن الزیات وزیر ہوئے[۵۲]۔ اُس زمانے کے شعرا نے ابن الزیات کی مدح میں خوب خوب قصیدے کہے ہیں[۵۳]۔ مگر اُس کی اور احمد بن ابی داؤد کی کبھی نہیں بنی۔

معتصم کے عہد خلافت میں احمد بن ابی داؤد اور محمد بن عبد الملک ابن الزیات نے یونانی علوم کی نشر و اشاعت میں خاص حصہ لیا۔ خود معتصم اتنا ہی جاہل اور ان پڑھ تھا جتنا کہ اُس کا بھائی مامون علم و فضل کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ یہاں ان یونانی طبیبوں اور فلسفیوں کا ذکر کرنا ضروری نہیں جو ابتدائی خلفا کے دور میں عربوں کے استاد رہے تھے، اور جنھوں نے یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ یہ حالت معتصم کے زمانے تک رہی۔ نہ اس کی گنجائش کہ یہودی طبیب زین الطبری اور اُس کے بیٹے ابو الحسن علی بن سہل کا حال تفصیل سے لکھا جائے۔ زین نے نہ صرف طب کا بلکہ

---

[۵۱] ابن خلکان (مطبوعہ یورپ) ج ۲ - ص ۴۰۰۔

[۵۲] یہ ابن خلکان کا بیان ہے۔ ابن اثیر (ج ۶ - ص ۱۶۰) اور ابن خلدون (ج ۳ - ص ۲۵۱) کے مطابق فضل کے بعد محمد بن عبد الملک ہی وزیر مقرر ہوا تھا۔ فضل بن مروان کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ سرکاری رقمیں غبن کرتا تھا، خلیفہ کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تھا، اور ہر لحاظ سے بدترین سیرت کا اظہار اُس سے ہوتا تھا۔ یہ واقعات ابن اثیر اور ابن خلدون دونوں نے بیان کیے ہیں۔ مصنف ان دونوں مورخوں کو ہمیشہ سند میں پیش کرتا ہے۔ مگر معتصم کو ظالم و جابر ثابت کرتے وقت واقعات کا ذکر کرنا بھول جاتا ہے۔ (مترجم)

[۵۳] دیکھو ابو تمام کے چند اشعار۔ ابن خلکان ج ۲ - ص ۳۰۰۔

فلسفہ اور ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ اس کا بیٹا طبرستان کے سپہبد مازیار بن قارن کا معتمد تھا۔ اُس کی تباہی کے بعد وہ غالبًا اس سے الگ ہوا، اور معتصم کے دربار میں آکر اُس نے اسلام قبول کیا۔ مشہور طبیب الرازی اسی کا شاگرد تھا۔ الکندی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ مشہور فلسفی تھا، اور بجا طور پر فیلسوف العرب کہلاتا ہے۔ اس کی تصانیف ایک زمانے میں یورپ میں بھی بہت مقبول تھیں۔ وہ قبیلۂ کندہ سے تھا، اور اُس کا پورا نام ابو یوسف یعقوب بن اسحاق بن صباح ہے۔ اُس نے بصرہ میں تعلیم پائی تھی۔ فلسفہ، طب اور ریاضی پر جتنی یونانی، ہندی اور ایرانی کتابیں اُس زمانے میں متداول تھیں اُن سب کا اُس نے مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے یونانی مصنفین کی کتابیں جو اُس زمانے میں متداول تھیں پڑھیں، اور اپنی محنت سے طب اور ہیئت میں ایسا ملکہ پیدا کیا کہ اُسی کی شرحوں اور ترجموں کے سبب یونانی فلسفہ اور ریاضی کی ترویج ہوئی۔ بہت جلد مامون نے اُسے بغداد بلا لیا، اور مترجم مقرر کیا۔ خلیفہ معتصم کے دربار میں بھی اُسے بہت وقعت حاصل رہی۔

معتصم نے ۱۸۔ ربیع الاول سنہ ۲۲۷ھ (مطابق ۵۔ جنوری ۸۴۲ء) کو وفات پائی۔ وہ بنی عباس کا آٹھواں خلیفہ تھا؛ حضرت عباسؓ کی آٹھویں پشت سے تھا؛ اُس نے آٹھ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں چھوڑیں؛ اُسکی عمر موت کے وقت اڑتالیس برس کی تھی۔ اُس نے اسّی لاکھ دینار اور اتنے ہی درہم خزانہ میں چھوڑے۔ وہ ماہ شعبان میں پیدا ہوا تھا، جو سال کا آٹھواں مہینہ ہے۔ اُس نے آٹھ مرتبہ فوج کشی کی یا کم از کم جنگ کا حکم دیا۔ یہ فوجی مہمیں حسب ذیل ہیں :—

(۱) بابک اور خرمیہ کے خلاف　　　　(۲) زُط کے خلاف
(۳) خراسان میں بنو علی کے خلاف　　　　(۴) بازنطینیوں کے خلاف
(۵) اسپہبد طبرستان کے خلاف　　　　(۶) آذربائیجان کے باغیوں کے خلاف
(۷) کردوں کے خلاف　　　　(۸) مبرقع کے خلاف

معتصم سے خلفائے عباسیہ کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے اصلی ناموں سے یاد نہیں کیے جاتے تھے۔ خود معتصم کا نام ابو اسحاق محمدؒ، اور لقب معتصم باللہ تھا۔ اسی لقب سے وہ مشہور ہے۔ اسی طرح باقی خلفا کے بھی لقب ہوتے تھے، اور انھیں لقبوں سے ان کا ذکر کیا جاتا تھا۔

حیاتِ نیّر

(جناب حاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے، پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۴)

شعرگوئی کا آغاز حسان الہند حضرت محسن کاکوروی کے کلام کی تدوین اخلاف سعید پر واجب تھی۔ خلف رشید نے اس خدمت کا بیڑہ اُٹھایا۔ مثنویاں متعدد بار چھپ چکی تھیں۔ بعض قصائد شائع ہو چکے تھے اُن کو یکجا کیا۔ متفرق رسالوں اور بیاضوں سے قطعات اور قصائد تلاش کرکے نکالے۔ صبح تجلی۔ چراغ کعبہ اور ابیات نعت کی شرح لکھی۔ تلمیح طلب الفاظ پر مفید حواشی چڑھائے۔ خصوصیات کلام کے اظہار کے لیے ایک طویل دیباچہ لکھا۔ حضرت محسن کی زندگی کے حالات جس قدر مستند ذرائع سے معلوم تھے قلمبند کیے۔ جولائی ۱۹۰۵ء سے اس خدمت کا آغاز کیا۔ اکتوبر میں کاکوری تشریف لائے تو کلیات کی تدوین ہو چکی تھی اور سوانح عمری کا معتدبہ حصہ تیار تھا۔ رفیق قدیم منشی مقبول علی اُس وقت وطن میں موجود تھے۔ سوانح نوشتہ سُنائے اور تحقیق وکاوش کی داد پائی۔ اثنائے گفتگو میں لوح مزار کا تذکرہ ہوا۔ فرمایا کہ ڈپٹی حکیم الدین[۵۱] صاحب نے "ادخلہ مالک الملک فی الفردوس" سے تاریخ نکالی ہے اور منشی زین العابدین[۵۲] فرجاد نے آیت قرآن شریف سے بے مثل مادۂ تاریخ حاصل کیا ہے یعنی "انہ فی الآخرۃ لمن الصالحین"۔ ان کے علاوہ کئی قدرشناسوں نے تاریخیں روانہ کی ہیں۔ چند قطعے اُردوئے معلٰی علیگڈھ میں چھپے ہیں لیکن ہنوز طے نہیں کیا گیا کہ لوح مزار پر کیا لکھا جائے۔ منشی مقبول علی نے عرض کی کہ والد ماجد کی تاریخ وفات آپ کو خود کہنا چاہیے۔ مولوی نور الحسن نے اُس وقت تک ایک شعر بھی موزوں نہ کیا تھا اپنی معذوری بیان کی۔ مکرر التماس پر کوشش کا اقرار کیا۔ اُسی وقت سے دماغ فکر شعر میں مبتلا ہوا۔ مین پوری پہونچ کر "راہی باغ جناں" مادۂ تاریخ ذہن میں آیا۔ مثنوی کی بحر میں چند اشعار موزوں کیے جن میں

---

[۵۱] مولوی حکیم الدین۔ رٹول ضلع میرٹھ کے رہنے والے۔ عرصہ تک مین پوری میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ مولوی محمد محسن سے برادرانہ تعلقات تھے۔ پنشن سے کرنائب وزیر بھوپال ہوگئے تھے۔ چار برس وہاں گذارے بعد ازاں خانہ نشین ہوگئے اور اپنے وطن میں ۲۰ر نومبر ۱۹۱۵ء کو انتقال کیا۔

[۵۲] منشی زین العابدین ریاست اودے پور میں ملازم تھے۔ مولوی محمد محسن کے غائبانہ نیازمند تھے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ میرٹھ کے محلہ اندر کوٹ میں رہتے تھے اور وہاں سے مولوی نور الحسن کو خطوط لکھے تھے۔ اُس کے بعد کچھ احوال معلوم نہ ہوا۔

ممدوح کے مختصر حالات تھے۔ اُن کی بیماری کا بیان اور دعاے مغفرت پر خاتمہ تھا۔ دوا علاج کی بے اثری کی بابت یہ شعر واقعہ کی سچی تصویر تھا:۔

هر دوا در کار خود بے کار بود　　　　ضعف از حسبِ جواهری فزود

اُستاد مرحوم کی یہی پہلی نظم تھی۔

بود محسن خسرو ملک سخن　　　　تاج انوار الحسن۔ نور الحسن
چاره ساز مفلسان و بیکساں　　　　همدم و همدرد هر پیر و جواں
بود طور نعت را گو یا کلیم　　　　یا خلیل کعبهٔ مدح کریم
مولد او هست کاکوری به نام　　　　مین پوری شد از و دار السلام
علم ظاهر خوانده بود از جد و اب　　　　فیض باطن را کرامت شد سبب
ماند او زیب نظارت روز چند　　　　تا نیا بد دل ز بے شغلی گزند
خوش بیانی را ز بس آمد دلیل　　　　بر زبانها شد رواں نعم الوکیل
هر دو دستش خلق را حاجت روا　　　　هر دو چشمش محو محبوب خدا
داشت از امراض پیری گو تعب　　　　بود دائم محو نعت و ذکر رب
آخر ماه محرم سال حال　　　　داد اسهال کبد او را ملال
خود اشارت کرد از طرز عمل　　　　هیچ نتواں کرد از جا ر الاجل
هر دوا در کار خود بے کار بود　　　　ضعف از حسبِ جواهری فزود
هیجدهم روز دوشنبه از صفر　　　　کرد از منزل گه آهنگ سفر
کلمهٔ توحید را خواندن گرفت　　　　لا و اِلّا بر زباں راندن گرفت
خاست انگشت شهادت هر زماں　　　　مخبر تصدیق قلبی بے گماں
واصل حق شد بتائید اِلٰہ　　　　باد یارب جنتش آرامگاه

گفت نیر از پئے سال وفات
"راهی باغ جناں" عالی صفات

نظم ہنوز تمام نہ ہوئی تھی کہ مین پوری کے بعض عقیدت کیشوں نے تجویز پیش کی کہ حضرت محسن کی یادگار میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے اور مولوی نور الحسن اُس بزم کے میر مجلس ہوں۔
شیخ عبدالوحید فدا۔ گلاوٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے مین پوری کی عدالت کلکٹری میں

عرصہ سے ملازم تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ۔ کلام پرلطف و بامزہ ہوتا تھا۔ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولوی محمد محسن کی "نظم دل افروز" کی تضمین کی تھی۔ مولوی نورالحسن سے محبت تھی۔ اکثر حاضر ہوکر اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ اُنھوں نے مشاعرے کے لیے اصرار کیا۔

سید ابوطالب۔ شاہ گنج ضلع آگرہ کے رئیس زادے۔ علیگڈھ کالج کے گریجویٹ۔ مین پوری میں وکالت کرتے تھے۔ خوشرو، تیز فہم اور روشن خیال تھے۔ شہر کے ایک کامیاب وکیل قاضی احمد حسین کانپوری کے انتقال کے بعد اُنھیں کی کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ جمی ہوئی وکالت ملی۔ پیشہ میں جلد فروغ ہوگیا۔ مولوی نورالحسن سے خلوص تھا۔ روزانہ خدمت میں حاضر ہوتے اور گھنٹوں خوش طبعی کیا کرتے تھے۔ وہ بھی مشاعرہ کے مؤید تھے۔

شیخ محمد اسمٰعیل رنگیلے۔ مین پوری کے رہنے والے۔ بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج تھے۔ محرری اور عرائض نویسی سے اوقات بسر کرتے تھے۔ شاعری گھٹی میں پڑی تھی۔ ظریفانہ مضحک اشعار فی البدیہہ کہتے تھے۔ بزم احباب سے "تفریح الشعرا" خطاب ملا تھا۔ بعض اشعار زبانزد خاص و عام ہوگئے تھے مثلاً

آدھے مُنھ پر کُک کروں اور آدھے پر آٹا ملوں اے رنگیلے اک نئی شام و سحر پیدا کروں

اُن کا ایک مصرعہ ضرب المثل ہوگیا تھا اور آج تک عدالت فوجداری کی حقیقت حال کا آئینہ ہے:-

جنٹی سے ہے سزا تو رہائی سشن میں ہے

وہ مولوی محمد محسن کے نیازمند تھے اور اُنھوں نے بھی "نظم دل افروز" کی تضمین کی تھی۔ مولوی نورالحسن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور مشاعروں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

مولوی نورالحسن کو مشاعروں سے دلچسپی باقی نہ تھی مگر احباب کے اصرار سے انعقاد محفل کی رضامندی دی۔ ۲۰ر جون ۱۹۰۸ء مطابق ۸ر ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ مشاعرے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ شعرائے مارہرہ، ایٹہ و فرخ آباد کو دعوت کے رقعے روانہ کیے گئے۔ شیخ عبدالوحید فدا نے ایک روز کہا کہ میر مشاعرہ کو غزل پڑھنا چاہیے آپ شعر نہیں کہتے ہیں اگر اجازت ہو تو میں ایک غزل تیار کردوں اور اُس کو آپ اپنے نام سے محفل میں سُنادیں۔ اُستاد کو یہ صلاح پسند نہ آئی۔ فرمایا کہ میں خود غزل کہنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کامیابی ہوئی تو وہی پڑھوں گا ورنہ کچھ ضرورت نہیں۔ شیخ صاحب خاموش ہوئے مگر مشاعرے کے دن مقررہ وقت سے پہلے دولت خانہ پر آئے اور غزل سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ نومشق شاعر کے کلام میں عیوب اسقام ہوں گے اُن کا خلوت میں درست کرنا مجلس میں بدنامی سے بہتر ہے۔

شیخ رنگیلے بھی حاضر تھے انھوں نے بھی اصرار کیا۔ غزل بہ نظر اصلاح سُنی تھی لیکن کسی جگہ حرف رکھنے کی جگہ نہ پائی۔ تحسین و آفریں کی صدا بلند کی۔

اُستاد کی پہلی غزل تھی اس لیے بجنسہ درج کی جاتی ہے :۔

دل کے پردے میں نظر آئے وہ جلوہ کس کا — آپ ہی آپ جو کھنچ جائے وہ نقشہ کس کا

غمگساری ہے نہ دلداری نہ الفت نہ تعلق — دل کرے نذر یہ پتھر کا کلیجہ کس کا

غیر بھی سُن کے ہوں برہم وہ شکایت کس کی — لب پہ آ آ کے جو رہ جائے وہ شکوہ کس کا

لب تک آنے نہیں پاتا ہے کہ مٹ جاتا ہے — کس کے وعدے کی طرح حرف تمنا کس کا

دل سا ہمدرد چھٹا اپنے ہوئے بیگانے — ظلم غیروں سے بیاں کیجیے کس کا کس کا

اُس کے کوچہ کو تو مقتل ہی بنا دیکھا ہے — رکھ لیا نام مریضوں نے مسیحا کس کا

سہو سے سجدہ کیا بھی تو پڑھا اُس میں درود — اے نکیرین سمجھ لو میں ہوں بندہ کس کا

دل کے کھونے کی شکایت نہیں دل آجانے پر — اے اثر تم نے یہ انداز اُڑایا کس کا

اُس وقت تخلص اثر تجویز کیا تھا۔ بعد کو نیر قرار دیا اور کئی سال کے بعد بیاض خاص میں اس غزل کے آخری مصرعہ کو یوں ترمیم فرمایا۔

نیر انداز نرالا یہ اُڑایا کس کا

چند ہفتوں کے بعد مارہرہ ضلع ایٹہ میں ایک بڑا مشاعرہ ہونے والا تھا۔ احباب نے مولوی نورالحسن سے شرکت کے لیے اصرار کیا۔ پہلی غزل کی بہت تعریف ہو چکی تھی۔ ہمت بڑھی اور اس مشاعرے کے لیے بھی غزل لکھی۔ سید ابو طالب وکیل رفیق سفر ہوئے۔ اثنا راہ میں بخار آیا۔ ۲۰ رجون مشاعرے کی تاریخ تھی۔ بیماری کی حالت میں غزل سنائی۔ مشاعرہ "واہ واہ" کے نعروں سے گونج اٹھا اور "الولد سرٌ لابیہ" واقف کاروں کے زبان پر آیا۔ چند شعر سُنیے :۔

ہم نے مانا غیر کا کھٹکا ہے آ سکتے نہیں — کیا بلانا بھی قسم ہے کیوں بلا سکتے نہیں

آہ اپنی نارسا ہے۔ نالۂ دل بے اثر — ایسے اوچھوں کو پیمبر ہم بنا سکتے نہیں

قتل کرنے پر ہیں آمادہ مگر مشکل یہ ہے — کچھ نزاکت کچھ حیا ہے ہاتھ اُٹھا سکتے نہیں

حضرت نیر کا شکوہ سُن کے قاصد سے کہا — کیسے دیوانے ہوئے ہیں ناز اُٹھا سکتے نہیں

مارہرہ سے واپسی کے وقت طبیعت کو سکون تھا۔ موسم کے اثر سے ایک شعر موزوں ہوا۔ سُننے کے قابل ہے :۔

کالی گھٹا پہ کیسی دھنک لال لال ہے　　　شاید کرشن جی نے اُڑا یا گُلال ہے

۶ر ستمبر ۱۹۰۶ء کو مین پوری میں دوبارہ مشاعرہ ہوا۔ طرح تھی۔ ع

دیارِ حُسن میں اُترا ہوا ہے کارواں کوئی

اُستاد نے بھی غزل لکھی۔ ابتدائی دو غزلوں سے مقابلہ کیجیے۔ روانی بڑھ گئی ہے اور کلام میں پختگی کی جھلک نظر آنے لگی ہے:۔

مری آہِ رسا کا کیا کرے گا امتحاں کوئی　　　دھوئیں اُڑ جائیں گے رنگت تو بدلے آسماں کوئی

وہاں اغیار پہلو میں یہاں صدمے جدائی کے　　　شریکِ رنج و راحت ہے یہاں کوئی وہاں کوئی

وہ ہنس کر عذر کرتے ہیں دل مایوس کہتا ہے　　　نہ ہو منظور اس حیلے سے اُن کو امتحاں کوئی

ابھی آنکھوں میں آئے تھے ابھی وہ دل میں جا پہونچے　　　ذرا خلوت میں دیکھے آکے اُن کی شوخیاں کوئی

شکستہ دل اور اُسیرِ خواہشِ دلبر ہیں خوش نیّر　　　نہیں ٹوٹے پیالے کا ہمارے قدرداں کوئی

مشاعرے کے بعد کاکوری تشریف لے گئے اور ۲۷ر رجب ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۷ر ستمبر ۱۹۰۶ء کو اپنے بڑے صاحبزادے مولوی احمد حسن اور بھتیجے مولوی محمد حسن کی شادیاں اُولوالعزمی سے کیں۔ اپنی بڑی صاحبزادی کا منشی وزیر احمد سے عقد کیا اور تقریبات سے فارغ ہو کر مین پوری واپس گئے۔

راہ میں ایک ساقی نامہ لکھنا شروع کیا وہ نا مکمل رہا۔ نظرِ ثانی کی نوبت نہ آئی اور اصلاح کسی سے لیتے نہ تھے۔ وہ مسودہ بہت دنوں قلمدان میں بند رہا۔ بعد کو اُس کاغذ پر دستِ خاص سے یہ نوٹ درج کیا:۔

”اب کے مین پوری آتے ہوئے میرے خیالات خدا جانے کہاں پہونچے۔ شکرم پر یہ اشعار پنسل سے لکھے۔ پھر تمام کرنے کی فرصت نہ ہوئی۔ اگرچہ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ لکھے جائیں لیکن دل بہلانے کے واسطے یہ شغل اچھا تھا۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی اور نہ اس عمر میں اصلاح لینے اور چھپوانے کا ارادہ ہے اس لیے ترتیب بھی درست نہیں کی گئی۔“

اُستاد کے عجز و انکسار نے اس نظم کو اشاعت سے محروم رکھا لیکن اُن کا ہر شعر فقیر امیر کے لیے تبرک ہے وہ اس کو کیونکر چشمِ خلائق سے مستور چھوڑ سکتا ہے:۔

اے ساقی ماہرو کدھر ہے　　　اپنے مستوں کی کچھ خبر ہے

میرے دل کے لُبھانے والے　　　لانبی تانیں اُڑانے والے

ساون کا مہینہ آگیا ہے　　　آنکھوں میں خمار چھا گیا ہے

کالی کالی گھٹائیں آئیں | ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آئیں
جھوٹے ہیں کہ ہار ہیں گلے کے | تعویذ سے اُن میں تختے لٹکے
مہندی رچے ہاتھ ڈوریوں پر | رو کے دوپٹہ کہنیوں پر
مِسّی کی دھڑی وہ کالی کالی | اُس پہ پانوں کی دیکھو لالی
آنکھیں تیری مری نظر میں | سودا زلفوں کا میرے سر میں
ہنستے بھی ہیں اور بناتے بھی ہیں | شرماتے ہیں مناتے بھی ہیں
غیروں سے ہے لطف اور عنایت | ہم بولیں تو مفت کی شکایت
کعبہ میں نہ دیر میں خبر ہے | کیا آہ ہماری بے اثر ہے

افسوس ہے کہ اُستاد نے اس نظم کو تمام نہ کیا اور دوبارہ اس طرز میں کبھی کچھ نہ لکھا ورنہ نیچرل شاعری کے دل گرفتہ کلام نیر کو چشم عقیدت کا سرمہ بناتے۔

غرض۔ مولوی محمد محسن کے "کلیات نعت" کی تدوین سے فارغ ہوتے ہی مشق سخن شروع ہوگئی تھی۔ کسی غیر سے اصلاح لینا گوارا نہ تھا۔ صنائع و بدائع کا والد ماجد سے درس لیا تھا لیکن علم عروض سے آشنائی نہ تھی۔ اب اس علم کے اصول و قواعد پر عبور ضروری معلوم ہوا۔ عروض کی کتب متداولہ کا مطالعہ کیا۔ بحریں یاد کیں۔ اُن زحافات کی فہرست لکھی جو صرف اُردو میں مستعمل ہیں اور یادداشت کے لیے اُن کو موزوں کیا۔ زحافات مرکب کو چار شعروں میں نظم کیا۔ تقطیع کی مشق کی۔ اور چند ہی روز میں مقامی شعرا کو درس دینے کے قابل ہوگئے۔

اس دوران میں وکالت کا کاروبار بہت ہلکا تھا۔ موروثی زمینداری کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی۔ سال میں دو ایک بار ضلعداروں اور کارپردازوں کا حساب دیکھ لیتے تھے یا ایک گشت دیہات کا لگا آتے تھے۔ دوپہر کو کچہری جاتے اور شام کو کلب میں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ اہل خانہ کو مین پوری کی آب و ہوا پسند نہ تھی وہ زیادہ تر اپنے والد کے ساتھ رہتی تھیں۔ مولوی محمد حسن انٹرنس پاس کرکے لکھنؤ جا چکے تھے۔ مولوی حامد حسن اور مصطفےٰ حسن عربی پڑھتے تھے۔ اُن کے لیے مولوی مقرر تھے۔ مگر ہفتہ وار اُن کا امتحان لیا جاتا تھا۔ اوقات فرصت میں حکام سے ملاقاتیں کرتے اور تاش وغیرہ شاغل تفریح میں شریک ہوتے تھے۔ شہر کے ایک مہاجن مصر کدار ناتھ ان کے ہم عمر دوست تھے۔ وہ دوسرے تیسرے دن آتے اور گنجیفہ بازی کی رغبت دلاتے تھے۔ سید ابوطالب کی خاطر سے کبھی کبھی ہارمونیم بھی یاد کیا جاتا تھا۔ ڈپٹی حکیم الدین کے صاحبزادے منشی عبید الحق مین پوری میں نائب

تحصیلدار تھے۔ زندہ دل۔ یار باش۔ وفا شعار۔ شب و روز مولوی نور الحسن کی خدمت میں حاضر رہتے اور پالٹکس پر رلے زنی کیا کرتے تھے۔ خان بہادر منشی اطہر علی وکیل کا اسم مبارک اوراق گذشتہ کی زینت ہو چکا ہے وہ اس سال بہ نیت حج عازم حجاز ہوئے۔ اُن کے صاحبزادے منشی اظہر علی بی اے کئی سال سے امتحان وکالت میں شریک ہوتے اور ناکام رہتے تھے۔ ظریفوں نے فقرہ بازی شروع کردی تھی کہ ان کے دماغ میں قانون کی گنجائش نہیں ہے۔ مولوی نور الحسن نے اُن کو مین پوری بلایا کئی مہینے مہمان رکھا اور خود قانون کا درس دیا۔ اُستاد کیمیا ساز کا فیض رائگاں نہ جا سکتا تھا۔ اُسی سال وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور آج مجلس وضع قوانین ہند کے ممبر ہیں!!

حضرت محسن مرحوم ہر سال ماہ ربیع الاول میں ایک مجلس میلاد شریف بڑی عالی ہمتی اور سیر چشمی سے کیا کرتے تھے۔ وسط صفر ۱۳۲۲ھ میں اُن کا انتقال ہوا تو اُس سال ربیع الاول میں یہ مجلس متبرک منعقد نہ ہو سکی۔ دوسرے سال مولوی نور الحسن نے بہ نیت ایصال ثواب رسم قدیم کی پابندی کی۔ صفر ۱۳۲۵ھ قریب آیا تو رلے ہوئی کہ اس سال یہ مجلس بجائے ربیع الاول کے والد ماجد کے ماہ وصال میں منعقد کی جائے اور اُس کے ساتھ مشاعرہ بھی ہو۔ مولوی انوار الحسن سے مشورہ لیا۔ وہ بھی ہم خیال ہوئے اور ۲۰ مارچ ۱۹۰۸ء انعقاد بزم کی تاریخ مقرر ہوئی۔ عوام نے اُس کو برسی کا فاتحہ سمجھا۔ عقیدتمندوں نے حضرت محسن کا عرس تصور کیا لیکن حقیقتاً وہ قدیم مجلس تھی جس کی تاریخ تبدیل کردی گئی تھی۔ دعوت کا اہتمام ہوا۔ شیوخ اٹاوہ۔ سخن سنجان مارہرہ۔ کہنہ مشقان فرخ آباد وغیرہ مدعو کیے گئے۔ راقم الحروف اُس وقت فیروز آباد ضلع آگرہ کا دورہ کر رہا تھا اُس کو بھی یاد فرمایا۔ تاریخ معینہ پر صبح کے وقت بڑی فراخ حوصلگی سے محفل کا انصرام ہوا۔ سہ پہر کو اکمین یونین کلب کے وسیع صحن میں مشاعرہ تھا۔ شعرائے مین پوری و فرخ آباد نے خوب خوب غزلیں پڑھیں۔ شیخ عبد الوحید فدا حضرت طاہر فرخ آبادی۔ اور منشی نعیم الدین کاکوروی کے صاحبزادے حکیم حکیم الدین برق کی غزلیات کی بہت تعریف ہوئی۔ حکیم صاحب کی غزل اس قدر مقبول ہوئی کہ ختم محفل کے بعد شائقین کے اصرار سے دوبارہ پڑھوائی گئی۔ اس کے چند شعر سُنیے:-

وصال اُن کا ہو اور مجھ کو میسر۔ ہو نہیں سکتا	وہ۔ اور مجھ سے ملیں۔ ایسا مقدر ہو نہیں سکتا
نہ ہو جس دل میں تو بالکل غلط ہے اُس کو دل کہنا	نہ سودا تیرا جس سر میں ہو وہ سر ہو نہیں سکتا
مری آنکھوں میں آجا دُ مرے دل میں سما جا دُ	مقام خلوت اس سے اور بہتر ہو نہیں سکتا
الٰہی خیر ہو یہ بت تو دل ہی چھینے لیتے ہیں	بتوں کا گھر بنے اللہ کا گھر ہو نہیں سکتا

پڑا ہے برق سے پالا سنبھل لے آسماں اب تو　　نہ اُڑ جائیں دھوئیں تیرے ستمگر ہو نہیں سکتا

شیخ محمد اسمٰعیل رنگیلے کی غزل ظرافت میں خوب تھی۔ چند شعر یاد ہیں :-

سبنے گو لاکھ نیٹو پر وہ مسٹر ہو نہیں سکتا　　مقابل بوٹ کے ہرگز سلیپر ہو نہیں سکتا
نہ دیتے ہو نہ دو اچھا نہ دو للکارتے کیوں ہو　　مرے ٹیپو کو کیا ٹکڑا میسر ہو نہیں سکتا
ہوکل دم دیے پھرتے ہیں نرسنگھ داس کے اوپر　　پلپیڈر اور پھر ایسا پلپیدر ہو نہیں سکتا

مولوی نور الحسن میر مشاعرہ تھے۔ اُن کی غزل بھی سید الکلام تھی :-

شفا ہو مجھ کو ان آنکھوں سے باور ہو نہیں سکتا　　کہ جادوگر میں اعجاز پیمبر ہو نہیں سکتا
وہ کہتے ہیں کہ بے جا تہمتیں تم نے لگائی ہیں　　رہے آٹھوں پہر دل میں وہ دلبر ہو نہیں سکتا
صبا تجھ کو مبارک تو وہاں گر آتی جاتی ہے　　مگر اتنا رسا اپنا مقدر ہو نہیں سکتا
سراپا ناز جو بت ہو نیاز اُس میں کہاں ممکن　　خدا چاہو تو کہہ لو۔ بندہ پرور ہو نہیں سکتا
مرے دل میں اثر کیا خاک ہو پند و نصیحت کا　　یہ بت خانہ کبھی اللہ کا گھر ہو نہیں سکتا
تسلی خاک ہو نیّر کو تصویر خیالی سے　　شبیہ گل میں اندازِ گلِ تر ہو نہیں سکتا

فطرت نے سنجیدہ و متین بنایا تھا۔ معاملہ بندی پسند نہ تھی۔ زبان کے چٹخارے سے شعر میں لطف پیدا کرنا عجز تصور فرماتے تھے۔ مضمون آفرینی کا شوق تھا۔ ہوسناکی کی داستانیں۔ بازار کی کہانیاں نظم کرنا عار سمجھتے تھے اور عاشقانہ شاعری میں انھیں چوچلوں کی قدر رہتی لہذا صوفیانہ معنامین تلاش کرنے اور نعت کہنے کا عزم کیا۔ مندرجہ ذیل غزل شروع کی تھی مگر ناتمام رہی :-

عیاں گر پردۂ دل میں تری تصویر ہو جاتی　　"تعالیٰ شانہ" کی اک نئی تفسیر ہو جاتی
وہ قتل بگینہ پر ہوں نہ شرمندہ قیامت میں　　مجھے یہ دُھن ہے مجھ سے بھی کوئی تقصیر ہو جاتی
ہماری آہ کو لازم رسائی تھی زمانہ میں　　کہیں ناقوس بن جاتی کہیں تکبیر ہو جاتی

نعت کی غزل سُنیے :-

دل میں تصورِ شہ کون و مکاں نہ تھا　　شعلہ تھا طور کا کہیں جس میں دھواں نہ تھا
دیر و حرم میں ایک ہی جلوہ نظر پڑا　　میری نظر میں صرف مکیں تھا مکاں نہ تھا
سایہ میں تیرے امت عاصی نے دم لیا　　یہ وہ زمین تھی کہ جہاں آسماں نہ تھا
سایہ قد رسول کا اُمت کو مل گیا　　اللہ رے دلدہی کہ یہاں تھا وہاں نہ تھا
گذرے ہیں شاعر اور بھی نیّر خدا گواہ　　محسن سا نعت میں کوئی شیریں بیاں نہ تھا

جون سنہ ۱۹۰۱ء میں کلکٹر ضلع نے بادشاہ کی سالگرہ کا جلسہ کیا۔ مولوی نور الحسن سے نظم کی فرمائش ہوئی
اُنھوں نے بلطائف الحیل ٹالنا چاہا۔ مگر احباب کے اصرار سے مجبور ہوئے۔ کلکٹر صاحب کے بنگلہ پر
ایوننگ پارٹی تھی۔ ضلع کے رؤسا اور عمائدین جمع تھے۔ تکلفات سے فراغت کے بعد حسب ذیل نظم سنائی۔

کیسی ادا سے آمد فصل بہار ہے ۔۔۔ شرمیلی چال اور غضب کا نکھار ہے
گرمی کی رُت میں رات سُہانی خنک ہوا ۔۔۔ گجرا کلائی میں ہے تو گردن میں ہار ہے
ہاتھوں میں نرا ہردں کے ہی مضراب خوشنما ۔۔۔ ہر رند دوش پر لیے پھرتا ستار ہے
یہ لطف پارٹی کا یہ ترتیب و انتظام ۔۔۔ جو چیز اس جگہ ہے وہ ترتیب وار ہے
کس کا یہ جشن سالگرہ کیسی دھوم ہے ۔۔۔ تقریب کیا ہے جس کی خوشی بے شمار ہے
شاہنشہ ہند کا شہ اڈورڈ ہفتمیں ۔۔۔ قربان جس پہ چاند ہے سُورج نثار ہے
جب تک رہے زمانہ میں یا رب خوشی کی دُھوم ۔۔۔ جب تک نشاط دل کے لیے خوشگوار ہے
سایہ میں حق کے وہ رہے ہم اُس کے سایہ میں ۔۔۔ جب تک یہ دھوپ چھاؤں یہ لیل و نہار ہے
افکار دشمنوں کو میسر اُسے ہو عیش ۔۔۔ جب تک زمانہ بھر میں خزان و بہار ہے
نور الحسن دعا تری مقبول ہو گئی ۔۔۔ آمین کی بلند صدا بار بار ہے

راقم جولائی سنہ ۱۹۰۷ء میں فرائض ملازمت کے وسیلہ سے مین پوری پہونچا۔ شام کا وقت تھا
مصر کدار ناتھ اور مولوی عبید الحق خدمت میں حاضر تھے۔ امساک باراں کی شکایت تھی۔ مصر کدار ناتھ
نے کہا کہ ہفتہ عشرہ میں پانی نہ برسا تو قحط یقینی ہے۔ راقم اضلاع مغربی کے دورے سے آیا تھا
اُس طرف بارش کسی قدر ہو چکی تھی عرض کرنے لگا کہ اب قحط کا خطرہ نہیں باقی ہے۔ اُستاد مرحوم نے
فرمایا کہ خدا رحم کرے گرانی تو ابھی سے شروع ہے۔ اس کے بعد شعر و سخن کا تذکرہ ہوا۔ ارشاد
فرمایا کہ نعت کے لیے غزل مناسب نہیں ہے۔ ارادہ ہے کہ غزوۂ بدر یا فتح مکہ کی حکایت نظم کروں
اور "سراپائے رسول اکرم" کے طرز پر مسدس لکھوں۔ میں نے عرض کی واقعہ نگاری کے لیے مثنوی موزوں
ہے اور فتح مکہ تاریخ اسلام کا مہتم بالشان واقعہ ہے۔ فرمایا کہ میں اول غزوۂ بدر نظم کرنے کی کوشش
کروں گا۔ فتح مکہ تو مدتوں بعد ہے۔

جب حاشیہ نشین رخصت ہوئے تو راقم سے فرمایا کہ مقدمات کا دائرہ یہاں بہت تنگ ہو گیا
ہے اگر قحط پڑا تو میرے پاس کچھ بھی کام نہ رہے گا۔ ارادہ ہے کہ مین پوری کی سکونت ترک کر کے
حیدر آباد میں قسمت آزمائی کروں۔ وہاں ہندوستانی وکلا کی بہت قدر ہے۔ میں نے عرض کی کہ آپ کے

تشریف لے جانے سے یہاں کے علاقہ کا انتظام دشوار ہو جائے گا۔ فرمایا زمینداری کا کام ضلعدار دیکھتے ہیں وہ بحال رہیں گے۔ کوٹھی کرایہ پر دیدی جائے گی۔ مولوی انوار الحسن سال میں دو ایک بار اس طرف آیا کریں گے۔ میں نے عرض کی کہ بڑی افسوسناک خبر آپ نے اس وقت سنائی ہے۔ فرمایا "کیا کروں۔ میرا دل یہاں سے اُچاٹ ہو گیا ہے۔" اس کے بعد گفتگو کا رُخ بدل دیا اور اپنے لڑکوں کی تعلیم کا تذکرہ کرنے لگے۔

راقم الحروف کو اس موقع پر کئی ہفتہ تک خدمت اقدس میں حاضری کا شرف حاصل رہا۔ مولوی احمد حسن بھی اُس زمانہ میں مین پوری میں تھے۔ احاطہ کے نو تعمیر کمرے میں رہتے تھے اور میں بھی اُنھیں کے ساتھ اقامت گزیں تھا۔

خود بدولت اپنے والد مرحوم کی نشست گاہ میں رونق افروز رہتے تھے۔ صبح کو مقدمات کی مسلیں دیکھتے۔ خطوط لکھتے یا شاعری کرتے تھے۔ سہ پہر کو کلب جاتے اور ٹینس کھیلتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے۔ سرِ شام احباب کا مجمع ہوتا۔ اور شب کے نو دس بجے تک صحبت رہتی تھی۔ ایک روز سہ پہر کو کوٹھی کے پورب طرف صحن میں تشریف فرما تھے۔ راقم آثم خدمت میں حاضر ہوا۔ سامنے پر فضا پائیں باغ تھا اور سرو کے شاندار درخت لگے تھے۔ جیب سے کاغذ کا پرچہ نکال کر خلاف عادت یہ اشعار سنائے :-

سرو چمن بہ شکل عَلَم سرفراز ہے　　　مہندی کی ہر روش صف اہل نماز ہے
بلبل نیاز مند گل بے نیاز ہے　　　سنبل شبیہ حضرت گیسو دراز ہے
لالہ ہے سر بکف کہ جو موقع ذرا ملے
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں جا ملے

میں نے عرض کی کہ جنگ کی تمہید کے لیے یہ بند نہایت خوب ہے۔ فرمایا " اسی طرز پر لکھنے کا ارادہ ہے اور میں پہلے مسدس ہی لکھوں گا۔"

چند روز کے بعد راقم مین پوری سے رخصت ہوا۔ اکتوبر سے مولوی احمد حسن و محمد حسن علیگڑھ چلے گئے۔ مولوی حامد حسن و مصطفٰے حسن کے لیے بیش قرار تنخواہ پر مولوی نوکر تھے۔ اہل خانہ اپنے والد کے ساتھ تھیں اور صاحب اولاد ہو چکی تھیں۔ مولوی طاہر محسن ۷ فروری ۱۹۰۶ء کو پیدا ہو چکے تھے۔ اخراجات میں افزونی تھی۔ وکالت میں ترقی نہ ہوئی۔ قحط شروع ہو گیا۔ دیہات کی آمدنی ذریعہ معاش تھی اُس میں بھی نقصان نظر آنے لگا۔ اتفاقات قضا و قدر سے اسی زمانہ میں ضلع کے صاحب جج سے

بھی خفیف رنجش پیدا ہوگئی۔ دل مین پوری سے پہلے ہی اُچاٹ تھا اب ترک سکونت کا مستقل قصد کر لیا۔ حیدر آباد جانے کی نیت تھی۔ مشورے کے لیے مولوی انوار الحسن کے پاس اُناؤ گئے۔ اُنھوں نے دکن کے سفر سے مخالفت کی اور صلاح دی کہ وہ بجائے مین پوری کے ہردوئی میں وکالت کریں کیونکہ وہاں مقدمات کی کثرت اور قابل و جفاکش وکیل کی تلاش ہے۔

یہ تجویز پسند خاطر ہوئی۔ مین پوری سے موروثی کتب خانہ اور تین پشت کا اسباب خانہ داری ہردوئی منتقل کیا گیا۔ مولوی حامد حسن و مصطفےٰ حسن کو ہمراہ لے کر یکم دسمبر ۱۹۰۷ء سے ہردوئی میں مقیم ہوئے۔

ہردوئی میں وکالت اور خورشید مہر

یہ شہر وطن مالوف سے قریب تھا۔ آب و ہوا پسند ہوئی۔ اسٹیشن کے قریب منڈی میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ مین پوری کی وسیع و پُر فضا کوٹھی کے بعد یہاں دل کیا لگتا۔ چند ہی روز میں تکلیف معلوم ہونے لگی۔ اُس کو چھوڑ کر بازار کے قریب گئے۔ دوسرا مکان بھی ناکافی ثابت ہوا۔ آخر کار مولوی لطیف الدین کا کوروی مختار نواب صاحب شاہ آباد کی ایک حویلی میں قیام اختیار کیا اور جب تک ہردوئی میں رہے اسی محلہ میں سکونت رکھی۔

وکلا شہر سے ملاقات کی۔ حکام کی خدمت میں حاضری دی۔ کچہریوں کے چکر لگائے۔ کار آزمودہ اور تجربہ کار تھے چند روز میں مقدمات ملنے لگے اور تین مہینہ کے اندر قانون دانی، معاملہ فہمی اور حاضر جوابی کی شہرت ہوگئی۔ مجلس میلاد شریف منعقد کر کے شہر کے مسلمانوں میں ہر دلعزیزی حاصل کی۔ انجمن اسلامیہ اور مسجد جامع کے انتظامات میں شرکت فرما کر ضلع میں نام پیدا کیا۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں نمائش کا میلہ تھا احباب کی فرمائش سے ایک نظم لکھی اور ۷ مارچ کو نمائش کے دربار میں پڑھی۔ پہلا بند تھا:-

آئی بہار ساتھ اُمنگیں لیے ہوئے شاخوں پہ پھول جھوم رہے ہیں پیے ہوئے
نور الحسن۔ تم اور لبوں کو سیے ہوئے توبہ کو توڑ دو۔ ہوئی مدت کیے ہوئے

بلبل کے نغمے سنیے پرندوں کے چہچہے
کلیاں چٹک چٹک کے لگاتی ہیں قہقہے

روشن خیالوں کے ایک گروہ نے نمائش کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اُن پر چوٹ تھی:-

مخمل پہ لات مار کے عاشق ہیں ٹاٹ کے جو غل مچا رہے ہیں یہاں بائیکاٹ کے

کلکٹر ضلع کی تعریف میں ایک بند تھا جس کی ٹیپ تھی

جھڑتے ہیں پھول لطف سے کہ وہ بات بات میں گلدستہ بن گیا ہے وہ سارے صفات میں

نظم کی بہت تعریف ہوئی۔ سارے ضلع میں تازہ وارد شاعر کی معجز بیانی مشہور ہوئی۔ کلکٹر ضلع مہربان ہوئے۔ حکام عزت کرنے لگے اور وکالت چمک اٹھی۔

۱۹ اگست ۱۹۰۷ء کو سندیلہ میں مشاعرہ تھا۔ دور دور سے شعرا تشریف لائے تھے۔ طرح تھی ؎

میلہ لگا ہے پیرمغاں کی دکان پر

مین پوری کے بعض حضرات بھی تشریف لائے تھے۔ رنگیلے سے ناظرین کا تعارف ہو چکا ہے اس لیے اُن کے دو شعر سننا چاہیے:۔

دشمن جہاں اڑا تھا وہیں ہم بھی اڑ گئے ۔۔۔ دو ٹوٹو گویا باندھ دیے ایک تھان پر
اُن کی زمین غیر کی خود کاشت تو نہیں ۔۔۔ پھر کیوں نہ جوتیں بوئیں اُسے ہم لگان پر

حکیم حکیم الدین برق نے بھی غزل لکھی تھی۔ مطلع تھا۔

قبضہ کیے ہوئے ہیں وہ دونوں جہان پر ۔۔۔ خود ہیں زمین پر تو دماغ آسمان پر

مولوی نورالحسن کی مضمون آفرینی دیکھیے:۔

ہم وہ بلا ہیں آئیں اگر اپنی آن پر ۔۔۔ تارے زمین پر ہوں دھوئیں آسمان پر
وہ آئے ایک دم کے لیے۔ خیر آئے تو ۔۔۔ شکوے کے ساتھ شکر ہے لازم زبان پر
مین حشر میں مثال اویس قرن اٹھوں ۔۔۔ دل میں احد ہو۔ نام محمد زبان پر
کچھ تھی مریض ہجر کو عیسے کے دم کی آس ۔۔۔ وہ بھی تو جا کے بیٹھ رہے آسمان پر
نیر وہ ہم نہیں کہ جو چوری سے چھپے پھریں ۔۔۔ چپکے سے جا کے بیٹھ رہیں پھر مکان پر

وکالت کا کاروبار بڑھتا گیا۔ مشق سخن کی فرصت مفقود ہوئی لیکن عزوہ بدر کے واقعات نظم کرنے کا عزم قائم تھا۔ رجبی شریف کی مجلس میں ہر سال کاکوری قدم رنجہ فرماتے اور حسب دستور نعت خوانی کرتے تھے۔ اس سال اپنے جدید مسدس کے چند بند سنائے۔ اعزہ دنگ ہوئے۔ اہل بزم ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ بعض کوتاہ اندیشوں کو شک ہوا کہ یہ اشعار حضرت محسن کے ہیں۔ مولوی نورالحسن نے کبھی شعر نہیں کہا۔ عقیدت مندوں نے خیال کیا کہ یہ زور کلام "کلیات نعت مولوی محسنؒ" کی تدوین کا ثمرہ ہے۔ ایک بند بطور نمونہ کے لکھا جاتا ہے۔ شہنشاہ رسلؐ کا سراپا ہے۔ چشم مبارک کی تصویر دیکھیے:۔

پتلی سیاہ۔ ڈورے سفیدی میں لال لال ۔۔۔ آنکھیں بنی ہیں امت مرحوم کی مثال
ہمسرے سیہ کاروں کا پتلی میں ہے جمال ۔۔۔ بینا دلوں کا رنگ سپیدی میں ہے کمال

پھولی شفق ہے آنکھ میں خون شہید کی
اللہ کیا رسائی ہے مشتاق دید کی

فروری سنہ ۱۹۰۹ء میں نمائش کا میلہ ہوا۔ اب کے اُس کے ساتھ ایک مشاعرہ بھی تھا۔ طرح تھی۔ ع
بلبل کے آنسوؤں میں ہے خوشبو گلاب کی

مشاعرہ کے لیے غزل۔ دربار کے لیے نظم لکھی۔ غزل کا رنگ دیکھیے :-

زاہد کی توبہ ٹوٹ کے رندوں میں جا ملی — یہ بات عمر بھر میں ہوئی ہے ثواب کی
یہ خوب دلدہی ہے کہ خط کے جواب میں — تصویر بھیج دی دل خانہ خراب کی
نیر کو تم خدا سے سمجھتے ہو دور کیوں — ذرہ میں بھی کرن ہے اُسی آفتاب کی

ہر سال نمائش کا میلہ ہوتا تھا اور دربار کے لیے نظم لکھنے پر مولوی نورالحسن مجبور کیے جاتے تھے۔ یہ نظمیں وقت، مقام اور موسم کے لحاظ سے پر لطف ہوتی تھیں۔ دربار میں واہ واہ سبحان اللہ کا غل مچتا تھا لیکن شاعرانہ حیثیت سے قابل قدر نہ تھیں۔ ۴ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کے دربار میں ایک مسدس پڑھا جس کا پہلا بند تھا :-

پھولا ہے آج کیسی ادا سے گل فرنگ — خوشبو نے اختیار کیے ہیں ہزار رنگ
کچھ نوبہار کے نظر آتے ہیں رنگ ڈھنگ — کلیاں چٹک چٹک کے بجاتی ہیں جلترنگ
ہر شاخ پتیوں سے ہے کیسی بھری کھڑی
دھانی لباس میں ہے زمرد پری کھڑی

دربار میں مسدس بہت پسند کیا گیا۔ ٹیپ واقعی خوب تھی لیکن ایک شاگرد نے دبی زبان سے چند روز کے بعد کہا کہ "گل فرنگ میں خوشبو نہیں ہوتی"۔ ارشاد فرمایا کہ "رنگ ہوتا ہے اور وہی خوشبو کا بدل ہے"۔

نمائش کے سلسلہ میں مشاعرہ بھی تھا۔ طرح تھی۔ ع
کچھ اب کے سال رنگ نئے ہیں بہار کے

غزل کے چند شعر سُنیے :-

خلعت جو دھوپ چھاؤں کا پایا تھا خواب میں — راتیں ملیں فراق کی دن انتظار کے
ہیں آرزو کے حرف بھی ایسے الگ الگ — جس طرح پھول بکھرے ہوں فصل بہار کے
نیر کی پارسائی کا سب حال کھل گیا — حضرت بھی پیچھے پیچھے تھے اک بادہ خوار کے

واقعاتِ غزوۂ بدر کے نظم کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اوقات فرصت میں دو چار شعر موزوں کرتے تھے۔ رزمیہ نظم کے لیے جنگ کی تفصیل۔ آلات حرب کی توصیف و توضیح۔ مبارزین و مقاتلین کی فہرست ضروری تھی۔ لیکن اس حصہ کو مہمل کیا اور فرمایا کہ "میر انیس اس صنف سخن کو تمام کر چکے مزید کوشش فضول ہے"۔ علاوہ اس کے صحیح روایات سے یہ تفصیلات معلوم نہ ہوتی تھیں اور تخیل سے کام لینا منظور نہ تھا۔ ایک بند میں کل حکایت ختم کردی۔

مقبول کبریا کی دعا با اثر ہوئی — فوج قریش لمحہ میں زیر و زبر ہوئی
اسلام کو خدا کی مدد سے ظفر ہوئی — روزے میں کہیے عید کی گویا سحر ہوئی

احسان کیا بیان ہو مالک کی قدر کا
گھر بن گیا بہشت میں اصحاب بدر کا

اس مسدس کا خورشید بدر نام رکھا اور افتتاح کے لیے یہ رباعی تصنیف کی

یارب مجھے عشق رُخِ پیغمبر دے — نیرؔ ذرہ ہے مہر انور کر دے
کر نقش نگین دل پہ اللہ اللہ — ہر نقش میں پھر نام محمدؐ بھر دے

لشکر اسلام بدر میں عشا کے وقت پہونچا تھا اور رمضان کی پندرہ تاریخ تھی اس لیے تمہید میں شب ماہ اور ارکان نماز کی طرف اشارہ تھا مثلاً

آئی ہے آج رات عجب آن بان سے — سر ہے جلو میں مہر درخشاں کی شان سے
سبزہ کی ہر روش پہ ادا کہکشاں کی ہے — اللہ اکبر آج یہ نیت کہاں کی ہے

گریز میں حلیۂ مبارک کی تفصیل تھی اور یہی مسدس کا بہترین حصہ تھا۔ زبان مبارک کی تعریف میں فرماتے ہیں:—

سحر حلال ہے کہیں آیت شفا کی ہے — گویا زبان کا ہے کو مرضی خدا کی ہے

تناسب اعضا کی توصیف:—

موزونی و تناسب اعضا کا روپ ہے — گرمی کی چاندنی ہے تو جاڑے کی دھوپ ہے
ڈوبا خدا کے رنگ میں قد مصطفےٰ کا ہے — تصویر ہے رسول کی نقشہ خدا کا ہے
آئینۂ جمال الٰہی ہے رو برو — لا یمکن الثناء کما کان حقہ

مقدس ہمراہیان جنگ کی تعریف میں یہ شعر لاجواب تھا:—

تھوڑی بہت سبھی کو تھی صحبت رسول کی — ہر ایک پنکھڑی تھا اُسی ایک پھول کی

لشکر بدر میں خیمہ زن ہوا تو پانی کی قلت تھی اور مکان راہ سے بدن چور چور تھا۔ رحمت حق سے مجاہدین پر نیند کا غلبہ ہوا اور سفر کی خستگی دفع ہوگئی۔ نیند کی تعریف کرتے ہیں :-

دل خستہ ہو کے نیند کے انداز دیکھیے — کیفیت شراب خدا ساز دیکھیے

نمائندہ یہ حسد کا شعر تھا :-

ذرّہ کی تو چمک ہے تو قطرہ کی آب ہے — جس دل میں تو نہیں ہے وہ خانہ خراب ہے

اور دعا تھی :-

وحدت و دوئی کے رنگ میں یوں رو برو رہے — آنکھوں میں ہو رسول ترا دل میں تو رہے

فی الحقیقت یہ مسدس مولوی نور الحسن کا شاہکار[1] تھا اور اُن کا کوئی عاشقانہ، صوفیانہ یا نعتیہ کلام اس نظم سے فائق نہ ہو سکا۔

المختصر نعت گوئی کی مشق سے شاعری پختہ ہوگئی۔ خورشید بدر کی قبولیت عامہ نے شہرت میں چار چاند لگائے۔ انجمن اسلامیہ ہردوئی کے روح رواں تھے۔ عیدگاہ کی امامت سپرد تھی۔ مسلمانان شہر کے مسلم لیڈر ہو گئے۔ ایک سن رسیدہ امین پوارہ ملک زاہد علی نام شب و روز کے جلیس و انیس تھے۔ مجھ نہیں بنتی اور گشتے تیار ہوتے تھے۔ مولوی مصطفےٰ احسن و حامد حسن کو تعلیم کے لیے لکھنؤ روانہ کر دیا تھا اور وہ ندوۃ العلما میں عربی پڑھتے تھے۔ اپنے عزیز انیس احمد عباسی کو (جو اب روزنامہ حقیقت کے اڈیٹر اور لکھنؤ میں میونسپل کمشنر ہیں) انگریزی پڑھنے کے لیے اپنی نگرانی میں رکھا۔ وہ انٹرنس کلاس میں تعلیم پاتے اور اوقات فرصت میں مولوی نور الحسن سے استفادہ کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں چند ماہ کے لیے اپنے بھانجے شفیق احمد کو بھی ہمراہ رکھا تھا مگر وہ تادیب و تنبیہ کے متحمل نہ ہو سکے اور اپنے بھائی ڈاکٹر حکیم احمد کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ وکالت کے کاروبار سے لڑکوں کی

[1] منشی زین العابدین فرہاد کا تذکرہ ان اوراق میں پہلے آ چکا ہے۔ مولوی نور الحسن کے غائبانہ دوست تھے۔ خورشید بدر اُن کی نظر سے گذری تو ایک قطعہ اس کی تعریف میں لکھ کر روانہ کیا۔ اس تقریظ کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں :-

جان ایماں آید و ایمان جان آید ہمی — یا کہ از نور الحسن خوش ارمغاں آید ہمی
ایں مسدس پنج نوبت زد بشش رنگ جہاں — شاہد ہر ہفت خلد جاوداں آید ہمی
نور نیر ہست از انوار نعت مصطفےٰ — حرف حرفش را دو دو دم برزباں آید ہمی
خامہ او نقش بند پکرستان خیال — طبع روشن شارق اشراقیاں آید ہمی
تاب نیر با در شک افزائے مہر نیمروز — خواہش نشر جاوداں از دل برزباں آید ہمی

خبر گیری کی مہلت نہ ملتی تھی۔ آمدنی اس قدر وافر تھی کہ اخراجات کے بعد پس انداز ہوتی تھی۔ موروثی جائداد کا منافع کارہائے خیر میں صرف کرتے تھے۔ اوراد و وظائف کا شغل جاری تھا مدح خیر المرسلین نے آستانۂ سرکار دو عالم پر حاضری کا اشتیاق پیدا کیا۔ عشق اول در دل معشوق پیدا می شود۔ اُدھر بھی کشش شروع ہوئی اور سفر حجاز کے سامان مہیا ہونے لگے۔

سفر حجاز | مولوی انوار الحسن اناؤ میں وکالت کرتے تھے۔ جاذبۂ شوق نے فریضۂ حج یاد دلایا۔ بیٹھے سے دل سرد ہوا۔ اہل و عیال ہمراہ لے کر عرب کا عزم بالجزم کر دیا۔ مولوی نور الحسن ہم خیال ہوئے۔ ہر دوئی کے ایک نو وارد وکیل مولوی محمود الحق کو اپنے مقدمات حوالہ کیے۔ اسباب خانہ داری سپرد کیا۔ منشی انیس احمد عباسی مدرسہ میں پڑھتے تھے اُن کو مکان مسکونہ میں چھوڑا۔ اہلیہ محترمہ اپنی ہمشیرہ کی علالت کے سبب ہمراہ نہ جا سکتی تھیں وہ اپنے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں رہیں اور خود بدولت اہل و عیال کی زنجیر محبت توڑ کر بھائی کے رفیق سفر ہوئے۔

حاجی ذکی الدین اور منشی رشید الدین مع اپنے قبائل کے ساتھ ہوئے۔ اعزہ کی بعض دیگر مستورات بھی قافلہ کے ہمراہ ہوئیں اور ۲۴ راکتوبر ۱۹۱۰ء مطابق ۲۰ رشوال ۱۳۲۸ھ کو یہ کاروان بہ آہنگ حجاز کاکوری سے رخصت ہوا۔

مولوی محمد شفیع بجنوری جو کئی بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے تھے (اور اس سال ۱۳۵۵ھ میں سولھویں حج کے لیے عرب گئے ہیں) مراحل و منازل سفر کا تجربہ رکھتے تھے امداد و رہبری کے لیے ہمراہ لیے گئے۔ انھوں نے چند روز پہلے سے بمبئی پہونچ کر سامان سفر فراہم کر لیا تھا۔ کاکوری کا قافلہ بمبئی میں تین چار دن قیام کر کے "فخری" جہاز پر سوار ہوا اور ہندوستان کے ساحل کو "خیر باد" کہی۔

قرنطینۂ کامران میں تضیع اوقات کے بعد سترھویں دن جدہ پہونچے اور "باب مکہ" میں قدم رکھا۔ دو تین دن وہاں بھی قیام رہا۔ شقدف خرید کیے۔ اونٹ کرایہ پر لیے اور دو دن کا سفر طے کر کے ۲ رذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ عمرہ ادا ہوا۔ پندرہ بیس دن کے بعد حج کا وقت آیا۔ منا اور عرفات میں حاضری دی۔ فریضہ سے سبکدوش ہو کر مکہ میں مقیم ہوئے اور تقریباً چالیس دن نماز پنجگانہ مسجد الحرام میں نصیب ہوئی۔

حاجی امجاز علی کاکوروی (برادر زادہ منشی امتیاز علی مرحوم وزیر بھوپال) اُس سال وطن سے حج کے لیے آئے تھے اور مولوی نور الحسن سے پہلے مکہ میں داخل ہو چکے تھے۔ اہل و عیال ساتھ تھے۔ منشی مشرف علی مرحوم (برادر منشی اظہر علی مسبوق الذکر) کی بیوہ بھی اُن کے ہمراہ تھیں اور وہ منشی منظور علی

"منجم" کے لڑکے مشہود علی کو جو اُن کی نگرانی میں پرورش پاتا تھا ساتھ لائی تھیں۔ یہ لوگ دوسرے مکان میں فروکش تھے مگر سب اہل وطن ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔

جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے طبیب حاذق حکیم عبد العزیز۔ میرٹھ کے مشہور رندان ساز گل محمد۔ اور لکھنؤ کے ڈاکٹر اشرف خان بھی مکہ معظمہ میں حاضر تھے۔ عبادت و استراحت سے جو وقت بچتا وہ اہل کمال کی صحبت میں صرف ہوتا تھا اور نہایت لطف سے یہ وقت گذر رہا تھا۔

اُس وقت مکے سے مدینہ کا سفر آلام و مصائب کا مخزن تھا۔ بے آب و گیاہ ریگستان حائل تھے۔ ہر قدم پر بدوؤں کی لوٹ مار کا خطرہ تھا۔ سلطانی راستہ سے اونٹوں کا قافلہ جو دو دن میں مدینہ پہونچتا تھا۔ ایک نزدیک تر راہ اور بھی کہ جدہ سے جہاز پر ینبوع جائیں اور وہاں سے اونٹوں پر چھ دن میں مدینے پہونچیں۔ رفقائے سفر میں اختلاف رائے ہوا۔ بعض سلطانی راستہ کو ترجیح دیتے تھے اور بعض ینبوع کی طرف کوچ بہتر سمجھتے تھے۔ مسجد الحرام میں استخارہ کیا گیا اور سلطانی راستہ سے سفر بہتر معلوم ہوا۔ چند روز کے بعد خیالات نے پلٹا کھایا اور ۱۰ محرم ۱۳۲۹ھ کو حکم استخارہ کے خلاف ینبوع جانے کے لیے جدہ کی طرف راہی ہو گئے۔ حاجی اعجاز علی مکہ میں مقیم رہے مگر حکیم عبد العزیز ہمراہ گئے۔ ینبوع میں قدم رکھتے ہی صعوبات کا سلسلہ شروع ہوا۔

مولوی انوار الحسن کا ہفت سالہ لڑکا محمود حسن جہاز سے تندرست اُترا تھا لیکن فرودگاہ تک پہونچتے ہی ہیضہ میں مبتلا ہوا اور آواز بند ہو گئی۔ حکیم عبد العزیز نے علاج کیا مگر قضائے الٰہی رد نہ ہو سکتی تھی۔ ہنستا کھیلتا لڑکا چوبیس گھنٹے میں تمام ہو گیا۔ اور ینبوع کے ریگستان میں دفن کیا گیا۔

حاجی ذکی الدین اسہال میں مبتلا ہوئے اور نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی۔ حاجی رشید الدین بیمار ہوئے۔ ان کی ہمشیرہ علیل ہوئیں اور قریب قریب کل ہمراہیان سفر کو کم و بیش امراض کی شکایت ہوئی۔ ہر مریض کی زبان پر تھا کہ آستانۂ نبی کریم تک پہونچوں تو مرض دور ہو جائے۔ مگر گاؤں میں اونٹ موجود نہ تھے جو یہاں سے کوچ کیا جاتا۔ آٹھ دن کے شدید انتظار کے بعد اونٹ ملے اور ریگستان کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ راستہ کے بدو بگڑے ہوئے تھے اور کسی قافلہ کو بغیر زحمت و آزار کے گذرنے نہ دیتے تھے۔ ہر روز حملہ کا خوف رہتا تھا اور ہر منزل دغدغہ سے کٹتی تھی۔ ایک دن راستے میں ٹوٹے ہوئے شغدف۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ نظر پڑے اور معلوم ہوا کہ کل اسی مقام پر لوٹ ہو چکی ہے اور آج بھی حملہ یقینی ہے۔ قافلہ والے توبہ استغفار کرنے لگے اور موت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اتنے میں غل ہوا کہ پہاڑی کی طرف سے بدو آ رہے ہیں کسی کو جینے کی آس نہ رہی۔ ہر شخص

اپنی بدنصیبی پر گریاں تھا کہ مدینۂ رسول کے قریب پہونچ کر حاضری آستانہ کی حسرت دل میں رہی جاتی ہے۔ مدینہ ہنوز دو منزل ہے اور موت کا پیغام آپہونچا۔ دل شکستہ محزونوں نے خلوص سے دعائیں مانگیں اور درگاہ بے نیاز سے اجابت استقبال کو آئی۔ سلطان روم کا فوجی دستہ مدینہ میں حاضر تھا۔ کل کے لُٹے ہوئے کارواں کی خبر مدینہ پہونچ چکی تھی۔ نئے قافلہ کی حفاظت کے لیے یہ رسالہ بھیجا گیا اور عین وقت پر حاجیوں کی دست گیری کو پہونچا۔ ہر ایک ترک بچہ اہل قافلہ کی نظر میں فرشتۂ رحمت تھا۔ اُن کی فوجی وردی رحمت یزدانی کا سایہ اور اُن کے زرق برق ہتھیار تجلیات حق کا پرتو معلوم ہوتے تھے۔

سلطانی لشکر کو دیکھتے ہی بدو فرار ہوئے اور مظلوم حاجیوں کے تن بے جان میں جان آئی۔ دوسرے دن قافلہ مع الخیر مدینہ میں داخل ہوا۔ سبز گنبد کی جھلک نظر آتے ہی سب پریشانیاں فراموش ہو گئیں۔ بیمار تندرست ہوئے اور ضعیفوں کی ناتوانی دُور ہو گئی۔

خوشا نصیب کہ آستانۂ سرکار دوجہاں کی دولت حاضری میسر ہوئی۔ مدتوں کی تمنا پوری ہوئی۔ زندگی بھر کی آرزو بر آئی۔ شبکۂ مبارک کے حضور میں فرط مسرت اور جوش عقیدت سے ربودگی اور بے خودی کا عالم ہوا اور ذوق شوق سے "السلام علیك یا رسول الله" کا نعرۂ عاشقانہ زبان پر آیا۔ قربان اُس مبارک ساعت کے جس پر زندگی کی ہر آنے والی ساعت قربان ہے!!

مقام وجد ہے اے دل کہ بزم یار میں آئے　　　　پڑے در بار میں پہونچے بڑی سرکار میں آئے

مولانا روم نے مثنوی میں لکھا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ عزیز مصر ہوئے تو اُن کا ایک کنعانی نیازمند ملاقات کے لیے آیا۔ حضرت نے پوچھا کہ میرے لیے وطن سے کیا تحفہ لائے ہو۔ دوست نے عرض کی کہ آپ کے قابل کوئی ارمغان مجھ کو دستیاب نہ ہوا۔ قطرہ کو دریا کے سامنے کیا لاتا۔ البتہ ایک آئینہ لایا ہوں تاکہ اس میں حضور اپنا جمال مبارک دیکھیں اور مجھ کو یاد کریں۔

آئینہ آوردمت اے روشنی　　　　تا چو بینی روئے خود یادم کنی

مولوی نور الحسن ہندوستان سے اُس شہنشاہ کا سہرا لکھ کر لے گئے تھے جس کی صباحت و ملاحت کے سامنے حسن یوسف شرمندہ تھا وہی محبوب رب العالمین کے دربار میں نذر گذرانا اور مواجہۂ اقدس میں مسدس خورشید بدر جوش و خروش سے پڑھا۔ سرکار سے انوار و برکات کے جو خلعت عطا ہوئے اُن کی کیفیت سوائے شاعر کے کون جان سکتا تھا اور اُنھوں نے کسی سے بیان نہیں کی۔

میان عاشق و معشوق رمزیست　　　　کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

مدینہ منورہ میں چالیس دن حاضری کا شرف حاصل رہا۔ منشی اعجاز علی بھی مکہ سے آگئے۔ منشی مشرف علی

مرحوم کی بیوہ مدینہ میں قدم رکھتے ہی داخل خلد بریں ہوئیں۔ منشی منظور علی کا لڑکا جو اُن کی زیر پرداخت تھا ہندوستان پہونچانے کے لیے مولوی نور الحسن کے سپرد کیا گیا کیونکہ حاجی اعجاز علی زیارت بیت المقدس کے لیے روانہ ہونے والے تھے اور بچہ کو ہمراہ لے جانا دشوار تھا۔ حاجی ذکی الدین اور حاجی رشید الدین مع قبائل کے ہندوستان روانہ ہوگئے۔ اُن کی روانگی کے بعد مولوی انوار الحسن کی بڑی صاحبزادی (زوجہ حکیم احمد) کے اسی مقدس شہر میں دو توام لڑکیاں پیدا ہوئیں اور جنت البقیع میں سپرد خاک کی گئیں۔ اس اثنا میں ربیع الاول کا مبارک مہینہ آیا۔ مسجد نبوی میں میلاد شریف کی مجلسیں منعقد کی گئیں اور فیوض و برکات سے سرشار ہو کر جوار نبی کریم سے رخصت ہوئے۔

جس دن ہوا تھا کوچ دیار حبیب سے　　میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھیے

ینبوع پہونچ کر پھر دشواریوں کا سامنا ہوا۔ چھ سات دن کے بعد "برما" جہاز آیا جو ساحل کے قریب چلتا تھا۔ نہایت مختصر اور سخت تکلیف دہ تھا۔ مجبوری اُسی پر سفر کیا۔ جدے پہونچے تو ہندوستان کے لیے کوئی جہاز موجود نہ تھا اور نہ کسی کی آمد کی خبر تھی۔ ہر دن انتظار میں گذرتا تھا۔ صبح کو آس بندھتی تھی اور شام کو مایوسی ہوتی تھی۔ اس بے سروسامانی اور انتظار اشد میں ایک مہینہ گذرنے کے بعد خدا خدا کرکے جہاز کی صورت نظر آئی۔ "فیروزی" نام تھا۔ اُس پر سوار ہو کر گیارھویں دن بمبئی میں لنگر انداز ہوئے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ الفانسو کا ناشتہ کیا۔ سبز پان کھائے۔ اہل وطن کو معاودت کی اطلاع کے لیے تار دیے۔ تین روز کے بعد کاکوری پہونچے۔ دوگانۂ شکر ادا کیا۔ مولوی انوار الحسن وکالت ترک کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ وہ خانہ نشین ہوئے اور بقیہ زندگی یاد حق کے لیے وقف کی مگر مولوی نور الحسن چند روز آرام کرنے کے بعد سلسلۂ وکالت دوبارہ شروع کرنے کے لیے ہردوئی چلے گئے۔ اُن کا قول تھا کہ

فقیری بھی کیجئے تو دنیا کے ساتھ　　نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ

اُردو کا سب سے پہلا شاعر کون ہے

(جناب مولوی سید مظہر علیم صاحب فریدآبادی بی اے (علیگ))

اس امر کا پتہ چلانا کہ اُردو کا سب سے پہلا شاعر کون ہوا ہے درحقیقت بہت دشوار امر ہے درانحالیکہ ہمیں خود یہی تحقیق نہیں کہ ہماری اُردو زبان کی ابتدا کب اور کہاں سے اور کیونکر ہوئی۔ تاہم اس بارے میں جو قیاس آرائیاں محققین اور مصنفین نے کی ہیں ان کا سرسری تذکرہ اس موقع پر بے محل نہ ہوگا کسی زبان کی پیدائش اور ترقی قدرتی اسباب کے تابع ہوتی ہے۔ انسان ویسی ہی زبان بولتا اور برتتا ہے جس پر قدرتی اسباب اسے مجبور کرتے ہیں۔

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

جس طرح دو بولی بولنے والے جانور ایک جگہ اکٹھے کر دیے جائیں تو یقیناً ایک دوسرے کی بولی اُڑالیں گے اسی طرح مختلف اللسان انسان جن کو نطق کی نعمت قدرت کی جانب سے بطور طرۂ امتیاز عطا ہوئی ہے جب ایک جا مجتمع ہوں گے تو یہ ممکن نہیں کہ ایک دوسرے کی بولی نہ سیکھیں۔ دنیا کی تاریخ کے اوراق اُلٹیے یہی حال قوموں کی زبانوں کا دیکھنے میں آئے گا۔ انگلستان میں جب رومن سلطنت قائم ہوئی تو وہاں کی اصلی اور خالص زبان میں جو 'سیکسن' کے نام سے موسوم تھی۔ بیشمار الفاظ لاطینی زبان کے داخل ہوگئے جو اس وقت تک انگریزی زبان میں مروج چلے آتے ہیں اور اس کا ایک جزو لاینفک ہوگئے ہیں۔ ایسا ہی ایک تغیر لسانی اُس وقت وقوع میں آیا تھا جب اہل عرب کے قدم عجم کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ جو رنگ عربیت کا اُس وقت فارسی پر چڑھ گیا وہ ایسا پختہ تھا کہ مرورِ زمانہ سے اُترا نہیں نہ پھیکا پڑا۔ اب ہندوستان کی طرف آئیے آریہ ہندو جب ہندوستان میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندگان کی پاس خاطر سے جو تہذیب و شایستگی میں ان سے بدرجہا کم تھے انھیں اپنی سنسکرت زبان بالائے طاق رکھنی پڑی اور ایک ایسی زبان کو رواج دینا پڑا جس میں ان لوگوں کو ان وحشی باشندگان کے ساتھ بول چال بات چیت میں سہولت ہو اور جس کو یہ لوگ بھی آسانی سے استعمال کر سکیں یہ زبان 'پراکرت'، اور 'برج بھاشا' بنی۔ اس کے بعد پہلی صدی ہجری میں مسلمان محمد قاسم کی سرکردگی اور اس کی قیادت میں اول ہی اول سندھ میں وارد ہوئے اور اُنھوں نے اپنے قدم یہاں ایسے جمائے کہ پھر یہاں سے نہ ہٹے۔ بلکہ سندھ سے بڑھ کر پنجاب تک پہونچے اور پنجاب کا ایک حصہ اور ملتان وغیرہ کا علاقہ بھی ان کے زیرنگیں آگیا۔

ظاہر ہے کہ جب یہ لوگ اپنی نئی معاشرت اور اپنا نیا تمدن اور اپنی عربی زبان لے کر یہاں آئے ہوں گے تو اُن کی زبان کا اثر سندھ و پنجاب کی زبان پر ضرور پڑا ہوگا اور فاتحین و مفتوحین میں زبان کے معاملہ میں کچھ نہ کچھ سمجھوتہ ضرور ہوا ہوگا۔

اب ذرا اور قدم آگے بڑھائیے پنجاب پر جب محمود غزنوی کے حملوں کا آغاز ہوا اور غزنوی خاندان کی حکومت کا مرکز لاہور قرار پایا تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت جب کہ اسلامی حکومت یہاں قائم کی گئی ہوگی تو نہ صرف یہ کہ خود بادشاہ یہاں مقیم ہوئے ہوں گے بلکہ ان کے ہمراہ لاکھوں مخلوق اور بھی ہوگی جن میں ان کے ملک کی سپاہ کے آدمی امرا و عمائدین اہل پیشہ اور ارباب فن سب ہی قسم کے لوگ ہوں گے اور ان کا اور اُن کے قیام کا جو اثر یہاں کی زبان پر پڑا ہوگا اُس کا قیاس کرنا کچھ دشوار امر نہیں۔ محمود غزنوی کا واقعہ تاریخ میں درج ہے کہ جب اُس نے کالنجر فتح کر لیا تو راجہ کالنجر نے ایک قصیدہ ہندی میں اس کی مدح میں لکھ کر اس کے حضور میں پیش کیا جس کو بادشاہ نے اہل دربار کے روبرو پڑھوا کر سُنا۔ اُسے سمجھا اور اُس سے بہت محظوظ ہوا اور راجہ کو اس کے صلہ میں پندرہ قلعے بخشے جن میں کالنجر بھی شامل تھا۔ اسی خاندان کے دوران عہد میں ایک صاحب تصانیف قابل یادگار بزرگ مسعود سعد سلمان ہوئے ہیں جن کا دیوان ہندی میں موجود ہونے کی شہادت حضرت امیر خسرو کی تصنیفات میں ملتی ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان فاتحین کے ساتھ ہی ساتھ صوفیائے کرام کے قدم بھی اس خطہ زمین میں آئے جنھوں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہندوستان کی سرزمین کو رشک ارم بنا دیا اور اگرچہ یہ فتوحات جو یہ شاہان عالی تبار بزور شمشیر کرتے تھے بہت عظیم الشان تھیں تاہم وہ تسخیرات جو یہ نفوس قدسیہ اپنے زہد و تقوے اور پاکبازی راست شعاری و ہدایت و تلقین کے ذریعہ کرتے تھے وہ شاہان نبرد آزما کی فتوحات سے بھی بڑھ کر گہرا اثر رکھنے والی اور قلوب کو مطیع و منقاد کرنے والی ہوتی تھیں۔

مسلمان اپنے ساتھ عربی و فارسی زبان لیے ہوئے تھے۔ لیکن ان قدرتی اسباب کے تحت میں جنکا ذکر اوپر گذر چکا ہندوستان میں ایک اور زبان شیریں کا بھی خمیر تیار ہونے لگا۔ جس نے ایک ہزار یا نو سو برس تک قدرت کے بھونرے میں خفیہ طور پر پرورش پائی اور پھر جب کنج مخفی سے نکل کر تخت پر جلوہ آرا ہوئی تو ملک کے گھروں اور دلوں میں اپنا سکہ بٹھا دیا اور چار دانگ عالم میں اسکی شہرت ہوگئی ملک نے اس کو تاج قبولیت بخشا اور شرف ہمنوائی عطا فرمایا۔ افسوس یہ ہے کہ اُردو کے ابتدائی مدارج و ترقی کی تاریخ تذکرہ والوں کے نزدیک مفقود ہے جب سے یہ زبان پردۂ اخفا سے ظہور میں آئی یعنی اس میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ شروع ہوا وہ سن نو سو یا ایک ہزار ہجری ہے اس زمانہ

ہیں جو اُس نے تدریجی ترقی ملک میں حاصل کی اور اپنی جڑیں جابجا پھیلائیں۔ اس کی داستان ایک داستان پریشان ہے بقول شاعر ؎

کچھ قمریوں کو یاد ہے کچھ بلبلوں کو حفظ دنیا میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

تذکرہ نویسوں کو جہاں کہیں بھی کوئی کھوج یا نشان اس زبان کے وجود کا مل گیا ہے اُنھوں نے اُس کو بیش بہا جواہر سمجھ کر اپنے دلوں میں جگہ دی ہے اور اُس کو آنکھوں کا تارا سمجھ کر رکھا ہے۔

یوں لائے داں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

اس زمانہ کے متعلق کوئی مسلسل اور معتبر و موقر تذکرہ موجود نہیں ہے اسی اُردو کے ابتدائی زمانہ کے متعلق پنجاب سے ہمیں فاضل اجل حافظ محمود خاں صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے ذریعہ سے ایک نظم ملی ہے جو زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین سرتاج اولیا حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا بابا صاحب موصوف کا سن وصال ۶۶۴ھ ہجری ہے وہو ہذا:—

وقت سحر وقت مناجات ہے خیز دراں وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

بادم خود ہر دم ہشیار باش صحبت اغیار بُری بات ہے

باتن تنہا چہ روی زیں زمیں نیک عمل کن کہ وہی (بڑی) ساتھ ہے

پند شکر گنج بہ دل و جاں شنو ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

ماخوذ از "پنجاب میں اُردو" مصنفہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی۔

اب ذرا اور حصہ ہائے ملک کی طرف بھی نظر ڈالو کہ وہاں کیا گذر رہی تھی۔ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ گجرات میں تشریف لاتے ہیں، سومناتھ کی سیر فرماتے ہیں اور اپنی زبان مبارک کا شرف ہندی کو بخشتے ہیں چنانچہ دو تین اشعار اُن سے منسوب ہیں جن کا مقطع عرض کرتا ہوں ؎

سعدی غزل انگیختہ در ریختہ دُر ریختہ شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہ اشعار ایک اور سعدی کے ہیں جو گجراتی الاصل تھا مگر اس کا پتہ نشان بتانے سے تذکرہ والے قاصر ہیں، صرف اُن کا یہ قیاس ہی قیاس ہے۔ خاندان غلامان و خلجی و تغلق کے زمانہ میں حضرت امیر خسرو کی خوشنوائی نے دلوں کو مسخر اور فریفتہ کر لیا تھا وہ جیسے فارسی میں بلبل ہزار داستاں تھے ویسے ہی ہندی میں بھی طوطی شکر مقال تھے۔ ان کا کلام خالص ہندی کا اور کچھ ہندی

فارسی مخلوط موجود ہے۔ ساون کا گیت جواب تک ملک کی مستورات میں بہ ذوق شوق گایا جاتا ہے انھیں بزرگوار کی شگفتگیٔ طبع کا ایک شگوفہ ہے۔ سینکڑوں پہیلیاں۔ اور کہہ مکرنیاں ان کی یادگار چلی آتی ہیں۔ جو اس وقت تک بچہ بچہ کی زبان پر ہیں ان کے گنگا جمنی کلام میں سے غزل کا ایک شعر نمونۃً درج کیا جاتا ہے۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

دہلی سے گذر کر اب ذرا دکن کے حال کی طرف بھی اپنی عنان توجہ منعطف کرو محمد شاہ تغلق کے عہد میں جب شاہی منتقل ہوکر دولت آباد دکھن پہونچی تو دہلی سے بہت سے اہل کمال اور ارباب فن سلطان کے ہمراہ وہاں گئے کہ پھر اُن کو دہلی کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ ارمغان دہلی یعنے یہاں کی زبان کا تحفہ سے کر گئے جس کا بیج اُنھوں نے دکھن کی شاداب و زرخیز زمین میں لگایا خاندان تغلق کے عہد ہی میں دکھن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی اور سلطنت قطب شاہی اور عادل شاہی اسی خاندان کی شاخیں ہوئیں اُنھوں نے اس طفل بے زبان کو دُرِ یتیم سمجھ کر اپنے آغوش تربیت میں لیا اور دن رات کے لیے اسے اپنے دل بہلانے کا مشغلہ ٹھہرایا چنانچہ خاندان قطب شاہی میں سے ہر ایک سلطان سلطان محمد قلی قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ صاحب دیوان ہندی تھے اور ان کے مکمل کلیات اور دیوان اب بھی کتب خانہ آصفیہ میں بہ مقام ریاست حیدرآباد دکن محفوظ ہیں۔ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ شاہان اسلام کے قدم بہ قدم اور دوش بدوش صوفیائے کرام بھی اس ملک کی ترقی و تہذیب تمدن میں برابر حصہ لیتے رہے ہیں اور اپنے باطنی فیوض و برکات سے اس ملک کو سنوارا اور بہرہ ور فرماتے رہے ہیں زبان کی ترقی بھی ایسی شے نہ تھی جس سے وہ غافل رہتے چنانچہ اکثر موقعوں پر ان حضرات کرام نے ہندی کو اپنی زبان شیریں بیاں سے شرف بخشا ہے۔ دکن میں مقبول بارگاہ الٰہی حضرت سید صدرالدین سید محمد حسینی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ذات بہت بابرکات اور بافیض ہوئی ہے ان کی ذات مرجع خلائق و مرجع انام تھی اُنھوں نے بھی ہندی کو یہ شرف عطا کیا ہے اور ذیل کی دو بیت ان کے نام پاک سے منسوب ہیں۔

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اسے جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوئی خودی اپنی خدا ساتھ محمد جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی دسے

حضرت موصوف کا سن وصال ۸۲۵ھ ہجری ہے۔

سلاطین مغلیہ نے بھی اردو کے ہندی نژاد بچہ کو جس کی زبان نئی کھلی تھی اور بہت پیاری پیاری

اور تتلاہٹ بھری تھی اپنی نظر التفات سے محروم نہ رکھا۔ ظہیر الدین بابر شاہ نے جب سرزمین ہند میں قدم رکھا تو اُس نے بھی یہاں کی زبان میں دلکشی پائی اور اگرچہ اُس کی زبان خالص ترکی یا فارسی تھی لیکن اس نے ہندی میں بھی طبع آزمائی کی۔ یہ ایک شعر جو اس کے تزک میں موجود ہے اس کی یادگار ہے۔

مج کو نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی فقرا ہلیغہ بس بولغوسید و ربانی و ردوتی
(مجھ) (کچھ) (یاقوت) (فقیر) (ردٹی)

جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد میں جب ہندو مسلم قوموں کا اختلاط بدرجہ غایت بڑھا تو اگرچہ زبان درباری اس وقت فارسی تھی مگر بہت سے ہندی الفاظ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ جھروکہ۔ درشن وغیرہ الفاظ اکبر و جہانگیر کے یہاں بے تکلف برتے جاتے تھے۔ اکبر نے لاڈلا و شیخ جی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ اس زمانہ میں لڑکیوں کی رخصت کے موقع پر جو بنڈھا گایا جاتا ہے وہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اکبر کے عہد کی تصنیف اور یادگار ہے جیسا کہ مشہور ہے شہاب الدین شاہجہاں کے عہد میں اس زبان نے 'اُردو زبان' کا لقب اختیار کیا۔ مقبولیت عامہ کا خلعت پہنا۔ اور ملک کے دل و زبان پر اپنا تسلط جمایا اور سکہ بٹھایا۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کو خود زیادہ شعر و شاعری سے لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اس کے درباری شعرا جو در اصل فارسی گو تھے ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

از زلف سیاہ تو بہ دل دوم پڑی ہے در گلشن آئینہ گتا جوم پڑی ہے
(مرزا معز موسوی خاں فطرت عہد عالمگیری)

بامن کی بیتی آج مری آنکھ موں پڑی غصہ کیا دگالی دیا و دگر لڑی
(قزلباش خاں امید عہد عالمگیر بادشاہ)

عہد عالمگیری ہی میں ایک ابر نیساں دکھن کی طرف سے اٹھا اور دلی پر آکر برسا اُس نے موتی برسائے اور یہاں کی کان میں لعل و جواہر پیدا کیے۔ یعنی شمس الدین ولی اللہ ولی اورنگ آبادی دکھن سے دہلی میں وارد ہوئے۔ اور شاہ گلشن جیسے درویش عارف باللہ اور خدا رسیدہ کی صحبت اور فیض نے انھیں کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ شاعر کو ولی کی سی مقبولیت عطا کی اور انھیں سرتاج شعرائے اُردو بنایا۔ چنانچہ اردو کے باوا آدم ہونے کا سہرا اول اول انھیں کے سر باندھا گیا۔ انھوں نے زمین سخن میں خوب خوب گل کھلائے اور کلام کے چمن کو آراستہ و پیراستہ کر کے خوب خوب داد سخن اہل زمین سے لی۔ ولی نے جو فضیلت اُردو میں حاصل کی اُس کو اُس وقت کوئی نہ پہونچا تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اُس سے بہت قبل

دکھن میں خاندان قطب شاہی و عادل شاہی کے سلاطین نے اپنی توجہات سے اس زبان کو نوازا۔ مکمل دیوان و کلیات اس میں مرتب کیے اس طرح اس کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم کیں اور اس زبان کو زندۂ جاوید کیا ان میں سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی علم دوستی سخن سنجی و سخن فہمی اور قدردانیِ اہلِ سخن کا اعتراف ہر اردو کی تاریخ دیکھنے والے کو کرنا ہوگا۔ اور چونکہ زمانہ کے لحاظ سے اس کے زمانہ کو ولی کے زمانہ پر بہت کچھ سبقت ہے، اس لیے اولیت کے مرتبہ کا ولی کے مقابلہ میں وہ زیادہ مستحق قرار پاتا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا بادشاہ تھا اس کا سن وفات ۱۰۲۵ھ ہجری ہے اس کا ایک شعر نمونۃً یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کفر ریت کیا ہور اسلام ریت ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے

اس سے بھی بڑھ کر حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم تذکروں میں یہ پڑھتے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ سے بھی پہلے اس زبان میں ایک موقر شاعر 'وجہی'، یا 'وحیدی'، ہو گذرا ہے جس کا زمانہ غالباً سلطان محمد قلی قطب شاہ کے باپ سلطان محمد ابراہیم قطب شاہ کا تھا (اندازاً ۱۰۱۵ھ) مولانا نصیرالدین ہاشمی مصنف "دکن میں اردو" مطبوعہ حیدرآباد اس کا نام وجہی قرار دیتے ہیں۔ اور مثنوی تحفۂ عاشقاں کو اس کی تصنیف بتلاتے ہیں لیکن "تذکرہ جواہر سخن" میں جو ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی زیر نگرانی ۱۹۳۳ء میں طبع ہوا ہے۔ اردو کے اول شاعر کا نام 'وجہی' بتلایا گیا ہے اور دو مثنویاں 'قطب مشتری' اور 'سب رس' ان کے نام سے منسوب کی گئی ہیں۔

بہرحال اس میدان میں ابھی مزید تحقیق و تفتیش کے لیے بہت کچھ گنجائش باقی ہے اور یہ مسئلہ ابھی بہت کچھ نئی تحقیق اور اجتہاد کا محتاج ہے۔

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

پیامِ اُمّید

(جناب منشی عبدالعزیز فطرت)

طوفان ہے کیوں مرے جہانِ دل میں مضطر ہے ہر ایک ذرہ اس محفل میں

آیا ہے کہیں سے کیا پیامِ امید بیتاب ہے لیلیٰ سکون محمل میں

مسلمانوں کی ثانوی تعلیم کے بعض مسائل

(جناب خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۹۳۵ء میں یہ بدعت حسنہ رائج کی گئی تھی کہ جلسوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن میں سے ہر ایک کے سپرد ایک خاص تعلیمی موضوع تھا۔ اس تنظیم جدید کی شان نزول یہ تھی کہ کانفرنس کے بعض ارکین نے یہ محسوس کیا کہ سال بہ سال محض نمائشی اجلاس کرنا اور ان میں چند ریزولیوشن پاس کر لینا کافی نہیں بلکہ ایک ایسا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے کہ کانفرنس کی وساطت سے ماہرین تعلیم کو قومی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر اور تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملے۔ ویسے تو کانفرنس کے دستور اساسی میں چند شعبہ جات عرصے سے قائم ہیں اور ایک زمانہ ہوا صیغہ اصلاح تمدن اور تعلیم نسواں کے اجلاس عام اجلاس کانفرنس کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے اس پر عمل نہیں ہوا اور شاید کانفرنس کو تمام تر شعبہ جاتی طریقہ پر چلانے کا خیال تو پہلے کبھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب جبکہ مختلف علوم و فنون کا میدان وسیع ہو گیا ہے اور اس میں مقابلۃً بہت زیادہ تخصیص پیدا ہو گئی ہے اس کام کو بھی زیادہ منظم اور علمی طریقہ پر کرنے کی ضرورت ہے۔ فن تعلیم بالخصوص اس قدر زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اس کے مختلف مسائل کے متعلق صحیح اور معقول رائے قائم کرنے کے لیے بہت وقت نظر کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ یہ نئی تنظیم جو رائج کی گئی ہے کانفرنس کو ایک زیادہ مفید اور کاروباری ادارہ بنانے میں کامیاب ہوگی۔ انھیں شعبہ جات میں سے ایک ثانوی تعلیم کا شعبہ بھی ہے جس کے صدر گذشتہ اجلاس میں جناب علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب تھے۔

میں نے بحیثیت سکریٹری شعبہ کے مسلمانوں کی ثانوی تعلیم پر ایک مختصر سا تبصرہ مندرجہ ذیل مضمون میں کیا تھا جو اس امید میں الناظر کی نذر کرتا ہوں کہ ہمارے اساتذہ اور دیگر تعلیمی کارکنوں کی توجہ ثانوی تعلیم کے ان پہلوؤں کی طرف مبذول ہو جن پر اس مضمون میں بحث کی گئی ہے۔ ایک مختصر سے مضمون کے اندر یہ ممکن نہیں کہ ثانوی تعلیم پر کوئی مکمل تنقید کی جائے یا اس کا کوئی مفصل اور مبسوط نظام پیش کیا جا سکے۔ علاوہ بریں یہ کام کانفرنس کے اس شعبہ اور تمام ماہرین تعلیم کا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بحث و مباحثہ اور غور و فکر کے بعد ایسے ایک نظام کے نقوش متعین کریں۔ کسی ایک شخص کے لیے اس اجتماعی ذہنی کاوش کے نتائج کی پیش بینی کرنا ایک بے جا جسارت ہے۔ البتہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کی توجہ بعض ایسے اہم اور ضروری مسائل کی طرف مبذول کر دوں جن کو

سمجھ داری اور بالغ نظری کے ساتھ حل کرنے پر ثانوی تعلیم کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ آج کل کے تعلیمی مسائل محض اصطلاحی معنوں میں تعلیمی نہیں یعنی ان کا تعلق محض نوشت وخواند اور چند علوم حاصل کر لینے سے نہیں بلکہ وہ قومی زندگی کے ہر پہلو اور ہر تحریک کے ساتھ جسم و جان کی طرح مربوط ہیں اور ان کا صحیح حل اور تصفیہ ہرگز ان بڑے بڑے سیاسی اور اقتصادی معاملات سے کم اہمیت نہیں رکھتا جو ملک کے مقتدر رہنماؤں کی توجہ کا مرکز ہیں اور باوجود ان کی توجہ کے حل نہیں ہو پاتے۔

پہلا مسئلہ جس کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ثانوی تعلیم کی حدود کیا ہوں۔ یعنی ابتدائی تعلیم کے بعد جس کو حالات موجودہ کا بے پناہ دباؤ ہمارے پسماندہ ملک میں بھی بہت جلد لازمی اور جبری بنائے گا، کن طلبہ کو ثانوی مدارس میں داخل کیا جائے۔ چونکہ کم از کم مستقبل قریب میں تمام یا بیشتر طلبہ ان مدارس میں جگہ نہیں پا سکتے اس لیے معیار انتخاب کا تعین کرنا ضروری ہے۔ اس بارے میں ہمارے یہاں اور دوسرے ممالک میں بھی عام طور پر یہ نظریہ کارفرما رہا ہے کہ ابتدائی تعلیم جس حد تک مہیا کی جا سکے عوام کے لیے ہے اور ثانوی تعلیم خواص اور شرفا اور اس مقابلۃً خوش حال متوسط طبقے کے لیے ہے جن کے افراد اس کا خرچ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ دراصل ایک عکس ہے ہماری معاشرت کی خلاف انصاف تنظیم کا، جو ہمیں تعلیم کے آئینہ میں دکھائی دیتا ہے اور یہ قومی مفاد اور ترقی کی راہ میں ایک سنگ گراں ثابت ہوا ہے۔ مگر دور حاضرہ کی جدید سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تحریکات سے متاثر بلکہ مجبور ہو کر مغرب کے اکثر ممالک میں ثانوی تعلیم کا ایک نیا تصور تشکل ہوا ہے جو بہت زیادہ صائب اور قرین عقل ہے۔ یعنی ثانوی تعلیم کسی خاص جماعت یا طبقے کے ساتھ مختص نہیں بلکہ وہ اس تعلیمی انتظام کا نام ہے جو کوئی قوم اپنے نوجوانوں کی ذہنی اور عملی تربیت کے لیے کرتی ہے جب وہ عنفوان شباب اور بلوغ کی پر آشوب منزل سے گذرتے ہوتے ہیں۔ یعنے ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں مابہ الامتیاز اقتصادی یا معاشرتی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ انگریزی ذہنیت نے بھی جو بالطبع روایت پرست اور قدامت پسند واقع ہوئی ہے اس انقلاب آفریں خیال کو تسلیم کر لیا ہے اور فشر ایکٹ ۱۹۱۸ء اور ہیڈو رپورٹ ۱۹۲۶ء نے گویا اس پر سرکاری مہر تصدیق ثبت کر دی ہے لہٰذا اب تو ہمارے علمائے فکر اور ارباب تعلیمی کو بھی اس سنت پر عمل کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نظریہ کے عملی نتائج بہت دور رس ہیں۔ اس سے ایک طرف تو یہ لازم آتا ہے کہ ہم ثانوی تعلیم کی حدود، غایت، نصاب، مدارج تعلیمی اور دیگر لوازم کا

تعین کرنے میں عہد بلوغ کی نفسی کیفیات اور مطالبات کو اپنا راہبر بنائیں اور ایک ایسا مکمل اور ہمہ گیر نظام تعلیم مرتب کریں جو عمر کی اس خاص منزل کی مختلف ذہنی، علمی اور جمالی ضروریات کی تشفی کرے۔ دوسری طرف اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انتخاب طلبہ میں معیار ان کی فطری صلاحیت ہو یعنی کون سے طلبہ کس حد تک مختلف قسم کی ثانوی تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یوں تو ایک عمدہ اسکول کی اجتماعی زندگی اور ضبط و تربیت کی روایات سے ہر طالب علم کو کم و بیش فائدہ پہونچنا لازم ہے لیکن جہاں مواقع اور وسائل محدود ہوں وہاں اجتماعی اور انفرادی بہبود دونوں کا مطالبہ یہی ہے کہ بہترین ذہنی اور علمی صلاحیتوں کو نشو و نما کا موقع دیا جائے خواہ وہ کسی سماجی طبقے میں پائی جائیں تاکہ ان کے امکانات خدمت اور سماجی کارکردگی میں اضافہ ہو اور وہ حیات اجتماعی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں۔ اس مطالبہ کا ایک سخن گسترانہ پہلو جس سے ہمارے تعلیمی حکام اور ماہرین دونوں پہلوتہی کرتے ہیں یہ بھی ہے کہ معیار صلاحیت ہر جماعت کے افراد پر خواہ وہ امیر ہوں یا غریب یا متوسط الحال، یکساں طریقے سے عائد کیا جائے۔ یعنی اگر ایک نادار بچہ ایسی صریح ذہنی صلاحیتیں رکھتا ہے کہ وہ ثانوی تعلیم سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے تو حکومت اور محکمہ تعلیم کا فرض ہے کہ اس کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائے برخلاف اس کے اگر ایک خوشحال بچہ فطرتاً کند ذہن اور اوسط سے کم قابلیت کا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بہتر طلبہ کو محروم کرکے اس پر ایک غیر مناسب اور غیر موزوں تعلیم کے دروازے کھول دیے جائیں۔ یہ مطالبہ کسی رقیق القلب جذبہ مساوات کا اظہار نہیں بلکہ قومی مفاد اور مجموعی ترقی کے لیے شرط ناگزیر ہے۔ تعلیم کے میدان میں جوہر قابل کو محروم کرنا اور بے جوہر نا قابل کو زبردستی بڑھانا ایک جرم صریح اور گناہ عظیم ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانا بجائے خود ایک نازک اور مشکل کام ہے جس کی طرف ابھی تک ہمارے ملک میں کوئی توجہ نہیں کی گئی مثلاً یو۔ پی گورنمنٹ کے تعلیمی ریزولیوشن کے مطالعے سے ہرگز یہ شبہ نہیں ہوتا کہ اس کے فاضل مصنفین کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا ہے مگر جب تک ہم مروجہ امتحانوں کے نظام کو منزل من اللہ سمجھ کر ان پر قانع رہیں گے کوئی اصلاح موثر نہیں ہو سکتی بالخصوص اس وجہ سے کہ ثانوی تعلیم میں تنوع پیدا کرنے اور اسے نفسیات طلبہ کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لیے جس مواد کی ضرورت ہے وہ اس تعلیمی تحقیق و تفتیش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مغربی ممالک میں گذشتہ بیس، پچیس سال میں اس سلسلہ میں بہت کچھ کام ہوا ہے۔ میں مثال کے طور پر صرف ایک تحقیق کا ذکر کروں گا جو لنڈن کونٹی کونسل کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر سرل برٹ (بقیہ حاشیہ)

نے کچھ عرصہ ہوا کی تھی (شاید بعض حضرات کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں ایسی میونسپل کمیٹیاں بھی ہیں جو ماہرین نفسیات کو اپنے کاروبار کے لیے لازم سمجھتی اور بیش قرار مشاہرہ پر ملازم رکھتی ہیں!) ان کی طویل اور نہایت معنی خیز تحقیق سے منجملہ اور نتائج کے یہ مستنبط ہوا کہ اعلیٰ پیشوں اور ذمہ داری کے کاموں کے لیے جس قدر فطری ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت کم طلبہ میں ہوتی ہے اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے صلاحیت کی فی صد تقسیم اندازاً اس طرح کی جا سکتی ہے:-

(۱) اعلیٰ علمی اور اصطلاحی پیشوں اور سول سروس کے لیے ہزار طلبہ میں ایک موزوں ہوتا ہے۔

(۲) ابتدائی مدارس کی معلمی، کلرکی کے اعلیٰ عہدوں اور تجارت کے لیے دو فی صدی طلبہ موزوں ہوتے ہیں۔

(۳) معمولی دفتری کاروبار، اور محرری اور اعلیٰ قسم کے ہنرمندی کے کاموں کے لیے دس فی صدی طلبہ موزوں ہوتے ہیں۔

(۴) اوسط قابلیت کے طلبہ جو معمولی تجارت، دستکاری اور صناعی کے لیے موزوں ہوتے ہیں آٹھ فی صدی ہیں۔

(۵) باقی اسی فی صدی طلبہ اوسط سے کم قابلیت کے ہوتے ہیں جو محض معمولی قسم کا ایسا کام اور مزدوری کر سکتے ہیں جس کے لیے کسی خاص ہنر کے جاننے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر مائرز (Dr. Myres) کے پیشوں کی رہنمائی کے ادارے (Institute of Vocational Guidance) نے بھی اس مسئلہ پر نہایت مفید اور قابل قدر کام کیا ہے۔ اس تمام تحقیقات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ طلبہ کی صلاحیتیں بہت مختلف اور متنوع ہوتی ہیں اور ان میں مختلف قسم کے علمی کام اور دستکاری اور صنعت و حرفت کے میلانات غالب ہوتے ہیں مگر ہماری ثانوی تعلیم نے اس حقیقت کی طرف سے بالکل توجہ ہی نہیں کی۔ وہ نہ طلبہ کے ان نمایاں اور مختلف نفسی رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہے، نہ اس میں اور صنعت و حرفت اور نظام معاش میں کوئی ربط قائم ہے۔ تقریباً تمام طلبہ کو اس طرح تعلیم دی جاتی ہے گویا سب کو آئندہ چل کر علمی یا دفتری زندگی بسر کرنی ہے اور ان کے دل میں آہستہ آہستہ غیر محسوس لیکن مستحکم طور پر دستکاری، مزدوری اور دوسرے تخلیقی کاموں کی طرف سے حقارت اور بے اعتنائی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے حالانکہ قوم کی مادی خوشحالی اور ان کی حقیقی تخلیقی صلاحیتوں کا نشوونما انھیں کاموں کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہذا آپ کے سامنے ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید کے ضمن میں سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہے کہ اسے کس طرح طلبہ کی نفسی ضروریات اور قوم کی معاشی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ

بنایا جائے اور دونوں پہلوؤں کا متحدہ تقاضا یہ ہے (جس کو ایک حد تک یوپی گورنمنٹ کے تعلیمی ریزولیوشن، سپرو کمیٹی کی رپورٹ اور حکومت ہند کے تعلیم کے مشورتی بورڈ (Advisory Board of Education) کی سفارشات میں تسلیم کیا گیا ہے) کہ ثانوی تعلیم کی حدود کو زیادہ وسیع کیا جائے اور اس میں نہ صرف نظری اور علمی رجحان رکھنے والے طلبہ کے لیے سائنس و ادبیات وغیرہ کی تعلیم کا وافر بندوبست کیا جائے بلکہ ان طلبہ کے لیے بھی ایک مخصوص نصاب مضامین و مشاغل مرتب کیا جائے جن کی ذہنی ساخت ایسی نہیں کہ وہ مروجہ تعلیم سے جس پر نظری علوم غالب ہیں پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔ اس میں مقابلۃً درسی مضامین کم اور عملی مشاغل زیادہ ہوں گے اور ان کی درسی تعلیم کا تعلق آئندہ کے پیشوں کے ساتھ رفتہ رفتہ زیادہ واضح ہوتا چلا جائے گا۔ محض نظری تعلیم کی صلاحیت کی کمی کی وجہ سے ان کو ثانوی تعلیم سے محروم کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ تمام قابل قدر قوتیں جو زمانہ شباب میں پھولتی پھلتی ہیں اظہار کا موقع نہ پائیں گی۔ رہا لبرل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مطالبات کا پرانا جھگڑا، اس کو حال کی نفسیاتی تحقیق نے بڑی حد تک حل کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ جو اعلےٰ قدریں ہم تعلیم کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ محض ادب عالیہ اور کلاسیکی علوم کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ جدید سائنس اور صنعت و حرفت کے مشاغل کی تعلیم سے بھی حاصل ہو سکتی ہیں بشرطیکہ طریقہ تعلیم کی مناسب اصلاح کی جائے۔ البتہ اگر غلط طریقۂ تعلیم کو اختیار کیا جائے گا تو وہ علوم بھی بالکل بیکار ہیں جن کو روایتاً تہذیب کا مخزن اور سرچشمہ مانا گیا ہے۔

یہ ثانوی تعلیم کے وہ عام مسائل ہیں جو تمام ہندوستان کے لیے مشترک ہیں۔ آخر میں چند باتیں مسلمانوں کے ثانوی مدارس کی تنظیم کے بارے میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مضمون تلخ ہے اور قلم گستاخ اس لیے ارباب تعلیم کی توجہ اور درگذر دونوں کا طالب ہوں۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے (جن نفوس مطمئنہ کو یہ سوال عجیب معلوم ہو وہ مجھے معاف کریں) کہ آخر ہندوستانی نظام تعلیم میں مسلمانوں کی مخصوص درسگاہوں کی شان نزول اور وجہ قیام کیا ہے؟ خیر شان نزول کو تو چھوڑیے کہ وہ ایک تاریخی بحث ہے، مگر ان کی موجودہ حالت پر تو غور کیجیے۔ اگر ان کا کام یہی تھا کہ مسلمان والدین اور طلبہ کو سرسری سی مذہبی تعلیم کی تحریص دلا کر انگریزی تعلیم کی طرف راغب کریں تو وہ فرض تو پورا ہو چکا کیونکہ اب تو ارباب قضا و قدر کو تعلیمی توسیع کے روکنے کی فکر اور راہ چلتے کو مروجہ تعلیم کی تنقید و تنقیص سے غرض ہے۔ اگر ان سے محض اپنی عصبیت کو بیدار رکھنا اور ایک علیحدہ جماعت ہونے کے احساس کو مستحکم کرنا مقصود ہے تو یہ بجائے خود کوئی بہت قابل قدر جذبہ نہیں۔ اگر ان کی وجہ سے مشترک احساس

قومیت کے پیدا ہونے میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں تو فرقہ وارانہ مدارس، خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، لائق سرپرستی نہیں، قابل انسداد ہیں۔ پھر ان کی علت غائی کیا ہے؟ میری رائے میں مسلمانوں کے ثانوی مدارس دو خاص فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ اول، مخصوص قومی اور ملی روایات اور قدروں کی نشر و اشاعت جو اسلامی تہذیب کا سرمایۂ افتخار ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اس کام کو مشترک اور سرکاری مدارس انجام نہیں دے سکتے۔ دوسرے تعلیمی تجربات اور اصلاحات کے میدان میں پیش قدمی اور قیادت کے فرض کی انجام دہی، جو پرائیوٹ مدارس کا مخصوص کام ہے کیونکہ وہ سرکاری مدارس کی نسبت قواعد و ضوابط کی سختیوں اور پابندیوں سے مقابلۃً آزاد ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں دنیا کے متمدن ممالک میں تعلیم نے اپنی پرانی کینچلی بدلی اور نیا روپ اختیار کیا ہے اُس کا آغاز تقریباً ہمیشہ نجی اور امدادی مدارس میں ہوا ہے۔ سکیسے؟ اس طرح پر کہ کسی اہل دل اور اہل نظر معلم نے اپنی حرکت آفریں شخصیت کے اثر سے بوسیدہ ہڈیوں میں نئی روح پھونک دی۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آیا آپ کے ان مدارس نے اپنے طلبہ کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین یا کوئی واضح اسلامی آئیڈیل پیش کیا؟ اس اسلامی آئیڈیل کی تشریح کا یہاں موقع نہیں اور شاید منطق کی توضیح کے ساتھ اور نثر کی زبان میں اس کے اظہار میں زباں بندی کا اندیشہ بھی ہو۔ اس لیے ادائے مطلب کے لیے فی الحال شعر کے اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ اسلام نے تو یہ تعلیم دی تھی کہ:-

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
وہی سجدہ ہے لائق اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

لیکن آپ کی اس تعلیم نے سکھایا کہ ہر آستانہ قوت و زر جو نظر پڑے وہ لائق جبیں سائی ہے اور خودی کو سیم و زر کے عوض فروخت کرنا عین مصلحت اور دانشمندی ہے!

اسلام نے یہ راز سکھایا تھا کہ

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور انسان کو یہ تنبیہ کی تھی:-

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ — ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم!

مگر کیا ان مدارس نے کبھی "نصاب زر وسیم" کے علاوہ اور حکومت کے دسترخوان سے گرے ہوئے ٹکڑوں کو سعادت دارین سمجھ کر چُن لینے کے سوا کسی اور مطمح نظر کو اپنا شعار عمل قرار دیا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور مجھے یقین ہے کہ جواب نفی میں ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارے پہلے معیار یعنے اسلامی اُصول اور قدروں کی اشاعت پر تو یہ مدارس کسی طرح پورے نہیں اُترتے۔ تو کیا ان مدارس نے قیادت تعلیمی کا فرض پورا کیا؟ کیا اُنھوں نے نصاب اور طریقۂ تعلیم کی کوئی جدید تشکیل کی؟ کیا اُنھوں نے جدید تعلیمی تحریکوں میں فعالی طور پر کوئی نمایاں حصہ لیا؟ کیا ان کی حالت اپنی تعلیم و تربیت کے اعتبار سے حکومت کے مدارس سے صریحًا بہتر ہے۔ آپ حضرات خود باخبر ہیں۔ لہذا موجودہ حالت کی تفصیل ضروری نہیں۔ ہمارے مدارس نے اب تک نہ نصاب کے مسئلہ پر غور کیا ہے نہ تعلیمی طریقوں میں کوئی اصلاح کی ہے۔ نہ ان کے استادوں میں ولولہ عمل ہے، نہ منتظمین میں سلیقہ کار اور تقسیم عمل کی صلاحیت۔ ایک اندھے بیل کا کولھو ہے کہ چلا جارہا ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن کی تشریح کا یہاں موقع نہیں اور اس کی ذمہ داری مختلف جماعتوں اور حالات پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اسباب کا تجزیہ اور ذمہ داری کی تقسیم ایک فلسفی کو مطمئن کرسکتے ہیں کسی عملی آدمی کو، جسے کام کی دُھن ہے، کسی قوم کو جس کی موت اور حیات کا مسئلہ درپیش ہے مطمئن نہیں کرسکتے۔

آپ کو اس سخت نازک اور اہم صورت حال کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ان زندہ مسائل کا مقابلہ مردانہ وار جرأت اور صداقت کے ساتھ نہ کریں گے تو آپ کی تمام سیاسی تعمیروں کی حقیقت نقش آب سے بڑھ کر ثابت نہ ہوگی!

مجذوب کی بڑ

(جناب خواجہ عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

کام فطرت سے نہ ہم کو ساز سے　　آشنا ہیں طور کی آواز سے
ہم تو ہونے دیں نہ واقف راز سے　　بس چلے بھی دیدۂ غماز سے
نغمہ پیدا ہے کہ نوحہ ساز سے　　ہوک سی اُٹھتی ہے اس آواز سے
آشنا بیٹھا ہو یا نا آشنا　　ہم کو مطلب اپنے سوز و ساز سے
آشنا اچھا ہے یا نا آشنا　　اس کو پوچھو آشنائے راز سے
آرہا ہے ہائے وہ مست شباب　　کس ادا کس ناز کس انداز سے
اک نظر میں آشیاں گم کردہ کو　　بھانپ لیں ہم ہیئت پرواز سے

"دوشیزہ کا راز" ـــــ ایک دلپذیر نظم

(جناب منشی محمد اظہار الحسن صاحب اظہر بی اے ایل ایل بی وکیل)

"زمانہ" کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا۔ جون ۱۹۲۹ء کے پرچہ میں مسٹر آنند نرائن ملا ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ لکھنؤ کی نہایت کیف آور اور جذبات سے لبریز نظم "دوشیزہ کا راز" نظر سے گذری جس کو پڑھ کر طبیعت اس قدر محظوظ ہوئی کہ میں یہ چند سطور لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ مسٹر ملا کا شمار کہنہ مشقوں میں نہیں ہے لیکن نزاکت احساس رفعت تخئیل اور موزونی طبع ان کی آئندہ شاعرانہ عظمت کا پتہ بتاتی ہیں اور وہ دن کچھ دور نہیں معلوم ہوتا جب وہ درگا سہائے سرور اور نوبت رائے نظر کی جگہ ادب اردو میں پر کریں گے۔

اردو میں نظمیں لکھنے کا رواج زیادہ پرانا نہیں ہے حال ہی میں اس کی ابتدا ہوئی ہے پھر بھی عمدہ نظموں کا کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے اور بعض اچھے اچھے شاعروں نے نظمیں لکھنی شروع کر دی ہیں۔ دوشیزہ کا راز ہر حیثیت سے ایک کامیاب نظم ہے اور اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

بندشوں کی چستی الفاظ کا تناسب، طرز ادا کی سادگی، زبان کی بے ساختگی، اور ان سب سے بڑھ کر اثر اور دلآویزی نے غضب کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ ناممکن ہے کہ آپ "دوشیزہ کا راز" پڑھیں اور داد دیے بغیر رہ سکیں مصوری جذبات کی اس سے بہتر مثالیں کم از کم میری نظر سے کم گذری ہیں۔

ایک البیلی حسین دوشیزہ کے دل میں شادی کے بعد جو احساسات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کو مسٹر آنند نرائن نے خود اسی کی زبانی بیان کیا ہے اور شادی سے قبل کی کیفیت اور اس کے بعد کے انقلاب کا پر لطف موازنہ کیا ہے فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں۔

آج کا دن زیست میں میری ہے سب سے بہتریں ــــ اس کو میں سب سے الگ دل میں کروں گی جاگزیں
قدر کیوں اس کی ہے اتنی میں بتاؤں گی نہیں ــــ یہ مگر سچ ہے دلاتی ہوں تمہیں اس کا یقیں

دہر میں جب تک یہ صبح خوشگوار آئی نہ تھی
گلشن جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

آغاز الفت کا پہلا دن! اُف کس قدر دلچسپ اور کیف آفریں ہوگا۔ رفیق زندگی کی ملاقات اولیں کے وہ مسرت زا لمحے جن کا تصور بھی سرور آمیز ہوتا ہے کس قدر عزیز ہونے چاہییں۔ حجاب نسوانی اس احترام و دلنشینی کا سبب بتانے میں مانع ہے کہنا نہیں چاہتی مگر کہتی ہے اور سب کچھ کہہ دیتی ہے۔

گلشن جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

کہنے کو باقی ہی کیا رہا

مثل مکتوب نہ کہنے میں ہے کیا کیا کہنا

قاعدہ ہے کہ جب انسان کا دل مسرور ہوتا ہے تو اُس کو ہر چیز پر مسرت چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے دنیا اُس کی نگاہ میں یکسر ابسنزار بن جاتی ہے ہر وقت پیش نظر رہنے والی چیزیں معمول سے زیادہ بارونق و پرکیف نظر آتی ہیں۔ دوسرے بند میں اسی کیفیت کو نظم کیا ہے۔

تازگی باد صبا میں کل تک ایسی نہ تھی　　　آسماں پر یہ چمک میں نے کبھی دیکھی نہ تھی
دل میں یہ ارماں نہ تھے ارماں میں یہ گرمی نہ تھی　　　ہاں مگر کل تک میں دل کی آرزو سمجھی نہ تھی

اب کھُلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں
آج میں سمجھی کہ غنچہ پھول ہوجاتا ہے کیوں

شباب اور مرادوں پر آیا ہوا شباب دل کو پیکر آرزو بنا دیتا ہے مگر اس کا احساس تشنۂ مضراب ہے کوئی چھیڑنے والا بھی تو ہو آخری شعر کتنا پُر لطف ہے۔

اب کھلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں　　　آج میں سمجھی کہ غنچہ پھول ہوجاتا ہے کیوں

یہ تازگی اور دلفریبی ممکن ہے کہ موسم کی خوشگواری کا اثر ہو لیکن نہیں اس کے نشاط قلب کا باعث کچھ اور ہے جس کو وہ بتانا نہیں چاہتی مگر ایک دل خوش کن خیال کو اپنے سینہ تک محدود رکھنا فطرت نسوانی کے خلاف ہے اس لیے وہ ایک رازداں تلاش کرتی ہے مگر ایسا جس میں تاب گویائی نہیں۔

آج کا دن یہ تو ممکن ہے کہ ہو نازِ بہار　　　ختم ہے یہ میں نے مانا اس پہ موسم کا نکھار
ہے نشاط قلب کا پر اور ہی کچھ ذمہ دار　　　راز اپنا میں نہیں کرنے کی ہرگز آشکار

بات یہ جز گل کسی کو میں نے بتلائی نہیں
رازداں ایسا ہے جس میں تاب گویائی نہیں

نازِ بہار، کی ترکیب کتنی حسین ہے۔ دوسرے مصرعہ کی روانی قابل داد ہے۔

مدعائے زندگی کیا ہے؟ محبت! وہ زندگی ہی کیا جو عشق کی رنگینیوں سے خالی ہو۔

دل لگانے میں غم ہزار سہی　　　پھر بھی اک دل لگی سی رہتی ہے

عورت کی زندگی کا دلچسپ پہلو شادی کے بعد شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے "پیا" کی تمنا کا مرکز بن جاتی ہے کیا خوب کہا ہے

میں سمجھتی تھی نہ کل تک مدعائے زندگی　　　کان تک میرے نہ پہونچی تھی نوائے زندگی

مجھ سے پنہاں تھی شبیہ جانفزائے زندگی عشق نے کھولے نہ تھے بند قبائے زندگی

دل مرا دنیا کی باتوں میں ذرا لگتا نہ تھا
آئینہ میں حسن تک اپنا بھلا لگتا نہ تھا

سادگی ہائے حسن کی کتنی سچی تصویر ہے۔ یہ اُس زمانہ کی باتیں ہیں جب بہ الفاظ حسرت موہانی "اظہار تمنا" سے "حسن بے پروا" "خود بین و خود آرا" نہ ہوا تھا[1]۔ تقاضائے فطرت کو نہ سمجھنے والی بھولی حسینہ جب اپنی پنہاں قوتوں کو بروئے کار دیکھتی ہے تو کہہ اُٹھتی ہے کہ

بے خبر فطرت سے اپنی خاطر معصوم تھی یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی
آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی

اب حقیقت زیست کی مجھ پہ ہویدا ہو گئی
کل تلک انگور تھی میں آج صہبا ہو گئی

دوسرے شعر میں جس کیفیت کو قلمبند کیا گیا ہے الفاظ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ملا نے واقعی کمال کیا ہے۔ مصوری جذبات اسی کا نام ہے۔

کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی

اور اس سے زیادہ ایک دوشیزہ سمجھ ہی کیا سکتی ہے؟ کسی مست شباب نازنیں کو جو دیکھنے والوں کو مخمور و بیخود بنا دے "صہبا" کہنا حسن تخئیل کا کمال ہے انگور کا صہبا بن جانا غضب کی تشبیہ ہے اور کتنی مکمل!

انیس حیات سے پہلے پہل سامنا ہوتا ہے۔ اُف کس بلا کا منظر ہے! ایک طرف حسن شرم آگیں ہے دوسری جانب عشق سراپا شوق

اک جوش ہے کہ محو تماشائے جوش ہے

نگاہیں چار ہوتی ہیں اور آنکھوں آنکھوں میں وہ پیام ادا ہو جاتا ہے جس کی لطافت رہین الفاظ نہیں ہو سکتی فطرت رنگ لاتی ہے۔ کیوپڈ وہ خوبصورت مگر اندھا لڑکا کیوپڈ جو اپنے بے پناہ تیروں کی بارش سے ہر اُمنگ بھرے دل کو چھلنی کر دیا کرتا ہے اپنا ترکش خالی کرتا ہے حسن حیا پرور کے دل میں ایک شیریں سوزش ایک میٹھی کسک محسوس ہونے لگتی ہے۔

اک لذت پُر درد ہے آغاز محبت

نگاہیں جھک جاتی ہیں، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور لطف شکست سے ناآشنا دل سراپا درد بن جاتا ہے

[1] حسرت کا شعر ہے ۔ حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

خود زندگی وقفِ خیالِ یار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک انقلاب ہے زبردست مگر کتنا خوش آیند! اس تمام کیفیت کو مسٹر ملا نے کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں

کل بھی دل سینہ میں تھا پر یہ دل پرخوں نہ تھا　　کل تلک بطنِ صدف میں یہ دُرِ مکنوں نہ تھا
کل بھی مجھ کو تھا مذاقِ زیست لیکن یوں نہ تھا　　کوئی جادو تھا پیامِ دیدۂ مجنوں نہ تھا

دل میں ہوک اُٹھی لبوں پر مسکراہٹ آگئی
رُخ پہ رنگ آیا نگاہوں میں لگاوٹ آگئی

تیسرے مصرعہ کی برجستگی تعریف سے بالا ہے۔ البتہ چوتھے مصرعہ میں "مجنوں" کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا آخری دو مصرعے خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ آغازِ الفت کی کیفیت نسوانی شرم و حیا کے مرقع میں کتنی دلکش معلوم ہوتی ہے

ساتواں بند "مذاقِ زیست" کے انقلاب کی تفسیر ہے۔

اب اُمنگیں اور ہیں جوشِ طبیعت اور ہے　　زندگی کی خواب ارماں کی حقیقت اور ہے
گلشنِ ہستی کی اب نظروں میں حالت اور ہے　　گل کی نکہت اور ہے سبزے کی رنگت اور ہے

کیا بتاؤں کون سا جلوہ مری آنکھوں میں ہے
اک نئی دنیا کا نظارہ مری آنکھوں میں ہے

دوشیزہ یہ داستانِ محبت اپنی سہیلیوں کو سناتی ہے۔ اُن کا مشورہ بھی سُن لیجئے۔

مجھ سے کہتی ہیں مری ہمجولیاں اکثر یہی　　مرد ہیں سارے کے سارے بے وفا خود مطلبی
آج ہے جس کی خوشامد کل ہے اُس سے بیرخی　　اُن کے بہکانے میں آتی ہیں مگر ایسی نہ تھی

یا تو اُن کے حسن میں میری سی رعنائی نہیں
یا کسی کی طبع اُن پر یوں کبھی آئی نہیں

صنفِ نازک کے یہ خیالات اپنی نسبت شاید اچھے نہ معلوم ہوں۔ لیکن کیا آپ نے عورت کی زندگی کی شعریت کو تباہ نہیں کر ڈالا کیا واقعی تیسرا مصرعہ حقیقتوں کا حامل نہیں۔ آپ کی بے وفائیاں اور ستم ظریفیاں مستقل مرثیہ طلب ہیں لیکن بھولی حسینہ اس کا اعتبار نہیں کرتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ نوجوان جو آج پیکرِ الفت بنا ہوا ہے کل کیونکر گنہگارِ محبت بن سکے گا۔ ہمجولیوں کے تلخ تجربات کی وجہ وہ کہیں اور ڈھونڈھنا چاہتی ہے اور کہتی ہے

یا تو اُن کے حسن میں میری سی رعنائی نہیں　　یا کسی کی طبع اُن پر یوں کبھی آئی نہیں

"خود مطلبی" کی غرابت اور "طبع" کی گرانی سے قطع نظر کر کے حقیقی جذبات کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

خواہش محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر پردہ داری کس لیے جذبات کی ہے اس قدر
اپنے دل کی آرزوئیں کیوں چھپاتا ہے بشر یا الٰہی کون سا الفت میں ہے ایسا اثر
تاب خاموشی نہیں اور فکر چپ رہنے کی ہے
شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

پہلا مصرعہ کتنا بلند ہے

خواہش محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر

ظالم نے کیا بات کہی ہے۔ جذبات کی رو میں دوشیزہ اپنے احساسات پنہاں بیان کر جاتی ہے پھر خیال آتا ہے کہ میں نے کیا کیا تو یہ کہہ کر دل کو تسکین دیتی ہے

خواہش محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر پردہ داری کس لیے جذبات کی ہے اس قدر

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب محبت کوئی جرم نہیں بلکہ عین فطرت ہے تو

اپنے دل کی آرزوئیں کیوں چھپاتا ہے بشر

آخری شعر فطرت نسوانی کا حسین مرقع ہے

شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

کس قدر دلچسپ ہے۔

آخر کار فطرت نسوانی جوش جذبات پر غالب آتی ہے دوشیزہ سنبھلتی ہے اور کہتی ہے۔

لو نہ جانے کیا کہے جاتی ہوں اپنے جوش میں میں نہیں ہوں غالباً اس وقت اپنے ہوش میں
اب نہ آئے گی صدا میری کسی کے گوش میں راز کو اپنے چھپاؤں گی لب خاموش میں
ہاں مگر جب تک یہ صبح خوشگوار آئی نہ تھی
گلشن جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

اس "ہاں" میں نہ معلوم کتنے معانی پنہاں ہیں۔

شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

آپ نے دیکھا مسٹر آنند نرائن نے کتنی کامیاب نظم کہی ہے موضوع اتنا نازک تھا کہ شاعر کو اپنا دامن متانت، عریانی و آلودگی کے کانٹوں سے بچا کر لے جانا سخت دشوار تھا۔ ملا اس میں بوجہ احسن کامیاب ہوئے۔ اور یہ اُن کے حسن مذاق کی دلیل ہے۔ خدا کرے وہ اسی طرح ادب اُردو کی خدمت کرتے رہیں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

تقویت حافظہ

(جناب خادر جبلپوری)

حضرت خاور جبلپوری نے تقویت حافظہ کے نام سے ایک مفید کتاب لکھی ہے جو عنقریب شائع ہوگی اُسکا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر

اچھے حافظہ سے مراد ہے کسی موضوع کا

(ا) بہت جلد یاد ہوکر دماغ میں محفوظ ہوجانا۔

(ب) کسی قسم کی رجوعات کے بغیر طویل عرصے تک ذہن میں قائم رہنا۔ اور

(ج) بوقت ضرورت بغیر فروگذاشت بعجلت تمام اصلی حالت مین یاد آجانا۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ جو چیز جسقدر آسانی سے حاصل ہوتی ہے وہ اتنی ہی جلدی ضائع بھی ہوسکتی ہے اور جو کسی قدر محنت اور دقت کے ساتھ دستیاب ہوتی ہے وہ اُسی حد تک مستقل اور دیرپا بھی ثابت ہوتی ہے چنانچہ حافظہ بھی اس "دیر آید درست آید" والے کلیے سے خالی نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کو یاد کرنے کیلیے جس قدر وقت نظر اور غور و فکر سے کام لیا جائے گا وہ اتنے ہی عرصے تک ذہن سے فراموش نہیں ہوسکے گی۔

عام طور پر لوگ وقتی ضرورت کے لحاظ سے بعض ضروری باتوں کو یاد تو کرلیتے ہیں مگر کام نکل جانے کے بعد اُنھیں اپنے حافظہ میں محفوظ نہیں رکھ سکتے اور اُن کی حالت اُس طالب علم جیسی ہوتی ہے جو گھنٹی بجنے سے چند منٹ پیشتر اپنے سبق کو ازبر کرکے ایک دو روز بعد بالکل فراموش کردیتا ہو لیکن ایسے اشخاص کم نکلیں گے جو کافی غور و خوض کے بعد ہمیشہ یاد رہنے کی غرض سے کسی بات کو اپنے ذہن میں منتقل کرتے ہوں۔

اگرچہ حافظہ خود بھی ضروری اور کارآمد چیزوں کو حفظ کرکے یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح حافظہ میں سپرد ہونے والی باتوں کے محفوظ رہ کر بوقت ضرورت یاد آجانے کا امکان بھی ہے مگر اس معاملہ میں مندرجہ بالا اصولوں پر عمل پیرا ہونا ناگزیر ہے

اس سلسلہ میں ایک اور بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ کیا بیکار باتوں اور غیر ضروری چیزوں پر بھی ہمارا حافظہ طبعی طور پر متوجہ ہوکر انھیں باقاعدہ محفوظ رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ تجربہ اس سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے کیونکہ بہتسے لوگوں کے خیالات ہزارہا چیزوں پر راغب ہوتے ہیں مگر ضرورت کے

وقت اُن میں سے ایک کو بھی یاد نہیں رکھ سکتے۔

اس قسم کے حافظہ کی مثال اُس عورت کی ہے جو اپنے اسباب کو قرینہ اور حفاظت سے نہ رکھتے ہوئے کسی ایک کمرے میں بے ترتیبی سے اناج کے بوروں کی طرح تلے اوپر ڈال دیتی ہے اور جب کبھی اس میں سے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو سارے سامان کو اُلٹ پلٹ کر تلاش کرتی ہے کہ شاید اس میں سے اس کی مطلوب چیز بھی نکل آئے۔

اسی طرح جو طلبا خود کو امتحانات کیلیے تیار کرتے ہیں اُن کے خیالات حدود امتحان سے متجاوز نہیں ہوتے اور جو کچھ بھی وہ یاد کرتے ہیں وہ صرف امتحان کی غرض پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ برائے آئندہ یاد رکھنے کے لیے صحیح اصولوں کے مطابق ترتیب وار۔

پھر اگر اتفاق سے رٹی ہوئی کتاب کے مطابق امتحان میں کوئی سوال آگیا تو خیر ورنہ اگر اسی موضوع کو کسی دوسری صورت میں تبدیل کر کے پوچھا گیا تو اُن کی سمجھ میں خاک نہیں آتا اور وہ صحیح جواب لکھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور اگر کسی طرح کامیاب بھی ہو گئے تو امتحان سے فارغ ہو کر اسکول سے باہر نکلتے ہی سب یاد کیا ہوا بھول جاتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے تو صرف امتحان میں کامیاب ہونے کی غرض سے جو کچھ بھی پڑھا یا رٹا تھا وہ کچھ روز کے بعد یقینی طور پر فراموش ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت غیر دلچسپ اشیاء کے جالب توجہ اشیا اور ایسی باتیں یاد ہو کر دیر تک محفوظ رہتی ہیں جنکے حصول کا اشتیاق ہو اسلیے کہ اول الذکر ہماری توجہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی اہلیت نہیں رکھتیں اور اسی سبب سے چھوٹے بچوں کو کتابی صورت میں الف۔ بے۔ پسند نہیں آتی اور وہ اسے یاد کرنے سے ہچکچاتے ہیں مگر شیرینی کے حروف کو تھوڑی ہی کوشش سے یاد کر لیتے ہیں یا یہ کہیے کہ شیرینی پسند خاطر ہونے کی وجہ سے خود بخود اپنے حروف اُن کے ذہن نشین کر دیا کرتی ہے پس اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں جس چیز کا جس قدر شوق ہوگا اُسی لحاظ سے ہم اُسے جلد یاد کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ایک مشہور جرمن موسیقار، مزارٹ (Mozart) چودہ سال کے سن میں موسیقی کے اہم ترین مسائل کو صرف ایک مرتبہ سن لینے کے بعد یاد کر کے جیسا کا تیسا لکھ دیا کرتا تھا اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ وہ موسیقی کے برابر کسی دوسری چیز کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس کے سننے کے وقت خیالات کو یکسو اور ہوش و حواس کو مجتمع کر لیا کرتا تھا کیونکہ کسی حفظ کیے ہوئے موضوع کو مدت مدید تک ذہن میں باقی رکھنا بھی اس موضوع سے دلچسپی اور اشتیاق پیدا کیے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا اسلیے کہ صرف وقتی طور پر کام نکالنے کیلیے

اگر کسی چیز کو یاد کر لیا گیا تو مطلب برآری کے بعد پھر اُس سے کوئی تعلق نہ رکھنے کی صورت میں اسکا فراموش ہو جانا یقینی ہے مثلاً ایک شخص کو کسی خاص وجہ سے عدالت دیوانی کے قواعد سمجھنے کی ضرورت ہوئی، اُس نے اُن کی ورق گردانی کی اُنھیں سمجھا اور دماغ میں محفوظ کر لیا لیکن عدالت سے اس معاملہ کا فیصلہ ہو جانے کے بعد پھر اُنکے برقرار رکھنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہی اسلیے کچھ روز بعد آپ ان ہی قوانین کا اس سے اعادہ کرانا چاہیں کہ جو تھوڑے دن پیشتر ازبر یاد تھے اور جن کی مدد سے اس نے ایک وکیل کی حیثیت سے اپنے مقدمہ میں پیروی کی تھی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اب وہ ان میں سے بہت کچھ بھول چکا ہے اور اگر جزوی طور پر کچھ یاد بھی رہا ہے تو وہ قانونی کتابوں کی ورق گردانی کا محتاج ہے۔

اب اسکے ساتھ ہی ایک مصنف یا وکیل کو لیجیے جنھیں روزانہ قانونی معاملات کے تصفیہ اور اُن کی پیروی کی ضرورت ہوتی ہے اسلیے یہ لوگ تمام متعلقہ قوانین کو ہمیشہ یاد رکھ کر ان سے کام نکالنے پر مجبور اور ایسے قوانین کے متواتر استعمال کی وجہ سے بغیر پس وپیش یاد کر لینے پر حاوی ہیں کیونکہ کسی چیز کو متواتر استعمال کیے بغیر جوں کا توں یاد رکھنا دشوار ہے اور جس چیز کو جتنا زیادہ مورد استعمال رکھا جائےگا وہ اسی تناسب سے زیادہ دیر تک یاد بھی رہ سکے گی جس طرح اگر کوئی اشعار کے قطعات کو حفظ کرنا چاہے تو جتنا زیادہ انھیں دُھرائےگا اتنی ہی زیادہ دیر تک وہ اُس کے ذہن میں باقی رہیں گے چنانچہ جو بچے جتنا زیادہ آموختہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اسی مناسبت سے اپنے سبق کو یاد بھی رکھ سکتے ہیں۔

دوسرے، دلچسپ اور مرغوب طبع ہونے کے علاوہ کسی چیز کا متناسب ہونا بھی اُسکے جلد یاد ہو جانے کی دلیل ہے مثلاً کسی مسلسل قصیدے کو حفظ کر لینے کے بعد صرف ایک شعر پڑھنے سے اسکا دوسرا شعر خود بخود زبان پر آجاتا ہے لیکن اگر کسی درمیانی مصرعہ کو بطور تمثیل یاد کیا جائے تو اس کے لیے کسی قدر غور وفکر کی ضرورت پڑتی ہے اسلیے کہ قصیدہ اس خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر یاد نہیں کیا گیا تھا جس کے لیے اس مصرعہ کی تمثیل کی ضرورت ہوئی بلکہ وہ تو صرف حفظ کرنے کے وقت پیش نظر رہنے والے خیالات تک محدود تھا۔

اس لیے جب کسی چیز کو یاد کیا جائے تو صرف اُسکے ایک ہی رُخ پر نظر نہیں ہونی چاہیے اور اسے ایک ہی مقصد کے لیے مخصوص نہ سمجھنا چاہیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسکے ہر ایک پہلو پر مختلف زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈال کر اُس سے وابستہ ہونے والے تمام مقاصد کے ساتھ اپنے ذہن میں محفوظ کر لینا چاہیے تاکہ جب کبھی ان میں سے کسی ایک مقصد کے حصول کی ضرورت پیش آئے تو وہ بلا تامل یاد آجایا کرے۔

قطعہ

برطرحِ مشاعرہ خیرآباد بسلسلۂ جلسۂ جشن سیمیں حضور نظام خلداللہ ملکہ وسلطنتہ بتاریخ ۱۲ فروری [illegible]

(جناب سید عقیل احمد جعفری صاحب خیرآبادی)

ہاں مجھ کو مبارک ہو، یہ حُسن کا کاشانہ — میں عقل سے بیگانہ، تو عشق سے بیگانہ

اے لعبتِ انگلشیہ، اے برقِ کلیسا کی — ویراں تو کیا تونے مشرق کا صنم خانہ

محفل میں نہیں ہے اب، وہ شمع ہے افسردہ — کل حسن کو کرتی تھی جو عشق کا پروانہ

بے نور بنایا تو بجلی نے چراغوں کو — اُس نورِ صداقت سے لیکن رہی بیگانہ

کھنچ آتے تھے دل جس سے، بے دل جو بناتا تھا — جو چشمِ حقیقت کا تھا غمزۂ ترکانہ

تنویر نے مغرب کی، آنکھوں کو کیا خیرہ — آباد نہ کر پائی دل کا مرا ویرانہ

خورشید نے دھوئے تو گیسوئے شبِ ظلمت کے — سُلجھا نہ سکا لیکن اس زلف کو یہ شانہ

جلووں میں نہیں اس کے، اُس نور کی آمیزش — کیڑے کو بناتا تھا محفل میں جو پروانہ

تقریب ہیں جبلی کی، عثمان علی خاں کی

اب ایک غزل سنیے، باطرزِ جداگانہ

ہر شخص تصدق ہے، اپنا ہو کہ بیگانہ — یہ پھول "دکن" کا ہے، یو اس کی ہے مستانہ

کیا شان بزرگی ہے، کیا شانِ کریمانہ — زلفِ شبِ ظلمت کا خورشید بنا شانہ

سو جاتا ہے، دنیا سے ہو جاتا ہے بیگانہ — جب موت سُناتی ہے، ہشیار کو افسانہ

پیکر ہے عمل کا وہ، تو قول ہے اے بلبل — کچھ منھ سے نہیں کہتا، جل جاتا ہے پروانہ

ہو سکتا ہے ایسا بھی، موقوف ہے نیت پر — بتخانے میں کعبہ ہو، کعبے میں ہو بت خانہ

ساغر مرا خالی ہے، ساغر کو مرے بھر دے — اس چشمِ مروت سے، اے ساقیِ میخانہ

اے ضعف مدد کر اب، اے پاؤں مرے تھک جا — آگے نہ قدم اُٹھے، یہ ہے درِ جانانہ

اک ایسی لگے ٹھوکر، کھل جائیں مری آنکھیں — تو ہی مری رہبر بن، اے لغزشِ مستانہ

زاہد تو ہے حجرے میں، اسلام ہے خطرے میں — اب تیری ضرورت ہے، اے جراتِ رندانہ

انساں سے توقع ہے انساں کو محبت کی — دیوانہ سمجھتا ہے ہر شخص کو دیوانہ

دیکھے جو پڑے پردے منصور نے حق پر، تو — ایمان کی کہہ بھاگا، دیوانہ تو دیوانہ

خود اپنی ثنا خوانی، یہ کون حماقت ہے

اب نام عقیل اپنا ہم رکھیں گے "دیوانہ"

امام الشعراء ولی دکھنیؒ

(جناب حاجی محمود الحسن صاحب محمود اسرائیلی)

۷؍ فروری ۴۳ء کو اسمٰعیل کالج اندھیری (بمبئی) میں حضرت ولی دکھنی مرحوم کی دو صد سالہ برسی منائی گئی تھی۔ یہ نظم اسی تقریب میں پڑھی گئی تھی۔

نغمۂ اُردو ابھی تھا ساز کے پردوں میں گم
اور مغان شعر کے ٹوٹے ہوئے تھے جام و خم

محفل علم ادب میں ایک ویرانی سی تھی
گیسوئے معنی سے پیدا کچھ پریشانی سی تھی

سینے میں جذبات تھے طرز بیاں کوئی نہ تھی
اک زبان کلک تھی، دل کی زباں کوئی نہ تھی

برج بھاشا کا نہ تھا اک شبدہ بھی سلجھا ہوا
صورت تحریر جو مضمون تھا وہ اُلجھا ہوا

مان لیجے اس کے شاہد وہیں معصوم سے تھے
زیور شائستگی سے سب مگر محروم سے تھے

شوکت الفاظ کی ہونٹوں پہ رنگینی نہ تھی
بولی میں الھڑ پنا تھا کوئی شیرینی نہ تھی

دیدۂ تخئیل سے پنہاں تھا ندرت کا جمال
عشق کو مطلق نہ تھا آداب محفل کا خیال

صنف نازک بولتی تھی عاشقوں کے بھیس میں
عاشقی کی یہ انوکھی ریت تھی اس دیس میں

گرچہ یہ عریانیٔ جذبات وجہ ننگ تھی
لیکن احساسات انسانی کی دنیا تنگ تھی

فارسی کا غنچہ بھی زیب چمن یوں ہی سا تھا
اس میں خوشبو تھی مگر رنگ وطن یوں ہی سا تھا

نظم کی کیاری میں اُردو کی کلی پھوٹی نہ تھی
دوسری بھاشائیں تھیں ایسی کوئی بوٹی نہ تھی

موسم گل کا کوئی منظر کہاں آنکھوں میں تھا
اس گلستاں میں خزاں ہی کا سماں آنکھوں میں تھا

نخل اُردو کو اُگانے کے لیے مالی نہ تھا
اور یہ پروان کیا چڑھتا کوئی والی نہ تھا

اس کی زیبائی سے گلزار سخن محروم تھا
یعنی ذوق شعر سے اب تک وطن محروم تھا

اے خوشا قسمت کہ دکھن سے ولی پیدا ہوا
اس نے بویا اس کو اور خود اس پہ وہ شیدا ہوا

اس کو سیراب اپنے خون دل سے وہ کرتا رہا
اس کی رگ رگ میں عجب رنگینیاں بھرتا رہا

اے ولی، اے شعر اردو کے معلّے کے امام
سیکڑوں کیا، تیری روح پاک پر لاکھوں سلام

تو ہے میر کارواں، گرد رہِ منزل ہیں ہم
تو ہے بحر بیکراں، موج لب ساحل ہیں ہم

تو شہنشاہ سخن اور بندۂ ناچیز ہم
کشور شعر و سخن کا تیرے ہاتھوں میں علم

شاعران ہند کی جانب سے یاں آیا ہوں میں
گل عقیدت کے تری سرکار میں لایا ہوں میں

تواریخ انتقال اندوہناک

۱۹۳۶

برسالے

مزار افصح الکلام اصغر گونڈوی

۱۹۳۶

آہ شیریں بیان اصغر آہ

۱۹۳۶

(۱)

گئے دار فنا سے جانب باغ جناں اصغر — ادیب ملک اصغر، ناثر شیوا بیاں اصغر

انھیں حاصل تھا حامد مرتبہ معجز کلامی کا — لکھو تاریخ رحلت "شاعر جادو بیاں اصغر"

۱۹۳۶

(۲)

صاحبدل خدا دوست اصغر حسین گونڈہ — دائم بظل لطف داور بخلد بادا

چوں راہی جناں شد، بنوشت کلک حامد — سالش ز روے الہام "اصغر بخلد بادا"

۱۹۳۶

(۳)

حضرت اصغر حسین گونڈوی — شعر میں رکھتے تھے کیا دل کی نگاہ

ان کی تصنیفات نثر و نظم ہیں — آسمان علم و فن کے مہر و ماہ

حامد ان کی قبر پر سال وفات

لکھ "منور قبر اصغر یا اِلٰہ"

۱۹۳۶

(۴)

جو سوز و درد و اثر تھا کلام اصغر میں — وہ فن شعر میں ہے نادر و لطیف و عجیب

جگر[51] کے دل سے وہ پوچھو، مری زباں سے سنو — نیاز[52] اور یگانہ[53] کو کب ہوا ہے نصیب

یہ سال رحلت اصغر لکھا ہے حامد نے

کہ "آہ شاعر و نقاد و نکتہ سنج و ادیب"

۱۳۵۵

---

[51] جگر مراد آبادی۔ [52] نیاز فتحپوری نے کلام اصغر پر اعتراضات شائع کیے ہیں۔

[53] میرزا یگانہ چنگیزی کہتے ہیں کہ اصغر کو علی گڈھ والوں نے یکایک شاعر بنا دیا ہے۔

کلام آشفتہ

(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

مے سے مطلب ہے وہ ہو خم میں کہ پیمانے میں
کوئی کعبہ میں بلائے کہ صنم خانے میں

عشق ہی عشق ہے سب حسن کے افسانے میں
شمع جلتی ہے تو لو دیتی ہے پروانے میں

بادۂ شوق کہاں دیدۂ مایوس کہاں
یہ وہ مے ہے کہ ٹھہرتی نہیں پیمانے میں

کوئی پوچھے دل وحشی سے حقیقت اس کی
وہ جو اک چیز نظر آتی ہے ویرانے میں

غم فرقت میں قیامت کا اضافہ ہی سہی
اک ورق اور بڑھا دو مرے افسانے میں

منزل عشق میں کرتا ہے وفا کی تخلیق
وہ جو اک جذبۂ خاموش ہے پروانے میں

چھیڑ کر پھینک دیا آگ لگا دی میں نے
دقتیں تھیں دل مایوس کے بہلانے میں

دل میں وہ درد ہے جس درد کی تدبیر نہیں
وہ تمنا ہے جو آتی نہیں سمجھانے میں

اُن کو یہ ضد کہ مرے دل کی کہانی نہ سُنیں
اور یہاں جان ہے ٹکڑا یہی افسانے میں

ٹوٹ جائے گا یہ دل پھیر کے نظریں دیکھو
دیر لگتی ہے کہیں پھول کے کمھلانے میں

سرخیاں یاس و تمنا کی ہیں عنوان غم کے
اور کیا چاہیے اک درد کے افسانے میں

ذوق تشنہ نہ رہا سعی طلب میں آخر
مل گیا کعبہ کا کھویا ہوا بت خانے میں

وہی وحشت ہے، وہی حاصل بے ربطی ذوق
وہ جو اک دھن سی ہوا کرتی ہے دیوانے میں

جلوۂ حسن جو مل جائے تو میں دل ڈھونڈوں
غم کی بکھری ہوئی زلفوں کے سیہ خانے میں

مسلک عشق میں آشفتہ نہ ایماں ہے نہ کفر
بتکدہ کعبہ میں ہے کعبہ ہے بتخانے میں

نوائے اختر

(جناب نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی)

ہم زمانے سے نکل کر بھی زمانے میں رہے
درد بن کر حسنِ الفت کے فسانے میں رہے

چار دن کی زندگی یوں ہم نے کاٹی ہمصفیر
دام میں دو دن تو دو دن آشیانے میں رہے

مٹ مٹا کر قبر اپنی نذرِ صرصر ہو گئی
خاک ہو جانے پہ بھی ہم خاک اڑانے میں رہے

لاگ سی کچھ ہو گئی ہے برق کو اے ہم صفیر
ہم تو جاتے ہیں وہی اب آشیانے میں رہے

ہمتِ مردانہ راہِ عشق میں لغزش نہ ہو
ہم گذر جائیں مگر حیرت زمانے میں رہے

گلفشانی ہم کریں بلبل تو ہو طرزِ بہار
آشیاں گلشن میں گلشن آشیانے میں رہے

چار آنکھیں اُس سے ہونا تھیں کہ آفت آ گئی
دل جگر دونوں تو پہلے ہی نشانے میں رہے

موجِ بوئے گل بنی جاتی ہے پیغام دام کا
کہہ دو بلبل سے یہ بیٹھے آشیانے میں رہے

حضرتِ شوکت تو پوری کر چکے کب کی غزل
اختر اب تک ایک ہی مصرعہ لگانے میں رہے

امواجِ شمیم

(جناب نوار فاطمہ صاحبہ شمیم پروفیسر کراسٹھ ویٹ گرلس کالج۔ الٰہ آباد)

غایتِ تخلیق جب مجھ پر عیاں ہو جائے گی
سازِ ہستی سے مری برپا فغاں ہو جائے گی

مجھ مریضِ غم کی خاموشی میں ہے اک داستاں
میری حالت میری صورت سے عیاں ہو جائے گی

جان جاتی ہے فراقِ یار میں جانے بھی دو
زمرۂ عشاق میں تو داستاں ہو جائے گی

اس بتِ غنچہ دہن کے عشق میں اے ہم نفس
داستاں میری دہانِ بے زباں ہو جائے گی

میں وہ بلبل ہوں خزاں میں لوں اگر نام بہار
اک قفس کیا، سبز شاخِ آشیاں ہو جائے گی

حسن کی شہرت ہو تیرے اس لیے سنتا ہوں میں
میرے مٹنے سے حقیقت سب عیاں ہو جائے گی

حسنِ باطن کا مرقع تو بنا ہے اے شمیم
اس لیے تصویر تیری ضو فشاں ہو جائے گی

نظرے خوش گذرے

آئین جدید کے بموجب اسمبلی اور کونسل کے انتخابات کل صوبوں میں مکمل ہوگئے۔ تفصیلات اخباروں میں آچکی ہیں یہاں صرف بعض امور کا ذکر کیا جائے گا۔

کانگریس نے مدراس میں ۷۵ فی صدی، صوبۂ متوسط میں ۷۰ فی صدی، اڑیسہ میں ۶۵ فی صدی، بہار و صوبہ متحدہ میں ۶۰ فی صدی اور بمبئی میں ۵۰ فی صدی سے زائد جگہیں حاصل کیں۔ اور اگر کانگریس کمیٹی نے عہدے قبول کرنے کی موافقت میں فیصلہ کیا تو گویا ان چھ صوبوں پر کانگریس کی حکومت ہوگی۔ اور فیصلہ عہدوں کے خلاف میں ہوا تو امید کرنا چاہیے کہ ان صوبوں میں آئین جدید معرض تعطل میں آجائے گا۔

مسلم لیگ کو ہندوستان کے کسی چھوٹے سے چھوٹے صوبہ میں بھی اکثریت نصیب نہیں ہوئی۔ سندھ اور سرحد کے صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت زائد ہے لیگ کا انتخابی بورڈ ہی نہیں قائم ہوسکا۔ پنجاب میں اس کے صرف دو نمائندے منتخب ہوئے جن میں سے ایک صاحب جو بورڈ کے سکریٹری بھی ہیں انتخابی کشمکش کے دوران میں مجلس اتحاد ملت میں بھی شریک ہوگئے حالانکہ اس کا مطمح نظر مکمل آزادی ہے اور مسلم لیگ نوآبادیات کے درجہ سے آگے بڑھنے کی جسارت نہیں رکھتی۔ اور دوسرے صاحب کامیاب ہونے کے بعد سر سکندر حیات خاں کی اتحادی جماعت میں جاملے۔

بنگال میں سب سے زیادہ کامیابی ہوئی یعنے مسلمانوں کی ⅓ جگہیں لیگ کے نمائندوں کو ملیں مگر وزارت کی ترتیب کا شرف مسٹر فضل الحق کو حاصل ہوا جو پرجا پارٹی کے رہنما ہیں اور جن کو مسٹر جناح نے ناراض ہوکر اپنے بورڈ سے خارج کردیا تھا۔

جن صوبجات میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان میں سے بہار اور اڑیسہ میں تو لیگ کا بورڈ ہی نہیں قائم ہوا۔ صوبۂ متوسط میں قائم ہونے کے بعد شکست ہوگیا اور دو رہنماؤں کی شخصی قیادت میں انتخابی جنگ لڑی گئی۔ بمبئی اور مدراس میں مسلمانوں کی جگہوں میں سے ۶۰ فی صدی کے قریب لیگ کے نمائندوں کو حاصل ہوئیں اور صوبہ متحدہ میں ۲۴ فی صدی۔

کانگریس اور مسلم لیگ کی انتخابی جنگ پر اگر غور کیا جائے تو ایک کی کامرانی اور دوسری کی محرومی کا سبب معلوم ہوسکتا ہے۔ کانگریس کی باگ جس جماعت کے ہاتھ میں ہے وہ جانتی ہے کہ قومی تنظیم کے واسطے ایک مستقل نصب العین درکار ہے اور اس کے حصول کے لیے مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے اور اس راہ میں کوئی قربانی ایسی نہیں جس سے وہ دریغ کرتی ہو۔ مسلم لیگ کا کھلونہ چند سیاسی بازیگروں کے ہاتھوں میں ہے

جن کو سوائے اپنے ذاتی ترفع کے نہ قوم کا درد ہے نہ ملک کا۔

خدا بخشے مولانا محمد علی مرحوم نے ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپسی کے بعد اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ "جتنے لوگ فرقہ پرستی کے مدعی ہیں وہ سب خود پرست ہیں" دوسری اقوام کے فرقہ پرستوں کی حالت خواہ اس سے مختلف ہو مگر مسلمانوں کے فرقہ پرست اللہ کے فضل سے سب خود پرستی ہی میں مبتلا ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایک آزاد خیال محب وطن ہیں اور اسی خیال سے ۱۹۱۹ء میں خود راقم الحروف اس کا محرک ہوا تھا کہ اُن کو مسلم لیگ کا صدر بنایا جائے۔ مگر افسوس کہ اس ساری مدت کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

سولہ سترہ سال کی طویل مدت میں جناح صاحب کے کل کارناموں کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا پڑتی ہے کہ وہ بھی "بسیار خوشخط بسیار غلط" کے مصداق ہیں۔

انتخابات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل افسوس بلکہ مضحکہ انگیز حکمت عملی اُن اسلامی جماعتوں کی رہی جو اس امر کی مدعی ہیں کہ آزادی کامل اُن کا نصب العین ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند قدیم سے بعض مقتدر مقدسین سے ہیں جو عقیدت ہے اُس کی بنا پر دلی اذیت ہوتی ہے جب ان بزرگوں سے اختلاف کرنا ہوتا ہے مگر مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش رہنے کے بعد ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس سے نہ صرف علیحدہ رہنا بلکہ ایسے لوگوں سے سازکرنا جو اُن کے سیاسی نصب العین سے کوسوں دور ہیں اور جن میں سے اکثر کا مطمح نظر ذاتی ترفع اور شخصی اقتدار کے سوا کچھ نہیں رہا اُس جماعت کے ہرگز شایان شان نہ تھا جو مذہبی حیثیت سے برسوں کونسل کے داخلہ کی مخالفت کرتی رہی اور شرعی مصالح کی بنا پر آزادی کامل کے لیے کوشاں ہے۔

بہتر تو یہ تھا کہ علمائے کرام انتخابات میں حصہ ہی نہ لیتے۔ اور اگر یہ پاپڑ بیلنا ہی تھے تو اُن کو اپنی ساری قوت کانگریسی مسلمانوں کی تائید میں صرف کرنا چاہیے تھی یا کانگریسی مسلمانوں، جمعیۃ العلما، مجلس احرار اور مجلس اتحاد ملت کا ایک مشترکہ بورڈ بنا لیا جاتا یا کم سے کم انفرادی طور پر صرف ایسے لوگوں کی حمایت کی جاتی جن کا نصب العین آزادی کامل ہوتا۔

کانگریس کی سیاسیات میں اگرچہ معتقدات کا کوئی دخل نہیں ہے مگر سیاسیات کی خود ایک جداگانہ شریعت ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جن خطاب یافتگان نے کانگریس کے نام پر انتخابات میں شریک ہونا چاہا اُن سے

کانگریس والوں نے صاف کہہ دیا کہ خطابات سے دست برداری کیے بغیر کانگریس اُن کو اپنا امیدوار نہیں بنا سکتی اور متعدد اصحاب نے خطابات واپس کر کے کانگریس کی نمائندگی حاصل کی اور سارے ہندوستان میں ایک بھی کانگریس کا نمائندہ ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو خطاب یافتہ ہو۔

جمعیۃ علما کے مقدسین اور ہمارے دوسرے علمبرداران حریت اپنے دعاوی آزادی میں تو پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور فرنگی محل کے ایک مولوی صاحب کے بارہ میں تو ایک مقامی اخبار میں یہ چھپ بھی گیا کہ اُنھوں نے ایک تقریر میں فرمایا کہ آزادی کامل کی طلب میں وہ جواہر لال سے بھی آگے ہیں لیکن دوسرے صوبوں کا اگرچہ تفصیلی علم نہیں تاہم کم سے کم ہمارے صوبہ میں متعدد خطاب یافتگان اور تعلقداران جو اپنی سندوں کے رو سے انگریزوں کی غلامی پر مجبور رہیں علمائے کرام کی تائید وحمایت کے بدولت انتخاب میں کامیاب ہوئے جس کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں جمعیۃ علما اور خود ان علما سے شدید ناراضی اور بیزاری کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں اور وہ دوسرے ملانوں کی طرح ان پر بھی زر پرستی اور ہوا خواہی دولت واقتدار کے آوازے کستے ہیں۔

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا، جب ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گذری کہ مولانا محمد علی مرحوم جیسے قائد کو جمعیۃ العلما کی صدارت دینے سے انکار میں اس قدر اصرار کیا گیا کہ خود جمعیۃ العلما کے دو ٹکڑے ہوگئے جن میں سے ایک نے امروہہ میں کانگریس کی جنگ آزادی سے مسلمانوں کو باز رکھنے کی تجویز منظور کر کے شائع کی۔ مگر جمعیۃ العلما کی وہی باغی جماعت جب اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر پھر نئی جمعیۃ العلما کو خیرباد کہہ کر پرانی جمعیۃ العلما میں جا ملی تو چند ہی سال کے اندر جمعیۃ علمائے ہند قدیم کے سردار بھی اس حد تک اعتدال پسند اور مصلحت کیش بن گئے کہ مسٹر محمد علی جناح جیسے عافیت کوش رہنما کی قیادت میں انتخابات کی جنگ میں شریک ہونا اور خطاب یافتوں یا تعلقداروں کی حمایت وتائید کرنا اُن کے لیے باعث ننگ وعار نہ رہا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

مجلس احرار کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس کی صدر مجلس نے پہلے مسٹر جناح کی قیادت قبول کی، پھر جب پنجاب میں مسلم لیگ بورڈ بننے لگا تو اُس سے الگ ہو کر اپنا بورڈ علیحدہ قائم کیا مگر صوبہ متحدہ کے احراری یہاں کی لیگ بورڈ میں شامل ہوئے اور عین انتخاب کے قریب اُنھوں نے اپنی طرف سے ایک فہرست اُن لوگوں کی شائع کر دی جن کی تائید اُن کو کرنا تھی۔ پھر اس میں سب ہی قسم کے لوگ تھے، کانگریسی بھی، مسلم لیگی بھی، آزاد خیال بھی اور خطاب یافتہ بھی حتے کہ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو مسلم لیگ بورڈ کے نمائندوں کے حریف تھے۔

مجلس اتحاد ملت نے غنیمت ہے کہ مسٹر جناح کی قیادت سے گلو خلاصی حاصل کرلی مگر انفرادی طور پر اُس نے جہاں ایک طرف پنجاب مسلم لیگ بورڈ کے سکریٹری کو اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی وہاں پنجاب کی اتحادی جماعت اور بعض آزاد امیدواروں کی حمایت میں بھی دریغ نہیں کیا۔

غرضکہ ان حامیان آزادیٔ ملک کی مشترکہ قوتوں کے مجتمع نہ ہونے اور طرح طرح کی بے اعتدالیاں سرزد ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں جہاں مسلم لیگ کے ۲ نمائندے کامیاب ہوئے وہاں مجلس احرار اور اتحاد ملت کے بھی دو وہی دو امیدوار کامیاب ہوسکے۔ اور آج اگر ہندو اکثریت والے صوبوں میں ہندو کانگریسیوں کو تفوق حاصل ہے کیونکہ مسلمان کانگریسی ان حضرات کی امداد سے محروم رہنے کی بنا پر عموماً ناکامیاب ہے تو مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں خطاب یافتوں یا پنجاب کی اصطلاح میں "ٹوڈیوں" کی حکومت قائم ہو رہی ہے اور علمبرداران حریت "ازیں سو رانده و ازاں سو درمانده"! فاعتبروا یا اولی الابصار۔

سلطان العلوم ہز اگزالٹڈ ہائینس نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام حیدرآباد کی نقرئی جوبلی آخر فروری میں حیدرآباد اور ملک کے دوسرے حصص میں منائی گئی۔

موجودہ تاجدار کے زمانہ میں حیدرآباد بہت کچھ تبدیل ہوگیا ہے۔ اور اس ساری تبدیلی میں کلیۃً اگر نہیں تو بڑی حد تک خود فرماں روا کی ذاتی توجہ کو دخل ہے۔ خصوصاً تعلیم کی اشاعت اور اردو زبان کی ترقی میں جو نمایاں حصہ حیدرآباد نے لیا ہے اُس کے لیے سلطان العلوم کا عہد حکمرانی یادگار رہے گا۔

ریاست کا عام نظم و نسق رفتہ رفتہ اُسی رنگ پر آگیا ہے جو برطانوی ہند کے علاقہ میں ہے۔ یہ طریقہ نظم بعض خوبیوں کے ساتھ بہت سے نقائص بھی رکھتا ہے اور جب اُستاد کے یہاں اُس کی اصلاح نہ ہوئی تو شاگردوں سے کیا توقع کی جائے۔ پھر بھی حیدرآباد کو ایک بات میں فوقیت حاصل ہے یعنے اُس کے نظم و نسق کی غایت کسی اجنبی ملک کی نفع رسانی نہیں ہے، اس بنا پر نقائص کے باوجود اُس کا نظم و نسق مجموعی حیثیت سے اہل ملک کے لیے چنداں مضر نہیں۔ اور اگر زمانۂ مستقبل میں وہاں بھی صحیح معنوں میں آئینی حکومت قائم ہوگئی اور نظم و نسق پر اہل ملک کو ویسا ہی اقتدار حاصل ہوگیا جیسا انگلستان میں انگریزوں کو ہے تو یہ ہز اگزالٹڈ ہائینس کے عہد کی سب سے بڑی اصلاح ہوگی۔

خدا کرے کہ میر عثمان علی خاں اپنے ملک اور اپنی رعایا کو ترقی کی اس منزل پر پہونچانے کے لیے تا بہ دیر سریر آرائے حکومت رہیں اور اہل دکن کو اس نقرئی جوبلی کے بعد اُن کی طلائی جوبلی منانے کا موقع نصیب ہو۔

بنام خداوند جان آفریں

جا ہست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر :- ظفر الملک علوی

نمبر ۳و۴ | مارچ و اپریل ۱۹۳۷ء | جلد ۴۳

فہرست مضامین

Himayat Ali Mirza [illegible] B. First [illegible]

پُرانے رسالے

حسب ذیل رسائل کا ایک ایک نسخہ موجود ہے ۔ جن صاحب کو ضرورت ہو طلب فرمائیں

(محصول وغیرہ ذمہ خریدار ہوگا)

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ اُردو

نمبر	جلد	ماہ و سنہ	قیمت
نمبر ۲	جلد اول	اپریل سنہ ۲۱ء	عا/
۱۳	جلد ۴	جنوری سنہ ۲۴ء	عا/
۱۴		اپریل سنہ ۲۴ء	عا/
۱۵		جولائی سنہ ۲۴ء	عا/
۱۶		اکتوبر سنہ ۲۴ء	عا/
۱۷	جلد ۵	جنوری سنہ ۲۵ء	عا/
۱۹		جولائی سنہ ۲۵ء	عا/
۲۰		اکتوبر سنہ ۲۵ء	عا/
۲۱	جلد ۶	جنوری سنہ ۲۶ء	عہ/
۲۲		اپریل سنہ ۲۶ء	عہ/
۲۳		جولائی سنہ ۲۶ء	عہ/
۲۵	جلد ۷	جنوری سنہ ۲۷ء	عہ/
۲۶		اپریل سنہ ۲۷ء	عہ/
۲۷		جولائی سنہ ۲۷ء	عہ/
۲۹	جلد ۸	جنوری سنہ ۲۸ء	عہ/
۳۰		اپریل سنہ ۲۸ء	عہ/
۳۱		جولائی سنہ ۲۸ء	عہ/
۳۴	جلد ۹	اپریل سنہ ۲۹ء	عہ/
نمبر ۳۵		جولائی سنہ ۲۹ء	عہ/
۳۶		اکتوبر سنہ ۲۹ء	عہ/
۳۸	جلد ۱۰	اپریل سنہ ۳۰ء	عہ/
۳۹		جولائی سنہ ۳۰ء	عہ/
۴۰		اکتوبر سنہ ۳۰ء	عہ/
۴۱	جلد ۱۱	جنوری سنہ ۳۱ء	عہ/
۴۲		اپریل سنہ ۳۱ء	عہ/
۵۵	جلد ۱۴	جولائی سنہ ۳۴ء	عہ/
۵۶		اکتوبر سنہ ۳۴ء	عہ/
۵۷	جلد ۱۵	جنوری سنہ ۳۵ء	عہ/
۵۸		اپریل سنہ ۳۵ء	عہ/
۵۹		جولائی سنہ ۳۵ء	عہ/
۶۰		اکتوبر سنہ ۳۵ء	عہ/

ہندستانی اکیڈمی کا تماہی رسالہ ہندستانی

نمبر	جلد	ماہ و سنہ	قیمت
نمبر ۱	جلد ۱	جنوری سنہ ۳۱ء	عہ۸/
۲		اپریل سنہ ۳۱ء	عہ۸/
۳		جولائی سنہ ۳۱ء	عہ۸/
۴		اکتوبر سنہ ۳۱ء	عہ۸/
۳	جلد ۴	جولائی سنہ ۳۴ء	عہ۸/

[illegible] لکھنؤ

بنام خداوند جان آفرین

الناظر لکھنؤ

نمبر ۳ و ۴ جلد ۴۳ — مارچ و اپریل ۱۹۳۷ء

مسئلہ تعلیم پر چند خیالات

(جناب منشی محمد عبدالحق صاحب بی اے ایل ایل بی جج ہائیکورٹ ریاست جموں)

"تعلیم، تعلیم، تعلیم" یہ صدا آج کل ہمارے ملک میں ہر زبان پر جاری ہے۔ مشکل سے کوئی حقیقی یا مصنوعی لیڈر ایسا ملے گا جس نے اپنی تحریر یا تقریر میں اس کی ضرورت پر زور نہ دیا ہو۔ "تعلیم ہی ہم میں قوت پیدا کرے گی۔ تعلیم ہی ہندوستان کو آزادی دلوائے گی۔ تعلیم ہی ہمارے تمدن کے نقائص دور کرے گی۔ تعلیم ہی افلاس سے نجات دلائے گی وغیرہ وغیرہ غرضکہ جو کچھ کرے گی تعلیم ہی کرے گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن تعلیم کے پیچھے اس طرح بلا سمجھے بوجھے اندھا دھند دوڑنے سے موجودہ ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے حسب خواہش نتیجہ مرتب ہونے کی کم امید ہونا چاہیے۔

وہ زمانہ گذر گیا جب محض لکھنا پڑھنا جاننا تعلیم کے مفہوم کے بیشتر حصہ کو محیط کیے ہوئے تھا۔ اس زمانہ کی ضروریات ہی اس قسم کی تھیں جو اس مفہوم سے پوری ہو جاتی تھیں۔ ہمارا تمدن ایک خاص صورت اختیار کر چکا تھا ہمارے بچے اس میں نشو و نما پاتے تھے اور کتابی علم کے علاوہ جن عادات و خصائل کی دنیوی زندگی میں ضرورت تھی اس کو ماحول پورا کرتا تھا۔

موجودہ زمانہ میں ایام ماضیہ کی طرح تعلیم کے معنے محض لکھنا پڑھنا سیکھنے کی قابلیت پیدا کر لینا

نہیں ہے بلکہ ایسا انسان بنانا ہے جس کے اخلاق و خیالات پاکیزہ اور عادات منضبط ہوں۔ جس کو حق العباد اور حق اللہ کا پورا لحاظ ہو۔ جس میں ایثار کسر نفسی حب الوطنی کے جذبات بدرجہ اتم پائے جائیں۔ جس کا مذاق سلیم اور جو مرد میدان عمل ہو۔ جو انسان ان خصائل سے متصف ہوگا اُس میں ضوابط و قواعد کا احترام یعنے "ڈسپلن" خود بخود پیدا ہو جائے گا۔

گذشتہ زمانہ میں کتابی تعلیم اور ماحول کے اثرات متفق ہو کر ان نتائج کو فراہم کر دیتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کے جزو کو تعلیم۔ اور ماحول کے اثر کو تربیت کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے پُرانا تمدن قریب قریب ضائع ہو گیا۔ دو چار نام لیوا جواب تک باقی ہیں تھوڑے دنوں میں نظر سے اوجھل ہو جائیں گے۔

آج کل یہ امید کرنا کہ ہمارا پرانا تمدن اور موجودہ ماحول تعلیم کے اُس جزو کو جو تربیت کہلاتا ہے مرتب کر سکے گا ایک امید موہوم ہے۔ ماحول کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ماحول کا انقلاب تمدن قومی پر بہت شدید اثر ڈالتا ہے اور اگر اُن حضرات نے جن پر قوم کو راہ راست پر چلانے اور اصلاح کرنے کا فرض عائد کیا گیا ہے توجہ نہ کی تو ساری قوم کا بُھاؤ بدل جائے گا۔ گذشتہ ایک صدی کی مغربی تعلیم اور ماحول نے ہمارے نوجوانوں کے طرز خیال اور طریق ماندو بود میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کو پرانی تہذیب میں بجز عیوب کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔

ماحول کے اعتبار سے یہ زمانہ بہت نازک تھا اور ہے۔ ماحول ابھی رہگذر انقلاب پر ہے اور قوم سازوں کا یہ فرض تھا اور ہے کہ اس کی رہنمائی ایسے طریقہ پر کریں کہ قومی تشکیل کی صورت اختیار کرے۔ اب تک ہماری قوم کی رہنمائی کوتاہ بین اور تنگ خیال حضرات کے ہاتھ میں رہی جن کا نصب العین محض اپنی قوم یا فرقہ کو ترقی کی منزل تک پہونچاتا رہا۔ ان حضرات نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جسے مصلحان مصر نے اپنی قوم کے لیے تجویز کر کے ملک میں نافذ کیا اور جس کی وجہ سے مصر میں فرقہ پروری کا مسئلہ پیدا نہ ہو سکا بلکہ مسلم و عیسائی جو وہاں آباد ہیں وہ اپنے ملک کی خدمت کرنے میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانا چاہتے ہیں اُن کا مرکزی خیال اور نصب العین صرف مادر وطن کی خدمت کرنا ہے۔ جس پر ہزاروں جانیں وہ اب تک قربان کر چکے ہیں اور الحمد للہ کہ اُن کا نصب العین ایک حد تک احاطہ امکان میں آگیا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ہاں کے رہنماؤں اور لیڈروں نے وطن کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا فرقہ پروری کے جذبات کو غیر معمولی طریقہ پر اکسانا شروع کیا جس کا نتیجہ ہم لوگ بھگت

رہے ہیں اور اگر قانون قدرت نے امداد نہ کی تو آئندہ نسلیں بھی برداشت کریں گی۔

موجودہ نسل سے یہ امید کم کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات و طرز عمل میں ترمیم کرے۔ ہماری دعا کارکنان قضا و قدر کی بارگاہ میں یہ ہے کہ موجودہ لیڈر۔ جوبیگانگی۔ نفاق۔ تعصب خود غرضی وغیرہ کے زہریلے جراثیم مادر وطن کی فضا میں بو رہے ہیں وہ بار آور نہ ہوں اور ان کی قابل نفریں کوششیں دیرپا اثر ہمارے وطن کی فضا میں نہ چھوڑیں تاکہ آئندہ نسل کے سچے قوم سازوں کو تشکیل قومی میں دقت نہ اُٹھانا پڑے۔

ناظرین سے عذر خواہ ہوں کہ میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ یہ جرم میرے جذبات کا ہے جنھوں نے مضمون زیر بحث سے مجھے الگ کر دیا۔

میں موجودہ ماحول کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ ابھی تک ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی ماحول نے کوئی خاص مستقل صورت اختیار نہیں کی ہے اس وجہ کر نونہالان قوم کی صحیح تربیت کے متعلق ماحول سے امید رکھنا فضول ہے۔ لہذا وہ خصائل بھی جو ماحول کی آغوش میں پرورش پاتے تھے تعلیم ہی کے ذریعہ سے حاصل ہونا چاہییں۔ اس وجہ سے اب تعلیم کا دائرہ عمل بہت وسیع ہو گیا ہے چنانچہ ہندوستان میں حقیقی ضرورت "رزیڈنشل" یعنے سکونتی تعلیمی اداروں کی اتنی زیادہ ہے کہ کسی اور دوسری قوم میں نہ ہوگی۔ ان اداروں میں اس قسم کا ماحول فراہم ہونا چاہیے کہ جن میں بچہ مکمل انسان بن سکے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ محض لکھنے پڑھنے کی قابلیت بچہ کو مکمل انسان نہیں بنا سکتی۔ راقم حروف بلا مبالغہ سینکڑوں ایسی مثالیں دے سکتا ہے کہ بی اے ایم اے وغیرہ کی ڈگریاں انسان بنانے میں بالکل بے اثر ثابت ہوئیں اور زندگی کی کشمکش میں مغرور صاحب ڈگری فرد معطل اور قوم اور خاندان پر بار بن گئے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ حالت میں جہاں جذبات قومی اور سچی حب الوطنی بالکل مفقود ہے اور اُن کی جگہ جذبات فرقہ پروری، فرقہ بندی، خود غرضی اور تعصب نے غصب کر لی ہے۔ ہندوستانی قوم کی ارتقا کا مسئلہ محض علمی بحث سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اس مسئلہ پر فرصت نے اگر مساعدت کی تو آئندہ موقع پر غور کیا جائے گا۔

•

اس مضمون میں مسلمانوں کی موجودہ حالت اور طریقہ تعلیم و تربیت پر غور و بحث مقصود ہے۔ مسلمانوں کی حالت موجودہ کے متعلق زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہر مسلم و غیر مسلم اس کو بخوبی جانتا ہے کہ موجودہ حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ جن اسباب نے اسلامی تمدن کو برباد کر کے مسلمانوں کو سلطنت سے محروم کر دیا وہ اب تک کارفرما ہیں۔ جو رہی سہی وقعت اسلاف کے کارناموں کی وجہ کر

مسلمانوں کے نام کے ساتھ وابستہ ہے وہ بھی روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی اقتصادی معاشرتی اور مالی حالت کا جو ساٹھ سال قبل تھی آج کی حالت سے مقابلہ کیا جائے تو آسمان و زمین کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ حکومت و سلطنت کے بگڑنے کے بعد بھی اتنی خوشحالی تھی کہ اگر صرف قائم ہی رکھی جاتی تو افلاس کا جو رونا آج کل ہے اُس کا کوئی موقع نہ ہوتا۔ بلا مبالغہ ثروت و خوشحالی میں متذکرہ بالا میعاد کے اندر اسّی فی صدی کی کمی ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے امرا اور اراکین سلطنت کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے اور اُن کے پسماندگان آج کل فاقہ کشی کی مصیبت میں گرفتار رہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ انتزاع سلطنت کے بعد مفتوح قوم کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ لیکن اول تو اتنی خراب نہیں ہوتی جتنی کہ ہماری ہوئی۔ ثانیاً ہندوستان کے اُن صوبوں میں جہاں بفضلہ ملکی انتظام و سلطنت قائم ہے اور جہاں نوابان و راجگان حکمران ہیں وہاں بھی مسلمانوں میں افلاس کی ترقی کی شرح بالکل اتنی ہی ہے جتنی برطانوی ہند میں اس بدیہی واقعہ کو پیش رکھنے کے بعد ہر اُس شخص پر جو قوم کی ہمدردی کا دم بھرتا اور اصلاح کی کوشش و فکر کر رہا ہے یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے تمدن میں اُس نقص کو معلوم کرے جس کی بنا پر اُن میں سے نہ صرف وہ خصائل جاتے رہے جو جاہ و ثروت کی فراہمی کے لیے ضروری تھے بلکہ وہ اُن عادات سے بھی محروم ہو گئے جو دولت و ثروت و خوشحالی کو محفوظ رکھنے اور اُن کے قیام و استقلال کے لیے لابدی ہیں۔

اس نقص و عیب کے معلوم کر لینے کے بعد ہر دردمند مصلح قوم کا فرض ہو گا کہ اُن کے استیصال و اصلاح کی کوشش کرے اور وہ زہریلے جراثیم جو اب تک قوم کو قعر ذلت کی سمت گھسیٹے لیے جاتے ہیں اُن کا انسداد کرے۔ بغیر مرض کی تشخیص کیے ہوئے صحیح علاج ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ امید کرنا کہ ہیضہ یا پلیگ کا مریض محض ٹانک اور قوت بخش دوا سے صحتیاب ہو جائے گا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو کوئی بچہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔

ارباب نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ جن مسلمانوں نے اسلامی حکومت و اقتدار کو مٹی دی اُن میں انفرادیت کے جذبات کی فراوانی اور قومی خیالات و جذبات کا فقدان تھا۔ وہ ہر فعل کو اپنی ذاتی اور اپنے اعزہ و احباب کے مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھتے اور ریاست یا قوم کے مفاد کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔ اودھ کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے جب کوئی امیر وزیر اعظم ہو گیا تو سب سے پہلے بڑے بڑے عہدے اعزہ کے سپرد کیے گئے۔ اُن کے بعد احباب کی نوبت آئی اور آخر میں وہ اشخاص جن سے امداد کی امید ہوتی تھی نوازے گئے۔ اس کا مطلق خیال نہ ہوتا تھا کہ جو حضرات مقرر کیے گئے

ہیں وہ کام کے بھی اہل ہیں یا نہیں۔ اس طریق عمل کا لازمی نتیجہ پارٹی بندی تھا جس نے لکھنؤ اور دہلی کی سلطنتوں کو برباد کر دیا۔ لہذا سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں سے جذبہ انفرادیت و خود غرضی کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اور اُن کی جگہ پر ایثار، حمیت قوم اور حب الوطنی کے جذبات برانگیختہ کیے جائیں۔ جن تدابیر سے یہ مقصود فراہم ہو سکتا ہے اُن کو معلوم کرنا اور عملی جامہ پہنانا قوم سازوں کا فرض ہے۔ اس موقع پر تمثیلاً ہم یہ عرض کر دینا بے محل نہیں سمجھتے کہ ہٹلر، مسولینی اور کمال پاشا اتاترک جن کے قوم ساز ہونے میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا انھوں نے انواع و اقسام کے طریقے بچوں میں قومیت۔ حب الوطنی۔ راست خیالی پیدا کرنے کے اختیار کیے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا ضروری جزو انواع و اقسام کے تہمات سے بچوں میں اُن جذبات کا برانگیختہ کرنا قرار دیا ہے جن سے قومی عزت۔ قومی وقار۔ ایثار۔ قومی خودداری اور حب الوطنی کے خیالات کو فروغ ہو۔ اس نتیجہ کو مرتب کرنے کی غرض سے اُن کے ماحول میں نمایاں تغیر کر دیا ہے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے قوم ساز بھی ان حضرات کی مثال کو پیش نظر رکھ کر عمل فرمائیں۔

دوسری اہم وجہ مسلمانوں کے انحطاط کی جنسی جذبات کی بے ترتیبی اور بے ضابطگی ہے جس کی وجہ سے مسلم نوجوانوں کے خیالات بیشتر اوقات انہی جذبات میں منہمک رہتے ہیں اور وقت عزیز۔ نیک نامی، قوت عمل۔ خوش حالی۔ انسانیت غرضکہ سب کچھ ان جذبات پر قربان کر دیے جاتے ہیں۔ مرور ایام و قانون فطرت جب ان جذبات میں کمزوری اور ان کے غلو میں کمی پیدا کرتا ہے اس وقت ہمارا شباب زدہ نوجوان بالکل پست ہمت مفلوج العمل اور خراب عادات و خصائل میں گرفتار نظر آتا ہے۔ جو قوم کی امداد کرنا تو درکنار اپنی زندگی کو بھی اچھی طرح نہیں گذار سکتا۔ اوائل عمر میں جنسی جذبات کی گرفتاری اُن کو دنیا کے کسی کام کا نہیں رکھتی۔

جنسی جذبات ہر قوم کے نوجوانوں میں ہوتے ہیں پھر مسلمانوں کے لیے کیا تخصیص ہے اور ان میں انھوں نے ایسی برباد کن صورت کیوں اختیار کر لی ہے اس کا جواب اس ماحول کی خرابی ہے جس میں ہمارے نوجوان نمو و بالیدگی کے منازل طے کرتے ہیں۔

یہ جواب کسی قدر مجمل ہے لیکن اس کی تفصیل کے متعلق یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سوسائٹی کو بحث کی اغراض کی خاطر مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے مالدار و نادار۔ امیر و فقیر۔ متمول و مفلس۔ بندہ و آقا سب کا ایک ہی رتبہ رکھا ہے اور قرن اولیٰ میں اسلامی ماحول ہر مسلمان کے لیے یکساں تھا۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اور ہمارے موجودہ

حالات و تمدن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ عرض کرنا غلط نہیں کہ مسلمانوں میں بھی مرورِ ایام نے طبقات پیدا کر دیے ہیں۔ اور ہر طبقہ کا ماحول مختلف و جداگانہ ہے۔ چنانچہ اُس کے پاک و صاف کرنے کی تدابیر بھی مختلف ہوں گی۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سوسائٹی کو حسب ذیل طبقات میں تقسیم کیا جائے۔

۱۔ طبقہ والیانِ ملک۔ ۲۔ طبقہ امرا و رؤسا

۳۔ طبقہ متوسط یا متوسط الحال ۴۔ طبقہ عوام

(۱) جس ماحول میں والیان ملک اور اُن کے قریبی عزیزوں کے بچے پرورش پاتے ہیں وہ اپنی نوعیت میں خاص اور دیگر طبقات کے ماحول سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس وقت سے بچے کے حواس اُس کے قابو میں آتے ہیں حضور و سرکار کی صداؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں سُنتا۔ اُس کی ہر خواہش عام اس سے کہ کسی قسم کی ہو پوری کی جاتی ہے۔ والدین کے فطرتی جذبات محبت تو درکنار جو لوگ بچے کے گرد و پیش ہوتے ہیں وہ اپنے ذاتی مفاد موجودہ و آئندہ کو مدنظر رکھ کر عمل کرتے ہیں اس کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ اُن کا اہم فرض ایسے بچہ کی پرورش و تربیت ہے جس کے کندھوں پر ایک ملک کے انتظام کا بار ہوگا۔ ہمارے ملک میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً نہ والدین کو اس کا احساس ہے اور نہ بچے کے حوارئین کو۔ بچہ کی خدمت پر جو ملازمین مقرر کیے جاتے ہیں اُن میں بیشتر تعداد جہلا کی ہوتی ہے۔ جن کے متعلق کوئی تحقیقات چال چلن کی نہیں کی جاتی حالانکہ یہ بہت آسانی سے ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ اور خوش چلن ملازمین رکھے جائیں۔ تاکہ بُرے خیالات سے بچے بچے اور اچھے ماحول میں پرورش پائے اس بے احتیاطی کے نتائج کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ آنکھ کھول کر اپنے گرد دیکھیے۔ تملق۔ چاپلوسی۔ بے محل تعریف اور ہر وقت کی خوشامد سے ایک ایسا غیر فطرتی اور مصنوعی ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو بچہ کی فطرتی نمو و بالیدگی میں سدراہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عموماً مسلمان رئیس کا بچہ گدی پر بیٹھتے ہی اتنا بدل جاتا ہے کہ اُس کا پہچاننا دشوار ہوتا ہے۔ یہ بدنصیبی تو زائیدہ نہیں ہے۔ بلکہ زمانہ انحطاط کے ہر دور میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ مرحوم نے اس بدنصیب ملک پر ایک صدی سے زائد کا عرصہ ہوا کہ سلطنت کی تھی شاہزادگی کی حالت میں شائستگی۔ متانت۔ سمجھداری اور نیک چلنی کے لئے مشہور تھے۔ چنانچہ کئی معتدد انگریزوں نے جو اُن سے ملے تھے اُن کے متعلق تحریر کیا ہے کہ ایسا باتمیز۔ مہذب۔ سمجھدار اور خوش اخلاق شاہزادہ اُن کی نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن جب عنانِ سلطنت ہاتھ میں آئی تو خدا جانے

کیوں کا پلٹ ہوگیا۔ ساری امیدیں جو اُن کی ذات سے وابستہ تھیں یکایک خاک میں مل گئیں۔ بادشاہی کے دوران میں، جو انگریزان سے تھے اُن کی متفقہ رائے ہے کہ اودھ کے حکمرانوں میں سے جنھوں نے سلطنت کو تباہ و برباد کردیا ان حضرت کا نمبر اول ہے۔ اُن کی خرابی کی اصلی بنا جنسی جذبات کی بے لگامی تھی۔ دربار اندر کا اکھاڑہ تھا۔ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ گذرتا تھا کہ گندے خیالات۔ گندی حرکات میں انہماک نہ ہو۔ دنیا کی شرم۔ رعایا کا لحاظ مذہب کی پابندیاں بالائے طاق رکھ دی گئی تھیں۔ ملک کے انتظام یا بہبودی رعیت و قوم کے فلاح کے تذکرے کی گنجائش اُن کی محفل میں نہ تھی۔ نتیجہ اُس گندے ماحول کا تھا جس میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اور جس نے اُن کو مجبور کیا کہ اُسی قسم کے حوارئین اپنے اردگرد رکھیں۔ خراب صحبت کا اثر روز بروز زیادہ ہوگیا اور بالآخر وہ صورت پیدا ہوئی جس کا لازمی نتیجہ بربادی تھا۔ کمینے۔ خود غرض۔ آبرو باختہ مصاحبین اور حوارئین نے نہ صرف سلطنت برباد کی بلکہ دائمی بدنامی کا طرہ امتیاز بادشاہ کے سر پر رکھدیا اور بالآخر زہر پلاکر جان لے لی۔

لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ آئندہ مالک تخت و تاج کے ملازمین۔ معلمین اور مصاحبین ایسے ہوں جو بچہ کے اردگرد پاکیزہ ماحول اور فضا قائم رکھیں۔ کچھ عرصہ تک اس فضا اور ماحول کے قائم رہنے سے بچہ کی طبیعت میں خود بخود بیہودگی اور رکیک الحرکاتی سے تنفر پیدا ہوجائے گا۔ اور امتیاز نیک و بد جبلی خاصیت بن جائے گا۔

علاوہ بریں یہ امر بھی مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان اب تک ملوکیت پرست ہے۔ جمہوریت کی وارنش بالکل سطحی ہے۔ تھوڑی سی رگڑ سے یہ وارنش غائب ہوجاتی ہے۔ نواب و راجہ حقیقتاً ظل اللہ خیال کیے جاتے ہیں۔ اگر وہ ذرا سی توجہ فرمائیں اور بدچلن حضرات کی سرزنش کردیں تو اُن کی مملکت کا ماحول گندگی سے ایسی قلیل مدت میں پاک و صاف ہوجائے جس کی داعظ و مصلحان قوم مدت العمر کی محنت کے بعد بھی امید نہیں کرسکتے۔ لیکن اُن ممالک کی بدنصیبی کا کیا تذکرہ جہاں مالک و رئیس خود جنسی جذبات کی خوش فعلیوں میں مصروف ہو اور اپنے حوارئین میں اُن کو جائز رکھے۔ وہاں کی فضا اور ماحول بد سے بدتر ہوجائے گی۔

اس موقع پر تمثیلاً ایک واقعہ عرض کردینا بے محل نہ ہوگا۔ مرحوم اعلیٰحضرت نظام حیدرآباد نہایت درجہ خوش پوشاک تھے اور اپنے حوارئین کو بھی زرق برق پوشاکیں میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اچھے اور قیمتی کپڑے پہننے کا شوق حیدرآباد میں اتنا زیادہ رائج ہوگیا کہ مشکل سے کوئی رئیس اُس زمانہ میں ایسا تھا کہ جس پر درزیوں اور بزازوں کا قرضہ نہ ہو۔ یہ مذموم حالت روز بروز ترقی

کرتی جاتی تھی اور شدید پیچیدگیوں کا باعث بن گئی۔ موجودہ اعلیحضرت نے کمال فراست اسکو محسوس فرمایا اور انسداد شروع کر دیا۔ خود نہایت سادے کپڑے پہننا شروع کر دئیے اور دو چار موقعوں پر بھڑکیلے کپڑوں کے خلاف رائے ظاہر کر دی۔ بس اتنا کافی تھا۔ فیشن بدل گیا اور سادے سستے اور صاف کپڑوں کا دور شروع ہو گیا۔ دو ہی سال کے اندر بڑے بڑے درزیوں نے دکانیں بند کر دیں اور حیدرآباد چھوڑ دیا۔ مقروض ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ مفقود ہو گئی۔ رئیس کی ذراسی توجہ سے مشکل اصلاح بہت آسانی سے عوام و رعایا کے عادات میں کی جاسکتی ہے۔ صرف رئیس کو نقائص کا احساس اور شوق اصلاح ہونا چاہیے۔

(۲) طبقہ امرا و روسا۔ جس ماحول میں ان حضرات کے بچے پرورش پاتے ہیں وہ بعض تفصیلی اجزا میں طبقہ اول کے مشابہ ہے اور بہت کچھ جو طبقہ اول کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے اُن پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اس طبقہ کے ممبروں پر جاہ دیرینہ اور ثروت پارینہ کا اب تک اثر باقی ہے اور مختلف صورتوں میں رونما ہوتا ہے باوجودیکہ نہ اُس خودسری اور نازک مزاجی کی گنجائش ہے نہ موقع۔ راقم حروف کے چند احباب ایک پرانے خاندان کے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اُن کو ایک عام جلسہ میں شرکت کے لیے مدعو کریں۔ نواب صاحب نے استدعا سنکر فرمایا کہ آپ ہم لوگوں کو مدعو کرنے تو تشریف لائے ہیں لیکن یہ فرمائیے کہ آپ نے ہمارے لیے نشست کا کیا انتظام کیا ہے۔ وفد میں ایک صاحب منچلے تھے جواب میں عرض کیا کہ اب تک تو یہ انتظام تھا کہ ڈائس پر (یعنے اُس مرتفع مقام پر جہاں صدر مجلس بیٹھتا ہے) آپ لوگوں کے لیے جگہ مقرر تھی۔ لیکن اگر یہ ناپسند ہو تو اس سے بھی بلند مقام تیار کروا کر سیڑھیاں لگادی جائیں گی۔ نواب صاحب کو جائے نشست کے متعلق اطمینان نہ ہوا اور جلسہ میں شرکت نہ کی۔ جن اسباب نے اسلامی تمدن کو ماؤف اور اسلامی سلطنت کو برباد کر دیا وہ اب تک اس طبقہ میں کم و بیش کارفرما نظر آتے ہیں۔ رئیس یا بزرگ خاندان اپنے کو بیشتر اوقات قوانین اخلاق و شرم سے بالاتر سمجھتے ہیں اور تعیش و تن آسانی کو نصب العین زندگی قرار دے کر نہایت انہماک، یکسوئی اور فراخدلی سے بلالحاظ بدنامی دُنیوی و بازپرس اُخروی مذموم و مشتبہ اشغال میں مصروف رہتے ہیں۔ مدت العمر کی اخلاقی بدنظمی سے رئیس صاحب کے دل میں ایک قسم کی رواداری و دلچسپی بدچلنی کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا اگر اُن کے بچوں یا حوارین میں سے کوئی شخص کوئی حرکت ناشائستہ جنسی جذبات سے متاثر ہو کر کر بیٹھتا ہے تو وہ باعث تفریح

ہوتا ہے اور "اقتضائے بشریت" پر محمول کرکے اس کی دلدہی اور امداد کرتے ہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ ماحول کی گندگی ہے۔

ایسی مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں کہ پدر بزرگوار نے اپنے نوخیز بچے کی دلچسپی و تفریح کے لیے نہایت خوشرو طوائف نوکر رکھ دی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنے بدچلنی کے سبق اوائل عمر میں سیکھنے کے بعد نواب زادے صاحب درجہ بدرجہ ترقی کرتے گئے۔ یہاں تک کہ جب گدی نشینی کا وقت آیا تو فن عیاشی میں کامل ہوچکے تھے۔ خودمختاری ملنے پر ایسی مہارت دکھلائی کہ باید وشاید۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خاندانی جائداد تباہ و برباد کردی۔ ہمارے تمدن و ماحول کو بد سے بدتر بنانے اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے میں رؤسا اور امرا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ باوجودیکہ ان کی جنسی بے ضابطگی صرف اُن کے طبقے اور خاندان کی فضا نہیں برباد کرتی بلکہ ساری قوم پر اثر ڈالتی ہے۔ بدترین اثر اُن کے بچوں کی عادات و اطوار پر پڑتا ہے اور بالآخر خاندان کی بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن اب تک امرا میں اس کا پورا احساس نہیں پیدا ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے ہر ملک کے خوشحال طبقہ میں جنسی جذبات کی خوش فعلیاں کم و بیش نظر آتی ہیں لیکن ہمارے یہاں کی طرح اُن پر جواز کی مہر نہیں لگائی جاتی۔ اور ایسی بے بسی سے دوسری اقوام کے نوجوان رئیس اس میں گرفتار نہیں پائے جاتے۔ اس کی وجہ وہی گندہ ماحول ہے جس میں ان کی نشوونما ہوتی ہے۔ اگر شروع عمر سے اُن کے ماحول کی تشریح کی جائے تو صاف طور پر ظاہر ہوجائے گا کہ بزرگوں اور بزرگ خاندان کی جنسی بے ضابطگی نے اُن کے لیے ایسی فضا مہیا کردی تھی کہ جنسی خوش فعلیوں کو نصب العین زندگی سمجھنے لگے۔ اس خیال میں جو کچھ خامی تھی اُس کو جاہل اور بدچلن ملازموں نے رفع کردیا۔ راقم حروف ایسی مثالیں بتلا سکتا ہے کہ ۹-۱۰ سال کے رئیس زادے کو سوزاک کی مہلک بیماری ہوگئی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ملازم جو بچہ کی خدمت پر مامور تھا بے حد بدچلن اور اس مرض میں گرفتار تھا جس سے بچہ پر اثر پڑا۔ ایسے واقعات بھی پیش نظر ہیں کہ ملازمین نے بچہ کو شراب پینا اور دیگر افعال شنیعہ سکھلائے۔ ان واقعات کے لحاظ سے اس کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ جو ملازمین۔ اتالیق یا مصاحب بچہ کی نگرانی۔ پرورش و تعلیم کے لیے مقرر کیے جائیں اُن کے چال چلن کے متعلق پوری تحقیقات کرلی جائے۔

درحقیقت مسلمانوں میں انحطاط شروع ہونے کا باعث بچوں کی تعلیم و پرورش سے

بے التفاتی و بے رخی ہے۔ اس بے رخی نے ایسا گروہ معلموں کا پیدا کردیا جو علمی دنیا سے الگ محض کتابی نظریوں اور اصولوں کو رٹاتا رہا۔ بزرگ بھی محض لکھنے پڑھنے کی قابلیت کو اصل منشائے تعلیم سمجھتے رہے۔ اور چال چلن اور قوت عمل کی اصلاح کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے آخری زمانہ میں امرا اور ارکان سلطنت جن پر مدار استحکام و قیام سلطنت ہوتا ہے اُن میں مالک تخت و تاج سے زیادہ عیوب و نقائص تھے۔ تقریباً ایک صدی کی طویل مدت میں جو حکومت مغلیہ کے برباد ہونے میں لگی۔ طبقہ اراکین وامرا میں کوئی ایسا شخص نہ پیدا ہوا جو اوراق سلطنت کے انتشار کو روک سکے۔

لہٰذا اب جو امرا و رؤسا باقی رہ گئے ہیں اُن پر فرض ہے کہ اپنے زاویہ نگاہ کو بدلیں۔ اور اپنے طرز زندگی کو ننگ و نام خاندان۔ بہبودی اسلام اور محبت وطن کی خاطر بالکل بدل دیں اپنے چال چلن کی اصلاح کریں۔ اگر یہ ناممکن ہو تو بچوں کو کسی سکونتی ادارے میں تعلیم کی غرض سے داخل کردیں تاکہ وہ گھر کے گندہ ماحول سے بچیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کافی ہے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ والدین اپنے بچوں کی تعلیم و ترقی سے ہر وقت واقف رہیں۔ اُس میں دلچسپی لیں اور وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہدایات بھی معلمین کو دیتے رہیں۔ اگر اس پر عمل کیا گیا تو انشاءاللہ بہت جلد حالت رو باصلاح ہو جائے گی۔

(۳) متوسط الحال طبقہ۔ حکمائے سیاسیات و اقتصادیات نے جسد قومی میں اس طبقہ کو اُتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی کہ صلب یا ریڑھ کی ہڈی کو اطبا جسم انسانی میں دیتے ہیں۔ اس طبقہ پر حقیقتاً قوم کی بقا اور سلطنت کا انحصار ہوتا ہے۔ جب تک اس طبقہ میں راست خیالی۔ دیانت اور قوت عمل باقی رہتی ہے قوم و تمدن کا شیرازہ بکھرنے نہیں پاتا اور سلطنت و وقار قومی قائم رہتا ہے۔ لیکن جب اس طبقہ میں بے ایمانی۔ خود غرضی۔ دغا بازی پھیل جاتی ہے اور قوت عمل معطل ہو جاتی ہے اُس وقت انحطاط قومی شروع ہو جاتا ہے۔ اس طبقہ کی خرابی اسلامی تمدن اور اسلامی سلطنت کی بربادی کی ذمہ دار ہے۔ مصلحان قوم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کی جانب پوری توجہ فرمائیں۔

قبل اس کے کہ اصلاح کی جانب قدم بڑھایا جائے یہ ضروری ہے کہ اُن عیوب و نقائص کو معلوم کر لیا جائے جو اس طبقہ میں جاری و ساری ہیں۔

ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ اس طبقہ کے افراد میں بھی انفرادیت کا غلبہ۔ سرکشی اور

بدنظمی کا دور دورہ۔ جنسی جذبات کی بے ترتیبی۔ قوت عمل کا فقدان۔ حق العباد اور حق اللہ کے احترام سے بیگانگی ہے۔

انفرادیت کا ایک پہلو خود غرضی ہے۔ ہر شخص اپنے مفاد اور ذاتی اغراض کو ہر معاملہ میں پیش نظر رکھتا اور ملکی۔ قومی اور مذہبی نقطہ نظر کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ہر قدم پر اہل نظر کو اس کا ثبوت ملتا ہے۔ تمثیلاً ہم اوقاف کے انتظام کا حوالہ دیتے ہیں اس وجہ سے کہ یہ اسی طبقہ کے سپرد ہیں۔ مشکل سے کوئی موقوفہ جائداد ایسی ملے گی جس کا انتظام دیانت کے ساتھ ہوتا ہو اور منتظمین میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔ صرف شہر لکھنؤ میں چھوٹے اور بڑے اوقاف کی تعداد قریب قریب ایک سو کے ہے۔ راقم حروف کو فرائض منصبی کی انجام دہی میں ان کے حسابات دیکھنے کا موقع ملا۔ حالات ناگفتہ بہ نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر منتظمین کو اپنی ذمہ داری کا احساس باقی نہیں رہا ہے۔ بڑے بڑے اوقاف کی جانب نظر کیجئے تو ایک عبرتناک منظر دکھلائی دیتا ہے۔ بہرائچ میں سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور موقوفہ جائداد کی بدنظمی گذشتہ زمانہ میں اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ سید سالار مرحوم کا کلام مجید اور تبرکات بنیوں اور مہاجنوں کے یہاں رہن تھے۔ خدا سرکار دولتمدار کا بھلا کرے کہ واقعات معلوم ہونے پر ایک مسلمانوں کی کمیٹی قائم کر دی جس نے بہ نگرانی افسران سرکاری کچھ روز تک اچھا کام کیا اور مزار شریف۔ جائداد موقوفہ اور ہسپتال وغیرہ جو مزار شریف سے متعلق تھے بہت کچھ درست ہو گئے۔ لیکن خود غرضی نے اب پھر رنگ دکھلانا شروع کر دیا ہے۔ ممبروں میں پارٹی بندی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے لڑائی جھگڑا۔ جوتی پیزار جاری تھی۔ ممکن ہے اس سال ڈیڑھ سال میں کچھ اصلاح ہو گئی ہو۔

اسی طرح اجمیر شریف میں خواجہ غریب نواز کی درگاہ شریف میں جو اختلافات و بدانتظامیاں ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

انفرادیت کے دوسرے پہلو نے مسلمانوں میں عجیب و غریب صورت اختیار کی ہے یعنے ہر شخص اپنے کو سقراط دوراں اور بقراط زماں سمجھتا ہے۔ اپنی رائے کے سامنے دوسرے کی رائے کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا۔ بلکہ برداشت نہیں کر سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی مشورہ و مصالحت کے ساتھ چار آدمی مشکل سے کام کر سکتے ہیں۔ ہر اسلامی ادارے میں لڑائی اور اختلاف ہونا ضروری ہے۔ اس کی بنا محض ہٹ دھرمی پر ہے۔ احترام ضوابط (Discipline

ہمارے احساس و اعمال سے مفقود ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے عمل مشترک قریب قریب غیر ممکن ہے۔ ہر فرد ہر وقت اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہے اور کسی دوسرے کی رہنمائی منظور نہیں کرتا خواہ وہ کتنا ہی نیک طینت۔ ہوشیار۔ متدین اور جلیل القدر بزرگ کیوں نہ ہو۔ چند بصرین کی رسائے ہے کہ یہ سرکشی (Indiscipline) مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا باعث ہوئی اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ ایک حد تک درست ہے۔ آئندہ نظام تعلیم و تربیت میں اس کی نہایت شدید ضرورت ہے کہ احترام ضوابط (یعنے Discipline ڈسپلن) کا احساس بچوں میں پیدا کیا جائے۔ اس صفت کے عادت میں داخل ہو جانے سے ان کے ذاتی اعمال بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ اور چال چلن پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔

جنسی جذبات کی بدنظمی اس طبقہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کا انسداد بہت زیادہ ضروری ہے۔ موجودہ صورت حال میں جب تک کہ والدین اور بچوں کے سرپرست معلموں کا ہاتھ نہ بٹائیں گے اصلاح بہت دشوار ہے۔ سب سے پہلے بزرگ خاندان کا فرض ہے کہ گھر کی فضا کو درست کریں کیونکہ سکونتی اداروں کی کمی اور بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کا شوق اس کا ذمہ دار ہے کہ بہت کم تعداد بچوں کی بورڈنگ ہاوس یا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ کثیر التعداد طلبہ چند گھنٹے اسکول میں صرف کرنے کے بعد بقیہ وقت گھر میں والدین اور بزرگوں کے ساتھ گذارتے ہیں۔ اگر گھر کا ماحول گندہ ہے تو اس کا دیرپا اثر اُن پر پڑ جاتا ہے جس سے مدت العمر نجات نہیں ہوتی۔

مغربی ممالک میں مستطیع خاندانوں کے بچے عموماً سکونتی اداروں میں پرورش پاتے ہیں۔ جہاں کی فضا اور ماحول گندگی سے عملاً پاک و صاف کی جاتی ہے۔ والدین کی خراب عادات کا اثر بچوں پر نہیں پڑنے پاتا۔

مسلمانوں میں سب سے زیادہ کمی آج کل قوت عمل کی ہے۔ سوچتے بہت کچھ ہیں لیکن کر کچھ نہیں سکتے۔ خیالات اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا بھول گئے۔ درحقیقت خیالات و عمل میں اتصال باقی نہیں رہا۔ راقم حروف کو کئی ایسے ذی علم اور ذی حیثیت حضرات سے بحث و گفتگو کا موقع ملا جو اہم مسائل اور علے الخصوص انتظامی معاملات میں ایسے واقف کار نظر آئے کہ باید و شاید۔ کوئی شخص اُن کے نظریوں۔ وسعت خیالات باریک بینی اور ذہانت کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان ہی حضرات کے ذاتی معاملات کی بدانتظامی وابتری ہر شخص کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اس نفاق و دورنگی کا سبب دریافت کرنا مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بے عملی ایک

حد تک زمانہ انحطاط کے موروثوں سے ترکہ میں ملی ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری مروجہ لٹریچر پر بھی ہے
اُس زمانے کو بہت دن نہیں گذرے کہ جب بچہ پڑھنے کے قابل ہوجاتا تھا تو بیشتر اوقات
طلسم ہوش رُبا۔ بوستان خیال وغیرہ پر وقت صرف کرتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اپنے ارادوں
اور امیدوں کی فراہمی میں خوارق العادات واقعات کا متمنی رہتا تھا۔ اور قوت عمل کمزور اور ماؤف
ہوجاتی تھی۔ اُس کا بہت کچھ اثر اب تک باقی ہے۔ بے عملی ہماری فطرت ثانیہ ہوگئی ہے اور
باوجود اتنی مدت کی مغربی تعلیم کے ہم اب تک اصلاح نہیں کرسکے۔ مصلحان قوم کا فرض ہے کہ اس جانب
خاص توجہ فرمائیں اور بچوں میں مناسب تدابیر سے عادت عمل پیدا کریں کیونکہ بغیر اس کے قومی ترقی محال
ہے۔ اس سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کرسکتا کہ ہم لوگوں میں حق العباد اور حق اللہ دونوں سے بیگانگی
ہے۔ انفرادیت اور خود غرضی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ حق العباد کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ ہر
شخص اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور اُسی کی قربانگاہ پر دوسروں کے حقوق کو بلا تکلف قربان
کرتا ہے۔ قومی خدمات اُسی وقت تک جاذب توجہ ہوتی ہیں جب تک کہ کوئی ذاتی غرض اُن سے
وابستہ ہوتی ہے۔

خود غرضی نفاق کی جڑ ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں میں مل جل کر کام کرنا غیر ممکن ہوگیا ہے۔
ہر ایسے کام میں جس میں باہمی مشورہ کی ضرورت ہو اختلاف ونفاق ہونا ضروری ہے۔ یعنے مذہبی
سیاسی۔ قومی۔ ملکی۔ معاشرتی کوئی مسئلہ اس کلیہ سے مستثنٰی نہیں ہے۔

ذرا سے غور پر ارباب نظر کو ذاتی غرض کا ہیولیٰ اختلاف ونفاق کے پس پشت دکھلائی دے گا۔
لہٰذا قوم سازوں کا فرض ہے کہ خود غرضی کے خیال کو بچوں کی ذہنیت سے جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیں
اور اُسی جگہ پر ایثار۔ خدمت الناس اور راست خیالی کے بیج بو دیں تاکہ یہ مرض آئندہ نسلوں میں
نہ پھیلنے پائے۔

خدمت الناس کو افضل الاشغال بتلایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس دل میں خدمت
خلق کا جذبہ اور شوق ہوتا ہے اُسے حق اللہ کی ادائگی میں کوئی دقت نہیں واقع ہوتی۔

موجودہ تعلیم نے ہم لوگوں کو ایک حد تک حق اللہ کے خیال سے علیحدہ کردیا ہے۔ اور یہ بنایت
ہماری اخلاقی بدنظمی کی بنا ہے۔

تعلیمی اداروں کے منتظمین اور معلمین کا فرض ہے کہ اس نقص کو رفع کریں۔ جذبۂ اطاعت خدا
بچوں میں پیدا کردینے سے موجودہ بے اتفاقی کا انسداد ہوجائے گا۔ جن عملی تدابیر سے یہ نتیجہ

فراہم ہو سکتا ہے اُن کو سُوچنا اور عملی جامہ پہنانا اُن حضرات کا فرض ہے جو تعلیمی کاموں میں مصروف ہیں۔
اس طبقہ کے متعلق صرف ایک اور اہم امر کا تذکرہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بچوں کو صحبت بد سے حتے الامکان بچایا جائے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور زمانہ قدیم سے ہر مصلح نے اس پر زور دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ نے نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس کی وجہ سے تحفظ نہیں کیا جاتا اور سیکڑوں خاندانوں کے ہونہار بچے برباد ہو چکے ہیں۔ جن خاندانوں میں مغربی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہو گیا ہے اور جن کا کوئی فرد شہر میں یا کسی ایسی جگہ جہاں تعلیمی آسانیاں فراہم ہیں مقیم ہے اُس کے یہاں دیگر اعزا اور احباب کے لڑکے تعلیم کی غرض سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہ عموماً مفصلات میں مغربی تعلیم کا کافی انتظام نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کا رواج سا ہو گیا ہے۔
مسلمان بزرگ خاندان یا روٹی پیدا کرنے والا عموماً اپنے بچوں کی تعلیم سے لاپروا ہوتا ہے اور ایک ماسٹر یا معلم نوکر رکھ دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا۔ گھر کے واسطے بورڈنگ ہاؤس کے سے قواعد مرتب کرنا اُس کے لیئے غیر ممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف گھرانوں کے مختلف ماحول میں پرورش یافتہ بچے بلا کسی قسم کی نگرانی اور رہنمائی کے ایک ساتھ مدارج بالیدگی و نمو طے کرتے ہیں۔ جو خراب عادات میزبان کے بچوں میں ہوتی ہیں وہ مہمان بچوں میں اور جو مہمان بچوں میں ہوتی ہیں وہ میزبان کے بچوں میں سرایت کر جاتی ہیں اور وہ ساری عمر اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ راقم حروف متعدد خاندانوں کو بتلا سکتا ہے جو اس بے احتیاطی کا شکار ہو گئے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ ہندوستانی تہذیب بطرز عمل کے خلاف ہے اور بہت لوگ اس کی مخالفت کریں گے۔ لیکن دنیا عالم اسباب ہے۔ اسباب فراہم کرنے کے بعد نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔
اس مسئلے پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ غریب بھائیوں کے لڑکے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ اس کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ اُن بچوں کی جن کی تعلیم مقصود ہے مدد کی جائے اور بورڈنگ ہاؤس میں رکھ دیے جائیں۔ اس طرز عمل میں اخراجات کا سوال پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ایسی ضرورت ہے کہ جس پر خرچ سے گریز کرنا دانشمندی میں داخل نہیں۔

(۴) طبقہ عوام میں ابھی تک تعلیم بہت کم ہے۔ شوق تعلیم ضرور پیدا ہو چلا ہے لیکن ایسے تعلیمی ادارے جن میں اس طبقہ کے بچوں کو مفید اور کار آمد تعلیم دی جا سکے بہت کم ہیں عموماً غربا کے بچے کسی مکتب یا مسجد میں تعلیم کی غرض سے بٹھائے جاتے ہیں جہاں کلام مجید اور ابتدائی اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ موجودہ ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قسم کی تعلیم کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر محلہ میں ایسے اسکول ہوں کہ جن میں علاوہ مندرجہ بالا نصاب کے دست کاری، صنعت و حرفت بھی سکھلائی جا سکے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اس کی ترتیب و انتظام کے لئے جب تک کہ ساری قوم آمادہ نہ ہو گی اُس وقت تک حسب دلخواہ نتیجہ فراہم ہونا محال ہے۔ امید کہ مصلحان قوم اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

مجذوب کی بڑ

(جناب الحاج خواجہ عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس لکھنؤ)

بس اب ایک ہی آشنا چاہتا ہوں
ہٹو دوستو راستہ چاہتا ہوں

بتوں کو برائے خدا چاہتا ہوں
سر خم دل مبتلا چاہتا ہوں

میں اے ضبط آہ رسا چاہتا ہوں
بہت ناتواں ہوں عصا چاہتا ہوں

جو پوچھا ادا سے تو سب بھول بیٹھا
کھڑا سوچتا ہوں کہ کیا چاہتا ہوں

مرا ساز ہستی ہے لبریز نغمہ
کوئی مطرب خوش نوا چاہتا ہوں

رہ عشق میں پھر قدم لڑکھڑائے
مدد تم سے پیر ہدیٰ چاہتا ہوں

سنبھالو۔ سنبھالو۔ سنبھالو
گرا چاہتا ہوں گرا چاہتا ہوں　ق

بھلاتا ہوں پھر بھی وہ یاد آ رہے ہیں
وہی چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں

ارے رکھ ہنسی کو ہنسی ہی کی حد میں
ہلاک تبسم ہوا چاہتا ہوں

سراپا بنے سوز یہ ساز ہستی
میں وہ راگ اب چھیڑنا چاہتا ہوں

بہت دن تو مجذوب کی ہرزہ گوئی
بس اب لب پہ نام خدا چاہتا ہوں

حیاتِ نسیم

(جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۵)

ہردوئی کا دوسرا دور جون ۱۹۱۰ء میں حاجی نور الحسن دوبارہ ہردوئی پہونچے۔ احباب نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ روسا نے مبارکباد دی۔ کارکنان انجمن اسلامیہ نے خیر مقدم کہا۔ قانون دانی کی شہرت۔ جفاکشی کی دھوم تھی۔ قیامگاہ تک پہونچتے ہی موکلوں کے پیام آنے لگے اور چند روز میں مقدمات کا وہی انبار ہوگیا جو سفر عرب سے پیشتر تھا۔

صحت جسمانی ظاہرا درست تھی لیکن طبیعت مضمحل رہتی تھی۔ سرزمین بطحا کی روحانی برکات نے زق زق دنیوی سے دل متنفر کر دیا تھا۔ روزانہ کچہری جاتے۔ مقدمات کی پیروی کرتے تھے لیکن دیار رسول کی یاد فراموش نہ ہوتی تھی اور جی اُداس رہتا تھا۔ اطفال خورد سال کی پرورش و پرداخت کرنا تھی اس لیے کسب معاش کا خیال چھوڑ نہ سکتے تھے۔ مولوی احمد حسن اسی سال بی اے پاس ہوئے تھے اُن کو قانون کی تعلیم کے لیے الہ آباد بھیجنا تھا۔ مولوی حامد حسن ندوۃ العلما کے مدرسہ میں عربی پڑھتے تھے اُن کو درسیات کی تکمیل کے لیے دیوبند روانہ کرنا تھا۔ مولوی طاہر محسن کی تعلیم کا وقت آگیا تھا۔ غرض مختلف اسباب ایسے جمع تھے کہ وکالت سے دست بردار نہ ہو سکتے تھے۔ ”دل بیار و دست بہ کار“ کے قدیم مقولہ پر کاربند ہونے کی خواہش تھی مگر دل کی گرمی سے ہاتھ بیکار ہوا جاتا تھا۔ ”دلائل الخیرات“ اور ”حصن حصین“ کے سوا دوسری کتابوں میں جی نہ لگتا تھا۔ مقدمات کی مسلیں بار خاطر تھیں اور اوقات عدالت کی پابندی ناگوار۔

قاضی محمد مصطفٰے غازیپوری، شہر میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کے بھائی قاضی احمد الیاس وکالت کرتے تھے۔ دونوں مولانا کے مخلص دوست تھے۔

ڈاکٹر نبی احمد شہر میں مطب کرتے۔ صبح کو شکار کھیلتے اور شام کو خدمت اقدس میں حاضری دیتے تھے۔ ملک زاہد حسین امین بٹوارہ قدیم نیازمند تھے۔ مولوی محمود الحق حقی کی وکالت فروغ پر تھی۔ انجمن اسلامیہ کی ترقی کی تجویزیں پیش کرتے۔ مقامی معاملات میں صلاح طلب ہوتے تھے مولانا ہر ایک رفیق سے اُس کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے اور افکار دنیوی سے اپنی بیزاری ظاہر ہونے نہ دیتے تھے لیکن دل کی گرمی دست و پا کی قوت آہستہ آہستہ سلب کر رہی تھی۔

منشی مقبول احمد وصل کا وطن بلگرام تھا لیکن عرصہ سے ہردوئی میں رہتے تھے۔ کچھ دنوں تک مرقع عالم پریس سے اور ایک مدت تک مقبول المطابع سے تعلق رہا۔ مولوی نورالحسن کے مصاحب خاص تھے۔ شعروسخن سے ذوق تھا۔ مولانا کو شعرگوئی کی رغبت دلاتے تھے۔

دوستوں کے اصرار سے جشن تاجپوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۱۱ء میں ایک نظم لکھی جس میں حکومت برطانیہ کی رعایا پروری اور معدلت گستری کی تعریف تھی اور مدرسہ رفاہ عام کے جلسۂ تہنیت میں حکام کو سُنائی۔ بعدازاں ۱۳؍فروری ۱۹۱۲ء کو سالانہ نمائش کے دربار میں ایک مسدس پڑھا جس کا پہلا بند تھا۔

کیا قیامت ہے اُترتے ہوئے جاڑے کا خمار　　　　مہماں ہے گھڑی ساعت کی فقط فصل بہار
اب تو نورالحسن اچھا نہیں مے سے انکار　　　　لانبی داڑھی سے خدا کے لیے کیوں تم کو ہے عار
کب سے ارمان مچلتے ہیں نکلنے کے لیے
پی بھی لو آج مزا مُنھ کا بدلنے کے لیے

لیکن طبیعت کی افسردگی سے نظم تمام نہ ہوسکی۔ البتہ ایک غزل تیار ہوئی جس کا مطلع اُن کے حسب حال تھا :-

یکسوئی ہو تو کچھ اثر آہ رسا کرے　　　　قابو میں دل نہ ہو تو بھلا کوئی کیا کرے

مقطع سُنیے :-

نیّر یہ عمر اور یہ رندانہ صحبتیں　　　　اللہ آپ کو بھی کہیں پارسا کرے

مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی زمانہ کی تصنیف ہیں اور دل کی پژمردگی ظاہر کرتے ہیں :-

(۱) نفس انسانی کا دنیا میں فنا ہوجانا　　　　میری آنکھوں میں ہے بندے کا خدا ہوجانا
خوش ہیں مشاق جو ہوتے ہیں نئے رو دستم　　　　درد نے سیکھ لیا بڑھ کے دوا ہوجانا
عشق کی بھول بھلیاں میں نہ بھٹکے نیّر　　　　لے چیک درد کی تو راہ نما ہوجانا

(۲) جوانی تو ہے چاندنی چار دن کی　　　　ہمیشہ رہا ہے زمانہ کسی کا
اکیلی جوانی پہ کیا منحصر ہے　　　　نہیں ساتھ دیتا زمانہ کسی کا

پرائیوٹ خطوط میں بھی حسرت واندوہ کے مضامین ہوتے تھے۔ رفیق قدیم منشی مقبول علی کو ایک خط میں لکھا تھا :-

"دنیا افکار اور پریشانیوں کا مجموعہ ہے۔ اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق کم وبیش اس میں مبتلا ہے۔

قومے بہ تماشائے خط و خال خوش اند　　　　قومے بہ تمنائے زر و مال خوش اند

بیدلؔ ہمہ را بہ حال بدمی بینم خوشحال کسانیکہ بہرحال خوش اند

جس قدر دینیات کی طرف مائل ہوتے جاؤ گے پریشانیاں کم ہوتی جائیں گی۔ خدا کی یاد دل کو تسکین دیتی ہے۔"

مکتوب مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں :۔

"وہ زمانہ طالب علمی کا بڑی مصیبت کا وقت سمجھ کر کاٹا تھا۔ فی الحقیقت وہ بڑی بے فکری کا زمانہ تھا۔ دل میں حوصلے تھے اور ہر وقت آئندہ ترقیوں کی امیدیں۔ اب معلوم ہوا کہ خواب تھا، اسی طرح اُس وقت کے آنے کا یقین ہے جب یہ دنیا خواب ہو جائے گی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

خلاصۂ نظائر اور شاعری

اگر یہ وحشت و پراگندہ خاطری۔ افسردگی و پژمردگی زیادہ دنوں تک قلب میں جاگزیں رہتی تو مولانا کارہائے دنیا سے معطل ہو جاتے اور ادب اردو اُس گراں بہا نعمت سے محروم رہ جاتا جو ان کے وسیلہ سے مقدر تھی۔ وہ صاحب تسبیح و مُصلا ہو کر عزلت نشیں ہوتے اور ملک اُن کی محققانہ قابلیت سے استفادہ نہ کر سکتا۔ لیکن اجرام و اجسام کے موکلوں کو ان کی موشگافیوں سے کام لینا تھا اور دنیا کی شعبدہ پردازیوں میں ان کو چندے گرفتار رکھنا لازم تھا۔ لہذا اُن کے خیالات کو فکر معاد سے پھیرنے اور دنیا میں پھنسانے کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ ایک دن وکلائے شہر کی مجلس میں تذکرہ ہوا کہ اودھ کے نظائر قانونی کی کوئی جامع و مانع فہرست موجود نہیں ہے۔ پچھلی تالیفات از کار رفتہ ہیں اور ضرورت ہے کہ ایک جدید فہرست ایسی مرتب کی جائے جس میں سنہ ۱۸۸۱ء سے اس وقت تک کے کل مفید نظائر کا خلاصہ موجود ہو۔ چونکہ مولوی نور الحسن کو نظائر سے زیادہ دلچسپی ہے اس لیے مناسب ہے کہ وہی اس خدمت کو انجام دیں۔ مولانا نے پہلے انکار کیا مگر احباب کے تقاضے سے مجبور ہو کر اس خدمت کا بیڑا اُٹھایا۔ نظائر کی بیشتر کتابیں دولت خانہ پر مہیا تھیں۔ کچھ اور خریدیں کچھ دوستوں سے عاریتاً لیں اور خلاصہ نویسی کا آغاز کیا۔ صبح شام تالیف جدید میں مشغول رہتے اور عدالت کے روزانہ کام پر بھی زیادہ توجہ کرتے تھے۔ وقت کی قدر بڑھی۔ زندگی کی ضرورت معلوم ہوئی۔ امور دنیوی سے تنفر گھٹا۔ دل بہلا۔ شعر و سخن کا ذوق تازہ ہو گیا۔ ایک اخلاقی نظم لکھی جو زمیندار اور ہمدرد وغیرہ مختلف اخباروں میں شائع ہوئی اور ملک میں بڑی قدر و پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ فی الحقیقت صفائی بندش۔ سادگی بیان اور پاکیزگی خیالات کے اعتبار سے اُن کے سب قطعات پر فائق ہے :۔

عالم خلوت میں مجھ کو اتفاقاً ایک شب — رب سے موقع مل گیا اک شکوۂ دلگیر کا

دست بستہ عرض کی میں نے کہ اے بندہ نواز — تیری رحمت نے بڑھایا حوصلہ تقریر کا

غور سے کرتا ہوں میں جو اگلے لوگوں پر نظر — ساتھ اُن کے اور ہی کچھ ڈھنگ تھا تقدیر کا

اُن میں بھی ایسے تھے جو تھے تیرے منکر صاف صاف — ہم میں بھی ایسے ہیں جن کو تکیہ ہے تدبیر کا

اُن کی آہیں عرش کے نیچے کبھی رکتی نہ تھیں — اپنی آہیں پست ہیں۔ پتہ نہیں اک تیر کا

تیری رحمت عام ہے اور تو سراپا رحم ہے — تجھ سے کچھ کھٹکا نہیں تبدیل کا تغئیر کا

توبہ توبہ تو خفا ہو جائے یہ ممکن نہیں — پھر یہ کیوں انداز بدلا عالم تقدیر کا

ہنس کے فرمایا کہ اے ناواقف اسرار غیب — نکتہ چینی اب تو شیوہ ہے جوان و پیر کا

دل میں کچھ ہے اور زباں سے کچھ کہا کرتے ہیں وہ — پھر گلہ رہتا ہے ہر دم گردش تقدیر کا

لب پہ ہے سبحان ربی دل میں انا ربکم — اس عبادت پر ہے تکیہ ہر جوان و پیر کا

دل کے آئینہ سے پارہ اڑ گیا اخلاق کا — روح رخصت ہو گئی خاکہ رہ گیا تصویر کا

اپنے اپنے نفس کو ہر اک بنائے ہے خدا — اور خدا کا نام ہے مجموعہ تقصیر کا

سچ بتا دیکھے ہیں تو نے کتنے ایسے نیک خو — جن کو ہو اقرار دل سے اپنی ہی تقصیر کا

جو پرستش تیری کرتے ہوں خلوص دل کے ساتھ — جن کو غرہ ہو نہ دنیا کی کسی جاگیر کا

ہو زباں اُن کی مطابق دل کے دل ہو آئینہ — آئینہ وہ جس میں جلوہ ہو مری تنویر کا

ہم نہیں بدلے نہ بدلا ہے ہمارا انتظام — فرق ہے تیری سمجھ کا پھیر ہے تعبیر کا

خود پرستی چھوڑ دے کر حق پرستی اختیار — راز کھل جائے گا تجھ پر عالم تقدیر کا

فروری ۱۹۱۲ء میں سالانہ نمائش تھی اور یہ خلاصۂ نظائر کی تالیف میں سرگرم تھے۔ دوستوں نے اصرار کیا کہ حسب دستور قدیم دربار کے لئے نظم ضرور لکھی جائے۔ ارشاد کی تکمیل کی۔ پہلا بند تھا:—

ساقی پلائے جام مے خوشگوار کا — وہ پیش خیمہ آگیا فصل بہار کا

قابو میں دل کہاں ہے کسی بادہ خوار کا — جو اعتبار کیجئے قول و قرار کا

زاہد کی ہم تو ایک نہ مانیں ہزار میں
توبہ کسی نے کی بھی ہے فصل بہار میں

ٹیپ کا دوسرا مصرع زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ بعض نکتہ سنجوں نے اس مصرع کو طرح قرار دے کر طبع آزمائی کی۔ مولانا نے بھی غزل لکھی جس کا مطلع تھا:—

مجھ کو یہ اضطراب رہا ہجر یار میں — آج اس دیار میں ہوں تو کل اس دیار میں

"بہار" کی قافیہ پیمائی ملاحظہ طلب ہے :-

کیا جانے کیا زبان سے نکلا خمار میں — توبہ سے توبہ کیجئے فصل بہار میں
داتا ترے کرم کا تو اک فیض عام ہے — محروم کیا ہمیں رہیں فصل بہار میں
زاہد بھی منہ لگاتے نہیں نیک بخت کو — توبہ بھٹکتی پھرتی ہے فصل بہار میں
ڈنکے کی چوٹ ہم تو کہیں گے ہزار میں — توبہ کسی کی رہتی ہے فصل بہار میں

مقطع تھا :-

نیر شب فراق کا شکوہ کسی سے کیا — تقدیر بھی ہوئی ہے کہیں اختیار میں

۱۹ فروری ۱۹۱۱ء کو نمائش کے پنڈال میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ طرح تھی۔ ع

ہم گلستاں میں رہے قطرۂ شبنم ہو کر

مولانا نے بھی چند شعر کہے :-

کچھ عجب طرح سے کٹتے ہیں مرے لیل و نہار — دن بھی رہتا ہے مرے گھر میں شب غم ہو کر
ناتوانوں کی یہ صورت ترے کوچہ میں رہی — درد کی طرح اٹھے گر پڑے شبنم ہو کر
اور تکلیف بڑھی جس قدر ادراک بڑھا — کچھ بھی راحت نہ ملی جوش جنوں کم ہو کر

اسی زمین میں ایک شعر تھا :-

بے حقیقت ہے یہ دنیا کا بگاڑ اور بناؤ — ہم نے سب دیکھ لیا درہم و برہم ہو کر

پہلا مصرعہ کسی دوسرے شاعر کا تھا اور مصرعۂ ثانی مولانا نے ضم کیا تھا۔ اس میں "درہم و برہم" بہ معنی "پست و بلند" استعمال ہوا تھا۔ کہا گیا کہ اہل فارس "درہم و برہم" بہ معنی "خفا"، "ناراض" بولتے ہیں۔ "پریشان" یا "تہ و بالا" کی جگہ مستعمل نہیں ہے۔ مولانا نے مصحفی کا شعر پیش کیا۔

تم کو نصیب روز بنانا ہو زلف کا — اپنا تو حال درہم و برہم ہے یاں

لغت نویسی کا خیال | اسی وقت سے خیال پیدا ہوا کہ محاورات و مصطلحات اردو کی ایک فرہنگ مرتب ہونا چاہیے۔ امیر مینائی علیہ الرحمہ کی بے وقت وفات سے امیر اللغات ناتمام رہا۔ دفتر ہنوز قائم ہے ریاست رامپور سے امداد ہو رہی ہے۔ منشی احمد علی شوق ملازم ہیں لیکن کام کچھ نہیں ہوتا اور لغت کی تکمیل کی کوئی امید نہیں۔ میر علی اوسط رشک لکھنوی کا لغت تقویم پارینہ ہے۔ بیگم بھوپال کے خزینۃ اللغات میں محاورات نہیں۔ یہی حال نفائس اللغات کا ہے۔ فیلن صاحب کی ڈکشنری بالکل

ناکافی ہے۔

قدیم مراسم کی بنا پر منشی احمد علی شوق سے خط و کتابت کی۔ اُنھوں نے اُردو لغت کی تدوین ناممکن بتائی اور بہت شکن جواب دیئے۔ مولانا کو خلاصۂ نظائر کی ترتیب سے فرصت نہ تھی لیکن امیر اللغات کو مکمل کرنے کا خیال دل میں بار بار آنے لگا اور محاورات جمع کرنے کا عزم آہستہ آہستہ قلب میں راسخ ہونے لگا۔

منشی انور علی فاروقی ایم اے ایل ایل بی۔ ہردوئی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مولانا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ فہرست نظائر کی تکمیل میں معاون ہوئے اور پروف دیکھنے کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء میں ڈائجسٹ چھپ کر آگیا۔ وکلا اور حکام نے بڑی قدر کی۔ ایک ہزار کاپیاں طبع کرائی تھیں وہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں اور دوسرا اڈیشن شائع کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اودھ کے صاحب جوڈیشل کمشنر نے اس تالیف کی عدالت ہائے ماتحت سے سفارش کی اور مولانا سے ایسی کتاب کی فرمائش کی جس میں اودھ کے جملہ نظائر کے طے شدہ مباحث مع دلائل کے واضح طور پر لکھے جائیں۔ مگر مولانا کو تدوین لغت کا خیال پیدا ہو چکا تھا لہذا اس جدید فرمائش کی تعمیل سے قاصر رہے۔

شاعری کا عروج مجموعہ نظائر کی تالیف کو شعر گوئی سے ظاہراً تعلق نہیں لیکن شب و روز کی دلچسپی نے پریشان خاطری دور کردی اور شاعری میں لطف آنے لگا۔ لغات و محاورات جمع کرنے کا خیال بھی ترقی کر رہا تھا اداے مضامین کے نئے نئے اسلوب تلاش کرتے تھے اس لئے سنہ ۱۹۱۴ء کا کلام سنہ ۱۲ء اور سنہ ۱۳ء کی غزلیات سے بہتر ہے :-

(۱) ہر گھڑی تازہ ستم دل پہ سہا کرتے ہیں — تیرے جانباز تو مر مر کے جیا کرتے ہیں
یاد کر کر کے وہ اس طرح جفا کرتے ہیں — جیسے بھولے ہوئے وعدے کو وفا کرتے ہیں
رنگ تصویر میں ہے کچھ تو مصور کی جھلک — جا کے بُت خانہ میں ہم یاد خدا کرتے ہیں

(۲) وعدہ بھی جو کرتے ہیں مگر جاتے ہیں فوراً — بن بن کے بگڑ جاتی ہے تقدیر کسی کی
ہم کو تو مرقع میں تمھیں تم نظر آئے — آنکھوں میں سماتی نہیں تصویر کسی کی

(۳) غیر کے سامنے کیوں ہم کو اُٹھا دیتے ہیں — میں بُری چیز نہیں جس کو چھپا دیتے ہیں
اپنے مایوس کو وعدوں کا سہارا دے کر — بیم و اُمید کا کھٹکا سا لگا دیتے ہیں
وعدے تسکین کا باعث ہیں یقیں ہو کہ نہ ہو — انھیں چھینٹوں سے لگی دل کی بجھا دیتے ہیں

ترک مے مفت کروں شیخ کی خاطر کیونکر حور و جنت تو خدا کی ہیں وہ کیا دیتے ہیں۔
واعظو حضرت نیر کو نہ اتنا چھیڑو ایک ہی آہ میں وہ عرش ہلا دیتے ہیں

مولانا کے پیر مرشد حضرت شاہ تقی علی قلندر کا ایک رسالہ "اسرار فطرت" پر اُن کے سجادہ نشین نے شائع کیا۔ مولانا نے قطعہ تاریخ لکھا جس کے چند شعر یہ تھے :۔

مرشد من حضرت شاہ تقی شبنم شاداب گلزار علی
فخر دار علم برادر اک او نازشِ نیر بذات پاک او
پردۂ اسرار فطرت ساز کرد باب فیضان حقیقت باز کرد
سالہا بعد وصالش ایں کتاب لیلیٰ محمل نشیں بُد در حجاب
چاپ شد ایں نسخہ خیر مقال جلوہ گر شد شاہد یوسف جمال
اسم تاریخی بگیرم بے بدل از تجلیات نیاز ش ازل

رفیق قدیم منشی مقبول علی نے ایک عریضہ میں لکھا کہ پہلے شعر میں اگر بجائے "گلزار علی" کے "بستانِ علی" ہوتا تو بہتر تھا۔ مولانا نے جواب میں ایک پوسٹ کارڈ لکھا جو بجنسہ نقل کرنے کے قابل ہے :۔

"دعا۔ خط آیا۔ تمہاری سخن فہمی سے دل نہایت خوش ہوا۔ اشتیاق ملاقات کے واسطے یہ اک اور تازیانہ ہوا۔ "گلزار" اور "بستان" کے فرق پر خیال کرو۔ ایک کو پھولوں سے دوسرے کو پھلوں سے تعلق ہے۔ شبنم کو پھولوں سے مناسبت۔ تو خود تم ہی پسند کرو گے کہ "گلزار" کو "بستان" پر ترجیح ہے۔ ملاقات کا ذکر کر کے تم نے افکار کے زخموں پر نمک پاشی کی۔ افسوس وہ شب و روز کا ساتھ۔ وہ میل جول دن رات کا ہنسی مذاق اور کہاں یہ سالہا سال کی جدائی۔ برسوں صورت دیکھنے کو ترسنا۔ پچھلی صحبتوں کی یاد ذکر جوانی در پیری اللہ اللہ۔

رخصت ہوا شباب کے ہمراہ درد دل اندھیر ہے چک بھی گئی آفتاب کی

کیا کہئے اور کس سے کہئے۔ یہ سب اپنے اعمال کی شامت ہے۔ ورنہ کیا بھائی بھائی جدا نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں لیکن اس طرح کہ دو چار مہینے بعد کو چھ مہینے سال بھر جدا رہے پھر چند روز مل بیٹھے پھر جدا ہوئے پھر ملے۔ غرض یہ کہ وصال و فراق کی دھوپ چھاؤں میں شاد و ناشاد زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں تو وہ فراق کی مصیبت ہے جس کے کٹنے کی امید نہیں۔ خدا نہ کرے کیا یہ بھی شاعروں کی شب ہجر ہے جس کی سحر نہیں۔ جامع المتفرقین کی بارگاہ میں بعجز و الحاح تم بھی دعا کرو کیا عجب ہے کہ باریاب قبول ہو۔ ہر تعطیل میں یہ سہارا ہوتا ہے کہ تم سے ملاقات ہوگی اسی امید پر کئی سال

گذر چکے ہیں۔ لغات نیر کے متعلق تحقیقات کر رہا ہوں۔ کتابیں کچھ آگئی ہیں کچھ جمع ہونے کو باقی ہیں حرف "الپا" سے آغاز کیا ہے۔ اس حرف کے متعلق نصف سے زیادہ الفاظ و محاورات کی ترتیب ہو چکی ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ نور الحسن۔ ۵ راگست ۱۹۱۵ء "

دو ہفتہ کے بعد لغت کی بابت تحریر فرمایا :۔

"یہ کام جس کی میں نے ابتدا کی ہے اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ امداد فرمائے اور تکمیل کو پہونچائے۔ میں نے اس کو حرف "الپا" سے اس وجہ سے شروع کیا ہے کہ امیر اللغات حرف الف کے لیے کافی ہے۔ بعد تکمیل انشاء اللہ حرف الف لکھا جائے گا "بات" کے مفردات و مرکبات کے معانی قریب ۱۵۰ کے لکھ چکا ہوں "

ایک پنجسالہ صاحبزادی کا اسی زمانہ میں انتقال ہوا تھا۔ مندرجہ بالا خط کے خاتمہ پر تحریر ہے :۔

"عابدہ میری چھوٹی لڑکی نے شب مابین ۲۰ و ۲۱ راگست کو بعارضہ بخار و ہیضہ انتقال کیا اس کی سبب سے پانچ سال تک دل بہلتا رہا۔ میں اس سے خلاف معمول زیادہ مانوس ہو گیا تھا۔ مرضی خدا سے کیا چارہ ہے "

۵ ار دسمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"برخوردار احمد حسن سلمہ الہ آباد لا کلاس میں قانون پڑھتے ہیں۔ دسمبر کی تعطیل میں کاکوری آئیں گے برخوردار حامد حسن[1] یہاں ہیں انگریزی پڑھتے ہیں۔ اسکول میں داخل کرنا نضول معلوم ہوا۔ ماسٹر مقرر کر لیا ہے۔ طاہر سلمہ مع اپنی والدہ کے لکھنؤ میں ہیں اور بخیریت ہیں۔

میں حسب دستور بفضل خدا باوجود بیکارہ اور افکار کے علمی مشاغل میں مصروف ہوں۔ عمر پچاس تک پہونچی۔ داعی اجل لبیک کی صدائیں دیتا ہے۔ دعا کرو کہ خدا تعالیٰ اپنی اطاعت اور رضا مندی کا خلعت عطا فرمائے۔ عبادت کی توفیق اور قبولیت کی سند رحمت فرمائے۔ وما متاع الدنیا الا قلیل"

"علمی مشاغل" سے لغت کی ترتیب اور دواوین کی ورق گردانی کی طرف اشارہ ہے۔ کسب معاش کی افکار سے جو وقت بچتا وہ اسی خدمت پر صرف کرتے تھے۔ شاعری بھی قریب قریب ترک تھی۔ ۱۹۱۶ء میں صرف ایک غزل پانچ شعر کی لکھی :۔

دل میں اک بوند لہو کی تو حقیقت کیا ہے	دوڑ دھوپ ایسی غضب ہے کہ قیامت کیا ہے
پڑ گئے پردے کرشموں کے اداؤں میں پھنسا	محو حیرت نے نہ دیکھا تری صورت کیا ہے

[1] مولوی حامد حسن عربی کی تعلیم ناتمام چھوڑ کر دیوبند سے چلے آئے تھے۔

غیر بے پردہ سر بام بُلائے جائیں ذکر میرا ہو تو کہتے ہیں ضرورت کیا ہے
چار باتیں بھی نہ کیں ہم سے کبھی گھُل مل کے انھیں باتوں کی شکایت ہے شکایت کیا ہے
کچھ تو محشر میں بھی ہے بندہ نوازی منظور ورنہ نیر کے بلانے کی ضرورت کیا ہے

البتہ ۱۹۱۷ء میں کئی غزلیں کہنے کا اتفاق ہوا۔ ۲۵ر فروری ۱۹۱۷ء کو نمائش کے مشاعرے میں حسب ذیل غزل پڑھی:۔

دل بیتاب کی اُس بُت کو خبر ہے کہ نہیں میری آہوں میں خدا جانے اثر ہے کہ نہیں
جس کی رگ رگ میں کھٹک ہو وہ بتائے کیونکر درد دل ہے کہ نہیں درد جگر ہے کہ نہیں
نہ سہی۔ دیر و حرم میں میری حاجت نہ سہی دونوں عالم میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
خوف کیا دفتر عصیاں کا کرم سے تیرے رونے دھونے کے لئے دیدۂ تر ہے کہ نہیں

مقطع درد و تاثیر سے لبریز تھا۔

گنبد سبز میں آرام سے سونے والے اپنے نیر کی تجھے کچھ بھی خبر ہے کہ نہیں

۸ر جون ۱۹۱۷ء کو مین پوری میں مشاعرہ تھا۔ طرح تھی۔ع۔ وہی گل ہے گلستاں میں وہی ہے شمع محفل میں۔ مولانا کی شاعری کا آغاز مین پوری سے ہوا تھا اور سخن فہمی کی قابلیت بھی وہیں حاصل کی تھی۔ لہٰذا اُس جوار کے نکتہ سنجوں کو پختہ مشقی کا کلام سُنانا پسند خاطر ہوا۔ منشی مقبول حسین وصل بلگرامی کو ہمراہ لے کر مین پوری تشریف لے گئے۔ والد ماجد کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ دیرینہ نیاز مندوں سے ملاقات کی اور مشاعرہ میں وہ زور شور کی غزل پڑھی کہ واہ واہ سبحان اللہ کے نعروں سے صحن مجلس گونج اُٹھا:۔

نہ درد اُٹھا کلیجے میں نہ ٹیس اُٹھی کبھی دل میں بھلا کس مُنہ سے واعظ جا رہا ہے کوئے قاتل میں
نہ ہم باہر کبھی نکلے نہ پہونچے تیری محفل میں مگر گھر بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتے ہیں تجھے دل میں
مرے داغوں پہ خوشیاں ہوں مبارک میرے دشمن کو مجھے یہ ناز ہے رہتا ہوں میں پریوں کی محفل میں
تمھارے دم قدم سے دونوں گھر آباد رہتے ہیں جگر میں درد ٹھہرا ہے جو کُجرے ہوئے دل میں
وفا پر حرف آ جائے زباں سے کچھ اگر نکلے مگر ہاں درد کچھ اُٹھ اُٹھ کے کہتا ہے مرے دل میں
ملا ہے جام جم اس دل کی صورت میں خدا رکھے یہی محفل ہے تنہائی میں تنہائی سے ہے محفل میں
تمھاری حسرتوں میں کس بلا کی دلربائی ہے پریزادوں کا اک جمگھٹ سا رہتا ہے مرے دل میں
چلو۔ یوں ہی سہی۔ ہم ہی بُرے ہیں سارے عالم سے مگر تم پر زمانہ کی نظر پڑتی ہے محفل میں

کرامت جذب دل کی، ہے کہو۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے　　وہ دیکھو حضرت نیرؔ چلے آتے ہیں محفل میں

خان بہادر سید محمد ہادی ہردوئی میں حاکم ضلع تھے۔ سخن فہم۔ سخن سنج۔ ولایت کے تعلیم یافتہ۔ عربی و فارسی میں استعداد۔ اُردو کے شاعر اور نثار۔ مولوی نور الحسن کی تکریم و توقیر کرتے۔ شاعری کی داد دیتے اور لغت نویسی کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ ان کا تبادلہ ہوا ضلع کے اشراف و اعیان کو جدائی کا قلق تھا۔ الوداعی پارٹیاں ہوئیں۔ استاد نے بھی ایک نظم لکھی۔ برطانیہ اور جرمنی کی جنگ عظیم جاری تھی۔ روس تباہ ہو چکا تھا۔ عراق کی حالت زار تھی۔ رنگروٹ بھرتی کیے جاتے تھے۔ قرضۂ جنگ کے دفتر کھُلے تھے۔ وفاداروں کو خطابات تقسیم ہوتے اور اسلحہ کے لیسنس دیے جاتے تھے۔ ان سب واقعات کی طرف لطیف پیرایہ میں اشارہ تھا اور فراقیہ نظم نیم مزاحیہ بن گئی تھی۔ پہلا بند تھا:۔

اے فلک تو نے نکالا یہ کہاں کا کھڑاگ　　اس طرح کوئی بُنے گھر میں لگاتا ہے آگ
عیش و عشرت سے ہمیشہ تجھے رہتی ہے لاگ　　روسیوں کا تری حرکت نے اُجاڑا ہے سُہاگ
کون سینہ ہے جو ماتم میں نہیں چاک ہوا
کیا بُری آگ لگی لاکھ کا گھر خاک ہوا

چند اشعار اور سُنیے:۔

(۱) سارا رن داغ جگر کے تجھے چندے میں ملے　　لوٹ بربادی تقدیر کے قرضے میں ملے
(۲) تیرے حصے میں وہ بھرتی ہوئے رنگروٹ بڑے　　بن کے زیپلن جو تاروں کی طرح ٹوٹ پڑے
(۳) نہ سہی خوف خدا کچھ تجھے وسواس بھی ہے　　اک دونالی کا تو لیسنس مرے پاس بھی ہے

۶ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو مولانا کے دولتکدہ پر مشاعرہ تھا۔ سندیلہ۔ بلگرام۔ شاہجہانپور۔ لکھنؤ سے مہمان آئے تھے۔ حضرت فانی بدایونی جو آج ہندوستان کے بہترین شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں شریک بزم تھے۔ اُس وقت تک اُن کا دیوان شائع نہیں ہوا تھا اور شہرت عام حاصل نہ تھی لیکن مزاج عاشقانہ۔ دماغ شاعرانہ۔ آواز درد انگیز رکھتے تھے اور سر تا بقدم مجسم شعر تھے۔ کلام میں سوز و گداز تھا اور حسرت خیز ترنم سے سُننے والوں کے دل موہ لیتے تھے۔

مصرعہ طرح تھا۔ ع الفت ہوئی ہے رونق محفل جگہ جگہ۔ فانی نے بڑی موثر غزل لکھی جو کئی سال تک ہردوئی کے سخن فہموں کو یاد رہی۔ راقم الحروف اس مشاعرے کے دو سال بعد بہ سلسلۂ ملازمت ہردوئی پہونچا تو ارباب ذوق کو یہ غزل حفظ تھی اگرچہ تحت اللفظ سے وہ لطف حاصل نہ ہو سکتا تھا جو شاعر کے ترنم سے حاصل ہوا تھا۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:۔

نوجوان مدعائے دل اور دل جگہ جگہ — ہے ایک شمع رونق محفل جگہ جگہ
رو رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں — ہنستی ہے مجھ پہ دوری منزل جگہ جگہ
اک سرگذشت درد ہے ہر ذرہ خاک کا — پہونچی ہے داستان غم دل جگہ جگہ
غم اصل کائنات ہے دل جو ہر حیات — دل غم سے غم ہے دل سے مقابل جگہ جگہ
مٹ کر بھی داغ شاہد خون شہید ہے — دھویا ہوا ہے دامن قاتل جگہ جگہ
اب یادگار فانی بسمل ہے اس قدر — گلگوں ہے خاک کوچۂ قاتل جگہ جگہ

مولانا کی غزل سنیے :۔

شکوہ یہ عام ہے سر محفل جگہ جگہ — کمبخت آہ کرتی ہے منزل جگہ جگہ
اے دل سنبھل کے کوچۂ جاناں میں رکھ قدم — بیٹھے ہوئے ہیں راہ میں قاتل جگہ جگہ
مجنوں کی آہ آہ کا کچھ تو اثر ہوا — اُٹھ اُٹھ گیا ہے پردۂ محمل جگہ جگہ
دنیا و دیں سے گذرے تو پہونچے ہیں تیرے پاس — کرنا پڑی ہے راہ میں منزل جگہ جگہ
نیر سے کیوں کرے کوئی قیمت کی بات چیت — ملتے ہیں مفت لوٹے ہوے دل جگہ جگہ

اُستاد ترنم سے غزل پڑھنا پسند نہ کرتے تھے اس وجہ سے مشاعرہ کا سہرا فانی کے سر رہا ورنہ جس طرح فانی کا شعر نمبرہ لاجواب تھا ویسے ہی مولانا کے بعض اشعار بھی قابل قدر تھے۔

نمونۂ نور اللغات الفاظ و امثال۔ محاورات و مصطلحات جمع کرنے کا سلسلہ دو سال سے شروع ہو چکا تھا دیباچۂ نور اللغات میں ہے کہ "۱۹۱۴ء میں میرے بہت سے ذی علم احباب نے طرح طرح سے ہمت بڑھا کر مجبور کیا کہ میں باوجود پیشہ وکالت اور دیگر مشاغل کے اس ذمہ داری کا بار اپنے سر لوں اور اپنے اوقات کا زیادہ حصہ اس کام کے لیے وقف کردوں۔ میں نے عذرات کی لپیٹ میں اپنی حالت کا اظہار بہت کچھ کیا لیکن کچھ سماعت نہ ہوئی اور مجبور ہو کر تعمیل ارشاد کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے کتب خانہ کی موجودہ کتب کے علاوہ اس ضرورت کے لیے معتد بہ کار آمد کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا اور ایک خاص دفتر اس کا قائم کیا۔ محرر ملازم رکھے ان کا صرفہ اپنے ذمہ لیا اور الفاظ و محاورات کو بہ ترتیب حروف تہجی لکھنا شروع کر دیا۔"

اردو کا پہلا قابل لحاظ لغت شیکسپیر اور فیلن صاحبان نے ۱۸۷۹ء میں شائع کیا تھا۔ اُس کو دلیل راہ بنا کر امیر اللغات کے طرز پر محاورات و امثال شامل کرنے کا عزم کیا۔ اساتذہ کے دواوین پڑھتے۔ مثنویوں کی ورق گردانی کرتے۔ نثر اردو کی مقبول کتابیں دیکھتے۔ ہر جدید محاورہ یا لفظ

نشانات بناتے۔ تذکیر و تانیث کی اسناد پر خط کھینچتے۔ مراقی کے دفتروں سے اصطلاحات منتخب کرتے۔ محرر علامت زدہ الفاظ و محاورات کو بہ ترتیب حروف تہجی لکھتے۔ اور سند کے اشعار نقل کرتے تھے۔
امیر اللغات کے دو حصے شائع ہو چکے تھے۔ الف ممدودہ و مقصورہ کا ذخیرہ ان میں موجود تھا۔ اس لیے حرف الباسے آغاز کیا۔ بوقت فرصت الفاظ کے معانی لکھتے اور پہلوے استعمال دکھانے کے لیے مسلم الثبوت استادوں کے اشعار یا مستند نثاروں کے فقرات درج کرتے تھے۔
امیر اللغات کا حصہ اول شائع ہونے سے چھ سات برس پہلے ایک "نمونہ" شائع کیا گیا تھا جس میں صرف "آنکھ" کا لفظ اور اس کے مرکبات تھے۔ یہ اپنے لغت کا آغاز حرف ب سے کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے نمونہ کے لیے لفظ "بات" انتخاب کیا۔ اگست ۱۹۱۵ء تک اس لفظ کے سیکڑوں مرکبات جمع کر چکے تھے اور تقریباً ۵۰ محاورات کے معانی لکھ چکے تھے۔ تلاش و تحقیق کا یہ عالم تھا کہ مفرد لفظ "بات" کے ۸۰ معانی لکھے تھے اور ہر معنی کے لیے سند پیش کی تھی۔ بعض معانی بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتے تھے لیکن جب سند دیکھی جاتی تو ثابت ہوتا تھا کہ واقعی اس جگہ بات کے یہی معنی ہیں۔ مثلاً
بات بہ معنی دلیل۔ ثبوت۔ (داغ)

بات کیا چاہیے جب مفت کی حجت ٹھہری — اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

بات بہ معنی تعریف۔ مدح۔ (غالب)

زاہد نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

بات بہ معنی خطا۔ قصور۔ (سودا)

سودا کسی کو وہ تو ستائے نہ بے سبب — کیا جانیے کہ تجھ سے ہی کیا بات ہو گئی

بات بہ معنی الزام۔ (امانت)

لائے گی اک دن محبت میں — آبرو پر یہ اشکباری بات

بات بہ معنی عقلمندی (مومن) بات جب ہے کہ بات ٹالو تم

بات بہ معنی سبب۔ (امانت)

آدھی رات اور ہم ترے در پر — دل لگانے کی ہے یہ ساری بات

بات بہ معنی رسم و راہ۔ (مومن)

میں جو آیا تو التفات نہیں — وہ نظر وہ سخن وہ بات نہیں

بات بہ معنی موقع محل۔ (منیر)

ہوتی ہے صبح دیکھیے تھوڑی سی رات ہے کروٹ ادھر کی لیجئے یہ کون بات ہے

غرض یہ نمونہ امیر اللغات کی تقطیع پر لکھا گیا۔ اتفاق سے کاتب بھی وہی دستیاب ہو گیا جس نے امیر اللغات کی کتابت کی تھی۔ مقبول المطابع ہردوئی میں چھپا اور مشہور شعراء ادبا اور زبان دانوں کی خدمت میں اظہار رسلے کے لئے روانہ کیا گیا۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدا آئی لیکن عام خیال تھا کہ اس طرح پر سارا لغت تالیف نہیں کیا جا سکتا۔ امیر مینائی باوجود ریاستہائے رامپور و بھوپال کی امداد کے تمام نہ کر سکے تو مولوی نور الحسن اس خدمت کو کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔ ان کی اعانت کے لئے نہ تو شاگردوں کا انبوہ ہے اور نہ کسی رئیس کی سرپرستی۔ کوئی عظیم الشان کتب خانہ بھی ان کے اردگرد نہیں ہے اور نہ ان کو امیر مینائی کا سا فن شعر میں تبحر ہے۔ اشاعت کی دشواریاں بھی سنگ راہ ہیں۔ ان کے پاس نہ کوئی دفتر ہے اور نہ مطبع۔ اگر بفرض محال یہ لغت مولانا کی زندگی میں مکمل بھی ہو جائے تو وہ اس کی طباعت اور اشاعت کا بارگراں برداشت نہیں کر سکتے لہذا یہ کوشش فضول و سعی لاحاصل ہے۔

مولوی نور الحسن کی ہمت بھی عام رائے سے متاثر ہو کر پست ہوئی۔ ریاست حیدر آباد سے امداد کے لئے سلسلہ جنبانی کی مگر وہاں سے کچھ جواب نہ آیا۔ خود دکن جانے کا ارادہ کیا مگر وکالت کی مصروفیاں دامنگیر ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۱۰ء سے تالیف لغت کا عزم فسخ کر دیا گیا۔ مکتوب مورخہ ۲ مارچ ۱۹۱۰ء میں لکھتے ہیں کہ "دسمبر سے لغت کا کام بالکل بند ہے۔ صحت اس قابل نہیں ہے کہ دن رات کی محنت برداشت کر سکوں اور محنت بھی وہ جس کا صلہ ملنے کا دین و دنیا میں کہیں آسرا نہیں۔"

ہردوئی سے بیزاری — دو تین سال کا مشغلۂ دلچسپی یکا یک چھوڑنا بھی سہل نہ تھا۔ طبیعت اُداس رہنے لگی مزاج مکدر ہوا اور پیشۂ وکالت سے دل اُچاٹ گیا۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں ایک ہم عصر ہندو وکیل سے نزاع ہوئی۔ معاملہ خفیف تھا لیکن یہ دل برداشتہ اور پراگندہ خاطر تھے وکالت سے کنارہ کش ہونے کا تہیہ کر لیا۔

منشی محفوظ علی ڈپٹی کلکٹر کا نام ان اوراق میں پہلے آچکا ہے وہ اب ملازمت سے دستکش ہو چکے تھے۔ بیشتر لکھنؤ میں رہتے اور کبھی ہردوئی میں بھی اقامت فرماتے تھے۔ انھوں نے مولانا کی آزردگی اور کبیدگی دیکھ کر حیدر آباد میں قسمت آزمائی کی صلاح دی۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی رئیس بھیکن پور ضلع علیگڈھ ریاست حیدر آباد میں امور مذہبی کے صدر تھے۔ حضور نظام کی

سرکار میں قدر و منزلت تھی ارا کین ریاست ادب و احترام کرتے تھے۔ منشی محفوظ علی سے قدیم تعلقات تھے۔ لکھنؤ تشریف لاتے تو ان کے برادر زادہ منشی احتشام علی (خلف منشی امتیاز علی سابق وزیر بھوپال) کی کوٹھی میں مہمان ہوتے تھے۔ اُن کے وسیلے سے حیدرآباد میں کامیابی کے سبز باغ دکھائے

مولوی نور الحسن کے عزیز اور لڑکپن کے دوست سید ظہور الدین[۵] احمد وہیں ڈسٹرکٹ ججی کے عہدے پر سرفراز تھے اُن سے بھی اعانت کی توقع متصور ہوئی اور یہ خیالات اس قدر راسخ ہوئے کہ اعزہ واقربا سے مشورہ کیے بغیر حیدرآباد جانے کا مستقل ارادہ کر دیا۔ ادبی کتابوں کا ذخیرہ بکسوں میں بند کرا کے سید ظہور الدین کے پاس دکن روانہ کیا۔ قانونی کتابیں مولوی محمود الحق وکیل اور بعض دوسرے احباب کو دیں۔ اسباب خانہ داری کچھ حیدرآباد روانہ کیا اور کچھ لکھنؤ۔ بقرعید کے دن (ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) عیدگاہ میں الوداعی تقریر کی۔ انجمن اسلامیہ کا کاروبار مولوی محمود الحق کے سپرد کیا۔ مولوی طاہر محسن اور

---

۵ سید ظہور الدین احمد بن سید نور الدین احمد از اولاد ملک العلما مفتی عبد السلام ساکن دیوہ ضلع بارہ بنکی۔ شاہ رحیم با سط نبیرہ شاہ محمد کاظم قلندر آپ کے نانا تھے۔ کاکوری میں بتاریخ ۱۴ شعبان ۱۲۸۲ھ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کاکوری میں پائی اس کے بعد مین پوری میں کچھ عرصہ تک مولوی نور الحسن کے ہم سبق رہے۔ مولوی ہدایت علی بریلوی سے یہ بھی عربی پڑھتے تھے۔ ابتداءً مین پوری میں اور بعد ازاں الہ آباد میں انگریزی پڑھی۔ سلسلۂ تعلیم ختم نہ ہوا تھا کہ حیدرآباد جا کر ملازم ہو گئے۔ تقریباً چالیس سال وہاں قیام رہا۔ مدت تک ہائیکورٹ کے رجسٹرار رہے اس کے بعد ڈسٹرکٹ جج مقرر ہوئے اور تین سال تک صوبہ اورنگ آباد کے اڈیشنل سشن جج رہے۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ کو نیکنامی اور عزت سے پنشن لے کر وطن آئے۔ آپ کی کارگزاری۔ دیانت داری اور راستبازی کے اہل دکن مداح رہے۔ شعر و سخن سے ذوق اور ظہور تخلص ہے۔ مفتی اکرام اللہ افسوں کاکوروی کے تلمذ تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

صورت و سیرت میں اتنا فرق بھی دیکھا نہیں　　　پھول چہرہ آپ کا پتھر کلیجہ آپ کا
کیا مزے تھے جب حسینوں میں گذرتی تھی ظہور　　　یاد ہیں وہ دن وہ راتیں وہ زمانہ آپ کا

آئینہ رکھ کے سامنے اپنے　　　آپ اپنا وہ بت حجاب ہوا
چاہ زنداں کہاں کہاں یوسف　　　حسن بھی جان کا عذاب ہوا
وہ ملے بھی تو کب ملے جس وقت　　　مجھ سے رخصت مرا شباب ہوا
منحصر یک تصور یہ رہا کام اپنا　　　ہم وقاصد نہ کبوتر نہ صبا رکھتے ہیں
کچھ بھی ہو وصل کا وعدہ ہو کہ دیدار کا ہو　　　وہ ہر اک بات قیامت پہ اٹھا رکھتے ہیں
جب کہا اُن سے کہ مرتا ہے ظہور　　　بولے اپنے فعل کا بھگتا رہے

منشی محب الرحمٰن (صاحبزادۂ منشی عبدالوحید نیرنگ) اُس زمانہ میں ہمراہ تھے اُن کو ساتھ لے کر ہردوئی سے کوچ کر دیا۔ یقین تھا کہ مولوی انوارالحسن حیدرآباد کے سفر سے مخالفت کریں گے اس لیے کاکوری تشریف نہیں لائے بلکہ براہ راست لکھنؤ پہونچے اور منشی احتشام علی کی کوٹھی میں مسافرانہ مقیم ہو گئے۔ ایک عزیز نے تبدیل مقام کا سبب دریافت کیا تو جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"دعا۔ نوراللغات کی تکمیل کی خواہش حیدرآباد کے سفر کا باعث ہے۔ کیا عجب ہے کہ دوسرے عشرۂ محرم میں یہاں سے روانہ ہو سکوں۔ اس سفر کے نتیجہ کے بعد یہ طے کیا جائے گا کہ آئندہ قیام کہاں ہوگا اور کیا مشغلہ رہے گا۔ تمہاری رائے دریافت کرنے کا مشتاق ہوں۔ ایک عزیز بھائی کی خلوص محبت میں ڈوبی ہوئی رائے ہر وقت قابل قدر ہے۔ میرے ان افعال کی محرک کیا چیز ہوئی اس کا جواب حسب ذیل ہے

صبح پیری کی چلی ٹھنڈی ہوا نیند آنے کا زمانہ آگیا

نورالحسن۔ ۳؍اکتوبر ۱۹۱۸ء"

مولوی انوارالحسن نے بھائی کو اس دور و دراز سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ راقم الحروف کسی وجہ سے وطن آیا تھا اُس نے بھی عاجزی سے عرض کی کہ سن شریف اس سفر کے قابل نہیں ہے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں حیدرآباد کی آب و ہوا خراب ہوگئی لہٰذا سفر چند روز کے لیے ملتوی کیا گیا۔ منشی مقبول علی نے بھی اس تجویز سے اختلاف کیا تھا ان کو جواب میں لکھا۔

"دعا۔ تمہارا خط آیا۔ اس سفر کا قصد پارسال بھی ہوا تھا لیکن ہردوئی کی وکالت کے تعلقات نے نہ چھوڑا۔ اب حیدرآباد کی آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے چند روز قصد ملتوی کرنا پڑا۔ میں یہاں مسافرانہ زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس وجہ سے یکسوئی خاطر مفقود ہے۔ دیکھیے آب و دانہ کی کشش کب حیدرآباد لے جاتی ہے۔ وہاں کے متعلق ہنوز کوئی رائے قائم نہیں کی ہے۔ توکلاً علی اللہ قصد کیا ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ہردوئی اور کاکوری میں مختلف قسم کی افواہیں میری نسبت اڑ رہی ہیں جن کی واقعیت سے قطعاً ناواقف ہوں۔ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی رباعی وردِ زبان ہے۔

روئے سیہ و موئے سپید آوردم چشم گریاں قدے چو بید آوردم
تو خود گفتی کہ ناامیدی کفر است فرمان تو بردم و امید آوردم

نورالحسن۔ لکھنؤ۔ نظیرآباد۔ کوٹھی منشی احتشام علی صاحب۔ جمعہ۔ ۲۵؍اکتوبر ۱۹۱۸ء"

المختصر لکھنؤ میں قیام تھا اور اپنے سسر منشی محفوظ علی کے مہمان تھے۔ منشی مقبول علی نے لکھا کہ آپ بجائے لکھنؤ کے کاکوری میں رہیں تو زیادہ دلچسپی ہوگی جواب[1] میں تحریر فرمایا:۔

"یہ تم نے خوب لکھا کہ کاکوری میں دلبستگی کا سامان بمقابلہ لکھنؤ کے بہت ہے۔ اب سے بیس پچیس سال پیشتر تو میں بھی یہی کہتا تھا۔ اب خدا جانے کاکوری میں کیا وحشت برستی ہے کہ کسی کا دل نہیں لگتا۔ اور میں تو اس زمانہ میں کاکوری ولکھنؤ دونوں مقامات پہ گھبراتا ہوں لیکن اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ کاکوری میں قیام کا قصد نہیں ہے۔ دیکھئے مشیت ایزدی کیا ہے اور آب ودانہ کہاں کا ہے۔ حیدرآباد کا قصد بوجہ وہاں کی خرابی آب وہوا کے ملتوی ہے۔ وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد۔"

موسم سرما کا ابتدائی حصہ حیدرآباد کی روداد آب وہوا دفع ہونے کے انتظار میں گذرا۔ منشی محفوظ علی کے مشورے سے بعض اراکین ریاست کو نوراللغات کی اعانت کے لئے خطوط لکھے تھے اُن کے جواب کا راستہ دیکھا مگر دکن سے صدائے برنخاست۔

قاصدا تو ہی بتا تو نے تو دیکھے ہونگے　　کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کا جواب آتا ہے

مولوی انوارالحسن نے اصرار کیا کہ بھائی کاکوری میں تشریف رکھیں۔ مولانا کو بھی زیادہ مدت تک منشی محفوظ علی پہ بار ڈالنا بارخاطر تھا۔ حیدرآباد کے سفر کی ساعت نہ آتی تھی۔ وکالت چھوٹ چکی تھی۔ لہذا طے کیا کہ فی الحال کاکوری میں قیام ہو اور نوراللغات کی باقاعدہ ترتیب شروع کی جائے جب حیدرآباد سے کوئی امید افزا پیام آگیا تو وہاں کا سفر کیا جائے گا ورنہ اشاعت لغت کی خدا کوئی اور سبیل نکالے گا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۱۶ء سے وطن مالوف میں سکونت اختیار کی۔

کاکوری کا عارضی قیام مولوی انوارالحسن وکالت سے کنارہ کش ہو کر کاکوری میں خلوت نشین ہوئے تھے اور زندگی کا بقیہ حصہ یاد خدا میں صرف کرنے کی نیت تھی مگر حکام ضلع نے ۱۹۱۱ء میں آنریری مجسٹریٹی سپرد کر دی اور اعزہ کی فہمائش سے اُن کو باوجود ہرج اوقات کے یہ خدمت منظور کرنا پڑی۔ منشی فخرالحسن رئیس کاکوری شریک خدمت بنائے گئے اور باقاعدہ اجلاس ہونے لگے۔ یہ کچہری چار پانچ برس سے قائم تھی اور موروثی کوٹھی کے مغربی دالان میں صبح کے وقت مقدمات کی پیشی ہوتی تھی۔ مولوی نورالحسن نے کاکوری میں قیام منظور کیا تو اسی کوٹھی کے مشرقی دالان میں اُن کا دفتر سجایا گیا۔ دن کے وقت وہاں کام کرتے اور شب کو برآمدہ میں استراحت فرماتے تھے۔

---

[1] مکتوب مورخہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۵ء۔

لغت کی ترتیب شروع ہوئی۔ ۲۰ر مئی ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں :—

"میں لغت میں مصروف ہوں۔ دم مارنے کی فرصت نہیں پاتا ہوں۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی لیکن یہ صحیح ہے کہ لغت کی دُھن میں طبیعت ہر وقت اسی خیال میں رہتی ہے دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ کاکوری میں دلچسپی خدا جانے کون خوش نصیب ہیں جن کو نصیب ہوتی ہے۔ میں مجبوری سے یہاں ہوں اور اس درجہ تالیف لغت میں انہماک ہے کہ مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میں کاکوری میں ہوں یا ہردوئی میں۔ سچ یہ ہے کہ نہ وہ دن رہے نہ وہ ہم رہے۔ کاکوری کا مذاق اور، میرا مذاق اور۔ پھر دلچسپی اور تفریح کیونکر ہو۔ زمانہ بدل گیا۔ مذاق بدل گیا۔ اب تو کاکوری کا باوا آدم نرالا ہو گیا ہے۔"

مولوی نظیر الحسن مرحوم کے صاحبزادے نبی حسن مولانا کی ولایت اور تربیت میں تھے۔ طاہر حسن بھی ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے اور ان دونوں کی تعلیم میں کسی قدر وقت صرف ہوتا تھا۔ ان کے استفادہ کے لئے سلیس عبارت میں "صرف" کے وہ قواعد نظم کئے جن کے بغیر عربی عبارت نہیں پڑھی جا سکتی۔ ہر قاعدہ کے ساتھ مثالیں بھی نظم کیں اور اُس کی تشریحات نثر میں لکھیں۔

جون کی گرمی اور ماہ صیام ایک ہفتہ میں یہ ہوا ہے کام
طلبہ شوق سے جو یاد کریں فاتحہ سے مجھے بھی شاد کریں

"تعلیلات منظوم" اس رسالہ کا نام رکھا۔ تالیف نہایت مفید ہے اور اس قابل ہے کہ پنج گنج پڑھنے والے طلبہ کو حفظ کرائی جائے۔

رمضان کا مہینہ اور سخت گرمی کا موسم۔ ۲۵ر جون ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں :—

"ایک ہفتہ سے وہ گرمی پڑ رہی ہے کہ الامان الحفیظ۔ خدا معلوم سورج کب کے جلے پھپھولے پھوڑتا ہے۔ ہوا کے حبس سے دم بند ہے۔ پسینے کے تراڑے جھڑی لگائے ہوئے ہیں۔ بادل نے وہ سون کھینچی ہے کہ پناہ بخدا۔"

اگرچہ لغت کی فکر سے فرصت نہ تھی اور شب و روز کے لئے مشغلۂ دلچسپی موجود تھا لیکن کاکوری کا قیام پسند نہ آیا۔ یکم ستمبر ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں لکھا تھا :—

"قیام وطن کے ساتھ ساتھ ہر کہ پابند وطن شد بکشد آزارہا کا تجربہ ہو رہا ہے۔"

۱۹۱۰ء ۱۵ر دسمبر کو تحریر فرمایا کہ :—

"دلم چو قبلہ نما فارغ از تپیدن نیست بعالمیکہ منم رسم آرمیدن نیست"

مندرجۂ ذیل غزل اسی دور کی بے چینی کی یادگار ہے :۔

کیا جائیے کیا کہہ گئے وہ ترچھی نظر میں　　اک ٹیس سی اٹھتی ہے مرے زخم جگر میں
وہ وعدے کی شب بزم میں غیروں کی جبے ہیں　　ہم سانس کی صورت کبھی باہر کبھی گھر میں
دو گھر ہوئے آباد تری ایک نگہ سے　　اک تیر مرے دل میں ہے اک تیر جگر میں
تم بند کیے آنکھیں پڑے رہتے ہو نیرؔ　　پنہاں تو نہیں پردہ نشیں کوئی نظر میں

مولوی احسن اللہ خاں ثاقب۔ آگرہ کے رہنے والے۔ مولوی نصر اللہ خاں صدر الصدور کے صاحبزادے۔ مولوی محمد محسن کے قدیم شاگرد۔ امیر مینائی سے فن شعر میں تلمذ۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے نیازمند۔ رسالہ قند پارسی کے اڈیٹر "خطوط منشی امیر احمد" کے جامع۔ فارسی نثر و نظم کے دبیر کامل۔ گوالیار کالج میں پروفیسر تھے۔ مولوی نور الحسن سے دیرینہ مراسم تھے۔ کاکوری تشریف لائے۔ اپنا کلام سنایا۔ مولانا کی نازک خیالیوں کی داد دی اور تالیف لغت کا حوصلہ بڑھایا۔

حضرت ریاض خیر آبادی۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد۔ امیر مینائی کے حاشیہ نشین "خمریات" کے بادشاہ فن شعر میں مرتبۂ استادی رکھتے تھے۔ مولوی نور الحسن سے قدیم شناسائی تھی۔ لغت کی بابت باہم خط و کتابت ہوئی تھی۔ نمونۂ نور اللغات نظر انور سے گذرا تھا اس زمانہ میں کاکوری آئے۔ محاورات و مصطلحات کے متعلق قیمتی مشورے دیے۔ اُن کے بھائی سید محمد عسکری وسیم خیر آبادی نے بھی قدم رنجہ فرمایا اور کئی مہینہ تک دفتر نور اللغات کے منتظم رہے۔

حرف الف کے مفردات و مرکبات جمع ہو چکے تھے اور اُن کے معانی مع اسناد کے لکھے جا چکے تھے لیکن جب طباعت کی دشواریوں پر نظر جاتی تھی تو ہمت پست ہو تی تھی۔ فرماتے تھے کہ "لغت کی اشاعت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کا خاص پریس ہو۔ دفتر کا کام باضابطہ جاری رہے نقادان سخن مدد دیتے رہیں۔ ایک ایک حصہ ترتیب پا کر اُن کی نظروں سے گذرتا جائے اور زیور طبع سے آراستہ ہو کر ملک کے ہاتھوں میں پہونچتا جائے"۔

۲۴ مارچ ۱۹۰۸ء کو اپنے صاحبزادے مولوی حامد حسن کی فرنگی محل میں شادی کی اور ۱۱ اپریل کو اپنی چھوٹی صاحبزادی کا (جس کو اُن کی ماں شیر خوارہ چھوڑ گئی تھیں) نبی حسن خلف مولوی نظیر الحسن کے ساتھ عقد کیا۔ ان رسوم سے فراغت کے بعد لغت کی اشاعت کے لئے پریس خریدکرنے اور مطبع قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ خیال تھا کہ چھاپہ خانہ کاکوری میں کھولا جا سکتا ہے لیکن خیر اندیشوں نے اس تجویز میں دشواریاں بتائیں اور بالآخر طے ہوا کہ مطبع کے لئے لکھنؤ ہی مناسب ہے۔

۱۸ر جون ۱۹۲۰ء کو اراکین انجمن اسلامیہ کے اصرار سے ہردوئی تشریف لے گئے۔ رمضان کا آخری جمعہ تھا۔ جامع مسجد کے امام نے خطبہ میں الوداع پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور بعض جہلا سمجھتے تھے کہ بغیر الوداع اور الفراق کی تکرار کے ماہ مبارک رخصت ہی نہیں ہو سکتا۔ لہذا ایک وفد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کو امامت کے لئے ہمراہ لے گیا۔ راقم الحروف اُس وقت ہردوئی میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ غریب خانہ پر فرکش ہوئے۔ جمعہ کی نماز پڑھائی۔ ماہ رمضان کو عزت و تکریم سے وداع کیا۔ شام کو رویت ہلال ہوئی۔ دوگانہ عید کی امامت کے لئے ایک شب اور قیام کرنا پڑا۔ اُن کے قدوم کی برکت سے راقم نے رات کے وقت مین پوری کے قطب الاقطاب حافظ محمد عارف کو (جن کا تذکرہ کتاب کے ابتدائی حصہ میں آچکا ہے) خواب میں دیکھا۔ اُن کے قدموں پر سر رکھ کر عالم غفلت میں خوب رو دیا اور کہتا جاتا تھا کہ

کافر ہو جو سجدہ کرے بت خانہ سمجھ کر   سر رکھ دیا ہم نے در جانانہ سمجھ کر

علی الصباح بیدار ہوا تو گریۂ شب کا اثر باقی تھا۔ اُسی وقت مولانا سے خواب کا ماجرا بیان کیا فرمایا کہ "یہ خواب بہت مبارک ہے اور اس کا ثمرہ انشاء اللہ جلد ظاہر ہوگا۔" استاد کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی لیکن اُس کی تفصیل کی اس مختصر میں گنجائش نہیں۔

۲۰ر جولائی ۱۹۲۰ء کو مولانا کی چچی یعنی بیوۂ مولوی محمد احسن مرحوم کا انتقال ہوا۔ مولانا کی دو صاحبزادیاں اُن کی نگرانی میں رہتی تھیں۔ مولوی احمد حسن اور حامد حسن کی خاطر داری اور دل نوازی بھی وہی خوب فرماتی تھیں۔ اس سانحہ سے بہت قلق ہوا اور افکار و تردّدات میں اضافہ ہو گیا۔ ہفتہ عشرہ سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اشتداد مرض کی خبر سُن کر کاکوری آ گئے تھے۔ تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد پھر وہیں چلے گئے۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۲۰ء کو لکھتے ہیں :—

"چچی مرحومہ کے انتقال سے ایک فکر اور اضافہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو غریق رحمت کرے اور ہم لوگوں کو اطمینان قلب اور یکسوئی خاطر عطا فرمائے۔ نور اللغات کا کام جاری ہے۔ مطبع کی اجازت مل گئی ہے۔ اس کے اجرا کے انتظامات میں مصروف ہوں۔ اگست میں اس کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔"

۲۴ر اگست ۱۹۲۰ء کو بقر عید (ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ) کی نماز پڑھانے کے لئے آخری مرتبہ ہردوئی آئے احباب سے بیان کیا کہ عنقریب "نور المطابع" کا کام شروع ہو جائے گا اور ایک ماہوار رسالہ "گلچیں" یکم اکتوبر سے جاری ہوگا جس کے ساتھ دو ایک جزو نور اللغات کے بھی سلسلہ وار شائع ہوتے رہیں گے۔

شب کو مولوی محمود اسحق وکیل کے یہاں دعوت تھی۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے راہ میں راقم سے کہا کہ "میں ایک مطبع بڑے پیمانہ پر قائم کرنا چاہتا ہوں جس میں نور اللغات کی طباعت کے علاوہ شہر کا متفرق اُجرتی کام بھی انجام پا سکے اور خاندان کے ناکارہ لڑکوں کے لئے کسب معاش کا حیلہ ہو۔"

قیصر باغ میں سکونت | دوسرے روز لکھنؤ تشریف لے گئے۔ منشی احتشام علی کی کوٹھی میں مقیم ہوئے اور مستقل سکونت کے لئے ایک وسیع مکان کی جستجو شروع کی جس میں مطبع اور کارپردازان مطبع کے لئے کافی جگہ ہو اور خود بھی مع اہل وعیال کے آسائش سے رہ سکیں۔ بڑی تلاش اور کوشش سے قیصر باغ میں چودھری نصرت علی تعلقدار سندیلہ کے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر ملا۔ مشین خرید کی گئی۔ مطبع جاری ہوا۔ بجائے "نور المطابع" کے "نیر پریس" نام رکھا گیا۔ رسالہ کا نام بجائے "گلچیں" کے "ادیب اردو" قرار پایا اور طے ہوا کہ یکم جنوری ۱۹۲۱ء کو رسالہ کا پہلا پرچہ شائع کیا جائے۔

مولوی حامد حسن نے سلسلۂ تعلیم ناتمام چھوڑ کر تجارت کا شوق ظاہر کیا تھا اور ایک دکان اسٹیشنری کی نظیر آباد میں قائم کر کے نقصان اٹھا چکے تھے وہ نیر پریس کے منیجر مقرر ہوئے۔

نبی حسن اور طاہر محسن تعلیم و تربیت کے لئے ہمراہ تھے اب راقم کے بڑے لڑکے مشیر احمد کو بھی جو اس وقت انٹرنس کلاس میں پڑھتا تھا اپنی نگرانی میں لیا اور ارشاد فرمایا کہ یہ بھی نبی حسن اور طاہر محسن کے ساتھ رہا کرے۔

غرض ستائیس برس کے بعد قیصر باغ کے پر فضا مقام پر دوبارہ سکونت نصیب ہوئی۔ بالائی منزل میں زنانخانہ تھا۔ نیچے مطبع اور نور اللغات کا دفتر۔ مولوی نظیر الحسن زندہ نہ تھے لیکن اُن کا لخت جگر آنکھوں کے سامنے تھا۔ امیر احمد دور تھا لیکن اُس کا نور نظر قائم مقام تھا۔ بھائی ساتھ نہ تھے لیکن دو صاحبزادے (حامد حسن اور طاہر محسن) خدمت میں حاضر تھے۔ کورس تیار کرنے کی ضرورت باقی نہ تھی لیکن دواوین اور لغات کی ورق گردانی اس کی جگہ تھی۔ کالج میں حاضری درکار نہ تھی لیکن محاورات کی چھان بین کے لئے مشاہیر لکھنؤ سے ملاقات کی حاجت تھی خیال تھا کہ قیصر باغ کی سکونت ویسی ہی دلچسپ ہوگی جیسے ۱۸۹۳ء و ۱۸۹۴ء میں تھی لیکن نیت الشباب بعوجہ کتاب زندگی کی تیس بتیس ورق الٹ چکے تھے۔ جوانی رخصت ہوئی۔ بڑھاپا آیا۔ خیالات میں انقلاب ہوا۔ نہ وہ دل رہا نہ وہ طبیعت۔ نہ وہ درخشاں امیدیں تھیں نہ وہ بلند ہمتیں۔ روح کی فرحناکی اور خاطر کی شادمانی کافور ہو چکی تھی۔

جگ سارا سونا ہے آنکھوں کا کیا حال ہوا   دنیا آگے بستی تھی دنیا اب بھی بستی ہے

مذہب "لاادریت" کی زد میں

(از جناب سید اختر علی صاحب تلہری)

اگرچہ "تحریک اصلاح عیسائیت" ریفارمیشن کے بانی لوتھر نے جرمنی میں پاپائیت کا اقتدار مٹانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اُس کی تحریک کو "آزادانہ غور و فکر" سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ وہ ایک نوعیت کے توہمات و تعصبات کو مٹا کر دوسری نوعیت کے توہمات و تعصبات قائم کرنا چاہتا تھا لوتھر کے متبعین پروٹسٹنٹ کہے جاتے ہیں۔ کیتھولک عیسائیوں کی طرح اُن کے تبلیغی کارناموں سے بھی خون کی بو آتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جرمنی کے اس مذہبی مصلح کی جد و جہد نے "پاپائی مسیحیت" کے خلاف عیسائیت کو ضرور اُبھار دیا تھا اور اس پہلو سے جرمنی میں بھی "فکری قوتوں" کی کچھ نہ کچھ جلا شروع ہو گئی تھی مگر "عقلیت" کے نقطۂ نظر سے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی البتہ اٹھارھویں صدی سے جرمنی نے بھی "آزادانہ غور و فکر" کے راستہ پر چلنا شروع کر دیا اور مخالف مسیحیت خیالات کی نشر و اشاعت شروع ہو گئی مگر عقلیت کے اس پودے میں ابھی تک نئے برگ و بار پیدا نہیں ہوئے تھے فرانسیسی و انگلیسی افکار ہی کے خرمن سے خوشہ چینی کی جا رہی تھی۔ ہیوم اور برکلے ہی کے نظریات کا ہر طرف زور تھا۔ "انکار مادہ" اور "شک و ارتیاب" ہی کی آوازیں علم و دانش کے حلقوموں سے نکل رہی تھیں۔ عیسائیت نے فکر و نظر کی ان جولانیوں کے خلاف قید و بند کے اسلحہ اُٹھا لئے تھے ان کے نازک مذہبی جذبات ان فکری بے باکیوں کے کیونکر روادار ہو سکتے تھے۔ عین اُس زمانہ میں کہ جب جرمنی میں ایک طرف "آزادیِ خیال" نشو و نما پا رہی تھی اور دوسری طرف "عیسائیت" اُس کا گلا گھونٹنے کے لئے آستین اُلٹ چکی تھی۔ جرمنی کے مشہور مفکر و حکیم کینٹ نے دنیائے فکر و نظر میں قدم رکھا۔

اُس وقت خطرہ کی بڑی چیز ہیوم کے "ارتیابی نظریے" تھے جو علت و معلول کے تخیل کی جڑیں کاٹ چکے تھے اور اُن تمام چیزوں کو جن میں ہمیں علت و معلول کی کارفرمائی نظر آتی ہے اتفاقیات کا ایک انبار قرار دے چکے تھے۔

ہیوم نے اس مقصد کے اثبات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ ایک دوسرے کے بعد بالالتزام واقع ہونے والی چیزوں میں "تعلیلی لزوم" نہیں پایا جاتا۔ ہوتا یہ ہے کہ چند چیزوں کے بار بار

ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے رہنے سے دماغ اُن میں علاقہ ضرورت یعنے پہلا دوسرے کی علت ہے اور اس لئے پہلے کے وجود کے بعد دوسرے کا واقع ہونا ضروری ولازمی ہے فرض کرلیتا ہے لیکن حقیقت میں ایک کا دوسرے کے بعد واقع ہونا کوئی چیز سبب ومسبب علت و معلول کی قسم کی ان میں نہیں پیدا کر دیتا۔

ہیوم نے "علاقہ تعلیل" کا انکار صرف مادی دنیا تک محدود نہیں رکھا بلکہ "روح وارادہ" کے افعال تک اُس کی زد میں سے لئے۔

کینٹ ہیوم کی اس "ارتیابیت" کا تار و پود بکھیرنے کے لئے اٹھا تھا اور اس لئے اس کے فلسفہ سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اُن زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا کام دے گا جو "ارتیابیت" نے مذہب کے دل میں ڈال دیے تھے لیکن ستم ظریفی دیکھئے کینٹ کے فلسفہ نے "ارتیابیت" کو ہٹا کر اس کی جگہ "لاادریت" کو دے دی اور اس طرح اُس نے مذہب کے خلاف ایک دوسرا طاقتور حریف پیدا کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ کینٹ نے اپنے "ماورار التجربی" (Transcendental) دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ دنیا کی بہت سی چیزوں میں "علاقہ تعلیل" پایا جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اُس نے ہمارے علم کو حقیقت سے عاری بنا ڈالا اور اُسے صرف ایسی چیز قرار دیدیا جو مشابہ بعلم ہے اور اس طرح خطرناک لاادریت کا سنگ اساس رکھ دیا۔

ہیوم نے مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ اگر ایک چیز کے بعد دوسری چیز برابر غیر منقطع طور سے واقع ہوتی ہے تو اس سے علاقہ تعلیل کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا کیونکہ ہمارا علم مختلف احساسات کا نام ہے اور ان احساسات میں کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ ایک کا دوسرے کے بعد واقع ہونا محض اتفاقی امر ہے۔

کینٹ نے ہیوم کا یہ دعوےٰ تو مان لیا کہ یہ احساسات فی الواقع ہمیں اشیا میں "علیت و معلولیت" کا پتا نہیں دے سکتے اور اس لئے اگر ہمارے ادراکات کلیۃً صرف انھیں احساسات کا نتیجہ ہوتے اور ہم انھیں کے پابند ہوتے جو ان خارجی اشیا کے ذریعے ہم تک پہونچتی ہیں تو فی الحقیقت یہاں حقیقی علیت موجود نہیں ہوسکتی بلکہ وہی کیفیت ہوگی جس پر علیت کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن اگر اس کے برخلاف واقعات سے مجبور ہو کر ہم کچھ چیزوں میں "علاقہ علیت" تسلیم کرتے ہیں تو اسے ماننا پڑے گا کہ ہمارے کچھ ادراکات ایک باطنی ذات (Subject) کی بھی ممنون ہیں۔ احساسات کی، نیا خالص اتفاقی

چیزوں کا مجموعہ سہی لیکن پھر بھی غیر محدود احساسات ہی تو ہمارے علم کی پوری کائنات نہیں ہیں۔ ہم جس دنیا کو جانتے ہیں وہ اپنے علاقۂ عینیت کے قوانین کی خاطر ایک دماغ کی پابند ہے۔

سابق کے فلسفیوں کے برخلاف وہ انسانی دماغ کو اشیا کے لئے گودام نہیں مانتا بلکہ اُس کی نظر میں خارجی اشیاء (Objects) "دماغ سے رابطہ علیت کے وہ اصول جو انھیں قابل ادراک بناتے ہیں اخذ کرتی ہیں۔ کینٹ نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ نظر ڈالی ہے لیکن اس کی ان فلسفیانہ ژرف نگاہیوں کا یہ نتیجہ بہر حال نکلتا ہے کہ جو دنیا ہمارے سامنے موجود ہے وہ واقعی دنیا نہیں ہے جسے ہم جاننا چاہتے ہیں۔ حقیقی دنیا کا اسے ایک ظل یا شبح سمجھئے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہم کسی امکانی طریقہ سے یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ یہ ہماری "ظلی دنیا" حقیقی دنیا سے کیا تعلق رکھتی ہے ؟۔

کینٹ نے اس عنوان سے یہ تو ثابت کر دیا ہے کہ ہماری دنیا میں بہت سی اشیا "علت و معلولیت" کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہیں اور اس طرح ہم ہیوم کی "ارتیابیت" کے جال سے بچ کر ضرور نکل جاتے ہیں لیکن فائدہ؟ کینٹ کے بنائے ہوئے "حلقہائے دامِ خیال" سے تو نجات نہیں ہوتی۔ وہ بھی تو ہمیں یہ منوانا چاہتا ہے کہ ہم جن چیزوں سے بحث کر رہے ہیں وہ حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ صرف ہمارے تصورات کا کھیل ہیں۔ جن کو ہمارے باطنی حاسہ (Mind) نے وجود بخشا ہے۔ کینٹ ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"تمام چیزیں جن میں ہم مصروف رہتے ہیں بغیر کسی استثنا کے مجھی میں موجود ہیں یعنی میری ذات کے مختلف "شؤن وارادات" ہیں "

گویا ہیوم کے برخلاف کینٹ کی دنیا "باطنی ہے یا دماغی"۔

مگر اس میں بھی شک نہیں کہ کینٹ نے جو دنیا بنائی ہے اس سے بھی اُسی قدر حقیقت مفقود ہے جس قدر کہ ہیوم کی دنیا سے اور اس لئے ہیوم کی "ارتیابیت" مذہب کے "مابعد الطبعیاتی افکار" کو جتنا صدمہ پہونچا رہی ہے اتنا ہی کینٹ کی "لاادریت" بھی۔

اگر ہیوم نے خدا کا اور معجزات کا اپنے ارتیابی رنگ میں انکار کیا ہے تو کینٹ نے بھی اپنے ان نظریات کے ذریعہ "مذہبی تخیل" کو کوئی قوت نہیں پہونچائی ہے۔ کینٹ بھی اس امر کے اثبات میں منہمک نظر آتا ہے کہ ہم جب عقل کی مدد سے خدا کا وجود اور روح کی قدامت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو متضاد باتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ "مابعد الطبیعیاتی حیثیت" سے خدا کا انکار کر دینے کے بعد "فلسفۂ اخلاق" کی خاطر اُس نے پھر خدا کا وجود مان لینا چاہا ہے اسی لئے اُس کے متعلق یہ ظریفانہ فقرہ مشہور ہو گیا ہے کہ "جس خدا کو اُس نے سامنے کے صدر دروازہ سے نکال دیا تھا اُسے پھر عقبی دروازہ سے اندر داخل کرنا چاہا ہے"۔ لیکن اس زبردستی کے فرض و تسلیم سے مذہب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

کینٹ کے فلسفہ کا حقیقی منشا خواہ "لاادریت" کی براہ راست حمایت نہ ہو لیکن بعد میں جو اُس کے مقلدین ہوئے ہیں اُنھوں نے اُس کے فلسفہ کا خصوصی امتیاز اسی "لاادریت" کی حمایت قرار دیا ہے۔

لینگ (Lange) "تاریخ مادیت" کا مصنف جدید مقلدین کینٹ کا جرمنی میں میر کارواں تھا۔ اُس کا اور اُس کے فاضل ہمسفیروں کا خیال ہے کہ حکیم کینٹ کے کریٹک کی خاص کامیابی یہ ہے کہ اُس نے ہماری لازمی جہالت کی حدیں مقرر کر کے "مابعد الطبیعیاتی ہوتے" کا آخری طور سے خاتمہ کر دیا ہے۔

اضافیت علم کا نظریہ | کینٹ نے "اضافیت علم" (Relativity of Knowledge) کے نظریہ سے جس انداز میں بحثیں کی ہیں حقیقت میں اُن سے لینگ ہی کے اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے کہ حکیم کینٹ کے فلسفہ کا اصلی محور "لاادریت" ہے۔

کینٹ نے "اضافیت علم" کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اُس کے سابق کے خیالات ہی پر متفرع ہوتا ہے۔

کینٹ نے مختلف مقامات پر اس نظریہ کے متعلق جن الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے اُن پر غور کیجئے۔ ایک جگہ کہتا ہے :—

"اشیاء کی حقیقت من حیث ہی ہی، بغیر اس لحاظ کے کہ ہمارے حواس اُن کا ادراک کرتے ہیں کیا ہے ؟ ہمیں اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا ہم اپنے خاص احساس کی نوعیت و کیفیت کے علم کے سوا جو ہمارے ہی ساتھ مخصوص ہے کچھ اور نہیں جانتے"

دوسری جگہ کہتا ہے :—

"ہم اپنے "تجربی احساس" کا اُس بلند ترین درجہ تک پہونچنا فرض کئے لیتے ہیں جو وضوح کی آخری امکانی حد ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اشیاء خارجی من حیث انفسہا (یعنے اپنی ذات میں جیسی وہ ہیں) کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں اپنے احساسات کے شؤن

وکیفیات کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارے معلومات جو احساس سے متعلق ہیں "اضافیات" سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور محض "اضافیات" کے ذریعہ سے کسی چیز کا من حیث ہو ہو علم نہیں ہو سکتا۔ حواس ظاہری ہمیں صرف اضافت (تعلق) کا پتا دیتے ہیں جو مدرک (ادراک کنندہ) اور مدرک (ادراک کردہ) کے مابین ہے لیکن اُس حقیقت اصلیہ کا علم نہیں ہو سکتا جس سے اس خارجی شے من حیث ہو ہو کا کالبد بنا ہے۔"

علم کے متعلق ہملٹن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ مباحثات (Discussions) میں کہتا ہے ا۔

"ہمارا تمام علم خواہ وہ ذہن سے متعلق ہو یا مادہ سے اضافی ہے۔ اشیا من حیث انفسہا کو خواہ وہ خارجی ہوں یا داخلی یا تو ہم بالکل نہیں جانتے یا اُن کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہمیں اُن کا کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ان غیر معمولی اشیا کے خارجی مظاہر سے تعلق رکھتا ہے۔"

میٹا فزکس میں یہی مفکر کہتا ہے :-

"ایک وجود کے ہم ہزاروں شئون فرض کر سکتے ہیں لیکن یہ سب شئون اُس وقت تک ہمارے لئے صفر (زیرو) کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک کہ ہم اتنے حواس نہ رکھتے ہوں جو ان سب شئون کا ادراک کر سکیں۔ لیکن اگر ان شئون وکیفیات کی تعداد کے برابر ہی ہمارے ادراک کرنے والے آلات بھی ہوں تو بھی ہمارا علم موجودہ حالات میں اضافی ہی ہوگا اور ہم ان وجودات من حیث ہی ہی کے متعلق اتنے ہی جاہل رہیں گے جتنے کہ اب ہیں۔"

عبارات بالا پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفکرین اپنے اس نظریہ کا نقطۂ آغاز اس امر کو قرار دیتے ہیں کہ ہمارے حواس خمسہ اشیا کے بے شمار شئون وکیفیات کا ادراک نہیں کر سکتے اور اگر ہمیں کچھ اور نئے حاسے میسر ہو جائیں تو انھیں چیزوں کے متعلق دوسرے شئون و کیفیات کا اندازہ ہو سکے گا جو اب تک ہم سے مخفی تھے لیکن اگر ہم ان مفکرین کے اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ خارجی اشیاء کے متعلق ہمارا علم مکمل نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری مخلوق ان اوصاف کے متعلق زیادہ علم رکھتی ہو یا پھر ہمارا ہی علم آگے چل کر ان کے متعلق مکمل ہو جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ احساس کی اس "امکانی محدودیت" کے یہ معنی کیونکر ہو سکتے ہیں کہ ہمیں ان اشیاء کے متعلق جو احساس ہو رہا ہے وہ واقعیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

مگر ان منکرین کی "لاادریت" اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ آگے بڑھتی ہے اور انسانی حواس کی محدودیت اور اُس کے مخصوص عنوان ادراک کو نظر انداز کرتی ہوئی علم کی مطلق اضافیت کا سوال درمیان میں لاکر اپنی جڑیں مستحکم کرتی ہے۔

کینٹ نے صاف صاف کہا ہے کہ علم ادراک کنندہ (مدرِک) اور ادراک کردہ (مُدرَک) کے درمیانی تعلق سے عبارت ہے۔ اسے مدرَک (ادراک کردہ) کے باطنی عناصر سے کوئی ربط نہیں ہے۔

ہملٹن نے بھی آخری عبارت میں اسے صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ ذہن اور مادہ کے جن اوصاف کا علم ہوتا ہے اُن کی حیثیت محض اضافی ہے۔ ہمیں اُن اشیا کا من حیث ہی کوئی علم نہیں ہوتا۔ اگر ہمارے حواس کی تعداد بڑھا بھی دی جائے تو اس اضافیت سے ہمیں نجات نہیں مل سکتی۔ اس بحث کا دوسرے لفظوں میں یہی مطلب ہوتا ہے کہ ہم لازمی طور سے کسی چیز کی اصلیت و حقیقت کو نہیں جان سکتے کیونکہ ہم ان چیزوں کا ادراک حواس مدرکہ ہی سے کر سکتے ہیں۔ اس امر کا علم حاصل کرنے کے لئے کہ یہ اشیا حقیقت میں کیا ہیں ہمیں اُن چیزوں کو جاننا چاہئے لیکن جن چیزوں کو ہم جاننا چاہتے ہیں وہ اپنے معلوم بننے کے لئے ہمارے ہاتھوں میں متغیر ہو جاتی ہیں۔ وہ معلوم و مدرک بننے کے لئے اُس مخصوص اضافیت کے سانچہ میں ڈھل جاتی ہیں جس میں وہ پہلے گرفتار نہ تھیں۔ بنا بریں ہمیں اُن اشیا کی خالص اصلیت (یعنی اُس اضافیت سے قطع نظر کر کے جو اُن کی ماہیت ہے) کا علم قطعاً حاصل نہیں ہوتا۔ جس چیز کو ہم جاننا چاہتے تھے وہ تو ہمیں حاصل نہیں ہوئی اور اُس کے بجائے کوئی دوسری چیز حاصل ہو گئی۔

اصل تو یہ ہے کہ "لاادریت" کے یہ مبلغ ان مقامات پر تحکم سے کام لے رہے ہیں۔

ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ فی الواقع اس کا امکان ہے کہ ہمارے ادراکات و احساسات کی نوعیتیں ہمارے ساتھ مخصوص ہوں اور ان اشیا کی جو اصلی کیفیتیں ہیں اُن کی نمائندگی نہ کر رہی ہوں لیکن اسی کے ساتھ کم سے کم اتنا ہی اُس کا امکان بھی کیوں نہیں فرض کیا جاتا کہ ہم جس طرح سے ان چیزوں کا احساس کر رہے ہیں اُسی طرح سے وہ حقیقت میں بھی موجود ہوں؟ ہمارے علم کے سانچہ میں ڈھلتے ہی ان اشیا کی حقیقت کیوں مسخ ہو جاتی ہے؟ آخر وہ کون سے اسباب ہیں جو لازمی طور سے ان اشیا کی حقیقت کو ہمارے دماغوں تک پہونچتے پہونچتے مسخ کر دیتے ہیں۔

فطرت سلیم اس کے تسلیم کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی ہر چیز کو اس عنوان سے مرتب کیا گیا ہے کہ ہمیں اُس کے علم حاصل کرنے میں برابر ناکامی ہوتی رہے۔ اس کے علاوہ

"لاادریت" کے اس نظریہ میں یہ خرابی بھی نظر آتی ہے کہ ایک ہی شے سے علم اور جہل کا بیک وقت تعلق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی حیثیت "اجتماع متضادین" کی ہے۔

خدا بھی کسی چیز کو نہیں جان سکتا

مسٹر پرنگل پٹسن نے اسکاٹش فلاسفی میں ان منکرین کے نظریہ اضافیت کی تشریح میں یہ بھی لکھا ہے :-

"اشیاء کا من حیث انفسہا کسی حالت میں بھی ادراک نہیں ہو سکتا۔ ہماری تو حقیقت کیا ہے خود خدا کو بھی اشیاء کا من حیث انفسہا علم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا بھی بغیر ادراک کے توسط کے کسی چیز کو نہیں جان سکتا۔ اس کے جو قوائے ادراک ہیں انھیں کے توسط سے وہ علم حاصل کر سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا علم بھی اضافی ہوگا۔ مختصر لفظوں میں اس کا مطلب یہی ہوا کہ علم کی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔"

تشریح بالا سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان حکما کا نظریہ اضافیت علم علم کے ناممکن قرار دینے پر مبنی ہے اور اس سے مذہب پر جو ضرب لگتی ہے وہ ظاہر ہے کیونکہ لاادریین کے ان مزعومات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی معرفت ہو سکنے کا بھی انکار کر دیا جائے۔

علم باری کے عدم امکان کے متعلق حکمائے اسلام کے خیالات

تشریح بالا میں علم باری کے عدم امکان کے متعلق جو اشارہ کیا گیا ہے اس سے بھی اتفاق مشکل ہے۔

علم باری کے ناممکن ہونے کا قول نیا قول نہیں ہے۔ یونانی حکما میں بھی اس کے قائل ملتے ہیں اُنھوں نے بھی علم کو اضافی سمجھ کر اس کا انکار کر دیا تھا لیکن حقیقت میں علم باری کو اضافی سمجھنا ہی غلط ہے۔ علم باری کو اضافت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اُسے اشیاء کے ادراک کے لئے قوائے ادراک کے توسط کی ضرورت ہے۔

محققین حکمائے اسلام کے نزدیک علم باری کی حقیقت ہمارے علم سے بالکل ہی الگ ہے۔ وہ علم باری کو حضوری اور عین ذات قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک واجب تعالیٰ کا تمام ممکنات کے لئے علت تامہ ہونا ہی انکشافات کا مبنیٰ ہے اور ان اشیاء کا واجب تعالیٰ سے صادر ہونا ہی اُن کا عین تعقل ہے۔

اگر وہ دلائل صحیح ہیں جو واجب الوجود کے یقین تک منتہی ہوتے ہیں تو پھر یہ بھی لازمی ہے کہ واجب علم محض قرار پا جائے اور تمام ممکنات اُس کے حضور میں پوری مکشوفیت اور نورانیت کے ساتھ موجود ہوں۔ اسی کیفیت کو حکمائے اسلام نے "علم اجمالی واجبی" قرار دیا ہے جو عین فی الکل

دوسرے لفظوں میں ذات واجب تمام مخلوقات و مجعولات کے لئے "صورت علمیہ" ہے اس لئے اُس کی ذات ہی بعینہ تمام اشیاء کے "علمی انکشاف" کا دوسرا نام ہے۔ ایسی حالت میں علم باری کے لئے کسی دوسرے امر کی مداخلت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اُس کی ذات کی "واجبیت" ہی انکشاف تام کے لئے کافی ہے اور کسی دوسرے آلہ تعقل یا درمیانی تفکر کے توسط کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

علامہ خضری البیات شرح تجرید جدید کے حواشی میں فرماتے ہیں:-

"واجب الوجود کے لئے دو علم ہیں۔ ایک "علم کمالی اجمالی" ہے اور یہ وہ علم ہے جو عین ذات واجب ہے یعنی اس کی ذات اپنی ذات کے لحاظ سے اس نوعیت کی واقع ہوئی ہے کہ وہ تمام موجودات کے انکشاف کا منشا ہے۔ شیخ الرئیس کا نامور شاگرد بہمنیار کہتا ہے کہ اُس کی حقیقت اس نوعیت کی حقیقت ہے جس سے تمام معلومات مفصل حیثیت سے صادر ہوتے ہیں۔ جس طرح سے "معقول بسیط" ہمارے لئے معقولات مفصلہ کی علت ہوتا ہے البتہ فرق اتنا ہے کہ معقول بسیط ہمارے پاس ہماری عقلوں میں موجود ہے اور باری تعالے کے یہاں نفس وجود ہے۔ معقول بسیط کی توضیح مثال ذیل سے ہو سکتی ہے۔

جب تم کسی شخص سے مناظرہ کرو اور وہ تم پر بہت سے اعتراضات وارد کردے تو تمہارے دل میں اُس کے جواب کا خطور ہو جاتا ہے اور اس کے بعد تم اُس کی تفصیل کرتے ہو یہاں تک کہ کاغذ کے دستے کے دستے بھر جاتے ہیں۔

پہلی کیفیت کو "معقول بسیط" سمجھو اور دوسری کیفیت کو "معقول مفصل"۔ باری تعالیٰ کے ہاں پہلا علم جو ہے وہ مکمل طور سے مجرد ہے۔ اور وہ اسی "شہود (حضور) علمی کمالیہ" میں اپنی ذات کو بھی جانتا ہے اور تمام دوسرے ممکنات کو بھی۔"

اس میں شک نہیں کہ علم حضوری کا صحیح تخیل ہمارے لئے آسان نہیں ہے تاہم خالص عقلی دلائل ہمیں اس کے ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ واجب الوجود کا تخیل بھی تو ہمارے بس کی چیز نہیں لیکن جب دلائل اُس کے وجود کا سراغ دیتے ہیں تو ہمیں اپنے حواس کی بیچارگیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اُسے ماننا ہی پڑتا ہے۔ علم کے کمال ہونے میں شک کی گنجائش نہیں ہے اور چونکہ واجب الوجود کو کسی صفات کمالیہ سے معرّیٰ نہیں مانا جا سکتا اس لئے ذات واجب الوجود میں علم کا موجود ماننا لازمی ہے۔ علم باری کے متعلق حکمائے اسلام نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں شیخ الرئیس کی شفا، حکمت علامہ محقق طوسی کی شرح اشارات اور تجرید میر باقر داماد کی تقویمات و تقدیسات اور

صدر المتابلیعین کی اسعفار میں اس مسئلہ کے اکثر جزئیات پر بسیط سے نظریں ڈالی گئی ہیں۔
ہمارے اس دور میں سید مرتضیٰ نونہروی فلسفی مرحوم نے بھی شرح دعائے مشلول میں نہایت معیت جامعیت کے ساتھ مسئلہ علم باری پر نظر کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان حکمائے اسلام کی تحقیق اُسی پرانے فلسفہ کے افکار پر مبنی ہے جسے آج کل دنیا نوسی قرار دیا جاتا ہے لیکن اُن کی کہنگی و قدامت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ وہ لازماً غلط ہوں۔

یہ سچ ہے کہ اس طولانی دفتر میں کام کی باتیں زیادہ نہیں ہیں۔ لاحاصل موشگافیوں میں کافی وقت ضائع کیا گیا ہے تاہم اگر ہیوم و کینٹ برکلے اور ہیگل کے پہلو بہ پہلو اپنے ان بڈھوں کے افکار پر ایک غلط انداز ہی نگاہ ڈال لی جائے تو فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

ایک علمی ستم ظریفی | "لاادریت" کی تان کو اتنا اونچا لے جانے کے بعد ان حکمانے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اپنے علم کے ان "رخنوں" کو عقیدہ سے بند کرنا چاہتے ہیں۔ کینٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اس نے "فکری دنیا" میں یہ سب زحمت اس لئے اٹھائی ہے کہ وہ "اخلاقی عقیدہ" کے لئے جگہ نکال سکے۔ اُس نے علم کا استیصال ہی اس لئے کیا ہے کہ "عقیدہ" ان مقامات پر اپنے قدم جما سکے اور "عقلی فکر و نظر" نے جو زخم لگائے ہیں ان کا "عملی استدلال" سے اندمال ہو سکے اُس کے نزدیک گویا کریٹک کا پہلا حصہ دوسرے حصے کے لئے "منطقی تمہید" ہے۔

ہملٹن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ۔

"میرے اس انکار کا کہ ہم "غیر محدود" کا علم حاصل نہیں کر سکتے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں اس کا اعتقاد بھی نہ کرنا چاہئے۔ درحقیقت ہماری "عالمانہ جہالت" ہی جو فلسفہ کا نقطۂ اختتام ہے مذہب کی ابتدا مستراریاتی ہے"

کینٹ اور ہملٹن کچھ کہیں مگر اصل تو یہ ہے کہ مذہب سے استدلال کا سہارا ہٹا کر اُسے عقیدہ کی بنیاد پر قائم کرنا نہایت ہی خطرناک طریقہ ہے۔

عقیدہ کے لئے استدلال کی ضرورت | استدلال کو کمزور ثابت کرنے کے بعد عقیدہ کے لئے جگہ نکالنے کا تخیل "فکری خوش مذاقی" کا ثبوت نہیں ہے۔

پائے استدلال کو مطلقاً "چوبیں" بنا کر اُس کے "سخت بے تمکیں" ہونے کا موعظہ کہنا لطیف خطابت ضرور ہے لیکن بُرہانی تعبیر سے معترٰی ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ استدلال کو یوں بے دست و پا بنا دینے کے بعد آگے چل کر ہمارا رجحان مذہبی عقیدہ کی طرف نہیں ہو سکتا بلکہ مکمل "لاادریت" کی طرف ہوگا۔ اس کا ایک علمی ثبوت تو یہی ہے کہ حکیم کینٹ نے اپنے "عملی استدلال" سے جو نتائج نکالے تھے وہ یک سخت نظر انداز ہو گئے اور اس کے نظریہ کے جو "منفی نتائج" تھے وہی رائج ہوئے۔

اس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ اگر واقعتاً مذہب اپنی حیثیت محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اُسے استدلال ہی کے سہارے کھڑا ہونا چاہئے۔ جو عقیدہ استدلال سے محروم ہے اُس کا سہارا کمزور سہارا ہے۔

مذہب کی بنیاد ایسے عقیدہ پر قرار دینے کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اُسے جہل پر مبنی قرار دیا جائے۔ جب عقیدہ کو استدلال سے محروم قرار دے لیا گیا تو پھر وہ جہل کا ترجمان ہونے کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ایسے عقیدہ میں نہ تو کوئی استحکام ہو سکتا ہے اور نہ اُس میں کوئی نورانی کیفیت ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا عقیدہ یا تو بے معنی اقرار ہے یا پھر شاعرانہ تخیل کا دلچسپ تماشا۔

انگلستان کا مشہور فلسفی لاک کہتا ہے:—

"جو شخص بغیر کسی دلیل کے کسی چیز کا اعتقاد کر لیتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے تخیلات کا عاشق و شیدا ہو لیکن نہ تو وہ صداقت کا جویا ہے اور نہ اپنے خالق کا مطیع بندہ کیونکہ وہ اُن توسلے تمیز سے کام نہیں لے رہا ہے جو اُسے اسی لئے دی گئی ہیں کہ غلطیوں سے محفوظ رہے۔ جو شخص اپنے مقدور بھر ان قوتوں سے کام نہیں لیتا ہے بہت ممکن ہے کہ اُس کے قدم صحیح جادہ پر ہوں لیکن یہ محض اتفاقی بات ہوگی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ بخت و اتفاق کی یہ خوش قسمتی اُس کی اس کارروائی کے لئے بے ضابطہ پن کا کفارہ ہو سکے گی۔

اپنے علم اور اپنے تصورات پر غور کرنے کے بعد جن صداقتوں کا بھی ہم پر انکشاف ہوتا ہے وہ ہمارے لئے اُن سے زیادہ قطعی اور یقینی ہوتی ہیں جو "روایتی الہام" کے ذریعہ ہم تک پہونچتی ہیں کیونکہ اس امر کا علم کہ یہ الہام اولاً خدا کی طرف سے ہوا ہے اتنا یقینی نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ علم جو ہم اپنے تصورات کے ائتلاف و عدم ائتلاف سے حاصل کرتے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں اسکاٹ لینڈ کے مشہور مفکر ریڈ کا بھی قول سن لیجئے:—

"بہت سے نیک آدمی انسانی عقل و فہم کی بے مائگی ظاہر کرنے اور فطرت و استدلال کی روشنی بجھانے کے واسطے یہاں سے ڈال دیئے گئے ہیں کہ الہام و عقیدہ کا وقار بڑھ جائیں۔ جو اسلحہ مذہب کی حمایت

سے لئے اُٹھائے گئے تھے اُن سے اُس کے ختم کرنے کا کام لیا جا رہا ہے اور جسے "مذہبی پختگی" کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا وہی کفر و الحاد کا مستحکم ترین سہارا بن گیا۔
مدعین "انسانی فہم" کی بیباکی ظاہر کرنے میں مذہبی لوگوں کے بالکل ہم نوا ہو جاتے ہیں تاکہ ہمیں "لاادریت وارتیابیت" کے غار میں جھونک دیں"
لاک اور ریڈ نے ان "عقیدیئین" کے نظریہ کی خرابی جس عنوان سے واضح کی ہے وہ نہایت ہی متین ہے۔ اس بحث کا یہ منشا نہیں ہے کہ عقل سے غلطی نہیں ہو سکتی یا اُس کی محدودیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اس ناقص و محدود دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہے۔ ہمیں جن حالات میں رکھ دیا گیا ہے اُن کے حدود کا لحاظ رکھ کر ہی ہم اپنے لئے راستہ تجویز کر سکتے ہیں اور وہ راستہ یقیناً عقل کا راستہ ہے۔

جہان آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

گم ہے احساس خودی ہوش کے میخانے میں — بھر کے ساقی نے یہ کیا دے دیا پیمانے میں
رونقِ حُسن کہاں حسن کے کاشانے میں — اک لپک شعلے کی جلتے ہوئے پروانے میں
طلبِ بادۂ سرجوش میں غیرت کیسی — ہوش پہلے سے ڈبو رکھے ہیں پیمانے میں
سوزشِ دل نہ سہی شعلۂ رخسار سہی — جمع ہیں دونوں سوا ایک ہی افسانے میں
بندۂ حُسن نہیں حُسن کا منکر اے شیخ — ایک بُت اور سہی دل کے صنم خانے میں
کیوں انا الحق وہ کہے واصلِ حق جو ہو جائے — کچھ ابھی بو ہے خودی ہے ترے دیوانے میں
یاد کو، رہ وہ تمناؤں کی دل سے کیا کام — خاک اُڑانے کو بہار آئی ہے ویرانے میں
دل کا ٹوٹا ہوا شیشہ ہے زبانِ نیرنگ — ساری دنیا کے ہیں قصے مرے افسانے میں

آرزو خود مئے بے کیف میں آجائے گا کیف
اور کچھ دور گذار و ابھی میخانے میں

جہان آرزو

مقالاتِ قزوینی

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی اے)

مقالہ نمبر ۳

کتاب راحۃ الصدور[1]

کتاب "راحۃ الصدور و آیۃ السرور" خاندان سلجوقیہ ایران و عراق (بمقابلہ سلجوقیہ کرمان و سلجوقیہ روم) کی تاریخ کی نہایت عظیم الشان اور معتبر تاریخ ہے۔ اس کا مصنف محمد بن علی بن سلیمان الراوندی چھٹی صدی ہجری کا ہے اور اس کا سنہ تالیف سنہ ۵۹۹ھ ہے یعنی دولت سلجوقیہ کے ختم ہونے اور اس کے آخری بادشاہ طغرل بن ارسلان کے تکش خوارزم شاہ (سنہ ۵۹۰ھ) کے ہاتھ سے قتل ہونے سے نو سال بعد یعنی اس کتاب کی تالیف کی ابتدا سنہ ۵۹۹ھ میں ہوئی اور بظاہر اختتام سنہ ۶۰۳ھ میں ہوا۔

اگرچہ مصنف خود اہل راوند سے ہے جو نواح کاشان کا ایک قصبہ تھا[2] اور اس کی تمام عمر عراق میں گذری اور وہ خود اور اس کا خاندان اخیر بادشاہان سلجوقیہ عراق کے متوسلین سے تھا مگر اس کتاب کو جو اس خاندان کے اختتام کے بعد تصنیف ہوئی ایک بادشاہ سلجوقیۂ روم سلطان غیاث الدین کیخسرو بن قلیج ارسلان (سنہ ۶۰۱ھ لغایت سنہ ۶۰۷ھ) کے نام اس نے معنون کیا اور خود قونیہ میں جاکر بادشاہ مذکور کی خدمت میں اس کو پیش کیا۔

یہ کتاب ظاہراً سب سے قدیم کتاب ہے جو زبان فارسی میں سلاطین سلجوقیہ ایران کے حالات میں اب تک باقی ہے[3]۔ اور چونکہ مولف خود بعض سلاطین سلجوقیہ کا معاصر اور متوسل تھا لہٰذا جو حالات کہ

---

[1] یہ مضمون میرزا محمد قزوینی نے "جہان" کے فرضی نام سے لکھا تھا۔ (مترجم)

[2] احتمال قوی ہے کہ یہ راوند جس کا ذکر "معجم البلدان" اور "انساب سمعانی" وغیرہ میں ہے اور ہمارے بہت سے علماء اس سے منسوب ہیں، ان حالات کی بنا پر کہ جو ان کتابوں میں دیے ہوئے ہیں وہی موجودہ راوند ہے جو کاشان کے مغرب اور قم کے جنوب میں دس دس فرسنگ کے فاصلہ پر ایک قریہ ہے مگر راوند کا نام حمد اللہ مستوفی کی "نزہۃ القلوب" میں نہیں ہے۔

[3] اُن کتابوں میں جو زبان عربی میں سلجوقیہ ایران و عراق کے حالات میں راحۃ الصدور سے پہلے تصنیف ہوئیں صرف ایک کتاب باقی ہے یعنی تاریخ سلجوقیہ از عماد الدین کاتب اصفہانی مصنف خریدۃ القصر۔ اس کتاب کا سنہ تالیف سنہ ۵۷۹ھ ہے اور یہ اب تک شائع نہیں ہوئی ہے مگر اس کا خلاصہ جو فتح بن علی البنداری نے سنہ ۶۲۳ھ میں کیا تھا، بمقام لیڈن (ہالینڈ)، کتب تاریخ سلجوقیہ ایران و کرمان و روم کے سلسلہ میں مشہور مستشرق ہوتسما کے اہتمام سے سنہ ۱۸۸۹ء میں چھپ گیا ہے۔

اس خاندان کے علی الخصوص آخری سلاطین کے اکثر وقائع کہ جو کتاب میں درج ہیں نہایت اہمیت رکھتے ہیں اور یہی کتاب متاخرین کی کتب تواریخ مثلاً جامع التواریخ ۔ تاریخ گزیدہ ۔ العراضہ فی تاریخ السلجوقیہ ۔ زبدۃ التواریخ حافظ آبرو ۔ روضۃ الصفا ۔ حبیب السیر وغیرہ کا ماخذ ہے کہ ان سب نے حوالہ کے ساتھ یا بغیر حوالہ دئے اسی سے اخذ کیا ہے ۔

اب تک سوائے ایک نسخہ کے جو کتب خانۂ پیرس میں محفوظ ہے کتاب راحۃ الصدور کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا میں موجود نہیں یعنی بہر صورت اب تک اُس کا ہم کو سُراغ نہیں لگا ہے ۔ لہذا یہ کتاب مطبوع صرف اسی نسخۂ وحیدہ پر مبنی ہے ۔ یہ نسخہ قلمی نہایت خوشخط بخط نسخ بڑی تقطیع پر ۱۷۹ ورقوں میں ۶۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے ۔ اگر کسی شخص کو اس کتاب اور اُس کے مصنف کے مزید حالات دریافت کرنا ہوں تو وہ اُس مفصل دیباچہ کا مطالعہ کرے جو فاضل ناشر نے زبان انگریزی میں کتاب کے ساتھ ملحق کیا ہے ۔ اور نیز "تاریخ جہانکشائے جوینی" جلد اول کا مقدمہ جس کو میرزا محمد قزوینی نے تحریر کیا ہے ۔

کتاب راحۃ الصدور مسٹر محمد اقبال پروفیسر زبان فارسی اورنٹیل کالج لاہور کی تصحیح و اہتمام سے نہایت صحت اور قابلیت کے ساتھ مع ایک مفصل مقدمہ بزبان انگریزی اور تین فہرست ترتیب وار درخصوص اسمائے اشخاص و اسمائے مقامات و اسمائے کتب و مع حواشی و فرہنگ لغات نادرہ مطبع بریل (E. J. Brill) لیڈن (ہالینڈ) میں نہایت پاکیزگی اور خوبی کے ساتھ عمدہ کاغذ پر ۵۰۶ صفحات متن اور ۴۲ صفحات مقدمہ ۱۹۲۱ء میں بسلسلۂ کتب اوقاف گیب (Gibb Memorial Series) چھپی ہے اور حق یہ ہے کہ ناشر فاضل نے کمال تبحر اور وسعت معلومات کے ساتھ کہ جو زبان فارسی و عربی میں اُن کو حاصل ہیں نہایت دقت و احتیاط سے تصحیح کر کے کتاب کو طبع کیا ۔ یہ ایک عظیم الشان احسان زبان فارسی پر اُن کا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کو بھی اُن کی توفیق نیک عطا کرے ۔ مگر افسوس ہے کہ یورپ میں ہر چیز کی گرانی کی وجہ سے، منجملہ جس کے قیمت کاغذ و اجرت طباعت بھی ہے، اس کتاب کی چھپائی میں بہت روپیہ صرف ہوا ۔ لہذا اس کی قیمت نسبتاً یعنی قبل جنگ کی قیمتوں کے مقابلہ میں بہت گراں ہے یعنی دو پاؤنڈ ساڑھے سات شلنگ علاوہ محصول ڈاک ۔

اب ہم بعد ایک سطحی مطالعہ کے جو اس کتاب کا ہم نے کیا بعض جزوی اغلاط کی طرف اشارہ کرتے ہیں (اس کے بعد مصنف نے کتاب کی چند جزوی غلطیاں دکھائی ہیں جنکا ذکر اُردو ترجمہ میں بیکار معلوم ہوا ۔ مترجم)

مقالہ نمبر ۸

پیرس سے ایک خط

(۲۴ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۷ جولائی ۱۹۲۴ء)

عزیز محترم۔ آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ جون مع دو نمبر اول و دوم "مجلہ علوم مالیہ و اقتصاد" جو آپ نے مجھ کو مرحمت فرمایا چند روز ہوئے کہ موصول ہوا۔ میں آپ کی اس عنایت و الطاف کا کمال متشکر ہوں اور شکریہ کے بعد اس بات کا افسوس ظاہر کرتا ہوں کہ آپ کے قیام پیرس میں صرف ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔ جو کلمات تعریف آپ نے اس خاکسار کے متعلق لکھے ہیں اور خاکسار کو پوری آزادی اظہار خیال کی اپنے مضمون کی تنقید کے متعلق عطا فرمائی ہے اس کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں مگر قبل اس کے کہ کچھ تنقیدی طور پر لکھوں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے مضمون کا اصل موضوع جس میں نہایت اہم و ضروری واقعات و اطلاعات جدید متعلق مسائل مالیہ اور خاصکر خالصجات دولتی کے درج ہیں اس قسم کا ہے کہ بندے کو کسی طرح کی بھی اطلاع اُن مسائل کی حاصل نہیں ہے کیونکہ یہ موضوع بندے کی اطلاعات محدود سے بالکل خارج ہے لہذا اگر اپنے خیالات کا اظہار اُن معاملات میں زبردستی کروں تو یہ ایک قسم کی رعونت اور ادعا بندے کی جانب سے ہوگا۔ پس آپ کے ارشاد کے بموجب مجبوراً بعض جزئی خیالات اپنے جو اصل مضمون کی عبارت و املا و انشا سے تعلق رکھتے ہیں اپنی ناقص معلومات کے اندازہ کے موافق عرض کرتا ہوں۔

اولاً میں جناب کو مضمون کے حسن انشا و سلاست عبارت کے متعلق علی الخصوص نیز کہ آپ نے تمام عبارت و کلمات و جملے و اصطلاحات، و طرز بیان بالکل اپنی اصلی زبان یعنی فارسی میں لکھے ہیں تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں اس وجہ سے کہ آجکل ہماری قومی زبان میں اس قسم کے مضمون نگار شاذ و نادر ہی ملیں گے۔ اگر اس زمانے میں کوئی شخص فرانس میں کوئی چیز زبان فرنچ میں یا جرمنی میں زبان جرمن میں یا انگلستان میں زبان انگریزی میں لکھے تو یہ مطلق کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی مگر ایران میں اس زمانے میں اپنے خیالات مضامین علمیہ کے متعلق اپنی زبان مادری میں ظاہر کرنا ایک عجیب و غریب چیز اور ایسا ہی عنقا ہے جیسے کہ سیمرغ اور کیمیا۔

میں خود ایک عرصہ سے ایران سے نکلا ہوا ہوں اور وہاں کے لوگوں میں نہیں ہوں کہ کوئی صحیح حکم اس معاملہ میں لگا سکوں مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر آجکل کی زبان فارسی کا معیار، جو

ایران کے اخباروں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے، چند دن اور قائم رہا تو بلاشک و شبہ اور بلا مبالغہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر صرف دس بیس ہی برس ہماری زبان اور ادب کا یہی حال رہا تو عنقریب ہی سعدی و حافظ کی زبان بالکل نسیاً منسیا ہو جائے گی اور اُس کی جگہ ایک نئی زبان لے گی جس میں فارسی و عربی و فرنچ و روسی و انگریزی و ترکی الفاظ بھرے ہوں گے مثل ہندوستان کی اُردو یا الجزائر کی موجودہ عربی کے۔

میں ہر چند اس معاملہ پر غور کرتا ہوں کہ یا اللہ ادبیات ایران کے اسقدر جلد تنزل اور زبان فارسی کی اس غارتگری کا آخر کیا سبب ہے، تو اس کا راز میرے مطلق سمجھ میں نہیں آتا اس وجہ سے کہ ایک طرف تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ سلطنت جدید (مشروطہ) قائم ہو جانے کے بعد ایرانیوں میں وطن پرستی کا احساس یقینی پیدا ہو گیا ہے اور لوگوں کا عام میلان اپنے ملک کی بقا اور حفظ قومیت کے جانب پوری طرح مبذول بلکہ روز بروز ترقی پر ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری طرف یہ اظہر من الشمس ہے کہ قومیت کے مہم ترین اور اعلےٰ ترین عناصر میں ایک قومی زبان کی موجودگی ہے جس کا ہمارے یہاں پتہ نہیں۔ لہذا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تناقض کو کس چیز پر محمول کروں کہ آجکل کے لکھنے والے ایک ہی وقت میں ایک طرف تو وطن پرستی کی فریاد کرتے ہیں اور حفاظت ایران اور بقائے قومی کا لمبا چوڑا دعوے کرتے ہیں مگر دوسری طرف جان بوجھ کے اور عمداً اپنے ہی ہاتھ سے اُسی قومیت کی جڑ پر ایک سخت تبر لگاتے ہیں اور بقائے ملت کا سب سے بڑا سبب کہ جو یقینی زبان فارسی ہے اُس کو اتنی سختی اور تیزی کے ساتھ مٹاتے جاتے ہیں۔ اور ہر روز اور ہر تحریر میں ایک ضرب تازہ سے اپنی قدیم اور قومی زبان کا ہاتھ اور سر زخمی اور مجروح کرتے جاتے ہیں۔ اُن کی وہی مثل ہے جیسا کہ ایک شخص ایک شاخ پر بیٹھا ہوا اُسی شاخ کو اپنے تبر سے کاٹتا جاتا تھا۔

کبھی اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا ہوں کہ یہ تناقض عملی جو بالفعل میں اپنے ہم وطنوں میں دیکھتا ہوں ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ وہ ملیت اور قومیت کا حقیقی مفہوم نہ سمجھتے ہوں کیونکہ یہ تو کسی طرح عقل میں نہیں آتا کہ کوئی شخص جان بوجھ کے اور عمداً اپنے وطن کا اس قدر خائن اور گنہگار ہو۔ بالفرض اگر کوئی ایسا کمبخت ہو بھی) تو اُس کا وجود مثل عنقا کے ہے یعنی کوئی ایسا شخص کہ جو ایک طرف تو وطن پرستی کا دعوے کرے اور دوسری طرف مادر وطن کے سر کاٹنے پر مائل ہو۔

مگر افسوس اور صد ہزار افسوس ہے کہ اتحادِ ملی کو مٹانے کے واسطے خواہ کوئی کام جان بوجھ کے اور عمداً کیا جائے یا ناواقفیت اور غفلت سے عمل میں آئے ان دونوں کا نتیجہ خارج میں ایک ہی ہوتا ہے اور فطرت کی نظر میں اور انہدامِ ملیت کے اسباب میں کوئی عذر کسی طرح کا مقبول نہیں ہو سکتا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے اور سیکڑوں مثالیں پیش کرتی ہے کہ بڑی بڑی قومیں جو عروج کے زمانے میں بہت کامیاب و مستقل تھیں وہ اپنے افراد کی غفلت اور ناواقفیت کی وجہ سے اور نیز اپنے اکابر کی غلطی اور سستی سے بحرِ فنا میں ڈوب گئیں اور ایسی ڈوبیں کہ اب قیامت تک ابھر نہیں سکتیں اور اب سوائے اُن کے نام کے کوئی نشان تک اُن کا باقی نہیں ہے۔

سب سے زیادہ عجیب چیز اس زمانے میں یہ دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں کسی گوشہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ زبانِ فارسی سے تمام عربی الفاظ خارج کر دیے جائیں اور عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ زبانِ عربی ایک خارجی عنصر ہے جو بعض اسبابِ تاریخی کی وجہ سے زبانِ فارسی پر مسلط ہو گئی اور اُس کو غارت کر دیا۔ مگر یہی حضرات جو ایک غیر زبان کے اس قدر دشمن ہیں ساتھ ہی اس کے یورپی الفاظ و اصطلاحات کے استعمال میں اپنی وہ خودداری اور ملت پرستی مطلق نہیں دکھلاتے اور بلا تکلف اپنی تحریروں میں انگریزی و فرنچ و جرمن الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ یہ تناقض پہلے سے بھی زیادہ عجیب تر ہے کیونکہ اولاً عربی الفاظ تقریباً ہزار برس سے زبانِ فارسی میں داخل ہو گئے اور کثرتِ استعمال اور طولِ مدت کی وجہ سے اپنی اصلی قومیت کو گویا کھو بیٹھے اور ایک دوسری قومیت کو اختیار کر کے زبانِ فارسی کے "ہمشہری" (ہم وطن) ہو گئے اور اب وہ مطلق خارجی خیال ہی نہیں کیے جا سکتے۔ اس کی مثال یہی ہے کہ جیسے مثلاً ایک ہندی خاندان کئی سو برس سے ہندوستان سے ہجرت کر کے ایران چلا گیا ہو اور وہاں اُس کے بال بچے ہوئے ہوں تو اب وہ کسی طرح ہندی نہیں شمار ہو سکتا یہی صورت اُن قبائلِ عرب کی تھی کہ جو شروعِ اسلام میں فوج کے ساتھ یا تجارت و زراعت کی غرض سے ایران آئے مثلاً شیبانی، و غفاری، و انصاری، و خالدی وغیرہ بلکہ ان سب سے زیادہ واضح اور روشن مثال صحیح النسب سیدوں کی ہے کہ جو اپنے خاندانی شجروں کے اعتبار سے قطعاً اور یقیناً عرب تھے مگر اب سیکڑوں برس کے بعد ایران میں قیام کی وجہ سے سب اُن کو ایرانی ہی جانتے ہیں اور حقیقت میں وہ ایرانی ہی ہیں اور اپنے ملک کی نیکی و بدی اور نفع و نقصان میں ایرانیوں کے سہیم و شریک ہیں۔

ہماری قومی مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) میں منجملہ دیگر وکلا کے ہمیشہ بعض حضراتِ سادات ضرور

شامل ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ صحیح النسب سادات ایرانی ہیں یا عرب؟ اگر آپ ان کو عرب اور عنصر خارجی کہیں تو ایرانی ان کو اپنا وکیل کیوں بناتے ہیں اور اگر ایرانی سمجھیں تو ان کے صحیح شجرے کے متعلق آپ کیا حکم دیں گے۔ لازمی یہی کہیں گے کہ گو یہ قومیت کے اعتبار سے غیر ایرانی ہوں مگر ملیت کے اعتبار سے یہ سب ایرانی ہیں۔

اور گویا نژاد (نسل) اور ملیت کے مفہوم میں فرق نہ کرنا باعث اشتباہ ہے اس وجہ سے کہ چونکہ نژاد ایک امر طبیعی اور غیر قابل تبدیل ہے لہذا ممکن ہے کہ خارجی ہو مگر ملیت جو ایک امر دقوعی اور اصطلاحی ہے ہمیشہ قابل تغیر و تبدل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کو کسی نژاد کا ہو محض کسی ملک کی طبعیت (حق باشندگی) حاصل کر کے اُس ملک کی قوم میں داخل ہو سکتا ہے اور اس قوم کا ایک فرد اور ایک عضو محسوب کیا جا سکتا ہے۔

ان نئی روشنی والوں سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا تم لوگ ایران کے سادات کو ایرانی سمجھتے ہو یا خارجی اور اگر بالفرض تم صاحب اختیار ہو جاؤ تو اُن سب سادات اور غیانی و غفاری و انصاری وغیرہ فرقوں کو تم ایران سے خارج کر دو گے یا کم سے کم اُن کو خارج از ملک شمار کرو گے؟ اگر سادات اور دیگر قبائل عرب کو جو ایران میں بالفعل موجود ہیں خارج کر دیا اُن کو خارجی سمجھو تو تم کو اختیار ہے کہ عربی الفاظ کو بھی جو وہ اپنے ساتھ ہزار سال پیشتر لائے تھے خارجی جانو اور اُن کو زبان فارسی سے نکال باہر کرو اور اگر اُن سب سادات اور بقیہ قبائل عرب کو ایرانی اور تابع ایران خیال کرتے ہو تو عربی الفاظ کو بھی فارسی ہی شمار کرو۔ ان دونوں معاملات میں ذرہ برابر مجھ کو فرق نہیں معلوم ہوتا۔

اسی زبان فرنگ کو جس کے الفاظ و اصطلاحات اپنی عبارتوں میں لکھنے کے تم اس قدر شائق ہو اور اُس پر فخر کرتے ہو غور سے دیکھو تو تم کو معلوم ہو گا کہ اُس میں سو کلمات میں ننانوے لفظ لاطینی اور یونانی ہیں اور اپنے اصلی الفاظ شاید فی صدی ایک سے بھی زیادہ نہ ہوں مگر فرنگ قوم جس کی تقلید کے تم اس قدر والہ و شیدا ہو کبھی اس بات کا خیال بھی دل میں نہیں لاتی کہ لاطینی اور یونانی الفاظ اپنی زبان سے خارج کر دے۔ پس میں پوچھتا ہوں کہ اس معاملہ میں بھی تم ان کی تقلید کیوں نہیں کرتے اور اپنی عمر عزیز اور نیز پڑھنے والوں کا وقت بیکار اس فضولیات و لغویات میں کیوں ضائع کرتے ہو۔

میرا مضبوط عقیدہ یہ ہے کہ آجکل کے فاضل مضمون نگار جو زبان فارسی مروجہ پر ایک

ضرب شدید لگا رہے ہیں یہ اُس ضرب سے کہیں زیادہ مہلک و سخت تر ہے جو عربوں یا تاتاریوں نے اپنے زمانے میں اس زبان پر لگائی تھی اس وجہ سے کہ عرب اور تاتاری تو جو کچھ چاہتے تھے تلوار کے زور سے کرا لیتے تھے اور جب یہ صورت حال ہو تو سوائے تسلیم و رضا کے چارہ کیا ہے مگر اس زمانے میں تو یہ جبر و استبداد مطلق نہیں پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جدید اغیال حضرات بغیر کسی عذر معقول کے بلکہ بغیر کسی قسم کے عذر و بہانہ کے اپنے بزرگوں کی زبان بے تکلف غارت کر رہے ہیں۔ وہ زبان جس کو ہمارے آبا و اجداد نے ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک باوجود بڑے بڑے حملوں اور سلطنتوں کے مٹنے کے بطور امانت اپنے کلیجہ سے چمٹا کے رکھا اور ہم کو سپرد کر گئے مگر اب یہ حال ہے کہ اُن کی اولاد نا خلف بلا کسی اکراہ و اجبار کے بلکہ نہایت خوشی خوشی اور جان بوجھ کے اُسی اپنی پیاری زبان کو اپنے ہی ہاتھوں مٹائے ڈالتے ہیں اور اس قیمتی خزانہ کو جو ہزار سال کی محنت اور کوشش سے رودکی، فردوسی، عنصری، نظامی، خاقانی، سعدی، حافظ وغیرہ نے جمع اور فراہم کیا تھا بے دریغ برباد کر رہے ہیں اور محض اہل یورپ کی کورانہ تقلید میں خاک میں ملائے دیتے ہیں۔ اس درد دل کا بیان کہاں تک کروں۔ مختصر یہ ہے کہ جب کوئی ایرانی اخبار میرے پاس پہونچتا ہے اور اُس میں اس قسم کے کسی مضمون پر اتفاقاً میری نظر پڑتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب اس بلائے عظیم سے بدون کسی حیلہ و چارہ کے مجبوراً اور اتفاقاً دوچار ہوتا ہوں تو سچے دل سے موت کی تمنا کرتا ہوں اور بے اختیار اپنے دل سے کہتا ہوں کہ کیا مبارک تھے وہ لوگ جو اب سے چند سال پیشتر مر گئے اور زبان فارسی کی اس جانکنی کی تکلیف کو اپنی آنکھوں سے اُنھوں نے نہ دیکھا۔

(اس کے بعد فاضل مصنف نے چند غلطیاں نکالی ہیں جو اس مضمون میں تھیں جو اُن کے پیش نظر تھا۔ مگر چونکہ اکثر کا تعلق خاص زبان فارسی سے ہے لہذا بعض نظر انداز کر کے صرف دو چار غلطیاں جن کا تعلق اردو کی املا و انشا سے بھی ہے یہاں دی جاتی ہیں۔ مترجم)

نسبتاً۔ غلط نسبۃً۔ صحیح۔ قضاوت۔ مشہور غلطی ہے۔ کیونکہ قضی یقضی ناقص یائی ہے نہ کہ وادی۔ مگر یہ ایسی غلطی ہے جو عام و خاص میں مستعمل ہے لہذا اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔
اسی طرح لفظ مُہر جو فارسی ہے اُس کی عربی جمع اُمہار اور مشتق اسم مفعول ممہور گو کہ قاعدہ سے غلط ہے مگر غلط العوام اور کثرت استعمال کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔
الفاظ حقیقۃً، کلیۃً، غفلۃً، فجاءۃً، مقارنۃً، صورۃً، نسبۃً وغیرہ اس طرح صحیح ہیں نہ

یہ کہ ان کے آخر میں الف مع تنوین لکھا جائے جو فاحش غلطی ہے۔

لفظ پرگرام (یعنے پروگرام) جو آپ نے لکھا اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے فارسی مرادفات موجود ہیں۔ شاید عذر میں آپ یہ کہیں کہ الفاظ پُست (پوسٹ) وتلگراف وتلفون واتومبیل (یعنی موٹرکار) بھی اسی قسم کے ہیں اور زبان فارسی میں داخل ہوگئے ہیں تو اس کے متعلق میں کیا عرض کروں۔ ممکن ہے ان سب الفاظ کو حق ہمسائگی زبان فارسی میں پیدا ہوگیا ہو۔ میں چونکہ ایران سے بہت عرصے سے نکلا ہوا ہوں لہذا اس کی صحیح حالت سے ناواقف ہوں۔ والسلام۔

غمگین نظم

جناب سرور الہ آبادی

فرط غم سے آج ہیں افسردہ دل اہل جہاں
اُٹھ گئے بزم سخن سے اصغر معجز بیاں

اُن کے دم سے تھی نشاط افزا فضائے روزگار
ہوگئی تاراج سب حسن معانی کی بہار

اب کہاں شعر وسخن کے ساز وسامان فریب
اب کہاں پیش نظر وہ بزم امکان فریب

قوت تخئیل میں اُن کے عجب اعجاز تھا
یعنی ہر نغمے میں کیف حافظ شیراز تھا

اہل دل کو اس لئے حاصل سکون دل نہیں
پیش چشم شوق وہ آرائش محفل نہیں

بیٹھ کر بزم سخن کو رنگ پر لائے گا کون
بادۂ خوش رنگ کے وہ جام چھلکائے گا کون

اُن کا ایک ایک شعر شرح بخت بیدار لطیف
مطلع رنگیں سے ظاہر صبح انوار لطیف

دست حسرت مل کے کہتے ہیں یہ سب اہل کمال
ہے کہاں دنیا میں ایسا شاعر شیریں مقال

کون اب منظر دکھائے وہ امید و بیم کا
کون اب جلوہ دکھائے کوثر و تسنیم کا

ان کی وہ رنگیں بیانی وہ لطافت اب کہاں
فلسفہ کی چاشنی میں وہ حلاوت اب کہاں

بزم عرفان وحقیقت رہتی تھی پیش نظر
موت نے آکر کیا اسرار حق سے باخبر

اصغر مرحوم تو ہیں شیخ کے پہلو نشیں
روح پہونچی ہے نکل کر جسم سے خلد بریں

سرور خستہ جگر کی ہے دعا بے قال وقیل
حشر کے دن بخش دینا ان کو اے رب جلیل

نیاز کی جرأت بے جا

(جناب منشی نانک چند سریواستو صاحب عشرت ایم۔ اے۔ مولوی فاضل)

(بسلسلۂ الناظر ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء)

شعرِ اصغر | دیکھنے والے فروغِ رخِ زیبا دیکھیں — پردۂ حُسن پہ خود حُسن کا پردا دیکھیں

اعتراضِ نیاز | دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ اول تو "پردۂ حُسن" کے استعمال کی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور مصرعۂ اولیٰ میں کوئی ایسی بات ظاہر نہیں کی گئی جس سے "پردۂ حسن" کا تعلق ہوتا اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ یہاں "حُسن زیرِ نقاب" ہی کا ذکر ہے تو پھر حُسن کا پردہ کیا چیز قرار پائے گی۔ جب کہ فروغِ رُخِ زیبا مصرعہ اول میں کھلم کھلا اس کے منافی واقع ہے۔ اگر "حسن کا پردہ" کے بجائے "حسن کا جلوہ" لکھا جاتا تو خیر کچھ نہ کچھ مفہوم پیدا ہوجاتا۔ غالب کا شعر ہے

منھ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منھ پر کھلا

معلوم ہوتا ہے کہ اصغر صاحب نے اسی شعر کو سامنے رکھ کر فکر فرمائی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ غالب کے شعر کا ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے اور اصغر صاحب نے "حسن کا پردہ" کہہ کر اس کو مہمل بنا دیا۔

عرضِ عشرت | بھائی صاحب آپ اصغر صاحب کے "پردۂ حسن" کو نہیں سمجھ سکے۔ غلطی سے اس کے معنی "حسن زیرِ نقاب" سمجھ کر شعر کو غالب کے شعر سے ملا دیا حالانکہ اصغر صاحب کا مضمون بالکل جداگانہ ہے اور غالب کے شعر سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اصغر صاحب کی طبیعت میں بڑی جدت ہے اور ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے مگر ہاں یہ صحیح ہے کہ اصغر صاحب کسی کی سمجھ کے ٹھیکہ دار نہیں ہیں۔ "پردہ" کے معنی اصغر صاحب نے (جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک شعر کی تشریح میں لکھ چکے ہیں) اُس پردہ کے لئے ہیں جو تھیٹر وغیرہ میں ہوتا ہے اور جس پر نقش و نگار، سین، سینری وغیرہ بنے ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح ایک پردہ کے آگے دوسرا پردہ اکثر گرا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے پردۂ حسن معشوق پر خود تابش حسن کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جس سے نگاہیں خیرہ ہیں اور پردۂ حسن پر جو جو رنگینیاں ہیں وہ نگاہ میں نہیں آرہی ہیں۔ آپ اصلاح دے رہے ہیں کہ پردۂ حسن کے بجائے جلوۂ حسن کر دیا جائے۔ ایسا کرنے میں اول تو وہی فرسودہ بات ہوجائے گی جو آج تک اُردو شعرا کہتے آئے ہیں اور جس سے اصغر صاحب کی جدت پسند طبیعت متنفر ہے۔ دوسرے یہ کہ شاعر کا پورا مفہوم لفظ جلوہ سے ادا نہیں ہوگا۔ مفہوم شعر نہایت وسیع ہے یعنی پردۂ حسن پر رخسارِ جاناں کی رنگینی۔ سبزۂ خط۔ آنکھ کا جادو۔ ابرو کی کمان وغیرہ

بیسیوں چیزیں ہیں جن کی طرف دماغ فوراً لفظ پردہ آئینے سے منعطف ہو جاتا ہے مگر لفظ جلوہ سے ان تمام باتوں کی طرف اشارہ نہیں ہوتا کہ جلوہ سے صرف تابش حسن کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے اس لیے اصلاح ناقص اور شعر غالب کی طرف اشارہ قطعی غلط۔

شعر صغر | جنون عشق میں ہستی عالم پہ نظر کیسی رُخ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ جنون عشق میں دنیا کی ہستی کا خیال بھی نہیں رہتا۔ بالکل درست ہے لیکن دوسرے مصرعہ سے اس کا تعلق؟ اگر ہستی عالم کا جواب دوسرے مصرعہ میں رُخ لیلیٰ اور جنون عشق کا جواب نظارہ محمل واقع ہوا ہے تو مفہوم کے لحاظ سے اس کا اہمال ظاہر ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیئے تھا۔

دفور شوق ہو تو پردہ پھر کیسا کہ رکھتے ہیں رُخ لیلیٰ نظر میں اپنی محمل دیکھنے والے

عرض عشرت | جب آپ شعر نہیں سمجھ پاتے تو نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں۔ پہلا مصرعہ تو آپ سمجھ گئے مگر دوسرے مصرعہ میں لیلیٰ و محمل کا استعارہ آپ کی فہم میں نہ آسکا۔ اسی سے آپ کو پہلے اور دوسرے میں ربط نہیں معلوم ہوتا۔ سنئے "لیلیٰ" حقیقت عالم کے لئے استعارہ ہے اور "عالم" محمل ہے جس کے اندر حقیقت پنہاں ہے۔ اب جسے جنون عشق ہے اُس کی نظر محمل پر نہیں جائے گی۔ وہ تو ہمیشہ حقیقت پر یعنی رُخ لیلیٰ پر نظر رکھے گا۔ اور جو محمل ہی سے یعنی "عالم" سے ہی اُلجھ گیا وہ لیلائے حقیقت کو کیا دیکھے گا۔ یعنی جو دنیا میں پھنس جائے گا وہ خدا کو کیا پہچانے گا۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح اس میں بڑے بڑے نقائص ہیں۔ اول تو بقول حضرات لکھنؤ مصرعۂ اولیٰ کے الفاظ "رکھتے ہیں" میں سخت "ذم کا پہلو" ہے دیگر یہ کہ پہلے مصرعہ کا مفہوم جب تک کہ اُسے دوسرے مصرعہ سے ملا کے نہ پڑھیں کسی طرح بھی کچھ نہیں نکلتا۔ یہ اکابر معائب شاعری میں سے ہے۔ یہ اصلاح بھی آپ کی تمام اصلاحوں کے رنگ پر ہے۔ شوق سندیلوی کے "اصلاح سخن" میں بھی آپ کی تمام اصلاحیں اسی طرح کی ہیں۔ اگر چودھری حامد حسین صاحب کا مضمون اس پر شائع ہو گیا تو اس کی حقیقت آپ پر اور نیز پبلک پر روشن ہو جائے گی۔

شعر صغر | تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا میں اُن کا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

اعتراض نیاز | ...... دوسرا مصرعہ ...... کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کس چیز کو شاعر اُن کا دل سمجھتا ہے اور وہ کس چیز کو شاعر کا دل سمجھتے ہیں۔ اس کا اظہار کہیں نہیں کیا گیا۔ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں محبوب کے دل کو زخمی سمجھتا ہوں اور وہ میرے دل کو لیکن اس کو وہ ظاہر نہیں کر سکے۔

عرض عشرت | افسوس ہے کہ آپ "میں اُن کا دل سمجھتا ہوں" اس معمولی فقرے کو بھی سمجھ نہیں پائے۔

آپ نے زخمی دل کے معنے لگائے جو نہایت غلط ہے۔ اگر کوئی کسی سے کہے کہ میں آپ کی بات نہیں سمجھتا تو کیا دوسرا فریق اُس سے اُلجھنے لگے گا کہ آپ کس چیز کو میری بات نہیں سمجھتے؟ کیونکہ بعینہٖ یہی سوال آپ اپنے اعتراض میں کرتے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ شاعر کس چیز کو ان کا دل سمجھتا ہے اور وہ کس چیز کو شاعر کا دل سمجھتے ہیں۔ بھائی صاحب سُنیے "میں اُن کا دل سمجھتا ہوں" کے معنی ہیں کہ جو کچھ اُن کے دل میں ہے میں سمجھتا ہوں اور اسی طرح "وہ میرا دل سمجھتے ہیں" کے معنی ہوئے کہ جو کچھ میرے دل میں ٹھنی ہے وہ سمجھتے ہیں۔ اب پہلے مصرعہ سے تعلق دیکھئے۔ عاشق کے نیاز اور معشوق کے ناز میں باہم کشاکش ہے۔ یہ کشاکش دیکھنے کے قابل ہے کیونکہ کسی جانب سے نہ کوتاہی ہو رہی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ عاشق معشوق کے دل کا ارادہ سمجھتا ہے کہ وہ تلا بیٹھا ہے کہ اپنے ناز میں کمی نہ کرے گا اور معشوق عاشق کا دل سمجھتا ہے کہ وہ اپنا نیاز کبھی نہ چھوڑے گا۔

شعرِ اصغر | کائنات دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے　　　زندگی جب مُسکرائی ہے قضا کے سامنے

اعتراض نیاز | اول تو قضا کے سامنے زندگی کے مسکرانے کی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ شعر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مسکراہٹ استسلام وسپردگی کی تھی یا جحود وانکار کی، دوسرے روح الامیں کے بیہوش ہونے کا کیا موقع تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت روح الامیں پیام خداوندی شاعر کے سامنے لائے اُسی وقت اتفاق سے قضا بھی آگئی اس لئے ادھر شاعر کی زندگی مسکرا پڑی اور اُدھر روح الامیں غش کھا کر گر پڑے۔ کائنات دہر کی ترکیب بھی عجیب ہے۔ صرف کائنات کہہ دینا کافی تھا۔

عرضِ عشرت | یہ سچے عاشق کی موت ہے، جو رہِ عشق میں جان دے دینا تکمیل عاشقی سمجھتا ہے۔ اُسے موت کا ڈر قطعی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عاشق کی زندگی نہایت بے پروائی وتحقیر سے قضا کے سامنے مسکراتی ہے۔ قضا کے سامنے زندگی کے مسکرانے کی یہی وجہ ہے۔ یہ مسکراہٹ نہ "استسلام وسپردگی" کی ہے اور نہ "جحود وانکار" کی جیسا کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور جب یہ بات ہی نہیں ہے تو اس کا شعر سے پتہ کیونکر چلے۔ خیر جب زندگی اس طرح نہایت بے پروائی وتحقیر سے قضا کے سامنے مسکرائی تو کائنات دہر کی حقیقت کیا، روح الامین کی شدید القوی ہستی تک انتہائے تحیر سے بیہوش ہو گئی۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ کائنات دہر کی ترکیب عجیب ہے، صرف کائنات کہہ دینا کافی تھا۔ آپ emphasis یعنے زور دینے کے رمز کو سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ جب کسی بات پر زور دینا ہوتا ہے تو زائد الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ غور کیجئے دو جملے ہیں (۱) میں نے یہ کام کیا (۲) میں نے یہ کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے جملہ میں "اپنے ہاتھوں سے"

کا ٹکڑا بیکار ہے۔ صحیح ہے لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئیے کہ انھیں زائد الفاظ سے جملہ کتنا زوردار اور چست ہوگیا اسی طرح محض کائنات کہنے سے بھی مطلب پورا ہوجاتا مگر وہ زور نہ رہتا جو کائنات دہر کہنے سے پیدا ہوگیا ہے۔

شعر اصغر | ایک صدا یاں ہے اصغر میرا طرز کافری میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اعتراض نیاز | اگر "میں" "اور بت دونوں خدا کے سامنے ہیں تو اس میں "رشک صدا یاں" ہونے کی کونسی بات ہے اور وہ طرز کافری کیا تھا جس کی داد چاہی جاتی ہے۔

عرض عشرت | مجھے قطعی طور سے معلوم ہے کہ یہ شعر غلط چھپ گیا ہے۔ عجلت میں کچھ نسخوں میں اصلاح کردی گئی تھی۔ اس وقت جس کا جی چاہے الہ آباد جاکر پچاسوں نسخوں میں اس شعر کو صحیح طور پر اصلاح شدہ دیکھ سکتا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کے لئے جو کاپی چھپنے سے لئے مصنف کے پاس رکھی ہے اس میں یہ شعر اس طرح ہے۔

رشک صدا یاں ہے اصغر میرا طرز کافری میں بتوں کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

مطلب اس کا صاف ہے۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔

شعر اصغر | جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ چشم بشر اب تک تیرا جلوہ نہیں دیکھ سکی اور دوسرے مصرعہ میں یہ خبر سنائی جاتی ہے کہ ہر ایک تجھے اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اگر مصرعۂ اول کا دعوے صحیح ہے تو معنے یہ ہوں گے کہ دوسرے مصرعہ میں جن دیکھنے والوں کا ذکر ہے وہ انسان نہیں ہیں کیونکہ اگر وہ انسان ہوتے تو ظاہر ہے کہ چشم انسانی ہی سے دیکھتے۔

عرض عشرت | یہ شعر حضرت اصغر کا کارنامہ ہے۔ مگر کاش آپ اسے سمجھ سکتے۔ شعر کے معنی سنئیے۔ خدا کا جلوہ اب تک چشم بشر سے نہاں ہے کسی نے خدا کو آج تک نہیں دیکھا مگر ہر ایک نے اپنے خیال کے مطابق اس کا تصور قائم کر رکھا ہے۔ ہر ایک مذہب میں خدا کے بارے میں جدا جدا خیالات ہیں گو کہ اس کو کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ نظر کے معنے اس شعر میں فکر و خیال وغیرہ کے ہیں لیکن اگر آپ اس شعر کو "گوشت و پوست والی معشوقہ" ہی پر منطبق کرنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے۔ ہر عاشق اپنے اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھتا ہے کہ معشوق میں یہ حسن ہے مگر اس کا اصلی حسن یا جلوہ کیا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔ یعنی کسی نے آج تک گو یا اس کو دیکھا ہی نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے خبط کے مطابق معشوق میں حسن کا تعین کرتا ہے۔

شعر مغز | مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے — یہ راز ہے تو ذرا حُسن راز رہنے دے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں ایک خواہش و التجا کا انظہار ہے، کسی واقعہ کا نہیں، اس لئے مصرعۂ دوم میں لفظ یہ کا اشارہ بالکل بے محل ہے کیونکہ مشارالیہ نہ کوئی موجود ہے نہ اس کا اظہار کیا گیا ہے اور اگر کہا جائے کہ (یہ) کا اشارہ حقیقت کی طرف ہے تو پھر حسن راز کا اس سے کیا تعلق۔ راز کا حُسن یہی ہے کہ وہ راز رہے اور یہاں حقیقت کو مجاز سے متعلق کر کے اُس کا افشا چاہا جاتا ہے جس کو حُسن سے کوئی واسطہ نہیں۔

عرض عشرت | پہلے آپ لکھتے ہیں کہ "(یہ) کے لئے کوئی مشارالیہ موجود نہیں ہے" مگر بعد کو آپ کہتے ہیں کہ اگر (یہ) کا اشارہ حقیقت کی طرف ہے "۔ بے شک (یہ) حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر آپ کو حقیقت کا تعلق 'حسن راز' سے سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ لکھتے ہیں کہ "راز کا حُسن یہی ہے کہ وہ راز رہے" بندہ پرور راز کا حُسن یہ نہیں ہے کہ وہ محض راز رہے۔ کیونکہ راز محض رہنے سے اُس سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ "تڑپ" جو حسن کا لازمی نتیجہ ہے۔ راز پر جب ایک ایسا پردہ پڑا رہتا ہے کہ نہ وہ ہٹتا ہے اور نہ کلیۃً راز کو چھپاتا ہی ہے تب وہ حسن راز ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ پردے سے کلیۃً چھپتا نہیں اس لئے وہ نگاہوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے اور چونکہ بے نقاب ہوتا نہیں اس لئے تڑپاتا ہے یعنے جب تک۔

کیا تماشا ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں — صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کا لطف نہ پیدا ہو تب تک حُسن راز نہیں ہو سکتا۔ حقیقت پر اگر کوئی پردہ نہ ہو تو بھی کوئی دلکشی نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی ایسا پردہ ہو کہ حقیقت کی جھلک کسی کو نہ ملے تو بھی اُس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے حقیقت کو حسن راز بنانے کے لئے شاعر مجاز کا ہلکا سا پردہ چاہتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مجاز حقیقت کو چھپاتا نہیں بلکہ دلکش بناتا ہے یعنے حسن راز کر دیتا ہے۔ مجاز ایسی چیز نہیں ہے جس سے راز افشا ہو جائے یا جس کو حُسن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں جیسا کہ آپ نے اپنے اعتراض میں لکھ مارا ہے۔ تمام عالم مجاز ہے اور حقیقت خدا ہے۔ مگر عالم ایک دنیائے رنگ و بو ہونے کی وجہ سے کس قدر خوبصورت ہے اور یہ خوبصورتی حسن حقیقت کی محض ایک جھلک ہے۔ اس پردۂ مجاز سے حقیقت کا راز افشا نہیں ہو گیا بلکہ اس سے راز "حُسن راز" ہو گیا جو ایک عالم کو تڑپا رہا ہے۔

شعر مغز | حیات تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں — ابھی یہ مرحلۂ عمر دراز رہنے دے

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں لفظ (یہ) بالکل زائد استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اس کو حذف کرنے کے

بھی معنی پورے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے مصرعہ میں لفظ تازہ بالکل بیکار ہے۔ محض حیات کہدینا کافی تھا۔ علاوہ اس کے مرحلہ کا دراز ہونا بھی کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شعر یوں ہو سکتا تھا۔

حیات عشق ہے قائم اسی فسانے پر فسانۂ غم الفت دراز رہنے دے

فسانہ کی تکرار اور زیادہ لطف پیدا کر دیتی

عرض عشرت | آپ کے اعتراض میں دو رکن خاص ہیں ایک یہ کہ شعر میں تقابل نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ شعر میں فلاں لفظ زائد ہے۔ خیر مان لیجئے کہ دوسرے مصرعہ میں (یہ) زائد ہے۔ اسے نکال دیجئے اب مصرعہ محض اتنا رہ گیا "مرحلۂ غم دراز رہنے دے"۔ اس کو پڑھتے ہی یا سنتے ہی سوال ہوگا کہ کونسا مرحلۂ غم دراز رہے۔ شاعر نے اسی لئے (یہ) کا لفظ لگا دیا ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ مرحلۂ غم دراز رہے جو اس وقت شاعر سے متعلق ہے یا جسے شاعر اس وقت بھگت رہا ہے۔ مگر اساتذۂ اردو کا یہ پرانا خبط ہے کہ لفظ (یہ) یا (وہ) بغیر 'جو' یا 'جس' وغیرہ کے شعر میں نہیں آ سکتا۔ اگر آ جائے تو زائد ہے۔ ان کے خیال شریف میں جو جملہ 'جو' یا 'جس' سے شروع ہوتا ہے وہ understood یعنی محذوف نہیں رہ سکتا لیکن زمانہ موجودہ کے بہترین شعرا اس فضول بات کے پابند نہیں ہیں۔ چونکہ ان کی شاعری زیادہ تر Suggestions یعنی اشارات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے جو چیز اپنے سے متعلق ہوتی ہے اس کے لئے لفظ (یہ) بلا جملہ موصول کے استعمال کرتے ہیں جس پر اردو کے پرانے دھرانے استادوں کو اور ان کے نالائق شاگردوں کو زائد ہونے کا دھوکا ہو جاتا ہے گو کہ کسی صحیح الدماغ کی سمجھ میں اس سے کوئی اہمال پیدا نہیں ہوتا۔ غور کیجئے۔ آپ کو محض یہ جملہ کہیں لکھا ہوا ملتا ہے "میں یہ پھول ہرگز ہرگز نہ دوں گا"۔ اس جملہ میں جو (یہ) ہے کیا اسے آپ زائد بتائیں گے اور کیا آپ اس سے پوچھیں گے "یہ پھول کون پھول ہے؟" موٹی سی موٹی عقل کا آدمی بھی اس جملہ کو سمجھ لے گا کہ "یہ پھول" سے مطلب وہ پھول ہے جو کہنے والے کے ہاتھ یا قبضہ میں ہے۔ اسی طرح "یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے" سے بھی ہر ایک کی سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ مرحلۂ غم وہ مرحلۂ غم ہے جسے کہنے والا خود بھگت رہا ہے۔ اب مرحلۂ غم کا حیات تازہ سے تعلق بھی سمجھ لیجئے۔ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ اصغر صاحب کا نظریۂ حیات کے متعلق کیا ہے مگر شاید آپ بھول گئے ہوں اس لئے اصغر صاحب کا یہ شعر پھر لکھتا ہوں:۔

یہ مجھ سے سن لے تو راز نہاں سلامتی خود ہی دشمن جاں کہاں ہے رہرو میں زندگی جو کہ راہ ہی پر خطر نہیں ہے

جب تک خطرہ اور مصیبت نہ ہو تب تک اصغر صاحب کے لیے حیات بیکار ہے اس لئے وہ مرحلۂ غم کو دراز رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ پہلے مصرعہ میں لفظ تازہ بیکار ہے آپ لکھتے ہیں کہ "محض

حیات کہدینا کافی تھا؟" بندہ پرور رنگینیاں حیات تازہ یعنے نو بنو میں پیدا ہوتی ہیں۔ حیات میں اگر رنگینیاں ہوں بھی تو بھی وہ مرور ایام سے رنگینیاں نہیں رہ سکتیں۔ اُن سے طبیعت اوبنے اور اکتانے لگے گی۔ بہت دنوں کے استعمال سے امرت بھی زہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن شاید آپ کا خیال نفسیات کے اس اصول کی طرف نہیں گیا جس سے کہ ایک دیہاتی بھی واقف ہوگا۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ رنگینیوں کے لئے حیات تازہ لازمی ہے۔ حیات مزمنہ رنگینیوں کی منافی ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح۔ اس میں وہی فرسودہ مضمون فسانۂ الفت کے دراز رہنے کا ہے جس کو اُردو کے شعرا ہزار بار لکھ چکے ہیں۔ اصغر صاحب کی جدت پسند طبیعت اس سے بھاگتی ہے۔ انچہ نظر تست آں ننگ من است۔

شعر اصغر | عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں　　　تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں

اعتراض نیاز | یہ شعر بھی منجملہ اُن بہت سے "متصوف زدہ" اشعار کے ہے جن کا لطف کسی ولی اللہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ معشوق سے کہا جاتا ہے کہ میں جو تجھ کو دیکھ کے آئینۂ حیرت ہو گیا ہوں تو تیری صورت میری صورت ہو گئی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ عاشق معشوق دونوں کا ہمشکل ہو کر "توام نزاد" نظر آنا واقعہ امکانی ہے تو اس کا غزل یا محبت سے کیا تعلق؟......

عرض حسرت | اس شعر کا تعلق علم معنی و بیان سے تھا لیکن الفاظ "عکس و صورت" سے آپ دھوکا کھا گئے اور استعارہ کو سمجھ نہیں سکے۔ اصغر صاحب نے "نشاط روح" کی ایک نظم میں اس مضمون کو یعنے عاشق معشوق کا عکس ہے بہت روشن طور سے لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:—

نہ جانیے مری بگڑی ہوئی اداؤں پر　　　کہ عاشقی میں مری حسن کی ہے جلوہ گری
جو شوخیوں سے لیا ہے جمال بیتابی　　　تو جوشِ حسن سے پائی ادائے جامہ دری
لئے ہیں زلف سے آشفتگی کے کل انداز　　　نگاہ مست سے پہونچا ہے حسن بے خبری

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ عاشق کو معشوق کا عکس کہنے میں ایک خوبصورت استعارہ ہے جس کے معنی اثر پذیر ہو سکتے ہیں نہ کہ عاشق و معشوق کے ہم شکل ہو کر توام نزاد ہو سکے۔ افسوس ہے آپ اشعار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

شعر اصغر | ہو گئی جمع متاع غم حسرماں کیونکر　　　میں سمجھتا تھا کوئی پردۂ غفلت میں نہیں

اعتراض نیاز | یہاں غفلت سے مراد محبوب کی غفلت و بے پروائی ہے۔ اس لئے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ غفلت میں کوئی نہیں ہے علاوہ اس کے لفظ (کوئی) سے متاع غم کا یوں بھی کوئی تعلق نہیں۔

اگر (کوئی) کی جگہ (کچھ) کہا جاتا تو خیر پہلے مصرعہ سے یک گونہ ربط پیدا ہوجاتا۔

عرض عشرت | آپ اس مقام پر ٹھیک سمجھے کہ غفلت سے مراد محبوب کی غفلت و بے پروائی ہے۔ عاشق نے معشوق کی غفلت دیکھ کے یہ سمجھا کہ یہ غفلت معشوق کی طرف سے ارادۃً نہیں ہے اگر یہ غفلت ارادۃً ہوتی تو اس کے لئے اُردو شعرا لفظ "تغافل" استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال عاشق نے سمجھا کہ اس غفلت کا محرک کوئی نہیں ہے۔ نہ رقیب اور نہ خود معشوق کی طبیعت۔ اسی لئے عاشق کو تسکین تھی کہ چونکہ یہ غفلت دل سے نہیں ہے چند روز میں ہٹ جائے گی۔ پس وہ ناامید نہیں ہوا تھا لیکن جب بہت دنوں کے بعد بھی غفلت نہیں ہٹی تو عاشق کے دل میں متاع حرماں جمع ہوگئی۔ اس لئے عاشق معشوق سے کہہ رہا ہے کہ میں پہلے سمجھتا تھا کہ آپ کی غفلت کا کوئی محرک نہیں ہے مگر اب متاع حرماں سے معلوم ہوا کہ کوئی محرک ضرور ہے ورنہ میرے دل میں ناامیدی نہ پیدا ہوتی۔ کیونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی بات نہ ہوتی تو میرے دل کو حرماں نصیبی نہ ملتی۔ اس مفہوم سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ لفظ (کوئی) شعر کے لئے کتنا ضروری ہے اور اس کا تعلق متاع حرماں سے کتنا ہے۔ اس کے علاوہ معشوق کی حرمت کے لئے عاشق نے بجائے تو یا تم کے لفظ کوئی استعمال کیا ہے جو شعر میں بڑا حسن پیدا کررہا ہے۔ مگر آپ نہ جانے کیوں (کوئی) کو (کچھ) بنا دینا چاہتے ہیں جس سے پہلے مصرعہ سے "یک گونہ" ربط پیدا ہوجائے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ اصغر "یک گونہ" ربط نہیں چاہتے وہ تو دونوں مصرعوں میں ربط کامل کے پابند ہیں مگر ہاں وہ کسی کی سمجھ کے ٹھیکہ دار نہیں ہیں۔

شعر | عشق کی فطرت ازل سے حُسن کی منزل میں ہے قیس بھی محمل میں ہے لیلےٰ اگر محمل میں ہے

اعتراض نیاز | تصوف کا ایک اور مسخ شدہ شعر ملاحظہ ہو۔ وہاں تو غریب قیس کی ساری عمر گذر گئی اور پردۂ محمل تک پہونچنا نصیب نہ ہوا اور یہاں اصغر صاحب اس کو بالکل محمل کے اندر ہی لیلےٰ کے ساتھ ہم آغوش دکھا رہے ہیں۔ عشق کی فطرت کا حسن کی منزل میں ہونا بھی عجیب بات ہے۔ منزل کی جگہ بھی فطرت لکھنا چاہئے تھا لیکن شاید مطلع بنانے کے لیے شعر کو مہمل کردینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

عرض عشرت | اس شعر کا تصوف سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اگر اصغر صاحب کے ہر شعر میں کسی کو تصوف دکھائی دے تو اس احولیت کا کیا علاج؟ شعر میں معمولی سا استعارہ ہے افسوس ہے کہ وہ بھی آپ کی سمجھ میں نہ آیا۔ خیر شعر کے معنی سمجھئے۔ عشق ازل سے فطرتاً اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ اس کو بہت کم لوگ پہچان سکتے ہیں دوسرے الفاظ میں استعارۃً یوں کہا جائے گا کہ گویا وہ ایک محمل میں پوشیدہ رہتا ہے۔ آدم جو اول ہی میں بار امانت کا حامل ہوا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں حسن عشق سے مزین ہوا۔ فرشتوں سے بھی نہ پہچانا گیا

فرشتوں کو یقین تھا کہ وہ آدم سے برتر تھے کیونکہ اُن کی خلقت نور یا آتش سے ہوئی اور آدم کی خاک سے۔ لیکن ہاں حکم خداوندی سے مجبور ہو کر سجدہ کیا۔ گو کہ ابلیس نے جو فرشتوں میں سب سے افضل تھا سجدہ نہیں کیا۔ اب آپ خود غور کریں کہ عشق کی برتری جو آدم میں موجود تھی اُسے فرشتوں نے نہیں دیکھ پایا۔ دوسرے لفظوں میں استعارۃً اس کو یوں کہیں گے کہ ازل ہی سے عشق محل کے اندر ہے۔ اسی لئے شاعر نے کہا کہ جیسے حسن محل کے اندر کہا جاتا ہے ویسے ہی عشق بھی۔ اس لئے حسن اور عشق دونوں ایک ہی منزل میں ازل سے ہیں۔ دوسرا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ 'منزل' کی جگہ بھی 'فطرت' لکھنا چاہئے تھا۔ اس کا فیصلہ اس سے ہے کہ آیا پردہ میں رہنا یا محل میں رہنا حسن کی فطرت ہے یا یہ اس کی منزل ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن کی فطرت پردے میں رہنے کے سخت منافی ہے۔ حسن تو سات پردہ توڑ کر ظاہر ہونا چاہتا ہے چھپنا نہیں چاہتا۔ یہ حُسن کی منزلت ہے کہ اُسے پردہ میں رکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں لفظ 'منزل' ہی صحیح ہے اور 'فطرت' بالکل خلاف فطرت۔ مفہوم کو غارت کر کے یا شعر کو مہمل بنا کے مطلع بنانا جرم گردن زدنی ہے مگر ہاں معترض کو اس کی پروا نہیں رہتی وہ اعتراض کی خاطر چاہے جس شعر کو مہمل قرار دے چاہے وہ بہتر سے بہتر مفہوم کا حامل ہو۔

شعر معز | عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو　　　پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

اعتراض نیاز | تصوف کی شاعری اول تو یوں ہی لغو اور مہمل ہوتی ہے لیکن جب کھلم کھلا اس میں مذہبیات کی اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو اس کا اہمال سخت نفرت انگیز ہو جاتا ہے۔ عرش ایک ایسا لفظ ہے ..... جس کا تعلق مفروضہ عقائد مذہب سے ہے۔ اس لئے جو صوفی شعرا زیادہ پاکیزہ ذوق کے ہیں وہ ہمیشہ ایسے الفاظ سے احتراز کرتے ہیں اور زیادہ تر کنایہ سے کام لیتے ہیں لیکن اصغر صاحب جو لاہوت ایسا مکروہ و ثقیل لفظ استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتے تو ان پر عرش کا کیا بار ہو سکتا ہے۔ معنی کے لحاظ سے جس حد تک یہ شعر بیگانۂ تغزل ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ عشق کا اپنے ساتھ حسن کو لے جانا اور وہ بھی عرش کی منزل تک مجذوبوں کی دنیا کی بات ہے، اور جب تک خود کوئی اسی حد تک بیگانۂ عقل و حواس نہ ہو جائے اس کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اب انداز بیان کا نقص ملاحظہ کیجئے۔ پہلے مصرعہ میں تو یہ خبر دی گئی تھی کہ عشق اپنے ساتھ حسن کو عرش تک لے گیا تھا اس لئے کہ ظاہر ہے کہ ذہن سامع کو آئندہ جستجو اسی کے متعلق پیدا ہو گی کہ وہ عرش کے بعد کہاں گیا لیکن دوسرے مصرعہ میں ذکر کیا جاتا ہے عشق کی منزل کا۔ میری رائے میں یہ شعر یوں ہوتا تو اتنے نقائص نہ پائے جاتے۔

عرش تک تو ساتھ تھے دونوں مگر اب کیا خبر　　　حسن کس منزل میں ہے اور عشق کس منزل میں ہے

عرض عشرت | اگر ناسمجھوں کے لئے تصوف کی شاعری لغو و مہمل ہو تو اس کے محاسن میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں فارسی صوفی شعرا کے ترجمے ہو رہے ہیں اور الفاظ کے استعمال کے بارے میں میں اس سے پہلے ایک شعر کی تشریح میں بالتفصیل لکھ چکا ہوں جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ثقیل سے ثقیل الفاظ مفہوم کے لحاظ سے استعمال کیے جا سکتے ہیں اور ان کے استعمال سے حسن پیدا ہو سکتا ہے مگر افسوس ہے آپ اس نکتہ کو نہیں سمجھتے اور اکثر الفاظ کو بلا مفہوم پر نظر کیے ہوئے ثقیل بتایا کرتے ہیں۔ خیر شعر کا مفہوم سمجھنے کے پہلے اصغر صاحب کا نظریہ حسن و عشق کے متعلق سن لیجئے۔ اُن کی نگاہ میں گو دونوں چیزیں بہتر ہیں مگر پھر بھی وہ عشق کو حسن سے افضل سمجھتے ہیں۔ اصغر صاحب کا ایک شعر عرض ہے۔

سو حسن کر دں پیدا ایک ایک تمنا سے وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصغر صاحب عشق کو حسن سے کہیں برتر سمجھتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ عشق حسن کو اپنے ساتھ عرش تک لے گیا۔ عرش کے آگے حسن کے پر جلنے لگے اس لئے وہ وہیں رہ گیا مگر عشق آگے بڑھتا ہی گیا اور اتنا بلند ہوا کہ اس کی بلندی کی تخصیص کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ عرش کے بعد لامکان کا درجہ ہے مگر شاعر نے عشق کے لئے اس منزل کا بھی تعین نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق لامکاں سے بھی آگے خدا جانے کہاں پہونچ گیا۔ اس لئے شاعر محض یہی کہہ کے خاموش ہو جاتا ہے کہ "پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے"۔ مگر آپ شعر سمجھے نہیں اور اصلاح دینے لگے۔ اصلاح میں بڑے بڑے نقائص ہیں۔ اول تو آپ کے اصلاحی مصرعۂ اولیٰ میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ حسن و عشق میں کون بہتر ہے۔ کیونکہ آپ کا مصرعہ ہے "عرش تک تو ساتھ تھے دونوں مگر اب کیا خبر"۔ اصغر صاحب کے مصرعہ اولیٰ میں ہے کہ عشق حسن کو اپنے ساتھ عرش تک لے گیا یعنی حسن کا عرش تک بھی پہونچنا مشکل تھا مگر عشق اُس کو وہاں تک اپنے ساتھ لے گیا البتہ اس کے آگے حسن عشق کے لے جانے پر بھی نہ جا سکا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عشق حسن سے کہیں بہتر و زبردست ہے۔ مگر آپ کے مصرعہ میں دونوں برابر ہیں کیونکہ دونوں عرش تک ساتھ گئے۔ دویم آپ کے اصلاحی مصرعہ ثانی سے پتہ نہیں چلتا کہ عشق اور حسن میں سے کون بلند ہو گیا اور کون پست رہ گیا مگر اصغر صاحب کے مصرعہ ثانی سے صاف ظاہر ہے کہ عشق نہایت بلند ہو گیا اور حسن محض عرش تک رہ گیا۔ شاعر کا مفہوم تھا کہ عشق حسن سے کہیں بلند ہے مگر اصلاح میں آپ نے شاعر کے مفہوم کو برباد کر دیا جو ہمیشہ سے آپ کا شعار رہا ہے جس کی قلعی شوق سندیلوی کے "اصلاح سخن" سے کھلتی ہے۔

اس کے بعد اصغر صاحب کے بارہ شعر دیے گئے ہیں جن کو عجیب و غریب کا خطاب دیا گیا ہے

اور جن پر مجموعی طور سے ذیل کے اعتراضات کئے گئے ہیں۔

اعتراض نیاز | یہ تمام اشعار نہ صرف تغزل سے خالی ہیں بلکہ مفہوم سے بھی یکسر بیگانہ ہیں۔ چند مفروضات پر ان کی بنیاد قائم ہے اور اس دنیا کے محسوسات و تاثرات سے اُنھیں کوئی واسطہ نہیں۔ دعوے خواہ کتنا ہی لغو کیوں نہ ہو لیکن اگر شاعر اپنی تخییل کے زور سے اس کو ثابت کر دے تو شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اصغر صاحب نے کبھی اس کی زحمت گوارا نہیں کی اور یہ شاید ان سے ممکن بھی نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کا کمال یہی ہے کہ چند خوبصورت الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دے۔ نہ اس کو محل استعمال سے بحث ہونا چاہیئے اور نہ اس سے کہ اُن سے کوئی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر چونکہ فلسفہ و تصوف کی شاعری میں اس کی کافی گنجائش ہے اس لئے اصغر صاحب جو اپنی فطرت کے لحاظ سے "گومگو" قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں بالطبع اس کی طرف مائل ہیں لیکن چونکہ تخییل ان کی خود اپنی نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ فن شعر و بیان و معانی سے ناواقف ہیں۔ اس لئے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ محض لایعنی دعوے پیش کر دینا ہی کمال شاعری ہے۔ ثبوت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی کی اُس متصوفانہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے جو صرف احمد جام زندہ پیل اور شاہ نیاز احمد بریلوی کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ اُنھیں کبھی نہیں ہوا۔ فارسی میں اس رنگ کا سب سے زیادہ دقیق کہنے والا بیدل گذرا ہے اور ایسی ایسی باتیں اُس نے لکھی ہیں جو بظاہر بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ اس کا سارا کلیات چھان ڈالیے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہ نکلے گا جس میں اُس نے کوئی دعوے بغیر ثبوت کے کیا ہو۔

آئینہ۔ خودی۔ حجاب۔ دریا۔ حباب۔ ساز۔ پردہ وغیرہ نہایت عام الفاظ ہیں جن پر تصوف کی شاعری کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اور اصغر صاحب نے تقلیداً انھیں سے کام لیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ بیدل نے ان کے متعلق جو مضامین پیش کیے ہیں وہ خود اس کے ذاتی ہیں۔ اور اصغر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ تقلید ہے اسی لئے اس کے یہاں وسعت مفہوم اور شگفتگی ہے اور یہاں اہمال و ضغطہ۔

عرض عشرت | نیاز صاحب جب آپ اصغر صاحب کا کوئی شعر نہیں سمجھ سکتے تو آپ کی تنقید کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ آپ چاہے جس شعر کو مفہوم و تغزل سے بیگانہ کہیں یا محسوسات و تاثرات سے خالی۔ مگر سمجھ دار دنیا کی نگاہ میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جن سے آپ انکار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے بہترین نکتہ رس مثلاً ڈاکٹر اقبال۔ سر تیج بہادر سپرو۔ مولانا ابو الکلام آزاد وغیرہ کی زبان پر اشعار اصغر کے لئے سوائے تعریف کے اور کچھ نہیں علی گڈھ اور پٹنہ یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں کلام اصغر شامل ہے۔ اس لئے

ہم آپ کے کہنے کا بُرا نہیں مانتے۔

چونکہ اصغر صاحب کی شاعری زیادہ تر محسوسات وتاثرات پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ بیدل کی طرح دعوے کم کرتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں دعوے ہوتا ہے تو اُس کا ثبوت بھی موجود ہوتا ہے یہ بات اور ہے کہ کوئی اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے اُسے سمجھ نہ پائے۔ احمد جام زندہ پیل یا شاہ نیاز بریلوی کے کلام سے اصغر کے کلام کو کوئی واسطہ نہیں۔ سچ پوچھئے تو متقدمین میں سے کسی کے کلام سے اصغر صاحب کی جدت پسند طبیعت نہیں ملتی۔ لیکن ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو الفاظ تصوف کی شاعری میں رائج ہیں انہیں کو اصغر صاحب نے اپنایا ہے۔ مسالا تو پرانا ہے مگر اصغر صاحب نے عمارتیں اُس سے نئی نئی کھڑی کی ہیں۔ مگر جو محدود دماغ صرف کورانہ ماضی پرستی کا قائل ہے وہ ان سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ خیر اب اُن تمام اشعار کے معنی جن کو آپ یکسر مفہوم سے بیگانہ فرماتے ہیں سُن لیجئے۔

(پہلا شعر) حسن بن کر خود کو عالم آشکارا کیجئے ۔۔۔ پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردا کیجئے

(معنی) شاعر خدا سے مخاطب ہے کہتا ہے کہ پہلے آپ خود حسن بن کر تمام عالم پر چھا گئے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ مجھے یعنے مشتاق دیدار عاشق کی ہستی کو پردہ بنا کر پوشیدہ رہتے ہیں۔ دیکھنے والے کی ہستی کو آپ شاید نہ سمجھ سکے ہوں گے لہذا اسے سمجھ لیجئے۔ اس سے مطلب چشم بینا اور عقل وخرد ہے۔ حسن حقیقت سب جگہ آشکارا ہے مگر قیامت یہ ہے کہ ہماری آنکھ اور ہماری عقل اُسے خدا کا جلوہ نہیں کہتی بلکہ اُسے رنگ وبو۔ گل وریحاں۔ دریا پہاڑ وغیرہ کہہ کر ٹال دیتی ہے۔ اس طرح ہماری عقلیں اور ہماری آنکھیں حسن حقیقت کے لیے خود پردہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری ہستی خود پردہ ہے۔

(دوسرا شعر) دیکھتا ہوں میں کہ انساں کُش ہے دریائے وجود ۔۔۔ خود حباب موج بن کر اب تماشا کیجئے

(معنی) یہ شعر تسلیم ورضا پر مبنی ہے انسان اگر دریائے وجود کا تماشا اپنی ہستی اور اپنی مرضی یعنے (ملاّ کملا) اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو قائم رکھتے ہوئے دیکھتا ہے تو اُسے انتہائی تکلیف ہوتی ہے اسی لئے وہ گویا ہر وقت مرتا رہتا ہے۔ یعنی انتہائی رنج وتعب میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی لئے شاعر نے الفاظ "انساں کُش" استعمال کیے ہیں۔ اس موت سے بچنے کے لئے ترکیب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو محو حوادث کردے۔ یعنی جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے سب کو مرضی خدا جان کر بجا و درست سمجھے۔ یعنے اپنی مرضی بھی وہی بنالے جو کچھ ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو مٹا کر اپنی ہی ہستی مٹادے اور حوادث دہر سے اپنی مرضی (ملاّ کملا) ملادے۔ تب گویا وہ وہی ہو جائے گا۔ اب جب انسان خود گویا حوادث دہر ہے تو حوادث سے اُسے کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی اور وہ بڑی خوشی سے

نیرنگیٔ دہر کا تماشا کرے گا۔

(تیسرا شعر) دے مسرت مجھے اور عین مسرت مجھ کو — چاہیئے غم بھی بہ اندازۂ راحت مجھ کو

(معنی) شاعر کا نظریۂ حیات ہم کئی مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ غم و مصائب سے دوچار رہنے کو وہ عین زندگی سمجھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُس کے لئے غم ہی باعث مسرت یا عین مسرت ہے۔ پہلے مصرعہ میں شاعر مسرت یا عین مسرت یعنے غم کا جویا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں وہ چاہتا ہے کہ جتنی راحت اُسے چاہیئے اسی انداز سے اُسے غم ملے کیونکہ غم ہی اُس کے لئے سامان راحت ہے۔

(چوتھا شعر) یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر میری نظر ہونا — یہی ہے دید تو پھر دید بھی اے فتنہ گر ہونا

(معنی) اس کے متعلق شاعر کا نظریہ پہلے سمجھ لیجئے۔ اصغر صاحب کا خیال ہے کہ ایک ہی قوت ہے، جو حسن اور عشق دونوں صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اصغر صاحب کا ایک شعر ملاحظہ ہو:—

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال — چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

جب حسن اور عشق یعنے جلوہ اور نظر دونوں ایک ہی قوت ہیں تب دید ہی ایک چیز ہے جو دوسری غیر ہے شاعر چاہتا ہے کہ کیف دید بھی وہی قوت ہو جائے اور تمام آفت رفع ہو جائے۔ کیونکہ کیف دید ہی ہے جس کی وجہ سے پریشانی پیدا ہوتی ہے۔

(پانچواں شعر) جمال یار کی زینت بڑھا دی رنگ و صورت نے — قیامت ہے، قیامت میرا پابند نظر ہونا

(معنی) حسن حقیقت میں کوئی رنگینی نہ تھی۔ اگر دیکھنے والے رنگ و صورت کے پردے میں اُسے نہ دیکھتے۔ اور اس رنگینی سے ایک عجیب دلفریبی پیدا ہوئی جس میں ایک عالم مبتلا ہو کر حقیقت سے بے خبر رہ گیا اس لئے شاعر کہتا ہے کہ میرا پابند نظر ہونا۔ یعنی محض رنگ و صورت سے اُلجھ کر رہ جانا قیامت ہے۔

(چھٹا شعر) طلسم رنگ و بو کو جس نے سمجھا مٹ گیا اصغر — نظر کے لطف کا برباد ہونا ہے نظر ہونا

(معنی) اگر کسی ڈراما میں کوئی پردہ نہایت خوبصورت بنا ہو تو اُس سے ایک خاص حظ ملے گا۔ مگر صرف اُس کو جو نقاش پردہ کے فریب میں آجائے یعنے جہاں اُس نے چند رنگیں نقوش سے باغ دکھایا ہو وہاں باغ سمجھے اور جہاں اُس نے نیلے رنگ سے پانی دکھایا ہو وہاں پانی سمجھے۔ جو شخص اُسے یہ کہہ کر ٹال دے گا یہ کچھ نہیں ہے صرف رنگ کا فریب ہے اُسے کوئی لطف نہ ملے گا۔ اگر تصور سے لطف اُٹھانا ہے تو مصور جتنا فریب دینا چاہتا ہو اُتنا فریب کھانا چاہیئے۔ اسی مضمون کو اصغر صاحب نے "نشاط روح" میں بھی ایک جگہ کہا ہے ملاحظہ ہو؎

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے — میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

اسی مضمون کو اصغر صاحب نے اس شعر میں بھی ادا کیا ہے۔ اس شعر میں پہلے لفظ "نظر" کے معنی ہیں دیکھنے والی قوت یعنی بصارت کے اور دوسرے لفظ "نظر" کے معنے سمجھنے والی قوت یعنی بصیرت کے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عالم ایک طلسم رنگ و بو ہے جو اس کے فریب میں رہتا ہے وہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ مگر جو اس طلسم کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ محض طلسم ہے اُس کا سارا لطف زندگی برباد ہو جاتا ہے۔ دنیا میں اُس کے لئے کوئی رنگینی باقی نہیں رہتی اس لئے شاعر کہتا ہے کہ نظر پیدا ہونا یعنی بصیرت حاصل ہونا نظر کے لطف کا یعنی بصارت کے لطف کا برباد ہونا ہے۔

(ساتواں شعر) ذرہ ذرہ ہے یہاں کا رہرو راہ فنا سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں

(معنی) عالم کا ذرہ ذرہ فنا کی طرف جا رہا ہے۔ اگر بالغ نظری ہو تو یہ مناظر ہم روز دیکھتے ہیں یعنی یہ سامنے کی بات ہے اس لئے اس کی صداقت کے لئے نہ کسی ثبوت کی ضرورت ہے اور نہ اس میں کسی شک کی گنجائش۔ مگر دنیا کے لوگ باوجود دن رات مناظر فنا دیکھنے کے اُس کو ایک مسلم الثبوت صداقت نہیں سمجھتے بلکہ محض ایک خبر سمجھتے ہیں جو ممکن ہے سچ ہو اور ممکن ہے غلط ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ دنیا کی محبت کے فریب میں آجاتے ہیں ورنہ اگر مناظر فنا سے عبرت حاصل کریں تو دنیا کی کسی چیز سے وابستہ نہ ہو کر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے زندگی گذار دیں جیسا کہ اکابر مذاہب کا شعار رہا ہے۔

یہ شعر سر تیج بہادر سپرو نے اپنے انتخاب میں لیا ہے اس پر اعتراض کر کے آپ نے اُن کے ذوق سلیم پر بھی حملہ کیا ہے۔

(آٹھواں شعر) رقص مستی دیکھئے جوش تمنا دیکھئے سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھئے

(معنی) شعر بہت صاف ہے اور زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم کسی طرح معشوق کو اپنے سامنے لے آتے تو کیا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت تمناؤں میں ایک جوش ہوتا اور خود شاعر دنیا و مافیہا کو بھول کر ایک مستی کے عالم میں ہوتا۔ اتنا ہی نہیں مستی خود ایک مستی کے عالم میں آکر رقص کرنے لگتی۔

(نواں شعر) اس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہ شوق میں جلوہ خود بیتاب ہو جاتا وہ پردہ دیکھتے

(معنی) شاعر کہتا ہے کہ نگاہ شوق میں اس طرح کا رنگ بھر جاتا۔ یعنے اتنی سچی لگن ہوتی کہ جب یہ نگاہ شوق پردہ پر بیتابانہ پڑتی تو خود حسن یعنے جلوہ کو ترس آتا اور وہ خود ظاہر ہونے کے لیے بیتاب ہونے لگتا۔

(دسواں شعر) ترے قربان ساقی اب یہ کیا حالت ہے مستوں کی کبھی عالم تو ہوتا ہے کبھی عالم نہیں ہوتا

(معنی) شعر نہایت صاف ہے۔ تعجب ہے کہ اس کا بھی مفہوم سمجھ میں نہیں آسکا۔ سنئے شاعر جو کہ ایک رند ہے ساقی کے قربان جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ عالم مستی میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کبھی تمام عالم موجود معلوم ہوتا ہے

اور کبھی اُس کا وجود گم ہو جاتا ہے۔

گیارھواں شعر) یہ اقرار خودی ہے دعویٰ ایمان و دیں کیسا　　　ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

(معنی) واقعی مفہوم کے اعتبار سے شعر بہت اعلےٰ ہے اس لئے ممکن ہے کہ عوام کی سمجھ سے باہر ہو۔ خدا کے بارہ میں جو کچھ مختلف مذاہب یا فلسفہ و سائنس میں ملتا ہے اُسے آدمی اپنی فہم کے مطابق سمجھ کر اپنے خدا کو تشکیل دیتا ہے۔ انسان کا خدا در اصل انسانی دماغ کی پیداوار ہے ورنہ اُس کی اصلیت کسی کو معلوم نہیں اسی مضمون کو اصغر صاحب نے "نشاط روح" میں یوں کہا ہے ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

اسی لئے شاعر کہتا ہے کہ خدا کا اقرار جو دعوے دین و ایمان پر مبنی ہے اقرار خدا نہیں ہے بلکہ اقرار خودی ہے۔ خدا کا اقرار جب ہی ممکن ہے جبکہ آدمی اپنے سے علیحدہ ہو جائے۔ اپنے سے علیحدہ ہونے پر اگر کوئی شے خدا دکھائی پڑے تو واقعی اُس کا اقرار خدا کا اقرار ہوگا۔

بارھواں شعر) بہار جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے　　　نظر کے سامنے حسن نظر مجسم ہے

(معنی) یہ شعر اُن لوگوں کے لئے صاف ہے جو موجودہ فلسفہ کی (Subjectivity) سے واقف ہیں۔ برکلے اور مصنف ویدانت و یاس وغیرہ کا مقولہ ہے کہ دنیا میں کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ تمام اشیا کو ہم لوگوں نے اپنے احساس سے پیدا کر لیا ہے۔ شاعر کی نگاہ اس حقیقت تک پہونچ چکی ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ اب بہار جلوہ رنگیں کی ساری حقیقت یوں معلوم ہوتی ہے کہ گویا اپنا ہی حسن نظر مجسم ہو گیا ہے اور بس۔

تیرھواں شعر) جسم کو اپنا سا کر کے لے اُڑی افلاک پر　　　اللہ اللہ یہ کمال روح جولاں دیکھئے

(معنی) یہ شعر بھی بہت صاف ہے۔ روح میں جب کمال پیدا ہو جاتا ہے تو وہ دور دور تک کی سیر اس طرح کراتی ہے کہ گویا وہ معہ جسم کے وہاں گئی تھی۔ وہاں کی چیزیں اس طرح صحیح صحیح بیان کرتی ہے کہ گویا اپنی آنکھوں دیکھی بیان کر رہی ہے۔ پہونچے ہوئے لوگ ہزاروں میل کے جزئیات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا وہ وہیں بیٹھے ہوئے تھے اسی مضمون کو شاعر کہتا ہے کہ روح نے گویا میرے جسم کو بھی لطیف بنا دیا اور معہ جسم کے افلاک پر اُڑ گئی۔ اس شعر میں واقعۂ معراج کی طرف بھی اشارہ ہے۔

چودھواں شعر) ایک میرا ہی فسانہ نازل تا بہ ابد　　　یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھ کو

(معنی) شعر نفسیات کا معمولی مسئلہ سامنے رکھتا ہے۔ ایک آدمی کے سامنے اُسی کے کارنامے کافی دیر تک لیتے رہیے تو اگر وہ باحیا انسان ہے تو محجوب ہونے لگے گا۔ انسان خدا سے کہتا ہے کہ ازل سے لے کر ابد

تک میرا ہی فسانہ کہا جا رہا ہے۔ مجھ کو میرے ہی سامنے اس طرح رسوا نہ کرنا تھا۔

(پندرھواں شعر) میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے، آصغرؔ — کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

(معنی) یہ شعر اصغرؔ صاحب کا کارنامہ ہے اور اس کی قدر صاحبانِ دل ہی کر سکتے ہیں۔ عاشقانِ حقیقی کے لئے حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے۔ طالب کہتا ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ مجھے معشوق کی طلب اور ضرورت ہے۔ مجھے یہ کیا خبر تھی کہ خود معشوق مجھ پر اتنا کرم کرے گا کہ خود مجھے وہ سراپا لے کر اپنا لے گا۔

(سولھواں شعر) حوصلے عشق کے پامال ہوئے جاتے ہیں — اب یہ بیداد کہیں حسن پہ بیداد نہ ہو

(معنی) یہ شعر مومن کے رنگ میں نہایت کامیاب تغزل کا نتیجہ ہے۔ اصغرؔ صاحب مومن خاں کے سلسلہ میں ہیں بھی اس لئے ایسا شعر کہنا اُن کے لئے زیبا اور انسب ہے۔ نیاز صاحب آپ مومن خاں کے بڑے معرفوں میں ہیں اور نگار میں مومن نمبر بھی نکال چکے ہیں۔ پھر اس شعر کا آپ کی سمجھ میں نہ آنا تعجب سے خالی نہیں ہے۔ سُنیئے۔ بیدادِ معشوق بڑی بہتر چیز ہے جس کا عاشق بڑے جوش اور سرگرمی سے استقبال کرتا ہے۔ مگر بیداد کی ایک حد ہوتی ہے اُس کے بعد بیداد کا کوئی لطف نہیں رہ جاتا۔ جگر صاحب کا ایک مصرع ہے۔ ع کیا لطف جب ہمیں نہ رہے اختیار میں۔ جب بیداد اس مقام پر پہونچ جاتی ہے تو عاشقوں کے حوصلے پامال ہونے لگتے ہیں۔ لوگ عشق کرنے سے ہچکنے لگتے ہیں۔ جب لوگ عاشقی سے بھاگنے لگیں گے تو حسن کا کوئی قدرداں نہ رہ جائے گا اور یہ انتہائی ظلم جو عاشقوں پر کیا گیا تھا خود حسن کے لئے ظلم ہوگا۔

(سترھواں شعر) اب نہ یہ میری ذات ہے اب نہ یہ کائنات ہے — میں نے نوائے عشق کو ساز سے یوں ملا دیا

(معنی) اس شعر میں ایک معمولی سا استعارہ تھا جس کا فہم سے باہر ہو جانا سوائے بدقسمتی کے اور کیا ہے۔ سُنیئے جب گانے والا اپنی آواز ساز سے ملا دیتا ہے اور دونوں میں انتہائی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو ایک مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے جس میں دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ میں نے نوائے عشق کو ساز سے یعنے مظاہرِ حُسن سے اس طرح ملا دیا کہ اب ایک مستی کا عالم ہے جس میں مَیں اپنی ہستی کیا ہستی عالم فراموش کر بیٹھا۔

(اٹھارھواں شعر) عکسِ جمالِ یار کا آئینۂ خودی میں ہے — یہ غمِ ہجر کیا دیا مجھ سے مجھے چھپا دیا

(معنی) یہ شعر عوام کے لئے ذرا مشکل ضرور ہے مگر سمجھ داروں اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے نہیں۔ اصغرؔ صاحب کے نظریہ (تصوریت Subjectivists) کا ہم ایک بار ذکر کر چکے ہیں کہ وہ حسنِ معشوق کو اپنے ہی خیالات و تصورات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے جب معشوق سامنے رہتا ہے (یعنی حالتِ وصل میں) تو معشوق کا حسن سامنے نہیں رہتا بلکہ عاشق آئینۂ خودیٔ عاشق میں جمالِ یار کا گویا عکس دیکھتا ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن ہجر میں عاشق عین بیتابی میں بے خود ہو جاتا ہے اور معشوق کا تصور بھی نہیں جا سکتا جو کہ خود اُس کے ہی

دماغ کا نتیجہ ہے۔ اسی کو شاعر نے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا ہے کہ حالت ہجر میں عاشق خود اپنے کو نہیں دیکھ پاتا۔

ابھی تک جناب نیاز اُن اشعار پر تنقید کرتے رہے جو یکسر مفہوم سے معرا تھے مگر جن کی حقیقت ناظرین کرام پر بخوبی روشن ہو چکی ہے۔ اب نیاز صاحب اصغر صاحب کے ان اشعار پر تنقیدی لیاقت دکھاتے ہیں جن میں اُن کی فہم کے مطابق کوئی مفہوم تو ہے لیکن کوئی نہ کوئی نقص اس میں ضرور پایا جاتا ہے۔ انشاء اللہ اس کی بھی حقیقت کھلی جاتی ہے۔

قطعات

(جناب حکیم افتخار علی صاحب جگر صدیقی دارثی)

آئینہ جب سامنے آئے نظر کر غور سے　　شکل اچھی ہے تو اُس سے بڑھ کے اچھے کام کر
اور اگر برعکس ہے دو عیبوں کو یکجا نہ کر　　ہے بُری صورت بُرے کاموں سے اپنے دل میں ڈر

جو دیکھتے ہیں تو ناپائدار دنیا میں　　برائے نام خوشی ہے مگر بہت سے ہیں غم
اگر لگاتے ہیں بحر جہاں میں ہم غوطہ　　تو سنگریزے ہیں ملتے زیادہ موتی کم

کسی کے دم پہ بنی ہے خمار پیری سے　　کسی کو دیکھو تو ہے بادۂ شباب سے مست
کچھ ایسا پردۂ غفلت پڑا ہے آنکھوں پر　　زمانہ جام بہ دست و جنازہ بر دوش است

ایک نکتہ خوب ہے یہ بہر تسخیر قلوب　　گر تجھے منظور ہے مجھ پر زمانہ جان دے
ابر کے مانند عالی ہمتی سے کام لے　　دے ضرورت پر جسے جو کچھ دے بے احسان دے

ایک نے سقراط سے اک دن کہا　　اے حکیم وقت مرد با خدا
وہ جو ہے اک مرد جاہل خود نما　　اُس نے گالی دی بُرا تجھ کو کہا
ہنس پڑا یہ سن کے مرد با صفا　　یہ جواب اپنے مخاطب کو دیا
اُس نے غیبت میں بُرا مجھ کو کہا　　سامنے تو گالیاں ہے دے رہا

شیر شاہ سُوری کے چند آئینی نقوش

(جناب منشی انوار احمد علوی صاحب بی اے)

(بسلسلۂ ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء)

مال گذاری

سلطنت دہلی کے ابتدائی سلاطین خود کو زمین کا حقدار سمجھتے اور اسی بنا پر کل زمین کی پیداوار کو اپنا حق جانتے اور غریب کاشتکار کے لئے صرف اس کی وجہ معاش کے لئے کچھ چھوڑ دیتے۔ سلطنت کا کوئی مقررہ اصول پیداوار کے متعلق نہ تھا۔ مال گذاری یا تو قیاس سے طے ہوتی تھی یا تخمینہ لگا کر شمار کی جاتی تھی۔ علاؤالدین خلجی نے سب سے پہلے جریب کے طریقے کو رائج کیا لیکن اس طریقے نے زیادہ رواج نہ پایا کیونکہ اس کی موت کے بعد ہی غازی الدین تغلق نے اپنے افسروں کو جو ہدایات مال گذاری کے متعلق کیں وہ یہ تھیں۔

"مال گذاری کی تشخیص یا تو قیاس پر کرو یا اطلاع دینے والوں کی اطلاع کے بموجب تخمینہ لگا کر اندازہ کرو"۔ (ضیاء برنی صفحہ ۴۲۹ = الیٹ جلد سوم صفحہ ۲۳۰)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر علاؤالدین کے طریقے نے رواج پا لیا ہوتا تو ہدایات اس طرح کی نہ ہوتیں۔ علاؤالدین نے کل پیداوار کا نصف سلطنت کا حق قرار دیا۔ اس کے علاوہ بھینس۔ بکری اور گائے کے اوپر بھی ٹیکس مقرر تھا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں دوآبہ کے ہندؤں کی شرارت کی بنا پر اس مال گذاری میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔ مگر یہ صرف دوآبہ کے لئے تھا اور دوسرے مقامات اس سے محفوظ تھے۔ فیروز تغلق کی تخت نشینی پر اس میں تبدیلی ہوئی۔ لیکن حاکم اور محکوم میں براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب حیانہ طریق عمل اور شاہی مراعات خاک میں مل جاتے تھے کیونکہ سپاہیوں کی دست برد اور ہند و مقدموں کے بے جا ظلم و تعدی سے غریب کاشتکار بالکل پس جاتے تھے۔ سپاہیوں کو تنخواہ کے عوض جاگیر دینے کا طریقہ ہمایوں کے زمانہ تک رہا (صرف علاؤالدین خلجی کے عہد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا) جاگیردار اور افسران فوج اپنی رعیت پر بالکل خود مختارانہ طریقے سے حکومت کرتے اور جو چاہتے اُن سے وصول کر لیتے۔ مقدم اور چودھری بھی اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھ کر غریب کاشتکاروں سے خوب روپیہ وصول کرتے تھے اور اگر زمیندار کبھی کمزور ہوا تو وہ خود زمیندارانہ حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔ اور چونکہ مال گذاری وصول کرنے کے طریقوں سے یہی لوگ واقف ہوتے تھے اس بنا پر حاکم اور محکوم دونوں ان کے ہاتھ میں تھے۔ ابھی تک کسی بادشاہ یا وزیر نے اس محکمہ کی

جانچ نہیں کی تھی جو ازسرتا پا غبن اور ہر قسم کی خرابیوں سے پُر تھا۔ اس خرابی کا علاج علاؤ الدین کا جور اور تعدی نہ تھا۔ بلکہ اس کا علاج یہ تھا کہ رعیت اور سلطان میں براہ راست تعلق ہو۔ مال گذاری مناسب اور واجب ہو اور اس کی تشخیص کے لئے کوئی آزمودہ طریقہ کار ہو۔

شیر شاہ نے تخت نشین ہو کر اسی طریقہ پر عمل کیا جو اُس نے اپنی جاگیرداری کے وقت سہسرام میں جاری کیا تھا۔ زمین کی پیمائش ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق کی گئی۔ سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں زمین کی پیمائش گز سے ہوتی تھی جس کی لمبائی ۳۲ اُنگل ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے سوتی جریب ۵۵ گز فی گز ۳۳ انچ ایجاد کی (اسی پر اکبر نے اتنا اضافہ کیا کہ رسّی کے بجائے بانس سے بیگھہ کی پیمائش ہونے لگی)۔ بیگھہ اور جریب دونوں ہم معنے تھے۔ ایک جریب یا بیگھہ میں ۳۶۰۰ مربع گز ہوتے تھے۔ ہر کاشتکار کی زمین کی علیحدہ علیحدہ پیمائش ہوتی تھی اور پیداوار کا چوتھائی حصہ بطور سرکاری مال گذاری کے مقرر تھا۔ اس سے قبل یہ طریقہ تھا کہ کاشتکار مال گذاری چاہے غلہ کی شکل میں ادا کرے چاہے نقد۔ لیکن ترجیح دوسرے ہی طریقے والے کو تھی۔ شیر شاہ نے اسی طریقہ کو جاری رکھا۔

"پیمائش کرنے والوں کا مستقل عملہ ملازم رکھا گیا۔ ہر جدید پیمائش کی رو سے افراد جمع بندی تیار ہوئیں اور ان کی رو سے خراج بحق دیوان (سلطنت) وصول ہوتا، پیداوار زرعی کا نصف حصہ کاشتکاروں کا حق ہوتا۔ اور نصف حصہ میں سے آدھا مقدم (زمیندار) کو ملتا۔ آدھا بحق دیوان وصول ہوتا۔ مقدم کا استحقاق اس لئے رکھا گیا کہ وہ گاؤں کا نگراں ہوتا، کاشتکاروں کی ضروریات کا مہیا کرنا، اُن کے خانگی تنازعات کا تصفیہ کرنا، وصولی میں شاہی ملازموں کو مدد دینا، ہر قابل انتظام امور کی حاکم پرگنہ کو اطلاع دینا، یہ سب کام اس کی ذات سے تعلق رکھتے۔"

(صولت شیر شاہی۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ ۱۹۳۳ء۔ صفحہ ۹۶)

یوں تو مقدم مال گذاری وصول کرتے۔ لیکن رعیت سے اس بات کی خواہش کی جاتی کہ وہ براہ راست خزانہ میں داخل کریں تاکہ مقدم کی اہمیت کم ہو اور رعایا اور بادشاہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں۔ بہت سے خلاف قانون ٹیکس جو اب تک جاری تھے اور جن سے مال گذاری وصول کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ وہ سب شیر شاہ نے موقوف کر دیے۔ شیر شاہ نے صرف ۲ وہ نئے ٹیکس لگائے۔ جریبانہ۔ محصلانہ اور ان دونوں کی مقدار وہ خود ہی مقرر کرتا تھا۔

"جریبانہ و محصلانہ و خوراک محصلاں معین ساختم۔"		(عباس صفحہ ۲۸)

تشخیص لگان اور وصول یابی کی اجرت اسی طرح حصہ مال گذاری میں شامل تھی۔ افسروں کا بھتہ

اور وصول یابی کا کمیشن غالباً شاہی خزانہ سے دیا جاتا تھا، اگر آئین اکبری کی مندرجہ ذیل عبارت پر اعتبار کیا جائے، جس میں ٹیکس جمع کرنے والے افسروں کو ہدایات کی گئی ہیں۔ عبارت یہ ہے :-

"جب گاؤں کے مکھیا (مقدم) کی کوشش سے کل مال گذاری وصول ہو جائے اسے (افسر مال گذاری کو) چاہیئے کہ وہ ہر بیگہ زمین پر نصف بسوہ بطور انعام اسے دے۔ یا یہ معاوضہ کسی اور شکل میں دے۔"

اس عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ۲½ فی صدی مقدم کو دیا جاتا تھا۔

اب ذرا الیٹ صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیے :-

"اس نے (شیرشاہ) اپنے گورنروں کو ہدایت کی کہ ایک حصہ کا نصف کاشتکار کو دیا جائے اور باقی نصف کا نصف مقدم کو دیا جائے[۱۵]۔"

عباس کے مسودہ میں اس عبارت کا ذکر نہیں۔ یہ بات ذرا بعید از قیاس ہے کہ شیرشاہ جو مقدم کی اہمیت کو کم کرنا چاہتا تھا کس طرح نصف مقدم کو دیتا۔ اکبر کے زمانے میں ۲½ فی صدی ملتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ۵ یا ۱۰ فی صدی دیتا لیکن نصف یعنی ۵۰ فی صدی وہ کسی طرح نہیں دے سکتا تھا۔ آج کل سرکار انگریزی بھی مقدم یا نمبردار کو پانچ فی صدی ہی دیتی ہے۔ اس واسطے صولت شیرشاہی اور الیٹ صاحب کا یہ بیان کہ "پیداوار کا نصف حصہ کاشتکاروں کا حق ہوتا اور نصف کا نصف مقدم کو ملتا۔" ذرا بعید از قیاس اور مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے۔

شیرشاہ حاکم و محکوم کے تعلقات میں یکسانیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ "اگر رعیت کے ساتھ تھوڑا سا سلوک کیا جائے تو اس سے بادشاہ ہی کو فائدہ پہونچتا ہے۔" اس کی عام ہدایت اپنے مال گذاری وصول کرنے والوں کو یہ تھی کہ :-

"تشخیص لگان کے وقت جتنی رعایت ممکن ہو کرو لیکن وصولی کے وقت رعایت پاس نہ پھٹکنے پائے۔"

چونکہ شیرشاہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مکمل وصولی ہی سے اوپر سلطنت کی بقا ہے اس واسطے سے بالکل خوشی اس بات کی نہ ہوتی تھی کہ اس کے ملازمین کا غذ کے اوپر بہت مال گذاری کی امید دلائیں اور وصولی کے وقت اس کا قلیل حصہ خزانہ میں آئے۔ بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ جتنی بھی مال گذاری ہو خواہ وہ قلیل ہی رقم کیوں نہ ہو سب وصول ہو جائے بقایا نہ رہنے پائے کیونکہ بقایا بقائے سلطنت کے لئے بہت مضر ہے۔ بجز اس کے کہ بارش بالکل نہ ہو اور خشک سالی کی

---

[۱۵] الیٹ جلد چہارم صفحہ ۴۱۳

بنا پر کاشتکار موعودہ رقم نہ ادا کر سکے اور کوئی صورت مال گذاری نہ ادا کرنے کی نہ تھی ایسی صورت میں کاشتکاروں سے خاص رعایت ہوتی تھی۔ اور یہ سختی بالکل بجا تھی کیونکہ تشخیص لگان کے وقت انتہائی نرمی سے کام لیا جاتا تھا۔

سلطنت کے ذرائع آمدنی میں اُس نے دو طریقے سے اور اضافہ کیا۔ ایک تو سپاہیوں کو تنخواہ کے عوض جاگیریں دینا بند کر دیں۔ اور دوسرے بہت سی زمینیں جو متولیان مسجد نے ناجائز طریقے سے دبا رکھی تھیں اُن کو تحقیقات کر کے اُن کے قبضے سے نکال دیا۔ لودی سلاطین کے زمانے میں بیشمار مساجد کی تعمیر ہوئی اور اُن کے اخراجات کے لئے زمینیں وقف کر دی گئیں ان مساجد کے اماموں نے سلطان ابراہیم لودی کے افسروں کو رشوتیں دے کر ناجائز طور پر بہت سی زمینیں حاصل کر لیں۔ ان باتوں کی اطلاع پا کر شیر شاہ نے بذات خود تفتیش کی اور ایسی تمام ناجائز طور پر حاصل کی ہوئی زمینوں کو اُن کے قبضہ سے نکال لیا۔ اور جتنی زمین کہ جائز تھی اس کا فرمان عطا کیا۔ لیکن چونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ قابل اعتبار نہیں ہیں اس واسطے ایسے تمام فرامین اُس نے اُن کے ہاتھوں میں نہیں دیے بلکہ سرکار متعلقہ کے شقداروں کے پاس براہ راست وہ فرامین بھجوا دیے۔ اس کے بعد اُس نے سفر خرچ دے کر رخصت کیا۔ اس طریقہ سے سلطنت کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ (الیٹ جلد چہارم ص۴۲۳)

شیر شاہ کا یہ ملکی و مالی نظام جو ٹوڈرمل کے بندوبست کے نام سے مشہور ہے مغلوں کے عہد میں بھی قائم رہا اور عہد انگریزی میں بھی مع اپنے ضروری اجزا کے "رعیت داری" طریقہ کے نام سے جاری ہے اور اس کی متفقہ طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ اُس کا منشا اور قصد تو یہ تھا کہ اس طریقہ کو اپنے پورے ممالک محروسہ میں جاری کرے لیکن عملی دقتوں اور چند ملکی مصالح نے اُسے اس بات پر مجبور کیا کہ بعض حصص ملک میں وہ اُن جگہوں کے مروج طریقہ پر عمل کرے۔ چنانچہ ملتان میں اُس نے ہیبت خاں نیازی کو حکم دیا کہ وہ وہاں کے باشندوں کے رسم و رواج کا لحاظ کرے اور ۱/۴ حصہ لگان بلا پیمائش کے وصول کرے۔

صدر شقدار کی عملی سرگرمیوں سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ اس مالی و ملکی نظام پر عمل درآمد کتنی سختی سے ہوتا ہے۔ حمید خاں گکر۔ نگر کوٹ۔ جوالا مکھی۔ دھداول اور کوہستان جموں پر حاکم تھا اور اس قدر رعب داب کا حاکم تھا کہ پہاڑی قوموں میں سے کسی کو بھی اُس کے آگے چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔ ان پہاڑیوں سے اُس نے زمین کی پیمائش سے لگان وصول کیا۔ عیسیٰ خاں شروانی

سنبھل میں تھا اور اتنی سختی اس نے وہاں کے سرکش زمینداروں پر کی کہ وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ ان جنگلوں کو جو بغاوت کے وقت اُن کی جائے پناہ ہوا کرتے تھے کاٹ کر لگان ادا کریں ہیبت خاں نیازی نے قنوج کے متمرد لوگوں کو پیمائش کے بعد لگان دینے پر مجبور کیا۔

ظاہر ہے کہ ان سختیوں کو وہ طبائع جنھیں خلاف قانون زندگی بسر کرنے کی عادت پڑ گئی ہو۔ جو گذشتہ بیس برس سے من مانی حکومت کرتے ہوں اور جنھیں کسی بیرونی مداخلت کا شان و گمان بھی نہ ہو کیونکر برداشت کر سکتی ہیں۔ نتیجہ جو ہونا چاہیئے وہی ہوا یعنی دریائے جمنا اور چمبل کے مضافات کے زمینداروں نے متحدہ طور پر بغاوت کر دی۔ شیر شاہ نے سنبھل سے ۱۲۰۰۰ فوج بلا کر اُن کی قرار واقعی گوش مالی کی۔

اگر شیر شاہ دس بیس برس اور زندہ رہتا تو زمینداروں کا طبقہ یا تو بالکل قابو میں آجاتا یا اس کا وجود ہی نہ رہتا اور ہندوستان کے طول و عرض میں سوائے محنتی اور ایماندار کسانوں کے اور کوئی نظر نہ آتا۔ جن کی تمام تر توجہ اپنی زمین کی بہتری میں صرف ہوتی اور جن کے دل و دماغ اپنے ارد گرد کی مسموم فضا سے بالکل پاک و صاف ہوتے۔ لیکن شیر شاہ کی زندگی اتنی مختصر ہوئی کہ سلطنت کے دور و دراز حصے پرانے طرز کے زمینداروں سے آباد رہے۔ لیکن وہ اتنے خطرناک نہ تھے کیونکہ وہ سب سرحد پر تھے اور انھیں بیرونی حملہ کے خلاف اپنی تمام تر توجہ صرف کرنی پڑتی تھی چہ جائیکہ وہ ہندوستان میں بغاوت کا خیال کر سکیں۔

سکّہ

شیر شاہ نے تخت نشین ہو کر دار الضرب کی حالت زراعت سے بھی بدتر پائی۔ سونے اور دیگر ادنیٰ دھاتوں میں کسی تناسب کے نہ ہونے سے اور دھاتوں میں میل ہونے کی وجہ سے سکّے بالکل دور از کار اور بیکار ہو رہے تھے۔ اس نے بہت جلد سکوں کی طرف توجہ کی۔ اعلیٰ پیمانہ پر ان کا انتظام کیا جتنے پرانے آمیزش والے سکّے تھے ان سب کو موقوف کر کے نئے سکّے رائج کئے۔ اس نے بہت کثیر تعداد میں ایک نیا تانبے کا سکہ رائج کیا جو بعد میں دام کے نام سے مشہور ہوا۔ جس کے متعدد حصّے بھی مثل ½ - ¼ - ⅛ - 1/16 کے تھے۔ اس سے فوج کو نقد تنخواہ دینے کی فوری ضرورت پوری ہو گئی۔

طامس کی رائے ملاحظہ ہو:۔

"شیر شاہی عہد ہندوستان کے سکوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ اُس نے نہ صرف دار الضرب درست کرائے بلکہ گذشتہ بادشاہوں کے سکوں میں جو خامیاں تھیں انھیں

دور کیا۔ جنھیں بعد کو مغلوں نے اپنا لیا۔"

(Thomas: Chronicles of the Pathan Kings P. 403)

ہندوستانی سکہ جات کے اوپر لکھتے ہوئے Smith صاحب باوجود اپنی اکبر نوازی کے یہ قم طراز ہیں:۔

"شیر شاہ کے سر سکوں کی باقاعدہ تنظیم کا سہرا ہے۔ اس کے اس طریق کو بغیر کسی تغیر و تبدل کے مغلوں نے جاری رکھا اور انگریزوں نے بھی ۱۸۳۵ء تک اس پر عمل کیا اور انگریزوں کا موجودہ انتظام بھی قریب قریب وہی ہے۔ اس نے خراب قسم کی آمیزش کے سکے یک قلم موقوف کر دیے اور سونے، چاندی اور تانبے کے سکے باہم وزن میں تناسب رکھ کر ایجاد کیے۔ اس کے چاندی کے روپیہ میں جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا۔ ۱۷۵ گرین خالص چاندی ہوتی تھی۔ اس طرح سے اس کا روپیہ موجودہ روپیہ کے برابر تھا۔"

(Imperial Gazetteer ii 145-146)

شیر شاہی سکّے ایک حیثیت سے اور قابل لحاظ ہیں۔ ان کی وجہ سے بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ اُن کی بدولت اُس کے ملکی حدود اور دیگر معلومات حاصل ہوئیں۔ فارسی مورخین بہت زیادہ ناقابل اعتبار ہیں۔ اُنھوں نے کہیں بھی اس کی فتح سندھ کا ذکر نہیں کیا۔ سکوں پر ٹکسال کا نام موجود ہونے سے اُن کی تاریخی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ گو کہ یہ قاعدہ کوئی نیا نہ تھا پھر بھی شیر شاہ نے اس کو ترقی دی اور اکبر نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ یہ صرف اس کے سکوں ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی سلطنت کوہستان آبو اور سکر بھکر (سندھ) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اگر یہ سکّے نہ ہوتے تو مختلف مورخین کے بیان سے جو غلط فہمی پیدا ہوتی تھی اس کا اندفاع نہ ہوتا۔ اس کے سکوں سے ایک بات اور ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مفتوحہ ممالک میں کس قدر جلد انتظام قائم ہو جاتا تھا۔ زمین کی پیمائش۔ سڑکوں کی تعمیر۔ دار الضرب کا قائم ہونا۔ یہ سب گویا اس کی افواج کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ جو سکّے ۹۴۷ھ، ۹۵۰ھ، ۹۵۱ھ میں علی الترتیب اجین۔ سکر بھکر (سندھ) اور کوہستان آبو سے جاری ہوئے اُن سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کی فتوحات کے چھ ہی مہینے بعد ان مقامات میں انتظام قائم ہو چکا تھا۔

ایک اور دلچسپ حقیقت کا انکشاف ان سکوں کے متعلق تحقیقات کرنے سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیر شاہ نے متعدد شہروں کو اپنے نام سے موسوم کیا تھا اور کچھ نئے بسائے بھی تھے۔ مثلاً شیر گڈھ عرف دہلی۔ شیر گڈھ عرف قنوج۔ شیر گڈھ عرف سکر بھکر۔ اگر ان شہروں کا عرف نہ ہوتا تو واقعی بہت دقت ان کے ایک دوسرے سے تمیز کرنے میں ہوتی اور ان سب مقامات کے نکلے ہوئے سکوں کو قلعہ شیر گڈھ

نزد سہسرام سے نکلا ہوا سمجھا جاتا جسے اس نے اپنی فتح بنگال سے قبل بنایا تھا۔

شیر شاہ کے سکے مربع اور گول دونوں قسم کے تھے۔ خالص دھات کے سونے کے سکے جن کا وزن ۱۶۸۰۵ گرین۔ اور ۱۶۶۰۴ گرین۔ چاندی کا نصف روپیہ جس کا وزن ۸۸ گرین اور تانبے کے سکے جن کا وزن ۳۱۱ گرین اور ۳۲۲ گرین کے درمیان ہوتا تھا۔ پائے گئے ہیں۔ چاندی اور تانبے کے سکہ کی شرح تبادلہ ۱:۶۴ تھی۔

سکوں کے اوپر بادشاہ کا نام فارسی اور ناگری دونوں زبانوں میں کندہ ہوتا تھا۔ ۹۴۶ھ کا جو سکہ شریف آباد کا پایا گیا ہے اُس میں اوپر حضرت ابوبکرؓ۔ نیچے حضرت عثمانؓ دائیں جانب حضرت عمرؓ اور بائیں جانب حضرت علیؓ کے نام ہیں۔ خود بادشاہ کا لقب یہ تھا۔ السلطان العادل المؤید الرحمۃ الدنیا والدین ابو المظفر شیر شاہ سلطان خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔

صاحب صولت شیر شاہی لکھتے ہیں :۔

”سکہ اپنے نام کا جو اس نے جاری کیا، وہ بھی اس کی غیر متعصبی کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ جس کے ایک رُخ پر بخط فارسی ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ“ اور دوسری طرف بخط ہندی ”سلطان شیر شاہ سور خلد اللہ ملکہ سلطان حفظ الدنیا والدین سری شیر شاہ“ کندہ تھا۔ سلاطین ماسبق کے عہد میں اس کی مثال شاید ہو مگر میری نظر سے نہیں گذری اکبر اور جہانگیر کا عہد تالیف قلوب خدام اور رعایا نوازی میں مشہور ہے مگر ان کے عہد میں بھی اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔

چونکہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک، اور زبان بھی ان کی ہندی۔ اس لئے سکوں کے حروف پڑھنے اور سمجھنے کے لئے مذہبی تعصب کو دل میں جگہ نہ دے کر ناگری حروف کا سکوں میں نقش کرانا سلطان نے ضروری سمجھ کر بے تعصبی کی عمدہ مثال قائم کی تھی۔“

(صولت شیر شاہی۔ مطبوعہ یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔ صفحہ ۱۱۲)

مندرجہ ذیل دارالضرب کے مضروب شدہ سکے پائے گئے ہیں۔

آگرہ۔ بھانپور۔ فتح آباد۔ گوالیار۔ کالپی۔ رسول پور عرف شمس آباد۔ سات گاؤں۔ شریف آباد۔ شیر گڈھ (سہسرام)، چنار۔ سنبھل۔ اجین۔ آبو۔ مالور۔ بیانہ۔ حصار۔ نرول۔ لکھنؤ۔ شیر گڈھ عرف قنوج۔ شیر گڈھ عرف حضرت دہلی۔ شیر گڈھ عرف سکر بھکر۔ مالوٹ۔

تاریخہائے الم رحلت

۱۹۳۶ء

بر

سنگ مزار مولوی نور الحسن صاحب علوی کاکوروی

۱۳۵۵ھ

ابن محسنِ عالم جناب مولوی محسن کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۵۵ھ

اُدۡخُلِیۡ فِیۡ عِبَادِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ

۱۹۳۶ء

(۱)

بجنت مولوی نور الحسن رفت
دُرِ یکتا ز گنج علم شد گم

براخلاق نکویش فخر ما بود
چو نا ز آسمان بر ماہ و انجم

دل اہل نظر را چوں سویدا
بہ چشم اہل دل مانند مردم

رقم سال وفاتش کرد حامد
کہ نیر داخل فردوس ہشتم

۱۰۹۵ + ۲۶۰

۱۳۵۵ھ

(۲)

ایسا صدمہ ہے وفات مولوی نور الحسن
کب چھپائے سے ترے اے دیدۂ پُرنم چھپا

لوح تربت کے لئے حامد ہے تاریخ وفات
آج کیا اوج ادب کا نیر اعظم چھپا

۱۳۵۵ھ

حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج، آگرہ

نظرے خوش گذرے

فروری نمبر شائع نہ ہوا تھا کہ ۳۰ مارچ کو حکومت صوبجات متحدہ کی طرف سے اُس کمیٹی کے تقرر کا اعلان ہوگیا جس کا گورنر صاحب نے ۱۴ نومبر کو مدح صحابہ کمیٹی کے دفد سے وعدہ کیا تھا اور ایڈیٹر الناظر کے وقت کا بیشتر حصہ کاغذات کی تیاری، وکلاء سے مشورہ اور مصارف کے لئے سرمایہ کی فراہمی میں صرف ہونے لگا۔ جیسے جیسے کمیٹی کی نشست کا زمانہ قریب آتا گیا مصروفیت بڑھتی گئی اور ۲۰ اپریل سے ۷ مئی تک کمیٹی کی کارروائی کے دوران میں تو تقریباً سارا وقت اسی کام کے نذر ہوا۔ کمیٹی کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہی الناظر کی طباعت شروع کردی گئی اور خیال تھا کہ مارچ و اپریل کا یہ مشترکہ پرچہ مئی کے اندر اندر شائع ہوجائے گا بلکہ اسی خیال سے ایک طرف حجم میں کسی قدر کمی کی گئی اور دوسری طرف خود اپنے معروضات کو آئندہ کے لئے ملتوی کرنا پڑا مگر دفعتہً ۲۰ اپریل کا دن گذرنے کے بعد نصف شب کے قریب شیعوں کی ایک جماعت سنیوں سے لڑ پڑی اور موقع پر موجود ہونے کی بنا پر راقم الحروف کا سر بھی لاٹھی کی ضرب سے مجروح ہوگیا اور اُسی وقت سے شہر کے مغربی حصص میں جو شیعہ آبادی کا مرکز ہے جا بجا سنیوں پر حملے ہونے لگے اور برابر دو دن تک راستوں اور گلیوں میں باہم جنگ ہوتی رہی۔

رات ہی کو اسپتال میں زخمی سر کی مرہم پٹی کرانے کے بعد ۲۱ اپریل کی صبح سے شہر کے دیگر سُنی معززین کے ساتھ مل کر حالات کی اصلاح اور عامۂ مسلمین کی خبرگیری کے لئے مصروف ہوجانا پڑا اور سنی ریلیف کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت میں کامل دو ہفتے اسی خدمت میں گذر گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ الناظر کی طباعت رُک گئی اور اب اس کا موقع ملا ہے کہ پرچہ کی تکمیل ہو۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ پرچہ جون کے دوسرے ہفتہ میں شائع ہوجائے اور اس کے بعد ہی مئی و جون کے مشترکہ پرچہ کی طباعت کا سلسلہ شروع کردیا جائے تاکہ جون کے اندر اگر نہیں تو جولائی کے ہفتہ اول میں اُس کی اشاعت کی جاسکے اور پھر ماہ بماہ الناظر کے چھپنے اور روانہ ہونے کا سلسلہ قائم ہوجائے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

جن اصحاب کے مضامین بہت دنوں سے آئے رکھے ہیں اور اس نمبر کے لئے لکھوائے گئے تھے افسوس ہے کہ ناگذیر اسباب سے روک لینا پڑے۔ خدا نے چاہا تو آئندہ پرچہ میں جو کافی ضخیم ہوگا (بہ شمول مضامین) درج ہوسکیں گے۔ احباب بددل نہ ہوں۔

بنام خداوند جان آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی))

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

جلد ۴۳	مئی و جون ۱۹۳۷ء	نمبر ۵ و ۶

فہرست مضامین

قیمت:- فی پرچہ ۸ / ۔ روپیہ ۲ / ۔

بنام خداوند جان آفرین

نمبر ۵ و ۶ جلد ۴۳ — مئی و جون ۱۹۳۷ء

یزیدی

اُن کے عقائد و مراسم

(جناب مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب)

ایک زمانہ ہوا کہ میں نے یزیدیوں کے متعلق ایک کتاب عربی میں دیکھی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ مصنف کا نام قسطنطین زریق، استاد تاریخ شرقی، جامعہ بیروت، تھا۔ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ پھر وہ ایسی گم ہوئی کہ باوجود تلاش نہیں ملی۔ مصر کا رسالہ مقتطف بابتہ ماہ مارچ جو ستمبر میں آیا ہے! بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ اسمیں اسی کتاب کا خلاصہ کر کے کسی صاحب نے یزیدیوں کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ بوجہ اختصار اس میں وہ لطف نہیں، لیکن پھر بھی خاصہ دلچسپ ہے، شاید کوئی اور صاحب بھی پسند فرمائیں۔ میں کچھ کمی بیشی کے بعد اس کو پیش کرتا ہوں۔

یہ چیزیں تطابق مذاہب پر غور فرمانے کے لیے شاید مفید اور ضروری ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی صاحب ذوق اسے پسند فرمائیں۔

یزیدی بیشتر کُردی نسل کے ہیں۔ لیکن یہ دعوے نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا خون بالکل صاف ہے۔ سُوریا، عراق اور ارمینیہ میں اُن کا میل سامیوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ علمائے تاریخ اس پر متفق ہیں کہ اس قوم کا نام یزیدی نہیں ہے، بلکہ ایزدی ہے اور یہ مشتق ہے فارسی الاصل لفظ ایزد سے۔ اور اگر یزیدیا

ہی فرض کر لیا جائے تو مشتق ہے یزدان سے اس کے معنی کیے جاتے ہیں: "وہ لوگ جو صرف عبادت ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں" یہ تعریف صرف ملائکہ کی ہو سکتی ہے۔ اُن کی ایک اور صفت یہ ہے کہ وہ واسطہ ہوتے ہیں مابین خالق و مخلوق کے۔ یزیدی کہتے ہیں کہ ہم ملائکہ ہی کے تبع ہیں۔ اسی لیے یہ دونوں صفات صرف ہمارے ہی اوپر صادق آتی ہیں۔

اُن کا جو کچھ بھی دعوے ہو مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو چھپاتے ہیں اس لیے اُن کے دعووں کو جانچنا مشکل ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا کوئی فلسفہ بھی ہے، یا جو اُن کے دعوے ہیں وہ محض خود ساختہ پرداختہ ہی باتیں ہیں۔ جب اُن کے مذہب[1] و معتقدات کا صحیح حال معلوم نہیں تو اور باریک باتوں کی کون کہے۔ مگر بہر کیف، اُن کا ایک خاص مذہب ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو مذہب بھی خالص نہیں، کیونکہ وہ مشرقی ادنیٰ کے تمام نہیں تو اکثر مذاہب کا ملغوبہ معلوم ہوتا ہے۔

اُن کا نبی (یا ہادی اول) ایک صوفی منش آدمی، شیخ عادی، ہے۔ یہ شخص پانچویں اور چھٹی صدی کے درمیان میں گذرا ہے۔ یہ موصل میں رہتے تھے۔ وہیں یہ پلے اور بڑھے تھے۔ یہ صرف قیاسات ہی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کے تمام حالات، ان کے سوانح عمر، اُن کے مذہب کی حقیقت اور اُس کی تاریخ پر رموز نہ غوامض و اوہام و خرافات کے ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اُن کے غیر کو ان پردوں کا اُٹھانا کچھ ناممکن سا ہے۔ صحیح تو یہ ہے کہ یہ بھی بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ اگر یہ پردے اُٹھ بھی گئے تو اصل حقیقت عریاں ہو جائے گی، یا وہی تاریکی بدستور باقی رہے گی۔ اُن کی تاریخ و حالات کی تلاش میں ناکامیابی ہی ہوئی ہے۔ یہ کسی طرح امید ہی نہیں کہ یزیدی اپنے مذہب کو واشگاف کریں گے؛ اُس کے اسرار و غوامض کا تو کیا ذکر ہے۔ جو کچھ بھی معلوم ہے وہ یہ ہے کہ مدتیں ہوئیں کہ یزیدی، بہ تعداد کثیر، انتہائے بلاد عجم و عراق و سوریہ و دیگر متفرق مقامات میں رہتے تھے۔ وہیں بحر یہ سامرہ، شرقاط (واقع عراق) نواح حلب و شام، ادرفہ، حران، سعرہ، نصیبین، بیرہ، جبیک، عین تاب، نواحی فزاں اور اُن کے علاوہ اور بہت سے مقامات ہیں، لاکھوں کی تعداد میں پھیلے۔ ترکوں کے زمانۂ دولت میں ان سے سخت تعصب دینی برتا گیا اور اُن پر بڑے بڑے ظلم ہوئے۔ اسی وجہ سے اب ان کی تعداد پچاس ہزار کے قریب رہ گئی ہے۔ یہ ہر طرف سے سمٹ کر اب موصل کے قریب قریۂ قضاء الشیخان اور کوہ سنجار میں رہ گئے ہیں، یا بلاد عجم اور ارمینیہ میں ترکی آزادی سرحد پر، کوہ کلیس، عین تاب، دیار بکر اور ماردین میں بھی کچھ لوگ

[1] میں نے دانستہ "مذہب" کہا ہے، "دین" نہیں کہا۔ مجھے شک ہے کہ یہ لفظ میں نے صحیح استعمال کیا ہے، یا نہیں۔ جہاں تک قیاس کام کرتا ہے یہ "دین" تو ہے نہیں۔ اگر مذہب ہے تو کس دین کا؟ (مترجم)

ملتے ہیں۔ ان کا مرکز اب بھی موصل کے شمال و مغرب میں، قضاء الشیخان کے قریب ایک قصبہ موسومہ باعدری' میں ہے۔ یہیں ان کے ہادی اول، شیخ عادی کا مزار ہے اور یہیں اُن کے امیر، میر میران، کا مدفن مقام ہے۔

عام حالت

یزیدیوں کی اصل زبان کُردی ہے۔ اس کو وہ مختلف لہجوں میں بولتے ہیں۔ جو لوگ ایشیائے کوچک میں رہتے ہیں وہ ترکی بولتے ہیں۔ سوریا اور عراق کے رہنے والے عربی بولتے ہیں۔ اپنی زبان کردی کو وہ مقدس سمجھتے ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اللہ نے آدم (علیہ السلام) سے اُن ہی کی زبان میں بات کی تھی اور موسیٰ (علیہ السلام) کے احکام اسی زبان میں نازل فرمائے تھے۔

یہ لوگ بڑے محنت کش، دراز قد، مضبوط ہاتھ پیر، جبڑے کلّے کے ہوتے ہیں۔ اُن کی پتلیاں کالی ہوتی ہیں اور رنگ سُرخ و سفید ہوتا ہے۔ داڑھی لمبی رکھتے ہیں (جیسا کہ آگے معلوم ہوگا) عادت و خصلت اور طور و طریق کے بہت پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں اور اُن کے اخلاق عام طور پر اچھے ہوتے ہیں۔ جو کوئی کام بھی اُن کے سپرد کیا جائے اُس کو بڑی محنت اور دیانتداری کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔ آزادی و استقلال کے دلدادہ ہیں۔ نیک چلنی اور صفائی میں ان کی شہرت ہے۔ زنا سے انھیں نفرت ہے۔ اگر کوئی اس فعل بد کو کرتا ہے تو اُس کو بدترین عبرت انگیز سزا دیتے ہیں۔ معاملے کے بہت صاف ہیں، فن فریب انھیں نہیں آتا۔ اپنے بڑے آدمیوں کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ زراعت کرنا اور جانوروں کو پالنا اُن کا خاص پیشہ ہے۔ اُن میں سے زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے، جو خانہ بدوش ہیں۔ یہ صحرا نشین مختلف قبائل میں منقسم ہیں۔ یہ لوگ اُن کی زبان میں "کوچر" کہلاتے ہیں۔ اُن کی برادری کا نظام اجتماعی ہے اور اپنے قبیلے کا بہت زیادہ لحاظ و خیال رکھتے ہیں۔ ہر قبیلہ ننھیال اور ددھیال میں منقسم ہوتا ہے اور ہر قبیلے میں جو سب سے بڑی عمر کا آدمی ہوتا ہے وہی اُس قبیلے کا سردار مانا جاتا ہے، وہی تمام قبیلے کا نگراں و حاکم ہوتا ہے۔ بڑا قبیلہ ایک مقررہ قاعدے کے موافق اور کئی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اور اُن کے الگ الگ کام اور پیشے مقرر کر دیئے جاتے ہیں، مثلاً کھیتی باڑی، جانوروں کی پرورش، مزدوری، مناصب، روحانی و مذہبی فرائض، وغیرہ۔ ابی آخری فرقہ کے لوگ مذہبی مقتدا ہوتے ہیں اور ان ہی کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ چھوٹے اور بڑے قبیلے کے تمام آدمیوں کو، خواہ وہ کسی پیشے کے ہوں منظم رکھیں اور قبیلے کے بوڑھے آدمی کے نائب کی حیثیت سے سب کی نگرانی کریں۔ یہی برادری کی تقسیم اجتماعی و دینی حدود کی سخت نگرانی اور حفاظت کرتے ہیں اور اپنے ہم مذہب لوگوں اور اپنے مذہب کا انتظام قائم رکھنے میں بڑی شدت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی برادری سے نکل کر غیر جگہ، یا اپنے سے اعلیٰ طبقے میں شادی کرے تو یہ قصور معاف نہیں کیا جاتا۔ مصیبت تو اُس کی ہے جو اُن کے حکم سے سرتابی

کرے۔ یا تو وہ سنگسار کر دیا جاتا ہے، یا مارے بیدوں کے اُس کی کھال اُدھیڑ دی جاتی ہے، یا کسی بدترین قسم کی موت سے مار دیا جاتا ہے۔

یزیدی جماعت کے دو شیخ ہوتے ہیں! ایک امور دنیوی کا نگراں ہوتا ہے۔ قبیلے کا وہ بڑا آدمی، جس کا ابھی اوپر ذکر آیا ہے وہ اسی شیخ کو جواب دہ ہوتا ہے۔ یہ شخص یزید، الملقب بہ میر میران (امیر الامرا) کی اولاد سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جاتا ہے یہ قصبہ باعدری میں رہتا ہے۔ جو لوگ کہ شہروں میں رہتے ہیں اُن کے دنیوی کام اس شیخ سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کو عالم خارجی کا امام سمجھنا چاہیے۔ دوسرا شیخ امور روحانی کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ بمنزلہ بادشاہ روحانی کے ہے۔ مذہب و عقائد کے متعلق تمام مسائل اُسی کے سامنے پیش و فیصل ہوتے ہیں۔ اُس کا حکم و فتوے حکم آخر و ناطق ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت پانچ حکام ہوتے ہیں؛ ان پانچوں کو الگ الگ قسم کا لباس پہننا ہوتا ہے۔ اُن کے مذہبی اعمال وغیرہ مقرر ہیں۔ اُن کے نام اور کام یہ ہیں:-

(۱) شیخ۔ از روئے درجہ و رتبہ سب سے بڑا ہوتا ہے اور اُس کا وہی درجہ مانا جاتا ہے جو انبیا کا۔

(۲) پیر۔ صوم و افطار اس سے متعلق ہیں۔

(۳) فقیر۔ غریبوں کی اولاد کو مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور شیخ عادی کی قبر کے خادم بھی یہی ہیں۔

(۴) قوال۔ دف اور دیگر مزامیر بجاتے ہیں اور اللہ اور ملائکہ کی مدح گاتے ہیں۔

(۵) کوچک۔ تجہیز و تکفین ان کے سپرد ہے۔ خوابوں کی تعبیر بتلانا ان ہی کا کام ہے۔

عقائد مذہبی | عام طور پر یہ مشہور ہے اور اسی پر سب کا اتفاق ہے، کہ یزیدی شیطان کو پوجتے ہیں۔ لیکن اگر اُن کے جتنے عقائد معلوم ہیں اُن پر غور کیا جائے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا ایک الگ مستقل "دین" ہے۔ اُن کے بعض معتقدات البتہ عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں، اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اُس میں قدیم زمانے کی بت پرستی، زرتشتیت، یہودیت، نسطوریت، بگڑا ہوا سا تصوف، صائبیت اور شامانیت کے عناصر ملے ہوئے صاف نظر آتے ہیں۔

اُن کے مذہب (دین؟) کا رکن اعظم ایک اِلٰہ کبیر و خالق کے وجود پر ایمان لانا ہے۔ اس اِلٰہ کے سات ملائکہ ہیں، جو اُس اِلٰہ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان پر ایمان لانا بھی فرض ہے۔ ان ملائکہ کے یہ نام ہیں:- عزرائیل، دردائیل، میخائیل، اسرافیل، زرزائیل، شمخائیل اور نورائیل[1]۔

---

[1] ان میں سے بعض نام عملیات سفلی میں ملتے ہیں۔ میں اس وقت یہ نہیں بتلا سکتا کہ آیا یہودیوں کے یہاں بھی ان ناموں کے ملائکہ ہیں، یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کہیں ہمارے یہاں کے عملیات میں یہ نام یزیدیوں سے تو نہیں آئے۔ عامل حضرات ... غور فرما کر شاید جواب دے سکیں۔ بہرحال سوال شاید دلچسپ ہے۔

ان میں سے ہر ایک کو خدا (اِلٰہ) نے دنیا کی کسی نہ کسی چیز اور کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا ہے.
جب یہ سب پیدا اور مکمل ہو چکے تو خدا نے ان سب میں سے عزرائیل کو بڑی عظمت عطا فرمائی اور سب سے
افضل کر دیا اور اُس کو دنیا کے بڑے بڑے کاموں پر متعین کیا. لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر وہ دنیا
میں کسی بات میں سرکشی کرتا، یا نافرمانی کی طرف مائل ہوتا ہے، تو خدا اُس کو سزا دیتا ہے. اور جب وہ
نادم ہو کر اپنے کیے پر پچھتاتا اور روتا ہے تو اُس کے آنسوؤں سے جہنم کی آگ بجھ جاتی ہے، اور خدا اُس کے
گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور اُس کو اُس کا بلند درجہ عطا فرما دیتا ہے اور دنیا کے کاموں پر بدستور
تعینات کر دیتا ہے.

یزیدی عزرائیل کی بڑی تعظیم کرتے ہیں. معلوم ہوتا ہے کہ اسی کا دوسرا نام "ملک طاؤس" بھی ہے.
یہ گویا ہر جگہ اور ہر موقعے پر حاضر و ناظر ہے. چونکہ وہ دنیا کی تدبیر کرتا ہے اور دنیا و ما فیہا کا محافظ بھی ہے،
اس لیے اُسی کے سامنے تضرع و زاری کی جاتی ہے. اُسی کو طفیل و شفیع بنا کر اپنے پیغمبر شیخ عادی، سے
اپنی مرادیں مانگتے ہیں. بعض وقت اس کے بالعکس بھی کرتے ہیں. اس سے ایک قسم کی مقدس تثلیث
پیدا ہو جاتی ہے، جس کے ارکان ثلاثہ الٰہ، ملک طاؤس اور شیخ عادی ہوتے ہیں. یزیدیوں کا دعویٰ ہے
کہ اُن کے اصول مذہب میں ملائکہ اور اولیا کو زیادہ دخل ہے.

ان کے مذہب کے موافق روزے بہت رکھے جاتے ہیں. بعض بعض عیدوں اور تہواروں پر قربانیاں
بھی کرنی ہوتی ہیں. غالباً یہ اسلام کا اثر ہے. عشاء ربانی اور شراب کی حلت اُن میں نسطوریوں سے آئی
یہودیوں سے بعض چیزوں کا حرام ہونا لیا ہے. بعض مادی چیزوں کو سجدہ کرنا بت پرستوں سے سیکھا ہے.
خوابوں کی تعبیر اور بہ حالت عبادت رقص کرنا شامانیوں کا ہے. ملول اور کودنا اچھلنا صابئیوں سے آیا ہے.
اُن کا اس پر پکا اعتقاد ہے کہ عالم آخرت میں محافظ فرشتوں کی طرح ہر یزیدی کے ساتھ ایک
بھائی ہوگا، جو اُس کی تعظیم و تکریم کو قائم رکھے گا - یہ لوگ اپنے اعمال کو سختی کے ساتھ چھپاتے ہیں؛
اسی لیے کہتے ہیں کہ نماز کو چھپا کر پڑھنے میں زیادہ فضیلت ہے. وہ فرائض کی کوئی تحدید نہیں کرتے.
اُن کا اعتقاد ہے کہ کتب سماوی اُن کے دلوں میں ہیں؛ بہ آواز بلند اُن کو پڑھنا، یا سنانا بیکار ہے. ملک
طاؤس بھی اپنے دوستوں اور معتقدوں کو بغیر کتاب کے ہدایت کرتا ہے. اور دور ہی سے بیٹھے ہوئے
سیدھا راستہ دکھلاتا اور بتلاتا ہے. ہر شخص کی تعلیم . . . ملک طاؤس اُس کے ظرف اور اُس کے
زمانے کے موافق کرتا ہے. تاہم وہ دو کتابوں کو مقدس سمجھتے ہیں: ایک کا نام "جلوہ" ہے اور دوسری
کا "مصحف رش" (یہ آخری لفظ کردی زبان کا ہے اور اس کے معنی ہیں سیاہ کتاب) ان دونوں کتابوں میں

اُن کے مذہب کے اُصول، نماز کی ترکیب، تہلیل وتکبیر کی صورت، مراسم مذہبی کی تفصیل، عیدین کے اوقات اور دیگر ضروری باتیں درج ہیں۔

کتب مقدس کے بعض مضامین | اگرچہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ دونوں متذکرہ بالا کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ لیکن جو کچھ بہ مشکل تمام معلوم ہوسکا ہے وہ یہ ہے کہ :-

دنیا اس طرح پیدا ہوئی کہ پہلے کچھ نہ تھا۔ جب خدا نے چاہا کہ کچھ پیدا کرے تو اُس نے سب سے پہلے اپنی سواری کے لیے (غالباً) گھوڑا پیدا کیا۔ پھر اُس پر سوار ہوکر سمندروں کا دورہ کیا۔ پھر کسی بات سے اُسے اُس سواری پر غصہ آگیا اور اُسے توڑ پھوڑ پھینکا۔ اس غضب الٰہی سے پہاڑ بن گئے اور دھواں جو نکلا اس سے آسمان پیدا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر خدا اُن (آسمانوں، یا آسمان) پر چڑھ گیا اور اُن کو ویسے ہی، ادھر اُدھر جاکر کھڑا کر دیا۔

اب رہ گئی آبادی۔ اُس کی تفصیل قریباً ویسی ہی ہے جیسی کہ توریت میں بیان ہوئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان کا بنانے والا ملک طاوس ہے۔ جب آدم کا پتلا مٹی، پانی، آگ اور ہوا سے بن چکا تو ملک طاوس نے اُس کے دونوں کانوں میں پھونک ماری وہ فوراً سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ملک طاوس نے اُس کو جنت بہشت کر دی۔ پھر ملک طاوس نے اُس کے واسطے، اُس کے داہنے بازو سے، حوا کو پیدا کر دیا اور اُس کو انسان اول آدم کے ساتھ رکھا اور اُس کو اعمال بشریہ سکھلائے۔ گیہوں کے درخت کے بیج دونوں کو کھانے سکھلائے۔ چالیس برس کے بعد حکم دیا کہ دونوں کو فردوس سے نکال دیا جائے۔ دونوں نے کچھ تامل کیا تو ملک طاوس نے ان کے پیٹوں پر پھونک ماردی اور اُن کو اُٹھاکر زمین پہ پھینک دیا۔ جب وہ زمین پر آئے تو دونوں بلا کسی مخرج کے تھے۔ اس سے ان کو سخت تکلیف معلوم ہوئی، تو ملک طاوس نے یہ دیکھ کر ایک پرندہ اُن کے پاس بھیجا، جس کا نام "قلاّج" تھا۔ دونوں سو رہے تھے کہ قلاج نے اُن کے ٹھونگیں ماریں۔ اس سے اُن کے مخرج کھل گئے۔ اس سے اُن کو بڑی راحت ملی۔ اس کے بعد دونوں کے آپس میں نسل کے متعلق جھگڑا ہو پڑا۔ آخر یہ یوں طے ہوا کہ دونوں اپنے اپنے نطفوں کو ایک تھیلی میں بند کرکے اُن پر اپنی اپنی مہر کر دیں اور نو مہینوں کے بعد اُس کو کھولیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ نو مہینوں کے بعد آدم نے جو اپنی تھیلی کھولی تو اس میں سے دو بچے برآمد ہوئے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی۔ دونوں کے نام، علی الترتیب، شیث اور ہوریہ رکھے گئے۔ آدم دو برس تک دونوں کو دودھ پلاتا رہا۔ ان ہی دونوں کی اولاد یزیدی ہیں۔ حوا کی تھیلی میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ گندہ ہوگیا اور حوا کی صورت بھی ایسی بگڑ گئی کہ بہت دنوں کے بعد آدم پہچان سکا کہ یہ میری بیوی ہے۔ اس مرتبہ ان سے دو سوتے ہوئے بچے پیدا ہوئے؛

ایک لڑکا تھا دوسری لڑکی۔ ان کے نام علی الترتیب، قابین اور ہلیونہ رکھے۔ ان کی نسل سے تمام دنیا کے آدمی ہیں۔

طوفان کا قصہ بھی اُن کے یہاں موجود ہے۔ اُس کی وہی صورت ہے جو توریت میں مذکور ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن کے طوفان کے نوح کی کشتی کوہ سنجار پر ٹھہری تھی۔

مقدس دن اور تہوار | یزیدیوں کے یہاں روز چہارشنبہ مقدس تھا، اُس دن وہ کوئی کام کاج نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب مسلمانوں کے میل جول کی وجہ سے جمعے کو مقدس ماننا شروع کر دیا ہے۔

اُن کے دین اور اُس کے مختلف مذاہب کی عیدیں بہت سی ہیں۔ ان میں خوب رونق ہو جاتی ہے۔ ہر سال کا پہلا دن عید ہوتا ہے۔ اس عید کو کُردی زبان میں "سرسالی" کہتے ہیں۔ یکم نیسان (اپریل) کو بھی عید ہوتی ہے۔ اس کی آدمی رات کو ان کی عورتیں اپنے مقدور بھر اچھے کپڑے اور زیور پہنتی ہیں، خوشبو لگاتی ہیں، ہر طرح کے سنگار کر کے مردوں کے ساتھ مل کر گیت گاتی اور اُس کے تال اور سُر پر ناچتی ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اس وقت ملائکہ آتے ہیں اور اُن کے اس فعل کو اُن کے نامہائے اعمال میں بہ منزلہ عبادت لکھتے ہیں۔

تمام ماہ نیسان گویا عید کا مہینہ ہے؛ شاید کوئی دن عید سے خالی جاتا ہو۔ ان میں سبز لباس پہنتے ہیں اور خوبصورت پھولوں سے اپنے آپ کو سجاتے ہیں اور میدانوں میں سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں[1]۔ اپنے گھروں اور دروازوں کو پھولوں سے سجاتے ہیں۔

اس مہینے کے پہلے چہارشنبے کو، حسب حیثیت، بھیڑ، بکری، گائے، مُرغ کی قربانی لازمی ہے۔ قربانی کا گوشت پکا کر ہانڈیوں یا دیگچیوں کو بہ طور صدقہ اپنے اپنے مُردوں کی قبروں پر رکھ آتے ہیں۔ اس مہینے کی آخری عید اُن کے بادشاہ 'یزید' کی یوم ولادت کی ہوتی ہے۔ ان عیدوں میں یزیدی اپنی عورتوں سے پرہیز کرتے ہیں؛ کیونکہ اس مہینے میں اُن کے انبیا نے شادیاں کی تھیں اُن کا احترام لازمی ہے۔

یکم کانون اول (مطابق دسمبر) کو بھی ایک عید بڑے دھوم دھام کی ہوتی ہے۔ اس میں خوب دعوتیں ہوتی ہیں اور شراب پی جاتی ہے۔

۱۰ ماہ ایلول (ستمبر) کو تمام یزیدی اپنے شیخ عادی کی قبر کی زیارت کرنے جاتے ہیں۔ وہاں اپنے بادشاہ 'یزید' کا تخت بچھاتے ہیں اور اُس کے گرد بیٹھ کر عید مناتے ہیں۔ ہر دو شیخان وقت ہر قبیلے کے سردار کو خلعتہائے مطلا عطا کرتے ہیں۔ یہاں بھی خوب گانا بجانا ہوتا ہے۔ سال بھر وہ ایک بیل پالتے ہیں اور

---

[1] مقابلہ کیجیے مسلمانوں کے آخری چہارشنبہ کے دن سبزے کو روندنے کی رسم سے۔

اس کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اسی روز اُس کو ذبح کرتے ہیں اور اُس کا گوشت پکا کر لٹا دیتے ہیں۔ جس کے ہاتھ ایک لقمہ بھی آجاتا ہے وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے اور اُس سے یہ شگون لیتا ہے کہ وہ اپنی مراد کو پہونچ جائے گا اور سال بھر برابر اس کو ہر طرح کی برکات ملتی رہیں گی۔ اس موقعے پر شیخ عادی کی قبر پر ہر شخص کو حسب حیثیت بہترین نذریں چڑھانی پڑتی ہیں۔

یہ تو بڑی بڑی عیدیں ہوئیں، چھوٹی چھوٹی عیدیں الگ رہیں۔ منجملہ ان کے ایک عید قربان کہلاتی ہے۔ یہ عید (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے بیٹے (حضرت) اسحٰق (علیہ السلام) کی قربانی کی یادگار میں منائی جاتی ہے۔ اس عید میں یزیدی کسی معین پہاڑی مقام پر جاتے ہیں اور وہاں لکڑیاں جمع کرکے اپنے امیر کے باورچی خانے کے خرچ کے واسطے پہونچا دیتے ہیں۔ آج بھی ہر یزیدی کو کچھ نہ کچھ قربانی کرنا لازمی ہے۔ ماہ شباط (فروری) کی نوچندی جمعرات کو ایک عید خضر و الیاس کے نام پر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی عید الفطر سے دو روز پہلے یزیدیوں کے اولیا میں سے ایک کی قید سے خلاصی کی خوشی میں عید کی جاتی ہے۔ کانون اول (دسمبر) کی دسویں تاریخ کو مردوں کی یادگار میں عید ہوتی ہے۔ اُس روز قبروں پر جاتے ہیں، مُردوں کا ذکر خیر کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، صدقے دیتے ہیں۔ اس کے گویا متصل ہی کانون ثانی (جنوری) میں چالیس دن کے روزے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہ تموز (جولائی) میں بھی روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ ان کے دوران میں ملک طاؤس کے فقرا کو صدقے دینے ہوتے ہیں۔

بعض اعتقادات و مراسم | یزیدیوں کا اعتقاد ہے کہ ساتوں ملائکہ نے مل کر حکیم سلیمان کے لیے دنیا میں ایک جھنڈا بنایا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد یہ جھنڈا یزیدیوں کے بادشاہوں کے ہاتھ آیا۔ ان بادشاہوں نے اُس کی نقل کرکے کئی اور جھنڈے بنوائے، جو تانبے اور لوہے کے تھے۔ اُن کے سروں پر طاؤس کی صورت بنی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک یزیدیوں کے دونوں شیخوں کے امیر کے پاس محفوظ ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے طلسم بھی محفوظ ہیں، جو بعض قدیم معبدوں کے تبرکات ہیں۔ یہ طلسم کیا ہیں؟ سانپ اور بچھو، اور دیگر موذی کیڑوں کی تصویریں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ ملک طاؤس ان ہی کی شکلیں اختیار کرکے خفیہ طور سے نکل کر دنیا میں آجاتا ہے۔ اس لیے وہ ان جھنڈوں اور طلسموں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور اُن کے کاہن اُن کے شہروں اور قصبوں میں بعض تہواروں میں لا کر اُن کا طواف کراتے ہیں۔ یہ رسم سال میں تین مرتبہ ادا کی جاتی ہے؛ اور ہر مرتبہ نذریں چڑھانا پڑتی ہیں۔

جس وقت یہ جھنڈے نکالے جاتے ہیں تو قوال کسی درخت کے کھٹے پھلوں کو گرم پانی سے دھوتے ہیں

اور پھر اُن کو پکا کے شیخ عادی کے مزار کی مٹی کے ساتھ گوندھ لیتے ہیں اور اُن سے طرح طرح کی تصویریں بناتے ہیں۔ لوگ بہ طور تبرک ان کو اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ جب یہ یزیدیوں کے کسی گاؤں کے پاس پہونچتے ہیں تو ایک آدمی، بہ آواز بلند، لوگوں کو ملائکہ کی تصویروں کے استقبال کے لیے بلاتا ہے۔ اس کو سُن کر لوگ سفید، پاک صاف کپڑے پہنے ہوئے، ننگے پیر، جلتے ہوئے بخورات ہاتھوں میں لیے، عطر میں ڈوبے ہوئے نکل آتے ہیں۔ عورتیں گیت گاتی ہوئی جھنڈوں کے آگے آگے ہوتی ہیں۔ یہ جلوس گاؤں کے کسی میدان میں آکر ٹھہر جاتا ہے۔ حاضرین میں سے ہر ایک جھنڈے کو اپنے گھر میں داخل کرتا ہے۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو برادری کے کسی بڑے آدمی کے مکان کے صدر مقام پر، ایک اونچے چبوترے کے اوپر یہ جھنڈا رکھ دیا جاتا ہے؛ اور پھر نہایت ادب و احترام کے ساتھ طاؤوس کی تصویر اُس کے اوپر قائم کر دی جاتی ہے اور اُس کے سامنے روشنی کی جاتی ہے۔ پھر قوال اُس کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور مزامیر کے ساتھ گاتے ہیں۔ حاضرین تال اور سُر میں اُس کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ فعل بڑا موجب ثواب سمجھا جاتا ہے۔ ہر شخص طاؤوس کے گرد نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ، سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے، سات بار طواف کرتا ہے۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اس سے اُن کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ طاؤوس کے سامنے سجدے کرتے ہیں، اُس کو چومتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ قوال دعائیں پڑھ پڑھ کر حاضرین کے سروں پر دم کرتے ہیں اور اُن کے لیے دعاے خیر و برکت و مغفرت کرتے ہیں۔ رات کو اُسی کھٹے پھل کے پانی سے طاؤوس کو غسل دیتے ہیں اور اُس پر تیل ملتے ہیں۔ جو پانی اور تیل اس غسل سے گرتا ہے وہ زائرین کو، بطور تبرک، دے دیتے ہیں۔ وہ اُس کو اپنے بدنوں پر ملتے ہیں۔ اعتقاد یہ ہے کہ اس سے ظاہر و باطن گناہ دُھل جاتے ہیں۔

بعض مراسم و عادات ایک زمانہ ہوا کہ وہ اپنی کسی بات کو ظاہر نہ ہونے دیتے تھے؛ یہاں تک کہ عام یزیدیوں کو پڑھنا لکھنا بھی ممنوع تھا کہ کہیں وہ آزادی کے جوش میں اُن کے اسرار کو ظاہر نہ کر دیں۔ تعلیم و تعلّم ایک خاص خاندان، یا قبیلے کے لیے مخصوص تھا۔ چند روز سے انھوں نے اس معاملے میں چشم پوشی کر رکھی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ اُن کے متمول لوگوں کی اولاد بیروت کے کالجوں میں تعلیم پا رہی ہے۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا کہ ان آزاد خیال نوجوانوں نے اکثر باتوں کو ظاہر کر دیا۔ لیکن اب بھی بیشتر باتیں ایسی ہیں جو پردۂ خفا میں ہیں اور غالباً مدتوں رہیں گی۔ بہرکیف؛ مقتدایان دینی و مذہبی داڑھیاں نہیں منڈاتے؛ بلکہ اُس کو خیر و برکت و تقدس کی علامت سمجھتے ہیں۔ عوام الناس ہلکے نیلے رنگ کی چادر نہیں بناتے۔ کوئی یزیدی اپنا گریبان کھلا نہیں رکھتا۔ اپنے مکان میں قضاے حاجت نہیں کرتے؛

بلکہ تھوکتے تک نہیں۔ کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرتے، بیٹھ کر پاجامہ نہیں پہنتے۔ ان کے خلاف کرنا حرام ہے اور حرام بھی شیطان کے نام پر۔ ہر اچھی چیز اور اچھی بات کو ملک طاؤس سے منسوب کرتے ہیں۔ سُور، مُرغ، ہرن، مچھلی نیز وہ ترکاریاں جو پتوں سے ڈھکی رہتی ہیں، بھنڈی، کدو اُن کے یہاں حرام ہیں۔ کوزے سے پانی پینا ناجائز ہے۔ اُن کی حرام و حلال کی فہرست بہت لمبی ہے، کہاں تک بیان کی جائیں۔

شادی، بیاہ اور دیگر تقاریب شادی، بیاہ کے موقعے پر اعلان کے واسطے ڈھول، یا اسی قسم کی بلند بانگ چیز بجانا اور بلند آواز سے گانا لازمی ہے۔ شادی کی تقریب میں کھانا برادری کا کوئی متمول آدمی یا گاؤں کا شیخ دیتا ہے؛ اُن ہی کا دیا ہوا کھانا دولھا، دولھن کو کھلایا جاتا ہے؛ اُن کے لیے کوئی خاص اور الگ اہتمام نہیں ہو سکتا۔ نکاح ہمیشہ سب کے کھانا کھالینے کے بعد پڑھایا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد بہ بانگ دہل اعلانِ نکاح ہوتا ہے اور اسی غرض سے آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ اس کے بعد دولھن رخصت ہوتی ہے۔ کوئی شخص اُس کے ساتھ نہیں جاتا؛ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے کنبے اور اپنی حیثیت سے زیادہ لوگوں میں شادی نہیں کر سکتا؛ مگر متمول لوگوں کو اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیں شادیاں کر لیں۔ ناتے نسبت کی گفتگو ۱۲ برس سے ۱۸ برس کی عمر تک شروع کر دینا چاہیے؛ اس کے بعد ناجائز ہے اور شیخ کی اجازت درکار ہے۔ کوئی شخص ایک سے زائد بیوی نہیں رکھ سکتا لیکن اگر اولاد نہ ہو تو چھ تک بیویاں، بیک وقت، رکھنی جائز ہیں؛ مگر شرط یہ ہے کہ موجودہ بیوی اجازت دے۔ اس کے بغیر اور شادی کرنا حرام ہے۔ جب اولاد ہو جائے تو کوئی اور شادی ناجائز ہے۔

بیٹی اپنے باپ کی وارث نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اپنے والدین کے قرار داده رشتے سے انکار کرے تو اُسے بطور جرمانہ سونا، چاندی ماں باپ کو دینا پڑتا ہے، ورنہ عمر بھر اُن کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی کسی غیر شخص کی بیوی کو بھگا لے جائے، تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اُس شخص کو اپنی بیوی، یا بہن، حتےٰ کہ اپنی ماں دے دے؛ اگر یہ نہ کرے تو مُنھ مانگا مال دے کر اُس کو راضی کر لے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ایک سال الگ رہے، تو وہ بیوی اُس پر حرام ہو جاتی ہے۔ بھتیجی، پھوپھی، خالہ کی بیٹی سے نکاح حرام ہے۔ ایک ہی ماں، باپ کی بیٹیوں سے، بیک وقت نکاح نہیں ہو سکتا۔

اُن کے نزدیک دنیا کی آخری منزل موت نہیں ہے۔ مرنے والا کئی مرتبہ اس دنیا میں آتا ہے۔ اگر مرنے والا کوئی بدکار تھا، تو کسی جانور کی جون میں آئے گا؛ اگر نیک اعمال ہے، تو موجودہ زندگی سے کسی بالاتر درجے میں، واپس آئے گا۔ یہ آواگون اُس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اُس کو درجہ کمال حاصل

ہو جائے۔ لطف یہ ہے کہ درجہ کمال کا کوئی تعین نہیں ہے۔ جب کوئی مرتا ہے تو اُس کے بدن پر شیخ عادی کے مزار کی مٹی مل دی جاتی ہے اور وہی اُس کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ دفن کے بعد ایصالِ ثواب کے لیے برادری کو کھانا دیا جاتا ہے۔ اُس کی قبر پر چند روز تک چوکی دار بٹھا دیے جاتے ہیں۔ اُن کا یہ کام ہے کہ وہ یہ دیکھتے رہیں کہ اُس کی قبر پر کیا گذری۔

اور کہاں تک عرض کیا جائے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ لوگ، ان کا دین، ان کے مذاہب، ان کے راہ و رسم بہت دلچسپ اور اس قابل ہیں کہ اُن کو بغور دیکھا جائے اور تحقیق کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ تعلیم ان کے نوجوانوں میں ایک طرح کی بغاوت پیدا کر دے اور وہ اپنے دین کے فلسفے کے نام ہی سے اپنے راز خود کھول دیں۔ مگر اس کے لیے برسوں درکار ہیں۔

افکارِ رضی

(جناب مولوی سید محمد رضی صاحب رضیؔ بدایونی)

دھجیاں لپٹی ہیں کانٹوں میں گریبانوں کی — یادگاریں ابھی محفوظ ہیں دیوانوں کی

بارش اے ابرِ کرم اس قدر احسانوں کی — گردنیں اُٹھ نہیں سکتی ہیں پشیمانوں کی

اشکِ خونیں میں ہیں شرحیں مرے ارمانوں کی — سرخیاں خونِ جگر سے ہیں افسانوں کی

اب وہ ہنگامۂ فریاد نہیں زنداں میں — بیڑیاں کٹ گئیں شاید ترے دیوانوں کی

ذرہ ذرہ میں ہے اک درسِ بصیرت پنہاں — ادب آموز فنا خاک ہے ویرانوں کی

نالۂ مرغِ چمن، آہِ سحر، تیرِ [illegible] — سب ہیں بدلی ہوئی شکلیں ترے پیکانوں کی

کتنی پرکیف ہے صہبائے محبت ساقی — روح ہر قطرہ میں کھنچ آئی ہے میخانوں کی

ہوں میں اس دشتِ جنوں خیز میں گرمِ جولاں — جس کے ہر ذرے میں وسعت ہے بیابانوں کی

حدِ منزل پہ بھی آسودہ نہیں ذوقِ طلب — غیر محدود ہے دنیا مرے ارمانوں کی

حسن کے جلوے ہیں نیرنگِ نظر کے تابع — سرخیاں روز بدلتی ہیں ان افسانوں کی

بیخودی شوق کی ہے مایۂ صد نازِ خرد — عالمِ ہوش ہے دنیا ترے دیوانوں کی

بے نقاب آج وہ غارتگرِ دیں آتا ہے — خیریت اب نظر آتی نہیں ایمانوں کی

خود جگا دیتا ہوں، وہ خوگرِ ایذا ہوں رضیؔ
آنکھ جب لگتی ہے زنداں کے نگہبانوں کی

(جناب کالج منشی امیر احمد علوی صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۶)

ادیب اُردو | جنوری ۱۹۲۱ء میں "ادیب" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر ۳ جزو کا حجم جس میں ۱۶ صفحے نور اللغات حرف الباء کے شامل تھے۔ کاتب غفلت شعار تھا اور منیجر ناآزمودہ کار۔ کتابت اور طباعت کی عام شکایت ہوئی لہذا فروری سے کاغذ بہتر لگایا گیا اور چھپائی بھی دیدہ زیب ہوئی۔ ابتدائی پرچوں میں مولوی احسن اللہ خاں ثاقب۔ مولانا علی حسن احسن مارہروی۔ سید اولاد حسین شاداں۔ منشی عبدالوحید نیرنگ۔ منشی عبدالرفیع اثر۔ حضرت حمد لکھنوی۔ صفدر مرزا پوری۔ نواب لاڈلے واقف فرخ آبادی وغیرہم نے اعلےٰ درجہ کے مضامین لکھے۔ ریاض خیرآبادی۔ فصاحت لکھنوی۔ نصرت لکھنوی کی غزلیں شائع ہوئیں مدیر رسالہ نے بعض ادبی مضامین "نقاد" یا "نشتر" وغیرہ فرضی ناموں سے شامل کئے۔ چند ماہ کے بعد اودھ پنچ کے بہترین مضامین کا انتخاب بھی مسلسل شائع ہونے لگا اور "ادیب اُردو" کو ہندوستان کے موقت الشیوع رسالوں میں درجۂ امتیاز حاصل ہوگیا۔

اجرائے رسالہ کی اصلی غرض تدوین لغت کے لئے زبان و محاورات کی تحقیق تھی یہ امور مشورہ طلب" کے عنوان سے مولوی نور الحسن سوالات شائع کرتے تھے اور ملک کے ممتاز اہل قلم اُن کے جوابات تحریر فرماتے تھے۔ مثلاً پہلے پرچہ میں حسب ذیل سوالات تھے:—

۱۔ "ذرا" کا املا ذال سے صحیح ہے یا زے سے۔

۲۔ الفاظ مُہنّد میں اضافت فارسی کے متعلق کیا رائے ہے؟ اُردوئے مُعلّٰی۔ عرصۂ دراز۔ تعویذ لحد وغیرہ کی اضافت صحیح ہے یا نہیں۔

۳۔ "بم پولس" کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی اصل کیا ہے؟

۴۔ "عطائی" کا املا کیا ہے۔ اتائی صحیح ہے یا عطائی۔

مارچ ۱۹۲۱ء کے پرچے میں حضرت شاداں بلگرامی کے مفصل جوابات مع دلائل کے شائع ہوئے اس کے بعد بعض دیگر زباں دانوں نے اظہار خیال سے سرفراز فرمایا۔ مولف نور اللغات نے دلائل پر غور کر کے حسب ذیل تصفیہ کیا۔

۱۔ "ذرا" کا املا ذال سے صحیح ہے۔

۲۔ الفاظ عربی و فارسی جن کے معنوں میں اہل ہند نے تصرف کر لیا ہے مگر وہ الفاظ بہ معانی دیگر ہنوز فارسی یا عربی میں رائج ہیں تو ایسے الفاظ کو مضاف یا معطوف بطور فارسی کے کرنا جائز ہے۔

۳۔ انگریزی میں بم (Bum) بہ معنی سُرین اور پلیس (Place) بہ معنی جگہ کے ہے اور بم پلیس بول چال میں بیت الخلا کا مرادف ہے۔ لہذا بم پولس کو بم پلیس کا مخفف سمجھنا چاہئے۔

۴۔ "اتائی" ہندی لفظ ہے۔ جس شخص نے کوئی ہنر شوقیہ سیکھا ہو۔ وہ اُس کا آبائی پیشہ نہ ہو یا اُس نے باقاعدہ تعلیم اُس ہنر کی نہ پائی ہو تو اُس کو "اتائی" کہتے ہیں۔ حضرت شاداں نے لکھا تھا کہ اس کا املا عین سے ہے اور وہی کا مرادف ہے مگر مولف نور اللغات نے امیر مینائی کی تقلید کی اور اس لفظ کو ہندی قرار دیا۔

ناظرین کی دلچسپی کے لئے چند سوالات اور نقل کئے جاتے ہیں:—

۱۔ قسائی کا املا سین سے ہے یا صاد سے؟

۲۔ "مبارکبادی" صحیح ہے یا غلط؟

۳۔ آبدست مذکر ہے یا مونث۔ بول چال میں "کرنا" کے ساتھ ہے یا "لینا" کے ساتھ؟

۴۔ مجلس۔ محفل۔ بزم میں کیا فرق ہے؟

جوابات سُنئے:—

۱۔ عربی میں قص (بالصاد) کے معنی "کاٹنا" ہیں۔ قسار اور قسوۃ (بالسین) کے معنی سختی دل کے ہیں۔ اہل ہند نے قسار "ای" نسبت کے واسطے بڑھا کر "قسائی" بنایا۔ لہذا صحیح لفظ قسائی ہے۔ قصاب خالص عربی لفظ ہے اور یقیناً صاد سے ہے۔

۲۔ "مبارکبادی" صحیح ہے۔ (زُلالی)

خلیل اللہ را در مسلخ خونریزِ فرزندش　　　مبارکبادی قرباں بماہ عید قرباں زد

(داغ) غم جاوید نے دی مجھ کو مبارکبادی　　　جب سُنا یہ کہ انھیں شیوۂ بیداد آیا

۳۔ آبدست کو بعض اہل زبان مذکر بولتے ہیں لیکن بیگمات کی زبان مونث ہے "کرنا" اور "لینا" دونوں مصدروں کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ (محشر)

حج کر کے آئیں بڑھ گئی گوہر کی آبرو　　　اب آبدست لیتی ہیں موتی کی آب سے

۴۔ اہل ہند نے مجلس کو بنارِ غم کے لئے اور محفل کو بنار شادی کے لئے مخصوص کر لیا ہے

بزم مشترک ہے لیکن بیشتر عیش و نشاط کے مجمعوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
غرض اس قسم کے لطیف سوالات "ادیب" میں شائع ہوتے تھے اور اُن کے جوابات سے لغت کی تدوین میں مدد لی جاتی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ "جس قدر ہمت افزائی نوراللغات کی تالیف میں حضرت ریاض خیرآبادی نے کی اتنی ہندوستان بھر میں کسی نے نہیں کی۔ اور امورِ مشورہ طلب کے تحقیقی جوابات جس قدر کاوش سے مع اسناد کے حضرت شاداں بلگرامی نے تحریر فرمائے کسی اہل قلم نے عنایت نہیں کئے"۔
شاہزادہ مرزا ثریا قدر بہادر (نبیرۂ امجد علی شاہ بادشاہ چہارم ملک اودھ) باعتبار علمی قابلیت اور مذاقِ سخن کے نواب زادگان لکھنؤ میں ممتاز تھے۔ انھوں نے بھی بعض "امور مشورہ طلب" کے جوابات تحریر فرمائے اور ایک قطعہ تاریخ اجراء "ادیب" کا لکھا جو مارچ سنہ۱۹۱۲ء کے پرچے میں شائع کیا گیا۔
نواب شاہزماں مرزا عرف الکھن صاحب سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُنھوں نے نواب وزیر مرزا بہادر المتخلص بہ کدرکا بہا شا کلام مرحمت فرمایا اور بعض قدیم محاورات کا پہلو سے استعمال بتایا۔
چوکھی کی ایک سن رسیدہ بیگم صاحبہ ادیب کی سرپرست ہوئیں اور بیگماتی رسوم و اصطلاحات کی تشریح سے مؤلف نوراللغات کے سرمایۂ تحقیق میں اضافہ کیا۔
فصاحت لکھنوی۔ نصرت لکھنوی۔ عزیز لکھنوی سے ملاقاتیں ہوتیں اور دشوار ادبی مباحث اُن کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔ صبح سے شام بلکہ نو دس بجے رات تک یہی مشاغل رہتے تھے۔ البتہ جمعہ کے دن دفتر بند ہوتا۔ اُس دن پرائیوٹ خطوط کے جوابات لکھتے۔ روشن الدولہ کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے اور امامت صلوٰۃ فرماتے تھے۔
۲۸ جنوری سنہ۱۹۱۲ء کو ادیب کا پہلا پرچہ شائع ہونے کے بعد ایک عزیز کو لکھتے ہیں:۔

"بہت مدت کے بعد خط آیا۔ بیشک مجھ کو فرصت بہت کم ملتی ہے لیکن اگر تمھارا خط پنجشنبہ یا جمعہ کو ملے تو اس وجہ سے کہ جمعہ کو میں نے تعطیل رکھی ہے اور اس دن مطبع بھی بند ہوتا ہے خط کا جواب برابر پہونچتا رہے گا۔

ادیب اُردو میں وہ مضامین ہونا چاہئے جن کو اُردو لٹریچر سے تعلق ہو۔ صفات و تشبیہات کے متعلق کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے انتخاب شائع کرنا مناسب نہیں ہے"

تم ابھی چند نمبر ادیب کے دیکھ لو پھر رائے قائم کرنا کہ کس قسم کے مضامین لکھنا چاہئیے۔

خدا کا شکر ہے کہ ادیب کے متعلق ملک کا خاص رجحان ہے اور کل ہی کی بات ہے کہ ایک قدرداں نے اس کی سالانہ قیمت میں عطا فرمائے ہیں۔ رسالہ فروری کا تیار ہو چکا تھا اور مطلق گنجائش نہ تھی ورنہ ایسے قدردان کا شکریہ ادیب ہی کی زبان سے ادا کیا جاتا۔

فروری کا رسالہ پچاس صفحوں کا کردیا ہے اور کاغذ بھی بہتر لگایا ہے۔ امید ہے کہ اول ہفتہ فروری میں رسالہ جملہ حضرات کی خدمت میں روانہ کردیا جائے گا۔"

تعلیم و تربیت سے دلچسپی بدستور تھی۔ نبی حسن انگریزی پڑھتے تھے۔ طاہر حسن کی عربی تعلیم جاری تھی۔ مشیر احمد مدرسہ میں داخل تھے لیکن اُن کی نگرانی اور تربیت مدنظر رہتی تھی۔ طرّہ یہ ہوا کہ ندوۃ العلماء کے ارباب حل و عقد نے آپ کو کالج کی کمیٹی انتظامیہ کا ممبر بنا دیا اور انگریزی تعلیم کی نگرانی سپرد کی۔ کچھ وقت اس خدمت کے لئے بھی نکالنا پڑا۔ دو ایک بار حاکم ضلع سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ "خلاصۂ نظائر اودھ" کی شہرت عام تھی۔ جوڈیشل کمشنر اودھ نے حاکم ضلع سے مولانا کی قانون دانی کی تعریف کی تھی۔ ڈپٹی کمشنر لکھنؤ نے آپ کو اختیارات اسسٹنٹ کلکٹری درجۂ اول عطا کئے جانے کی سفارش کی۔ اس خدمت سے تالیف لغت میں ہرج کا اندیشہ تھا مگر ترک موالات کا زور شور تھا اس لئے صاف الفاظ میں آنریری خدمت سے انکار نامناسب معلوم ہوا۔

القصہ، قیصر باغ کے پُر فضا سبزہ زار کی سیر دلچسپ تھی۔ نوراللغات کے لئے مفید۔ ادیب اودھ کے لئے سودمند اہل زبان سے ملاقات کا ذریعہ اور مولانا کی شہرت عام کا وسیلہ لیکن سن شریف پنجاہ و پنج سے متجاوز ہو چکا تھا۔ شبانہ روز کی محنت صحت کے لئے مضر تھی۔ فراغت قلبی اور آسائش جسمانی میسر نہ تھی۔ مصارف دوچند ہوگئے تھے۔ ادیب کی آمدنی اس کے اخراجات کے لئے کافی نہ تھی۔ نوراللغات کی طباعت کے لئے کوئی رقم پس انداز نہ ہو سکتی تھی اور اُس کے صرف چھ چھ جز و چھ چھ مہینے میں شائع ہوتے تھے۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہونے لگا تھا کہ اسسٹنٹ کلکٹری کے فرائض اگر سپرد ہوئے تو اجلاس کے لئے کاکوری جانا لازم ہو جائے گا اسی اثنا میں نبی حسن کو لکھنؤ کی آب و ہوا ناپسند ہوئی اور وہ وطن چلے گئے۔ مشیر احمد نے علیگڈھ کالج میں تعلیم پانے کا شوق ظاہر کیا اور قیصر باغ سے رخصت ہوئے۔ مولوی احمد حسن پاٹانالہ پر ایک جداگانہ مکان میں سکونت پذیر تھے مولوی حامد حسن نے خواہش کی کہ نیر پریس

وہیں منتقل کیا جائے تاکہ کرایہ میں کفایت ہو۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں نبی حسن بیمار ہوئے
مرض میں اشتداد ہوا۔ بغرض معالجہ لکھنؤ آئے۔ جھوائی ٹولہ کے حکیم عبدالحمید سے رجوع کرنا تھا
اس لئے پاٹا نالہ پر مولوی احمد حسن کے ساتھ ٹھہرے۔ مولوی نورالحسن اور مولوی انوارالحسن
تیمارداری کے لئے ساتھ رہے۔ دوا دوش میں کوتاہی نہ ہوئی مگر قضائے خداوندی ٹل نہ سکتی تھی
۲ر مئی ۱۹۲۱ء کو سہ پہر کے وقت قلب کی حرکت یکایک بند ہوئی اور روح قفس عنصری سے
پرواز کر گئی۔ نعش کے ہمراہ کاکوری گئے اور شب کو گورستان تکیہ میں دفن کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دوسرے دن شام کے وقت لکھنؤ واپس آئے لیکن تہیہ کر لیا کہ قیصر باغ کی سکونت ترک
کی جائے۔ نیر پریس پاٹا نالہ پر رہے مگر نوراللغات اور ادیب اُردو کا دفتر کاکوری میں قائم
کیا جائے۔ اسباب کاکوری پہونچانے۔ مطبع کا سامان اُٹھانے میں ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ لگا۔
بالآخر ۱۶ر جون ۱۹۲۱ء کو وطن میں مستقل سکونت کے عزم سے کاکوری پہونچے۔

کاکوری میں مستقل قیام | برآمدہ پر قیام پسند فرمایا۔ دیواروں میں تختے لگا کر کتب خانہ بنایا گیا۔
اہل خانہ کی آسائش کے لئے برآمدہ اور محل سرا کے درمیان ایک جدید ڈیوڑھ تعمیر ہوا۔

نوجوان داماد کی ناگہانی موت سے طبیعت اداس تھی۔ علمی مشاغل میں دل نہ لگتا تھا عاقبت
کی فکر ہر وقت دامنگیر تھی۔ ایک عزیز کو لکھا تھا کہ "کشتی عمر لب ساحل پہونچ گئی۔ ناخدا نے
لنگر ڈال دیا۔ اب کوئی دم میں بغیر یار و مددگار۔ بے ساز و برگ۔ یکہ و تنہا۔ بیک بینی و
دو گوش منزل اول میں قدم رکھنا ہے۔ فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین"

لغت نویسی ملتوی تھی لیکن ادیب کے لئے مضامین مرتب کر کے لکھنؤ روانہ کرتے تھے
اور مولوی حامد حسن کی نگرانی میں پاٹا نالہ سے رسالہ شائع ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں اسسٹنٹ کلکٹری
درجۂ اول کے اختیارات عطا ہوئے۔ گزٹ دیکھ کر منشی مقبول علی نے حالات دریافت کئے۔ ۲۱ر
اگست ۱۹۲۱ء کو جواب میں تحریر فرمایا:—

"اسسٹنٹ کلکٹر ہونے کی ابھی تک کوئی باضابطہ اطلاع مجھ کو نہیں ہے۔ پچھلے ڈپٹی کمشنر
صاحب نے میرا ذکر جوڈیشل کمشنر سے سنا تھا اور اُنھوں نے کوئی یادداشت میری نسبت چھوڑی تھی
موجودہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے برادر عزیز سے تذکرہ کیا اور گورنمنٹ میں رپورٹ کر دی میری کوئی خواہش
اس عہدے کی نہ تھی لیکن انکار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ سنا ہے کہ کام بہت ہے۔ دیکھا جائے گا۔
اگر لغت کے کام میں ہرج ہوگا تو ترک کر دوں گا۔"

چند روز کے بعد ضابطہ کے احکام آ گئے۔ مقدمات کی مسلیں پہونچیں۔ پیشکار مقرر ہوا۔ کوٹھی کے مغربی دالان میں مولوی انوار الحسن مجسٹریٹی کا اجلاس کرتے تھے۔ مشرقی دالان میں اسسٹنٹ کلکٹری کی کچہری قائم ہوئی۔ قانون داں۔ معاملہ فہم اور جفاکش تھے۔ کام بہت بڑھ گیا اور دن کا بیشتر حصہ شہادتیں قلمبند کرنے اور تجویزیں لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ صبح کے وقت بعد وظائف کے "ادیب اردو" اور "نور اللغات" میں مشغول رہتے۔ دوپہر کو کتب تصوف کا مطالعہ کرتے اور تیسرا پہر مقدمات کے لئے وقف تھا۔ مولوی طاہر محسن کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کچھ وقت اُن کے پڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔ نور اللغات کا ایک جز دو ماہ بماہ ادیب کے ساتھ نکلتا تھا۔ ستمبر ۱۹۱۲ء کے پرچے میں ایک محاورہ "بانسوں اُچھلنا یا کودنا" درج ہوا اور اس کے معانی "خوشی یا غصے کی شدت میں کودنا۔ بے حد خوشی منانا" لکھے گئے اور داغ کا حسب ذیل شعر سند میں پیش کیا گیا۔

فرط خوشی میں میکش بانسوں اُچھل رہا ہے | وہ جوش ہے کہ پانی بانسوں اُچھل رہا ہے

منشی مقبول علی نے ایک عریضہ لکھا کہ "بانسوں اُچھلنا" خوف کے محل پر استعمال ہوتا ہے اور مثال میں یہ شعر لکھا:-

چھپے چوری ہوا ہے آج اُن سے وصل کا وعدہ | کلیجا ہاتھ بھر کا ہے مگر بانسوں اُچھلتا ہے

استاد نے جواب[۵] میں تحریر فرمایا:-

"اس شعر میں خوف کا احتمال بھی نہیں ہے۔ چھپے چوری وعدہ نہ ہوتا تو کیا کوئی بازاری ہے جس سے کھُلم کھُلا وعدہ ہوتا۔ "مگر" سے خوف کا احتمال کس طرح ہوگا۔ شاعر کہتا ہے کہ کلیجا خوشی سے ہاتھ بھر کا ہو گیا ہے۔ ہاتھ بھر کا کلیجہ ہے پھر بھی بانسوں اُچھلتا ہے۔ ہاتھ بھر کے کلیجے کا بانسوں اُچھلنا حیرت انگیز ہے اور اس حیرت کو "مگر" سے ظاہر کرتا ہے"

نبی حسن مرحوم کے انتقال کے تین چار مہینہ بعد اُن کی بیوہ کے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو ڈیڑھ ماہ زندہ رہ کر ستمبر ۱۹۱۲ء میں قضا کر گئی۔ مولوی نظیر الحسن مرحوم کی کثیر متروکہ جائداد کا داخل خارج نبی حسن کے انتقال کے بعد اُن کی نوزائیدہ لڑکی کے نام ہونے والا تھا مگر وہ بھی رخصت ہو گئی تو وراثت کا سوال پیدا ہوا۔ بیوہ کا حق چہارم نکالنے کے بعد ہزاروں روپیہ کی جائداد بچتی تھی اور بہت سے اعزہ اُس میں حصہ پانے کے امیدوار تھے۔ مولوی نور الحسن اور انوار الحسن کا حق بہ حیثیت عصبہ ہونے کے فائق تھا لیکن ہمشیرۂ مولوی نظیر الحسن (یعنے زوجۂ اولیٰ مولوی نور الحسن) کی اولاد ترکہ کی

[۵] مکتوب مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء

اس بنیاد پر دعویدار تھی کہ یہ جائداد اُن کے نانا مولوی محمد احسن مرحوم کی ہے اور عصبات میں تقسیم ہونے سے پہلے اُن کی مادر مرحومہ کا حصہ مشخص ہونا چاہیئے۔

ایک دن صبح کے وقت راقم الحروف خدمت میں حاضر تھا کہ ایک عزیز قریب نے مولوی محمد احسن مرحوم کی کل متروکہ جائداد کو اس سبب سے منحوس بتایا کہ اُن کے بیٹے اور پوتے کو اس سے منتفع ہونا نصیب نہ ہوا تھا اور مولوی نور الحسن کو صلاح دی کہ وہ اس جائداد میں حصہ نہ لیں۔ میں نے عرض کی کہ کل جائداد کی بابت تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن جس وقت "جزیہ گڈھی والا باغ" مولوی محمد احسن مرحوم خرید کر رہے تھے تو میرے سامنے کسی شخص نے مولوی صاحب مرحوم سے کہا تھا کہ یہ باغ منحوس ہے اس کو آپ خرید نہ کریں اور مولوی صاحب لاحول پڑھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ استاد یہ قصہ سُن کر مسکرائے اور فرمایا کہ میں اس جائداد کو لینا نہیں چاہتا لیکن احمد حسن اور حامد حسن کو نانا کی میراث ضرور ملنا چاہیئے۔

دراندازوں نے معاملہ کو طول دلایا اور مولوی نور الحسن اور انوار الحسن کے درمیان شکر رنجی پیدا کرا دی۔ کئی مہینہ تک مناقشہ رہا۔ بالآخر تصفیہ ہوا کہ کل متروکہ کا ½ حصہ بیوہ نبی حسن یعنے دختر مولوی نور الحسن کو دیا جائے۔ اور ¼ حصہ مولوی احمد حسن و حامد حسن کو دیا جائے۔ بقیہ جائداد مولوی نور الحسن اور انوار الحسن بحصہ برابر تقسیم کر لیں۔ اس تصفیہ کے بعد بیوہ نبی حسن مرحوم کا عقد مولوی احسن خلف مولوی انوار الحسن کے ساتھ ۸ رجمادی الثانیہ سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۶ رجنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو ہوا اور اس کے چند ماہ کے بعد مولانا نے وہ چہارم حصہ بھی جو تقسیم کے بعد اُن کو ملا تھا مولوی احمد حسن و حامد حسن کو ہبہ کر دیا اور کاغذات سرکاری میں دونوں صاحبزادوں کا نام اپنی جگہ درج کرا دیا۔

ہنوز یہ قضیہ ختم نہ ہوا تھا کہ مولانا نے اپنی موروثی جائداد کا بیشتر حصہ وقف علی الاولاد کیا اور اگست سنہ ۱۹۲۳ء میں دستخط و خود وقف نامہ کی رجسٹری کرا دی۔ تقریباً دو سال ان کھیڑوں میں صرف ہوئے اس مدت میں شعر گوئی کی بھی فرصت کم ملتی تھی۔ لغت کی ترتیب مقدمات کی تجویز اور خانگی نزاعات کے تصفیہ سے جو وقت بچتا وہ کتب تصوف کے نذر ہوتا تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں صرف ایک غزل لکھی اور وہ صوفیانہ مذاق سے رنگین ہے:۔

وہ کیا پردے میں بیٹھے جس کا چرچا جا بجا بھی ہے
برنگ بوئے گل مخفی بھی ہے جلوہ نما بھی ہے

حیا ایسی کہ گم نکہت ہے خیال و وہم سے اُس کو
اور اُس پر خود نمائی یہ کہ عالم آشنا بھی ہے

تری رحمت کے آگے بارِ عصیاں ہیچ ہی کیا ہے
پھر اپنا شافع محشر محمد مصطفےٰ بھی ہے

کبھی آنکھوں میں رہتے ہو کبھی تم دل میں بستے ہو　　تمھیں تو ہو محلہ بھر میں کوئی دوسرا بھی ہے
بت کافر نے دل چھینا خدا حافظ ہے ایمان کا　　یہی بستی میں کلمہ گو تھا کوئی دوسرا بھی ہے

اسی زمانہ میں "شمائل نبوی" بطرز مسدس نظم کرنے کا قصد کیا۔ مارچ ۱۸۸۶ء میں چودہ بند کہے مدت کے بعد دس بند اور لکھے لیکن نظم تمام کرنے کی فرصت نہ ملی نمونہ کے لئے ایک بند نقل کیا جاتا ہے :۔

جھکتی نہ اگر ہمت عالم سوئے پستی　　معمور نہ ہوتی کبھی آدم کی یہ بستی
افلاک رسالت کی نہ ہوتی کوئی ہستی　　ایمان کے تاروں کے لئے خلق ترستی
یہ چہرہ نہ ملتا کبھی یہ ماہ نہ ملتا
بالفرض یہ ملتے مگر اللہ نہ ملتا

تصوف کی بابت اس زمانہ میں جو خیالات تھے وہ مندرجہ ذیل خط سے ظاہر ہوتے ہیں جو ۲۹ فروری ۱۸۸۶ء کو منشی مقبول علی کے نام لکھا تھا :۔

"تصوف کے مذاق میں شاعری کا لطف ہے اس وجہ سے وہ دل خوش کن ہے لیکن صرف الفاظ سے لطف اٹھانے کی عمر گذر گئی۔ اب وہ اشارات وکنایات سے خوش نہیں ہوتا۔ وہ کچھ اور ہی ڈھونڈھتا ہے۔ دیکھئے پردہ کب اٹھتا ہے۔ جو اصل حقیقت کو پہونچ گئے اُن کی زبان بند ہوگئی اور جو ظاہری طلسم میں مبتلا رہے وہ لفاظی کرتے رہے۔ فی الحقیقت تصوف کی ادب بہار ہے۔"

مولوی طاہر حسن کی والدہ کو سفر حج کی آرزو تھی۔ اُن کی نانی یعنے بیوہ منشی محفوظ علی مرحوم ڈپٹی کلکٹر پنشنر بھی سامان سفر درست کر رہی تھیں۔ منشی اسحاق علی علوی۔ اڈیٹر "الناظر" بھی عازم بطحا تھے۔ اور بھی بعض اعزہ اس سال عرب جانے والے تھے۔ مولانا نے قصد کیا کہ وہ بھی اس قافلہ کے ساتھ دوبارہ سعادت حج و زیارت سے فیضیاب ہوں۔

۲۵ مارچ ۱۸۸۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"بیگانہ جامی نہ از خود رود　　گر ہمت شیخ جامش برد
دفعۃً قصد روانگی ہوگیا ہے۔ اپریل کے آخر یا مئی کے اول میں قصد روانگی ہے۔ طاہر کی نانی صاحبہ اور طاہر کی والدہ کا قصد باعث میرے ارادہ کا ہوا ہے۔ شوال میں دریا کے تموج کا احتمال ہے اس واسطے پیشتر سے روانگی کا قصد ہے۔ کاکوری سے

منشی انور علی[51]۔ منشی اسحاق علی۔ بھائی ظہور[52] کی ہمشیر عازم ہیں۔ رشید[53] بھائی کا بھی قصد ہے لیکن خفیہ ہے صحیح تاریخ روانگی سے بعد کو اطلاع دوں گا[54]۔"

۱۴ر اپریل ۱۹۱۲ء کو بدایوں تشریف لے گئے۔ راقم الحروف کی ایک لڑکی کی شادی خاں صاحب منشی عبدالقادر بلوی کاکوروی کے صاحبزادے سے قرار پائی تھی۔ وہ اُس وقت بریلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور راقم بدایوں میں تعینات تھا اس لیے طے ہوا کہ نکاح بدایوں ہی کر دیا جائے۔ فریقین کے اعزہ بدایوں آئے۔ ۷ر شعبان ۱۳۳۰ھ کو سہ پہر کے وقت عقد ہوا اور دوسرے روز غریب خانہ پر بزم مشاعرہ منعقد کی گئی۔ طرح تھی۔ ع۔ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔ استاد نے باوجود اصرار کے غزل نہ لکھی تھی سخن سنجان بدایوں کی موثر اور رنگین غزلیں سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ خود میر مجلس تھے اختتام بزم کے وقت شمائل نبوی کے چند بند پڑھے۔ اساتذۂ فن نے قدر کی اور مندرجہ ذیل شعر اہل ذوق کو حفظ ہو گیا:۔

سجدے میں ستارے گرے اور جھوم کے اُٹھے — جس طرح مصلّے کو کوئی چوم کے اُٹھے

بدایوں سے واپس آ کر سفر حجاز کا تہیہ شروع کیا۔ ۷ر مئی ۱۹۱۲ء کو کاکوری سے رخصت ہوئے۔ جہاز کی روانگی میں دیر تھی۔ بمبئی میں انتظار کرنا پڑا۔ وہاں بلغمی تپ میں مبتلا ہوئے اور بحری سفر کے قابل نہ رہے۔ مولوی طاہر حسن مع اپنی والدہ کے راہی عرب ہوئے اور مولانا کاکوری واپس آئے۔ یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولوی حامد حسن کی دُلہن بہت بیمار ہیں۔ اس کل داستان کو مولانا ہی کی زبان سے سنئے:۔

(۱) "بمبئی[55] میں ۱۴ر مئی کو مجھے بلغمی تپ ہوئی جس سے تھرمامیٹر انتہائی درجے پر پہونچ گیا۔ تیسرے روز میں اورنگ آباد مشفقی ظہور الدین احمد کے پاس چلا گیا۔ اُنھوں نے اور اُن کی بیوی نے جس اخلاق و محبت سے تیمارداری کی اُس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹری علاج کیا۔ ۱۷ر مئی کو بخار کم ہونا شروع ہوا۔ بخار کی پریشانی میں میں نے والدۂ طاہر کو بمبئی سے بلا لیا تھا۔ بخار اُتر جانے کے بعد میں نے اُن کو مع طاہر کے بمبئی بھیج دیا اگرچہ وہ مجھ کو چھوڑ کر جانے پر رضامند نہ تھیں۔ میں ۲۸ر مئی کو اورنگ آباد سے روانہ ہو کر ۲۹ر مئی کو کاکوری پہونچا۔ ۳۰ر مئی کو طاہر مع اپنی ماں، ہمشیر اور نانی کے سردستان جہاز میں بمبئی سے روانہ ہوئے۔

[51] منشی انور علی خلف خان بہادر منشی اطہر علی مرحوم [52] سید ظہور الدین احمد مسبوق الذکر
[53] ناجی رشید الدین مرحوم مسبوق الذکر [54] مکتوب مورخہ ۶ر جون ۱۹۱۲ء بنام منشی مقبول علی۔

یہاں آکر مجھ کو معلوم ہوا کہ حامد کی دُلہن کو حرارت رہتی ہے اور اطبا پھیپھڑے میں فساد تجویز کرتے ہیں جس سے نہایت پریشانی ہوئی۔ یہاں جو ڈاکٹر آئے ہیں وہ اس مرض کے واسطے پچکاری دیتے ہیں۔ یہ پچکاری حال میں ایجاد ہوئی ہے۔ یہاں دو مریض ان کے زیر علاج ہیں دونوں کی تپ دفع ہوگئی ہے۔ میں نے فرنگی محل لکھا تھا کہ مریضہ کو یہاں بھیج دیں مگر وہاں سے یہ جواب ملا کہ اطبا اجازت نہیں دیتے۔ اس علالت سے نہایت پریشانی ہے۔ شافی مطلق اُس کو شفا عطا فرمائے۔ مجھ کو ضعف بہت ہے۔ خط لکھنا بھی بار ہے۔ معالجہ ہوتا ہے۔"

(۲) " پرسوں میں انتظار میں بلکہ اُس وقت جب میں انتظار کرتے کرتے نہایت پریشان اور مضطر ہو رہا تھا۔ برخوردار طاہر سلمہ کا خط مورخہ ۲۳ر جون آیا جس سے ان لوگوں کا مع الخیر مکہ معظمہ پہونچنا اور گیارہ گنی میں مکان لے کر متصل بیت اللہ مقیم ہونا معلوم ہوا۔ الحمد للہ کہ سفر کا ایک مرحلہ طے ہوا۔ اور زیارت بیت اللہ نصیب ہوئی۔ میری فریاد تو یہ ہے۔

قافلہ شد واپسی ما بیں　　　اے کس ما بکیسی ما بیں

برخوردار حامد حسن سلمہ کی دُلہن کی حالت تردد انگیز ہے۔ شافی مطلق شفا عطا فرمائے حامد حسن بہت پریشان ہیں اسی وجہ سے ادیب جون میں نہیں نکل سکا۔ اب جولائی جون کا ایک پرچہ نکالا ہے۔"

(۳) " دعاہائے صحت و عافیت و فلاح دارین۔ تین روز سے بار بار تمہارا خیال آتا تھا اور کئی بار ارادہ ہوا کہ تم کو خط لکھوں۔ کل شام کو تمہارے خیال کے ساتھ یہ شعر زبان پر رہا۔

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر　　　تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

آج صبح کو تمہارا خط ملا۔ بے اختیار دعائیں زبان سے نکلیں۔ اللہ تعالیٰ شرف قبول عطا فرمائے طاہر سلمہ کا خط مکہ معظمہ سے آیا۔ یہ خط ۲ر اگست کا لکھا ہوا تھا جو ۶ر ستمبر کو مجھ کو ملا وہ لوگ ۷ر اگست کو مدینہ طیبہ روانہ ہوے ہوں گے۔ صفر کے آخر یا ربیع الاول کے اول ہفتہ میں یہاں پہونچ جائیں گے انشاء اللہ۔ انور سلمہ کا خط بھی اسی مضمون کا آیا ہے۔ حامد حسن سلمہ کی دُلہن کی حالت خطرناک ہے۔ معالجہ ہو رہا ہے۔ کسی دوا علاج سے افاقہ نہیں ہوتا۔ منشی اسحاق علی سلمہ کا خط اُن کے گھر آیا ہے اُن کو بخار آگیا تھا اس وجہ سے وہ مکہ معظمہ سے روانہ نہیں ہوئے۔"

سلہ مولوی حامد حسن پسر دوم مولوی نور الحسن　　　سلہ مکتوب مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۲۳ء

سلہ مکتوب مورخہ ۷ر ستمبر ۱۹۲۳ء

(۴) "۳۰ راکتوبر کو برخوردار طاہر سلمہ مع دیگر اعزہ کے شام کی گاڑی میں مع الخیر یہاں پہونچے
سب لوگ گرمی کی شدت سے حبشی ہوگئے ہیں۔"

القصہ بمبئی سے واپس آنے کے بعد تدوین لغت کی طرف زیادہ توجہ کی۔ مولوی حامد حسن اپنی بیوی کی شدید علالت کی وجہ سے پریشان تھے۔ ادیب کی اشاعت میں تعویق ہوتی تھی علاوہ اس کے دو سال کی مدت میں صرف چھبیس جزو لغت کے شائع ہوسکے تھے اور حرف البا بھی تمام نہ ہوا تھا لہٰذا طے کیا گیا کہ دسمبر سنہ ۲۲ء سے ادیب بند کر دیا جائے اور نور اللغات کا ایک حصہ بڑی تقطیع پر چھپوا کر ملک کے سامنے پیش ہو۔ اگر قدردانی ہوئی تو بقیہ حصص طبع کر لئے جائیں گے ورنہ کتاب غیر مرتب چھوڑ دی جائے گی۔

۹ر دسمبر سنہ ۲۳ء کو مولانا کی چھوٹی ہمشیرہ یعنی والدۂ منشی وزیر احمد تحصیلدار کا یکایک انتقال ہوگیا۔ اس سانحہ سے دل و دماغ کو سخت صدمہ پہونچا۔ ۹ ر دسمبر کے خط میں لکھتے ہیں:-

"اس زمانہ کی پریشانیوں سے حواس درست نہیں ہیں۔ والدۂ وزیر احمد کے انتقال نے زندگی
کا حوصلہ پست کر دیا۔ اُن کا انتقال ایسا ہوا جیسے اولیاء اللہ کا ہوتا ہے۔ خدائے تعالےٰ مغفرت فرمائے
حامد حسن سلمہ کی دُلہن کی حالت روز بروز خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ حامد حسن بہت پریشان ہیں۔
ادیب کی اشاعت بھی نہیں ہوسکتی ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ نور اللغات کو مرتب کر دوں کیونکہ
میرے بعد اس کا مکمل کرنے والا ہندوستان میں کوئی نظر نہیں آتا۔"

جنوری سنہ ۲۴ء میں زوجۂ حامد حسن کی علالت ناقابل علاج ہوگئی۔ معالجہ اور تیمارداری کی پریشانیوں سے مولوی حامد حسن خود بیمار ہوگئے۔ نمونیہ کا سخت حملہ ہوا۔ مولوی نور الحسن فدا نور الحسن لکھنؤ پہونچے۔ ۵ر فروری سنہ ۲۴ء کو وہ بیوی راہی جنت ہوئیں۔ مولوی حامد حسن کو ڈاکٹروں نے جواب دیا۔ باپ چچا بھائی بدحواس ہوگئے۔ اطبارِ یونانی کی طرف رجوع کیا۔ شفا اُن کے ہاتھ مقدر تھی۔ ایک ہی نسخہ سے افاقہ شروع ہوا اور چند روز میں صحت ہوگئی۔ ادیب اُردو بند کر دیا گیا۔ نور اللغات کا حصہ اول نیر پریس میں چھپ رہا تھا۔ مولوی حامد حسن کی پریشان خاطری اور شدید علالت سے طباعت میں تعویق ہوئی۔ اپریل سنہ ۲۴ء تک اس جلد کا نصف حصہ بھی تیار نہ ہو چکا تھا کہ مولانا کا چھوٹا لڑکا ناصر حسن جو ۲ر نومبر سنہ ۲۲ء کو پیدا ہوا تھا بیمار ہوا اور اُس کی علالت کی سبب مولانا بھی طباعت کی دیکھ بھال نہ کر سکے۔ اہل خانہ مع بیمار بچہ کے لکھنؤ میں تھیں اس لئے

مکتوب مورخہ ۹ر اکتوبر سنہ ۲۳ء بنام منشی مقبول علی۔

بار بار دفتر سے غیر حاضر ہونا پڑتا تھا اور پروف کی کاپیاں صحیح کرنے میں تاخیر ہوتی تھی۔ جون میں بچہ کو افاقہ ہوا تو جولائی میں زنانخانہ میں آگ لگ گئی۔ لغت چھپوانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی اور غیر معمولی اخراجات یکے بعد دیگرے پیش آتے تھے۔ سارا وقت تحقیق الفاظ و محاورات کے نذر کرنا چاہتے تھے مگر ہجوم افکار اجازت نہ دیتا تھا۔ اس زمانہ کے دو خط پڑھنے کے قابل ہیں۔

(اوّل) عزیز بجان سلمہ الرحمٰن۔ دعا ہاے صحت و عافیت و فلاح دارین۔ تمھارے خط سے مجھے وہ فرحت ہوتی ہے جو مُردے کو فاتحہ کے ثواب سے اور اسی وجہ سے عالم بے اختیاری میں جواب لکھتا ہوں۔ میں اس عالم میں کہاں ہوں جس سے تم خط نہ لکھنے کی شکایت ہو۔ خدا معلوم کس دُھن میں مبتلا ہوں۔ کبھی کسی دوست کا خط آجاتا ہے چونک پڑتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ابھی لوگ میرا شمار زندوں میں کرتے ہیں۔ ناصر کو اب کسی قدر افاقہ ہے۔ میں دس روز لکھنؤ رہ کر چلا آیا ہوں۔ یہاں دو چار روز رہ کر پھر لکھنؤ کا قصد ہے۔ حامد حسن کے متعلق ابھی کیا رائے قائم کی جائے۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے برخوردار امیر احمد سلمہٗ نیچ کی چھاؤنی میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر مقرر ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُس کو صحیح و سلامت و با اقبال رکھے اور عمر طبعی عطا فرمائے۔

نور الحسن
۲۹ مئی پنجشنبہ

(دوم) دعا و سلام۔ خط آیا۔ آگ لگنے کا واقعہ عجیب و غریب ہے۔ زنانہ مکان کے برد میں آگ لگی۔ بجز اس من خشک لکڑی اور متفرق اسباب تھا۔ سب جل گیا۔

اس موسم میں کہیں آگ لگتے نہیں سُنا۔ پریشانیوں کی حالت خدا ہی جانتا ہے۔ ایک سلسلہ ہے جس کی انتہا کا خدا کو علم ہے۔ دعا کرو کہ خدا تعالیٰ مجھ کو استقلال عطا فرمائے۔ سُننا نہ سُننا اُس کے اختیار میں ہے۔ اُس سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ بیشمار نعمتیں اور بے حد احسانات ہیں پھر بھی جب ذرا سی کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوتی ہے تو شکوہ مُنہ کی زبان سے نہیں تو دل کی زبان سے ضرور نکلنے لگتا ہے۔ مایوسی ہوتی ہے تو اُس کے رحمت ہی رحمت عام سے زیادہ امیدیں ہو جاتی ہیں۔ اسی رحمت کے بھروسے پر عمر بسر ہوتی ہے۔

یارب تو بفضل بدمن کار مکن　　　با من تو ہماں کن کہ بہ آں معروفی

نور الحسن　　۱۱ جولائی　　۸ ذیقعدہ۔ جمعہ

| نور اللغات جلد اول | باوجود خانگی ترددات۔ افکار و آلام کے اسی زمانہ میں نور اللغات پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا جس میں اُن الفاظ و محاورات کی تفصیل تھی جو متقدمین اور متوسطین کے کلام میں پائے جاتے ہیں مگر اب متروک یا قلیل الاستعمال ہیں۔ آگو۔ ٹک۔ پرے۔ آئے ہے۔ جلسے ہے وغیرہ قدیم الفاظ و محاورات کے علاوہ حسب ذیل الفاظ بھی اس فہرست میں شامل تھے!

بارے۔ (آخرالامر۔ آخرکار۔ الغرض) بن۔ (بغیر)
بھانا۔ (پسند آنا۔ خوش آنا) لکھنؤ میں صرف عورتوں کی زبان پر ہے۔
بھیتر۔ (اندر) پر۔ (لیکن)
پنھانا۔ (پہنانا) تلک۔ (تک)
جان۔ "یہ لفظ پہلے مذکر استعمال ہوتا تھا لیکن اب بالاتفاق مونث ہے"
جانی۔ "یہ لفظ اب فصحا استعمال نہیں کرتے۔ متقدمین کے کلام میں موجود ہے مثلاً

لڑکپن میں یہ ضد ہے جانی تمہاری ابھی دیکھنی ہے جوانی تمہاری (نسیم دہلوی)

لکھنؤ میں ابا جانی۔ اماں جانی کی ترکیب سے عورتوں کی زبان پر ہے"
جوبن۔ (بہ معنی پستان متروک۔ بہ معنی حسن و جمال مستعمل ہے)
چکھا۔ (بہ تشدید کاف فصیح ہے)
حشر۔ (میر نے مونث کہا ہے لیکن اب بالاتفاق مونث ہے)
حلال خوری۔ حلال خورنی۔ (اب لکھنؤ میں حلال خورن بولتے ہیں)
دھرنا۔ (رکھنا) ڈھیل۔ (تاخیر)
رکھا۔ (بہ تشدید کاف فصحا کے استعمال میں ہے) سدا۔ (ہمیشہ)
سر۔ (بالفتح کی جگہ بالکسر یعنی "سِر" فصحا کی زبانوں پر ہے)
سلانا۔ (سلوانا) فی الواقعی۔ (فی الواقع)
کفارہ۔ (بہ تشدید حرف دوم صحیح ہے)
ناگوارا۔ (ناگوار) یہی۔ (یہی)
متروک الفاظ کی طویل فہرست کے علاوہ چند ضروری قاعدے بھی مقدمہ میں درج تھے۔ مثلاً
(۱) ہندی الفاظ کی جمع الف نون سے قطعاً متروک۔ فارسی الفاظ کی جمع الف نون سے صفت یا اضافت کی حالت میں مستعمل ہے۔

(۲) جب ترکیب فارسی ہو (جیسے تابع فرمان) تو آخر لفظ کی نون کو باعلان پڑھنا متروک ہے۔
(۳) جو لفظ خود جمع ہے اُس کی جمع بقاعدۂ اُردو بنانا جائز ہے جیسے احباب واغیار کی جمع احبابوں واغیاروں۔
(۴) لفظ ہر کو جمع کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ "ہر علمانے کہا" غلط ہے۔ "ہر عالم نے کہا" صحیح ہے۔
(۵) جو شخص مرگیا ہو اُس کے نام کے ساتھ صاحب کا لفظ لگانا معیوب ہے۔ لقب کے ساتھ مضائقہ نہیں۔
(۶) "لانا" اور "سمجھنا" مصادر کے فاعل کے ساتھ لفظ نے کا نہ لانا فصیح ہے مثلاً میں یہ رسالہ لایا۔ میں سمجھا۔ وہ کتاب لائی۔ وہ سمجھی۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

خدا خدا کرکے نومبر ۱۸۹۱ء میں حصہ اول کی طباعت سے فراغت ہوئی اور دسمبر ۱۸۹۱ء میں یہ جلد شائقین کے ہاتھوں تک پہونچی۔ اس جلد میں صرف الف اور ب کے الفاظ و محاورات تھے۔ حرف الف کے الفاظ امیر اللغات سے اخذ کیے گئے تھے لیکن بہت سے الفاظ و محاورات جو امیر اللغات میں سہواً رہ گئے تھے نور اللغات میں اضافہ کیے گئے۔ مثلاً

آبِ زلال۔ | آبِ کوثر سے زبان دھو ڈالنا
آبگیر۔ (تالاب) میر نے کہا ہے۔

اپنے روتے ہی روتے صحرا میں | گوشے گوشے میں آبگیر ہوئے

آتشدان۔ (انگیٹھی) | آسودگی۔ (راحت آرام۔ خوشحالی۔ سیری)
آشفتگی۔ (پریشانی)
آنچل پکنا۔ (عورتوں کی زبان میں چھاتی میں زخم ہونے کو کہتے ہیں)
آندی روگ۔ (چلتے چلتے تھک جانے کی جگہ)
آنی جانی چیز۔ (ناپائدار) | آوارگی۔ (شہدپن)
ادھ کچی۔ (ناتمام۔ ناقص)۔ شاد

ادھ کچی کہہ کر نہ چھوڑ دیں حباں | بات کا انسان پورا چاہئے

اندھیر کھاتا۔ (سختی۔ بدمعاملگی۔ بےایمانی) داغ۔ وہاں انصاف پھر کیا ہو جہاں اندھیر کھاتا ہو۔

المختصر حرف الف کے الفاظ و محاورات میں امیر اللغات سے بہت اضافہ تھا اور حرف الیا

کے لئے جو کدو کاوش مولانا نے کی اُس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس مقام پر تین لفظ اور نقل کیئے جاتے ہیں:—

(۱) بوالہوس۔ بعض فرہنگ نویسوں کی رائے ہے کہ ہوس فارسی ہے اس پر الف لام تعریف کا لانا صحیح نہیں ہے۔ لہذا اس لفظ کو بُل (بہ معنی بہت) اور ہوس (بہ معنی آرزو) سے مرکب سمجھنا چاہیئے۔ لغات عربی میں ہوس بہ معنی جنون اور دیوانہ ہونے کے ہے۔ اُردو میں بوالہوس کے معنی "نہایت آرزومند" "بڑا حریص" "بہت ہوس رکھنے والا" "خواہش نفسانی کا پابند" ہیں۔

(۲) بادیہ۔ تانبے کا بڑا پیالہ یا کٹورا۔ (جان صاحب)

جنگل میں گھومے بادیہ لائے نہ آج تک کہتے تھے چل کے شہر میں لے دیں گے جام ہم

مولف نفائس اللغات نے "بادیان" لکھا ہے۔ ترکی میں بڑے پیالے کو "بادیہ" کہتے ہیں۔

(۳) بگولا۔ چکر کھاتی ہوئی ہوا۔ بونڈلا۔ اکثر شعرا نے بگولے اور ببولے کو بہ معنی "گردباد" کہا ہے لیکن مولف کی رائے میں "بگولا" بہ معنی گردباد اور "ببولا" بہ معنی حباب ہے۔ "ببولا" لفظ "باد" بہ معنی ہوا اور "بُلا" بہ معنی حباب سے مرکب ہے لہذا اس کا استعمال بہ معنی گردباد صحیح نہیں ہے۔ بہ معنی حباب صحیح ہے۔

یہ ریویو نا تمام رہے گا اگر اس مقام پر اُن ضروری قواعد کا حوالہ نہ دیا جائے جو مولانا نے امالے کی بابت تحریر فرمائے۔ اصطلاح میں "امالہ" کے معنی ہیں" ہائے ہوز یا الف مقصورہ کو جو الفاظ کے آخر میں پڑیں یائے مجہول سے بدل دینا" جیسے بندہ سے بندے۔ تذکرہ سے تذکرے اُردو میں یہ "امالہ" صرف جمع کی حالت میں یا حرف ربط[1] کے ساتھ استعمال ہونے کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور صحیح اُردو لکھنے کے لئے ان اصول سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ جلد اول کے صفحات ۳۵۷ و ۳۵۸ پر یہ سب قاعدے بہ تفصیل لکھے گئے ہیں۔ مولانا کو خود ان قواعد کے فراہم کرنے پر ناز تھا اور شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ "امالے کے قواعد جو میں نے نور اللغات کی پہلی جلد میں لکھے ہیں دیکھ لو۔"

خلاصہ ان قواعد کا حسب ذیل ہے:—

(۱) عربی اور فارسی الفاظ کا اصلی "الف" کسی صورت میں یائے مجہول سے نہیں بدلتا۔

---

[1] حروف ربط یہ ہیں: "سے۔ میں۔ تک۔ پر۔ نے۔ کو۔ کا۔ کے۔ کی۔"

جیسے دعا۔ قضا۔ جزا وغیرہ کا الف (اس قاعدہ سے "سودا" کا لفظ مستثنیٰ ہے۔ اُس کا "الف" امالہ قبول کرتا ہے)

(۲) عربی الفاظ کی جمع میں امالہ جائز نہیں جیسے طلبہ۔ اشقیا۔ انبیا۔ اولیا۔ علما وغیرہ۔

(۳) اسم فاعل اور اسم مفعول میں تصرف جائز نہیں جیسے دانا۔ بینا۔ شنیدہ۔ مرتضٰے وغیرہ (اس قاعدہ سے "مُردہ" مستثنیٰ ہے)۔

(۴) جن عربی الفاظ کے آخر میں الف مقصورہ ہوتا ہے کوئی تصرف نہیں قبول کرتے جیسے طوبیٰ۔ اعلیٰ۔ ادنیٰ وغیرہ (اس قاعدے سے۔ دعویٰ۔ شکویٰ۔ بلویٰ۔ تقویٰ مستثنیٰ ہیں۔

(۵) عربی الفاظ جن کے آخر میں ہائے ہوز پڑھی جاتی ہے امالہ قبول کرتے ہیں جیسے تذکرہ۔ جلسہ۔ فدیہ وغیرہ۔

(۶) جن الفاظ کے آخر میں "عین" ہوتا ہے حرف ربط آنے سے حرف ما قبل عین کو کسرہ دیتے ہیں جیسے مصرَع سے مصرِع۔ مطلَع سے مطلِع۔
جمع کی حالت میں یائے مجہول اضافہ کرکے اور عین کو تلفظ سے ساقط کرکے بولتے ہیں جیسے مصرعے۔ مقطعے وغیرہ۔

(۷) آدمیوں اور شہروں کے ناموں میں امالہ جائز نہیں بعض حضرات کی رائے ہے کہ کلکتہ آگرہ وغیرہ کو جب (ی) کی آواز سے بولیں تو اسی طرح لکھیں بھی۔ جیسے "تم کلکتے گئے" "ہم آگرے آئے" لیکن جمہور اس کے خلاف ہیں۔

(۸) ہندی اور اُردو کے اسماء و صفات جن کے آخر میں الف ہوتا ہے یائے مجہول سے بولے لکھے جاتے ہیں جیسے بھلا۔ اچھا۔ نیلا۔ پیلا وغیرہ (اس قاعدہ سے سوا۔ پردا۔ بچھوا۔ مستثنیٰ ہیں)۔

(۹) اُردو کے تمام مصادر میں حرف ربط کے ساتھ امالہ ہوتا ہے لیکن جمع کی حالت میں نہیں ہوتا۔
نور اللغات کی پہلی جلد بصرف زر کثیر شائع ہوئی لیکن دوسری جلد چھپوانے کے لئے سرمایہ نہ تھا اوقات فرصت لغت کی تدوین میں بدستور صرف کرتے تھے مگر طے کر لیا تھا کہ دوسری جلد اُس وقت تک پریس کو نہ دی جائے گی جب تک کہ جلد اول کی اس قدر کاپیاں فروخت نہ ہو جائیں کہ اخراجات طباعت جلد ثانی اُس رقم سے ادا ہو سکیں۔ مندرجہ ذیل خط اسی زمانہ کی یادگار ہے:—

"دعا و سلام۔ خط آیا۔ تم کو معلوم نہیں کہ میں کس طرح کام کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہوں۔ لغت کی تکمیل کوئی معمولی بات نہیں اُس کے علاوہ ایک کام عدالت کا بھی ہے۔ بڑا حصہ وقت کا لغت میں

صرف ہو جاتا ہے بقیہ حصہ میں سے دو تین گھنٹے عدالت کے کام کے ہیں۔ انصاف کرو کہ اب وقت کہاں ہے جو اور کوئی کام چھیڑا جائے۔ لغت کا کام اب اتنا ہو گیا ہے کہ اُس کے ترک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اگر موقع ملا تو بعد تکمیل لغت کے نعت میں وقت صرف کرنے کا قصد ہے انشاء اللہ۔ نور اللغات چار جلدوں میں شائع ہوگی۔ دوسری جلد کی طباعت اس انتظار میں ملتوی ہے کہ از غیب کوئی سامان ہو جائے۔ دیکھئے اس کی نوبت کب آتی ہے۔

گرمی کی وہ شدت ہے کہ یاران فراموش کردند عشق " نور الحسن

۱۴ جون ۱۹۲۵ء

۱۹۲۵ء ختم ہو گیا اور جلد دوم کی طباعت شروع نہ ہو سکی۔ ۳ جنوری ۱۹۲۶ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

" نور اللغات کے پہلے حصہ میں جو مصارف پڑے ان کو خیال کر کے دوسری جلد چھپوانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالےٰ مسبب الاسباب ہے، غیب سے کوئی سامان ہو جائے تو یہ کتاب چھپ جائے ورنہ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ "

نور اللغات جلد دوم | خداوند کارساز نے کتاب کی اشاعت کی یہ صورت پیدا کی کہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے گورنر سر ولیم میرس کی توجہ زبان اُردو کی ترقی کی طرف مبذول ہوئی۔ وزیر تعلیمات، اور ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے مشورہ سے اُنھوں نے نور اللغات کی سرپرستی کی۔ منجانب حکومت سو کاپیاں خریدکیں اور دو ہزار روپیہ سالانہ تین برس کے لئے بطور زر امداد منظور فرمایا۔

محکمہ تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ میں اعانت کی سفارش کی۔ ریاستہائے میسور و حیدرآباد نے کتب خانوں کے لئے نور اللغات کو موزوں تجویز کیا۔ بعض ڈسٹرکٹ بورڈوں نے مدرسوں کے لئے اس کی جلدیں خریدکیں اور ملک کے ہر گوشہ سے کتاب کی طلب ہونے لگی۔

مولانا نے امداد غیبی کا شکر ادا کیا اور حکومت سے دو ہزار روپیہ کی پہلی قسط پاتے ہی کاغذ خرید کر کے دوسری جلد کی طباعت شروع کرا دی۔ مئی ۱۹۲۶ء میں امداد کی منظوری آئی اور دسمبر ۲۶ء میں دوسری جلد تیار ہو گئی۔

اس جلد میں پ لغایت خ کے الفاظ و محاورات تھے۔ تحقیق و تدقیق کا یہاں بھی وہی عالم تھا جس کی جھلک جلد اول کی تقریظ میں دکھائی گئی ہے۔ نمونہ کے لئے تین لفظ نقل کئے جاتے ہیں:۔

(۱) پچھوانا ۔ یہ " پوچھنا " کا متعدی المتعدی ہے۔ اس کا املا بغیر " واؤ " کے ہے یعنی " پوچھوانا

غلط ہے "پچھوانا" صحیح ہے۔

(۲) تماچا۔ یہ لفظ تاے فوقانی سے لکھنا چاہیے۔ طپانچہ لکھنا غلط ہے کیونکہ یہ لفظ فارسی ہے

(۳) تماکو۔ یہ لفظ امریکہ کی زبان میں "ٹوبے کو" تھا۔ اس کا رواج جلال الدین اکبر کے وقت میں اول اول دکن میں پھر تمام ہند میں ہوا۔ لکھنؤ کی بیگمات پینے کا ہو تو "تماکو" اور پان میں کھانے کا ہو تو "تمباکو" کہتی ہیں۔ دہلی والے پینے کا ہو تو "تمباکو" اور کھانے کا ہو تو "زردہ" کہتے ہیں۔ اہل فارس "تنباکو" لکھتے ہیں۔

اُردو کانفرنس کی صدارت | جلد دوم ہنوز مطبع سے باہر نہ نکلی تھی کہ آل انڈیا اُردو کانفرنس کا اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ۲۶ ر ۲۷ ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو بہ مقام دہلی منعقد ہوا اور مولانا اس جلسہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اجلاس سے صرف پانچ روز پیشتر مولانا کو اطلاع ملی۔ شکریہ کے ساتھ اس عزت کے قبول کرنے سے انکار کرنا چاہا لیکن بعض عزیزوں اور شاگردوں کے اصرار سے راضی ہوئے۔ خطبۂ صدارت مرتب کرنے کا وقت نہ تھا۔ بہ عجلت تمام چند اوراق لکھے اتفاق سے روانگی کے وقت اسٹیشن پہونچنے میں دیر ہوئی۔ جیسے ہی گاڑی میں قدم رکھا ریل چھوٹ گئی اور ملازم مع سامان واسباب کے رہ گیا۔ رات کے وقت دہلی پہونچے۔ جاڑوں کا موسم اور سامان سرمائی ہمراہ نہیں۔ کارکنان کانفرنس نے اسباب راحت فراہم کیا۔ صبح کو اجلاس تھا۔ چند اوراق مولانا کی جیب میں تھے جن میں بعض الفاظ کی تحقیق و تشریح تھی انھیں کو اضافہ اور ترمیم کے بعد کانفرنس میں پڑھا۔ اہل بزم نے نہایت قدر کی۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے سہ ماہی رسالۂ "سہیل" نے دسمبر ۱۹۲۶ء کے "شمارہ" میں اسی مضمون کو "خطبۂ صدارت کے" عنوان سے شائع کیا اور "شذرات" میں نوٹ لکھا کہ "مولانا نورالحسن صاحب نیر بی اے ال ال بی مولف نوراللغات کو فرائض صدارت سے عہدہ برآ ہونے کا بہت کم وقت ملا۔ تاہم خطبۂ صدارت عام طور پر نہایت مقبول ہوا۔ ہم جملہ اراکین کی طرف سے ممدوح کے شکر گذار ہیں"۔

مشاعرے | مقامی حکومت کی امداد نے مولوی نورالحسن کو طباعت لغت کے اخراجات سے ایک حد تک بے فکر کر دیا۔ دو جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور فروخت ہو رہی تھیں۔ تیسری اور چوتھی جلد کی تدوین ہو چکی تھی صرف نظر ثانی کی احتیاج تھی۔ اسسٹنٹ کلکٹری کی خدمت سپرد تھی۔ دن کا بڑا حصہ اسی کام میں گذرتا تھا۔ کاکوری میں ایک انگریزی اسکول مدت سے قائم تھا اب اس کی نگرانی مولانا نے اپنے ذمہ لی اور روزانہ کچھ وقت اُس کے انتظامات کی درستی میں صرف کرتے تھے۔ ندوۃ العلما کی مجلس انتظامیہ کیا

شرکت کے لئے گاہ گاہ لکھنؤ جاتے تھے۔ اعزہ اور ارباب برادری کی باہمی نزاعات کا تصفیہ اگر ان کے سپرد کیا جاتا تو بدل وجان کوشش اور پیروی کرتے تھے۔ شعر وسخن سے ذوق ترقی پر تھا۔ نوجوانان وطن میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلا مشاعرہ ۵ جولائی ۱۹۲۷ء کو ہوا۔ منشی نور الدین احمد کیفی جو منشی محمد رضا صبر کاکوروی کے شاگرد اور نہایت کہنہ مشق لطیف البیان بذلہ سنج شاعر تھے اُس وقت تک بقید حیات تھے اُنھوں نے بھی مشاعرے کے لئے غزل لکھی۔ چند اشعار بطور نمونہ کے نقل کئے جاتے ہیں :-

منصور نے کہا تھا انا الحق کہ یار نے　　　اک بے گنہ کا خون کیا مفت دار نے
اے شیخ دیکھ حشر میں عصیاں کا مرتبہ　　　پوچھا ہمیں کو رحمت پروردگار نے
پیری میں بھی تو کم نہ ہوا جوش عشق کا　　　آیا ہزار ضعف طبیعت کو مارنے
یکتائی کا جواب جو پایا غضب ہوا　　　آئینہ چور چور کیا رشک یار نے
وعدہ خلاف تجھ کو مبارک ہو خواب ناز　　　کیفی کی نیند کھوئی ترے انتظار نے

اُستاد کی غزل سُنئے :-

اب کے نیا شگوفہ کھلایا بہار نے　　　ہم دل سی چیز لے چلے صدقے اُتار نے
پہلے یہ رنگ روپ نہ تھا یہ ادا نہ تھی　　　آئینہ کو بنا دیا تصویر یار نے
شکوہ ہے دل سے اور کا کیوں نام لیجئے　　　دھوکا دیا ہے ہم کو اسی راز دار نے
ارماں زمانہ بھر کے نکالے تو کیا کیا　　　حسرت نہ میری دل کی نکالی بہار نے

۲۸ اگست ۱۹۲۷ء کو دوسرا مشاعرہ ہوا۔ کیفی کی غزل تھی :-

جوش شباب کی ہے تڑپ حسن یار میں　　　جلوہ ہے آفتاب کا نصف النہار میں
آئیں جو جھوم جھوم کے گلشن میں بدلیاں　　　رندوں کی توبہ اُڑ گئی باد بہار میں

---

[1] ولادت۔ محرم ۱۲۶۹ھ۔ وفات ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ (مطابق ۱۸ مئی ۱۹۲۸ء)۔
وہ شیخ ظہور الدین احمد علوی المتخلص بہ ظہور شاگرد شیخ عبد الرؤف شعور کے صاحبزادے تھے۔ کچھ عرصہ تک پولس میں ملازم رہے بعد ازاں وسط ہند میں مدت تک سررشتہ دار مجسٹریٹی رہے۔ تاریخ گوئی میں ید طولے حاصل تھا۔ شعر وسخن کا ذخیرہ ایک لاکھ بیت سے زائد ہے۔ دو مرتب دیوان موجود ہیں۔ نثر بھی خوب لکھتے تھے ایک داستان "نور نگار" بطرز بوستان خیال لکھنا شروع کی تھی اور ۲۴ جلدیں تحریر فرما چکے تھے کہ پیمانۂ حیات لبریز ہوگیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

اس ضبط کا بُرا ہو کہ آہیں ہیں مضطرب نالے تڑپ رہے ہیں دلِ بیقرار میں
رکھو نہ حشر پر مرے شکووں کا فیصلہ کیا بات رہ گئی جو کھلا مُنھ ہزار میں
کیفی یہی ہے آبلہ پائی کی آرزو دو دو ہزار نوک ہوں اک ایک خار میں

اُستاد نے فرمایا:—

اس طرح گل کھلے ہیں دل داغدار میں تارے چھٹک رہے ہیں شبِ تیرہ و تار میں
زاہد کی ہم تو ایک نہ مانیں ہزار میں توبہ کسی نے کی بھی ہے فصلِ بہار میں
گردش سے تیری چشم کے حیراں ہیں مے فروش اب کوئی پوچھتا نہیں فصلِ بہار میں
یارب ہمارے دل کو بنادے سدا بہار یکساں ہرا بھرا ہو خزان و بہار میں
فتنے جو بچ رہے تھے تری چال ڈھال سے وہ آگئے ہیں گردشِ لیل و نہار میں

۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو تیسرا مشاعرہ ہوا۔ کیفی کی غزل تھی:—

خدا بچائے ہے نازک معاملہ دل کا پڑا ہے سنگدلوں سے مقابلہ دل کا
ہجومِ حسرت و حرماں ہے ساتھ لاشے کے چلا ہے شہرِ خموشاں کو قافلہ دل کا
کبھی ہے چشمِ عنایت کبھی نگاہِ عتاب بڑھا بڑھا کے گھٹاتے ہیں حوصلہ دل کا
ذرا سی پی کے بہت مستیاں ہیں کیفی کی تجھے خراب کرے گا یہ ولولہ دل کا

اُستاد نے فرمایا:—

الٰہی کس طرح چھوڑ دوں میں شکوہ جورِ قاتل کا کہے دے کر یہی اک رہ گیا ہے مشغلہ دل کا
جوانی اب کہاں ہاں کچھ کچھ اُس کے داغ باقی ہیں مہک سی رہ گئی ہے پھول تو مرجھا گیا دل کا
چھپانے سے مرے رازِ محبت چھپ نہیں سکتا لکھا ہے لوحِ پیشانی پہ گویا مدعا دل کا
الٰہی مجھ کو ناکامی سے مایوسی نہیں ہوتی تری رحمت سے اتنا بڑھ گیا ہے حوصلہ دل کا
ترے دربار میں نیّر کو رہنے کی اجازت ہو یہی ہے آرزو دل کی یہی ہے حوصلہ دل کا

اسی زمانہ میں مولانا نے ایک جدید مکان محلہ کٹھل تلہ میں خرید کیا۔ محلسرا کی مرمت کرائی۔ احاطہ میں باغ لگایا اور ۱۹۲۸ء سے وہیں سکونت اختیار کی۔ ۱۳ر اگست ۱۹۲۸ء کے خط میں منشی مقبول علی کو لکھتے ہیں:—

"دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

تمہارے محبت بھرے اندازِ تحریر نے نشتر کا کام کیا۔ پچھلا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اللہ اللہ

کیا زمانہ تھا اور کیا سچی محبتیں تھیں۔

میں جس مکان میں بیٹھا ہوا یہ تحریر لکھ رہا ہوں، وہ جدید مکان ہے جس کو تم لڑکپن میں "پھاٹک بند" کہا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۶ء تک یہ کھنڈر تھا۔ بحمد اللہ اب پر فضا مقام ہے۔ زنانہ مکان قریب قریب مکمل ہو گیا ہے۔ مردانے میں ایک خس پوش بنگلہ ہے جس کے پچھم میں پائیں باغ ہے، موقع موقع سے درخت لگے ہیں۔ مقبول کا خیال بارہا آیا اور اشتیاقِ ملاقات میں آنکھیں نم ہو گئیں پھر جی بہلا لیا۔ کل امیر موہن باد قاتھا سے کچھ تسکین ہو گئی۔ نور اللغات کی تیسری جلد چھپ رہی ہے۔ جرمنی سے نور اللغات کی کاپیاں طلب ہوئی ہیں۔ دور پہنچی ہے اپنی رسائی۔ والسلام۔ نیر

اسی سلسلہ میں مندرجہ ذیل خط بھی پڑھنا چاہیے:—

"نیر نے ایک بنگلہ مردانے مکان میں بنا لیا تھا وہ ۱۰ مارچ کی آندھی میں اڑ گیا۔ اس وقت میں مع ناصر حسن کے اسی بنگلہ میں تھا۔ خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و رحمت کا نمونہ دکھایا اور ہم دونوں کو ضرر سے محفوظ رکھا۔ الحمد للہ بارہ پختہ ستون منہدم ہو گئے۔ نور اللغات جلد سوم ہنوز دفتری کے پاس ہے۔ جزبندی نہیں ہو چکی ہے۔ جس وقت آ جائے گی تم کو بھیجوں گا انشاء اللہ۔ نور الحسن۔ ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء"

خان بہادر منشی تاج الدین جج متخلص بہ جذب شاگرد منشی محمد رضا صبر کاکوروی کے باکمال صاحبزادے منشی معراج الدین اس زمانہ میں کاکوری میں رونق افروز تھے۔ وہ حافظ جلیل حسن جلیل تلمیذ امیر مینائی کے شاگرد تھے اور خسرو تخلص کرتے تھے۔ مدت تک ریاست حیدرآباد میں مناصب اعلیٰ پر سرفراز رہے۔ "نواب حسین نواز جنگ" خطاب پایا۔ بڑے عالی ہمت، سیر چشم، طباع اور ذہین تھے۔ ملازمت سے کنارہ کش ہو کر وطن میں سکونت پذیر ہوئے۔ شعر و سخن سے موروثی ذوق موسیقی سے عشق تھا۔ حال و قال کی محفلوں میں حاضر ہوتے اور آستانہ کاظمیہ کے خدام پر جان و دل نثار کرتے تھے۔ الفت آل نبی سے سرشار تھے۔ سیکڑوں سلام اور مرثیے تصنیف کیے۔ آخری زمانہ استغراق کا ہے۔

نازِ خسرو کربت پہ ہے طاعت پہ نہیں رو ٹھا بیٹھا ہے اسے آ کے منائیں شبیر

سنہ ولادت ۹ شعبان سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۵ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء روز پنجشنبہ۔

وفات ۱۹ محرم سنہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۳ مئی سنہ ۱۹۳۵ء روز پنجشنبہ۔

عشق و محبت کی روداد نظم کرتے اور عاشقانہ غزلیں خوب کہتے تھے۔ اُن کی شرکت سے مشاعروں میں رونق ہوتی تھی اور سخن فہم کلام کی داد دیتے تھے۔ ۳۰ر دسمبر ۲۸ء کو اپنے دولتکدہ پر ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ طرح تھی ۔ گذرتی ہے شب فرقت میں کیونکر آپ کیا جانیں۔

فرماتے ہیں :-

ستم کہتے ہیں کس کو بندہ پرور آپ کیا جانیں　　بگڑ کر مجھ سے بن بیٹھے ستمگر آپ کیا جانیں
خمار آلودہ آنکھوں سے نگاہیں جو نکلتی ہیں　　پلاتی ہیں مجھے ساغر پہ ساغر آپ کیا جانیں
عجب انداز کی چھل بل ہے جو فتنے جگاتی ہے　　قیامت بن گئی شوخی سمٹ کر آپ کیا جانیں
حسیں ہیں نازنیں ہیں مہ جبیں ہیں بھولے بھالے ہیں　　لگاوٹ عشق کی اللہ اکبر آپ کیا جانیں
یہ کیا انداز ہے کس کس کی دیکھیں موت آئی ہے　　قیامت کر رہے ہیں آج تیور آپ کیا جانیں

مولوی نور الحسن بھی مشاعرے میں شریک تھے۔ اُن کی طبع آزمائی ملاحظہ کیجئے :-

کوئی شئے چھپ رہی ہے دل کے اندر آپ کیا جانیں　　یہی ہے دردِ الفت بندہ پرور آپ کیا جانیں
خدا رکھے سلامت آپ کی اس تب کبھی جیتوں کو　　بھری محفل میں دل لیتی ہے کیونکر آپ کیا جانیں
یہ عاشق دل دیا کرتے ہیں پہلے جان اس کے بعد　　ہماری مانئے ۔ ایسا ہوا کرتا ہے اکثر آپ کیا جانیں
یہ سچ ہے مرنے والے اپنی موت مرتے ہیں　　ہے کس کا نام قاتل اور ستمگر آپ کیا جانیں
یہ دل کی پھانس ہے ظالم ذرا چھیڑا تو کھٹکے گی　　نکل جائے گی آپ ہی جان لے کر آپ کیا جانیں

اس مشاعرے سے چار روز پہلے انجمن اخوان الصفا کاکوری نے ایک بزم شعرا منعقد کی تھی اور اس کے لئے بھی استاد نے غزل لکھی تھی ۔ چند اشعار اُس کے بھی سُنئے :-

جذبِ الفت کھینچ کر کوچے میں تیرے لے گیا　　تھی مقدر اس بہانے سے قضا میرے لئے
توبہ توبہ میں بھی کچھ تھا لیکن اب تو کچھ نہیں　　ہو گئی کیا قہر دنیا کی ہوا میرے لئے
پھرتے ہی تیری نگہ کے اک زمانہ پھر گیا　　ایک سے ہیں بے وفا اور باوفا میرے لئے
پہلے اے زاہد تو اُس کا فرِ صنم سے دل لگا　　پھر ذرا تجویز کر یاد خدا میرے لئے
رفتہ رفتہ آرزوئیں ساتھ سے رخصت ہوئیں　　رہ گیا باقی دلِ بے مدعا میرے لئے

خسرو بھی شریک محفل تھے ۔ ارشاد فرمایا تھا :-

دل کش آئینہ اپنی طبع موزوں ہو گئی　　جام جم ہے ۔ بزم اخوان الصفا میرے لئے

منشی اعجاز حسین اعجاز کاکوروی کا اسم گرامی پچھلے اوراق میں کسی جگہ آچکا ہے وہ مدت

ترک وطن کئے ہوئے ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے۔ پچیس برس کی مفقود الخبری کے بعد گھر یاد آیا اور ۱۹۲۷ء میں ایک مثنوی "یادِ وطن" نام تصنیف کرکے مولوی نورالحسن کی خدمت میں اسقام واغلاط دور کرنے کے لئے روانہ کی۔ استاد نے شرف اصلاح سے مزین فرمایا۔ دو شعر راقم کو یاد ہیں:-

ٹھوکریں کھاؤں پر وطن میں رہوں کانٹے چنتا ہوا چمن میں رہوں
ان بزرگوں سا رنگ روپ نہیں اب وہ سورج نہیں وہ دھوپ نہیں

مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں کاکوری تشریف لائے۔ اُن کی دلچسپی کے لئے بزم مشاعرہ منعقد کی گئی۔ طرح تھی "یہ نازک وقت ہے تم بال بکھرائے کہاں آئے"۔

منشی احتشام علی صاحب کی عالی شان کوٹھی میں محفل تھی۔ رؤسائے قصبہ موجود تھے۔ منشی صاحب نے پہلے ایک غیر طرح غزل ہم وطنوں کو سنائی اور در و دیوار سے آفریں و مرحبا کی صدائے بازگشت سنی چند اشعار اس غزل کے نقل کئے جاتے ہیں:-

نہال سبز ہوں پر زینت صحرائے غربت ہوں نہ پہونچے جو گلستاں تک میں ایسے گل کی نگہت ہوں
ہے دل افسردہ میرا گو شریک بزم عشرت ہوں ہنسی رونے سے بدتر ہے کہ میں غنچوں کی صورت ہوں
زرا یوسف کی میرے مجھ کو بوئے پیرہن لادے مثال پیر کنعاں اے صبا مشتاق عترت ہوں
قفس کی تیلیاں مانع نہیں میری رہائی میں کہ میں پرواز میں بیمار کے چہرے کی رنگت ہوں
نہ کیوں ہر اک نفس ہو رشک عیسے نام ہے میرا کہ میں اعجاز ہوں اُن کی مسیحائی کی زینت ہوں

اس کے بعد طرح کی غزل پڑھی جس کو استاد کی اصلاح کا شرف حاصل تھا:-

مقید جسم کی صورت میں ہو کر مثل جاں آئے تعجب اپنی ہستی پر ہے ہم کو ہم کہاں آئے
جسے کہتے ہیں دنیا اصل میں کلفت کی بستی ہے ملا کب چین اُن کو جو کہ زیر آسماں آئے
مبارک شیخ صاحب تم کو کعبہ کیوں بگڑتے ہو سمجھ کر بتکدہ آوارۂ کوئے بتاں آئے
کہیں کیا کس طرح سے خانہ ویراں چمن سے پلٹے برنگ بوئے گل نکلے تھے اور مثل خزاں آئے
گراں اعجاز کا شیون نہ کیوں ہو ہم صفیروں کو نہ اس کا سا بیاں آئے نہ اس کی سی زباں آئے

مولوی نورالحسن نے سخنوروں کی محفل میں حسب ذیل غزل سنائی اور اپنی قادرالکلامی کا سکہ بٹھایا:-

اُڑاتے دھجیاں آئے، رگڑتے ایڑیاں آئے بڑے نام و نشاں سے جان دینے نیم جاں آئے

تری سرکار میں ہم چھوڑ کر دونوں جہاں آئے
مکاں سے جب ہوا ترک تعلق لامکاں آئے

جوانی تک امنگیں ہیں ترنگیں ہیں بہاریں ہیں
گھڑی ساعت کو رخصت ہونے سارے میہماں آئے

یہ گردش ہے مقدر کی یہ چکر ہے نصیبے کا
خدا جانے کہاں ہم جانے والے تھے کہاں آئے

عجب وارفتگی ہے جب سے اپنا خانماں چھوٹا
ہمیں کیا گر چمن میں اب بہار آئے خزاں آئے

کسی جلوے کا شرمندہ ہمارا راز ہستی ہے
بس اتنا بھی نہیں سمجھے بڑے تم رازداں آئے

نہ اتراؤ یہ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے نیرؔ
خدا معلوم ہرجائی کہاں جائے کہاں آئے

نور اللغات کی تکمیل

نور اللغات کی تیسری جلد جون ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں حرف دال سے قاف تک الفاظ و محاورات تھے۔ تحقیق و تدقیق کا یہاں بھی وہی حال تھا جس کا تذکرہ ابتدائی دو جلدوں کے ریویو میں کیا جا چکا ہے۔ جانشین امیر مینائی حافظ جلیل حسن جلیل نے ایک منظوم تقریظ لکھی جس کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

نیرؔ کا لغت ہے کانِ اردو
معیارِ زبانِ اردو

کیا نور فشاں ہے چشم بد دور
آنکھیں جسے دیکھ کر ہوں پُر نور

ہر لفظ کی ہر لغت کی تحقیق
ہر قول کی ہر مثل کی توثیق

نکلے ہیں جو اس کے تین حصے
سہ پارے ہیں وہ کتاب دل کے

تکمیل ہو اس کی جب مزا ہے
ہمت ہے اگر تو بات کیا ہے

اب سُنئے جلیل طبع کا سال
اوصاف کتاب پر جو ہے دال

تاریخ یگانہ ہے تو یہ ہے
اردو کا خزانہ ہے تو یہ ہے

اس جلد کی اشاعت کے بعد مولوی حامد حسن نیر پریس کی منیجری سے دستکش ہو کر تلاش ملازمت میں اورنگ آباد چلے گئے اور مطبع بند کر دیا گیا۔ لغت کی چوتھی جلد طباعت کے لئے "اشاعت العلوم فرنگی محل" کے سپرد کی گئی اور جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ مولانا نے پندرہ برس پہلے جس عظیم الشان خدمت کا بیڑہ اٹھایا تھا اور جس کا سرانجام تجربہ کار واقفان فن اس وقت محال بتاتے تھے ان کی ہمت و استقلال سے بحسن و خوبی تکمیل کو پہنچی۔ ابتدا میں وکالت کی فتنہ کاریاں اور بعد ازاں اسسٹنٹ کلکٹری کی ذمہ داریاں سد راہ ہوئیں۔ خانگی فکروں۔ ناگہانی آفتوں۔ مالی مشکلوں نے کانٹوں میں الجھایا۔ صحت جسمانی بگڑی۔ اعضائے رئیسہ نے جواب دیا لیکن مولانا کی عالی ہمتی۔ جفاکشی اور استواری عزم کے سامنے ہر مشکل آسان۔ ہر آفت عافیت ہر زحمت رحمت تھی۔

جو خدمت ایک انجمن ایک جماعت کے لئے دشوار ہوتی وہ انھوں نے تنہا بے امداد غیرے انجام دی۔ کانٹے ہٹا کر مقصد کے پھول چنے۔ بالو کے ٹیلے سے آب شیریں کا چشمہ نکالا اور اُردو کا وہ جامع لغت مرتب کر دیا جس کی تہذیب و تکمیل کا ارمان اساتذہ سابقین پورا نہ کر پائے تھے اور حسرت کا داغ دل میں لے کر ہمانسرا سے دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

نفائس اللغات اور خزینۃ اللغات کے مختصر و ناکافی ہونے کا تذکرہ اس مضمون کے ابتدائی اوراق میں آچکا ہے۔ رشک لکھنوی کا لغت تقویم پارینہ تھا۔ البتہ انگریزی میں ایک ڈکشنری اُردو الفاظ کی موجود تھی جس کو فیلن صاحب نے ۱۸۷۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں صرف الفاظ مع مختصر معانی کے تھے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے ایک لغت "ارمغان دہلی" کے نام سے شروع کیا تھا جو ۱۹۰۸ء میں "فرہنگ آصفیہ" کے نام سے مکمل ہوا۔ اس میں علاوہ الفاظ کے بعض محاورات بھی تھے۔ امیر مینائی اور جلال لکھنوی نے تدوین لغت کی کوشش کی مگر پایہ تکمیل کو نہ پہونچا سکے۔ لہٰذا "امیر اللغات" اور "سرمایۂ تحقیق" کا ذکر فضول ہے۔ ان کے بعد نور اللغات ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوا۔ اس میں الفاظ و محاورات مع اسناد و پہلوے استعمال کے درج تھے۔ اس لازوال خزانۂ زبان کو پیش نظر رکھ کر خواجہ عبدالمجید بی۔ اے نے جامع اللغات لاہور سے شائع کیا اور ۱۹۳۵ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس میں محاورات تقریباً وہی تھے جو نور اللغات میں درج ہو چکے تھے مگر الفاظ کا گنجینہ بہت زائد تھا اور اسناد حذف کر دیے گئے تھے۔

اس فرق مراتب کو ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک لفظ پر اکتفا کی جاتی ہے دیکھئے:-

(۱) فیلن کی ڈکشنری

ارغواں۔ فارسی۔ اسم مذکر۔ ایک باجا۔

(۲) فرہنگ آصفیہ

ارغوان۔ یونانی۔ اسم مذکر۔ ارگن۔ ارغن۔ ایک قسم کا باجہ ہے جو افلاطون نے ایجاد کیا تھا۔
ارغوانی۔ فارسی۔ صفت۔ کسُم کا رنگ۔ لال۔ چہچہاتا۔ نہایت سُرخ۔ نارنجی رنگ کو بھی کہتے ہیں۔

(۳) نور اللغات

ارغنوں۔ (فارسی۔ بالفتح اور فتح سوم) مذکر۔ نام ایک باجے کا جس کا موجد افلاطون ہے۔ (آتش)

مجھ صوفی کے ہر نعرے سے حال اُس کو آگیا مطرب نے ٹکڑے سر سے مرے ارغنوں کیا

ارغوان۔ (فارسی۔ بر وزن پہلوان) مذکر۔ ایک درخت کا نام جس کی ٹہنیاں باریک ہوتی ہیں۔

اور موسم بہار میں پھولوں سے سُرخ ہوجاتا ہے۔ سُرخ رنگ کا پھول۔ مجازاً سُرخ رنگ (مصحفی)
کیوں ہوا منھدی نہ میں بوسے جو لیتا پاؤں کے ارغواں برسوں اسی حسرت سے خوں رو یا کیا
ارغوانی۔ (فارسی) سُرخ پھول۔ سُرخ رنگ۔ سُرخ۔

(۴) جامع اللغات

ارغنون۔ (فارسی۔ مذکر) ایک باجے کا نام جو کوک دینے سے بجتا ہے۔ خیال ہے کہ اسے افلاطون نے ایجاد کیا تھا۔

ارغوان۔ (فارسی۔ مذکر) ایک پودا جس کے پھل اور پھول نہایت سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ ۲۔ اس پودے کا سُرخ رنگ کا پھول۔ ۳۔ سُرخ رنگ۔

ارغوانی۔ (صفت) سُرخ۔ قرمزی۔

نور اللغات کی تفصیل و تحقیق یقیناً فیلن کی ڈکشنری اور فرہنگ آصفیہ سے زیادہ ہے۔ جامع اللغات توضیح معانی کے اعتبار سے نور اللغات کا خلاصہ ہے لیکن اسناد کے حذف نے اہل زبان کے لئے اس کو ناکافی بنا دیا۔ ارغنون اور ارغوان کے مذکر ہونے کا ثبوت نور اللغات میں موجود ہے لیکن جامع اللغات میں نہیں ہے۔ تاریخی اور جغرافیائی واقفیت کے لئے جامع اللغات بیشک مفید ہے لیکن کسی محاورے کی بحث ہو یا سند مانگی جائے تو جامع اللغات بالکل بیکار ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مجلس میں دو طالب علم یہ بحث کر رہے تھے کہ تکان اور تھکن میں کیا فرق ہے اور تکان مذکر ہے یا مونث۔ پہلے جامع اللغات میں تکان کا لفظ تلاش کیا گیا۔

تُکان۔ (فارسی مونث) حرکت۔ جنبش۔ ۲۔ اشارہ۔ جھٹکا۔
(ہندی مونث) تھکان کا مخفف۔ تھکاوٹ۔ کسلمندی۔ ہچکولوں کی وجہ سے تھکاوٹ سُستی۔ کاہلی۔"

اُس کے بعد تھکن تلاش کیا گیا تو اس کی بابت درج تھا" (مونث) تکن۔ ماندگی۔ کوفتگی۔ تکان"
اور ایک جگہ لفظ تھکان بھی لکھا تھا جس کے معنی تھے" تھکن۔ تکان۔ ماندگی"

اب طالب علم کے لئے کئی سوالات پیدا ہو گئے۔

اول۔ تکان کے مونث ہونے کا کیا ثبوت ؟
دوسرے۔ لفظ تھکن فصیح ہے یا تھکان یا تکن ؟

تیسرے۔ تکان اور تھکن کے محل استعمال میں کیا فرق ہے ؟
مجبوراً نور اللغات کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور وہاں ہر سوال کا جواب مل گیا۔ ملاحظہ ہو
تکان۔ (فارسی۔ ماندگی۔ تکاندن تکانیدن کا حاصل مصدر۔ لپیٹنا جیسے توشک بتکاں۔ توشک لپیٹ دو۔ ۲۔ جھٹکنا۔ گرد سے صاف کرنا)
مونث۔ ایکسلمندی۔ تھکاوٹ۔ اعضاشکنی۔ سستی۔ کاہلی۔ ہچکولوں کا صدمہ (جان صاحب)

اب نہ ہیلی پہ میں چڑھوں گی کبھی   کیا کہوں کس قدر تکان ہوئی

۲۔ برچھی یا نیزے کو جھٹکا دینا۔ (انیس)

جب یہ للکار کے نیزوں کو تکاں دیتے تھے   آہنی ڈھالوں میں سینے وہ چھپا لیتے تھے

تکان تھکن کا فرق۔ تکان وہ خستگی جو کسی متحرک چیز کی حرکت سے بدن میں پیدا ہو۔ یعنے اگر مرکب کی حرکت سے خستگی ہو تو تکان ہے اور اگر صرف سفر کی وجہ سے ہو تو تھکن ہے۔
نور اللغات میں تھکان یا تکن کوئی لفظ نہیں کیونکہ اہل زبان اس اصطلاح سے ناآشنا ہیں البتہ تھکن درج ہے اور اُس کے معانی لکھے ہیں " (مونث) ماندگی۔ کوفتگی۔ (منیر)

دن بھی ہے گرم دھوپ بھی ہے کڑی   راہ چلنے کی بھی تھکن ہے بڑی

اسی طرح ایک بار شک پیدا ہوا کہ " عرض " بہ معنی درخواست والتماس مذکر ہے یا مونث جامع اللغات نے مونث لکھا ہے لیکن کوئی سند نہیں درج کی۔ نور اللغات میں ہے
"مونث۔ درخواست۔ بیان۔ التماس (کرنا کے ساتھ) اس کے مفعول کے ساتھ " سے " مستعمل ہے۔ فقرہ۔ زید نے بکر سے عرض کی۔ (انیس)

اک دن رسول حق سے کسی نے یہ عرض کی   ارشاد آپ کیجئے کچھ رتبۂ علی

منیر نے مذکر بھی کہا ہے ؎

ملبوس خلاف وضع کے شکوہ میں   کچھ عرض کیا تو پائنچے تنگ ہوئے

ایک دیوبند کے تعلیم یافتہ نیم ملا نے راقم سے سوال کیا کہ " دودھ پینا " فصیح ہے یا " دودھ کھانا " جامع اللغات کی ورق گردانی کی۔ اُس میں " دودھ کھانا " کوئی محاورہ نہ ملا " دودھ پینا " کی بابت درج تھا " (لازم) دودھ نوش کرنا۔ ۲۔ بچے کا دودھ چوسنا "
نور اللغات سے استفادہ کیا تو جواب مل گیا۔
" دودھ پینا۔ شیر نوشیدن کا ترجمہ۔ (آتش)

ساقی معاذ اللہ رکھ مجھے ساغر کشی سے تو　　　مے کیا ہے وہ دودھ جو پی کر اُبل چلے

۲۔ بچے کا دودھ پینا (جانصاحب)

ہو گیا شیطان ہے مردود پی کے میرا دودھ　　　اور اتنا ہیں ہو میرے دودھ کی تاثیر نوج

ایسے محل پر جہاں معنی نمبر ۲ کا پہلو قابل مضحکہ ہو دودھ پینا کی جگہ "دودھ کھانا" "دودھ استعمال کرنا" بول چال میں فصیح ہے۔ جہاں ذم کا پہلو نہ ہو وہاں "دودھ پینا" ہی فصیح ہے۔

مثالیں کہاں تک نقل کی جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ جامع اللغات باوجود نقش ثانی ہونے کے محقق زبان کے لئے بیکار ہے اور اردو الفاظ و محاورات کا مکمل اور جامع لغت ہنوز سوائے نور اللغات کے موجود نہیں ہے۔

نسب نامۂ مخدوم زادگان کاکوری موسوم بہ "نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد عبدالکریمؒ" کے مولف نے لکھا ہے کہ "جب تک اُردو زبان کے بولنے اور سمجھنے والے گلشن ہند میں برقرار رہیں گے اس سدا بہار شاہکار پر تعریف و توصیف کے گلدستے ملک کے ہر گوشے سے نثار ہوں گے۔ خدا اس مولف کی دعا قبول کرے کہ "جب تک عطارد فلک کا میر منشی اور قمر نظام شمسی کا دستور اعظم ہے۔ نیر کا یہ دفتر تحقیق و تدقیق منازل اُردو کے رہ نوردوں کو شاہراہ فصاحت کی رہبری کرتا رہے اور اُن کے اسم گرامی کو حیات جاوید کے خلعت اور بقائے دوام کے تاج سے ملبوس و مزین رکھے"

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم　　　شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

قند پارسی

(جناب مولانا خیر الدین صاحب خیر)

لب خاموش تو خنجر چہ خنجر خنجر بُرّاں　　　نگاہِ سرمگیں قاتل چہ قاتل قاتلِ دوراں
حدیثِ دل نمی دانم مگر دانم چنیں قصہ　　　چہ قصہ قصۂ غنچہ چہ غنچہ غنچۂ خنداں
بہ طوفانِ حوادث عزم شد ایں ہمنوا کشتی　　　چہ کشتی کشتیٔ حسرت چہ حسرت حسرتِ پنہاں
نقابِ رُخ کشید واز دلم پرسید آں دلبر　　　چہ دیدی جلوۂ حُسنے چہ جلوہ جلوۂ یزداں
دلِ عالم کہ آں کافر مسخر کرد از جادو　　　چہ جادو جادوئے عشوہ چہ عشوہ عشوۂ مژگاں
سیاہ من سفید آخر بہ محشر گشت از قطرہ　　　چہ قطرہ قطرۂ رحمت چہ رحمت رحمتِ یزداں
امامِ میکدہ صد رشکِ جنت کرد از مستی　　　بہ دورِ جامِ مے محفل چہ محفل محفلِ مستاں
من بیچارہ می سوزم چو خیر از آتشِ سوزاں　　　چہ آتش آتشِ فرقت چہ فرقت فرقتِ یاراں

ہندوستانی صنعت کاغذسازی

(جناب مولوی محمد احمد صاحب سبزواری بی۔اے جامعہ عثمانیہ)

ہندوستان رقبہ کے لحاظ سے ایک نیم براعظم ہے جہاں مختلف قسم کے موسم، آب و ہوا، اور دوسری قدرتی خصوصیات موجود ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ خاص خاص چیزیں جو بڑی حد تک قدرتی ماحول کا نتیجہ ہوتی ہیں ان کے لیے یہاں ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔ ہندوستان کی صنعتوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حصہ میں وہ صنعتیں ہیں جن کو گھریلو یا مقامی صنعتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کام چھوٹے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ تھوڑے سے سرمایہ سے کام چل جاتا ہے اور اس وجہ سے ایسے کاروبار میں یا تو ذاتی سرمایہ لگا ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ دو چار ساجھی ہو جاتے ہیں۔ کاروبار چلانے کے لیے کسی اعلےٰ قابلیت یا عمدہ تنظیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ کاروبار کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس قسم کے مواقع پیش ہی نہیں آتے۔ صناع گھر والے ہی ہوتے ہیں اور اگر ضرورت ہوتی ہے تو چند مزدوروں کو نوکر رکھ لیا جاتا ہے۔ چونکہ ان مصنوعات کی طلب مقامی ہوتی ہے اس وجہ سے نہ تو ان کی طلب میں زیادہ تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ فیشن کی تبدیلی یا بیرونی مال کے مقابلہ کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری صنعتیں ہیں جن میں کاروبار بہت بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ مشینی، دخانی، آبی یا برقی طاقتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مال کثیر تعداد میں تیار کیا جاتا ہے۔ کارخانوں میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔ اور کاروبار کے لئے لاکھوں کا سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ اب یا تو کاروبار کرنے والے کے پاس اتنی کثیر رقم ہوتی ہی نہیں یا اگر ہو بھی تو وہ اس کو ایک نئے کام میں لگا کے خطرات برداشت نہیں کرنا چاہتا اس وجہ سے سرمایہ چھوٹی چھوٹی تعدادوں میں ادھر ادھر سے جمع کیا جاتا ہے۔ تیار شدہ مال نہ صرف ملک کے بڑے بازاروں میں بلکہ بعض اوقات بیرون ممالک کے بازاروں تک جاتا ہے۔ اور وہاں اس کو دوسرے ملکوں کے مال سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کاروبار کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جائے گا اتنی ہی اس کی نگرانی اور انتظام مشکل ہوتا جائے گا۔ اس وجہ سے ایسے کارخانوں کے نگراں اعلےٰ صلاحیتوں کے حامل ہی رکھے جاتے ہیں۔ اس قسم کی صنعتوں کو تنظیم شدہ صنعتیں کہا جاتا ہے۔ جن کی ہندوستان میں بہت کمی ہے۔ اور جو تھوڑی بہت موجود ہیں ان میں نمایاں سوتی پارچہ بافی، جوٹ، چرم سازی، شکر سازی، شیشہ سازی،

کاغذسازی، سیمنٹ سازی اور لوہے و فولاد کی صنعتیں ہیں۔ آج ان ہی میں کی ایک صنعت یعنی ہندوستان میں کاغذ کی صنعت کا مختصر حال پیش کیا جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ انسانی ترقی میں کاغذ کا بھی بہت بڑا حصہ رہا ہے تو غالبًا کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ فنون لطیفہ، ادب و فنون، سائنس، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، سیاست سب میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے گا۔ زندگی کا کونسا ایسا شعبہ ہے جہاں کاغذ کی ضرورت ناگزیر نہ ہو۔ خواہ دنیا ہولناک بین الاقوامی جنگوں میں پھنسی ہوئی اور ایک قوم دوسرے کو نگلنے کی فکر میں ہو یا عالم میں صلح و آشتی کا ڈنکا بج رہا ہو۔ بہر حال دونوں صورتوں میں کاغذ سے مفر نہیں۔ اور اس کا تعین دشوار ہے کہ کس زمانہ میں کاغذ کی ضرورت زیادہ ہوگی۔ اس لئے اس قسم کی ضروری اور مفید صنعت کو ملک میں ترقی دینے کی کوشش کرنا یقینًا ملک کی مرفع الحالی اور تمدنی احتیاجات کے لیے اشد ضروری ہے۔ اس مضمون میں اس امر پر روشنی ڈالی جائے گی کہ اس صنعت کی جدید طریقے پر ابتدا کب ہوئی اور موجودہ دور میں اس کا کیا حال ہے اور آئندہ ترقی کے کیا امکانات ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلا کارخانہ تجارتی اصولوں پر ۱۸۶۷ء میں "بالی ملس" کے نام سے بمقام ہگلی قائم کیا گیا۔ اس مقام کے گرد و نواح آج بھی اس صنعت کے خاص مرکز ہیں۔ کارخانہ میں اُس وقت پُرانے چیتھڑے اور بوری استعمال ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس وقت کاغذ بنانے کے لئے ان دونوں چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز کا علم ہی نہ تھا۔ کارخانہ میں مال بہت کم تیار ہوتا تھا اور اس کی طلب بہت زیادہ تھی۔ تقریبًا ۱۵ سال تک یہ کارخانہ تنہا ملک کی مانگ کے کچھ حصہ کو پورا کرتا رہا۔ اسی زمانہ میں تھامس روٹ لیج نے جو برطانیہ کا کاغذ بنانے والا تھا۔ کاغذسازی کی اشیا کے متعلق تحقیقات کی۔ اس نے بانس، گھاس اور بعض دوسری اشیا پر تجربات کیے۔ اور اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کامیابی نے ہندوستانیوں کی توجہ بھی بانس اور ریشہ دار پودوں مثلاً موُنج یا سبائی گھاس کے استعمال کی طرف منعطف کرائی۔ ۱۸۸۳ء میں لارڈ ڈفرن نے جو اس وقت وائسرائے تھے ملکی صنعت کو فروغ دینے کے لیے اس امر کا اعلان کیا کہ سرکاری ذخائر ملک کی تیار شدہ مصنوعات خریدا کریں۔ اس نئے اعلان سے اور یورپ اور امریکہ میں کاغذ کی قیمتیں گراں ہوجانے کی وجہ سے ہندوستان میں اس صنعت کو بڑی مدد ملی۔ اور لوگوں کو نئے نئے کارخانے کھولنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ میں اور ۱۸۸۲ء میں ٹیٹاگڑھ میں کاغذسازی کے کارخانے قائم ہوئے۔

اس کے بعد ہی تھوڑے عرصہ میں گوالیار، پونا، ٹراونکور، رانی گنج اور کن کی نارا میں کارخانے کھل گئے اور انیسویں صدی کے اختتام تک ان تمام کارخانوں سے انیس ہزار ٹن سالانہ کاغذ تیار ہونے لگا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ میں لکڑی کے گودے سے کاغذ سازی شروع ہوئی اور کثرت سے گودے کا کاغذ تیار ہونے لگا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاغذ کی قیمت گرنا شروع ہوئی۔ اور ہندوستان میں یہ سستا کاغذ بڑی مقدار میں درآمد ہونے لگا۔ چونکہ اس زمانہ میں تاوین نہ تھی اس وجہ سے ہندوستان کو اس سستے کاغذ سے مقابلہ کرنے میں بڑی دقت ہوئی اور مصارف پیدائش نکالنے بھی دشوار ہوگئے۔ مختلف کارخانے بند ہونے لگے چنانچہ ۱۹۰۵ء میں ٹیٹاگڑھ کا کارخانہ "امپیریل پیپرمل" میں شامل ہوا جس کی بنیاد ۱۸۹۲ء میں کن کی نارا کے مقام پر پڑی تھی ۱۹۰۵ء میں "بالی مل" کا دیوالہ نکل گیا۔ بہرحال اب اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ارزاں کاغذ تیار کرنے کے لئے کسی نئی چیز کی دریافت کی جائے۔

۱۹۱۰ء میں دہرہ دون کے "فارسٹ ریسرچ انسٹیٹوٹ" نے جنگل کی پیداواروں پر مختلف تجربات شروع کیے۔ اس سلسلہ میں کاغذسازی کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ ابتدا میں کاغذ سازی کے تجربات صابی گھاس پر ہوئے مگر بہت جلد اس حقیقت کا انکشاف ہوگیا کہ محض اس گھاس کی بدولت یہ صنعت ترقی نہیں کرسکتی۔ بہرحال مختلف قسم کی کوششوں اور تجربوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہندوستان میں کاغذ سازی کے لئے بانس سے عمدہ کوئی چیز ملنا دشوار ہے۔ کیونکہ اول تو ہندوستان اور برما میں بانس کی بڑی کثرت ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کے جنگلات سے اتنا بانس کا گودا حاصل ہوسکتا ہے جو ساری دنیا کی کاغذ سازی کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔ تجربہ گاہ میں مختلف تجربوں کے ذریعہ سے معلوم کرلیا گیا کہ بانس کا گودا بہت آسانی سے اور کم مصارف سے حاصل ہوسکتا ہے۔

یہ تجربات ابھی "تجرباتی اداروں" سے باہر نہ نکلے تھے کہ جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ اور اس نے ابتدا میں صنعت کی ترقی میں بڑی دشواریاں پیدا کردیں اور کاغذسازی کی تنظیم کے متعلق جو اسکیم کہ پیش نظر تھیں ان کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر جب جنگ طویل ہوگئی اور بیرونی ممالک کی مصنوعات کی درآمد میں کمی ہونے لگی تو یہاں کی مصنوعات کو پنپنے کا موقع ملا۔ چنانچہ کاغذ سازی کی صنعت میں بھی دوبارہ روح پیدا ہوئی۔ اور ۱۹۱۸ء میں "انڈین پیپر کمپنی لمیٹڈ" بمقام ہگلی قائم ہوئی اور اس نے بانس کے گودے سے کاغذ تیار کرنا شروع کیا۔ اس کمپنی کا

کام ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا اور اس نے اپنے مصالحوں میں ایک نئے مصالحہ سلفیٹ ایسڈ کا اضافہ کیا جس کی وجہ سے عمدہ کاغذ تیار کرنے میں بڑی مدد ملنے لگی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد حکومت نے فارسٹ ریسرچ کے لئے ایک مکمل اسکیم منظور کی۔ اور اس اسکیم کے تحت کاغذ سازی کے تجربات کے لئے ایک الگ شاخ قائم کی گئی۔ اور اس میں بانس کے گودے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس شاخ نے ۱۹۲۳ء میں اپنا کام شروع کیا اور ایک ہی سال بعد اپنے تجربات کو رپورٹ کی صورت میں پیش کیا۔ رپورٹ میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ ہندوستان میں بانس کے گودے سے کاغذ بنانے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

اس زمانہ میں بیرونی ملکوں کے کاغذ کی درآمد زیادہ بڑھ گئی۔ اور ہندوستانی صنعت کو اس سے مقابلہ کرنا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ ابھی یہ صنعت اپنے پاؤں پر بھی کھڑی نہ ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف یورپ اور امریکہ میں دوران جنگ اور جنگ کے بعد اس صنعت میں بہت زیادہ ترقی ہو گئی تھی اور وہ کاغذ کی بڑی سے بڑی مانگ کو پورا کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ ان کارخانوں نے بڑی تیزی سے کثیر مقدار میں مال تیار کرنا شروع کیا۔ مگر جیسا کہ خیال تھا کہ جنگ کے بعد ہر صنعت کی طلب میں اضافہ ہوگا ایسا نہیں ہوا بلکہ طلب گھٹ گئی۔ کیونکہ جنگ کی وجہ سے نہ صرف حکومتیں بلکہ کروروں افراد بھی مفلس ہو چکے تھے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کارخانوں میں جو مال ضرورت سے زیادہ تیار ہو چکا تھا اس کی نکاسی کا راستہ تلاش کیا جانے لگا۔ اور اُس کو ہندوستان سے اچھا اور کونسا بازار مل سکتا تھا چنانچہ اس مال کی ہندوستان میں "بھرمار" ہونے لگی اور "نہ ملنے سے کچھ ملنا بہتر ہے" والے اصول پر عمل شروع کیا گیا۔ اس وقت یہ خیال نہیں کیا گیا کہ قیمت کم ہے یا مصارف مکمل رہے ہیں۔ بلکہ کوشش یہ شروع کی گئی کہ جس طرح ہو سکے ادنیٰ سے ادنیٰ قیمتوں پر مال نکال دیا جائے۔ ظاہر تھا کہ غریب ہندوستان میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ان شرائط پر بیرونی مال کا مقابلہ کر سکے۔ صورت حال اس قدر نازک ہو گئی کہ حکومت کو اس صنعت کو تامین دینے کے لئے ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کرنا پڑا۔ اس بورڈ نے تحقیقات کی اور اپنی رپورٹ شائع کی۔ اسی بنا پر ۱۹۲۵ء میں مجلس وضع قوانین میں ایک مسودہ پیش ہوا اور "پیپر انڈسٹری پراٹکشن ایکٹ" کی صورت میں اس کا نفاذ ہوا۔ اس قانون کی رو سے مختلف قسم کے کاغذوں کو ۷ سال کے لئے تامین ملی۔ بورڈ نے اپنی تحقیقات میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ ہندوستان میں یہ صنعت بہت اچھی طرح فروغ حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ اس کو بیرونی مقابلہ کے غیر مساوی حالات سے بچایا جائے۔

بورڈ نے سفارش کی تھی کہ کاغذ پر ارنی پونڈ تامین محصول لگایا جائے۔ اور "انڈین پیپر پلپ کمپنی" کو ۱۰ لاکھ روپیہ بطور قرض دیے جائیں تاکہ کمپنی مذکور نئے پودوں اور سلفیٹ ایسڈ پر تجربے کر کے ارزاں کاغذ تیار کر سکے۔ مابی گھاس سے کاغذ بنانے کے سلسلہ میں بورڈ نے کسی قسم کی تامین کی سفارش نہ کی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس گھاس کی وجہ سے یہ صنعت ترقی نہیں کر سکتی۔ حکومت نے بورڈ کی بعض سفارشات پر عمل کیا مثلاً کاغذ پر ارنی پونڈ تامین محصول عائد کر دیا مگر حکومت نے کسی کارخانہ کو مالی مشکلات کی وجہ سے قرض دینے سے انکار کر دیا۔

دوران تامین میں مختلف کاغذ سازی کے کارخانوں، اور دہرہ دون کی کاغذ سازی والی شاخ نے اپنی کوششیں برابر جاری رکھیں۔ مختلف جنگلات کا مطالعہ کیا گیا اور سات قسم کے عمدہ بانس تلاش کر کے ان پر مزید تجربات کیے گئے۔ جن میں بڑی کامیابی ہوئی۔ اور اس زمانہ میں کاغذ سازی کے نئے کارخانے کھلنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں راج مندری میں "کرناٹک پیپر ملس" کی بنیاد پڑی۔ جس نے دھان، بھوسہ اور بانس سے کاغذ تیار کرنا شروع کیا۔ پنجاب میں "پنجاب پیپر ملس" قائم ہوئیں اور اس نے اپنا کارخانہ سہارنپور کے قریب قائم کیا۔ یہ "بھابر" گھاس سے کاغذ تیار کرتا تھا۔ جو پنجاب میں بڑی کثرت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک کارخانہ آسام میں اور دوسرا ٹیٹاگڑھ میں کھلا۔ اب ہندوستان میں کاغذ سازی کے کارخانوں کی تعداد ۱۲ ہو گئی تھی اور آخرالذکر تین کو نکال کر بقیہ ۹ کارخانوں سے ۴۳۰۰۰ ٹن کاغذ تیار ہوا اور سب کارخانوں کی پیداوار ملانے سے یہ تعداد ۴۳۰۰۰ ٹن سے زائد تک ہو گئی۔

تامینی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں ختم ہو جانے والی تھی۔ اس لئے ۱۹۳۱ء میں یہ مسئلہ "ٹیرف بورڈ" کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ معلوم کرے کہ اس صنعت کا دوران تامین میں کیا حال رہا اور آئندہ اس کو کب تک اور کس مقدار میں تامین دی جائے۔ بورڈ نے صنعت کی تحقیقات کی اور معلوم ہوا کہ اس وقت ہندوستان میں سالانہ چالیس ہزار ٹن کاغذ تیار ہونے لگا ہے۔ اور بانس کا کاغذ دوسری چیزوں کے تیار شدہ کاغذ کے مقابلہ میں بڑھ رہا ہے مثلاً ۲۶-۱۹۲۵ء میں بانس سے تیار شدہ کاغذ کی مقدار ۴ ہزار ٹن تھی مگر ۱۹۳۱ء میں اس کی تعداد ۱۲ ہزار ٹن کے قریب ہو گئی۔ اگرچہ ترقی کی رفتار اس قدر تیز نہ رہی جتنا کہ اس کو رہنا چاہیئے تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگل سے بانس لانے اس کا گودا حاصل کرنے، اور پھر اس گودے میں دوسرے مصالحہ ملا کر اس کا کاغذ تیار کرنے میں مہارت اور مشق کی ضرورت تھی اور ہندوستان میں اب تک با مہارت مزدوروں کی کمی تھی۔ بورڈ نے نہ صرف

تامین کو مزید سات سال تک جاری رکھنے کی سفارش کی بلکہ لکڑی کے گودے کی برآمد پر بھی محصول لگانے کی سفارش کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گودے کی برآمد میں کمی ہو جائے گی اور اندرون ملک اس کا استعمال بڑھ سکے گا۔

حکومت نے بورڈ کی ان سفارشات کو منظور کرلیا اور ۳۲-۱۹۳۱ء میں انھوں نے قانونی صورت اختیار کرلی۔ اس نئی تامین سے ہندوستان میں بانس سے کاغذ سازی میں بڑی مدد ملی۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں ۳۲ ہزار ٹن کاغذ بانس سے تیار کیا گیا۔ اور خیال ہے کہ دو سال کے عرصہ میں یہ مقدار دوگنی ہو جائے گی۔ اس وقت ہندوستان میں جتنا بانس کا تیار شدہ کاغذ استعمال ہو رہا ہے اس کا ۷۵ فی صدی حصہ ہندوستان ہی میں تیار ہو رہا ہے۔ اور باقی ۲۵ فیصدی حصہ باہر سے آرہا ہے مختلف کارخانوں اور ڈیہرہ دون کی کاغذ سازی کی تجربہ گاہ میں مختلف تجربات ہو رہے ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ بہت جلد صنعت کو اس درجہ پر پہونچا دیا جائے کہ تامین کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ہندوستان میں مختلف کاغذوں کے خرچ کا اندازہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۲,۱۹,۰۰۰ ٹن کیا گیا تھا۔ اور اس میں سے ۱۵ ہزار ٹن یعنی ۲۳ فیصدی حصہ دیسی مال کا تھا اور باقی ۱,۹۸,۰۰۰ ٹن یعنی ۷۷ فیصدی حصہ باہر سے برآمد ہوا۔ ہندوستان میں اس سال میں جو کاغذ باہر سے برآمد ہوا اس کی ترتیب مختلف اقسام کے لحاظ سے حسب ذیل ہے۔

نام کاغذ	مقدار (ٹن)
۱۔ لکھنے کا کاغذ اور لفافے	۷,۴۶۱
۲۔ چھاپنے کا کاغذ	۱۸,۰۸۰
۳۔ اخباری کاغذ	۳۴,۳۱۸
۴۔ معمولی استعمال کا کاغذ	۱۰,۷۳۰
۵۔ پرانے اخبارات	۵۷,۵۸۴
۶۔ کرافٹ پیپر	۹,۵۴۴
۷۔ مختلف قسم کے کاغذ	۳,۵۴۴
۸۔ دفتیاں، موٹے کاغذ اور پٹھے	۲۴,۱۷۵
۹۔ کاغذ کی مصنوعات	۲,۰۱۹
۱۰۔ دفتیوں کی مصنوعات	۶۷۱
کل مقدار	۱,۶۸,۰۲۵ ٹن

ان اعداد وشمار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درآمد میں سب سے زیادہ اہمیت پرانے اخبارات کو ہے جو ہر سال ۵۸۳، ۵۰ ٹن برآمد ہوتے ہیں۔ یہ اخبارات، پھل، مٹھائیاں اور دوسرے سامان کی پڑیاں بنانے کے کام آتے ہیں۔ ملک میں معمولی کاغذ کے استعمال کا اندازہ ۰۰۰، ۷۰ ٹن کیا جاتا ہے۔ اور اس کی طلب میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں یہ مقدار صرف ۳۷، ۳۲ ٹن تھی۔ مختلف قسم کی دفتیوں اور پٹھوں کا استعمال بھی ملک میں بڑھ رہا ہے چنانچہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۰۰۰، ۲۴ ٹن کی مقدار درآمد ہوئی۔ ہندوستان میں ان چیزوں کی تیاری کے لئے ہر قسم کی خام اشیا مثلاً گھانس، بانس وغیرہ کی بڑی کثرت ہے۔ اور بڑی آسانی سے ان کو تیار کیا جا سکتا ہے چنانچہ حال ہی میں "امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ" نے "فارسٹ ریسرچ انسٹیٹوٹ" کو اس بارے میں تجربات کرنے کے لئے ایک معقول امداد دی ہے۔

۱۹۲۷ء کی انڈسٹریل سینس رپورٹ کی رو سے ہندوستان میں کاغذسازی کے ۷ کارخانے ہیں اور کاغذسازی کے لئے گودا بنانے والا ایک کارخانہ ہے۔ ان کارخانوں میں علے الترتیب ۵۰۶۱ اور ۵۱۵ مزدور کام کرتے ہیں۔

فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ ۵ سال سے کرافٹ پیپر کی تیاری کے متعلق تجربات کر رہا ہے اور اس کو یقین ہے کہ وہ بہت جلد مختلف قسم کے کرافٹ پیپر بنانے میں کامیابی حاصل کرے گا۔ کیونکہ ملک میں اس کاغذ کے لئے ہر قسم کی خام اشیا میسر ہیں۔ اس کے علاوہ محکمہ استعمال کے لئے سستا کاغذ بنانے کی تجویز پر بھی غور کر رہا ہے۔ اگرچہ اس شعبہ میں مختلف مشکلات موجود ہیں مثلاً اس کاغذ کو باہر کے پرانے اور ازاں اخبارات سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ تاہم ان دشواریوں پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

حکومت اس صنعت کے بارے میں بہت کچھ کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ حکومت نے جو آسانیاں بہم پہونچائی ہیں اُن سے فائدہ اٹھایا جائے اور اُس کے لئے سرکاری محکموں اور سرمایہ داروں کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ ملک میں سرمایہ موجود ہے، اگرچہ منتشر حالت میں ہے مگر تھوڑی بہت دقت سے جمع ہو سکتا ہے۔ آجکل شرح سود کم ہے۔ ملک میں محنت کا کوئی کال نہیں بلکہ ہمارے یہاں محنت جس قدر سستی ہے غالباً اُس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ کاروباری اعلےٰ قابلیت و صلاحیت رکھنے والے افراد کی ملک میں کمی نہیں خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے بے روزگاری کے ہولناک بھنور سے بچنے کے لئے یہ ایک اچھا راستہ ہے۔ ایک وسیع بازار ہمارے ہاتھ میں ہے اور ابھی ملک میں اس صنعت کی ترقی کے کافی امکانات موجود ہیں۔ البتہ محنت اور کوشش شرط ہے۔

نیاز کی جرأتِ بیجا

(جناب منشی نانک چند سریواستو صاحب عشرت ایم اے۔ مولوی فاضل)

(بسلسلہ الناظر ماہ مارچ و اپریل)

شعر اصغر | ساز دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہو جب — جانِ مضطرب بن کر تو بھی لب کشا ہو جا

اعتراض نیاز | اس شعر میں ساز۔ پردہ اور اس کو چھیڑنے والا سب مجازی معنے میں استعمال ہوئے ہیں اس لئے "جانِ مضطرب" کی جگہ "اضطرابِ جاں" زیادہ موزوں تھا۔

عرض عشرت | "جانِ مضطرب" کے بجائے آپ "اضطرابِ جاں" اصلاح فرماتے ہیں اور آپ کی نگاہ میں یہی کسر شعر میں رہ گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "تو لب کشا ہو جا" اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ جملہ "تو جانِ مضطرب ہو کر لب کشا ہو جا" درست ہے یا "تو اضطرابِ جاں بن کر لب کشا ہو جا" بجا ہے۔ صاحبانِ ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ لب کشا ہونے کے لئے "جان" ضروری چیز ہے۔ بے جان چیز لب کشا نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ جو زور "جانِ مضطرب" میں صوت و معنی دونوں لحاظ سے ہے وہ "اضطرابِ جاں" میں ناممکن ہے۔ کیونکہ روح کے مقابلے میں اضطراب بہت کم حیثیت چیز ہے چاہے وہ اضطراب روح ہی کا کیوں نہ ہو کیونکہ اس حالت میں "روح" کل اور "اضطراب" جزو ہے۔ شعر میں "کل" ہے اور آپ اپنی اصلاح میں صرف "جزو" پر قانع ہیں۔ آپ روح پر مادہ کو ترجیح دیتے ہیں مگر اصغر صاحب مادہ پرست نہیں ہیں۔

شعر اصغر | یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے — لباسِ زہد کو جس نے کیا شراب آلود

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں بیان کی تعقید و تشویش ظاہر ہے۔ لفظ (وہ) بالکل زائد مستعمل ہوا ہے اور (انقلاب کرنا) محاورہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح لفظ (یہی) سراسر بے محل آیا ہے۔ اس کی جگہ (تری) ہونا چاہئے تھا۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا۔ ع تری نگاہ جو فتنہ کرے بپا کم ہے۔

عرض عشرت | پہلے مصرعہ میں نہ کوئی تعقید ہے نہ تشویش مگر خواہ مخواہ کسی کو معلوم ہی ہو تو شاعر سب کی فہم کا ٹھیکہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لفظ (وہ) آپ کو زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر بھی معنے پورے ہوتے ہیں مگر بھائی صاحب میں بارہا لکھ چکا ہوں کہ زور دینے (emphasis) دینے کے لئے زائد الفاظ لائے جاتے ہیں اور وہ زائد شمار نہیں کئے جاتے بلکہ اُن کا شمار محاسن میں ہوتا ہے کیونکہ اُن سے زورِ کلام

بڑھ جاتا ہے۔ غور کیجئے۔ دو جملے ہیں "آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں" اور "آپ جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں"
ادب کے پرستاروں پر روشن ہے کہ پہلا جملہ سادہ ہے اور اس میں کوئی زور نہیں ہے گو کہ مفہوم کے
لحاظ سے مکمل ہے مگر دوسرا جملہ لفظ (وہ) کی وجہ سے زوردار بھی ہے اور سننے میں خوش آیند بھی۔ اس کے
بعد آپ لکھتے ہیں کہ 'انقلاب کرنا' محاورہ نہیں ہے۔ آپ کو فتنہ یا قیامت برپا یا بپا کر دینے سے دھوکا
ہو گیا ہے آپ کے ذہن میں شاید یہی ہے کہ انقلاب کے ساتھ بھی "برپا" کا چھلا چاہئے۔ لفظ فتنہ کے لئے
'برپا' لازم ہے مگر قیامت کے ساتھ لازم نہیں۔ 'اس نے قیامت کر دی' اور 'اس نے قیامت برپا
کر دی' دونوں جملے صحیح ہیں۔ مگر انقلاب کا برپا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انقلاب کرنا ہی لکھا جاتا ہے۔
اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ لفظ (یہی) بیکار ہے۔ میں ایک بار لکھ چکا ہوں کہ اساتذہ اردو کا یہ ایک
فرسودہ حربہ ہے کہ شعر میں یہ۔ وہ۔ یہی۔ وہی وغیرہ زائد ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں زائد ہوتا بھی ہے مگر
اس کے لئے اساتذۂ اردو فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ جب زائد ہوتے ہیں کہ جب ان کے لئے ایک جملہ موصولہ
'جو' 'جس' وغیرہ سے شروع نہ ہو۔ غیر سے اصغر صاحب کے شعر میں جملہ موصولہ بھی ہے ملاحظہ ہو۔
"جس نے کیا شراب آلود" یعنے یہی نگاہ جس نے لباس زہد کو شراب آلود کیا جو چاہے وہ انقلاب کرے
اس جملہ میں لفظ (یہی) قطعی زائد نہیں ہے جب تک کہ سمجھنے والے میں عقل زائد نہ ہو۔ اس کے بعد آپ کی
اصلاح ہے جس میں آپ نے "یہی نگاہ" کے بجائے "تری نگاہ" بنا لیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ
تغزل میں تخاطب اگر اس طرح کیا جائے کہ بجائے واحد حاضر کے واحد غائب استعمال کیا جائے تو ایک خاص
لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ شعرا اسی لئے بجائے تم یا تو کے کوئی لکھتے ہیں اور اس غائبانہ تخاطب سے ایک لطف
پیدا کر دیتے ہیں ایک میر کا شعر ملاحظہ ہو ؎

ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے رسوا کوئی — یہ بھی چھپنا ہے کوئی یہ بھی ہے پردا کوئی

شاعر معشوق حقیقی سے کہہ رہا ہے کہ تو ذرہ ذرہ میں رسوا نظر آتا ہے مگر بجائے تو کے لفظ کوئی استعمال
کر کے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔ اسی بنا پر اصغر صاحب نے بھی "تری نگاہ" کے بجائے "یہی
نگاہ" لکھا۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اشارات کی شاعری زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ اب آپ خود ہی
غور کریں کہ ایک لطیف اشارہ 'تری نگاہ' میں ہے یا 'یہی نگاہ' میں۔ اس کے علاوہ معشوق سے باتیں کرنے
میں احترام حسن کی ادب شناسی یہ ہے کہ بجائے تو کے غائبانہ تخاطب کرے۔ ہاں ایک بات تو میں بھول
ہی گیا۔ آپ کی اصلاح میں ایک بڑا نقص ہے وہ یہ کہ آپ نے محاورہ کے لفظوں کو مقدم و موخر کیا ہے۔ محاورہ
برپا کرنا یا بپا کرنا ہے۔ ان الفاظ میں لوٹ پھیر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آپ نے "کرے بپا" لکھ مارا۔ معائب

شاعری میں اس کا نام "ضعف تالیف" ہے۔

شعر اصغر | کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا — خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں بجائے (جس کو) کے صرف (کہ) استعمال ہوا ہے جو درست نہیں۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا۔ ع ہے اپنا طرزِ نظر جس کو دیکھتا ہوں میں۔

عرض عشرت | آپ درست فرماتے ہیں کہ لفظ (کہ) (جس کو) کے معنے میں مستعمل ہوا ہے مگر آپ کو کیا خبر کس تقاضائے ادبیہ سے مجبور ہو کر اصغر صاحب نے ایسا کرنے کی ضرورت سمجھی۔ اگر آپ اُسے سمجھ جاتے تو شاید اس ترکیب کی ترمیم کے لئے آپ آواز اُٹھاتے۔ سُنئیے کبھی کبھی موصول وصلہ کے مفہوم میں اتنا اتحاد ہوتا ہے کہ الفاظ میں بھی وہ دوری برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسے موقع پر سب سے چھوٹا لفظ (کہ) موصولہ ہے۔ وہ اتنا مختصر ہے کہ جس سے موصول وصلہ کا اتحاد منقطع نہیں ہوتا جیسا کہ (جس کو) یا (جس سے) وغیرہ سے ہو جاتا ہے۔ یہ میں بتلا چکا ہوں اصغر صاحب فلسفہ (Subjectiveness) کے قائل ہیں۔ وہ عالم کو اپنی نظر کا مرہونِ منت سمجھتے ہیں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ 'طرزِ نظر' اور 'عالم' بالکل ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے محض 'اپنا طرزِ نظر' نہیں لکھا بلکہ زور دینے کے لئے "خود اپنا طرزِ نظر" لکھا۔ اس کے بعد (جس کو) کے بجائے محض (کہ) لکھا جس سے 'طرزِ نظر' میں اور جو کچھ دیکھا جاتا ہے اس میں جو رشتۂ اتحاد ہے اُس کو ضرب نہ پہونچے۔ مگر یہ بڑے پایہ کی باتیں ہیں، معمولی لوگوں کا تو ان کا سمجھنا دشوار ہے۔ آپ نے چونکہ یہ نکتہ سمجھ نہیں پایا۔ اپنی اصلاح میں لفظ 'خود' کو جو شعر کی جان ہے نکال دیا اور (کہ) کو جو اتنا نازک کام کر رہا ہے ہٹا کے (جس کو) کا ڈھیلا رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی مصرعہ اصغر صاحب کے مصرعہ سے کس قدر پست و کمزور و بے کیف ہے۔

شعر اصغر | حسن کرشمہ ساز کا بزم میں فیض عام ہے — جان بلاکشاں بھی آج غرق ہے موجِ نور میں

اعتراض نیاز | موجِ نور کے استعمال کا کوئی قرینہ شعر سے ظاہر نہیں۔ پہلے مصرعہ میں حسن کرشمہ ساز لکھا ہے اور موجِ نور کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح فیض عام کے زیر اثر جان بلاکشاں کو موجِ سرور و حسرت میں غرق ہونا چاہیئے نہ کہ موجِ نور میں۔ آج کا (ج) بھی تقطیع سے گرتا ہے بجائے اس کے (اب) ہونا چاہیئے۔

عرض عشرت | حسن کی کرشمہ سازی یہی ہے کہ جان بلاکشاں جو ہمیشہ شراب کے علاوہ کسی چیز کو کچھ نہیں سمجھتی اور جو شراب کی مستی میں دنیا و ما فیہا کو یک لخت فراموش کئے رہتی ہے اس کو بھی آج معشوق نے اپنے نورِ حسن سے مسحور کر لیا اور یہاں تک کہ وہ لطفِ میخواری کو یک لخت بھول کر معشوق کے نورِ حسن میں دوسرے عاشقوں کے مانند غرق ہو رہے ہیں۔ کوئی سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتا ہے کہ اس شعر میں بلاکشوں کی رعایت سے سرور و کیف کی ضرورت نہیں ہے اور موجِ نور کا محل استعمال بالکل بجا و درست ہے (آج) کے استعمال اور

خوبصورتی پر آپ کو اعتراض نہیں۔ تقطیع میں چونکہ آج کا (ج) گر جاتا ہے اسی لئے آپ اسے اب
کرنا چاہتے ہیں۔ فارسیت کے آپ بڑے مدعی ہیں۔ اپنے مکتوبات میں آپ فارسی اشعار کا اکثر اعادہ
کیا کرتے ہیں مگر آپ کو معلوم نہیں کہ فارسی شعراء کے یہاں یہ جائز ہے۔ کلیات خاقانی اتفاق سے سامنے
ہے اس سے کئی شعر اسی بحر میں دیے جاتے ہیں جن میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک حرف بعینہ اسی طرح
تقطیع سے گرا ہوا ہے۔

اشعار خاقانی

(۱) تاجورم چوں آفتاب اینست عجب کہ بے بہا	بر سر خاک عور تن نور تنم دریغ من
(۲) رفتہ تنینہ در فواق از چہ ز امتلاے خوں	راست چوں پشت نیشتر خوں چکدش معصفری
(۳) چنگی آفتاب بروئے از پے ارتفاع من	چنگ نہادہ ربع وش بر بر و چہرہ بربری
(۴) چرخ سدابے از لبش دروش فقع کشاد گفت	اینست نسیم مشک پاش اینست فقاع شکری
(۵) گاو سفالیں اندر آر کاتش موسوی درد	تا چہ کنند خاکیاں گاو زرین ساحری
(۶) مے بہ سفال خام نوش اینست چمانۂ طرب	لب بہ کلوخ خشک مال اینت شمامۂ تری
(۷) گنبد آبگینہ رنگ نیست فرشتہ خوے رو	سنگ بر آبگینہ زن دیو دلی کن اے پری
(۸) در قصب سر دامنی آستیں دو بر فشاں	پاے طرب سبک بر آر از چہ زمے گراں سری
(۹) ہفت طواف کعبہ را ہفت بتاں بسندہ اند	ماو سر پنج کعبتین داد بہ ہفت آوری
(۱۰) حیدر آسماں حسام احمد مشتری نگیں	رایض رلے آسماں صیقل جاہ مشتری

مرقومہ بالا دس اشعار کے لئے آپ کی تقطیع کی حقیقت ظاہر ہے۔

شعر منشر: موجوں کا عکس ہے خط جام شراب میں — یا خوں اچھل رہا ہے رگ ماہتاب میں

اعتراض نیاز: خط جام ایک فرضی خط ہے اور اگر فرضی نہ ہو تو بھی اس میں موجوں کا عکس نمایاں نہیں ہو سکتا
دوسرے مصرعہ میں جام شراب کو (ماہتاب) کہا ہے حالانکہ (آفتاب) کہنا زیادہ مناسب تھا۔

عرض عشرت: اعتراض اصل یہ ہے کہ خط جام شراب اگر فرضی نہ ہو تو بھی اس میں موجوں کا عکس نمایاں نہیں
ہو سکتا۔ دوسرے رگ ماہتاب کو رگ آفتاب کہنا چاہئے۔ اگر خط جام فرضی نہیں تو اس پر سرخ مے
کی موجوں کا عکس شیشہ کے باہر سے کیوں نمایاں نہیں ہو سکتا؟ ہاں اگر پیالہ شیشہ کا نہ ہو تو نہیں ہو سکتا
مگر ایسا فرض کرنے کے لئے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اب صرف یہ رہ گیا کہ جام کو آفتاب کہنا چاہئے
یا ماہتاب۔ آپ شاید شراب کی رعایت سے آفتاب کہنا چاہتے ہیں کیونکہ آفتاب کے معنی شراب کے
بھی ہوتے ہیں مگر اگر محض اتنی سی بات ہے، تو یہ لکھنؤ کی اس رعایت لفظی کی رنگ ہے جس کا نزد رمیاں

امانت کے عہد میں تھا مگر میں سے اب شعرائے لکھنؤ بھی متروک سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں۔ کوئی سمجھدار اب اسے رواج دینا نہیں چاہتا۔ خیر اب مناسبت استعارہ کو دیکھیے۔ شاعر کو اگر محض ایک مدور چیز کی مثال دینا ہوتی تو آفتاب یا ماہتاب دونوں کہہ سکتا تھا کیونکہ بدر و آفتاب دونوں مدور ہیں گو کہ اس اعتبار سے بھی ماہتاب ہی زیادہ موزوں تھا کیونکہ آفتاب کا مدور ہونا چکاچوند کے مارے سوائے صبح یا شام کے ٹھیک نہیں دکھائی پڑتا مگر بدر کا گول دائرہ ہر وقت پورا پورا دکھائی پڑتا ہے لیکن خیر آفتاب سے بھی تشبیہ دے سکتے تھے کیونکہ وہ بھی گول ہے گو کہ وہ ماہتاب سے بدتر تشبیہ ہوتی۔ مگر جب شاعر خوبصورتی جام مدور دکھانا چاہتا ہو تو سوائے ماہتاب کہنے کے چارہ نہیں کیونکہ خوبصورتی بدر کی مسلم ہے۔ آفتاب کسی ادب میں خوبصورتی کے لئے مشہور نہیں۔ آفتاب تیزی و تمازت کے لئے لایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس مقام پر آفتاب کی تشبیہ بالکل غلط ہے اور ماہتاب کی بالکل بجا و درست۔

شعر صفر| اُس دن بھی میری روح تھی محو نشاط دید موسیٰ اُلجھ گئے تھے سوال و جواب میں

اعتراض نیاز| پہلے مصرعہ کے انداز بیان کے لحاظ سے دوسرے مصرعہ کے الفاظ یوں ہونا چاہئے تھا۔ جب موسیٰ سوال و جواب میں اُلجھے ہوئے تھے۔ لفظ (جب) کا اظہار ضروری ہے اور "اُلجھ گئے تھے" بھی بے محل استعمال ہوا ہے۔ یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے۔

اُس دن بھی میری روح تھی محو جمال جب موسیٰ الجھ رہے تھے سوال و جواب میں

عرض عشرت| شاعر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ یعنے شاعر کی روح جلوہ طور کے دن کے پہلے بھی محو نشاط تھی اور اس دن بھی جس دن موسیٰ سوال و جواب میں اُلجھ گئے تھے۔ مصرعہ میں جو لفظ (بھی) ہے وہ اس معنے پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں (جب) کا لکھنا شبہ پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ ایک خاص وقت یعنے (Point of time) بتاتا ہے اور وقفہ یعنے (Period of time) نہیں بتاتا جو لفظ دن میں موجود ہے۔ اسی لئے شاعر نے اُسے ترک کر دیا۔ لیکن قرینہ سے اس کا مطلب صاف نکل آتا ہے اور اس طرح کے اشارات شاعری میں جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن سمجھے جاتے ہیں۔ آج کل کے اُردو ادیب پُرانے اساتذہ کا یہ بچپڑا اُٹھنے کو تیار نہیں کہ اس شعر میں فلاں لفظ کی ضرورت باقی رہ گئی مگر ہاں اگر سیاق عبارت سے اس کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہو۔ اب رہ گئی یہ بات کہ بجائے 'الجھ گئے تھے' کے 'اُلجھے ہوئے تھے' یا 'اُلجھ رہے تھے' ہونا چاہیے۔ سنیے اگر شعر میں بجائے اُس دن کے اس وقت ہوتا تو شاید آپ کا کہنا بہتر ہوتا گو کہ 'الجھ گئے تھے' پھر بھی غلط نہ ہوتا۔ مگر اُس دن کے ساتھ جو کچھ اصغر صاحب نے لکھا وہی زیادہ موزوں ہے گو کہ آپ فرما رہے ہیں) وہ غلط نہیں ہے۔

شعر اصغر | میں اضطراب شوق کہوں یا جمال دوست یک برق ہے جو کوندر ہی ہے نقاب میں

اعتراض نیاز | تھوڑی سی تبدیلی کے بعد یہ شعر اس سے بہتر ہو سکتا تھا ؎

میں اس کو فرط شوق کہوں یا جمال دوست اک برق سی جو کوند رہی ہے نقاب میں

عرض عشرت | اس میں محض شعر کو بہتر کرنے کے لئے اصلاح دی ہے مگر شعر بدتر ہو گیا۔ آپ نے 'اضطراب شوق' کے بجائے 'فرط شوق' کر دیا ہے اور 'برق' کو 'برق سی' اور دونوں محض بیکار ہی نہیں بلکہ مفہوم شاعر کو برباد کرنے والی ہیں۔ برق کے کوندنے کی کیفیت کے لئے اضطراب نہایت ضروری لفظ ہے کیونکہ برق کوندنے میں ایک خاصہ اضطراب کا پایا جاتا ہے۔ اتنے برمحل لفظ کو جو شعر کی جان ہے آپ نے بدل کر شعر کو پست کر دیا دوسرے یہ بات علم معنی و بیان میں مسلم ہے کہ تشبیہ سے استعارہ زوردار ہوتا ہے مگر اس کے برخلاف (سی) زائد کر کے آپ نے استعارہ کو تشبیہ سے بدل دیا۔ دوسرے لفظوں میں آپ نے زوردار کو پھیکا۔ بلند کو پست اور چست کو سست کر دیا۔

شعر اصغر | میخانۂ ازل میں جہاں شراب میں ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں لفظ (نہ) دونوں ٹکڑوں کے درمیان لانا مناسب تھا اور دوسرے مصرعہ میں (ایک جگہ) کے بجائے (کسی جگہ) ہونا چاہئے تھا۔ دوسرا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے۔ ع ٹھہرا گیا نہ مجھ سے کہیں اضطراب میں۔

عرض عشرت | (نہ) لانے کی ضرورت پہلے مصرعہ میں بالکل نہیں۔ مفہوم یوں بھی صفائی سے ادا ہو رہا ہے دوسرا اعتراض آپ کا ہے کہ بجائے (ایک جگہ) کے (کسی جگہ) ہونا چاہئے اور اسی کی رعایت سے آپ نے 'کہیں' اصلاح دی ہے۔ مگر ایسا کرنے سے شعر کا سارا زور جاتا رہا۔ زور لفظ (ایک) کی وجہ سے ہے۔ مگر شاید آپ زور یعنے (Emphasis) کا مرتبہ شعر میں بالکل نہیں مانتے کیونکہ اس سے پہلے بھی اس طرح کے لایعنی اعتراض آپ نے کئے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک بڑے پہلوان کے سامنے ایک جماعت پہلوانوں کی موجود ہے مگر وہ ان میں سے کسی کو خیال میں نہیں لاتا۔ وہ اُن سے یوں کہے گا "تم میں کوئی مجھ سے نہیں لڑ سکتا" مگر اگر اُسے اپنی بات پر زور دینا ہے تو وہ یوں کہے گا "تم میں سے ایک بھی مجھ سے نہیں لڑ سکتا" دوسرے جملہ میں جو زور موجود ہے وہ محض لفظ 'کوئی' کو 'ایک' سے بدل دینے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے مگر جو راز ادب سے واقف نہیں ہے وہی 'ایک' کے بجائے 'کوئی' یا 'کسی' کے پھیر میں پڑے گا۔

شعر اصغر | یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اعتراض نیاز | کس کو گلستاں بنا دیا؟ سوائے کلیوں کے اور کسی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا اور کلیوں کو

گلستاں بنا دینا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے لب کشائی کا نتیجہ گلستاں بنا دینا بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ غزلخواں ہوتا تو خیر تعلق پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ نقص پھر بھی باقی رہتا کہ کس کو غزلخواں بنا دیا۔

عرض عشرت | آپ پوچھتے ہیں کس کو گلستاں بنا دیا؟ یہ بعینہٖ وہی اعتراض ہے کہ "عاشق کس چیز کو ان کا دل سمجھتا ہے" اور جس کی حقیقت کھل چکی ہے۔ سُنیے 'بنا دیا' یعنے 'تیار کر دیا' ہے۔ یعنے معشوق نے لب کشائی کر کے ایک گلستاں تیار کر دیا۔ اب آپ کا صرف یہ اعتراض رہ گیا کہ لب کشائی کا نتیجہ (گلستاں بنا دیا) سمجھ میں نہیں آتا۔ تعجب ہے کہ آپ اُردو ہندی کا مشہور محاورہ "منہ سے پھول جھڑنا" نہیں جانتے۔ جب کوئی نہایت خوبصورتی سے بات کرتا ہے تو لوگ یہی کہتے ہیں کہ اس کے مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں معشوق کی لب کشائی کی کیا تعریف کی جائے۔ اسی لئے شاعر نے لکھ دیا کہ لب کشائی کر کے اُس نے گویا ایک گلستاں تیار کر دیا۔

شعر صغر | ہم اس نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگ جاں بنا دیا

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں (اس) بالکل غیر ضروری ہے۔

عرض عشرت | (اس) آپ کی سمجھ میں زائد ہے مگر حقیقتاً ضروری ہے۔ ہر نگاہ ناز نیشتر نہیں ہوتی۔ ایک خاص موقعہ کی نگاہ نیشتر ہوتی ہے اسی لئے شاعر لکھتا ہے کہ "ہم اس نگاہ کو (جو اس وقت ہم پر ہوئی ہے) نیشتر سمجھے تھے۔"

شعر صغر | بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو — مجھ کو شہید رسم گلستاں بنا دیا

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ کے دونوں ٹکڑے ترکیب کے لحاظ سے غیر متوازن ہیں۔ علاوہ اس کے (بلبل بہ آہ و نالہ) کی ترکیب بھی اس موقع پر صحیح نہیں ہے۔ بجائے اس کے (بلبل رہین نالہ) کہہ سکتے تھے

عرض عشرت | آپ کے توازن کے بارے میں میں اب کیا لکھوں۔ بارہا اس کی قلعی کھول چکا ہوں۔ مگر معلوم نہیں کہ (بلبل بہ آہ و نالہ) کی ترکیب میں قواعد کی کون غلطی ہے۔ ترکیب بالکل صحیح ہے اس میں قطعی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح کہ بجائے (بلبل بہ آہ و نالہ) کے (بلبل رہین نالہ) ہونا چاہئے۔ آپ نے پھر شاعر کے مفہوم کو کم کر دیا جو آپ کی اصلاح کا طرۂ امتیازی ہے۔ شاعر نے آہ و نالہ دو چیزیں کہی ہیں اور دونوں چیزیں ایک نہیں ہیں کہ ایک ان میں سے چھوڑ دی جائے جیسا کہ آپ نے اپنی اصلاح میں کیا ہے۔

شعر صغر | اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو — خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے میں

اعتراض نیاز | اگر امتحان و آزمائش میں عاشق رونے لگا تو اس سے خود معشوق کا اپنے آپ کو آزما بیٹھنا کیونکر ظاہر ہوتا ہے اور اس سے معشوق کی آزمائش کیا ہوئی یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے۔

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو کیا ملا تمہیں آخر مجھ کو آزمانے میں

عرض عشرت | افسوس ہے کہ آپ شعر مطلق نہیں سمجھے۔ پہلا مصرعہ عاشق کی حالت نہیں بیان کرتا بلکہ معشوق کی حالت کا بیان ہے۔ مگر آپ نہ جانے کیا سمجھ کر لکھتے ہیں کہ "اگر امتحان و آزمائش میں عاشق رونے لگا" خیر شعر کا مطلب سُنیے۔ معشوق عاشق کے صبر کی آزمائش کرتا تھا کہ کہاں تک وہ صبر کے ساتھ معشوق کا ظلم برداشت کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ معشوق کو یہ بھی خیال تھا کہ مجھے اپنے دل پر قابو ہے۔ عاشق کی حالت زار دیکھ کر میری حالت کبھی متغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے معشوق نے انتہائی ظلم کیے۔ جس سے عاشق کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ جسے دیکھ کر کوئی بھی اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکے۔ ایسی حالت میں معشوق کی آزمائش ہو گئی معشوق اپنے دل پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اس کے اشک متواتر گرنے لگے۔ چلے تھے عاشق کی آزمائش کرنے مگر خود معشوق کی آزمائش ہو گئی کہ ان کو اپنے دل پر کہاں تک قابو ہے۔

شعر صفر | زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اُٹھاتا ہوں تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

اعتراض نیاز | زخم لینا خلاف محاورہ ہے (زخم آپ کھاتا ہوں) ہونا چاہئے۔

عرض عشرت | محض زخم لینا پر اعتراض ہے۔ آپ کی سمجھ میں "زخم کھانا" ہونا چاہئے۔ زخم کھانا اُردو کا مشہور محاورہ ہے مگر شاعر کا کام اس سے نہیں چلا۔ شاعر کا مفہوم اس سے وسیع تر تھا۔ اردو میں اپنے موافق لفظ یا محاورہ نہ پاکر شاعر نے ایجاد کی۔ ایجاد اچھی ہے یا بُری اس کا فیصلہ زمانہ کرے گا۔ اگر ایجاد بہتر ہے تو اس کا رواج عام ہو جائے گا اور اگر ردی ہے تو وہ موجد ہی تک محدود رہ جائے گی۔ مگر یہ آئندہ کی بات ہے۔ آپ شعر کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں جس سے مجبور ہو کر شاعر نے "زخم لینا" لکھا ہے۔ زخم کھانے میں قبول و تسلیم کر لینے کا مفہوم نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ اس نے چار زخم کھائے تو اس جملے سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اُس نے اپنی پسند یا طبیعت سے زخم کھائے، بڑی خوشی سے ان زخموں کا استقبال کیا اور اُن سے اس کو ایک خاص لذت مل رہی ہے۔ مگر شاعر کو یہ تمام مفہوم ادا کرنا تھا اس لیے اُس نے "زخم لینا" لکھا جس میں قبول و استلام کے ساتھ ایک لذت بھی شامل ہے۔

شعر صفر | سرو بھی جو بار بھی لالہ و گل بہار بھی جس سے چمن چمن بنا ایک وہ مشت پر نہیں

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں ٹکڑوں کی تقسیم غلط ہے (گل) کے بعد (بھی) ہونا ضروری تھا اور اس کے نہ ہونے سے (گل) بہار کے ساتھ مل کر گل بہار ہو جاتا ہے۔ دوسرا مصرعہ سست ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے

سرو بھی جو بار بھی، گل بھی ہے اور بہار بھی جس سے مگر چمن بنا اک وہی مشت پر نہیں

عرض عشرت | اعتراض ہے کہ پہلے مصرعہ میں ٹکڑوں کی تقسیم غلط ہے کیونکہ (گل) کے بعد (بھی) ہونا ضروری

تھا۔ ٹکڑوں کی تقسیم بالکل صحیح ہے۔ سرو ایک چیز ہے لہذا اس کے بعد (بھی) ہے۔ جوئبار ایک چیز ہے لہذا اس کے بعد بھی (بھی) موجود ہے مگر لالہ وگل بہار تینوں چیزیں مل کر باغ میں ایک ہو جاتی ہیں کہ بہار کا لالہ وگل سے تعلق ہی نہیں بلکہ اتحاد ہے۔ بہار کو سرو وجوئبار سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ سرو ہر موسم میں سرسبز رہتا ہے اور جوئبار بھی اپنی روانی کے لئے بہار کا محتاج نہیں۔ برخلاف اس کے لالہ وگل کا تعلق بہار سے ایسا ہے کہ باغ میں ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے شاعر نے لالہ وگل بہار تینوں چیزوں کو ایک ساتھ لے کر ان تینوں لفظوں کے لئے الگ الگ (بھی) نہیں لکھا بلکہ ان تینوں لفظوں کے بعد (بھی) استعمال کیا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ گل بہار سے مل کر گلبہار ہو جاتا ہے یہ عجیب اعتراض ہے جا ہے جن دو لفظوں کو ایک میں ملا کے لکھ دیجئے اور اعتراض جڑ دیجئے۔ مثلاً آپ کے اصلاحی مصرعہ میں (گل، بھی) کے ساتھ مل کر گلبھی ہو جاتا ہے۔ یہ بیکار کا اعتراض ہے۔ اعتراض کی صورت تو جب ہوتی کہ جب دونوں لفظوں کے ملنے سے ایک مکروہ لفظ بنے جیسے مرزا دبیر کے ایک مصرعہ میں الفاظ "تار پہ دوڑے" پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ "پہ دوڑے" مل کے "پدوڑے" ہو گیا جو ایک مکروہ لفظ ہے یہی بات آپ کے ذہن میں تھی مگر آپ کو اس کا محل استعمال نہیں معلوم تھا۔ تیسرا اعتراض ہے کہ دوسرا مصرعہ سست ہے اسی لئے آپ نے اس پر اصلاح دی ہے۔ اصغر صاحب کے مصرعہ میں "چمن چمن" کی تکرار نے بڑا زور یعنی (Emphasis) پیدا کر دیا ہے جس نے پورے شعر کو خوبصورت اور زوردار بنا دیا ہے آپ نے اس خوبصورت تکرار کو بدل کے پورا مصرعہ سست کر دیا مگر اپنے دہی کو کھٹا کون کہتا ہے۔

شعر اصغر | جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے ۔ اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرز نظر ہے

اعتراض نیاز | شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جینے مرنے کا ہوش کسے نہیں ہے۔ محبوب کو یا عاشق کو۔ اس لئے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے۔ ع جینے کا مجھے ہوش نہ مرنے کی خبر ہے۔

عرض عشرت | جس میں ذرا سا بھی ذوق سلیم ہو وہ الفاظ "شعبدہ پرداز" اور "طرز نظر" سے سمجھ لے گا کہ یہ معشوق کے لئے ہیں اور الفاظ "مرنے جینے" سے سمجھ لے گا کہ یہ عاشق کے لئے ہیں۔ اصغر صاحب شعر نہ بچوں کے لئے کہتے ہیں اور نہ جاہل ونیم تعلیم یافتہ جماعت کے لئے۔ ادب کا اور خصوصاً شاعری کا ایک اہم اصول ہے کہ جو بات کنایۃً کہی جا سکتی ہو اُسے صراحۃً نہ کہا جائے مگر آپ نے اپنی اصلاح میں جو کنایہ تھا اُسے بالصراحت بیان کر کے شعر کا لطف چوپٹ کر دیا۔ اگر ایسی ہی اصلاحیں عام طور سے ہونے لگیں تو اُردو ادب کا سر نیچا ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اصغر صاحب کے مصرعہ میں لفظ (کچھ) بڑا زور پیدا کر رہا ہے مگر آپ زور یعنی (Emphasis) کے دشمن ہیں کیونکہ اصغر صاحب کے اشعار میں جہاں جہاں

(emphasises) تھا آپ نے اصلاح دے کے اُسے سادہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

شعر اصغر | ہے تابش انوار سے عالم تہ و بالا — جلوہ وہ ابھی تک تہ دامان نظر ہے

اعتراض نیاز: | نہ تابش انوار سے عالم تہ و بالا ہو سکتا ہے اور نہ جلوہ کا دامان نظر سے کوئی تعلق ہے اگر یہ کہا جاتا کہ "وہ جلوہ ابھی تک زیر نقاب ہے" تو البتہ درست ہو سکتا تھا۔

عرض عشرت | اعتراض ہے کہ "تابش انوار سے عالم تہ و بالا" نہیں ہو سکتا۔ آپ شاید تہ و بالا کے معنی نہیں سمجھے۔ آپ اس کے لفظی معنی سے دھوکا کھا گئے اور سوچا کہ "تابش انوار" سے عالم چمک سکتا ہے تہ و بالا یعنے اوپر نیچے نہیں ہو سکتا۔ مگر معمولی سے معمولی علم و عقل کا آدمی بھی جانتا ہے کہ اُردو میں "تہ و بالا" ہونے کے معنے انقلاب ہونے کے ہیں مگر اعتراض آپ کا اب بھی قائم ہے کہ تابش انوار سے کوئی انقلاب بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ آپ کی بھول ہے۔ جلوۂ طور سے پہاڑ جل گیا تھا۔ کیا یہ کوئی انقلاب نہ تھا؟ انقلاب ممکن ہے مگر اس کے لئے کافی زوردار تابش انوار چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ طور کے جل جانے سے بھی انکار کر جائیں کیونکہ بہت سے مذہبی مسلمات سے آپ صاف انکار کر جاتے ہیں۔ مگر یہ بات فارسی اور اُردو ادب میں مسلم ہے اور ادب کے واقعہ کی صحت کا لزوم نہیں۔ دوسرا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ "جلوہ کا دامان نظر" سے تعلق نہیں ہے۔ سبحان اللہ۔ اگر جلوہ کا تعلق نظر سے نہیں ہے تو کیا اینٹ پتھر سے ہے؟ مگر شاید آپ یہ لکھنا چاہتے تھے کہ جلوہ کا دامن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے آپ "تہ داماں" کے بجائے اپنی اصلاح میں "زیر نقاب" تجویز فرماتے ہیں۔ آپ نے "تہ داماں" کے استعارہ کو بالکل نہیں سمجھا گو کہ ہندوستانی عورتوں میں یہ رسم عام ہے کہ جب وہ چراغ (دیا) لے کر ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی اور صحن یا اور کسی کھلی جگہ سے اُنھیں گذرنا پڑتا ہے تو وہ روشنی کو آنچل سے چھپا لیتی ہیں تاکہ ہوا سے بجھ نہ جائے۔ روشنی باریک آنچل سے چھن چھن کر نکلتی رہتی ہے۔ اصغر صاحب نے یہیں سے استعارہ لیا ہے جس پر الفاظ "تابش انوار" دال ہیں۔ شعر کے معنی یہ ہوئے کہ جلوۂ حقیقت اتنا زبردست ہے کہ گو کہ وہ انسانی نظر کے دامن کے نیچے چھپا ہے پھر بھی تمام عالم میں اُس کی تابش انوار سے ایک انقلاب ہو رہا ہے اب شاید آپ کا اعتراض ہو کہ نظر کا کام دیکھنے کا ہے چھپانے کا نہیں۔ اس بات کو بھی سمجھ لیجئے۔ نظر کا کام جہاں دیکھنا ہے وہاں حقیقت کو چھپا دینا بھی ہے۔ نظر جب حسن حقیقت کو دنیا میں پھیلا ہوا دیکھتی ہے تو اُسے رنگ و بو۔ لالہ و گل۔ دریا۔ پہاڑ وغیرہ کہہ کر اُس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اصغر صاحب نے یہ مضمون بار بار کہا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱) کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے — مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

(۲) لالہ و گل کا جگر خون ہوا جاتا ہے — سب سمجھتے ہیں جو ناکام تماشا مجھ کو

(۳) فصل گل۔ جوش نمو۔ طلعت زیبائے بہار — عرض دیدار پہ یک جلوۂ مستور ہے آج

(۴) صوفی کو ہے مشاہدۂ حق کا ادعا — صدہا حجاب دیدۂ بینا لئے ہوئے

(۵) نیرنگ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے — آنکھوں سے اگر دیکھو پردا نظر آتا ہے

ایک میر ابھی شعر اسی مضمون کا ملاحظہ ہو ؎

سیکڑوں بار مرے سامنے آیا ہے مگر — چشم بینا کو بنائے ہوئے پردا کوئی

شعر اصغر | در پہ جو تیرے آگیا اب کہیں اٹھا سے مجھے — گردش مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اعتراض نیاز | پہلا مصرعہ ترکیب نظم کے لحاظ سے بہت سست ہے اور علاوہ اس کے گردش مہر و ماہ کا ذکر بھی بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ اصغر صاحب نے جو مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے اُس کے لحاظ سے شعر یوں ہونا چاہیئے تھا ؎

بات نصیب کی ہے یہ در ترا مجھ کو مل گیا — گردش مہر و ماہ بھی دیکھی ہے ورنہ راہ میں

عرض عشرت | اعتراض یہ ہے کہ پہلا مصرعہ سست ہے۔ آپ نے اصلاح دی ہے اور ہمیشہ کی طرح چوپٹ اصغر صاحب کے شعر میں "در پہ جو ترے آگیا" میں جو لطف اور سچی التجا اور لجاجت ہے، وہ آپ کی اصلاح میں مفقود ہے۔ آپ کا اصلاحی مصرعہ اصغر صاحب کے مصرعہ سے ہر معنی میں سست ہے۔ اصغر صاحب کے دوسرے مصرعہ میں الفاظ "دیکھ چکا" لاکھ روپیے کے ہیں جن سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ اب دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ مگر آپ نے اصلاح میں یہی الفاظ نکال کر شعر کو مفہوم کے اعتبار سے اور لفظی خوبصورتی کے بھی اعتبار سے مٹا کر رکھ دیا۔

شعر اصغر | تو بہت سمجھا تو کہہ گذرا فریب رنگ و بو — یہ چمن لیکن اُسی کی جلوہ گاہ ناز ہے

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں لفظ (لیکن) کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ اس جگہ (ورنہ) ہونا چاہیئے۔

عرض عشرت | نیاز صاحب آپ شاعر کا پورا مفہوم نہیں سمجھے۔ شاعر کہتا ہے کہ تو نے اگر چمن کی حقیقت جاننے میں بڑی تحقیق کی تو یہاں تک پہونچا کہ اس کو فریب رنگ و بو کہہ گذرا۔ اس کے بعد یہ جملہ (اگر تیری تحقیق میں یہی آتا ہے تو یہی کہتا رہ) چھپا ہوا ہے جو قرائن سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ لیکن یہ چمن اسی کی جلوہ گاہ ہے۔ یعنے تیری تحقیق میں اگر چمن فریب رنگ و بو ہے تو تو اس کو مانتا رہ یا کہتا رہ لیکن یہ چمن اسی کی جلوہ گاہ ناز ہے۔ اس میں (ورنہ) کی گنجائش کہیں نہیں ہے اور (لیکن) کا حرف برمحل ہے۔

شعر اصغر | بندشوں سے اور بھی ذوق رہائی بڑھ گیا اب قفس بھی ہم اسیروں کو پر پرواز ہے

اعتراض نیاز | ذوق رہائی اور رہائی میں بڑا فرق ہے اس لئے جب تک پہلے مصرعہ میں واقعتاً رہائی نہ دکھائی جائے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ دعوے کر بیٹھنا کہ قفس بھی پر پرواز ہو گیا ہے درست نہیں۔

عرض عشرت | آپ اکثر استعاروں کو لفظی معنی میں سمجھ کر ارد و ادب پر بڑی بیداد کرتے ہیں۔ اصغر صاحب نے لکھا کہ "قفس بھی پر پرواز ہے" اس سے آپ لے اڑے بلبل محبوس واقعی اڑنے لگا۔ سنیئے۔ جس چیز سے آدمی منع کیا جاتا ہے اس کی طرف طبیعت خواہ مخواہ مائل ہوتی ہے۔ یہ نفسیات کا ایک مسلم الثبوت مسئلہ ہے جس سے جاہل تک واقف ہے۔ بلبل میں آزاد رہ کر سیر چمن کی تمنا فطری ہے۔ مگر جب اُسے قفس میں رکھا گیا تو اس کی فکر رہائی و آزادی اور تیز ہو گئی۔ اُس کا خیال قفس سے اُڑ کے باغ کی سیر کرنے لگا۔ کوئی خیال کو بیڑی نہیں پہنا سکتا بلکہ خیال بیڑیوں سے اور آزاد ہو جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے اور آپ نے خدا جانے کیا سمجھا کہ رہائی اور ذوق رہائی میں فرق دکھانے لگے۔

شعر اصغر | عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرز دید میری آنکھیں بند ہیں اور چشم انجم باز ہے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں لفظ عام کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بجائے اس کے (ایک) کا لفظ زیادہ برمحل ہے۔

عرض عشرت | آپ کو لفظ (عام) پر اعتراض ہے۔ شاعر کا مفہوم کہ جلوہ حقیقت سب جگہ بے پردہ نمایاں ہے اور سب کے لئے عام ہے۔ لفظ عام کے لئے ایک شعر میر بھی ملاحظہ ہو ؎

اس کم نظری نے مجھے محروم ہی رکھا جلوہ ہے ترا عام مگر عام نہیں ہے

مفہوم کے لحاظ سے لفظ (عام) شعر میں نہایت ضروری ہے مگر آپ اُسی کو بدل رہے ہیں۔

شعر اصغر | دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں لفظ (سے) نمایاں کے ساتھ تو استعمال ہو سکتا ہے لیکن پنہاں کے لئے (میں) چاہیئے اس لئے یہ مصرع اس طرح ہونا چاہیئے تھا۔ ع دہر ہی سے وہ نمایاں ہے اسی میں پنہاں۔ دوسرے مصرعہ کی ردیف بالکل بیکار ہے کیونکہ (ہونا) کو حذف کر دینے کے بعد بھی معنے پورے ہو جاتے ہیں۔

عرض عشرت | اعتراض محض یہ ہے کہ پنہاں کے ساتھ (سے) غلط ہے (میں) ہونا چاہیئے۔ آپ اکثر شاعر کا مفہوم کلیۃً نہیں سمجھتے اور استادی کے زعم میں خواہ مخواہ اصلاح دینے لگتے ہیں۔ شاعر کا مفہوم ہے کہ دہر جلوۂ حقیقت کے لئے ایک پردہ ہے مگر یہ پردا ایسا نہیں ہے کہ جلوۂ حقیقت کو کلیۃً چھپا دے کیونکہ اسی میں سے ایک جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔ اب غور کیجئے کہ دہر ایک ایسا پردا ہے جس سے

جلوۂ حقیقت نمایاں ہے اور جس سے جلوۂ حقیقت پنہاں بھی ہے۔ ایک چیز پنہاں پردے سے بھی ہو سکتی ہے اور پردہ میں بھی دونوں صحیح ہیں مگر آپ کو تو خواہ مخواہ کا اعتراض کر دینا آتا ہے۔ آپ کا دوسرا اعتراض ہے کہ ردیف بیکار ہے۔ خیر بہتر ہے آپ شعر کی نثر کر ڈالیں وہ یوں ہوئی " دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے (اور) دہر ہی سے وہ پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا (کا) ہونا " آپ کے اعتراض کے مطابق ردیف (ہونا) بیکار ہے اُسے نکال ڈالئے۔ اب نثر یوں ہوئی " دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے (اور دہر ہی سے وہ) پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا " جملہ بے ربط ہے جب تک کوئی فعل ناقص اس میں نہ جوڑیے۔ چاہے آپ (ہونا) کے بجائے (ہوتی ہے) لکھیں یا اور کچھ لکھیں مگر بغیر اس کے لفظوں سے مفہوم ادا نہ ہوگا۔

شعر اصغر | جلوۂ ذوق پرستش۔ گرمیٔ حسن نیاز ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

اعتراض نیاز | اس شعر میں بھی (ردیف) بیکار ہے اور (ہے) حذف کرنے سے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا علاوہ اس کے معنوی نقص یہ ہے کہ کعبہ کے لئے جلوۂ ذوق پرستش لائے ہیں اور بتخانے کے لئے گرمیٔ حسن نیاز۔ حالانکہ نیاز و پرستش میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے جو کعبہ و بتخانہ ایسی دو متضاد چیزوں کے امتیاز کو ظاہر کر سکے اسی کے ساتھ لفظ حسن کا استعمال بھی ذوق کے مقابلہ میں درست نہیں۔ حسب ذیل تغیر سے یہ شعر بلند ہو سکتا ہے ؎

ذوق خالص ہے یہاں اُن ذوق کی صورتگری ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

عرض عشرت | آپ کا اعتراض ہے کہ ردیف بیکار ہے مگر جب آپ اصلاح دینے لگے تو آپ نے بھی وہی غلطی کی۔ بندہ پرور ردیف بیکار نہیں ہے۔ زور دینے کے لئے (ہے) کا لفظ دہرایا گیا ہے۔ ورنہ اس کے حذف کرنے سے جیسا کہ آپ لکھتے ہیں اس کے حذف کرنے سے بھی مفہوم پورا ہو جاتا ہے مگر آپ نے (Emphasis) کے نکتہ کو سمجھنے میں ہمیشہ غلطی کی ہے۔ دوسرا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ کعبہ و بتخانہ دو متضاد چیزیں ہیں مگر اصغر صاحب کی نگاہ بلند میں کعبہ و بتخانہ بالکل یکساں چیزیں ہیں کیونکہ دونوں جگہ اُسی خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ اس لیے دونوں کے لئے یکساں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس لئے آپ کی اصلاح لایعنی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی اصلاح میں ایک فاش غلطی ہے۔ آپ نے لفظ (واں) وہاں کے معنے میں استعمال کیا ہے جو مدت ہوئی اُردو غزل میں متروک ہو چکا ہے۔

شعر اصغر | ہے تقاضا ترے جلوہ کی فراوانی کا ہمہ تن دید نہیں تجھ کو سراپا دیکھیں

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ کا کوئی ایک سا لحرظ مفہوم پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دونوں میں ربط

اس لیے نہیں ہے کہ سراپا دیکھنے کے لئے ہمہ تن دید بن جانا بالکل غیر ضروری ہے۔ علاوہ اس کے جلوہ کی فراوانی تو اس امر کی مقتضی ہے کہ ہمہ تن دید بننے کے بعد بھی تکمیل نظارہ نہ ہو سکے۔ لفظ (تقاضا) بھی بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ میرا مشورہ اس شعر کے متعلق یہ ہے ؎

ہے یہ عالم ترے جلوہ کی فراوانی کا ہمہ تن دید ہوں پھر بھی نہ سراپا دیکھیں

عرض عشرت | دوسرے مصرعہ کے دونوں ٹکڑوں میں سے کوئی غیر ضروری نہیں ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ سراپا دیکھنے کے لیے ہمہ تن بالکل غیر ضروری ہے مگر یہ غلط ہے معشوق کو ایک ہی وقت سے سر سے پیر تک دیکھ لینے کے لئے ہمہ تن دید بننا لازمی ہے۔ آنکھ ایک وقت میں معشوق کے ایک مقام پر پڑے گی اس لئے معشوق کا سراپا دیکھنا بالکل ناممکن ہے۔ ہاں اگر ہمہ تن دید بن جائے تو البتہ معشوق کو سراپا یک وقت دیکھ سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ لفظ 'تقاضا' کا استعمال بے محل ہے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ مفہوم شاعر یہ ہے کہ معشوق کے جلوہ کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مجھ کو سراپا دیکھنا چاہتے ہو تو ہمہ تن دید بن جاؤ مگر خدا جانے آپ کیا سمجھ کر لفظ (تقاضا) کو بے محل سمجھتے ہیں۔ دوسری بات آپ یہ لکھتے ہیں کہ "جلوہ کی فراوانی تو اس امر کی مقتضی ہے کہ ہمہ تن دید بننے کے بعد بھی تکمیل نظارہ نہ ہو سکے" اس لئے آپ نے اصلاح دی ہے "ہمہ تن دید ہوں پھر بھی نہ سراپا دیکھیں" آپ کی عبارت میں دو باتیں قابل دید ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کو لفظ (تقاضا) پر اعتراض ہے مگر مطلب ادا کرنے کے لئے آپ اُسی لفظ کی دوسری شکل (مقتضی) استعمال کرتے ہیں۔ یعنے مفہوم شاعر ادا کرنے کے لئے آپ بھی وہی لفظ استعمال کرنے کے لئے مجبور رہیں۔ دوسری بات آپ جلوہ کی فراوانی کے بارے میں تکمیل نظارہ نہ ہو سکنے کی لکھتے ہیں اور اسی پر آپ کی اصلاح کا دارومدار ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ جس طرف آپ اشارہ اور جس کے لئے آپ اصلاح کی زحمت اُٹھا رہے ہیں وہ بات کنایۃً شعر میں پہلے ہی موجود ہے۔ کنایہ یہ ہے کہ معشوق کو سراپا دیکھنے کے لئے ہمہ تن دید بن جانے کی شرط ہے اور انسان کا ہمہ تن دید واقعۃً بن جانا ناممکنات سے ہے۔ اس لئے تکمیل دید بھی ناممکن ہے۔ مگر جو بات کنایہ میں کہی گئی تھی اُسے آپ نے بالصراحت بیان کی حالانکہ ادب لطیف کے لئے ضروری ہے کہ جہانتک ممکن ہو وہ کنایات اور اشارات پر مبنی ہو مگر شاید آپ ادب کے اس مسلم الثبوت اصول کی پروا نہیں کرتے۔

شعر مغز | ساقیا جام بہ کف پھر ہو ذرا گرم نوا حسن یوسف۔ دم عیسےٰ۔ ید بیضا دیکھیں

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں ساقی سے خطاب کر کے دو باتوں کی فرمائش کی جاتی ہے ایک یہ کہ جام بہ کف ہو اور دوسرے یہ کہ گرم نوا ہو حالانکہ لفظ (ہو) صرف ایک جگہ واقع ہے خواہ اُس کو جام بہ کف سے متعلق کیجئے یا گرم نوا سے۔ جام بہ کف ساقی کی صفت ہو نہیں سکتی کیونکہ حرف ندا اس کے بعد موجود ہے۔ اگر ساقی

جام بکف کیا جاتا تو یہ تعلق باقی نہ رہتا۔

عرض عشرت: آپ کے تمام اعتراض اس پر مبنی ہیں کہ آپ اصغر صاحب کے مصرعہ کی نثر نہیں کرسکے گو کہ اسکول میں چوتھی جماعت کا معمولی لڑکا بھی اس میں فیل نہیں ہوسکتا۔ سُنئے۔ پہلے مصرعہ کی نثر یوں ہوئی "ساقیا جام بکف ذرا گرم نوا ہو" یعنے اے ساقی (تو) ذرا جام بکف گرم نوا ہو" دوسرے لفظوں میں۔ مثلاً ساقی ہاتھ میں جام لے کے ذرا پھر نغمہ سرائی کر" دوبارہ اس جملہ میں ہو لکھنا حماقت ہے اور اس پر اصلاح دینا حماقت در حماقت۔

شعر اصغر: عبث ہے دعوئ عشق و محبت خام کا اُن کو　　یہ غم دیتے ہیں جس کو جو ہر قابل سمجھتے ہیں

اعتراض نیاز: دوسرا مصرعہ مفہوم کے لحاظ سے ناقص ہے کیونکہ (یہ غم) کے بعد جب تک (اُسے) کا اضافہ نہ کیا جائے معنے پورے نہیں ہوتے۔

عرض عشرت: جس (اُسے) کی آپ ضرورت سمجھتے ہیں وہ اس جملہ میں محذوف ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ ان دونوں جملوں پر غور کیجئے (۱) ہم جس کو سمجھیں گے انعام دیں گے (۲) جس کو ہم بہتر سمجھیں گے اُس کو انعام دیں گے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے جملے میں سے اگر اُس کو نکال دیا جائے تو معنے میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا بلکہ ایک خوبصورتی پیدا ہوجاتی ہے۔ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ عمدہ شاعری تمام تر اشارات پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں جتنے الفاظ نکالے جاسکیں نکال ڈالے جائیں مگر شرط یہ ہے کہ معنی آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔

نعتیہ غزل

(جناب مولانا فیض اللہ صاحب فیض خضری تونسوی)

فدا ہے یوں مرا دل جلوۂ محبوب یزداں پر　　تصدق جس طرح کبک دری ہو ماہ تاباں پر

مرا رونا کبھی اے چشم تر خالی نہ جائے گا　　یہ آنسو میرے پانی پھیر دیں گے فردِ عصیاں پر

زلیخا دیکھ لیتی میرے یوسف کو تو یہ کہتی　　اسے ترجیح ہے دوچند حسنِ ماہِ کنعاں پر

مدینہ سے صبا لائی ہے بوئے گیسوئے احمدؐ　　عجب کیا اوس پڑ جائے چمن میں سنبلستاں پر

خدا پہونچائے گا جب ہند سے مجھ کو مدینہ میں　　کروں گا شکر کے سجدے درِ محبوبِ یزداں پر

سُنا ہے فیض تھی ساری خدائی تابع فرماں
کُھدا تھا نام شاہِ دیں کا کیا مہرِ سلیماں پر

نواب سلطان بہو صاحبہ

محل خاص حضرت نصیر الدین حیدر تاجدار اودھ

(جناب شیخ تصدق حسین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

نواب سلطان بیگم المخاطب بہ نواب سلطان بہو صاحبہ مرزا سلیمان شکوہ شہزادہ دہلی کی لاڈلی بیٹی اور حضرت شاہ عالم شہنشاہ دہلی کی پوتی تھیں۔ لڑکپن میں گھر والے پیار سے اُن کو بُوا سلطانہ بھی کہتے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ حضرت شاہ عالم کے دوسرے بیٹے نواب قدسیہ بیگم کے بطن سے تھے جو ایران کے شاہی صفویہ خاندان کی ایک رکن اور امامیہ مذہب کی پیرو تھیں۔ شہزادہ موصوف بھی اپنی ماں کے مذہب پر تھے۔ بعد بغاوت غلام قادر روہیلہ جس نے شاہ عالم کو نابینا کر دیا تھا سلطنت دہلی کی حالت ابتر ہوگئی۔ اگلا سا وہ تجمل اور احتشام نہ رہا۔ جہاں ہر طرف غنچہ و گل تھے وہاں نیرنگی زمانہ سے اب بالکل خار ہی خار دکھائی پڑتے تھے۔ جب ضروریات زندگی کے بھی لالے پڑے اور پریشانیوں نے ہر طرف سے نرغہ کیا تو شہزادہ نے بصد حسرت و یاس ترک وطن کا عزم کیا۔ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے کئی گوجر ملازم رکھے اور ایک گھوڑا سواری کے لئے اُن کے ساتھ کر کے دریا کے پار اُتار دیا اور خود بھی تاریکی شب میں کمند ڈال کر قلعہ کی بلند فصیل سے نیچے اُتر آئے۔ پھر ایک گوجر کی پیٹھ پر دریا عبور کر کے دوسری طرف آئے اور تیس کوس تک اُس برق رفتار گھوڑے پر چل کر داخل ریاست رامپور ہوئے۔ وہاں اُن کا بہت شاندار خیر مقدم ہوا۔ نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور نے خیمہ میں اتار کر گرانقدر نذرانہ پیش کیا جس سے کلفتیں دُور ہوگئیں اور سامان شاہانہ فراہم ہوگیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر لکھنؤ کا رُخ کیا اور صوبۂ اودھ میں داخل ہو کر تاکہ شہر لکھنؤ میں تکیہ بود علی شاہ کے قریب ایک باغ میں بہ جمعیت پانچہزار سوار و پیدل شاگرد پیشہ وغیرہ فروکش ہوئے۔ خیموں میں قیام کیا۔ مگر شہزادہ کی آمد نواب آصف الدولہ کے بار خاطر ہوگئی انھوں نے داخلہ شہر کی اجازت نہ دی کیونکہ چار سال قبل ۱۷۸۴ء میں شہزادہ کے برادر معظم مرزا جاندار شاہ عرف مرزا جواں بخت بھی دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے جن کی پنشن نواب آصف الدولہ نے نہایت فیاضی سے پچیس ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دی تھی مگر شہزادہ موصوف سے کچھ ایسے افعال ناروا سرزد ہوئے

تھے کہ آصف الدولہ کا آئینہ دل اُن کی طرف سے غبار آلود ہو گیا تھا جس پر اُنھوں نے لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے بنارس میں استقامت فرمائی۔

نواب آصف الدولہ خیال کرتے تھے کہ مرزا سلیمان شکوہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی کے ہوں گے اور اگر شہزادگان دہلی اسی طرح لکھنؤ میں آکر بستے رہے تو میری پوری آمدنی گذاروں اور پنشنوں کی نذر ہو جائے گی اس لئے نواب نے شہزادہ سے معذرت کہلا بھیجی کہ جو عہد نامہ میں نے سرکار انگریزی سے کیا ہے اُس کی رو سے بلا صلاح و مشورہ نواب گورنر جنرل فدوی حاضر خدمت نہیں ہو سکتا۔ آخر کار اکرام اللہ خاں نے اپنے بھائی تفضل حسین خاں نائب الریاست کو موافق کیا انھوں نے گورنر جنرل کو سمجھا بجھا کر اجازت ملاقات دلوائی۔ نواب نے شہزادہ کے قیام گاہ پر جا کر اُن کا استقبال کیا جو تخمیناً تین ماہ سے خیموں میں بسر کر رہے تھے۔ شہزادہ ایک کوہ پیکر ہاتھی پر متمکن ہوئے نواب حسب دستور وزیر اعظم خواصی میں بیٹھ کر مورچھل کو جنبش دیتے ہوئے بڑے جاہ و جلال سے لکھنؤ میں لائے۔ بنگلہ مرزا خلیل میں قیام ہوا جو قریب کوٹھی رزیڈنسی کنار دریا واقع تھا پھر جنرل مارٹین کی ٹیڑھی کوٹھی خرید کر اُس میں منتقل ہو گئے۔ اُس کے بعد لارڈ کارنوال گورنر جنرل لکھنؤ تشریف لائے تو اُن کی سفارش سے چھ ہزار روپیہ ماہوار بطور مصارف باورچی خانہ سرکار نواب اودھ سے مقرر ہوئے۔ خان زادہ خاں کو داروغگی ذات خاص تفویض ہوئی۔ شہزادہ موصوف تاریخ آمد سے تا سنہ جلوس شاہ زمن غازی الدین حیدر کمال اعزاز اور احترام سے لکھنؤ میں رہے جب نواب سعادت علی خاں مسند نشین ریاست ہوئے اور دولت خانہ قدیم تعمیر کردہ نواب آصف الدولہ کو چھوڑ کر عمارت فرح بخش جنرل مارٹن سے خرید کر اُس میں سکونت اختیار کی تو ہمسائیگی شاہزادہ کو خلاف داب شاہی سمجھ کر کوٹھی آمل صاحب کنار دریا متصل رزیڈنسی بمعاوضہ ٹیڑھی کوٹھی شہزادہ کو دی۔

نواب سعادت علی خاں و نواب غازی الدین حیدر خاں تا قیام بادشاہت بطریق وزیر اعظم حسب دستور قدیم پیش آیا کئے یعنی شہزادہ کو نذر دیتے تھے اور خلعت پہنتے تھے اور جب کبھی شارع عام پر شہزادہ ممدوح اور نواب موصوف کی سواریوں میں مڈبھیر ہو جاتی تھی تو نواب کی سواری کا ہاتھی ازراہ ادب بٹھا دیا جاتا تھا اور شہزادہ کا ہاتھی نکل جاتا تھا۔

۱۸۱۹ء میں جب نواب غازی الدین حیدر خاں شاہ اودھ قرار پائے تو شہزادہ سے مساویانہ ملاقات کے طالب ہوئے مگر اُنھوں نے اپنی شان برقرار رکھ کر اس طور سے ملاقات کی کہ شاہ غازی الدین حیدر کا غنچۂ دل کھلا کر رہ گیا اُن کا منشا دلی پورا نہ ہوا اُس روز سے جانبین کے دل ایسے مکدر ہو گئے

کہ نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

بعد قیام بادشاہت غازی الدین حیدر نے خیال کیا کہ میں بادشاہ کے منصب جلیلہ پر فائز ہوا ہوں اب خاندان تیموریہ سے رشتہ قائم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اُنھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر کو مقرر کیا کہ وہ مرزا سلیمان شکوہ کو رضامند کریں کہ وہ اپنی دختر سلطان بیگم کی شادی ولی عہد سلطنت نصیر الدین حیدر سے کر دیں بعض شہزادگان دہلی مقیم لکھنؤ راوی ہیں کہ اولاً شہزادہ نے یہ رشتہ قائم کرنے سے بوجوہ صاف انکار کر دیا۔ اُس پر اُن کی تنخواہ روک دی گئی جس سے سخت مالی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور گوناگوں مصائب کا چشمہ اُبل پڑا۔ شہزادے کے متعلقین و متوسلین کی تعداد کئی سو تھی ایک روز روپیہ کا ایسا توڑا ہو گیا کہ دستر خوان پر صرف بھُنے ہوئے چنے آئے اس پر شہزادہ اشکبار ہو گئے۔ آغا میر نے میر گلزار علی خاں رفیق الدولہ کو جو شہزادہ کے عقل کل تھے بہ طمع زر ہموار کیا انھوں نے شہزادہ کے محل خاص نواب نوازش محل کو نشیب و فراز سے باخبر کیا۔ بے زر بے پر ہوتا ہے آخر کار اپنی چہیتی اور دلنواز بیوی نواب نوازش محل اور مختار کے سمجھانے سے از راہ مصلحت و دور اندیشی رضامند ہو گئے۔

شادی بڑی دھوم دھام اور تکلفات شاہانہ سے ہوئی اس شادی سے غازی الدین حیدر کا غنچۂ دل باغ باغ ہو گیا۔ نواب سلطان بیگم کو سُسرال سے نواب سلطان بہو صاحبہ خطاب عطا ہوا اور پانچ کروڑ روپیہ مہر قرار پایا۔ بروقت شادی بجائے چھ ہزار روپیہ ماہوار گذارہ کے شاہ اودھ نے شہزادہ کے سات ہزار روپیہ ماہوار کر دیے اور جب دونوں سمدھیوں میں مساویانہ طور پر ملاقات ہوئی تو پانچ ہزار روپیہ اور اضافہ کر کے جملہ بارہ ہزار روپیہ ماہوار گذارہ کے کر دیے۔

نواب سلطان بہو نہایت مقبول صورت۔ خوش خلق اور پیکر شرم و حیا تھیں مگر میاں بیوی میں ہمیشہ ان بن رہی کبھی موافقت نہ ہوئی۔

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے۔ تاجپوشی سے ایک سال کے اندر ہی جون ۱۸۲۸ء میں خسر اور داماد میں چشمک ہو گئی۔ سبب یہ ہوا کہ شہزادہ کی ایک بیگم سرفراز محل نامی ایک لڑکی مانخاں کلاونت کی لے کر بطور اپنی بیٹی کے ناز و نعم سے پالی تھی اس کا نام قمر چہرہ تھا اُس کا مکھڑا واقعی چاند کا ٹکڑا تھا۔ جب وہ جوان ہوئی تو اُس کے حسن و جمال کا شہرہ سُن کر نصیر الدین حیدر اُس کے عاشق زار ہو گئے اور اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں اپنے وزیر اعظم کو شہزادہ کے پاس بھیجا کہ اگر آپ اُس کا نکاح مجھ سے کر دیں تو پانچ ہزار روپیہ ماہوار اور اضافہ کر دوں گا۔ شہزادہ نے باعث بدنامی

سمجھ کر کہ گھر گھر چرچا ہو گا کہ اپنی بیٹی پر خود سوت مسلط کردی قبول نہ کیا اس پر بادشاہ بہت چراغ پا ہوئے اور ایک روز جب شہزادے کے محلات اپنے باغ جا رہے تھے تو نصیر الدین حیدر نے ایک کٹنی کے ذریعے سے قمر چہرہ کی سواری نواب سلطان بہو کے محل میں اُتروا دی۔ شہزادہ نے خبر پاتے ہی اس امر کی فریاد ریذیڈنٹ سے کی اُنھوں نے نصیر الدین حیدر سے کہلا بھیجا کہ اس معاملہ میں آپ کی بڑی رسوائی ہو گی اور ہنگامہ عظیم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے بہتر ہو گا کہ آپ اس لڑکی کو فوراً واپس کر دیں۔ نصیر الدین حیدر نے قمر چہرہ کو سوار کر کے بھیج دیا اور ریذیڈنٹ سے یہ کہہ کر بات بنا دی کہ وہ اپنی ہمشیرہ نواب سلطان بہو کی ملاقات کو محل میں گئی تھیں یہ مجھ پر تہمت تراشی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ نصیر الدین حیدر نے اُن کے گذارہ سے مبلغ پانچہزار روپیہ جو بر وقت ملاقات مساویانہ مقرر ہوئے تھے تنخواہ سے کم کر دیے۔ جب قمر چہرہ شہزادہ کے یہاں واپس آئی تو اُنھوں نے اُس کے پیر میں بیڑیاں ڈال کر قید کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد شہزادہ کو لکھنؤ میں رہنا وبال جان ہو گیا اُنھوں نے اپنے سمدھی کرنل گارڈنر رئیس کاسگنج کو جن کی پوتی سوسین گارڈنر (Susanne Gardner) شہزادہ کے ایک بیٹے کو منسوب تھیں بلا بھیجا۔ کرنل موصوف لکھنؤ آکر شہزادہ کو کاسگنج لے گئے اور قمر چہرہ کو اپنی بیگم کی نگرانی میں کر دیا جو صوبہ بمبئی کے ایک مسلمان رئیس کی بیٹی تھیں۔ یہاں کرنل گارڈنر کے بیٹے جیمس گارڈنر پر قمر چہرہ کے حسن فسوں ساز کا ایسا جادو چل گیا کہ وہ اُسے لے اُڑے اور خفیہ طور پر الور جا پہونچے کرنل گارڈنر جو نہایت ہی شریف النفس انگریز تھے اس حرکت نازیبا کی وجہ سے اپنے بیٹے کی صورت سے بیزار ہو گئے۔ اُن کے خطوط کا بھی کبھی کوئی جواب نہ دیا۔ جیمس گارڈنر اور قمر چہرہ دو سال تک متواتر جنگلوں میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔ ایک روز جیمس گارڈنر نے اپنے باپ کو کشتی میں سوار دیکھ کر تہیہ کر لیا کہ یا تو آج عفو تقصیر کراؤں گا یا جان پر کھیل جاؤں گا چنانچہ وہ کشتی کے ساتھ مسلسل تیرتے رہے مگر کرنل گارڈنر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر کار جب اُنھوں نے دیکھا کہ جیمس گارڈنر بالکل شل ہو گئے ہیں اور عنقریب غرق آب ہوا چاہتے ہیں تو محبت پدری قوت ارادی پر غالب آئی۔ اُنھوں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کشتی پر بٹھا لیا اور خطا بھی معاف کر دی اس کے بعد جیمس گارڈنر کی شادی باقاعدہ قمر چہرہ کے ساتھ ہو گئی اور تین اولادیں بھی پیدا ہوئیں جن کے نام سلیمان۔ ولیم گارڈنر اور نوشابہ بیگم ہیں۔

اس واقعہ سے شہزادہ کو اور بھی زیادہ کوفت ہوئی اور کاسگنج کی سکونت ترک کر کے اکبر آباد

میں قیام اختیار کیا۔ اُن کی صاحبزادی نواب سلطان بہو مثل سابق اودھ میں مقیم تھیں اور یہاں تیر ستم کا
نشانہ بنتی رہیں۔ نصیر الدین حیدر نے اپنی تخت نشینی کا سالانہ جشن اکتوبر ۱۸۳۲ء میں بڑے تزک و
احتشام سے منایا تھا۔ اُس روز ایک یوروپین خاتون بیگمات شاہی کو دیکھنے کے اشتیاق میں
دولتسرائے سلطانی گئی تھیں اُن کا بیان ہے کہ میں بادشاہ کے خاص محل نواب سلطان بہو کو نہ دیکھ سکی
کیونکہ مجھے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ اُن پر عتاب شاہی نازل ہے اور وہ کسی محل میں اسیروں کی
طرح زندگی کے دن گذار رہی ہیں۔

دیگر مورخین نے بھی واقعات متذکرہ بالا کی تصدیق و تائید کی ہے مثلاً فانی پارکس
(Fanny Parkes) ایک فرانسیسی خاتون بہ سلسلہ سیاحت ہندستان ۱۸۳۱ء میں شہر لکھنؤ بھی آئی تھیں
وہ اپنے سفرنامہ میں تحریر کرتی ہیں کہ بیگمات شاہی اودھ کے کچھ اندرونی حالات مجھے ایک ایسے
شخص کی زبانی معلوم ہوئے جس نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ سردست یہ باتیں آپ اپنے تک رکھیےگا
اور کسی کو نہ معلوم ہونے پائیں ورنہ آپ کی اودھ سے واپسی پر اگر یہ پتہ چل گیا کہ یہ راز ہائے سربستہ
میں نے طشت از بام کئے ہیں تو اس کی پاداش میں میری جان پر بن جائے گی۔ وہ حالات یہ ہیں:۔

"ملکہ یعنے نواب سلطان بہو ہز رائل ہائینس (His Royal Highness) مرزا محمد سلیمان شکوہ
کی بیٹی ہیں جو موجودہ شہنشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کے حقیقی بھائی ہیں۔ شادی کے اول ہی روز
سے ملکہ صاحبہ کے ساتھ لاپروائی اور بے التفاتی برتی گئی اور مناسب برتاؤ بھی اُن کے ساتھ
نہیں کیا گیا۔ تھوڑے عرصہ قبل تک اُن کو صرف بیس روپیہ یومیہ یعنے چھ سو روپیہ ماہوار ملتے
تھے آج کل وہ دو ہزار روپیہ ماہوار پا رہی ہیں مگر محل کے باہر قدم رکھنے کی اُن کو مطلق اجازت
نہیں ہے۔ اُن کے خاندان کے کل قدیم ملازمین کو جواب دے دیا گیا ہے اور فی نفسہ وہ ایک نظربند
کی حیثیت سے ایام زندگی کاٹ رہی ہیں۔ نہ کبھی بادشاہ اُن کے پاس جاتے ہیں نہ بادشاہ کے کوئی
عزیز اور رشتہ دار نہ کسی دوسرے شخص کی مجال ہے جو اُن کی قیام گاہ کی طرف رُخ بھی کر سکے۔
اہلیہ رزیڈنٹ نے مجھ سے بیان کیا کہ ملکہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہیں ایسی حسین
وجمیل عورت میری نظر سے کبھی نہیں گذری ہے مجھے اُن کی ہمشیرہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور
ان کو دیکھ کر میں بہ آسانی یقین کر سکتی ہوں کہ ملکہ کی رعنائی و زیبائی بیان کرنے میں ذرہ
برابر مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی کتخدائی کو تخمیناً پانچ سال گذرے
ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کی زیادہ سے زیادہ سولہ یا سترہ بہاریں دیکھی ہوں گی۔

ملکہ کے والد محمد نواب آصف الدولہ سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ شاہ مرحوم غازی الدین حیدر نے اُن کو مجبور کیا کہ اپنی بیٹی کی شادی مرزا نصیر الدین حیدر اُن کے ولی عہد کے ساتھ کر دیں۔ مرزا سلیمان شکوہ کو پانچ ہزار روپیہ ماہوار بطور گذارہ ملتے تھے۔ اب اس رقم کی ادائی بھی رُکی ہوئی ہے اور ماہ جون ۱۸۲۶ء شاہزادہ موصوف کی ایسی توہین اور تذلیل کی گئی کہ وہ شہر لکھنؤ کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے خاندان تیموریہ کی یہ چشم و چراغ شہزادی بُوا سلطانہ اپنے باپ کے اس امر پر مجبور کئے جانے پر کہ وہ ان کی شادی نصیر الدین حیدر کے ساتھ کر دیں نہایت آزردہ اور برافروختہ ہیں اور بمقابلہ خود نصیر الدین حیدر کو اس قدر ادنیٰ اور کم ذات آدمی خیال کرتی ہیں کہ نہ وہ کبھی اپنے محل میں اُن کے آنے کی روادار ہوئیں نہ کبھی اپنے پلنگ پر انھیں قدم رکھنے دیا۔"

سلیمن صاحب رزیڈنٹ اودھ بھی نواب سلطان بہو کے بڑے معترف اور مداح تھے۔ اپنے سفرنامہ اودھ میں جو اُنھوں نے ۱۸۵۱ء میں مرتب کیا تھا اور جس میں ضبطی اودھ کی سفارش کی تھی وہ موصوفہ کی نسبت حسب ذیل تحریر کرتے ہیں:۔

"شاہ نصیر الدین حیدر کی شادی شہنشاہ دہلی کی پوتی سے ہوئی تھی یہ نوجوان شہزادی بلا کی حسین ہیں اور نہایت نیک سیرت بھی ہیں۔ اراکین خاندان شاہی اودھ نیز باشندگان لکھنؤ اُن کی بہت تعظیم و توقیر کرتے ہیں۔ دربار شاہی کا رنگ بگڑا ہوا دیکھ کر اُنھوں نے شادی کے بعد ہی سے عزلت گزینی اختیار کی اور اس وقت سے صرف تین سو یا چار سو روپیہ ماہوار کی قلیل رقم پر جو اُن کو شاہ اودھ سے ملتی ہے وہ گذارہ کر رہی ہیں۔"

ایک دوسرے مقام پر وہ موصوفہ کی نسبت حسب ذیل رقم طراز ہیں:۔

"وزیر اعظم کو ہمیشہ یہ ملحوظ خاطر رہتا تھا کہ بادشاہ سلامت کی محبوب ترین بیگم کو ترغیب و تحریص دے کر اپنا ہمخیال رہنوا بنائے رکھیں چونکہ بادشاہ کے محل خاص نواب سلطان بہو پر جو نہایت عظیم المرتبت اور والا دودمان شہزادی ہیں اثر جانا اور اُن کو اپنی مٹھی میں کر کے اُن کی ہمدردی حاصل کرنا محال تھا اس لئے اُن کے لئے یہ صورت پیدا کی گئی کہ وہ قصر سلطانی کی سکونت ترک کر کے اپنے شوہر سے علٰحدہ زندگی بسر کریں۔"

مرقومۂ بالا بیانات پڑھنے سے واضح ہو گا کہ گو مورخین میں بعض معاملات میں جزوی اختلافات ہیں مگر ان امور پر سب یک زبان ہیں کہ ملکہ کے ساتھ شروع ہی سے بہت ناروا برتاؤ کیا گیا۔ نہ مثل

دیگر محلات اُن کا بیش قرار وثیقہ مقرر ہوا نہ حسن سلوک سے اُن کی کبھی دلجوئی کی گئی بلکہ برعکس اس کے وہ زیر حراست رکھی گئیں۔ محل کے باہر جانے کی اُن کو مطلق اجازت نہ تھی۔ اُن کے قدیم ملازمین کو جو اُن سے ہمدردی کرتے تھے برخاست کر دیا گیا تھا اور کسی فرد بشر کی مجال نہ تھی جو اُن سے ملاقات کر سکتا۔

بیچارگی اور بے بسی میں مرزا سلیمان شکوہ نے اُن کی شادی جو نصیر الدین حیدر کے ساتھ کر دی تھی اس کا اُن کو دلی صدمہ تھا اور اپنی علو ہمتی سے ثابت کر دیا کہ گو باپ کی رضامندی جبر اور دباؤ سے حاصل کی جا سکتی ہے مگر بیٹی کی مرضی کسی قیمت پر بھی نہیں خریدی جا سکتی ہے۔ چنانچہ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے نصیر الدین حیدر کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ انھوں نے ملکہ کی طرف سے اپنا خیال ہٹا لیا۔ بعد میں اُن کو ایذائیں بھی پہونچائی گئیں۔ اُن کی سوتیلی بہن قمر چہرہ کو محل بنانے کی کوشش کی گئی مگر انھوں نے سب باتیں صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیں اور جس طرح دنیا میں آئی تھیں اُسی طرح کورے پنڈے کے ساتھ دنیا سے سدھار گئیں۔

۱۸۳۷ء میں بعد انتقال شاہ نصیر الدین حیدر جب بادشاہ بیگم صاحبہ نے مرزا فریدوں بخت عرف مُنّا جان کو خلاف منشاء گورنمنٹ محض اپنی ہماہمی اور زور زوری سے تخت اودھ پر بٹھانے کا تہیہ کیا تو راستہ میں حسن باغ[1] سے نواب سلطان بہو کو بھی اپنی مہم کو قوت پہونچانے کے لئے ساتھ لے لیا تھا مگر جیسے ہی بندوقیں چلنے لگیں اُن کی دو خادمائیں اُن کی پالکی لال بارہ دری کی بغلی صحنچی میں جا نب مغرب لے گئیں۔ ان میں سے ایک کا بازو چھروں سے بہت مجروح ہو چکا تھا مگر دوسری نے چند کپڑے باہم باندھ کر اُن کی مدد سے شہزادی صاحبہ اور زخمی خادمہ کو تخمیناً آٹھ گز کی بلندی سے نیچے صحن میں اُتار دیا جہاں سے اُن کے ملازمین اُن کو محلسرا واپس لے گئے اس طرح تینوں کی جانیں محفوظ رہیں۔ بارہ دری کے شمال رُخ دونوں پھاٹکوں میں سپاہی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور سوائے اس طریقہ سے واپس آنے کے اور کسی طرح جانبری نہیں ہو سکتی تھی۔

سلیمن صاحب کے متذکرہ بالا بیان میں اور سید کمال الدین حیدر مصنف تاریخ اودھ کے اس موقع کے بیان میں قدرے اختلاف ہے۔ آخر الذکر اس واقعہ کے متعلق حسب ذیل تحریر کرتے ہیں:-

[1] ملکہ حسن باغ میں رہتی تھیں یہ باغ ۱۸۵۷ء میں اُجڑ گیا۔ اور اُس کی عمارت بھی منہدم کر دی گئی۔ میڈیکل کالج کا بورڈنگ ہاؤس (Hardinge Bridge) کے پل کے اُس جانب اسی باغ کی آراضی پر تعمیر ہوا ہے اور جا بجا قدیم عمارت کے کھنڈر اب تک پائے جاتے ہیں۔

"جب لال بارہ دری میں ہنگامہ کارزار گرم ہوا تو سلطان بہو بیگم صاحبہ گھبرا کر پینس سے باہر نکل پڑیں اور بارہ دری کے پردے سے مثل گیند کے نیچے چلی آئیں ایک شخص نے اپنی گودی میں اُتار لیا پھر پینس میں سوار ہوئیں بموجب حکم صاحب سلامت اپنے حسن باغ میں چلی آئیں"

۱۸۵۷ء میں بعد مرزا برجیس قدر سلطان بہو لکھنؤ ہی میں مقیم تھیں۔ اُسی زمانہ میں شہزادہ فیروز شاہ پسر مرزا ناظم بخت نواسہ حضرت فرخ سیر بادشاہ دہلی مع دو سو سوار پانسو تلنگہ بہمراہی بخت خاں داخل لکھنؤ ہو کر ملکہ موصوفہ کے مکان میں بسبب قرابت کے فروکش ہوئے۔ سلطان بہو نے خوف زدہ ہو کر جناب عالیہ (والدہ برجیس قدر) سے کہلا بھیجا کہ مجھ کو اتنا مقدور نہیں ہے کہ ان کی خاطر خواہ تواضع کر سکوں۔ اُن کے قیام کے لئے دوسرا مکان تجویز ہونا چاہئے۔ چنانچہ حسن باغ کے قریب ایک دوسرا مکان تجویز ہوا شہزادہ اُس میں منتقل ہو گئے۔ حضرت محل والدہ برجیس قدر نے پانچ ہزار روپے دعوت کے بھیجے۔ جب باغی فوج لکھنؤ سے بھاگ گئی شہزادہ موصوف بھی سراسیمہ ہو کر بریلی چلے گئے۔

مرزا سلیمان شکوہ نے اکبر آباد میں بتاریخ ۲۴ فروری ۱۸۳۸ء فرشتۂ اجل کو لبیک کہا اُن کی لاش چھ ماہ تک وہیں رہی بعدہ بمقام سکندرہ اکبر کے مقبرہ میں دفن کی گئی اور اس پر سنگ مرمر کی قبر بنوا دی گئی۔

بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۸۳۷ء شاہ نصیر الدین حیدر کو بھی زہر دے کر عین عالم شباب میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اب اس ڈرامہ کی ہیروئن صرف سلطان بہو پردۂ دنیا پر رہ گئیں۔ بعد ضبطی سلطنت اودھ عملداری سرکار میں وہ بھی کربلائے معلے چلی گئیں اور عراق میں چند سال قیام کرنے کے بعد موت نے اُن کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا اور میٹھی نیند سُلا کر دنیا کی بکھیڑوں سے آزاد کر دیا۔ اُن کا متروکہ نواب اقبال الدولہ پسر شمس الدولہ نواب احمد علی خاں برادر زادہ شاہ غازی الدین حیدر نے پایا جو قبل سے عراق میں مقیم تھے۔

ارغنون دل

(جناب مفتی محمد رشید الدین صدیقی صاحب رشید اکبر آبادی - بی - اے - ایل ایل بی)

دل پُرخوں کو یہ تلقین! ترک آرزو کر دے
گلِ شاداب کیونکر ہا ئے قطع رنگ و بو کر دے

زبانِ شوق ایسی تیز، خونِ آرزو کر دے
تبسم اس قدر بیباک، زخمِ جاں رفو کر دے

زبانِ شوق کی لغزش، کہ شرح آرزو کر دے
نگاہِ ناز کی گردش، کہ ختمِ گفتگو کر دے

نگاہِ ناز کو ضد سی، کہ خونِ آرزو کر دے
تبسم کو اشارہ سا، کہ زخمِ جاں رفو کر دے

ہر آفت سے نڈر، جو لئے گل ہے، فطرتاً بلبل
قفس میں ظاہرا ترکِ تلاشِ رنگ و بو کر دے

نہ مرہم نہ یہ تسلی ہے۔ نہ شور افشاں تبسم ہے
الٰہی کوئی میرے زخمِ پنہاں کا رفو کر دے

یہ بلبل آتشِ غم سے قفس میں کیوں پھنکے؟ یارب!
اگر برباد ہی کرنا ہے۔ گل کے روبرو کر دے

لگا دی آگ ظالم نے گلستاں کو نشیمن کو
قفس کو بھی مجھے بھی بھسم۔ یہ سوزِ گلو کر دے

رفوئے زخمِ جاں سے عقلِ سوزن کار عاجز ہے
بھرم رہ جائے، چاکِ جیب و دامن کا رفو کر دے

بہار افزا ہو کیفیت، اگر اس چشم میگوں کی
نسیم و لالہ و گل کو، مے و جام و سبو کر دے

چمن زادو! قفس میں باہمی پیکار، کیا معنے؟
وہ ایکا ہو، کہ آزاد فضائے رنگ و بو کر دے

تبسم میں، تکلم میں، یہ جادو ہے، کہ وہ کافر
گل و بلبل کو صحنِ باغ میں باہم عدو کر دے

یہ صحرائے بلا خیز و، تلاشِ منزلِ لیلےٰ
الٰہی قیس کو، خوش کامِ کیفِ جستجو کر دے

غزل کے پردۂ نازک میں گم ہے ارغنون دل
مبادا نار برہم ختمِ بزمِ ہاؤ ہو کر دے

رشید مبتلا روزانہ شغل گریہ کرتا ہے
نمازِ عشق کیونکر ہو؟ اگر ترکِ وضو کر دے

نظرے خوش گذرے

النا ظر کی بے وقت اشاعت کے لیے بار بار معذرت کرتے ہوئے بھی ندامت ہوتی ہے مگر حالات گردوپیش سے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یہ پرچہ وسط جولائی کے بجائے اگست کے تیسرے ہفتہ میں شائع ہوگا اور بجائے اس کے کہ جولائی سے ماہ بماہ اشاعت کا انتظام ہوتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ کو وقت پر لانے کے لیے ابھی ایک دو مشترکہ نمبر اور شائع کرنا ہوں گے۔

ارزاں ایڈیشن کا سلسلہ اب بند کر دیا جائے گا کیونکہ ادھر چند ماہ میں کھرا کاغذ بہت گراں ہو گیا ہے۔ جن اصحاب سے قیمت وصول کی جا چکی ہے اُن کے لئے تو اُس وقت تک ضرور کھرے کاغذ کا پرچہ چھپے گا جب تک اُن کی قیمت بیاق نہ ہو۔ البتہ آئندہ جن صاحب کی میعاد ختم ہو جائے وہ ارزاں ایڈیشن کے لئے چندہ نہ ارسال فرمائیں بلکہ اگر بار سالانہ کی ادائی کا تحمل ہو تو معمولی سفید کاغذ کے پرچہ کے خریدار بن جائیں۔

سفید کاغذ بھی گراں ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کانپور کے مشہور رسالہ زمانہ تک کو چکنے سفید کاغذ کی جگہ کھرا کاغذ لگانا پڑا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو ہمیں بھی مصارف کم کرنے کے لئے موجودہ انتظام میں کچھ تبدیلی کرنا ہوگی۔ خواہ حجم میں کمی کرنا پڑے یا کاغذ کم قیمت کا لگایا جائے۔

ملک میں بہت سے اہل علم ایسے ہیں جو اپنی فرصت کے اوقات خاموشی کے ساتھ علمی و ادبی خدمات میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ انھیں میں ہمارے مکرم جناب مولوی حافظ عطا حسین صاحب ایم اے، سی ای، سابق ناظم تعمیرات ریاست حیدرآباد دکن ہیں جنھوں نے حال ہی میں نہایت آب و تاب سے سلطان دکن حضرت خواجہ گیسو دراز قدس سرہ العزیز کی قابل قدر کتاب "خاتمہ" جو نشئہ کی تصنیف ہے تصحیح و تحشیہ کے بعد پہلی بار طبع کراکے شائع فرمائی ہے۔

قلمی کتابوں کی تصحیح اور طبع و اشاعت کوئی آسان کام نہیں۔ مولوی سید عطا حسین صاحب نے ان سب مراحل کو بخوبی طے کیا اور شروع میں ۴۴ صفحے کا قابل قدر دیباچہ اضافہ کیا ہے جس میں حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور اس کتاب کے خصوصیات کا ذکر ہے جس کے لئے

صاحب ممدوح لائق شکریہ و مبارکباد ہیں۔

تصوف میں حضرت شیخ ابو النجیب سہروردی کی کتاب آداب المریدین بڑے پایہ کی تصنیف ہے حضرت خواجہ نے اپنے عہد کے لوگوں کی ضروریات و حالات کو پیش نظر رکھ کر فارسی میں اُس کے مطالب کی وضاحت کے لئے متعدد شرحیں لکھی ہیں اور انھیں شروح میں سے ایک کے سلسلہ میں "خاتمہ" کی تصنیف ہوئی۔ اس کے مضامین بھی طالبان حق اور سالکان طریقت کے لئے آداب المریدین کی طرح نہایت نافع ہیں۔

ہندستان میں عربی فارسی کا مذاق کم ہوگیا ہے اس لئے بعض لوگ تصوف یا دیگر علوم کی کتابوں کے متن مع ترجمہ کے شایع کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں "خاتمہ" کا ترجمہ بھی اگر آخر میں شامل کردیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔

خاتمہ کا حجم ۲۸۰ صفحہ، کاغذ، طباعت سرورق سب دیدہ زیب قیمت عہ
ملنے کا پتہ:- مولوی سید عطا حسین صاحب۔ محلہ لنگم پلی۔ حیدر آباد دکن

حسن انتخاب

(مولفہ سید مظہر علیم بی۔ اے۔ علیگ)

لکھنؤ و دہلی کے اساتذہ کی جگر کاویوں مضمون آفرینیوں اور زبان آوری کا بہترین اور نہایت دلچسپ و دلکش مرقع ہے۔ اگر آپ کو میر و سودا، مومن خاں و مصحفی۔ انشاء و جرأت، ناسخ و آتش۔ غالب و ذوق۔ داغ و امیر کے مکمل دیوان پڑھنے کی مہلت اور فرصت نہیں ہے تو کم از کم اُردو ادب سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کو ضرور پڑھئے۔ ان اساتذہ کے کلام کا عطر ہے اور ہر شعر جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ ملک کے اہل الرائے نے بہترین رائیں اس کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے یہ شعر اس انتخاب پر بالکل صادق آتا ہے

رنگینیاں جو حسن ازل کی تھیں جابجا سب کھنچ کے آگئیں نگہ انتخاب میں

قیمت مع محصول ڈاک ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:-

کتب خانہ رشیدیہ دہلی یا مولف سے حبیب گنج ضلع علیگڈھ سے طلب کریں

بنام خداوند جان آفرین

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ درین

(تاریخ اجراء الناظر ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

جلد ۴۴	جولائی و اگست ۱۹۳۷ء	نمبر ۱ و ۲

فہرست مضامین

چندہ سالانہ عہ

قیمت بلا فی پرچہ

کتب خانہ

میں حسب ذیل اُردو کتابوں کی ضرورت ہو تو ہم سے طلب فرمائیے۔ ادبی کتابوں کا اتنا عمدہ اور بڑا ذخیرہ ہندوستان بھر میں کہیں یکجا نہیں کیا گیا۔ قدردانوں کی توجہ سے ذخیرہ کو اور ترقی ہوگی۔

تاریخ ادب

- تاریخ زبان اُردو ۱۲ر
- تاریخ ادب اُردو لعہ
- تاریخ نثر اُردو (حصہ اول) صہ
- دکن میں اُردو ۶ر
- اُردو کے اسالیب بیان ۱۲ر
- شعر العجم ۵ حصے لعہ
- سیر المصنفین ۲ جلد ۱۲ر
- مرحوم دہلی کالج ۱۲ر
- خطبات گارسن دی تاسی ۱۲ر
- شعر الہند ۲ حصے عہ
- تاریخ ادبیات ایران للعہ
- عربی ادب کی تاریخ ۸ر

ادب و شاعری

- مقدمہ شعر و شاعری ۱۲ر
- موازنہ انیس و دبیر سے
- نیرنگ خیال ۲ حصے ۱۲ر
- ایشیائی شاعری عہ
- مباحثہ چکبست و شرر ۶ر
- ہماری شاعری ۶ر
- جدید اردو شاعری ۶ر
- نقد الادب ۶ر
- روح تنقید ۱۲ر
- مراۃ الشعر سے
- مثنویات ۱۲ر
- دو میرزا ۱۲ر
- شرح دیوان غالب طباطبائی ۶ر
- ″ ″ حسرت موہانی عہ
- ″ ″ نظامی بدایونی ۶ر
- ″ ″ آسی سے
- ″ ″ بیخود دہلوی ۶ر
- ″ ″ سہا ۶ر
- شرح کلام غالب ۶ر
- غالب اور اسکی شاعری ۶ر
- محاسن کلام غالب عہ
- اقبال ۶ر
- بزم خیال عہ
- حسن خیال عہ
- مشاہدہ سخن ۲ حصے ۶ر

شعرا و مصنفین

- حیات انیس ۶ر
- یادگار انیس ۶ر
- حیات دبیر ۲ جلد للعہ
- یادگار نسیم ۶ر
- یادگار غالب سے
- بہادر شاہ ظفر ۱۲ر
- طرہ امیر ۱۲ر
- تذکرہ رند ۴ر
- حیات حالی ۸ر
- حیات داغ ۸ر
- حیات النذیر سے
- سوانح مولانا روم ۶ر
- حیات سعدی ۱۲ر
- خیام سے
- حیات حافظ ۱۲ر
- حیات جامی ۸ر
- حیات خسرو عہ
- تذکرہ حزیں ۴ر
- البیرونی ۶ر

تذکرے

- آب حیات سے
- ارباب نثر اُردو ۶ر
- تذکرہ آب بقا ۶ر
- تذکرۃ الخواتین ۱۲ر
- تذکرہ کاملان رامپور سے
- تذکرہ خندۂ گل للعہ
- تذکرہ مشاہیر کاکوری سے
- خمخانہ جاوید جلد سوم سے
- ″ ″ جلد چہارم صہ
- سخن شعرا ۱۲ر
- گل رعنا صہ
- نگارستان فارس سے
- ہندو شعرا ۱۲ر
- (بزبان فارسی)
- تذکرہ اردو میر حسن ۶ر
- نکات الشعرا (میر تقی) ۶ر
- چمنستان شعرا (شفیق) صہ
- گلشن بیخار (شیفتہ) ۱۲ر
- مخزن نکات (قائم) ۱۲ر
- مخزن شعرا ۱۲ر
- تذکرہ گردیزی ۱۲ر
- تذکرہ ہندی (مصحفی) ۶ر
- ریاض الفصحا ″ ۱۲ر
- تذکرہ گلزار ابراہیم ۶ر
- مجموعہ نغز (قاسم) سے

خطوط

- اردوئے معلی ۶ر
- عود ہندی ۸ر
- ادبی خطوط غالب ۶ر
- خطوط سرسید سے
- مکاتیب محسن الملک عہ
- مجموعہ مکتوبات آزاد ۶ر
- مکاتیب شبلی ۲ جلد سے
- خطوط اکبر ۱۲ر
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
- مرقع ادب ۲ جلد سے
- عورتوں کی انشا عہ
- انشائے ہادی النسا ۱۲ر
- انشائے بشیر ۱۲ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بنام خداوند جان آفریں

الناظر لکھنؤ

جلد ۴۴ نمبر ۱ و ۲ جولائی و اگست ۱۹۳۷ء

عربوں کی خانگی زندگی

(مترجمہ جناب مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے، پروفیسر تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

[ایک مضمون "مدینۃ السلام" اس رسالہ میں اس سے قبل شائع ہو چکا ہے "عربوں کی خانگی زندگی" اسی المانوی مستشرق، فون کریمر، کی کتاب کے ایک دوسرے باب کا ترجمہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مصنف کے ہر بیان کو ناقابل تردید مان لیا جائے، اور نہ اس نظر سے اس ترجمہ کو پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن تصویر کا ایک رُخ یہ بھی ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ غور طلب رُخ ہے۔ مترجم]

کسی قوم کی تہذیب و معاشرت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اُس قوم کی عورتوں کی معاشری اور معاشی حالت پر غور کیا جائے۔ اگر عورت کو پورے قانونی حقوق حاصل ہیں، اور وہ معاشرہ میں مردوں کے مساوی درجہ رکھتی ہے، تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اُس قوم نے تہذیب و تمدن میں بہت ترقی کر لی ہے۔ مگر یہ مساوی درجہ محض اس وجہ سے نہ ہو کہ وہ چند بچوں کی ماں ہے، اس لیے اُس کی عزت و توقیر کی جاتی ہے، بلکہ وہ درحقیقت گھر کی ملکہ ہے، اہل خاندان پر اُسے پورے اختیارات حاصل ہیں، اور اپنے خاوند اور دوسرے خاندان والوں کی صرف بے دام کی لونڈی ہی نہیں، بلکہ اصلی معنوں میں اپنے خاوند کی شریک زندگی اور ممد و معاون ہے۔ اگر یہ حالت کسی قوم میں پائی جائے اور خانگی زندگی میں مساوات ہو تو ہم فوراً اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ اس قوم میں

نہایت اعلیٰ درجہ کی معاشرت اور تہذیب موجود ہے۔ تاریخی نظر سے دیکھا جائے تو کوئی قوم مشکل ہی سے اس قسم کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کی مثال پیش کر سکتی ہے جیسی کہ عربوں کی قدیم روایات میں پائی جاتی ہے۔

عربوں کے انتہائی عروج کے زمانے میں عورت نہ صرف مردوں کے پہلو بہ پہلو مساویانہ درجہ رکھتی تھی، بلکہ اُس کا اتنا احترام کیا جاتا تھا کہ فروسیت کی تاریخ دنیا کے کسی حصہ میں ویسی مثالیں پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن جب سیاسی تنزل شروع ہوا، تو اس انحطاط کے ساتھ معاشری حالات بھی خراب ہوتے چلے گئے، اور پھر حرم کی زندگی سے عورت کی عزت میں کمی آتی گئی۔ آخر رفتہ رفتہ عہد قدیم کی اعلیٰ اخلاق رکھنے والی، آزاد منش، ارادے کی پکی عورت، جسے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا، ناپید ہوتی چلی گئی، اور اُس کی جگہ ایسی عورت نے لی جو حرم میں قیدی کی حیثیت رکھتی تھی، اور سوائے بناؤ سنگار اور بیکار گفتگو کے اُس کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ وہ دن رات عیش و عشرت میں گذارتی تھی، اور اُس کی زندگی کا یہی واحد مقصد رہ گیا تھا کہ سامان تعیش مہیا ہو تو محض گڑیا کی طرح قیمتی لباس میں ملبوس، اور زیورات سے لدی رہے، اور اسی طرح اپنی تمام زندگی اسی شغل میں گذار دے۔ پرانے عہد کی شرم و حیا رفتہ رفتہ رخصت ہو گئی۔ زمانۂ مابعد کی عورت خوبصورت ضرور ہوتی تھی، مگر بالکل کندۂ ناتراش؛ وہ باعصمت ہوتی تھی، مگر اس خیال سے نہیں کہ وہ اُسے بڑی پارسائی سمجھتی ہو، بلکہ محض اس لئے کہ وہ کسی اور طرح کی زندگی گذارنے پر قادر ہی نہ تھی؛ عام طور پر نہ وہ خوددار تھی اور نہ عصمت و عفت کے صحیح معنی سمجھتی تھی۔ اسلام کے قرون اولیٰ یا عرب جاہلیت کی عورت اور زمانۂ مابعد کی عورت کا جب ہم مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں میں کس قدر زبردست تفاوت معلوم ہوتا ہے!

قبیلۂ مُرّہ کے طاقتور شیخ حارث بن عوف نے شادی کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ تمام عرب میں کوئی ایسا شیخ بھی ہے کہ میں اُس کے ہاں شادی کا خواستگار ہوں اور وہ میری درخواست رد کرنے کی ہمت کرے۔ دوست نے جواب دیا: "ہاں بیشک ہے۔" یہ سُن کر حارث کو غصہ آ گیا، اور اُس سے پوچھا: "وہ کون ہے؟" دوست نے کہا: "قبیلۂ طے کا اوس بن حارثہ۔" اس پر حارث بن عوف نے فوراً اپنے غلام کو حکم دیا کہ دو اونٹ سفر کے لیے تیار کرے اور اپنے دوست کو ساتھ لے کر اُس کی طرف روانہ ہو گیا، اور اُس کے پاس پہنچا۔ اوس نے ان کی خاطر مدارات کی، اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ حارث نے جواب دیا کہ

مَیں تیرے ہاں شادی کرنے کا خواستگار ہوں " اَوس نے جواب دیا کہ " اگر یہ ارادہ ہے تو تم غلط جگہ آئے ہو " یہ کہہ کر وہ غصہ کی حالت میں گھر کے اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی قبیلہ عبس سے تھی۔ اُس نے اَوس کو اس غصہ کی حالت میں دیکھ کر پوچھا کہ " یہ اجنبی کون تھا، جس سے تم اس قدر بے رخی اور کج خلقی سے پیش آئے ہو " اَوس نے کہا کہ " وہ اس تمام نواح کا سب سے زیادہ معزز شخص حارث بن عوف ہے، اور ہمارے ہاں شادی کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ لیکن میں نے اُسے سخت جواب دے کر واپس کر دیا ہے " اس فہمیدہ عورت نے اپنے بدخلق خاوند کو بہت لعنت ملامت کی کہ وہ ایک قبیلے کے نامور شیخ کے ساتھ اس قدر ترش روئی سے پیش آیا، اور آخر کہہ سُن کر اُسے اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان دونوں اجنبیوں کے پیچھے جائے، اور سمجھا بجھا کر انھیں واپس لے آئے۔ اَوس فوراً گیا، اور تھوڑی ہی دور پر اُنھیں جا لیا۔ اُس نے اُن سے استدعا کی کہ وہ اس کے ساتھ واپس چلیں، اور اس کی مہمانی قبول کریں۔ یہ دونوں بھی راضی ہو گئے۔ اَوس نے واپس آکر پہلے تو اپنے مہمانوں کی خاطر و مدارات کی فکر کی، اور اُن کی تمام ضروریات پوری کرنے کے بعد اپنی تینوں بیٹیوں سے گفتگو کی۔ پہلے اُس نے سب سے بڑی بیٹی کو بُلا یا، تمام حالات بیان کیے، اور پوچھا کہ وہ حارث بن عوف سے شادی کرنے پر راضی ہے یا نہیں۔ لڑکی نے جواب دیا: " اول تو میں خوبصورت نہیں، پھر مجھ میں بہت سی کمزوریاں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ خواستگار نہ میرا برادر عم زاد ہے اور نہ ہمسایہ کہ وہ تیری ہی وجہ سے میری عزت کرے۔ اگر اُس کا دل مجھ سے پھر گیا، اور اُس نے مجھے چھوڑ دیا تو یہ بے حرمتی بھی مجھے برداشت کرنی پڑے گی " یہ سُن کر اَوس نے بیٹی کو دعا دی اور کہا کہ تو سچ کہتی ہے۔ اب اُس نے منجھلی بیٹی کو بُلایا، اور وہی تجویز اُس کے سامنے پیش کی۔ اُس نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔ وہ اب اپنی چھوٹی بیٹی بہیسہ سے مخاطب ہوا۔ اُس نے کہا کہ " ہاں۔ میں خوبصورت بھی ہوں، خانہ داری سے بھی واقف ہوں، قد کی لمبی ہوں، اور حسب نسب کے لحاظ سے شریف ہوں۔ اس پر بھی اگر میرا خاوند مجھے چھوڑ دے تو خدا کی اُس پر لعنت ہے " باپ نے جواب دیا کہ " بیٹی خدا تجھے خوش رکھے، تو سچ کہتی ہے " یہ فیصلہ کر کے اَوس اپنے مہمان کے پاس گیا اور کہا کہ " میں اپنی بیٹی بہیسہ کے ساتھ تیری شادی کرتا ہوں "

اب شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا گیا، اور تمام رسمیں مکمل ہو گئیں تو اَوس نے دُلہن کو دُلہا کے خیمہ میں پہونچا دیا۔ لیکن جب حارث بن عوف خیمہ میں داخل ہونے لگا تو دُلہن مانع ہوئی اور کہا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہاں ماں باپ اور بہنوں کی

موجودگی میں رات بسر ہو۔ حارث ناکام واپس ہوا اور روانگی کا حکم دیا۔ فوراً خیمے اکھاڑے گئے، اونٹوں پر لاد دیے گئے، اور یہ چھوٹا سا قافلہ واپس روانہ ہوا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد رات گذارنے کے لیے قیام ہوا۔ حارث نے اپنی دلہن کے پاس جانے کی پھر کوشش کی، مگر اس دفعہ بھی ناکام رہا۔ بہیسہ نے کہا کہ "کیا تو نے مجھے اپنی زرِ خرید لونڈی یا اسیرِ جنگ سمجھا ہے؟ تو میری صورت اُس وقت تک نہیں دیکھ سکتا جب تک کہ تو اپنے قبیلے میں واپس نہ پہونچ جائے؛ ولیمہ نہ ہو؛ اونٹ اور بکریاں ذبح نہ کی جائیں؛ اور قبیلے کے لوگوں کی دعوت نہ ہو۔"

اس پر قافلہ آگے روانہ ہوا، یہاں تک کہ حارث اپنے قبیلے میں پہونچ گیا۔ ولیمہ کی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ دلہن کے حکم کے مطابق اونٹ اور بکریاں ذبح ہوئیں، اور مہمانوں کی دعوت کی گئی۔ یہ شرط پوری کرنے کے بعد حارث نے پھر اپنی دلہن کے پاس جانا چاہا۔ مگر بہیسہ نے اُسے پھر روک دیا اور کہا کہ "عورتوں سے دل بہلانے کا یہ کون سا وقت ہے؟ تمام عرب کشت و خون میں مبتلا ہیں، اور ایک دوسرے کو کھائے جا رہے ہیں، اور عبس اور ذبیان تو بالکل فنا ہو چکے ہیں۔ پہلے تو فوراً اُن کی طرف جا۔ قبائل میں صلح کرا، اور پھر اپنی دُلہن کے پاس آ، جو تیرے انتظار میں گھڑیاں گنتی ہوگی۔"

حارث ان دونوں قبائل کے پاس گیا۔ اس کی کوشش سے ان میں صلح ہوئی۔ طرفین کے مقتولین گنے گئے۔ ان کے خون بہا کا فیصلہ ہوا، اور جس قبیلے کے زیادہ لوگ کام آئے تھے اُن زیادہ مقتولین کا خون بہا ادا کیا گیا۔ خود حارث نے دیت کے تین ہزار اونٹ پیش کیے، اور وعدہ کیا کہ یہ اونٹ تین سال میں دے دیے جائیں گے۔

یہ کام کر کے جب وہ واپس ہوا تو اُس کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی۔ اب اُس کی بیوی بہیسہ نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اُس کے بطن سے حارث کی بہت سی اولاد ہوئی۔[۱]

اس دل آویز حکایت کی تاریخی سند ہمارے پاس نہیں۔ لیکن اس کی سادگی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عرب جاہلیت کی یادگار ہے، اور اُس زمانے کی روایات کے بالکل مطابق ہے۔

اس حکایت سے عرب عورت کی حقیقی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے، اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس عہد میں عورت کو کیا سمجھا جاتا تھا۔ گو یہ سخت غلطی ہوگی کہ ہم اسے تاریخی اہمیت دیں، اور اسے واقعہ سمجھ لیں، لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس روایت میں عرب کی بہترین عورت کو پیش کیا گیا ہے۔

---

[۱] اغانی - ج ۹ - ص ۴۹ - ۱۵۱ -

اغلب یہ ہے کہ یہ حکایت پہلی یا دوسری صدی ہجری میں بیان کی گئی ہوگی، کیونکہ اسی عہد میں عرب جاہلیت یا بدویوں کے متعلق ایسی حکایات سے لوگ شام کے وقت اپنا دل بہلاتے تھے۔ یہاں تک کہ دمشق اور بغداد کے درباروں میں بھی ان حکایات کو خاص طور پر پسند کیا جاتا تھا۔

جن صفات کا عورتوں میں ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا، اور جن سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مردوں کا دل موہ لیتی ہیں، وہ صرف یہی نہیں تھیں کہ عورت حسین ہو، بلکہ شرافت نسبی، فہم و فراست، تہذیب و سلیقہ مندی، ارادہ کی پختگی اور بلند نظری بھی عورت کی صفات میں شمار ہوتی تھیں۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال حضرت ابوبکرؓ کی نواسی عائشہ بنت طلحہ کی ہے۔ یہ اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ حسین اور خوددار بی بی سمجھی جاتی تھیں۔ وہ پردہ میں رہنا پسند نہیں کرتی تھیں، اور ان کے خاوند مصعب بن زبیر اس وجہ سے انھیں ہمیشہ ملامت کرتے رہتے تھے۔ مگر وہ کہتی تھیں کہ "اللہ نے مجھ پر خوبصورتی کی مُہر لگا دی ہے، اور مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ مجھے دیکھیں اور صانع حقیقی کی صنعت پر عش عش کریں۔ میں اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالتی کیونکہ بخدا اس میں کسی طرح کا نقص نہیں ہے۔" اُدھر سے ملامت اور ادھر سے اصرار آخر اتنا بڑھا کہ خانگی جھگڑوں تک نوبت پہونچی، اور چونکہ عائشہ ارادے کی پکّی اور مزاج کی تیز تھیں اُنھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ابھی میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہی تھے کہ ایک مرتبہ مصعب جنگ پر روانہ ہوئے اور فتحیاب واپس آئے۔ عائشہ مدت سے قطع تعلقات کی تلخی محسوس کر رہی تھیں، اور دوبارہ ملاپ کی اتنی خواہشمند تھیں کہ اب ان سے نہ رہا گیا۔ اُنھوں نے اپنی ایک آزاد کردہ کنیز سے اس کا ذکر کیا، اور اُس نے مشورہ دیا کہ ملاپ کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا کہ ان کے شوہر مظفر و منصور جنگ سے واپس آئے ہیں۔ لہذا عائشہ ان کے پاس چلی گئیں، اُنھیں فتح کی مبارکباد دی، اور اُن کے چہرے اور زرہ سے گرد جھاڑنے لگیں۔ مصعب نے کہا کہ "میرے زنگ آلود ہتھیاروں کی بدبو تمھیں ناگوار گذرے گی۔" عائشہ نے جواب دیا کہ "یہ بدبو مجھے مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔"

مصعب عائشہ کے دوسرے شوہر تھے، اور اُنھوں نے پانچ لاکھ درہم بطور مہر انھیں دیے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد عائشہ نے بنی تیم کے ایک نہایت ہی دولتمند اور شریف شخص سے تیسرا نکاح کیا۔ اس نے پندرہ لاکھ درہم مہر دیا، اور اس کے علاوہ ایک لاکھ درہم بطور نذرانہ پیش کیے۔ اس تیسرے خاوند کے بعد بھی وہ زندہ رہیں، بلکہ اُنھوں نے اُس کا مرثیہ بھی کہا اور اُس میں

عہد کیا کہ اب وہ شادی نہ کریں گی[1]۔ عورتوں کی یکے بعد دیگرے متعدد شادیوں کی مثالیں شاذ نہیں، اور ایسی عورتیں نہ تو مورد الزام ہوتی تھیں، اور نہ قابل فضیحت۔ ایک اور مثال لیجئے۔ عاتکہ مکہ کے ایک شریف ترین خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھوں نے بھی یکے بعد دیگرے تین نکاح کئے۔ تیسرے شوہر کی موت پر جب مکہ کے ایک شریف شخص نے نکاح کا پیغام دیا تو جواب ملا کہ وہ اب چوتھے شوہر کے بعد بھی زندہ رہنا نہیں چاہتیں[2]۔ ان کے تینوں خاوند جنگ میں کام آئے تھے۔ اس لئے لوگ کہا کرتے تھے کہ جسے بہشت میں جانے کی جلدی ہو وہ عاتکہ سے شادی کرے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عورت شادی کے معاملے میں بالکل آزاد تھی، اور بلا کسی رکاوٹ کے شوہر کا انتخاب کرسکتی تھی۔ بلکہ ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ سفاح عباسی کی ایک بیوہ نے اپنی مرضی سے ایک ایسے معمولی شخص سے شادی کرلی تھی، جو باوجود نہایت شریف النسب ہونے کے بہت مفلس تھا[3]۔ پہلی شادی میں اس عورت کو دولت ملی تھی وہ بھی اپنے ساتھ لائی۔ لیکن آخر الامر اس نے اپنے نئے خاوند سے قطع تعلق کرلیا، کیونکہ اسے شبہ ہوگیا تھا کہ اس نے اس کی ایک لونڈی سے تعلق پیدا کرلیا ہے۔

اسی قسم کی ایک اور مثال سکینہ کی ہے۔ یہ حد درجہ کی حسین وجمیل تھیں۔ انھوں نے بھی یکے بعد دیگرے متعدد نکاح کیے، اور خاص بات یہ ہے کہ نکاح کی ایک شرط ہمیشہ یہ ہوا کرتی تھی کہ ان کی آزادی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ تیسرے نکاح کے موقع پر انھوں نے یہ شرط بھی کی تھی کہ وہ اپنے افعال واعمال میں پوری پوری آزاد رہیں گی، اور ان کا خاوند ان کی ہر بات بلا چون چرا مانے گا۔ مگر انھوں نے اپنی تلون المزاجی سے خاوند کی زندگی تلخ کردی، اور اس نے آخر انھیں طلاق دے دی۔ اس کے بعد سکینہ نے چوتھا نکاح کیا، اور اس کا بھی یہی انجام ہوا[4]۔

مذکورۂ بالا واقعات سے ہی ظاہر ہے کہ مردوں اور عورتوں کے میل جول میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ عورتیں بلا تردد اپنے مرد ملاقاتیوں کا اپنے گھر میں استقبال کرتی تھیں۔ یہ بھی ضروری نہ تھا کہ ملاقاتی قریبی عزیز ہی ہوں، بلکہ ایسے اجنبی بھی ہوا کرتے تھے، جن سے کوئی رشتہ نہ ہوتا[5]۔ وہ ضرورت کے وقت گھر سے باہر جاتی تھیں، اور انھیں اس کا بھی حق تھا کہ فریضۂ نماز ادا کرنے کے لئے

---

[1] اغانی۔ ج ۱۰۔ ص ۵۴۔ آخر [2] اغانی۔ ج ۱۶۔ ص ۱۳۲ [3] ایضاً [4] اغانی۔ ج ۴۔ ص ۸۹۔
[5] اغانی۔ ج ۱۴۔ ص ۱۶۱،۱۷۰ [5] اغانی۔ ج ۱۹۔ ص ۱۶۱۔

پنج وقتہ مسجد میں جائیں[۵۱]۔ یہ رسم تیسری صدی ہجری میں ترک ہوئی۔ اسی طرح وہ اپنا شوہر خود ہی منتخب کر سکتی تھیں، اور جب شوہر سے ناخوش ہوں اُس سے علٰحدگی بھی اختیار کرتی تھیں۔ اس معاملے میں بھی قدیم فقہا کی رائے بالکل صاف ہے کہ بیوی خریدی نہیں جا سکتی، اور وہ تحائف جو بیوی کے والدین یا قریبی عزیز اُسے دیتے تھے، وہ سب اُس کی ملکیت تصور ہوتے تھے[۵۲]۔ اس کے علاوہ فقہا نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ شادی کے وقت بیوی یہ شرط کر سکتی تھی کہ اُس کی زندگی میں شوہر نہ تو دوسرا نکاح کرے گا اور نہ کسی اور عورت کو گھر میں ڈالے گا۔

اوپر جو مثالیں دی گئیں وہ اُن عورتوں کی ہیں جن کا تعلق نہایت ہی اعلےٰ خاندانوں سے تھا۔ اس کی ضرورت نہیں کہ خاص طور پر ایسی مثالیں پیش کی جائیں جن سے اُن عورتوں کا درجہ واضح ہو جو کم درجے کے طبقے سے تھیں، کیونکہ اُن کے حقوق و فرائض بھی اونچے درجہ کی عورتوں سے کم نہ تھے۔ وہ بھی انھیں کی طرح آزاد تھیں، اور ہر لحاظ سے اس قابل تھیں کہ اپنا ذاتی کاروبار اور دوسرے امور متعلقہ بلا شرکت غیرے چلا سکیں[۵۳]۔ صرف فرق یہ تھا کہ قدرتی طور پر خانہ داری کا تمام بار اُن پر تھا۔ مفلس کسان کا جھونپڑا ہو، یا خانہ بدوش بدو کا خیمہ، شہر کے اوسط درجے کے باشندوں کے گھر ہوں یا مزدوروں کے مکان، ان میں عورتوں کو جو اختیارات حاصل تھے، وہ شاید عمائد کے محلوں میں بھی عورتوں کو میسر نہ تھے۔ جہاں صاحب خانہ ایک عورت سے بددل ہو کر کسی دوسری کو تلاش کرتا تھا، اور پہلی کو بالکل بھول جاتا تھا، مفلس اور اوسط درجے کے خاندانوں میں عورت گھر کی مالک ہوتی تھی۔ اُس کے اختیارات لامحدود تھے، اور اُس کے اقرار و تکرمت سے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ عہد ہارون الرشید کے شاعر ابوالعتاہیہ نے اپنی بیوی کی تعریف میں مبالغے سے کام نہیں لیا۔ وہ کہتا ہے:—

"میری گھر کی ملکہ کے بعد میرا غم و اندوہ ناپایاں ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کبھی یہ جدائی ختم بھی ہوگی یا نہیں؟ افسوس! میں تیار ہوں کہ اُس کے لیے دنیا کی تمام نعمتیں ترک کر دوں۔"

عہد اسلامی کے آغاز میں عورت کا موقف یہ تھا۔ مختصراً یوں کہنا چاہیے کہ اُسے اپنے اوپر پورا

۵۱ بخاری ۵۵۳، ۵۵۵، ۵۶۷۔　　۵۲ موطا۔ ج ۳۔ ص ۰۔

۵۳ گھر کی بیبیوں کا کام عام طور پر چرخہ چلانا تھا۔ ابوالعلاء المعری نے اپنے اشعار میں لکھا ہے: "کاتنا (غزل)، بننا (نسج)، اور زردوزی (زردن)" سیکھو۔ زردن کا ترجمہ یہاں میں نے زردوزی کیا ہے۔ مگر غالباً اس سے مراد کروشیا ہے۔ یورپ میں یہ فن سولھویں صدی میں پہنچا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ صنعت یورپ ہی میں پیدا ہوئی تھی یا ایشیا سے وہاں پہنچی تھی۔

اختیار حاصل تھا، اور اس کی عزت و توقیر میں کمی نہ تھی۔ بلکہ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ اُسے وہی درجہ حاصل تھا جو فروسیت کی عام کہانیوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ مرد عورتوں کی تعریف میں نہایت پرجوش گیت گاتے تھے، اور شاعری کا پورا زور ان اشعار میں ختم کر دیتے تھے۔ عہد جاہلیت کی روایات میں جو زیادہ تر شمالی عرب سے تعلق رکھتی ہیں۔ کوئی فرد بشر اُس شخص سے زیادہ شہرت و عزت کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا جو ہر قسم کے خطروں میں پڑ کر، بلکہ اپنی جان پر کھیل کر، اپنے قبیلے کی عورتوں کے ناموس کو بچائے، یا اُن پر قربان ہو جائے، اور اُنھیں غیروں کے ہاتھوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے۔ ان حکایات کے طرز بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راوی چاہتا ہے کہ سننے والے ہیرو کے قدم بقدم چلیں۔ ایسے مافوق العادت لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور عنترہ ہے جس کا ذکر شمالی عرب کی روایات میں فخر و مباہات سے کیا جاتا ہے۔ عنترہ نے اپنے قبیلے کی عورتوں کو دشمنوں کے اچانک حملوں سے تن تنہا محفوظ رکھا تھا۔ وہ ایک درے میں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا، اور دشمن کو وہیں روکے رہا، یہاں تک کہ قبیلے کی عورتیں محفوظ ہو گئیں۔ اُسے مہلک زخم لگا۔ مگر اُس نے ہمت نہ ہاری اور برابر اپنے گھوڑے پر جما ہوا، نیزہ پر سہارا لگائے درے کا راستہ بند کئے رہا، اور آخر اسی حالت میں جان دی۔ اس اثنا میں عورتیں قبیلے کے قیام گاہ تک پہنچ گئیں۔ لیکن دشمن کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اکیلے نوجوان پر حملہ کرے، یا اُس کے پاس تک پھٹکے۔ آخر جب گھوڑے نے جنبش کی اور عنترہ کی لاش زمین پر گر گئی تو اُنھیں معلوم ہوا کہ کس طرح عنترہ نے مرنے کے بعد بھی اپنے عزیز و اقارب کی حفاظت کی ہے۔

کسی عورت کو زخمی یا قتل کرنا بذات خود انتہا درجے کی شرمناک و رذیل حرکت سمجھی جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر جس زمانے میں بنی امیہ کی مخالفت کر رہے تھے تو اُن کے حکم سے ایک باغی کی بیوی کو قتل کیا گیا تھا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ ایک شاعر نے اپنی نظم میں انھیں لعنت ملامت کی اور آخر میں کہا کہ "قتل ہونا اور قتل کرنا ہم مردوں کا فرض ہے عورتوں کا کام صرف یہ ہے کہ خوبصورت لباس پہن کر دنیا میں جلوہ گر ہوں[1]"۔ ایک دوسرا شاعر اپنی بیوی کے متعلق کہتا ہے کہ "میں شوہروں کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی بیویوں کو مارتے ہیں۔ لیکن میں اگر اپنی زینب پر ہاتھ اُٹھاؤں تو خدا کرے کہ میرا ہاتھ سوکھ جائے۔ میں کس طرح اُس پر ہاتھ اُٹھا سکتا ہوں جب اُس سے کوئی قصور سرزد نہیں ہوتا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں اُسے بے قصور ماروں!

[1] ابن اثیر ج ۴۔ ص ۲۲۷ + کامل مبرد۔ ص ۵۰۳۔

زینب سورج ہے، اور دوسری بیویاں اُس کے مقابلے میں محض ستارے کی مانند ہیں۔ جب سورج نکلتا ہے تو اُس کی روشنی میں تمام ستارے آنکھ سے اوجھل ہوجاتے ہیں"۔ قرون اولیٰ کے قانون حرب میں اس کی صراحت تھی کہ دشمنوں کی عورتوں اور بچوں سے خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں، بدسلوکی نہ کی جائے، اور نہ انھیں قتل کیا جائے، سوائے اس صورت کے کہ جنگ میں اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف حصہ لیا ہو۔

معاشرہ میں عورتوں کا درجہ گھٹانے کی ناقابل رشک خدمت سب سے پہلے ترش خو اور متعصب فقہا نے انجام دی۔ یہ بات نہ تھی کہ یہ لوگ عورتوں کے حسن ولطافت سے بیگانہ تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ان کے حرم میں بھی حسین عورتوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن دنیا پر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انھیں تمام دنیوی نعمتوں اور عیش وعشرت سے قطعی نفرت ہے، اور انھیں دنیاداروں کی گنہگاری اور موجودہ نسل کی سبک سری اور ہرزہ سرائی ناپسند ہے۔ اسی وجہ سے قدیم ترین محدثوں نے چن چن کر ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں اکثر و بیشتر جہنم کا ایندھن بننے کے لئے پیدا کی گئی ہیں[2]۔ یہ ترش خو علما بالکل بھول گئے کہ مسلمانوں کی جنت میں ایسی حوریں ہیں جو بے انتہا حسین ہیں، اور جن کا حسن ہمیشہ برقرار رہے گا۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ ان کے بیانات اسلام اور عرب دونوں کی قدیم روایات سے دور ہیں۔

لیکن صرف اس قسم کے افسردہ دل گوشہ نشین علما کو یہ الزام دینا ٹھیک نہیں کہ انھوں نے اپنے اقوال واعمال سے مسلمان عورتوں کے معاشری موقف کو ایسا بدل دیا جیسا کہ آئندہ ہمیں نظر آتا ہے۔ اس تبدیلی کے اور بھی اسباب تھے۔ عورت کے معاشری موقف پر سب سے پہلا حملہ اس طرح ہوا کہ قدیم عرب شرفا رفتہ رفتہ فنا ہوتے چلے گئے۔ مکہ کے وہ شریف خاندان جو پہلی صدی ہجری میں حکومت کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے مسلسل جنگوں میں تباہ ہوتے چلے گئے۔ ان کی جگہ ایسے دوغلے خاندانوں کے نودولتوں نے لی جو نہ خاندانی لحاظ سے شریف کہے جاسکتے تھے، اور نہ تربیت اور خیالات کے لحاظ سے۔ اس کے علاوہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ قریبی رشتہ داروں کی مسلسل مصاہرت و مناکحت بھی اس خرابی کا باعث ہوئی ہوگی، اور اس وجہ سے پوری نسل خراب ہوتی چلی گئی۔ اس قسم کی شادیوں سے اولاد کی پوری جسمانی نشوونما پر ضرور اثر پڑا ہوگا۔ چنانچہ حضرت عمر کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ قریش کے ایک مجمع میں اُنھوں نے اُن کے چھوٹے قدوں کا

[1] ابن خلکان: قاضی شریح۔ ابن حمدون۔ ج ۲۔ ورق ۲۰۷۔ [2] بخاری۔ ۲۱۔ موطا ج ۱۔ ص ۳۳۷

ذکر کیا۔ انھیں جواب دیا گیا کہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اکثر شادیاں قریبی رشتہ داروں (یعنی چچا زاد بھائی بہنوں) میں ہوتی ہیں، اور یہی رشتے اس عیب کے ذمہ دار ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جہاں تک ہو سکے ایسے رشتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ ایک شاعر کسی شخص کے جسمانی توانائی کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا باپ اُس کی ماں کا برادر عمزاد نہ تھا[۱]"۔ اس کی سب سے اچھی مثال کہ بعض جسمانی کمزوریاں موروثی ہوتی ہیں رُتّہ کی ہے۔ یہ ایک عیب تھا کہ تقریر کے شروع میں مُنہ سے الفاظ نہ نکلتے تھے۔ یہ عیب شریف ترین خاندانوں کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا[۲]۔ اس قسم کا ہکلا پن وراثتاً خاندانوں میں چلا آتا تھا۔

بہرحال کچھ ہی کیوں نہ ہو، یقیناً دوسرے اسباب بھی تھے، جن کا ہم آئندہ ذکر کریں گے، جن سے تمام نسل کی جسمانی اور اخلاقی حالت میں ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ جن اعلےٰ مرتبت عورتوں کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اُن کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی۔ خلیفہ ہارون الرشید کی ذکی اور زیرک بیوی زبیدہ عربوں کی اعلےٰ نسل کی شریف، خود رائے، اور آزاد عورتوں کی آخری نمائندہ تھی۔ ان عرب شریف زادیوں کے اصلی جذبات کا اندازہ اُن اشعار سے ہو سکتا ہے جو ایک عورت حمیدہ کی طرف منسوب ہیں۔ اُس نے ضرورت زمانہ سے مجبور ہو کر کسی معمولی درجے کے آدمی سے شادی کر لی تھی۔ مگر شادی کے بعد وہ اپنے اور اپنے شوہر کے معاشری درجے کو نہ بھلا سکی۔ چنانچہ ایک ہجو میں اپنے شوہر کے متعلق کہتی ہے کہ:۔ "میری رگوں میں خالص عربی خون گردش کر رہا ہے، اور میں شریف ماں کی اولاد ہوں۔ لیکن میرا شوہر خچر ہے۔ اگر میرا بچہ شریف ہو تو جان لو کہ وہ میرا ہے، اور اگر خبیث ہو تو سمجھ لو کہ میرے خاوند کا ہے[۳]"۔

اس قسم کی آزاد اور خوددار عورتیں جلدی ہی کمیاب ہوتی چلی گئیں۔ نئے تمدن و تہذیب کی رو میں قدیم شریف خاندانوں کی بالآخر مکمل تباہی کا صرف یہی نتیجہ نہیں ہوا، بلکہ غضب یہ ہوا کہ آزاد خیال اور شریف عورتوں کی مانگ بھی کم ہو گئی۔ لہٰذا یہ نسل رفتہ رفتہ بالکل معدوم ہو گئی۔ قدیم روایات جن کی رو سے حسب و نسب کی شرافت تلافی کی جاتی تھی، خواب و خیال ہو گئیں۔ کسی زمانے میں صرف یہی نہیں دیکھا جاتا تھا کہ کوئی شخص باپ کی طرف سے شریف ہے، بلکہ ماں کی خاندانی شرافت کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن اب دوسرے خیالات کا دور دورہ تھا، اور شرافت کا

---

[۱] اصفہانی: محاضرات۔ ج ۱۔ ص ۲۰۷۔　[۲] ابن حمدون۔ ج ۱۔ ورق ۹۷۔ دیکھو لین کی عربی لغت لفظ رتہ۔

[۳] اغانی۔ ج ۱۳۔ ص ۱۳۰۔

معیار بالکل بدل گیا تھا - یہ تبدیلی آغاز خلافت میں نہیں ہوئی - اس وقت ناممکن تھا کہ کسی غیر معروف داشتہ عورت کا بیٹا، خواہ اُس کا باپ خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، باپ کا وارث بن سکے - بنی امیہ کے ایک خلیفہ نے اس کی کوشش کی تھی (کتاب ہذا صفحہ ۳۹۳ جلد اول) - مگر اُسے آخر یہ خیال ترک کر دینا پڑا تھا - شروع میں داشتہ عورتوں کی اولاد نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ لوگ ماں کے خاندان کو بالکل بھلاتے چلے گئے[۵] - ابتدائی زمانے میں برابر کے خاندانوں میں شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا، اور اس کی بڑی قدر تھی؛ مگر اب یہ کیفیت تھی کہ گھروں میں بیوائیں مطلق العنان حکمراں تھیں - منکوحہ بیویاں کسی طرح ان اخلاق سوز عورتوں کا جو مردوں کے دل موہ لینے کے فن میں طاق تھیں، کامیابی سے مقابلہ نہ کر سکتی تھیں - عیش و عشرت کے دلدادہ شوہروں کے لئے بھی ناممکن تھا کہ ان عورتوں کے ناز و ادا سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں، انھیں بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ ان کا وارث منکوحہ بیوی کا بیٹا ہو - اس میں شبہ نہیں کہ اس معاملے میں اسلامی قانون نے بھی ان کی مدد کی تھی - کیونکہ قانون کے مطابق نکاحی اور غیر نکاحی عورتوں کی اولاد میں کوئی فرق نہ تھا، اور نہ اس کا خیال رکھنا ضروری تھا کہ ماں شریف گھرانے سے ہے یا کمینہ - حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کا ذکر کرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا - کیونکہ اکثر خلفاء یونانی یا ایرانی لونڈیوں کے بطن سے تھے - اس قسم کی معاشری ابتری جوں جوں بڑھتی گئی "غیرت مند" شوہروں کے لئے ضروری ہوتا گیا کہ معلقہ بیویوں کی حفاظت زیادہ سختی سے کی جائے - دراصل یہ پہلا قدم تھا جس سے حرم کی ذلت آفریں زندگی کا آغاز ہوا - اسی زندگی نے ایشیا کی عورت کو اس درجے پر پہونچا دیا جس درجہ پر آج ہم اُسے دیکھ رہے ہیں - حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ان عورتوں کو بھی خدا کی طرف سے وہی قابلیت و صلاحیت ودیعت ہوئی ہے جو دنیا کی دوسری اقوام کی عورتوں کو - یہ ممکن نہیں کہ اتنی زبردست تبدیلی کا، جس نے ایک پوری قوم کی اخلاقی زندگی پر اتنا گہرا اثر کیا تھا، کوئی خاص وقت یا زمانہ معین کیا جا سکے - کیونکہ ایسی تبدیلیاں اس طرح بتدریج ہوتی ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ ایک زمانہ کب ختم ہوا، اور دوسرا کب شروع ہو گیا - بہرحال اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عورتوں کے معاشری موقف میں یہ تبدیلی اُس دور میں ہوئی جو بنی امیہ کی بربادی سے ہارون الرشید کے

[۵] ابن خلکان (ڈی سلین - ج ۲ - ص ۲۱۰) + دیکھو زین العابدین + کامل مبرد - ص ۲۹۹ +

عہد تک گذرا، اور اسی دور میں اس کی تکمیل بھی ہوگئی۔[1] اس کے بعد عورت بڑی حد تک کس مپرسی کی حالت میں حرم کی چار دیواری کے اندر، خواجہ سراؤں کے زیر نگرانی بند کر دی گئی، اور ہر جگہ، ہر طرف بیسواؤں، اغوا کرنے والوں اور خواجہ سراؤں کا دور دورہ ہو گیا۔ (باقی)

[1] اس معاشری انحطاط کی بہترین مثال یہ ہے کہ مامون نے ایک فرمان کے ذریعے نکاح المتعہ کو جائز قرار دیا تھا لیکن لوگوں کی سخت مخالفت کی وجہ سے فرمان واپس لینا پڑا۔ دیکھو ابن خلکان؛ یحییٰ بن اکثم + گولڈ زیہر۔ محمدانش سٹوڈین۔ ج ۱۔ ص ۱۲۴ +

جہانِ آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

رفعِ حجابِ رُخ کے بعد جلوہ پھر اک حجاب ہے
اُف یہ جھکی ہوئی نظر غیرتِ صد نقاب ہے

حُسن بھی اک شراب ہے عشق بھی اک شراب ہے
جس میں یہ دونوں ایک ہوں وہ دِرہ کامیاب ہے

سُرخیِ چشمِ اشکبار آتش زیرِ آب ہے
جوششِ غم میں جانِ زار ماہیِ دل کباب ہے

ذوق اگر ہے پائدار جذب ہے روکشِ بہار
منظرِ کائنات کو یہ نہ سمجھ کہ خواب ہے

ایک تسلسلِ بیاں جو کہیں ختم ہی نہیں
میری کتابِ شوق میں فصل نہ ہے نہ باب ہے

دل کا حقیر آئینہ وہ بھی شکستہ و خراب
عشق کی کائنات ہے حسن کا انتخاب ہے

نزہتِ رنگ و بوئے گل ہے وہ طلسم در طلسم
جس کی کتابِ حسن کا ہر ورق اک کتاب ہے

طالبِ راحت و سکوں موت سے اپنے منہ سے تنگ
برق و شرر سے پوچھ دیکھ زندگی اضطراب ہے

دیکھ کے تیرا پیچ و تاب ہاں یہی دل کا اضطراب
ایک طرف سوال ہے ایک طرف جواب ہے

کشمکشِ حیات و موت جزر و مد امید و بیم
رخ یہ ہوا کے رکھ نظر ہر نفس انقلاب ہے

لطفِ خلش تو اب کجا ذوقِ خلش بھی مٹ چکا
دردِ جگر سے کیا گیا حالتِ دل خراب ہے

اے نگہِ عتاب بس ردِّ عمل تو ہو گیا
خوفِ عذاب جیتے جی جان کو اک عذاب ہے

نازِ تلوّنِ مزاج ہونے نہ دے گا کامیاب
درس گہ نیا زمیں روز نئی کتاب ہے

ہو نہ ہلاکِ جستجو پیاس کو مار آرزو
آ نہ فریبِ شوق میں آب نہیں سراب ہے

ندرتِ فکرِ آرزو اُس پہ یہ قدرتِ بیاں
صبح میں ہے سوادِ شام شیب نہیں شباب ہے

حیاتِ نصیر

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے، پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

نمبر (۷)

زندگی کے آخری چھ سال اور امراض کا سلسلہ

منشی اظہر علی وکیل (خلف خان بہادر منشی اطہر علی مرحوم) مجلس واضعان قوانین ہند کے اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء میں ممبر منتخب ہوئے۔ انجمن اخوان الصفا کاکوری نے یکم نومبر سنہ ۳۰ء کو اس مسرت کے موقع پر مبارکباد کے لئے جلسہ کیا۔ قصبہ کے روسا شرفا جمع تھے بعض حکام ضلع بھی مدعو تھے۔ مولوی نور الحسن نے ایک نظم لکھی تھی جس کا پہلا شعر تھا۔

طبیعت بن گئی ہے جھومتے پھولوں کی اک ڈالی ۔۔۔ ہرے داتا ہوائیں چلتی ہیں متوالی متوالی

محفل میں نظم سناتے وقت مولانا کے ہاتھوں میں خفیف کپکپی پیدا ہوئی جو عوام کو محسوس نہ ہو سکی۔ مگر عزیزوں نے دیکھ لی۔ پہلے شک ہوا کہ رعب مجلس کا اثر ہے مگر اُن کی حیات کے پچھلے کارنامے پیش نظر تھے۔ معلوم تھا کہ اُن کو بچپن سے مجمع میں شعر خوانی کی مشق ہے۔ بھری عدالتوں میں دھواں دھار تقریریں کرنا اُن کا مدتوں پیشہ رہا ہے اور اس بزم کے حاضرین میں کوئی شخص ایسی وجاہت اور فضیلت کا موجود نہیں ہے جس سے مولانا مرعوب ہو سکیں لہذا اندیشہ ہوا کہ یہ رعشہ کسی بیماری کا پیش خیمہ ہے۔ چند روز کے بعد مرض کو ترقی ہوئی۔ اور ہاتھوں کی بے ارادہ جنبش۔ پاؤں کی لغزش نمایاں ہو گئی۔

معالجہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹری۔ یونانی اور ہومیوپیتھک طبیبوں کا علاج ہوا لیکن مرض کا ازالہ نہ ہو سکا۔ جس زمانے میں طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو صاحب فراش ہو جاتے تھے اور جب کسی قدر سکون ہوتا تو نثر و نظم کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ نماز کے لئے مسجد جامع میں حاضر ہوتے اور کبھی کبھی بھائی بہن سے ملاقات کے لئے محلہ باؤلی تک تشریف لاتے تھے۔ اسسٹنٹ کالکٹری کے فرائض سے سنہ ۱۹۳۰ء میں سبکدوش ہو چکے تھے۔ نور اللغات کی طباعت سے سنہ ۱۹۳۱ء میں فراغت ہو گئی۔ دن کا بیشتر حصہ اپنے خوردسال صاحبزادے مولوی طاہر حسن کی تعلیم و تربیت میں صرف فرماتے تھے اور بوقت فرصت شاگردوں کی غزلیات پر اصلاح دیتے تھے۔ ان تلامذہ میں قدیم ترین شیخ محمد اسمٰعیل رئیس[1]

---

[1] محمد اظہار حسن نام۔ محمد اسماعیل عرف عام۔ ابو شعیب کنیت۔ رئیس تخلص۔ خلف شیخ محمد ابراہیم فاروقی کاکوروی۔ کاکوری کے مشہور طبیب حکیم فضل علی کے قریبی رشتہ دار۔ ۸ر جولائی سنہ ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی کی تکمیل اپنے والد ماجد سے کی سنہ ۲۷ء سے دفتر ندوۃ العلما لکھنؤ میں ملازم ہیں۔ شعر گوئی کا نوعمری سے شوق ہے۔

تھے جو ۱۹۲۰ء میں شاگرد ہوئے تھے۔ استاد کا انداز اصلاح دکھانے کے لئے چند اشعار ایک غزل کے نقل کئے جاتے ہیں:۔

(۱) چشم تر دیکھ عیاں ہوتا ہے اب راز دروں ہائے بے وقت یہ دامن مرا نم ہوتا ہے

(اصلاح کے بعد)

چشم تر دیکھ عیاں ہونے لگا راز نہاں ہائے کس وقت یہ دامن مرا نم ہوتا ہے

(۲) پھر ہوا عشق مجھے ایک بت کافر سے پھر مری موت کا سامان بہم ہوتا ہے

(اصلاح کے بعد)

پھر مرے دل میں خیال بت کافر آیا پھر مری موت کا سامان بہم ہوتا ہے

(۳) نہ عنایت ہے نہ الطاف و کرم ہوتا ہے روز ایجاد نیا ایک ستم ہوتا ہے

(اصلاح کے بعد)

وہ عنایت ہے نہ وہ لطف و کرم ہوتا ہے روز ایجاد نیا اب تو ستم ہوتا ہے

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ چند الفاظ کے رد و بدل سے اشعار کا مرتبہ کس قدر بڑھا دیا۔ تلامذہ میں سے ایک سید محمد خورشید علی بقا[۵۱] ہیں جو پہلے منشی نورالدین کیفی کاکوروی سے اصلاح لیتے تھے اور اُن کے انتقال کے بعد مولانا کے شاگرد ہوئے۔

مولانا کی اصلاح کا طریقہ دکھانے کے لئے دو تین شعر ایک غزل کے جو ۷ رجون ۱۹۳۱ء کو شرف اصلاح سے مزین ہوئی تھی نقل کئے جاتے ہیں:۔

(۱) جگر بھی غیر ہوا دل بھی ہو گیا دشمن ہمارا کوئی محبت میں راز دار نہیں

دوسرے مصرعے پر اصلاح دی گئی۔ "کوئی کسی کا زمانے میں راز دار نہیں"

(۲) گلوں کی شکل میں داغ جنون اُبھرا ہے یہ پھول وہ ہیں جو شرمندۂ بہار نہیں

پہلے مصرعے پر اصلاح دی گئی۔

ہمارے داغ جنوں کو گلوں سے کیا نسبت یہ پھول وہ ہیں جو شرمندۂ بہار نہیں

(۳) ملی تھی آنکھ الٰہی وہ کون ساعت تھی کہ آج تک کسی پہلو مجھے قرار نہیں

---

۵۱ سید خورشید علی بن سید امجد علی ۲ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ کو پیدا ہوئے۔ "محمد خورشید علی" تاریخی نام ہے۔ آبا و اجداد کا وطن سندیلہ تھا۔ اس کے بعد صفی پور اور رانا ؤ میں سکونت رہی۔ اب تیس سال سے کاکوری وطن ثانی ہے۔ فی الحال کاکوری کے ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول میں مدرس ہیں۔ شعر و سخن سے ذوق ترقی پر ہے۔ اللّٰھم زد۔

پہلے مصرعے میں ایک لفظ ترمیم کر کے شعر کا پایہ بلند کر دیا۔

ملی تھی آنکھ وہ کم بخت کون ساعت تھی | کہ آج تک کسی پہلو مجھے قرار نہیں

تلامذہ میں سے ایک مولوی تحسین الدین[1] بی اے ہیں جو ۱۹۳۱ء میں شاگرد ہوئے۔ ان کے بھی چند اشعار سنئے :-

(۱) نظر کے سامنے رکھنا چمن کے ذرہ ذرہ کو | قفس میں اے تصور بس تجھی سے آسرا کچھ ہے

(اصلاح کے بعد)

نظر کے سامنے رکھنا کسی کے روئے روشن کو | قفس میں اے خیال یار تیرا آسرا کچھ ہے

(۲) اندھیری رات طوفاں خیز موجیں اور اکیلے ہم | نہ کوئی ناخدا باقی نہ منزل کا پتہ کچھ ہے

(صرف دو لفظوں کو تبدیل کیا)

اندھیری رات طوفاں خیز موجیں اور تنہا ہم | نہ کوئی ناخدا اپنا نہ منزل کا پتہ کچھ ہے

(۳) مریض غم کی حالت دیکھ کر یہ چارہ گر بولے | دعا ہی رہ گئی ہے اب اگر اس کی دوا کچھ ہے

(دوسرا مصرعہ تبدیل کیا گیا)

مریض غم کی حالت دیکھ کر یہ چارہ گر بولے | یہ بیمار محبت ہے بھلا اس کی دوا کچھ ہے

مرزا سکندر بیگ[2] قدر بھی مولانا کے شاگرد ہیں۔ چند اشعار ان کے بھی نقل کئے جاتے ہیں :-

---

[1] مولوی تحسین الدین بن حافظ حسین الدین علوی کاکوروی گریجویٹ ہیں اور ادب اردو سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ فروری ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ نوعمری سے شاعری کا شوق تھا۔ اپنے ماموں مولوی مقبول الدین علوی کی وساطت سے حضرت نیر کی خدمت میں رسائی ہوئی۔ اخوان الصفا کلب کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ طرح پر غزل لکھی اور مولانا کی خدمت میں برائے اصلاح پیش کی۔ مطلع تھا۔ وہ بھی مایوس اُٹھ گئے جن کا مسیحا نام ہے :: اب علاج درد دل کرنا بڑا ہی کام ہے۔ مولانا نے آخری مصرعے کا ایک لفظ تبدیل کر کے شعر کا لطف دوچند کر دیا۔ یعنی "اب علاج درد دل کرنا خدا کا کام ہے"

[2] مرزا محمد سکندر بیگ ولد مرزا صفدر بیگ ساکن بغل محلہ قصبہ کاکوری۔ ہنوز نوجوان ہیں تیس تیس سال کی عمر ہے۔ فارسی کی درسی کتابیں مولانا سے پڑھیں اور شاعری شروع کر دی۔ تصویرکشی میں بھی دخل ہے۔ نسلاً ایرانی ہیں اور ان خصوصیات کی طرف حسب ذیل رباعی میں اشارہ ہے :-

جلتے ہو مجھے اردو کا میں خاقانی ہوں | رشک بہزاد ہوں ہم مرتبۂ مانی ہوں

قدر بیر حکموں نہ کیوں مہر درخشاں ہوکر | نیر دہر کا اک خادم ایرانی ہوں

ان کا ایک شعر راقم کو بہت پسند ہے :-

تم نے وعدہ کیا کیا دونوں جہاں سے کھو دیا | زندگی دشوار تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

(۱) حسین تم کو بنایا ہے ہمارے دل کی شورش نے چمن کی ساری رنگینی ہمارے آشیاں تک ہے
(اصلاح کے بعد)
ابھی واقف نہیں ہے باغباں اس رازسے شاید یہ سب رنگینی گلشن ہمارے آشیاں تک ہے
(۲) زمانہ منقلب ہو لاکھ۔ الفت مٹ نہیں سکتی کلیجے میں دبی ہے آگ سینے میں دھواں تک ہے
(اصلاح کے بعد)
ہمارے سوز دل کا آپ کیوں انکار کرتے ہیں کلیجے میں لگی ہے آگ سینے میں دھواں تک ہے
(۳) سمجھتا ہوں نہیں ہوتا اثر ان پر مرے غم کا مرا مطلب ہو جانا بھی شغل رائگاں تک ہے
(اصلاح کے بعد)
سمجھتا ہوں نہیں ہوتا اثر ان پر مرے غم کا مگر جینے کی لذت میری سعی رائگاں تک ہے

(نوٹ) مندرجہ بالا غزل ۲۳ فروری ۱۹۳۵ء کو شرف اصلاح سے بہرہ مند ہوئی۔ مولانا معذور ہو چکے تھے اور اپنے قلم سے اصلاح نہ دے سکتے تھے۔ شاگرد اپنا شعر سناتا تھا اور مولانا فرما جاتے تھے کہ "اس طرح درست کر لو" یا "یہ لفظ تبدیل کر دو" غالباً یہی آخری غزل تھی جس کو استاد کی حذف و اثبات کی عزت نصیب ہوئی۔

علاوہ ان تلامذہ کے منشی ابرار حسین قدوائی۔ وفا تخلص۔ مضافات بارہ بنکی کے رہنے والے بائیس سال کی عمر میں ۷ مارچ ۱۹۳۲ء کو شاگرد ہوئے۔ ایک روز اصلاح کے لئے غزل لے کر حاضر ہوئے۔ مصرع طرح تھا ع "کیوں التجا کروں جو کوئی مدعا نہ ہو"
عرض کرنے لگے کہ علاوہ ان اشعار کے جو میں نے سنائے ہیں ایک مصرع اور کہا ہے مگر دوسرا مصرعہ مناسب ذہن میں نہیں آتا۔ ارشاد ہوا کہ مصرعہ سناؤ۔ عرض کی

تیر نگاہِ ناز الٰہی خطا نہ ہو

استاد نے فرمایا کہ دوسرا مصرعہ کیا مشکل ہے۔ لکھ لو

شرمندۂ نیاز تمھاری ادا نہ ہو

منشی عبدالسلام صفا بھی ضلع بارہ بنکی کے باشندے تھے۔ کاکوری میں عرصہ تک مقیم رہے۔ پہلے کیفی کے شاگرد تھے مگر بعد کو مولانا سے شعر و سخن میں اصلاح لی۔
منشی زاہد علی فنا کاکوری پرائمری اسکول میں ہیڈ مدرس تھے۔ عرصہ تک مولانا کے دولتکدے پر مقیم رہے اور شرف تلمذ حاصل کیا۔

حافظ شاہ اکرام علی قلندر کو شعر و سخن سے ذوق ہے اور مولانا کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ منشی سعید احمد نسیم۔ منشی مختار احمد قمر۔ مرزا امین بیگ بھی تلامذہ کی فہرست میں شامل ہونے کی عزت رکھتے تھے۔

منشی عبدالرفیع اثر مولف رسالۂ جمال و نیرنگ سودا مولانا کے عزیز اور ہم سن تھے مگر اپنا کلام اصلاح کے لئے خدمت اقدس میں پیش کیا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ گذشتہ جون (یعنی جون ۳۴ء) میں اُن کا انتقال ہوگیا اور اُن کی کوئی اصلاح شدہ غزل جامع اوراق کو دستیاب نہ ہوسکی۔

علاوہ مندرجہ بالا تلامذہ کے منشی اعجاز حسین اعجاز کاکوروی ثم اورنگ آبادی نے اپنی مثنوی "یادِ وطن" اور بعض غزلوں پر مولانا سے اصلاح لی۔ بعض شعرائے لکھنؤ بھی اپنا کلام اصلاح کے لئے لاتے تھے اور کاکوری کے مشاعروں میں حاضر ہوتے تھے مگر افسوس ہے کہ راقم کو اُن کے اسمار گرامی یاد نہیں رہے۔ اُستاد مرحوم کی زندگی میں اُن حضرات سے اکثر نیاز حاصل ہونے کا موقع ملا۔ لیکن اسم مبارک دریافت کرنے کی نوبت نہ آئی اور استاد کی وفات کے بعد انھوں نے کاکوری کو سرفراز نہ فرمایا۔ ان تلامذہ کا تو شمار نہیں ہوسکتا جنھوں نے اپنی دو ایک غزلیں یا نظمیں اصلاح کے لئے مولانا کی خدمت میں بذریعہ ڈاک کے روانہ کیں اور مولانا نے اصلاح کے بعد اُن کو واپس کردیا۔

ملک الشعرا منشی عبدالوحید نیرنگ مولانا سے عمر میں بڑے اور نثر نویسی میں بمنزلہ استاد کے تھے لیکن مولوی نور الحسن کے علم و فضل۔ زباندانی اور سخن فہمی کا ایسا گہرا نقشہ اُن کے دل پر تھا کہ اپنا دیوان اشاعت سے پہلے نظرِ ثانی کے لئے ان کے سپرد کیا۔ وہ مدت سے ریاست جھالراپاٹن میں اقامت گزیں تھے اور فرماں روائے ریاست کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے۔

پچیس برس کے بعد اپنے صاحبزادے منشی محب الرحمٰن کی شادی کرنے وطن آئے۔ مولانا نے اُن کی دلچسپی کے لئے ۷ر مئی ۱۹۳۳ء کو ایک بزم مشاعرہ اپنے دولت خانہ پر منعقد کی۔ کوٹھی تیار ہوچکی تھی اُسی میں محفل کا اہتمام ہوا۔ وسیع پیمانے پر دعوت تھی۔ علاوہ ارباب برادری کے لکھنؤ کے بعض معززین نے بھی قدم رنجہ فرمایا۔ راقم بھی کانپور سے طلب کیا گیا۔ مصرع طرح تھا۔ ع

ہمارے دل لگانے میں بھی ظالم مدعا کچھ ہے

زمین سخت تھی لیکن بعض اشعار خوب نکلے اور مشاعرہ کامیاب رہا۔ اُس وقت خیال نہ آیا کہ سب شعرا کی غزلیں جمع کرلی جائیں اور گلدستہ مرتب کیا جائے اب سخت کوشش سے صرف تین چار غزلیں دستیاب ہوسکیں اور انھیں کا انتخاب پیشکش ہے :-

کہوں کیا حال دل درد جگر کی انتہا کچھ ہے — اور اس پر یہ ستم دیکھو مرض کچھ ہے دوا کچھ ہے
بہت گل تو نے دیکھے ہیں بہت گلزار چھانے ہیں — خبر میرے گل رعنا کی بھی باد صبا کچھ ہے
کسی کو ان کے وعدے کا بھروسہ ہو تو کیونکر ہو — زباں پر کچھ ہے اور کہتی نگاہ فتنہ زا کچھ ہے
ظہور اب تک وہی غفلت رہی شغل مے و ساغر — خدا کا خوف بھی دل میں ترے مرد خدا کچھ ہے

منشی معراج الدین خسرو کی غزل بھی خوب تھی:۔

بت بیداد گر آخر تجھے خوف خدا کچھ ہے — جفا کی حد بھی ہے کوئی ستم کی انتہا کچھ ہے
یونہی کیا تشنہ لب در سے ترے ساقی پلٹ جاؤں — خم و جام و سبو میں دیکھ تو بہر خدا کچھ ہے
مری تقدیر جاگی ہے وہ میرے گھر میں آئے ہیں — اثر جذب وفا کا ان پر اب ہونے لگا کچھ ہے
کہاں تک امتحاں لیتے تمہارے عہد و پیماں کا — یہی ہم دیکھتے آئے کہا کچھ ہے کیا کچھ ہے
نگاہ ناز کچھ جیسی ہوئی ہے ماجرا کیا ہے — بیاں کچھ کر رہے ہیں آپ مجھ سے واقعہ کچھ ہے
لئے جاتے ہیں دل بے خوف بزم یار میں خسرو — اگر ہے تو ہمیں اندیشۂ دزد حنا کچھ ہے

استاد کی غزل حاصل مشاعرہ تھی:۔

سمجھتا ہے دل ناداں کہ میں نے کب کیا کچھ ہے — خدا جانے فرشتوں نے کہاں کیا لکھ لیا کچھ ہے
لحد پر تم نہ آنا فاتحہ بھی تم نہ دلوانا — بس اتنی یاد رکھنا اس کو ہم سے واسطہ کچھ ہے
دل درد آشنا کو کیا کوئی سمجھائے بھلا ناصح — محبت میں یہی ہوتا ہے یا اس کے سوا کچھ ہے
مٹا دی فرد میری داور محشر نے یہ کہہ کر — کریں کیا شافع محشر نے اس پر لکھ دیا کچھ ہے
سبھی ارماں ہوئے پورے سبھی تو حسرتیں نکلیں — مگر جب دیکھئے اس دل میں باقی حوصلہ کچھ ہے
وہ اس کوچے میں کیوں آئے جسے جاں اپنی دوبھر ہو — وہی آئے جسے جینے کا اپنے حوصلہ کچھ ہے
وہ ایسی ویسی شے منہ سے لگاتے ہی نہیں نیر — جنہیں جام مئے عرفاں کا چسکا پڑ گیا کچھ ہے

امراض کا سلسلہ نامتناہی جاری تھا۔ ضعف معدہ اور نزلہ وغیرہ کی قدیم شکایات عود کر آئی تھیں مارچ ۱۹۳۱ء میں کسی قدر سکون میسر ہوا تھا اور اپنے صاحبزادے مولوی طاہر محسن کی بزم عقد میں شرکت کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ بعد ازاں منشی عبدالوحید نیرنگ کے زمانۂ قیام وطن میں طبیعت کسی قدر درست رہی مگر ان کی واپسی کے بعد بیماریوں کا غلبہ ہوا اور ضعف بڑھنے لگا۔ بہ اصرار عزیزوں کے مشورے سے دہلی تشریف لے گئے اور حکیم نابینا صاحب دہلوی سے تشخیص مرض کی استدعا کی انہوں نے فرمایا کہ "آپ کی بیماریاں لغت کی تالیف کا ثمرہ ہیں۔ مولوی سید احمد ارمغان دہلی بھی ایسے

...اض کا شکار ہو رہے تھے۔ حکیم صاحب کی مجوزہ بیش قیمت دوا یہ خرید کر کے کاکوری لائے اور عرصہ تک استعمال کرتے رہے مگر کسی دوا سے دیرپا فائدہ نہ ہوا۔

نومبر ۱۹۳۳ء میں راقم الحروف طویل رخصت لے کر وطن آیا اور اپنے نو تعمیر کمرے میں بزم مشاعرہ کا اعلان کیا۔ مولانا پیادہ روی سے معذور تھے پالکی پر تشریف لائے۔ منشی معراج الدین خسرو اور شوکت تھانوی اڈیٹر سرپنچ نے بھی کرم فرمایا۔ مولانا نے غزل نہ لکھی تھی۔ غیر طرح کلام سنایا۔ شوکت تھانوی نے بھی اپنے دلفریب لحن سے غیر طرح غزلیں سنائیں اور حاضرین کو محظوظ کیا۔

دوبارہ جون ۱۹۳۴ء میں راقم نے وسیع پیمانے پر محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ لکھنؤ کے دو نامور شعرا مرزا جعفر علی خاں اثر اور منشی عبدالباری آسی شریک بزم ہوئے۔ قاضی خورشید احمد انسپکٹر مدارس نے کرم فرمایا۔ منشی معراج الدین خسرو نے رونق محفل دوبالا کی۔ مولانا بدستور معذور تھے۔ مرض کو اس قدر طوالت ہو چکی تھی کہ صحن محفل تک پالکی لائی گئی۔ مشاعرہ دلچسپ رہا۔ اور چار پانچ گھنٹے تک غزل سرائی ہوتی۔ خسرو کی غزل کا انتخاب نذر ناظرین ہے:-

اب کچھ امید اے دل اندوہگیں نہیں — میں کہہ رہا ہوں حال وہ اُن کو یقیں نہیں
اُن کی گلی میں جا کے طبیعت مچل گئی — ایسی نظر فریب کوئی سرزمیں نہیں
میں اُن سے عرض حال کروں کس اُمید پر — جن کی زباں پہ ہو برابر نہیں نہیں
ہستی کا میری غیروں کو ہے جیسے گماں — میں جانتا ہوں اس لئے مجھ کو یقیں نہیں
دل کی خطا ہے آنکھوں کا خسرو قصور ہے — ملزم گناہ عشق کا وہ نازنیں نہیں

چونکہ مرض سے استاد کی آواز خستہ تھی اس لئے اُن کے صاحبزادے مولوی طاہر محسن نے مولانا کی غزل پڑھی اور حاضرین بزم پر وجد کی کیفیت طاری کر دی:-

وعدے کرم کے لاکھ ہوں دل کو یقیں نہیں — طرز جفا یہ اور کہاں ہے کہیں نہیں
خفیہ شریک جرم رہی لطف کی نگاہ — تیرے گناہگار اکیلے ہمیں نہیں

حاصل مشاعرہ یہ لاجواب شعر تھا:-

دل کے غبار نے یہ بنا دی تھیں صورتیں — لیلیٰ ملی تو ناقہ و محمل کہیں نہیں

مقطع تھا:-

نیر تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے میخانے جاتے ہیں — جب پوچھئے تو کہتے ہیں حضرت کہیں نہیں

[illegible] کانگریس والوں نے امین آباد لکھنؤ میں دیسی مصنوعات کی نمائش کی

اُس کے متعلق ایک مشاعرہ بھی قرار دیا گیا۔ مولوی طاہر محسن نے مولانا کی طرف سے حاضرین بزم کو یہ غزل سُنائی :-

تم خوب بناتے ہو کہہ کر مجھے فرزانہ کیوں یاد دلاتے ہو بھولا ہوا افسانہ
اللہ مرے دل میں اب ہو کا یہ عالم ہے کعبہ نظر آتا ہے اُجڑا ہوا بت خانہ
دل اور جگر دونوں غیر وں سے کریں سازش اپنوں کی شکایت کیا بیگانہ تو بیگانہ
تم سنتے نہیں میری میں کس سے کہوں آخر اک بلبلِ شکستہ دل کی قصہ ہے نہ افسانہ
تم جاؤ نہ باتوں پر نیّر کو نہ سمجھو تھوڑا اللہ نہ چھیڑو اس کو دیوانہ تو دیوانہ

اسی زمانے میں حضرت ریاض خیرآبادی کے انتقال کی خبر آئی۔ مولانا سے قدیم شناسائی تھی اور ۱۹۲۲ء سے باہمی تعلقات بڑھ گئے تھے۔ سلسلۂ خطوکتابت جاری رہتا تھا۔ اس قدرشناس جوہرِ قابل کی رحلت سے مولانا کو سخت صدمہ ہوا۔ "ریاض عفا اللہ عنہ" تاریخ انتقال ارشاد فرمائی۔ اس کے علاوہ ایک بے نظیر تاریخ حسبِ ذیل شعر سے نکالی :-

ہر آنکہ زاد بہ ناچار بایدش نوشید ۱۲۳۷
زجامِ دہر مے کل من علیہا فان ۶۹۷

مولانا نے ۱۹۲۰ء میں اودھ کے نظائرِ قانون کا خلاصہ شائع کیا تھا جو اس وقت بہت مقبول ہوا تھا اب خیال آیا کہ اُس کا جدید ایڈیشن چھاپا جائے اور ۱۹۳۴ء تک جس قدر جدید نظیریں ہوئی ہیں وہ بھی شامل کردی جائیں۔

ہاتھوں میں قوت نہ تھی۔ دماغ محنت کا تحمل نہ کرسکتا تھا مگر اس خدمت کا آغاز کیا اور بڑی کوشش سے کتاب مکمل کی۔ مصارفِ طباعت کی فکر عرصہ تک دامنگیر رہی۔ بعض اعزا نے عرض کی

سلہ مولانا نے نور اللغات کی جلد پنجم مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ وہ الفاظ و محاورات جو قدیم فرامین۔ مثنویات و دواوین میں پائے جاتے ہیں اور نور اللغات میں درج نہیں ہوئے اس جلد میں فراہم کئے جائیں اور دکن کی جدید اصطلاحات علمیہ بھی شامل کی جائیں تو حضرت ریاض سے مشورہ کیا تھا۔ ریاض نے جواب میں تحریر فرمایا "آپ صحت بگڑ جانے کی شکایت کرتے ہیں اور پھر اس کام میں مشغول ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے نور اللغات کی چاروں جلدیں لکھ کر حیاتِ ابدی حاصل کرلی ہے۔ پھر بھی آپ کی ہمت کو ہزار آفریں ہے جو آپ اس اہم کام میں ہنوز مشغول ہیں۔ خدائے تعالیٰ آپ کو صحت کامل عطا فرمائے اور اس ارادے میں استقلال دے کیونکہ یہ کام آپ نے بہت ضروری اختیار کیا ہے۔ خدائے تعالیٰ اس کام کو تکمیل پر پہونچائے اگر آپ ہمت کریں گے تو عجب نہیں کہ یہ کام بھی تکمیل پر پہونچ جائے۔"

کہ آپ کو وکالت ترک کئے ہوئے عرصہ ہو گیا۔ قانون سے مَس باقی نہیں رہا ہے اور وکلا کی نئی نسل آپ سے ناواقف ہے یہ جدید تالیف کامیاب نہ ہو گی مگر یہ صلاح پسند خاطر نہ ہوئی۔ اور ایک سال کے اندر کتاب شائع کر دی گئی۔ اغلاط طباعت کا انبار تھا۔ پروف کی صحت بھی مناسب طور پر نہیں ہوئی تھی۔ انجام یہ ہوا کہ طباعت کا صرف بھی وصول نہ ہو سکا اور کوشش رائگاں گئی۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں تبدیل آب و ہوا کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ یکے بعد دیگرے مختلف محلوں میں مکانات کرایہ پر لے کر مقیم رہے۔ کاکوری کی سکونت پسند خاطر نہ تھی اور اعزہ کو تلقین کرتے تھے کہ "ہر کہ پابند وطن شد کلی کشد آزار ہا" لیکن لکھنؤ میں بھی دلبستگی نہ ہوتی تھی۔ مزاج ناساز رہتا تھا اور اعضائے رئیسہ قابو سے باہر تھے۔ محلہ گھسیاری منڈی میں کئی مہینے مقیم رہے مکان کے قریب ہی ایک مختصر مسجد تھی اور بیشتر وقت صبح سے شام تک وہیں صرف کرتے تھے۔

حضرت نیاز فتحپوری اڈیٹر نگار کا دفتر مکان کے قریب تھا۔ وہ بوقت فرصت خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور مولانا کی تحقیقات سے مستفید ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں اسلامیہ اسکول لکھنؤ کے بعض اراکین نے ایک مشاعرہ کا اعلان کیا۔ مولانا بوجہ کبر سنی اور اشتداد امراض کے شرکت سے معذور تھے۔ حضرت صفی۔ آسی۔ ظریف وغیرہ وغیرہ سخن سنجان لکھنؤ نے مشاعرہ کو زینت دی مولانا کی طرف سے مولوی طاہر حسن نے حسب ذیل غزل پڑھی:-

میرے دم سے عشق کا آباد ویرانہ ہوا　　لیلی و مجنوں کا قصہ کہنہ افسانہ ہوا

کچھ تو مقدار وفا ٹھہرا دو تم میرے لئے　　تاکہ میں سمجھوں وفا کا ایک پیمانہ ہوا

واہ رے دست سوال اللہ رے ظرف گدا　　ہاتھ پھیلانے کا منشا پاؤں پھیلانا ہوا

کھل گیا راز محبت دم قدم سے آہ کے　　خواب جو گونگے کا تھا گھر گھر وہ افسانہ ہوا

شمع یہ رو رو کے کہتی صبحدم رخصت ہوئی　　کیا جئے جس سے جدا دن بھر کو پروانہ ہوا

اپریل ۱۹۳۴ء میں کاکوری واپس آئے اور پھر باوجود بعض اعزہ کی صلاح کے وطن سے حرکت نہیں کی۔ ضعف بہت بڑھ گیا تھا۔ بیرونی کوٹھی سے زنانخانہ تک جانا دشوار تھا لیکن ۱۰ اگست ۱۹۳۵ء کو راقم الحروف کے غریب خانہ پر بزم مشاعرہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے پالکی سے اترنے کی قوت نہ تھی۔ عزیزوں نے سہارا دے کر سہارے سے اٹھا اور مسند تک پہونچایا۔

یہ مشاعرہ قصبہ کاکوری کی موجودہ حیثیت پیش نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ راجہ صاحب حسن خاں

تعلقدار گنٹوارہ میر مشاعرہ تھے۔ حضرت آسی۔ شوکت تھانوی۔ وسل بلگرامی وغیرہ مع اپنے احباب وتلامذہ کے شرکت محفل کے لئے تشریف لائے تھے۔ اڈیٹر اخبار حقیقت لکھنؤ مع بعض سخن فہمان لکھنؤ کے رونق افروز تھے۔ مولانا کے تلامذہ بھی جمع تھے۔ دوپہر کو طعام دعوت کے بعد شعر خوانی کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ غروب آفتاب کے بعد تک قائم رہا۔ بعض غزلیں نہایت دلکش تھیں۔ شوکت تھانوی کے انداز غزل خوانی پر وجد کی حالت طاری ہوتی تھی۔ حضرت آسی کی غزل بہترین سمجھی گئی محلہ درگا نواں لکھنؤ کے ایک نوجوان شاعر بہزاد تخلص تشریف لائے تھے اُن کی غزل بھی مقبول ہوئی مولانا کے شاگرد مولوی تحسین الدین کی غزل بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ افسوس ہے کہ اس موقع پر بھی گلدستہ جمع کرنے کا خیال نہ آیا اور آج راقم کے پاس اس بزم شعرا کی کوئی مکمل غزل موجود نہیں۔ یہ آخری مشاعرہ تھا جس کو مولانا کی شرکت کا شرف نصیب ہوا اور مندرجہ ذیل اشعار استاد کی آخری یادگار رہیں۔

مرقع میں مری تصویر پا کر شوخ نے لکھا اب اس بیمار کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
بھری برسات ہے توبہ کریں پینے سے اے واعظ یہ فرمائش تو حضرت آپ کی مانی نہیں جاتی
پھرے جاتے ہیں کس کے گھر سے یہ کہتے ہوئے ناصح ہمارے منہ کی کوئی بات بھی مانی نہیں جاتی
طبیعت ہچکچاتی ہے سنا ہے جب سے اے نیر کہ توبہ کر کے مدت تک پشیمانی نہیں جاتی

مشاعرے کے چند ماہ بعد ایک دن صبح کے وقت راقم خدمت میں حاضر ہوا۔ مرزا سکندر بیگ قدر اپنی غزل اصلاح کے لئے لائے تھے وہ بھی موجود تھے۔ مولانا کے صاحبزادے مولوی حامد حسن کی تنخواہ میں ترقی کی اورنگ آباد دکن سے خبر آئی تھی اور مولانا اس خبر سے خوش تھے۔ میں نے عرض کی کہ یہ ترقی آپ کے "اعمال صالحہ کا ثمرہ ہے"۔ یہ سن کر رونے لگے اور فرمایا کہ اعمال صالحہ کہاں ہیں۔ یوں کہو کہ "دعاؤں کا ثمرہ ہے" راقم کو ایک پرائیوٹ معاملے میں اُن کی صلاح درکار تھی آہستہ آہستہ گفتگو کر کے واپس آیا۔ چند روز کے بعد مولانا نے خود طلب کیا اور ایک خاص معاملے کے بابت حکم دیا کہ اس کام کو یوں کرنا چاہیئے۔ اُس کام میں جو دشواریاں تھیں وہ میں نے عرض کیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "آپ ایسا حکم دیں گے تو میں انشاءاللہ نافرمانی نہ کروں گا" مولانا سن کے لگے اور فرمایا کہ "تمہاری سعادتمندی سے ایسی ہی امید تھی۔ تم نے میرا دل باغ باغ کر دیا" اس گفتگو کے بعد راقم خدمت سے رخصت ہوا لیکن دل میں وہم پیدا ہوا کہ مولانا کا چہرہ آج کچھ متغیر معلوم ہوتا تھا۔ براہ راست مولوی انوار الحسن کی خدمت میں گیا اور اپنا شک اُن سے

ظاہر کیا۔ وہ روزانہ سہ پہر کو بھائی کے پاس جاتے تھے۔ انھوں نے تحقیق کرنے کا وعدہ کیا مگر سہ پہر کو ورم کا نشان نہ ملا۔

چند روز کے بعد ورم کا اثر ہاتھوں تک پہونچا اور بہت نمایاں ہوگیا۔ سب عزیز فکر مند ہوئے پہلے ڈاکٹری علاج کیا گیا اُس سے نفع نہ ہوا۔ جھوائی ٹولہ کے حکیم عبدالحلیم صاحب بُلائے گئے اُنھوں نے مرض "ماشرہ" تجویز کیا۔ دوائیں لکھیں، مسہل پر مسہل دیے۔ ضعف بڑھتا گیا اور مرض پر ضبط نہ پڑا۔ علاج تبدیل کرنے کی رائے ہوئی۔ حکیم عبدالحمید صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور انھوں نے "استسقاے لحمی" کی تشخیص کی۔ جس وقت اُنھوں نے اس مرض کا نام لیا بھائی کا دل ہل گیا اور جب راقم کو اطلاع ہوئی تو کلیجے پر چوٹ لگی۔ مولانا کا ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ صحت کلی سے سب رشتہ دار نااُمید تھے مگر اتنی آس تھی کہ فوری خطرہ نہیں ہے "استسقا" کا نام طبیب کی زبان پر آیا تو سب بے آس ہوگئے۔

مرض کا نام مولانا پر ظاہر نہیں کیا گیا مگر دوا اسی بیماری کی ہوتی تھی۔ مولوی انوارالحسن دو وقت خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تھے۔ سہ پہر کو منشی مظہر الحسن بھی آتے تھے۔ حافظ شاہ اکرام علی اور حاجی اعجاز علی گاہ گاہ قدم رنجہ فرماتے تھے۔ اعزہ و اقربا میں سے جو وطن میں آتا عیادت کے لئے حاضر ہوتا تھا اور رخصت کے وقت یہ سمجھ کر جاتا تھا کہ اب دوبارہ اس جمال کے زیارت کی آس نہیں۔ آواز خستہ ہوگئی تھی۔ تکلم دشوار تھا لیکن عیادت کرنے والوں کی خاطر مدارات کا لحاظ رکھتے تھے۔ سہ پہر کے وقت صحن میں کرسیاں بچھواتے اور احباب کی آمد کے انتظار میں دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے رکھتے تھے۔

حضرت شاداں بلگرامی کا اسم گرامی کتاب میں کئی بار آچکا ہے۔ اُن کا خط دریافت خیریت کے لیے آیا تو جواب میں صاحبزادے سے لکھوایا:-

بے تابی دردِ دل نہ پوچھو زندہ ہوں کمال کر رہا ہوں

حکیم عبدالحمید کے علاج سے نفع نہ ہوا تو لکھنؤ کے بعض دیگر نامور اطبا سے مشورہ لیا مگر حالت دن پر دن بگڑتی ہی گئی اور مولانا کا قدیم شعر خود اُن کے حسب حال ہوگیا یعنی

ہر دوا در کار خود سبے کار بود ضعف از حب جواہر سے فزود

نشست و برخاست سے معذور ہوچکے تھے۔ اب بغیر سہارے کے کروٹ بھی نہ لے سکتے تھے۔ طہارت کے لئے پلنگ کے قریب چوکی لگانا پسند نہ تھا اس لئے ملازم یا کوئی عزیز مولانا کو

گود میں اُٹھا کر ایک کرسی پر بٹھا تا تھا۔ وہ کرسی چوکی کے متصل پہونچائی جاتی تھی اور مولانا چوکی پر بٹھا دیئے جاتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کمر بند کھولتے اور بعد رفع حاجت خود باندھتے تھے۔ تمام عمر کی اتقاد پرہیزگاری کا انعام تھا کہ کمر بند کھولنے یا باندھنے میں اخیر وقت تک کسی نامحرم کی امداد کی ضرورت نہ ہوئی۔

نماز پنجگانہ کے وقت تیمم کے لئے مٹی حاضر کی جاتی اور مولانا قبلہ رو بٹھا دیئے جاتے تھے تکبیر تحریمہ کہتے ہی چہرے پر ہیبت طاری ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ احکم الحاکمین کے دربار میں حضوری حاصل ہے۔

جامع الاوراق نے لڑکپن میں پڑھا تھا کہ " اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اُس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ تم اُس کو اگر نہیں دیکھ سکتے تو وہ تو بہر حال دیکھ رہا ہے " مگر اس طرز عبادت کا عملی نمونہ مولانا کے مرض الموت میں نظر آیا اور کئی بار راقم کی زبان سے نکل گیا کہ " نماز مقصود یہی ہے " اور یہ نماز ایمان کی قوت سے نصیب ہوتی ہے۔

مولانا چھ سات برس کے سن سے نماز کے پابند تھے اور مدت العمر مذہب کو دنیوی عز و جاہ پر ترجیح دی تھی اس کا ثمرہ تھا کہ اس ضعف و ناتوانی کے عالم میں ایک وقت کی نماز بھی فوت نہ ہوئی۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ بقول شاعر " کروٹ بدل رہا تھا کہ دنیا بدل گئی " مگر نماز کے وقت بدن میں قوت نشست کی آجاتی تھی۔ تکیہ کے سہارے بیٹھتے اور نماز فرض ادا کرتے تھے۔

فحش گوئی اور ناشکری کے کلمات سے زندگی بھر پرہیز کیا تھا اُس کا معاوضہ ملا کہ اس شدید بیماری کی حالت میں بھی زبان شکوہ و شکایت سے آلودہ نہیں ہوئی۔ جب کوئی اپنا یا بیگانہ دریافت کرتا کہ مزاج کیسا ہے تو فرماتے کہ " اچھا ہوں " راقم نے کئی بار پوچھا کہ " آپ کو کیا تکلیف ہے " تو فرمایا کہ " ضعف ہے اور کچھ نہیں "

سارا جسم گھل گیا تھا سوائے پوست و استخواں کے کچھ باقی نہ تھا۔ تکلیف کا احساس کس چیز پر ہوتا۔ اور اگر کوئی ایذا بھی تو اُن کی زبان پر نہیں آئی۔

۵ ستمبر ۱۹۱۲ء کو سہ پہر کے وقت بندہ حاضر ہوا۔ مولوی انوار الحسن اور بعض دیگر اعزہ موجود تھے تکلم کی قوت ساقط ہو چکی تھی۔ راقم سے اشاروں میں کچھ فرمایا مگر اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اپنے قریب بُلایا اور راقم کے ہاتھ پر اپنی انگلی سے کچھ لکھنا چاہا مگر انگلیوں میں بھی سکت نہ تھی اور معلوم نہ ہو سکا کہ اُس وقت کیا ارشاد منظور تھا۔ تنفس میں فرق آچکا تھا اور

ناک کا بانسہ پھر گیا تھا۔ اسی حالت میں مغرب و عشا کی نمازیں ادا کیں۔ رات میں نبض کا نظام بگڑا اور نزع روح کا آغاز ہوا لیکن ایمان کی قوت سے نماز فجر (بتاریخ ۶ ستمبر ۱۹۱۳ء) ادا کی اور اس کے بعد بیہوش ہو گئے۔ ظاہرا سکرات کی کوئی تکلیف نہ تھی لیکن جسم کا نصف حصہ سرد پڑ چکا تھا مولوی انوار الحسن نے حالت متغیر دیکھ کر مولانا کی صاحبزادیوں کو باخبر کیا۔ کلمہ طیبہ کی تلقین شروع ہوئی سانس دیر دیر میں آتی تھی لیکن انفاس کی رفتار سے "اللہ ہو" کا ذکر مفہوم ہوتا تھا۔ ایک بار سانس سے "ہو" کی بلند آواز آئی اور روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دوران علالت میں صاحبزادوں کو وصیت عزیزوں کو نصیحت کر چکے تھے۔ کئی بار فرمایا تھا کہ نماز جنازہ مولوی مصطفیٰ حسن (خلف مولوی انوار الحسن) پڑھائیں۔ حضرت مخدوم نظام الدین قاری کے روضے میں قبر بنے تربت خام رہے۔ اور انجمن اسلامیہ ہر دوئی کے زیر اہتمام قرآن خوانی ہو۔

ظہر کے وقت مسجد جامع کاکوری کے احاطے میں غسل میت ہوا۔ آب زمزم سے دھوئی ہوئی قمیص کفن میں دی گئی۔ مولوی مصطفیٰ حسن نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اعزہ و احباب لکھنؤ سے آ گئے تھے قصبہ کے اعیان و اشراف مشایعت کے لئے حاضر تھے۔ شہیدا دب کا "جنازہ دھوم سے اٹھا" صحن روضۂ حضرت مخدوم میں منشی عبدالحمید خلف منشی عبدالمجید سحر کے متصل جگہ ملی۔

عصر کے وقت جامع اوراق نے قبر میں اتارا۔ جاں نثار بھائی نے آنسو بہا کر دعا مغفرت کی اور مولوی طاہر محسن نے پہلی مشت خاک ڈالی۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

وزیر

(مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔اے، ایل ایل بی وکیل)

آپ کا نام خواجہ محمد وزیر اور تخلص وزیر تھا۔ باپ کا نام خواجہ محمد فقیر تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ استغنا، توکل، سخاوت اور وضعداری میں خواجہ صاحب مشہور تھے۔ جناب شیخ صاحب یعنی حضرت ناسخ آپ کو حاصل تلامیذ جانتے تھے۔ اعمال فتوح اور علم تسخیر وغیرہ میں ایسی مشق بہم پہونچائی تھی کہ لکھنؤ میں بے مثل سمجھے جاتے تھے بمقتضائے شوق نقش کی چال کی عادت ہوگئی تھی اور شاعری سے بالکل نفرت ہوگئی تھی۔ انتظام خانہائے نقوش سے فرصت نہ ہوتی تھی اور مہینوں کسی شاگرد کی اصلاح کی نوبت نہ آتی تھی۔ اپنی ضرورت پر حاجت روائی سائل کو مقدم جانتے تھے۔ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین کا بجد خیال رکھتے تھے۔ دو بار حضرت سلطان عالم والی ملک اودھ نے کمال سرفرازی اور رعایا نوازی سے یاد فرمایا مگر جناب موصوف بعذر علالت حاضر نہ ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کا خرچ سو روپیہ ماہوار سے کم نہ تھا مگر کبھی یہ نہ کھلا کہ کہاں سے آیا اور کون دے گیا۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ اُن کو دست غیب حاصل تھا۔ شیخ صاحب کے زمانہ میں ایک ضخیم کلیات مرتب ہو کر ضائع ہوا۔ بیشتر غزلوں کے مسودے بے پروائی سے رائگاں ہوگئے۔ آخر جناب محمد عبد الواحد خاں مہتمم مطبع مصطفائی شہر لکھنؤ نے احباب سے کلام خواجہ صاحب کی فراہمی کے لئے تاکید کی اور اکثر تلف شدہ غزلیں بہم پہونچائیں۔ جب کبھی خاں صاحب فرط محبت سے طبع دیوان کا ارادہ ظاہر کرتے بے تکلف خواجہ صاحب ارشاد فرماتے کہ کلام سابق کا بالکل ناپسند طبیعت ہے، اور ابتدائی مشق کے شعروں سے مجھ کو نفرت ہے، اگر زمانے نے فرصت دی تو دو مہینے کی توجہ میں جیسا جی چاہتا ہے بہت کچھ موزوں ہو جائے گا۔ مگر اجل نے فرصت نہ دی اور بائیسویں تاریخ شب آدینہ ذیقعدہ کو ۱۲۷۰ھ ہجری مطابق ۱۸۵۴ء میں جہان گذراں سے رخصت ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد خاں صاحب ممدوح نے سید ہادی علی رضوی بیخود تخلص کو جو خواجہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے اس کام کے لئے منتخب کیا اور ترتیب دیوان کا کام ان کے سپرد کیا۔ بہت سا کلام سید محسن علی محسن نے بہم پہونچایا۔ بیشتر خطوط احباب اطراف و جوانب کو لکھے اور اکثر مسودات گم شدہ دوستوں کی عنایت سے دستیاب ہوئے۔ بڑی دوا دوش سے دو برس کی محنت شاقہ کے بعد یہ نسخہ کہ جس کا تاریخی نام دفتر فصاحت ہے چھاپا گیا۔
(۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء)

حضرت اسیر نے حسب ذیل قطعہ تاریخ وفات خواجہ صاحب مرحوم لکھا ہے۔

رحلت خواجہ وزیر اہل جہاں کو ہوئی شاق　　خاک بر سر ہوئے اس غم سے صغیر اور کبیر

کی رقم کلک نے صفحے پہ یہ تاریخ وفات　　خواجۂ عالم ارواح ہوئی جان وزیر

۱۲۷۰ھ

کلام پر تبصرہ

جناب ناسخ کا کلام پڑھنے کے بعد یہ خواہش باقی نہ رہی تھی کہ اُن کے شاگردان نامی کے دواوین پڑھنے کی زحمت گوارا کی جائے۔ لیکن خواجہ وزیر کی شہرت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ کم از کم آپ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس لیئے ہم نے آپ کا دیوان اول سے آخر تک پڑھا جس میں تقریباً چار ہزار اشعار ہوں گے۔ یہ دیوان غزلیات کا مجموعہ ہے۔ ایک دو ترجیع بند تین چار قطعات تاریخی اور ایک خمسہ بھی اس میں شامل ہے۔ آپ کی غزلیات دیکھ کر جناب ناسخ یاد آجاتے ہیں کیونکہ یہاں بھی وہی بے نمکی اور پھیکا پن ہے جو استاد کا طرۂ امتیاز ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ناسخ تشبیہات سے کام لے کر کبھی کبھی کوئی مضمون بھی پیدا کر لیتے ہیں اور یہ حضرت اس دولت سے بھی محروم ہیں۔ جو اصحاب اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر اپنے زمانہ کا رنگ قبول کر لیتے ہیں وہ اپنے خاص وقت میں ایک حد تک مقبول خلائق ہو جاتے ہیں لیکن جب زمانہ دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے تو یہ گوشۂ اخمول میں جا پڑتے ہیں۔ یہی حال حضرت وزیر کا ہے۔

آپ نے سر دیوان جو غزل لکھی ہے وہ تیس اشعار پر حاوی ہے۔ اس تمام غزل میں مطلع اول کے سوا باقی تمام اشعار بے حد معمولی اور پیش افتادہ مضامین سے پر ہیں۔ آپ کا رجحان طبع زیادہ تر سراپائے معشوق کی طرف پایا جاتا ہے۔ جہاں دیکھیئے سراپا کے متعلق غزلوں کی غزلیں بھری ہوئی ہیں۔ اسی پہلی غزل میں حسب ذیل اشعار سراپا کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

بگڑ کر اُس نے چتون سے جو ہم کو آنکھ دکھلائی　　غزال چشم پر دھوکا ہوا شیر نیستاں کا

ترے ہونٹوں کے آگے رنگ جب اُس کا نہیں جمتا　　تو کیا کیا جوش کھاتا ہے لہو لعل بدخشاں کا

زقن میں وہ خال سیہ دیکھا تو میں سمجھا　　لطافت سے عیاں ہے تخم پر سیب زنخداں کا

وہ گریاں ہوں جو میرا یوسف دل گر پڑا اُس میں　　کبھی پانی نہ ٹوٹے گا ترے چاہِ زنخداں کا

طلب کی صبح صادق کا گماں ہے اُس کے عارض پر　　مسی پر لعل لب کی شبہ ہے شام بدخشاں کا

لب لعلیں پہ اُس کے یہ نہیں ہے پان کا لاکھا　　نکل آیا ہے کھا کر جوش خوں لعل بدخشاں کا

دل دیوانہ کی چندے جو زلفوں میں بسر ہوگی　　لقب ہو جائے گا صبح وطن شام غریباں کا

جہاں کو قتل کرتے ہیں یہ مہرو جامہ زیبی سے — مگر تیغ ہلالی ہے ہلال ان کے گریباں کا
دکھایا بے تکلف ہو کے مُنہ اُس حور طلعت نے — اُٹھا گھونگھٹ کہ دروازہ کھُلا گلزارِ رضواں کا
کرے گا آتش افروزی چمن سودے گیسو میں — دھواں بن کر رُلائے گا نظارہ سنبلستاں کا

معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے چند قافیے مخصوص کر لیے تھے اور ان قافیوں کے ساتھ مضامین بھی متعین تھے۔ بدخشاں کے ساتھ لعل کا تصور اور لعل کے ساتھ معشوق کے لب لعلیں کا تصور ایک ضروری اور لازمی بات ہو گئی ہے۔ چنانچہ بدخشاں کا قافیہ تین جگہ بندھا ہے اور تینوں اشعار میں ایک ہی خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ ان اشعار سے لذت تو کیا کوفت حاصل ہوتی ہے۔ جب ان حضرات کی شہرت پر نظر کی جاتی ہے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ لوگ نہ سخنداں تھے نہ سخن فہم۔ قافیہ پیمائی کیا کرتے تھے اور اُس وقت کی پبلک جو مغز سخن سے خالی تھی اسی کو غنیمت سمجھ کر خوش ہوتی تھی۔ یا افزونی دولت و عیاشی اسی قسم کے اشعار کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وزیر کا دیوان جو ہمارے پیش نظر ہے خاص اہتمام کے ساتھ ترتیب دے کر چھپوایا جاتا۔ اور روپیہ اور وقت اس طرح برباد کیا جاتا۔

آپ کے شاگرد سید بادی علی رضوی بخود تخلص مرتب دیوان ہذا دیباچہ میں آپ کے متعلق حسب ذیل الفاظ تحریر کرتے ہیں:۔

"جو کمالات ظاہری و باطنی اور جو صفات صوری و معنوی جناب اقدس الٰہی ذات مجمع البرکات جناب غفراں مآب، فخر المتاخرین، شرف المتقدمین، استاذ المحققین، ملاذ المتبحرین، بسم اللہ صحیفہ بلاغت، دیباچۂ کتاب فصاحت، سرآمد استادانِ جہاں، وزیر بادشاہ شاعراں، مجموعۂ اوراق ذی کمالی شیرازۂ اجزائے نازک خیالی، ناخدائے سفینۂ علم قوافی و عروض، در یکتائی بحر کمالات و فیوض، آسماں ساز زمین شعر و سخن، نتیجۂ اشکال شعری ذہن، صائب عصر، کلیم دہر استاد راسخ، نایۂ تحقیقات جناب شیخ امام بخش ناسخ، افصح الفصحا، اکمل الکملا، محسود برنا و پیر، سخنگوئے بے عدیل و نظیر، جناب مولانا و استادنا خواجہ محمد وزیر خلف الصدق جناب خواجہ محمد فقیر تغمدہ اللہ بغفرانہ میں جمع فرمائے تھے کسی طرح حصر میں نہیں آسکتے اگر جملہ اشجار صحرا قلم ہو جائیں اور تمامی صفحات گلستان عالم مرتبہ قرطاس بہم پہونچائیں تو بھی ممکن نہیں کہ ایک حرف اس دفتر کا تحریر میں آئے۔"

شعر میں تو لوگ مبالغہ کرتے ہی آئے ہیں لیکن یہ مرتب دیوان نثر کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی نثر میں اپنے نزدیک حق شاگردی ادا کر دیا ہے۔ اس بات کا خیال نہیں کیا کہ ضرورت سے زیادہ تعریف خود

مداح اور ممدوح دونوں کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ لیکن آپ کے نزدیک مبالغہ بھی وہ مبالغہ ہونا چاہئے اور جھوٹ بھی وہ سفید جھوٹ جس میں سچ کا شائبہ تک نہ ہو۔ ورنہ پھر لطف ہی کیا۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہ پیشرو اپنی فارسی دانی کا کیسا بے جا مصرف پسند کرتے تھے اور یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات شعر کے حقیقی معنے سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اگر اُس زمانہ میں لکھنؤ کے ایسے ہی اصحاب "سخنگوئے بے عدیل و نظیر" ہوتے تھے تو اللہ بس باقی ہوس۔ خدا ایسی شاعری سے محفوظ رکھے اور دشمن کو بھی اس قسم کی شاعری کا آزار نہ ہو۔

کیا شاعری اسی کا نام ہے؟

کھا گیا مجھ ناتواں کو غم مرے خوش چشم کا — ہو کے کاہیدہ اسی آہو کا چارا ہو گیا

بل نکالا ہے مژہ کا اُس نگاہ گرم نے — آنچ سے تلوار کی کیا تیر سیدھا ہو گیا

غمزہ و انداز و ناز و کبر و مہر و لطف و حسن — ساتھ یہ اور ایک تم آٹھوں کا میلا ہو گیا

گرمیاں کیں اس قدر ہر عضو شعلہ ہو گیا — شب کو روشن یار کے بازو کا اتکا ہو گیا

آفتاب داغ سودا کو جو دیکھا اُڑ گیا — جامۂ تن اے جنوں شبنم کا کرتا ہو گیا

آنکھ ہر اک طفل کی اس لئے جنوں پڑنے لگی — ڈھیلے آنکھوں کے چلے مجھ کو جو سودا ہو گیا

اُن کے چلنے کی صفت لکھی تو بجلی پڑ گئی — قاصدا پائے قلم سے خط روانا ہو گیا

کھینچ لایا حسن کو بھی عشق اپنے رنگ پر — ضعف سے ہیں زرد وہ سونے سے پیلا ہو گیا

کہاں تک مثالیں لکھی جائیں تمام دیوان اس قسم کے اشعار سے پُر ہے۔

اصل یہ ہے کہ جناب ناسخ اور اُن کے شاگردان رشید صرف تشبیہات اور رعایت لفظی کو شاعری سمجھتے تھے وہ جذبات کی فضا سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ ممکن ہے کہ اتفاقیہ کوئی عمدہ شعر ان کی زبان قلم سے ٹپک پڑا ہو ورنہ ان حضرات نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ معشوق کا سراپا مبالغہ کے ساتھ اور اُن چند تشبیہات کے ساتھ جو مشہور و معروف ہیں اور بار بار دہرانے سے بے لطف ہو گئی ہیں بیان کریں۔ اُس کے لباس اور اُس کے خد و خال کو تشبیہات کے رنگ سے مزین کریں اور صرف مرصع کاری سے کام لیں۔ انھوں نے معشوق کی ظاہری شکل و صورت پر قناعت کی اور عاشق کے اندرونی جذبات کے بیان کرنے سے قاصر رہے۔ یہ مانا کہ ہر شاعر عشق کی دولت سے مالا مال نہیں ہوتا لیکن ایک نقال بھی وہی کامیاب سمجھا جاتا ہے جو نقل کو اصل کر دکھلائے ان اصحاب کی شاعری اُس وقت کامیاب سمجھی جاتی جب وہ ایک عاشق کی سرگذشت اس طرح بیان

کرتے کہ گویا خود اُن پر یہ حالت طاری ہے لیکن اُن کے اشعار سے بوالہوسی اور عیش و عشرت کی ترغیب کے سوا عشق حقیقی تو کیا عشق مجازی کی جھلک تک نمایاں نہیں ہوتی۔

چونکہ ان اصحاب کو حقیقی شاعری سے کچھ غرض نہ تھی اس لئے زمینیں بھی اکثر سنگلاخ اور دشوار اختیار کرتے تھے اور قافیہ پیمائی کی داد حاصل کرتے تھے۔ مثال کے طور پر چند زمینیں تحریر کی جاتی ہیں:-

تن سرخ ترا، پیرہن سرخ ترا۔ میدان بلا، بیابان بلا۔ دل بیتاب کا پھاہا، سیماب کا پھاہا۔ چراغ آفتاب، دماغ آفتاب۔ یاسمین کا سانپ، آستین کا سانپ۔ پیغام روح، آرام روح۔ شمشیر دوش پر، تقریر دوش پر۔ وقار عارض، دیار عارض۔ جنگ و شمع، سنگ و شمع۔ روغن چراغ، تن چراغ۔ صحن پھول، دہن پھول وغیرہ وغیرہ۔

بعض الفاظ اب متروکات کی فہرست میں داخل ہو گئے ہیں جو آپ کے دیوان میں پائے جاتے ہیں:-

تک بجائے ٹک، گھورنے بجائے غور سے یا غصے سے دیکھنا، واہ ری وحشت بجائے آہ اے وحشت، ایذائیں جمع ایذا آجکل استعمال کرنا پسند نہیں کرتے۔ صرف واحد ہی سے اپنا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ غالباً پائزے بجائے پائنچے۔ شعر

اُٹھائے گی جو ہم کو وحشت دل یار کے در سے	گریں گے پائزے پاؤں پہ اپنے بیڑیاں ہو کر

ابھی بالکل متروک ہے۔ اللہ رے بھی متروک ہے۔ ہوئے بجائے ہوں گے۔ شعر

ہوئے حنائی رکھے برہنہ جو کوئی پاؤں	فصل بہار میں ہے یہ خاک چمن کا رنگ

بھلا بھی متروک ہے۔ شعر

گل ریزہے کیا کلک و زیراب دم تحریر	پیدا تو کرے ایسی بھلا شاخ سمن پھول

آئیو بجائے آنا اور بھیجیو بجائے بھیجنا۔ شعر

آئیو اے اشک اب بہنے لگا ہے خون گرم	بھیجیو پانی کہ آتشبار آنکھیں ہو گئیں

موئے بجائے مر گئے وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے دیوان میں رکیک اشعار کی بھی کمی نہیں مثلاً

ہم منہ کو دیکھ دیکھ کے رہ جائیں یا نصیب	لوٹے اُگالدان مزا اس اُگال کا
وصل کی شب دیکھ کر انگیا کی چڑیا ڈر گئے	صاف ہم کو شبہ مرغ سحر ہونے لگا
سما گئی مرے سینہ میں مثل دل شیشی	تمہارے محتسبو ہاتھ کیا کدو آیا

یاد پستاں جو مجھے کرتی ہے دیوانہ وزیر — سنگترے پڑتے ہیں گلزار میں پتھر کے عوض
وہ گلابی ہے کٹوری جیب گل جس پہ ہے جاک — دیکھ کر آنکھ کی جھڑیا بلبلوں میں دم نہیں

آپ کے دیوان میں تلازمہ اور رعایت لفظی بکثرت موجود ہے۔ چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

میں کہہ دھانی جو ڑا کمیت ہیں کشتوں کے آ ظالم — ہرا ہو جائے پھر زخم کہن ہر ایک بسمل کا
نظر سے میری گر بیمار ان کی ہو گئیں آنکھیں — تصدق کے لئے کھنچواؤں روغن آنکھ کے تل کا
خط میں جو مضمون خط سبز تھا — تیرا کبوتر بھی ہرا ہو گیا
میٹھی چھری سے تونے بنایا مگر قلم — خامہ دم رستم جو شکر بار ہو گیا
حسن عارض عارضی تھا کھل گیا — خط کے آتے ہی لفافہ کھل گیا
آنسو جو پی گیا تری آنکھوں کی یاد میں — لذت میں صاف شیرۂ بادام ہو گیا
ہار پھولوں کے ہیں چوٹی میں عیاں — کیا ہی پھولا ہے گلستان بلا
کون آفتاب چہرہ ہے محفل میں جلوہ گر — کافور ہو گیا ہے جو شمع لگن کا رنگ
اس کا خط دیکھتے ہیں جب صیاد — طوطے ہاتھوں کے اڑا کرتے ہیں
مرہم جو سبز تم نے لگایا تو رنگ مُرّہ — بے آب تیغ زخم ہمارا ہرا نہ ہو

صائب کے رنگ میں بھی کچھ اشعار آپ کے دیوان میں پائے جاتے ہیں مثلاً

نکلے ہیں دو خال بالائے لب میگون یار — رتبہ مے سے دو بالا رتبۂ افیوں ہوا
خط سے پنہاں عارض رشک قمر ہونے لگا — رات اب بڑھنے لگی دن مختصر ہونے لگا
بلا کے شیر سلاتی ہے طفل کو دایہ — دلیل خواب اجل ہے سفید مو آیا
بھلا ہو کیا دل زاہد میں سوز الفت حق — کبھی جلانے کے قابل چراغ خام نہیں

آپ کے یہاں بعض فارسی تراکیب عمدہ ہیں مثلاً تصور پیشہ۔ شعر

ہیں وہ بلبل ہوں تصور پیشہ — آنکھ کی بند گلستاں دیکھا

طائر رنگ حنا، گرد باد، موج تبسم، زخم دامن دار، گریبان تیر بند۔ شعر

سینے ہیں صورت دامن یہ زخم دامن دار — گلے کا زخم گریبان تیر بند ہوا

منت کش، فرش پا انداز، قد خم گشتہ، ہرجائی۔ شعر

کہہ کے یہ تم بڑے ہو ہرجائی — در بدر کیا مجھے پھرواؤ گے
یوسف سے کارواں وغیرہ

ذیل میں آپ کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں جن کی مقررہ تعداد بمشکل پوری کی گئی ہے

۱ ہوا انشاء دادیں نام بسم اللہ سے دیواں کا — سر دیواں پہ ہے الحمد للہ تاج قرآں کا

۲ دم اے محرومی نہ دیکھا خواب میں بھی یار کو — میرے اس کے درمیاں غفلت کا پردا ہو گیا

۳ کرہ ہوئے کنارہ کر کہ قسمت کچھ عجب شے ہے — لب دریا ذرا لب خشک رہنا دیکھ ساحل کا

۴ چڑھاتے دار پر منصور کے ہمراہ زاہد کو — تماشا دیکھنا منظور تھا گر حق و باطل کا

۵ کبھی خورشید نہ افلاک میں پنہاں ہوگا — لاکھ پردوں میں جو تو ہوگا نمایاں ہوگا

۶ اپنے گناہ آ نہیں سکتے حساب میں — زاہد کو خوف چاہیے روز حساب کا

۷ مجھ سے کسی کی دلشکنی ہو نہ عندلیب — توڑوں کبھی نہ پھول چمن میں گلاب کا

۸ چہرہ سے آفتاب قیامت مراد ہے — دامان حشر نام ہے اس کے نقاب کا

۹ آج ہم نے لب جاناں دیکھا — اے خضر چشمۂ حیواں دیکھا

۱۰ ہوں وہ بلبل کہ قفس ہی میں رہا — خواب میں بھی نہ گلستاں دیکھا

۱۱ تجھ سے اے صبح وطن ہو کے جدا — صدمۂ شام غریباں دیکھا

۱۲ جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں — آج ہے نامہرباں کل مہرباں ہو جائے گا

۱۳ مہرباں ہے مجھ پہ یہ نامہربانی ہے تری — دوست تو ہوگا تو دشمن آسماں ہو جائے گا

۱۴ سر مرا کاٹ کے پچھتائیے گا — کس کی پھر جھوٹی قسم کھائیے گا

۱۵ تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے — ابھی پہلو سے نہ اُٹھ جائیے گا

۱۶ کہیے یاران عدم کیا گزری — کچھ لب گور سے فرمائیے گا

۱۷ حضرت کعبہ جو بن جائیے عرش — دل کی وسعت نہ کبھی پائیے گا

۱۸ ہوا نہ آہ میں مقبول اپنے صانع کا — وہ آئینہ ہوں سکندر کے ناپسند ہوا

۱۹ کرے غرور نہ طاعت پہ کہدو زاہد سے — مرے کریم کو عذر گنہ پسند ہوا

۲۰ اُس کو طاعت پہ غرور اس کو ہے آمرزش پہ — کبر زاہد ہے جدا کبر گنہگار جدا

۲۱ عاشق و معشوق اک ہی خاک سے پیدا ہوئے — یہ بھی قسمت ہے کوئی لیلےٰ کوئی مجنوں ہوا

۲۲ بیٹھے بٹھائے تمھیں کیا ہو گیا — اُٹھ کے چلے حشر بپا ہو گیا

۲۳ آنکھوں سے طوفان بپا ہو گیا — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

۲۴ جلتی ہے کفر و دیں کی شراب دو آتشہ — کیا جانے کون ساقی گلفام ہو گیا

۲۵ صدمۂ شب فرقت کا اٹھانا نہیں اچھا | اے بے خبری آپ میں آنا نہیں اچھا
۲۶ نہیں غم زاہدان خشک کو خورشید محشر کا | سلامت ہے اگر سایہ ہمارے دامن تر کا
۲۷ چھپ گیا دوستی کے پردے میں | دشمن جاں نے کیا حجاب کیا
۲۸ ہوا جب دل شکستہ پھر صفائی غیر ممکن ہے | گرہ پڑ جاتی ہے جس وقت دھاگا توڑ کر جوڑا
۲۹ جلا دیا نہ ہو گلشن میں آتش گل نے | دھواں سا آج جو بلبل کے آشیاں سے اٹھا
۳۰ باتیں سنوائیں لب خاموش نے | ورنہ ہم دیتے اسے کیا کیا جواب
۳۱ آج مجھ سے بات اگر کرتے نہیں | دیں گے یہ بت کل خدا کو کیا جواب
۳۲ کس کی شمع رخ سے ہے روشن چراغ آفتاب | ان دنوں کچھ آسماں پہ ہے دماغ آفتاب
۳۳ یاں تو پیغام اجل آ پہنچا | واں سے قاصد نہ پھرا کیا باعث
۳۴ نہ دیکھوں گا جو فردائے قیامت | دکھائی ہے شب فرقت وہ تو آج
۳۵ منہ پھرائے ہو کیوں خاموش بیٹھے | ہوئی موقوف کس سے گفتگو آج
۳۶ کروٹیں لے لیکے کٹتے ہیں شب فرقت میں ہم | کس طرح اے خفتگان خاک آ جاتی ہے نیند
۳۷ ذرا تو دیکھ لے وہ ہم کو آ کر | کوئی دم اور بھی اے دم وفا کر
۳۸ جلائے ہے اور دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر | زمیں کو لے کے ہانا رنج دے گی آسماں ہو کر
۳۹ اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے | اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر
۴۰ ادا سے جھک کے ملتے ہو نگہ سے قتل کرتے ہو | ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر
۴۱ دہان زخم گلو سے اگر ذرا چھو لوں | ہمت کے آب ہو قطرہ زبان خنجر پر
۴۲ ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا تو ہو کر | روح میری گل عارض میں رہے بو ہو کر
۴۳ منہ آئے نظر صاف وہ ہے یار کی تلوار | آئینہ کا آئینہ ہے تلوار کی تلوار
۴۴ جلایا طور کو اک دم میں صاعقہ بن کر | شرر فشاں جو ہوا سنگ آستانۂ عشق
۴۵ حاضر ہے لیجیے یہ اگر کام آئے دل | کچھ اور پاس ہم نہیں رکھتے سوائے دل
۴۶ نہ کیا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل | دہن زخم پکارا کیے قاتل قاتل
۴۷ جز یاد دوست غیر کا خطرہ نہ آ سکا | وسعت نثار تجھ پہ ہو اے تنگنائے دل
۴۸ بو ہو کے گل میں کیا دل بسمل سما گیا | توڑا کسی نے پھول تو آئی صدائے دل
۴۹ اٹھا اٹھا کے جو پردہ نگاہ کرتے ہیں | ہمارے دل میں وہ در پردہ راہ کرتے ہیں

۵۰ جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں — ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

۵۱ ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

۵۲ بے چین ہے یہ دیکھ کے مجھ بیقرار کو — ہے انتظار صبح شب انتظار کو

۵۳ دشمن بھی اپنے دوست سے یارب جدا نہ ہو — ناآشنا کو بھی الم آشنا نہ ہو

۵۴ یاد آتے ہیں مجھے حضرت ناسخ جو وزیر — کیا لگا دیتی ہے اشکوں کی جھڑی میری آنکھ

۵۵ دل دیا اس کو پر یہ ڈرتا ہوں — دشمن اک دوست کے کیا ہمراہ

۵۶ نہیں یاران رفتگاں کا نشاں — لے گئے کیا یہ نقش پا ہمراہ؟

۵۷ آبلے روتے ہیں خوں رنج بڑا ہوتا ہے — کوئی کانٹا جو کف پا سے جدا ہوتا ہے

۵۸ ایک ذرہ کو نہیں ہوتی ہے جنبش بے حکم — بت جو پھر جاتے ہیں اللہ پھرا ہوتا ہے

۵۹ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو گیا ہے در فتنہ باز ہے

۶۰ کیا کیا نہ ہم کو اپنی عبادت پہ ناز تھا — بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے

۶۱ شکر ہے ان بتوں کے کوچے میں — پہونچے ہیں ہم خدا خدا کر کے

۶۲ ایک عالم نے جبہہ سائی کی — اے بتو تم نے بھی خدائی کی

۶۳ بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی

۶۴ چھان ڈالا تمام کعبہ و دیر — اے ہمارے خدا کہاں تو ہے

۶۵ اس نے نگاہ کرتے ہی بس آنکھ پھیر لی — برچھی لگی تھی سینہ پہ لیکن اچٹ گئی

۶۶ پڑا ہے تفرقہ بیتابیوں سے — وزیر اب میں کہیں ہوں دل کہیں ہے

۶۷ اٹھتا ہے جائے شعلہ دھواں دل کے داغ سے — تاریک ہو گیا ہے مرا گھر چراغ سے

۶۸ لذت درد سراپا مجھے حاصل ہو جائے — آرزو ہے کہ ہر اک عضو بدن دل ہو جائے

۶۹ غزل بمثل کہتا ہوں وزیر افضال ایزد سے — نہ میری طبع عالی ہے نہ میری فکر عالی ہے

(نوٹ) مصرع اولیٰ سے ہم کو اختلاف ہے، البتہ مصرع ثانی سے اتفاق ہے۔

ق

۷۰ نہ کر عوض مرے جرم و گناہ بے حد کا — الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں

۷۱ کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج — یہ ان کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

شیر شاہ سوری کے چند آئینی نقوش

(جناب منشی انوار احمد علوی صاحب بی۔ اے)

(۳)

(بسلسلہ گذشتہ)

تجارت

شیر شاہ کے قوانین محصول و چنگی (Tariff System) نے شمالی ہندوستان کی مٹتی ہوئی تجارت کو سنبھال لیا۔ ہندوستان کی اندرونی تجارت مختلف قسم کے ٹیکسوں سے جو اندرون ملک لگائے جاتے تھے بالکل ختم ہو رہی تھی۔ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ تک بھی آزادانہ تجارت نہ ہو سکتی تھی۔ اور خود صوبہ کے اندر بھی حکام مختلف گھاٹوں اور شاہراہوں پر ٹیکس لگا کر جو چاہتے وصول کر لیتے۔ اس طرح سے تجارت کو بہت سخت نقصان پہونچ چکا تھا اور بظاہر کوئی امید درستگی تجارت کی نظر نہ آتی تھی کہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ قدرت نے ہندوستان کی حکومت کی باگ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دیدی۔ جس کے عہد میں ہندوستان پر ہن ہی ہن برسا۔ شیر شاہ نے کل اندرون ملک کے ٹیکس یک قلم موقوف کر دیئے، اور صرف سرحد اور بازار میں جہاں وہ فروخت ہوتی ٹیکس لگائے۔ تاجروں اور مسافروں پر خاص توجہ مبذول رہتی اور سڑکوں پر ان کی حفاظت کا پورا بندوبست ہوتا۔ عمال کو یہ حکم تھا کہ:۔

> "شاہی مہمانوں کی طرح ان کے ساتھ سلوک ہو۔ اگر کوئی تاجر یا مسافر فوت ہو جائے تو اس کا متروکہ شاہی دیوانخانہ میں داخل کرنے کے بجائے اس کے ورثا کو تلاش کر کے حوالہ کیا جائے"۔
>
> (صولت شیر شاہی۔ صفحہ ۹)

> "اپنی سلطنت بھر میں شیر شاہ نے چنگی صرف دو جگہ لگائی۔ ایک تو جب مال بنگال کی جانب سے آتا تو گڑھی کے مقام پر چنگی لگائی جاتی اور دوسرے جب خراسان کی طرف سے آتا تو سرحد ہندوستان پر چنگی لی جاتی۔ ان محاصل کے علاوہ اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اندرون ملک کسی گھاٹ یا سڑک پر چنگی لگائے۔ اس نے اپنے افسروں کو یہ بھی ہدایت کی کہ بازار کے مروجہ نرخ کے خلاف خرید و فروخت نہ کریں"۔ (عباس صفحہ ۲۰۶۔ الیٹ جلد چہارم صفحہ ۴۲۳)

بیرونی مال بنگال کے بندرگاہوں میں بلا کسی ٹیکس کے داخل ہوتا۔ یہ غالباً وصولیابی کی

دقتوں کی وجہ سے تھا۔ مشرقی ساحل پر دریائے سندھ کی طرح کوئی موزوں جگہ چنگی کے لئے نہ تھی۔ شمال اور مشرق میں اتنے پہاڑی راستے تھے اور ساحل سمندر پر اتنے چھوٹے چھوٹے شہر تھے کہ ناجائز تجارت کا روکنا بہت مشکل امر تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چٹاگانگ اور سات گاؤں ایسے بڑے تجارتی مقامات پر (پرتگالیوں کی تجارت کی بنا پر اُن کی اہمیت بڑھ گئی تھی) چنگی لی جاتی تھی کیونکہ اگر وہاں یہ بھی معاف ہوتی تو پرتگالی مورخ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ عباس کے بیان سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ مالوہ اور میواڑ کے ذریعہ جو چیزیں دکن اور گجرات سے آتیں اُن پر چنگی کس جگہ لی جاتی تھی۔

سڑکیں اور سرائیں

یوں تو شیر شاہی عہد کی ہر بات یادگار ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے اُس کی شہرت کو برقرار رکھا وہ اُس کی بنائی ہوئی سڑکیں ہیں جن سے اس کی یاد ہر دم تازہ ہوجاتی ہے۔ وہ شاہی توجہ اور اتحاد کا ایک بین ثبوت تھیں اور مختلف کاموں کے لئے بنائی گئی تھیں۔ جن میں سب سے ضروری حفاظت سلطنت تھی۔ ان تمام سڑکوں کے لئے آگرہ ایک مستقر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں وہ سب آکر ملتی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی اور مشہور وہ سڑک ہے جو سنارگاؤں (ضلع ڈھاکہ) سے دریائے سندھ تک گئی ہے اور جس کا طول ۱۵۰۰ کوس ہے۔ (فرشتہ لکھتا ہے)

"آثار پسندیدہ بسیار گذاشت، چنانچہ از بنگالہ دسنارگاؤں تا آب سندھ کہ بہ آب نیلاب اشتہار دارد دیک ہزار و پانصد کردہ است" (فرشتہ صفحہ ۲۲۵ مطبوعہ نولکشور۔ لکھنؤ)

دوسری سڑک آگرہ سے مانڈو ہوتی ہوئی برہان پور (سرحد ملک دکن) تک تقریباً چھ سو کوس تیسری سڑک آگرہ سے جودھپور ہوتی ہوئی چتوڑ گڑھ (راجپوتانہ) تک۔ چوتھی سڑک لاہور سے ملتان تک۔ ان سڑکوں کے کنارے ہر دو کوس کے فاصلہ سے بکثرت سرائیں بنوائیں اور قریب قریب چاہات کندہ کرلئے۔ اور سڑکوں کے دونوں جانب سایہ دار اور پھل دار درخت نصب کرائے تاکہ مسافروں کو آرام و آسائش نصیب ہو۔

"ان تمام سڑکوں پر سترہ سو سرائیں تھیں۔ ہر سرائے میں مسلمانوں کے قیام کے لئے جدا اور ہندوؤں کے آرام کے لئے جدا مکانات تھے۔ اسی طرح ہر سرائے میں دو دروازے رکھے گئے تھے ایک دروازہ پر مسلمانوں کے لئے اور دوسرے پر ہندوؤں کے لئے پانی کی سبیلیں قائم تھیں۔ اس سے زیادہ آرام کی یہ بات تھی کہ مسلمان مسافرین کے کھانا پکانے کے لئے باورچی اور ہندوؤں کے لئے برہمن ملازم تھے۔ گرم و سرد پانی ہر وقت موجود رہتا۔ جو نہانے اور پینے کے

کام میں آتا۔ برہمنوں کے متعلق ہندو مسافرین کے لئے بستر کرنا۔ رسوئی (کھانا) بنانا۔ اور گھوڑوں کے لئے دانہ لانے کا کام سپرد تھا، اسی طرح مسلمان مسافرین کی خدمات کے لئے علیحدہ ملازم تھے۔ مسافرین پر سرائے کے قیام کا کوئی ٹیکس نہ تھا۔ چارہ۔ دانہ جانوروں کے لئے اور ہر طرح کا ضروری سامان مثل اجناس۔ ترکاری۔ گھی۔ لکڑی وغیرہ آدمیوں کے لئے مفت ملتا"

لنگر خانے وسیع پیمانے پر تھے اور ان کا خرچ اس زمانے میں جبکہ روپیہ کی قیمت آجکل کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔ ایک لاکھ اسی ہزار اشرفی سالانہ تھا۔

"سب سے زیادہ خوبی کی بات یہ تھی کہ ہر سرائے کے وسط میں ایک پختہ مسجد اور اُس کے متصل کنواں تھا، تاکہ مسلمان مسافرین فریضۂ نماز آرام کے ساتھ ادا کرتے رہیں۔ ہر مسجد میں ایک موذن۔ ایک خادم اور ایک پیش امام بھی مقرر تھا۔ جن کو دیوان شاہی سے تنخواہیں ملتیں۔ ان تمام آسائشی سرو سامان کے علاوہ سرائے اور مسافرین کی حفاظت کے لئے ایک شحنہ اور کئی چوکیدار مقرر تھے جن کو معاوضہ خدمت کے صلہ میں سرائے کی متصلہ اراضی قابل کاشت بطور معافی ملی ہوئی تھی"　(صولت شیر شاہی ص۹۸　عباس ص۲۲۵　الیٹ جلد چہارم ص۴۱۸)

یہ سڑکیں بہت عمدگی سے بنی تھیں۔ اور سلطنت کے نازک مقامات کو ایک دوسرے سے متصل کرتی تھیں۔ بروقت ضرورت انھیں سڑکوں کے ذریعہ افواج کا اجتماع ہو جایا کرتا تھا۔ پرانے ہندو بادشاہ اپنی توجہ سڑکوں وغیرہ کی تعمیر کی طرف صرف کرتے مگر مسلمان بادشاہ اپنی زیادہ توجہ عمارات کی تعمیر میں صرف کرتے۔ شیر شاہ نے ممکن ہے یہ خیال ہندو بادشاہوں سے لیا ہو مگر جو سڑکیں اس نے بنوائیں اُن میں سے کسی کا بھی وجود نہ تو ہندو بادشاہوں کے عہد میں ملتا ہے اور نہ مسلمان سلاطین کے یہاں ان کا کوئی مذکور ہے۔ صاحب زبدۃ التواریخ رقمطراز ہیں:-

"جو سڑک دہلی سے آگرہ کو جاتی ہے یہ شیر شاہ کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ سڑک اُس نے تمام جنگلات وغیرہ جو بیچ میں پڑتے تھے اُنھیں کٹوا کر بنوائی۔ اور سرائیں بھی تعمیر کرائیں۔ اس سے قبل لوگوں کو دہلی سے آگرہ آنے کے لئے دوآبہ سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا"

(زبدۃ التواریخ۔ الیٹ جلد ششم ص۱۸۸)

شیر شاہ کی تکمیل انتظام کے لئے ان سڑکوں اور سراؤں کا ہونا بیحد ضروری تھا۔ کیونکہ کام میں بتعجیل۔ افسروں کا ایک مقام سے دوسرے مقام کو تبادلہ۔ اور افواج کی ہر وقت کی نقل و حرکت بغیر عمدہ سڑکوں کے ممکن ہی نہ تھی۔ یہ سرائیں اعیان مملکت اور خود بادشاہ کے ٹھہرنے کا کام بھی دیتی تھیں

جن کے لئے ایک الگ کمرہ مخصوص ہوتا تھا۔

سڑکوں کی حفاظت کی وجہ سے تجارت کو بہت فروغ ہوا ا۔ بعض سرائیں تجارت کا مرکز بن گئیں جہاں کاشتکار اپنی زرعی پیداوار بیچ کر ضروریات زندگی خرید سکتے تھے۔ ان سراؤں میں بادشاہ اور دوسرے افسران کے قیام سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ غریب کسان جنھیں بادشاہ کو دیکھنا ایک امر دشوار تھا بلا تکلف بادشاہ کو دیکھ کر ترقی اقبال کی دعائیں دیتے اور اس کے انتظام سے خوش خوش واپس جاتے۔

ان سراؤں سے ڈاک چوکی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ خبر رسانی کے سلسلہ میں دو گھوڑے مع سوار ہر سرائے میں مقرر رہتے۔ اس طرح اس نے تین ہزار چار سو گھوڑے اور اسی قدر سوار خبر رسانی کے لئے مامور کر دئے تھے۔ جن کے ذریعہ بنگال، پنجاب، مالوہ، بہار، راجپوتانہ وغیرہ ملکوں سے روزانہ خبریں پہونچتی تھیں، اور ان ہی کے ذریعہ فوری احکام انتظامیہ اطراف ملک میں جاری ہوتے۔

"و در ہر سرا دو اسپ بام کہ بزبان ہندی ڈاک چوکی گویند نگاہداشتہ کہ ہر روز خبر نیلاب و اقصائے بنگالہ بادی رسید" (فرشتہ۔ نولکشور لکھنؤ ص۲۲۵ و (طبقات اکبری ص۲۳۲)

اس کے علاوہ کوئی پرگنہ کوئی سرکار کوئی صوبہ کوئی لشکر کوئی امیر ایسا نہ تھا جہاں شاہی جاسوس نہ ہوں ان جاسوسوں کے ذریعہ اس امر کی بھی نگرانی کی جاتی کہ امرا اور دیگر عمال کس طرح سے اور کس حد تک شاہی قوانین کی تعمیل کرتے ہیں......

"وقائع نگاراں و سوانح نگاراں شیر شاہی ہر پرگنہ اور ہر ضلع میں علٰحدہ تھے۔ غرض خفیہ اور علانیہ ذرائع خبر رسانی کا تمام ملک میں ایسا جال بچھا ہوا تھا کہ ملازمین اور رعایا کا اس میں سے نکلنا دشوار تھا۔ ہر شخص اپنی خانگی گفتگو میں بھی یہ سمجھتا کہ شیر شاہ سامنے ہے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ شاہی قوانین کی خلاف ورزی کر سکے" (صولت شیر شاہی ص۹)

مغلوں نے اپنے یہاں بھی اسی طریقہ کو رواج دیا۔

شیر شاہ ان محکموں کے لئے اپنے پیشروؤں کا مرہون منت ہے۔ خفیہ خبر رسانی اور جاسوسی ہندوستان کی ابتدائی چیزیں ہیں۔ اور یہ محکمہ قریب قریب ہر بادشاہ نے قائم رکھا۔ خود ہماری انگریزی سرکار بھی اپنی بقا کے لئے ایک عظیم الشان محکمہ خفیہ پولیس (C. I. D) کی مرہون منت ہے۔ سلاطین ماسبق میں سلطان علاؤالدین کے زمانے میں اس محکمہ کو سب سے زیادہ فروغ ہوا۔ ڈاک چوکی کا محکمہ بھی اسی کی ایجاد ہے اور اس کی صورت یوں تھی کہ جب علاؤالدین کسی فوج کو بھیجتا۔ تو وہ سڑکوں پہ چوکیاں قائم کرتا۔

ہر چوکی پر گھوڑے موجود رہتے اور ہر آدھے یا چوتھائی کوس پر ہرکارہ متعین ہوتے۔ اور اخبار نویس بھی تعینات کئے جاتے۔ روزانہ یا ہر دوسرے اور تیسرے دن بادشاہ کو فوج کی مکمل نقل و حرکت کی اطلاع ہوتی اور فوج کو بھی بادشاہ کی صحت و تندرستی کا علم ہوتا رہتا۔ اس طرح سے غلط خبریں فوج میں نہ پھیلنے پاتی تھیں۔ اس سے دو فائدہ ہوتے ایک تو فوج کے متعلق معلومات حاصل ہوتیں اور دوسری جانب دربار کا حال بھی معلوم ہوتا رہتا۔ تاریخ میں شاید یہ محکمہ خبر رسانی کی طرف پہلا قدم تھا۔ علاؤالدین کے بعد نااہل سلاطین کے عہد میں یہ محکمہ بالکل غائب ہو گیا۔ اس کے دو سو برس بعد سلطان سکندر لودی نے پھر اس محکمہ کو قائم کیا لیکن اس کی بہت زیادہ فوجی شکل بدل دی۔ اس کی ماتحتی میں اس محکمہ سے فوجی اور ملکی دونوں کام لیے جاتے تھے۔ فرشتہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"درہرگاہ لشکر بجانبے می فرستاد ہر روز دو فرمان بر آں لشکری رسید یکے صباح کہ کوچ کردہ فلاں جا منزل کنید و یکے ظہر کہ چنیں و چناں کنید و ایں ضابطہ ہرگز تخلف نمی نمود اسپان ڈاک، چوکی دائم مستعد می بودند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بطریق زمان سلطان علاؤالدین خلجی ہر روز روزنامچہ نرخ اجناس و واقعات جمیع ممالک محروسہ و احوال لشکر بایستے کہ بخدمت بادشاہ برسد و اگر سر موئے ناملائم معلوم شدی فوراً بتدارک آں پرداختے"

(فرشتہ - جلد اول - نولکشور پریس - ص۱۸۱)

شیر شاہ نے اپنا یہ انتظام سکندر لودی ہی سے لیا تھا۔ لیکن اس پر اتنی ترقی کی کہ:-

"ایک مرتبہ حسین طشت بردار شاہی نے ایک دن میں تین سو کوس کی منزل طے کی تھی، اور دوسری مرتبہ اسی حسین نے تین دن اور تین رات میں قلعہ گور (بنگال) سے چتوڑ گڈھ (راجپوتانہ) تک کئی سو کوس کا سفر کیا تھا"		(دولت شیر شاہی ص۹)

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سلطان سکندر لودی اور شیر شاہ کے حدود مملکت میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ اتنی بڑی سلطنت کا انتظام اس عمدہ طریقہ سے کر لینا واقعی قابل داد ہے۔

پولیس

شیر شاہ کا محکمہ پولیس سادہ لیکن بے انتہا مستعد تھا۔ سرکار میں صدر شقدار امن کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اور اس کے ماتحت جو پرگنوں میں تعینات ہوتے تھے وہ بھی یہی فرائض انجام دیتے تھے۔

"اس سلسلہ میں شیر شاہی قانون یہ تھا کہ اگر کسی جگہ چوری، ڈکیتی، رہزنی یا قتل کی واردات

ہو، اور مرتکب جرم فی الفور گرفتار اور مال مسروقہ یا مفرورہ برآمد نہ ہو سکے تو جس گاؤں کی سرحد میں جرم کا ہونا ثابت ہو وہاں کے مقدموں اور زمینداروں سے مال کا معاوضہ دلایا جائے اور جبکہ مقام واردات مشتبہ ہو تو چاروں سمت کے ملحقہ زمینداروں سے بقدر نقصان مال حصہ رسدی معاوضہ دلایا جائے، مجرم کی گرفتاری پر اول اس کی تحقیقات کی جائے کہ وہ کس گاؤں میں پناہ گیر ہوا تھا، ثابت ہونے پر اس گاؤں کے مقدم سے ان زمینداروں کو معاوضہ دلایا جائے جو پہلے شخص ضرر رسیدہ کو ادا کر چکے ہیں، اس کے بعد مجرم کو سزا دی جائے، اور اگر مجرم نے بطور خود اصل مال مفرورہ پیش کر دیا تو مالکان مال کو وہ سامان دیا جا کر معاوضہ نقد جو اُن کو دیا جا چکا ہے واپس لے کر مستحقین کو واپس دیا جاتا۔

قتل کی صورت میں یہ حکم تھا کہ بشرط گرفتاری قاتل، اس گاؤں کے مقدم کو قید رکھا جائے۔ جس کی سرحد میں قتل کی واردات ہوئی ہو۔ تلاش قاتل کی اگر وہ مہلت چاہے تو ضمانت پر آزاد کیا جائے۔ ناکامی کی صورت میں اس کو اس وقت تک قید رکھا جائے، جب تک کہ مجرم گرفتار ہو کر شرعی سزا کو نہ پہونچے، اور اگر مجرم کی گرفتاری و حاضری سے مقدم قطعی مایوس ہو جائے تو آخری حکم یہ تھا کہ قاتل کے عوض اس کو سزا دی جائے۔"

(صولت شیر شاہی صفحہ ۹۱ عباس صفحہ ۲۰۸-۲۰۹ الیٹ چہارم صفحہ ۴۲۰-۴۲۱)

یہ طریقہ اس زمانہ کے لئے موزوں تھا۔ صاحب طبقات اکبری باوجود اس کے کہ تیموری خاندان کے نمک خوار ہیں مجبوراً لکھتے ہیں۔

"امن و امان کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص ایک اشرفی کی تھیلی سر پر رکھ کر چلے اور جنگل بیابان میں سو جائے تو حفاظت کے لئے کسی کی حاجت نہ تھی۔" (طبقات اکبری صفحہ ۲۳۱-۲۳۲)

فرشتہ لکھتا ہے:-

"در عہدش امنیت بمرتبہ بود کہ مترددین در صحرا و بیابان ہر جا می رسیدند کالائے خود اندیشہ نہ کردہ بفراغت می غنودند۔ گویند اگر زالے با سبدے پر از طلا در صحرا شبہا خواب کردے حاجت پاسبان اصلا نبودے۔" (فرشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۲۵)

شیر شاہ کے پولیس کے انتظام کی تمام فارسی مورخین نے بالاتفاق تعریف کی ہے۔ عباس لکھتا ہے:-

"مسافر اور راہ گیر اس کے زمانہ میں چوری اور ڈاکہ سے بے پرواہ تھے۔ وہ بیچ جنگل میں رکنے سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔ وہ رات کو ہر جگہ بلا تکلف قیام کرتے۔ اپنا اسباب کھلا چھوڑ دیتے

اور اپنے جانوروں کو چارہ کے لئے چھوڑ کر خود بلا تکلف پیر پھیلا کر چین سے سوتے۔ اور زمیندار اس ڈر سے کہ کہیں ان مسافروں پر کوئی مصیبت نہ آجائے اور انھیں سزا نہ ملے ان کی حفاظت کرتے۔ شیر شاہ کے عہد حکومت میں حفاظت اس درجہ پر تھی کہ اگر ایک بڑھی عورت زیورات کی ایک ٹوکری سر پر رکھ کر سفر کے لئے روانہ ہوتی تو شیر شاہی سطوت کے ڈر سے کوئی چور یا رہزن اس کے قریب آنے کی ہمت نہ کرتا۔"

(عباس۔ ایلیٹ جلد چہارم ص۴۳۲-۴۳۳)

"یہ اخیر حکم غیر شخص کے قصاص یا دوسری قسم کی تعزیر کے متعلق بظاہر اس قدر سخت معلوم ہوتا ہے کہ اگر موجودہ دور کی قانونی عدالتوں میں اس کو پیش کیا جائے تو بجان ہائیکورٹ اور اور ممبران مجلس وضع قانون اس کو بے رحمی، سفاکی اور بیدادگری پر محمول کرکے واضع قانون کو وحشی، جاہل، غیر مہذب قرار دے کر علانیہ اس کا مذاق اڑائیں، لیکن حقیقت بیں نگاہوں کو آج کل سہل ترین وسائل گرفتاری، اور اس وقت کی عام مشکلات، جرائم کی کثرت اور ان کی علانیہ وخفیہ اعانت کے اسباب پر نظر کرکے غور کرنا چاہیئے کہ جہاں جس زمانہ میں۔ جنگل، جھاڑیوں کی کثرت ہو، رہزنی قتل اور غارتگری جیسے جرائم کا روزانہ تفریحی مشغلہ ہو، باشندوں میں جہالت ہو، قومیں جنگجو ہوں، آج کل کی طرح باقاعدہ پولیس نہ ہو قریب قریب پولیس اسٹیشن نگرانی کے لئے نہ ہوں، قانون اسلحہ نہ ہو، وہاں بغیر عبرتنما سیاست، اور سولے تدابیر و پولٹیکل حکمت علیوں کے معمولی احکام و قوانین سے نتیجہ خیز انسدادی صورت کا پیدا ہونا محال ہوتا ہے۔ سلطان شیر شاہ نے ایک مدت کے تجربہ کے بعد اس کا اندازہ کرلیا تھا کہ گاؤں میں مقدموں کا وجود ہر قسم کے لوگوں کے لئے پناہ ہوتا ہے اور بغیر مقدموں کی سازش اور چشم پوشی کے وارداتیں نہیں ہوتیں اور اگر شاذ و نادر مقدموں کے علم و ایما کے بغیر کوئی واقعہ ہوا بھی تو وہ لوگ اپنے قتل کے خوف سے اصل مجرم کے پتہ لگانے میں سعی و کوشش زیادہ کرکے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان تمام اسباب و علل اور اپنے وسیع تجربات و مشاہدات کے بعد اس نے اس قسم کے احکام جاری کیے تھے جو بہت زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہوئے۔"　　(صولت شیر شاہی ص۹۱-۹۲)

سیاست کے ذریعہ سے انسداد مظالم | "سلطان شیر شاہ ..... رعایا کے ساتھ مراعات شاہانہ کے حدود میں شفیق باپ سے کم نہ تھا..... بلا معاوضہ رعیت سے نہ کوئی چیز لیتا نہ دوسروں کو

بینے دیتا۔ عمال کو تاکید تھی کہ خراج مقررہ سے ایک دانہ زیادہ دیوان شاہی میں داخل نہ ہونے پائے۔ مقدم یا زمیندار زیادہ ستانے کے مرتکب ہوتے تو اُن کے حقوق ضبط کر لئے جاتے اور سزا دی جاتی۔ لشکر کے کوچ کے وقت سختی سے ہدایت کی جاتی کہ راستہ میں زراعت کا نقصان نہ ہونے پائے، کسی مجبوری سے زراعت پامال ہو جاتی تو فوراً اُس کا تخمینہ کر کے معاوضہ ادا کرتا۔ زبانی ہدایت اور منادی کے علاوہ اثنائے سفر میں لشکر سے الگ ہو کر جائزہ کرتا کہ عمداً کسی سوار یا پیادہ نے درختوں کو پامال تو نہیں کیا۔ سواری کے وقت اس کا یہ عام اصول تھا کہ دائیں بائیں زراعت پر نگاہ ڈالتا رہتا۔ ہدایت کے خلاف اگر کسی کی نسبت زراعت کا نقصان ثابت ہو جاتا تو اس کے کان کتروا کر حکم دیتا کہ جو کچھ اس نے کھیت سے کاٹا ہے اُس کے گلے میں لٹکایا جائے اس کے بعد لشکر کے گرد اس کو پھرایا جاتا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔۔۔۔۔۔ اس حکم کا یہ اثر تھا کہ بحالت قیام، سوار و پیادے قریب کی زراعت کی خود رات بھر حفاظت کرتے کہ مبادا صحرائی جانوروں یا کسی طریقہ سے زراعت کا نقصان ہونے کی صورت میں وہ خود ماخوذ نہ ہو جائیں۔" (صولت شیر شاہی صفحہ ۹۳-۹۴)

"شیر شاہ فرائض حکومت کے ایک ایک نکتہ سے واقف تھا۔ اس نے سلطنت حاصل کرنے کے بعد تمام نکتوں سے کام لیا اور جس قابلیت سے لیا وہ اسی کا خاص حصہ تھا اس کے ماتحت سلاطین لودی کے عہد کے بہت سے با اثر امرا موجود تھے، حکومت نئی تھی استقلال و استحکام کو زمانہ چاہیئے تھا۔ لیکن یہ اسی سیاست کا اثر تھا کہ کبھی اس کے طاقتور امرا خود مختاری یا خلاف ورزی احکام کا خواب تک نہ دیکھ سکے۔ افغانی قوم جیسی کچھ جہالت کے ساتھ اس زمانہ میں جنگجو اور آزاد تھی۔ دنیا پر روشن ہے۔ ان کے مطیع و فرمانبردار بنانے میں شیر شاہ نے جس سیاستانہ تدبر سے کام لیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ خلوت، جلوت، سفر، حضر بلکہ زندگی کے ہر لمحہ میں ہر محکوم فرد یہی سمجھتا تھا کہ سلطان شیر شاہ سامنے موجود ہے۔ جہاں سیاسی اثرات اس قدر وسیع ہوں وہاں کی حکومت کو بھی مکمل اور شان و شوکت کی حکومت سمجھنا چاہیئے۔" (صولت شیر شاہی صفحہ ۹)

محکمہ عدالت

"سلطان شیر شاہ متبع شریعت اور مقلد آثار صحابہؓ سلطان تھا۔ اس لئے دیوانی و فوجداری عدالتوں کو اُس نے شرعی بنیاد پر قائم کیا۔ فصل خصومات کے لئے اُس نے ہر ایسے پرگنات

میں قضاۃ مقرر کئے جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی۔ قاضیوں کو صدر الصدور امور مذہبی کے ماتحت رکھا، جس کا دار القضا دار الخلافت میں تھا، عام انتظامی امور کے لئے ضلع کے صدر قاضیوں سے ان کا تعلق رکھا۔ قاضیوں کو ان کی خدمات کے معاوضہ میں اور ارامنیات معافی اس قدر تعداد کی دی جاتیں جن کی آمدنی سے اُن کے متعلقین کی گذر ہو سکے۔ شرعی خصومات کی جس قدر اقسام، اُن کی رجوعات بھی قاضیوں کی عدالت میں ہوتی۔ اُس زمانہ میں قاضیوں کی عدالتیں رجسٹراری کا کام بھی انجام دیتیں یعنے جائداد غیر منقولہ کے انتقال کی دستاویزیں اُس وقت مکمل سمجھی جاتیں جب اُن پر عدالت کی مہریں ثبت ہو جائیں "

(صولت شیر شاہی ص۱۰۱)

دیوانی مقدمات صدر منصف طے کرتا تھا اور فوجداری کے مقدمات صدر شقدار طے کرتا۔

تعمیرات

فوجی و ملکی انتظامات کے ساتھ ساتھ سلطان کو قلعہ جات اور عام ضروری عمارتوں کی تاسیس و تعمیر کی طرف بھی توجہ رہی۔ اسمتھ صاحب اس کی آخری آرام گاہ سہسرام کے متعلق رقم طراز ہیں:—

" ناپائدار اور مختصر سور خاندان کو جس کا بانی مبانی شیر شاہ تھا اپنی بقا اور وجود کے لئے اس قدر سخت جدوجہد کرنا پڑی کہ اُس سے تعمیرات کے متعلق کچھ امید رکھنا ایک فضول سی بات ہے۔ اس کے باوجود بھی اُس نے چند قابل توجہ عمارتیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں شیر شاہ کا مقبرہ جو سہسرام میں ہے اپنی شان اور شکوہ کے اعتبار سے اس عہد کی تمام ماقبل عمارتوں سے بڑھ کر ہے۔ کننگھم صاحب کو تو یہ خیال ہو چلا تھا کہ یہ تاج سے بھی بہتر ہے۔ گنبد گو بیجاپور کے گول گنبد سے چھوٹا ہے لیکن تاج کے گنبد سے ۱۳ فیٹ چوڑا ہے۔ باہر سے پوری اسلامی شان نمایاں ہے لیکن اندر کا کام جونپور کی عمارتوں کی ہندو طرز کا ہے۔ اس کا طرز تغلق اور مغل عہد کے درمیانی حصہ کا سا معلوم ہوتا ہے "

دہلی کا پرانا قلعہ مع شہر کے شیر شاہ کا تعمیر کردہ ہے۔ عباس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:—

" اس نے جمنا کے کنارہ شہر کی دوبارہ تعمیر کی۔ اور دو قلعوں کے بنانے کا حکم دیا ایک جس میں گورنر رہ سکے اور دوسرا مع شہر پناہ کے اس کی حفاظت کے لئے . . . .

گورنر والے قلعہ میں اس نے ایک پتھر کی جامع مسجد بنوائی جس کی تزئین میں اس نے سونا اور دیگر قیمتی چیزیں صرف کیں۔ لیکن دوسرے قلعہ کی بیرونی دیوار اس کی موت تک تیار

نہ ہوئی تھی۔"　　(عباس۔ الیٹ ص۴۱۹ جلد چہارم)

صاحب تاریخ داؤدی لکھتے ہیں:-

"اس نے علاؤالدین کے اس بلند اور مضبوط قلعہ کو گروا کر جو سیری میں واقع تھا۔ دریائے جمن (Jumna) کے کنارے، فیروز آباد اور کیلو کھیری کے مابین موضع اندرپت میں ایک نیا شہر پرانے شہر سے تین کوس کے فاصلہ پر آباد کر دیا اور اس کو بسایا جو آج تک (عہد جہانگیری) قائم ہے۔ اس نے ایک عالیشان مسجد کی بنیاد بھی ڈالی جو بہت جلد تیار ہو گئی۔ اس قلعہ کا نام شیر گڈھ رکھا۔ (یہ وہی شیر گڈھ ہے جو اس کے سکوں پر شیر گڈھ عرف حضرت دہلی کے نام سے مضروب ہے) قلعہ کے اندر ایک ناتکمل محل بھی تھا جس کا نام اس نے شیر منڈل رکھا۔"　　(الیٹ ص۴۴۷ جلد چہارم)

آل تیمور کا مدح خواں نور الحق عہد جہانگیری میں رقم طراز ہے:-

"شیر شاہ نے اپنے نام پر بہت سے شہر آباد کیے۔ مثلاً شیر گڈھ۔ شیر کوٹ اور ایک نیا شہر (دہلی) جو آج تک موجود ہے۔"　　(زبدۃ التواریخ۔ الیٹ جلد ششم ص۱۸۹)

فارسی مصنفین نے جس جامع مسجد کا ذکر کیا ہے وہ آج تک موجود ہے اور قلعہ کہنہ کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ ماہرین فن تعمیرات اس کی تعریف میں آج تک رطب اللسان ہیں۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب لکھتے ہیں:-

"مغلوں کا فن تعمیر بابر کے عہد سے شروع ہوا۔ لیکن اس کی کوئی یادگار باقی نہیں ہے۔ سب سے پہلی یادگار جو باقی ہے وہ شیر شاہ کی بنائی ہوئی مسجد "قلعہ کہنہ کی مسجد" ہے جو ۱۵۴۱ء میں بنی ہے اور پرانے قلعہ میں موجود ہے۔"　　(امپیریل گزیٹیر ص۱۹۵)

فرگیسن اسے اس عہد کی عمارتوں میں سب سے بلند درجہ دیتا ہے اور لکھتا ہے:-

"پٹھان سر بفلک عمارتیں بناتے تھے اور ان کا اختتام صنعت کا بے مثل نمونہ ہوتا تھا۔"

بدایونی اور دیگر مورخین شیر شاہ پر عمارتوں اور پرانے شہروں کے مسمار کرنے اور اپنے نام پر نئے شہر بسانے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ لیکن ہم اس کے نئے شہروں کی جائے وقوع پر غور کریں تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اس نے ان پرانے شہروں کو اس واسطے مٹا دیا کہ بوجہ دریاؤں کے راستہ بدل جانے کے ان کی اہمیت جاتی رہی تھی۔ اور نئے شہر اس سے زیادہ موزوں اور دریاؤ سے قریب مضافات پر بسائے۔ راج محل۔ پٹنہ کو بنگال اور بہار کا دار السلطنت قرار دینا اس بات بین ثبوت ہے۔

شیر شاہ قلعوں کی تعمیر کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے ہر سرکار میں ایک قلعہ بنانے اور کچی سراؤں کو پختہ کرانے کا ارادہ کیا تاکہ وہ شاہ راہوں کی حفاظت کا کام دے سکیں۔ مولف صولت شیر شاہی لکھتے ہیں:-

"استعماری سلسلہ جو اس نے جاری کیا تھا اُن میں سے قابل یادگار حسب ذیل آثار ہیں:-

(۱) قلعہ رہتاس خورد۔ یہ قلعہ لاہور دارالملک پنجاب سے ۰۰ کوس اور دریائے جہلم سے ۸ میل کے فاصلہ سے ہندوستان اور کابل کی سرحد پر تعمیر ہوا تھا، جس میں ۳۰ ہزار فوج ہر وقت رہتی تھی۔ استحکامی اساس میں دوسرے قلعے اس کے ہمسر نہ تھے۔ ٹوڈرمل کھتری اس قلعہ کا میر تعمیر تھا، دوران تعمیر میں اس نے شیر شاہ کے پاس اس مضمون کی درخواست بھیجی کہ یہ ملک گکھروں کا ہے جن کے باشندوں کو نوکری سے نفرت ہے، اور انھوں نے باہم اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ جو شخص مزدوری کرے گا وہ جلاوطن کر دیا جائے گا۔ شیر شاہ نے حکم لکھا کہ کثرت مصارف اور زر و سیم کی طمع سے میرے ارادے اور امثال میں تغیر نہیں ہو سکتا، ٹوڈرمل نے حکم کی منشا کو سمجھ کر اعلان کر دیا کہ ایک پتھر لانے والے کو ایک اشرفی دی جائے گی۔ اشرفیوں کی بارش نے گکھروں کو قلعہ کی تعمیر پر لگا دیا، میر عمارت نے اس قوم کو عادی کرنے کے بعد تدریجاً ایک اشرفی کے بجائے ایک روپیہ اور ایک روپیہ سے ایک سکہ پوسیہ مزدوری پر راضی کر لیا۔ اس طرح سے ایک کثیر رقم صرف ہونے کے بعد قلعہ مکمل ہو گیا۔

(۲) قنوج کی قدیم آبادی کو مسمار کر کے اینٹ مٹی کا قلعہ بنوایا، جس کا نام اپنے نام کی انتساب سے شیر گڈھ رکھا۔

(۳) بہرہ کھنڈ میں قلعہ تعمیر ہوا جس کا نام بھس کنڈلی رکھا۔

(۴) کوہستان بہرہ کھنڈ میں ایک اور قلعہ بنوایا۔ جو قلعہ شیر کوہ کے نام سے مشہور ہوا۔

(۵) اس وقت دہلی کی آبادی جمنا سے دور تھی، قدیم آبادی کو مسمار کرا کے جمنا کے کنارے جدید آبادی کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس میں دو قلعے تعمیر ہوئے، چھوٹا قلعہ شاہی سکونت کے لئے بڑا قلعہ عام آبادی کے لئے، اس کے گرد شہر پناہ کی فصیل کی بھی تعمیر کا حکم دیا تھا، لیکن حصار پورا نہ ہونے پایا تھا کہ شیر شاہ کی زندگی کا وقت پورا ہو گیا۔ چھوٹے قلعہ میں ایک جامع مسجد نہایت حسین بنوائی تھی، جس میں لاجورد اور سنگرفی پتھر لگوائے تھے۔ ان پتھروں میں صنعتی نقش و نگار کا ایک باغ لگا ہوا تھا۔

سلطان شیرشاہ کا قول تھا کہ اگر میری حیات مستعار نے وفا کی تو اپنے قلمرو کے ہر ایک پرگنہ میں ایک قلعہ تعمیر کرادوں گا جو شاہی عمال اور شہری آبادی کا مامن ہو۔ ارادہ میں جس قدر وسعت اور خیالات میں جتنی بلندی تھی اس کی تکمیل کے لیے اطمینان اور کافی وقت درکار تھا۔ پنج سالہ قلیل عہد سلطنت اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے بہت ہی ناکافی تھا۔ تاہم دیگر انتظامی ابواب کے ساتھ جو کچھ اس نے عمارتی آثار یادگار چھوڑے وہ کچھ کم نہیں ہیں" (صولت شیرشاہی ص ۱۵۰)

"غرض سلطان شیرشاہ نے اپنے پنج سالہ عہد سلطنت میں مستقبل کو کامیاب اور متمدن بنانے میں جس بیدار مغزی کا ثبوت دیا ہے وہ اس کا محیرالعقول کارنامہ ہے۔ وہ اگرچہ اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے باوجود سلطنت کے ہر شعبے، ہر صیغے میں تنظیمی داغ بیل ڈالنے اور ہر ایک آئینی عمارت کے نقشے تیار کرنے میں برابر مشغول رہا۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ تنہا تھا اور اپنے تجربات کی بنا پر وزرا پر بہت کم اعتماد رکھتا تھا۔ تاہم اس نے جس قدر بھی آئینی نقش و نگار یادگار چھوڑے ہیں۔ اور وہ خود جس سیادت، سطوت، رعب و اثر کے ساتھ ہندوستان پر چھا گیا تھا دوسرے بادشاہوں کو پچیس تیس سال کی مدت حکمرانی میں بھی وہ بات نصیب نہیں ہوئی" (صولت شیرشاہی ص ۱۰۱-۱۰۲)

یہ تھا اس بادشاہ کا عقل کو حیرت میں ڈالنے والا انتظام جس کا بیشتر حصہ صدیاں گذرنے پر بھی آج اس طرح سے قائم ہے۔ اس کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ہندوستان کی تاریخ آج کچھ اور رہی ہوتی ہندوستان اس پنج سالہ مدت میں اتنا خوش اور بے فکر تھا۔ جتنا آج باوجود مہذب دنیا کے اس قدر آگے بڑھ جانے کے اور انگریزوں کی خود ساختہ برکات حکومت کے وہ استغنا اور بے فکری سے محروم ہے۔ شیرشاہ کے عہد حکومت کے حالات سے بے خبری کی ذمہ داری ہمارے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پر ہے جو ہر چیز کو انگریزی عینک سے دیکھتا ہے۔ اور پھر اُس تحریر پر جو کسی انگریز کے قلم سے نکل جائے آمنا و صدقنا کہہ کر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ کاش کہ وہ اور وسیع النظری سے کام لے۔ ذرا زیادہ چھان بین کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ موجودہ انتظام انگریزی جس کا وہ مداح ہے اس کا زیادہ حصہ شیرشاہ کا مرہون منت ہے۔

اصغر اور آزاد

(جناب منشی سراج احمد علوی صاحب فانی بی، اے)

اصغر مرحوم کی "شاعرانہ جلالت" کی بقول اڈیٹر صاحب الناظر کے یہ دلیل ہے کہ گذشتہ دس سال سے اُن کی شاعری بہت کچھ معرض بحث میں رہی۔ ایسی صورت میں کہ ایک شاعر کی شاعرانہ جلالت مسلمہ ہو نقاد کا یہ فرض ہے کہ تنقید کرتے وقت بہت سوچ سمجھ کر اس راہ میں قدم رکھے کہ نقاد کی "لغزش پا" بجائے شاعر کے کلام کے عیوب و نقائص کو پیش کرنے کے 'نقاد' کا پول کھول دیتی ہے اور نقاد اور اُس کی تنقید دونوں مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں۔

حضرت اصغر مرحوم کے "سرودِ زندگی" پر حال میں اسی قسم کی دو تنقیدیں الگ الگ نگار اور الناظر میں شائع ہوئیں۔ اول الذکر نیاز صاحب کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے اور دوسری مولانا اظہر علی آزاد کی "کاوش نظر" کا ثمرہ ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری کی تنقید یا بالفاظ دیگر "جرأت بیجا" پر نظر ڈالنا بیکار ہے کہ مولانا نیاز کی تنقیدوں کا مقصد بجز "تجارتی" مفاد کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ صحیح معنوں میں تنقید کہے جانے کے لائق نہیں ہوتیں۔ البتہ جناب نیاز اس حیثیت سے ضرور قابل ستائش ہیں کہ وہ ہر شاعر اور مصنف کی بازاری قیمت (Market value) سے بخوبی واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ کس شاعر یا مصنف کے عیوب (خواہ وہ عیوب ہوں یا نہوں) اُچھالنے سے "نگار" کے کتنے دام اور مل جائیں گے۔ اگر یہ حقیقت نیاز پیش نظر ہوتی تو جناب عشرت کو اس دردسری کی ضرورت نہ پڑتی جو اُنھوں نے نیاز کی تنقید کے جواب دینے میں مول لی ہے۔

مگر جناب آزاد نے جو "سرسری نظر سے سرودِ زندگی" کو دیکھ کر "سُرخ پنسل سے نشانات" لگانے کی تکلیف گوارا کی اور بغیر نظر ثانی کیے ہوئے اشعار نافہمیدہ پر اصلاح بے جا اور تنقید کرنے کی زحمت اُٹھائی وہ البتہ قابل غور ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی "تجارتی" غرض اس تنقید میں پوشیدہ نہیں ہے اور آپ اصغر کے کمال کے بھی معترف ہیں جیسا کہ آپ نے اپنے مقالے کی ابتدائی سطور میں اعتراف کیا ہے۔ تو پھر "سرودِ زندگی" پر ایک سرسری نظر ڈال کر اور "عروس نظم" کو دور سے دیکھ کر اس کے چہرے کے خد و خال کا صحیح اندازہ لگائے بغیر انھیں "بدنما داغ" سے تعبیر کرنا صریح ظلم ہے۔ اور بزعم خود ان بدنما داغوں کو اپنے اصلاح کے اُبٹن سے دور کرنے کی کوشش کرنا اور

بھی قبیح ہے۔
حضرت اصغر اب دنیا میں موجود نہیں کہ وہ آپ کے چیلنج کا جواب دیں، جناب عشرت کو نیاز صاحب کہاں فرصت کہ کسی دوسرے کی جرأت "بے باکانہ" کی طرف متوجہ ہوں۔ لہذا سطور ذیل جناب آزاد کی نذر ہیں شاید ان کی روشنی میں اشعار معترضہ کے صحیح خدوخال نمایاں نظر آنے لگیں۔
اس سے پہلے کہ اشعار معترضہ پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تنقید کے اصول پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتا چلوں۔
کسی شاعر کے کلام پر نقادانہ نظر ڈالنے سے پہلے اس شاعر کے متعلق چند باتیں جاننا ضروری ہیں اول تو یہ کہ شاعر شاعری کے کس دور سے گذر رہا ہے یعنی ابتدائے شاعری کا دور ہے۔ یا وسط میں ہے یا شاعری کی ارتقا تک پہونچ چکا ہے یا پھر اُس کی شاعری معراج کمال کو پہونچ کر تنزل کی طرف جا رہی ہے۔
اگر شاعر کلام و سخن کی ابتدائی منزلوں سے گذر رہا ہے تو اس کے کلام پر تنقید کرنا تضیع وقت ہے کیونکہ نہ تو اُس کی شاعری کا (Theme) مقصد اچھی طرح واضح ہوتا ہے اور نہ زبان کی پختگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اُسے چند اصول موضوعہ کے معیار پر پرکھنا فعل لایعنی ہے۔
اگر شاعر ابتدائی منزلیں طے کر چکا ہے اور اُس کا (Theme) مقصد شاعری واضح ہوتا جاتا ہے۔ نیز اُس کے طرز ادا اور رنگ بیان نمایاں حیثیت اختیار کر رہے ہوں یا بالفاظ دیگر وہ ارتقا کی منزلیں طے کر رہا ہے تو اُس صورت میں بھی صحیح تنقید چند اصول موضوعہ کے ماتحت مشکل ہے اس لئے کہ ارتقا کا لازمی نتیجہ اصول موضوعہ سے الگ چلنے اور نئی شاہراہ تیار کرنے کی صورت میں نکلتا ہے تیسرا درجہ شاعر کا وہ ہوتا ہے جہاں پہونچ کر شاعر رک جاتا ہے اور اُس کا (Theme) مقصد شاعری اس طرح سے نمایاں ہوتا ہے کہ اُس کا ایک ایک شعر اُس کے Theme کا حامل اور ہر شعر سے اُس کے خاص رنگ کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ اور ہر شے کے متعلق اُس کے زاویہ نگاہ اور اُس کے مصطلحات کا اندازہ معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی وہ درجہ ہے جہاں تنقید صحیح معنوں میں کی جا سکتی ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کے کلام کی تنقید میں کن باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا اور شاعر کو کیا کیا مراعات (Latitudes) دینا پڑیں گے اور تنقید کن اصولوں پر ہوگی۔
ظاہر ہے کہ نظم کے مصطلحات، عروض و قافیہ، بحر و ردیف، محاورہ اور روزمرہ کے سخت اصولوں کے ماتحت ایک شاعر جو مروجہ شاعری سے الگ جا رہا ہو اُس کی شاعری نہیں جانچی جا سکتی اس لئے کہ

اگر وہ انھیں فرسودہ بندشوں میں جکڑا رہا تو ارتقا ناقص ہوئی لہذا نقاد کو صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ شاعر نے جہاں اصول موضوعہ سے روگردانی کی ہے وہ مفید ہے یا بیکار۔ اگر اس سے آئندہ فن شاعری میں نئی شاہراہوں کے اضافہ کی اُمید ہے اور اصول موضوعہ کو وہ کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچاتا تو اُس کو خوش آمدید کہنا چاہیے ہاں اگر شاعر کی بے راہ روی سے بنیادی اصولوں کی بیخ کنی ہو تو یقینی شاعر کو اُس کی بے راہ روی کے نتائج سے آگاہ کرنا لازمی ہے۔

دوسری شے جو شاعر زیر احتساب کے کلام میں دیکھنے کی ہے یہ ہے کہ اس کا (Thema) مقصد شاعری یا مرکز شاعری کیا ہے۔ آیا وہ اس سے پہلے بھی معرض وجود میں آچکا ہے یا شاعر کی نئی اوپج ہے اگر کوئی پرانا (Theme) ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ کس حد تک وہ نئے لباس میں لاکر اُسے اپنا سکا اور اگر کوئی نیا (Thema) اس نے اختیار کیا ہے تو وہ کس حد تک اس کے پیش کرنے میں کامیاب رہا اور اس کے اس نئے موضوع سے شاعری میں کیا اضافہ ہوا اور "شاعری" نے بحیثیت مجموعی اس سے کچھ ترقی کی یا اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

تیسرا محاکمہ نقاد کا شاعر کے ماحول خارجی اور اس کے رجحان طبیعی کو پیش نظر رکھ کر اس کی شاعری پر ہونا چاہیے۔ اور اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا ماحول خارجی کس حد تک اس کے ارتقائے شاعری میں معاون ہوا اور شاعر کس حد تک اپنے ماحول سے متاثر ہونے میں حق بجانب ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ شاعر کا طبعی میلان کس طرف ہے اور اس کے تخیلات کی آمد کن جذبات کے خزانے سے ہوتی ہے۔ وہ (Pessimist) قنوطی ہے یا (Optimist) رجائی ہے اسکا رجحان طبع (Ethics) اخلاق کی طرف ہے یا (Suphiism) تصوف کی طرف ہے۔ نظر وسیع (Liberal) ہے یا تنگ (Orthodox) ہے، وہ مقلد ہے یا مجتہد یا موجد۔ ان تمام ذہنی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے نقاد اس کے کلام پر نظر دوڑائے کہ اُس کا کلام اُس کے خصوصیات اور جذبات کا صحیح عکس ہے یا نہیں۔

اگر انھیں چند اصولوں کے تحت کلام اصغر کی جانچ کی جاتی تو شاید فاضل نقاد کو اتنے صفحات سیاہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

آئیے اور انھیں چند اصول کے ماتحت کلام اصغر کو یا کم سے کم اشعار متعلقہ کو پرکھئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اصغر کا موجودہ کلام ابتدائی سرحدوں سے بہت آگے نکل چکا ہے جس کا آپ نے اعتراف کیا اور ظاہری خوبیاں جو شعر کے اندر پائی جاتی ہیں اس کا عنصر بھی آپ اصغر کے اشعار میں پاتے ہیں۔ کلام میں غنائی

شگفتگی، ندرت، نازک خیالی، وقار، بلند نظری کے نمونے جابجا موجود ہیں۔ محاسن بہت ہیں۔ آپ شاہراہ ترقی پر گام زن ہیں" آپ کے مندرجہ بالا الفاظ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ اصغر کم سے کم شاعری کے ارتقا کی منزلیں طے کر رہے ہیں اور آئندہ بھی ارتقا کی امید تھی اگر ان کا چراغ ہستی یکایک خاموش نہ ہو جاتا۔

موجودہ صورت میں جبکہ "سرود زندگی" کا مغنی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے اور اس کا یہ سرود آخری سرود ہے جس کے اندر "تکمیل فن" کے کافی اثرات نظر آتے ہیں اگر اُس کی شاعری کے ارتقا کی آخری کڑی مان کر اُس پر اسی انداز سے تنقید کی جائے جو کسی شاعر کی ارتقا یافتہ شاعری کے لیے بیان ہوئے تو کچھ بے جا نہیں۔

مرحوم اصغر گونڈوی کے غزلیات کے دو مجموعے ہمارے سامنے ہیں نشاط روح اور سرود زندگی۔ اور دونوں پختہ شاعری کے نمونے ہیں۔ ابتدائی شاعری کے نمونے وہ کسی حالت میں بھی نہیں کہے جا سکتے البتہ یہ ضرور ہے کہ نشاط روح میں جو اصغر کا (Theme) مقصد شاعری تھوڑا بہت مخفی تھا وہ سرود زندگی میں بالکل نمایاں ہو گیا ہے اور (Theme) کے تعین اور تعارف میں ذرہ برابر بھی رقت اور دشواری باقی نہیں رہتی۔

اصغر کا یہ (Theme) مقصد شاعری کیا ہے؟ جناب نقاد نے نہیں بتایا۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں یا تو سرسری نظر میں جناب آزاد تے اس کے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی اور یا پھر گستاخی معاف آپ اصغر کا Theme پا نہ سکے اور اگر یہ نہیں تو پھر آپ شاعری میں Thema کی اہمیت کے یا تو منکر ہیں یا اسے لاشے سمجھتے ہیں۔

میرا اپنی جگہ پر یہ خیال ہے کہ اگر جناب مقصد شاعری یا موضوع شاعری کے سمجھنے یا اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا فرما لیتے تو وہ اشعار جن کو آپ اصغر کی شاعری کے بدنما داغ سے تعبیر کرتے ہیں اُن کے مطالب کے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوتی۔

اصغر کی شاعری کا موضوع (Theme) مع اُن تمام صفات کے جن کی آپ نے فہرست گنائی ہے "تصوف محض" ہے۔ غالباً آپ چونک پڑیں گے اور آپ کے ساتھ بڑی بڑی عباؤں والوں کی تیوریاں چڑھ جائیں گی اور وہ بھی جھرجھری سے کر سنبھل جائیں گے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ لیکن میں یہی کہوں گا کہ ہاں اصغر کا اصل شاعری تصوف ہے اور ٹھیٹ تصوف مگر وہ تصوف نہیں جو عباؤں اور بڑی بڑی داڑھیوں میں پوشیدہ ہے۔ وہ تصوف نہیں جس نے صدیوں تک اسلام کو نقصان پہونچایا۔ وہ تصوف

نہیں جس نے قوائے عمل کو بیکار کر کے مسلمانوں کو مجبور اور ناکارہ بنا دیا وہ تصوف نہیں جس نے مذہب و ملت اور سیاست کے پرخچے اُڑا دیے اور اسلام کے شیرازے کے تار و پود بکھیر دیے وہ تصوف نہیں جس نے خانقاہوں کے مقبروں میں جسدہائے بے روح دفن کر دیے جس نے توحید کے پردے میں صنم پرستی اور کافری سکھائی اور تقدیر تقدیر اور رضا و تسلیم پکار پکار کر کائنات کے ایک بڑے حصے کو عضو معطل اور مفلوج بنا دیا۔

اصغر اس تصوف سے اور اس کے گمراہ کن اصولوں سے خوب واقف ہیں چنانچہ اُن کا تصوف اس تصوف سے الگ ہے، اور وہ اس حد تک اس سے اجتناب کرنا چاہتے ہیں کہ رموز تصوف کے بیان کرنے کے لئے اُن اصطلاحات کو بھی استعمال نہیں کرتے جو عام طور پر "تصوف بازاری" میں استعمال ہوتے ہیں اور جن کے حاصل کرنے کے لئے آپ نے بڑی شفقت سے اپنے مضمون کے اختتام پر ان کو ان الفاظ میں مشورہ دیا ہے:—

"مجھے یہی عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ صوفیانہ نہیں بلکہ عارفانہ شاعری شروع کرنے سے پہلے مصطلحات صوفیائے کرام کا عمیق مطالعہ فرما لینے کی ضرورت ہے تاکہ ایسی ناقابل معافی لغزشیں جو شعر کا شعر سراپا مہمل بنا دیں آئندہ نہ ہوں" حیف!

نظر تو ہمہ تقصیر در خود نگرا ہی　　　　نہ رسی بزیر تقاضائے کلیم اللّٰہی

اول تو ایک شاعر جو بقول آپ کے مرحلۂ حسن تک نہ [illegible] اور [illegible] کوشش کرے گا کہ ہر حیثیت سے اپنی شاعری کو [illegible] کرے اور ارتقا کا [illegible] سے کہ [illegible] اصول سے انحراف کیا جائے اور اُن میں اس طرح سے اختراعات وایجادات کئے جائیں کہ [illegible]

دوسرے یہ کہ فطرت انسانی میں کہنے کو تو اختراع اور ایجاد کا مادہ موجود ہے لیکن ماہران نفسیات کا یہ دعوےٰ ہے اور صحیح دعوےٰ ہے کہ (Man is not a creative being) انسان موجد اور خلاق نہیں بلکہ اس میں کسی شے کے نظام کو بدلنے کی قوت ودیعت کی گئی ہے ....

(He arranges and rearranges things in new order) [illegible]

اور قوت بدلتا ہے اور کوئی نفس شے نہیں پیدا کر سکتا ہے۔

نقاد کا فرض ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کو بہ نظر غور دیکھے اور جہلیت کا فتوے دینے سے پہلے نئی چیز کو پہچاننے کی بلیغ کوشش کرے۔ اصغر نے اگر اپنا اسلوب بیان جداگانہ اور حقائق و معارف کے پیش کرنے کا انداز نیا اختیار کیا اور اس میں [illegible] قدرت حاصل کی تو کیا گناہ کیا؟ اصغر کبھی [illegible]

لائق عتاب اور مورد تعزیر نہیں ہو سکتے کہ اُنھوں نے نئے اسالیب اپنے عرض مدعا کے لئے کیوں گڑھے اور اپنے اصطلاحات کیوں وضع کیے۔ یہ نقاد کا قصور ہے کہ وہ ایک شاعر کو ارتقائی شاعر سمجھتے ہوئے اُس کے اشعار کو نظر تعمق سے دیکھنے سے اجتناب کرے۔ اور سطحی مطالب کی تلاش میں سرگرداں رہے اور جھنجھلا کر مہملیت کے سرٹیفکٹ عطا کرے۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں اصغر کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جنھیں نقاد نے مہمل سمجھ کر پیش کیا اور جن پر اصلاحیں دی ہیں۔ اور کوشش کروں گا کہ ان کی مہملیت کو دور کر دوں۔

شعر اصغر:- کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

حضرت آزاد نے دو اعتراض کیے ہیں (۱) لفظی اور (۲) معنوی۔

لفظی اعتراض :- آگ دینا بے محاورہ ہے۔

جواب :- اصغر صاحب تو گونڈوی ہیں زبان نہ جاننے کا الزام ان پر آ سکتا ہے۔ لیکن حضرت ثاقب لکھنوی جن کے پاس مشورے کے لئے آپ اصغر کو بھیجتے ہیں وہ فرماتے ہیں :-

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ہمارے اصغر صاحب سے پوچھنے کے ثاقب سے رجوع کیجئے وہ بتا دیں گے کہ آگ دینا محاورہ ہے یا بے محاورہ۔

(۲) معنوی اعتراض :- پہلا مصرعہ بتاتا ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے ہوس کو کچھ آگ دے کر عشق کی تعمیر کی اور دوسرا مصرعہ بتاتا ہے کہ ہوس جل کر خاک ہو گئی تو عرفاں بن گئی، غور طلب یہ ہے کہ ہوس جلنے والی اشیا میں نہیں جو جل کر خاک ہو جائے .... پھر ہوس اور عشق میں بعد المشرقین ہے ایک نور ہے دوسری نار۔ ہوس میں آگ کے اضافہ سے کیا حاصل۔ ہوس ترقی کر کے نار جہنم کا شعلہ بن جائے گی.... کیا ہوس بازی کے طوفان بے تمیزی کا نام عشق ہے ؟

(جواب) آگ دینا کے معنے چمکانا۔ اور روشن کرنا، اس شعر میں دراصل محبت حقیقی کے مدارج دکھائے ہیں۔ محبت کی ابتدا ہوسناکیوں سے ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ تبدیل ہو کر عشق کی صورت میں چمکتی ہے اور مجازی عشق سے موسوم ہوتی ہے لیکن مجازی عشق بھی ہوس ہے مگر (Refined) اصلاح پذیر فتہ۔ جس وقت یہ بھی ختم ہو جاتی ہے تو حقیقت کی سرحدیں نظر آنے لگتی ہیں اور ہوس کا خاتمہ ہو جاتا ہے یعنی وہ خاک ہو جاتی ہے۔ فرمائیے ہوس کی ناریت ختم ہو گئی یا نہیں۔

شعر:- اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

(آزاد) :- اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے محو خواب، فرمائیے اگر پسند ہو۔ موجزن تو

اس وقت ہوئی جب حسن و عشق کا ساماں بنی ۔

جواب :۔ مولانا برق کی رو ہمیشہ متحرک رہتی ہے ۔ علم طبعیات کی کھلی حقیقت ہے ۔ برق کی "محو خوابی" اس کی نیستی کے مترادف ہے ۔

مثبت اور منفی برقوں کی لہریں ہمیشہ اپنے میڈیم (Medium) میں گذرا کرتی ہیں ان کا ایک دوسرے سے ربط شعلہ گرمی وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ اب مطلب شعر واضح ہوگیا ہوگا۔

شعر:۔ جز دل درد آشنا اور کو یہ خبر نہیں ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

(آزاد) اگر "یہ" کے بجائے "کچھ" ارشاد ہوتا تو غالباً بہتر ہوتا ۔

(جواب) آپ ہی فرمائیے "کو کچھ" فصیح ہے یا "کو یہ" ۔

نیز "یہ خبر نہیں" سے تکمیل بے خبری کا پتہ چلتا ہے ۔ اور "کچھ خبر نہیں" میں وہ معنوی جامعیت نہیں ہے ۔

شعر:۔ خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے آصغر جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرز نظر ہے

(آزاد) طرز کی جگہ اگر وہم ہوتا ۔

(جواب) وہم اور طرز کے لطیف فرق کو آپ نے نظر انداز کر دیا ۔ وہم کے معنی ہیں دماغ کی وہ باطنی قوت جو فاسد خیالات پیدا کرتی ہے ۔ اسی واسطے واہمہ خلاق کہلاتا ہے یا پھر وہم کے معنی شک اور گمان کے ہیں ۔ اور یہ دونوں معنے یہاں چسپاں نہیں ہوتے، اور پہلی صورت میں نظر تابع وہم ہوتی ۔ لہذا جو کچھ نظر آتا ہے اس میں نظر معطل ہے ۔ طرز کے معنے انداز ۔ طریقہ اور روش کے ہیں ۔ اب فرمائیے کون لفظ زیادہ بہتر ہوگا ۔

شعر:۔ چاہیے داغ معصیت اس کے حریم ناز میں پھول یہ ایک بھی نہیں دامن پاکباز میں

(اعتراض) مصرعہ اولیٰ کے الفاظ :۔ "کہ مستحق کرامت گناہگار انند" کے معانی حامل ہوتے نظر نہیں آتے اس مصرعے کی نثر کیا ہوئی :۔ اس کی حریم ناز میں داغ معصیت چاہیے ۔ معانی بظاہر بہت صاف ہیں ۔

(جواب) کیا شعر کے اندر یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مصرعہ پورے شعر کے معانی کا حامل ہو؟ کیا شعر صوری اور معنوی لطافتوں میں سرمد کے شعر اور حافظ کے مصرعے سے بالاتر نہیں ہے؟ اور کیا اس کی حریم ناز میں داغ معصیت (کا پھول) چاہیے، میں "کا پھول" کو مقدر مان کر مصرعہ کی نثر نہیں ہو سکتی ۔

شعر:۔ گم ہے حقیقت آشنا ۔ بندۂ دہر بے خبر ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

ہائے ہائے ذرا اعتراض سُنیے :۔ حقیقت آشنا یعنے اہل اللہ ذات باری تعالےٰ کے سوا دنیا و ما فیہا سے مطلب نہ رکھنے کے باعث گم کہے جا سکتے تھے،۔۔۔۔ اب رہے دنیا دار جنھیں شاعر صاحب "بندۂ دہر" فرمارہے ہیں وہ کیونکر بے خبر ٹھہرے؟ اگر اس وجہ سے بے خبر ہیں کہ وہ "حقیقت آشنا نہیں" قابل غور ہے، اگر وہ بے ہوش ہیں تو اس کے ساتھ بندۂ دہر بھی تو ہیں۔ بے ہوش ہوتے تو دنیا کے کاروبار بحیثیت بندۂ دہر ہونے کے وہ کیونکر انجام دے سکتے تھے۔

جواب :۔ اول تو نقاد کا منطقی استدلال اور بالخصوص نتیجہ قابل داد ہے۔ اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد شعر کا مطلب ملاحظہ ہو۔

گم ہونا :۔ یعنے بے خبر ہونا، کسی خیال میں محو اور ساکت ہونا۔

حقیقت آشنا اس وجہ سے گم ہے کہ حقیقت سے آگاہی "از خود رفتن" کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے اور یہ گم شدگی بے ہوشی کی مترادف ہے جو قابل تحسین ہے۔ بندۂ دہر بوجہ علائق دنیوی میں گرفتار ہونے کے ناآشنائے حقیقت ہے، اور بندہ ماسوا میں ایسا گم ہے کہ نہ اپنی خبر ہے اور نہ حقیقت کی اور یہ بھی بے ہوشی ہے لیکن غیر مستحسن۔ یہ کہنا کہ بندۂ دہر بے ہوش ہو کر کیسے کام کرے گا۔ بیجا ہے۔ بندۂ دہر کے معنی یہی ہیں کہ جو ماسوا اللہ میں پھنسا ہوا ہو "ہوش کسی کو بھی نہیں"، صرف زور دینے (Emphasis) کے لئے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے سے دونوں گذر گئے ہیں لیکن ایک کی بے خبری مبارک اور دوسرے کی غفلت عبرت خیز ہے۔

شعر :۔ موج نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے اور بھی جان پڑ گئی کیفیت۔۔۔ نماز میں

اعتراض :۔ نسیم صبح کی جگہ "نسیم کعبہ" ہوتا؟

جواب :۔ نسیم کعبہ و نسیم صبح کی ترکیبوں میں کون زیادہ لطیف ہے آپ شاعر ہیں زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں۔ اگر نسیم صبح کی جگہ پر نسیم کعبہ چلنے لگتی تو اول تو شعر کی شعریت فنا ہو جاتی اور ملائیت کی جلاہند آنے لگتی اور نسیم کے ساتھ بجائے لطافت کے کچھ مسواکوں کے تنکے اور کچھ "جبین ریا" کی گھسی ہوئی خاک آجاتی۔

شعر :۔ حسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے ملحد باخبر بھی گم جلوۂ لاالٰہ میں

اعتراض یہ ہے کہ حسن ہزار طرز صفات الٰہیہ کے لئے لانا کہاں تک جائز ہے اور یہ کہ ملحد بظاہر باخبر کہے جانے کے قابل تو نظر نہیں آتا وہ تو شاید بے خبر ہی رہے گا۔ اگر باخبر ہوتا تو ایک لمحہ بھی ملحد رہنا گوارا نہ کرتا۔

جواب :- ہائے ہائے اتنا بلیغ شعر اور سمجھ میں نہ آئے۔ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مطلب شعر :- شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ملحد بھی جو بظاہر منکر خدا ہے حقیقت میں منکر نہیں۔ اس کے انکار میں اقرار پنہاں ہے۔ اس لیے کہ انکار اسی وقت لازم آتا ہے جب شے موجود ہو۔ لاشے سے انکار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لہذا ملحد کا انکار گویا اثبات وجود باری تعالیٰ کا مؤید ہے۔ غرضکہ "حقیقت" اپنی حقیقت کسی نہ کسی طرح تسلیم کراتی ہے۔ خواہ اثبات میں خواہ نفی کے ذریعہ۔ فرمایئے کیا اب بھی کوئی شک باقی رہا۔
اگر شاعر حسن ہزار طرز کہہ کر ایک ترکیب نو کا اضافہ کرتا ہے تو کیا گناہ۔ اگر شاعر حسن ہزار طرز سے احسان کا اسیر کرنا بیان کرتا ہے تو کیا ہرج ہے۔

شعر :- مے بے رنگ کا سو رنگ میں رسوا ہونا　　کبھی مے کش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

اعتراض :- بے رنگ پر اعتراض ہے کہ بے رنگ کے معنے صرف بے کیف و بے لطف اور بے رونق ہیں یک رنگ زیادہ موزوں ہوتا۔

جواب :- کاش جناب نقاد لغت دیکھنے کی تکلیف گوارا فرما لیتے۔ بے رنگ کے معنے سنیے :-
(۱) نقشہ تصویر کہ دراں ہنوز رنگ آمیزی نہ کردہ باشند (۲) ظہور وحدانیت حق تعالیٰ (غیاث اللغات بحوالہ برہان، رشیدی و بہار عجم وغیرہ) فرمایئے اب تو جناب کو بے رنگ کے معنی معلوم ہو گئے۔ نیز یک رنگ میں رنگ کی موجودگی عین ذات پر اتنی دلالت نہیں ہے جتنی رنگ کی بے رنگی غیر موجودگی۔ اس لطیف اور نازک فرق کو بھی آپ نے محسوس نہیں کیا۔

شعر :- ایک ایسی ہی تجلی آج مے خانے میں ہے　　لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

اعتراض :- مصرعۂ اولیٰ کا مصرعۂ ثانی سے کوئی ربط نہیں، تجلی ہوا میں معلق نظر آتی ہے۔ تجلی کا کام دیدہ و دل کو منور کر دینا ہو تو ممکن ہے۔ کھو دینا تجلی کا کام نہیں۔ یہ نہیں ارشاد ہوا کہ کیسی تجلی مصرعہ ثانی اگر نثر عبارت میں داخل ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔

جواب :- شاعر اگر یہ کہدیتا کہ ایک جھپکا چوند پیدا کر دینے والی تجلی ہے یا ہوش ربا تجلی ہے تو شاید جناب کو اعتراض نہ ہوتا لیکن شاعر نے بجائے فرسودہ الفاظ کے "ایسی" کو استعمال کر کے جس معنوی ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے وہ نقاد کی سمجھ میں نہ آئی۔ ربط مصرعوں میں نہ ہونے سے کیا معنی ہیں۔ کیا مصرعوں میں بھی نثر کی طرح حروف عطف سے ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے؟ اگر معنوی ربط کے متعلق ارشاد ہے تو اچھا خاصا ربط موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔
مے خانے میں مے و مینا کے علاوہ جو اپنی جگہ پر لطف آفرینی کے سامان ہیں، آج ایک اور

تجلی بھی موجود ہے جس میں محو ہو جانے کا کیف مے و مینا کے سرور سے بڑھا ہوا ہے۔ باقی رہا یہ کہنا کہ تجلی منور کرتی ہے کھوتی نہیں غالباً "سرسری نگاہ" بلکہ میں تو کہوں گا تجاہل عارفانہ کے باعث ہے۔ حضرت موسیٰ پر جو تجلی کوہ طور پر ہوئی وہ ان کو کھو نہ سکی؟ دراصل شاعر نے اس شعر میں اک فیضان انوار کا اور اس انشراح قلب کا ذکر کیا جو اسے منازل عشق طے کرنے میں یک بیک حاصل ہو جاتے ہیں اور اسے بیخود بنائے دیتے ہیں۔

"لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے" اور آپ کی اصلاح "کس کا پینا کیا پلانا لطف کھو جانے میں ہے" میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ آپ خود فراموشی کے باعث کھونے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ درانحالیکہ شاعر کے یہاں تجلی دعوت دے رہی ہے اور دو مختلف چیزیں اپنی اپنی کیفیت آفرینیوں کے ساتھ موجود ہیں اور ایک دوسری سے بڑھی ہوئی سلوک کے طریقہ فرسودہ پر چلنے کو شاعر نے پینے سے تعبیر کیا ہے اور "تجلی" اس کیف کا نام ہے جو اسے حاصل ہوئی اور اس میں وہ غرق ہونا چاہتا ہے۔

شعر:- معنی آدم کجا و صورت آدم کجا یہ نہاں خانے میں تھا اب تک نہاں خانے میں ہے

اعتراض:- یہ ہے کہ معنی آدم کے معنی انسانیت اور شرافت ایثار اور انکسار کے ہیں اور یہ چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں لہذا شعر مہمل ہو گیا۔

جواب:- معنی آدم کے وہ معنی نہیں جو جناب نے مقرر کیے ہیں بلکہ معنی آدم سے مراد اس کی کنہ اور حقیقت ہے یا اس کا مقصد تخلیق۔ یہ چیز ہمیشہ زیر بحث رہی ہے۔ مذہب کچھ کہتا ہے۔ عقل کچھ کہتی ہے۔ فلسفہ سیکڑوں طرح اس کو سمجھنا چاہتا ہے لیکن یہ راز اب تک راز ہے اور کسی کے سمجھ میں نہیں آیا۔

شعر:- رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جزو کل اب نہ کچھ شیشے میں باقی ہے نہ پیمانے میں ہے

اعتراض:- جزو کل اُڑا بیٹھنا محاورہ نہیں ہے۔ خانہ زاد ہے۔ ترمیم پیش کرتا ہوں۔

"رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُلٹ کر جام مے"

جواب:- اگر جزو کل اُڑا بیٹھنا محاورہ نہیں ہے تو "خالی ہاتھ بیٹھنا" پر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ نے جو اصلاح فرمائی ہے ذرا اسے غور سے پڑھیے شیشہ و پیمانہ دونوں کے خالی ہونے کا اندازہ جزو کل کے اُڑا دینے سے زیادہ صحیح ہوتا ہے یا آپ کے پیمانہ اُلٹ دینے سے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ رند خالی ہاتھ اور جام اُلٹے ہوئے اس وجہ سے بیٹھے ہوں کہ ساقی شراب نہ دیتا ہو۔ اس سے یہ کہیں لازم نہیں آتا کہ مے کا اسٹاک (ذخیرہ) ختم ہو گیا ہے۔

عورت کے جال میں بیڑا غرق

(از جناب مولوی محمد ظفر صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل)

جنگ عظیم میں بحر شمالی واقعی بحری نقل و حرکت کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن بحیرہ بالٹک بھی خالی نہ رہا۔ وہاں جرمنی کی بحری طاقت کو سخت صدمے پہونچے۔ ان کا باعث زیادہ تر روسیوں کی وہ سرنگیں تھیں جو اُنھوں نے بڑی ہوشیاری سے سمندر میں جا بجا بچھا رکھی تھیں۔ اس میں اُن کے خفیہ محکمہ نے بڑا کام کیا تھا۔ اس سمندر میں یوں تو اس لڑائی کے زمانہ میں کئی حادثے پیش آئے مگر ایک تو ایسا تھا جس میں جرمنی بحری بیڑے کا ایک معقول حصہ سمندر میں غرق ہو گیا اور اس کے امیر البحر کا درجہ سزا کے طور پر توڑ دیا گیا۔ اس سانحہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ سب کارستانی ایک عورت کی تھی ——
محض ایک عورت کی!۔

جرمنی کے اس بالٹک والے بیڑہ کے وارنٹ افسروں میں ایک خوبصورت بالوں کا کرلی جوان تھا جسے قدرت نے اوسط درجہ کی مردانہ خوبصورتی خاصی دیدی تھی۔ اُس نے ساحل کے برابر کے علاقہ کی عورتوں کی ایک جماعت میں ایک عجیب قسم کی فریفتگی پیدا کر رکھی تھی۔ اس خوبصورت بحری افسر کے کارنامے مختلف وضع قطع کے تھے جن سے اُس نے عورتوں کے دل پامال کر ڈالے تھے۔ حتے کہ اُس کا نام "کاسل ترین حسین کُش" اس ساحل پر زبان زد ہو گیا جس سے وہ تو خوش ہوتا تھا لیکن اُس کے ہم عصر افسر جلے مرتے تھے۔ اس کے متعلق یہ عام طور پر مشہور تھا کہ وہ آیا، دیکھا اور فتح کر کے چل دیا۔
اس کا نام کرٹ بریمیرمین تھا۔

وہ اُس سلسلہ میں ساحل پر جلد ایک مشہور ہستی بن گیا۔ وہ اپنے رفیق افسروں سے عموماً بازی لگایا کرتا کہ فلاں فلاں مس کو ایک ہفتہ میں اپنے قدموں میں گرا لے گا اور اُس نے کبھی بازی نہیں ہاری! حتے کہ اُسے کسی نے لیباؤ کی اینا کی خبر دی......

اُسے بتایا گیا کہ اینا ایک چھوٹے سے ہوٹل کی روسی خادمہ ہے۔ اُس ہوٹل میں جرمن افسروں کا ہجوم رہتا تھا کیونکہ لیباؤ کو روسی خالی کر چکے تھے اور جرمنوں نے اُس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُس کے دلفریب حسن میں کسی کو شبہ نہ تھا لیکن اُس کی ایک ادا ناقابل مزاحمت تھی جس نے اُس کے غیر معمولی حُسن میں چار چاند لگا دئے تھے۔ اُس میں نفاست اور ایک شان امتیاز تھی جس کی وجہ سے جرمن بیڑہ کے افسر ایک دوسرے کے اوپر گر پڑ کے اُس تک پہونچتے اور اُس کے دل میں جگہ پانے کی کوشش

کرتے لیکن اُس کی حیا و سکوت کے سامنے کسی کی ایک پیش نہ جاتی۔۔۔۔
اُس میں کوئی بات تھی بھی ایسی جس سے کسی کو اس پُراسرار حسینہ سے بے تکلف ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ مسکراتی، باتیں اور بذلہ سنجی کرتی سب سے تھی اور کبھی کبھی کسی سے ناز نخرہ بھی کر لیتی لیکن قابو میں کسی کے نہ آتی!
یہ تھی لیباڈُکی اینا ــــ اُنھوں نے اُسے مغلوب کرنے پر اُبھارا۔۔۔۔۔ انھوں نے اپنی ایک ایک مہینے کی تنخواہ کی بازی لگائی کہ وہ ضرور ہار جائے گا۔۔۔۔۔
ایک روسی ادنےٰ خادمہ اور ناقابل تسخیر۔۔۔ کرٹ بریمرمین نے ناک چڑھائی۔ کندھے چڑھائے، اُس نے بازی قبول کر لی!
جیسے ہی اُس کا کروزر لیباڈُ کے ساحل سے لگا۔ کرٹ بریمرمین اپنی بازی جیتنے کے لئے چلا۔ وہ تقریباً روزانہ اس ہوٹل میں جاتا جہاں اینا ملازم تھی اور اس نے اس پر اپنی ساری مردانہ خوبصورتی کا زور ڈالنا شروع کر دیا۔
دن گذر گئے۔۔۔۔۔ اینا خاموش اور شرمگیں تھی اور برابر خاموش اور شرمگیں رہی۔ اس اثنا میں عورتوں کے اس شکاری کے دل میں بھی کوئی عجیب اور باریک بات پیدا ہو رہی تھی۔۔۔۔۔
ایک پُرانی، بہت پُرانی کہانی تھی کہ ایک شکاری خرگوش کا شکار کرنے چلا آخر میں وہ خود اُس کا شکار ہو گیا۔۔۔۔
قاتل خود ہی قتل ہونے والا تھا۔ کرٹ بریمرمین مذاق میں آیا تھا ــ وہ اب سنجیدگی سے وہاں ٹھہر گیا۔ خوبصورت جرمن اپنا دل لیباڈُ کی ''ایک ادنیٰ خادمہ'' کے ہاتھ کھو بیٹھا۔ اور ایک اٹھوارہ میں جب اینا کی عمیق نیلگوں آنکھوں میں کچھ پگھلنے کی علامات نمودار ہوئیں اُس کے کروزر کو کسی کارِ منصبی کے سلسلہ میں وہاں سے واپسی کا حکم مل گیا!
قسمت کس قدر بے رحم ہے! اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ وہ دونوں چیزیں ہارے گا جو اُس نے پہلے کبھی نہ ہاری تھیں ــــ دل اور بازی!
اُس کا دل مسلنے لگا جب وہ اس عورت کو جس سے وہ محبت کرتے آیا تھا کسی دوسرے آنے والے کے رحم پر چھوڑ جانے پر مجبور ہوا۔۔۔۔ اُس کا فرض مقدم تھا۔ اُس کی محبت پھر کسی وقت کے لئے ملتوی کرنی ضرور تھی! یہ حقیقی زندگی کا ایک عام ناٹک ہے جسے ہم روزانہ اپنے اردگرد دیکھا کرتے ہیں
اب یہ وقت وہ تھا کہ بالٹک کے جرمن بیڑہ کے سامنے خلیج ریگا میں روسی مرکزی مقامات پر ابتدائی

بارھانہ کارروائی بڑے پیمانہ پر عمل میں لانے کی تدبیر درپیش تھی۔ لیباؤ جسے روسیوں نے خالی کر دیا اور جرمنوں نے جس پر قبضہ کر لیا تھا فوجی صدر مقام قرار دیا گیا۔ وہاں سے ہیبت ناک روسی سرنگ لگانے والوں کے درمیان میں سے زن سے نکل جاتا تھا۔ تباہ کن جہاز اور روسیوں سے بھری ہوئی کشتیاں آگے بڑھائی جاتی تھیں اور اندھیرے اور زبردست گولہ باری کی آڑ میں ریگا کے قریب جزیرہ اوسل کی زمین پر فوجیں اتارنی تھیں لیکن سب کو صرف ایک خطرہ روسی سرنگوں کا ہی تھا۔ وہ ہر جگہ اچانک نمودار ہو جاتی تھیں اور نہایت تکلیف دہ اور مشکل کے مقام پر تواد ہدا کے آموجود ہوتی تھیں اگر انھیں صرف ان کا صحیح مقام معلوم ہو جاتا تو اُن کا خوب سوچا ہوا حملہ یقیناً کامیاب ہو جاتا۔ جرمنی کا محکمہ جاسوسی ہمہ تن اسی کوشش اور تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔

بیڑہ بالٹک کے جرمن امیر البحر نے حکم دیا کہ خلیج ریگا کی روسی سرنگوں کا کوئی نقشہ اُٹھا لا دے وہ دشمن کو کچل ڈالنے والی فتح حاصل کر کے دکھا دوں گا۔

یہ حکم چاروں طرف پہونچ گیا اور جرمن بیڑہ کا ہر افسر کپتان سے لے کے عقبی امیر البحر تک سب کے سب ہمہ تن چشم و گوش بن گئے۔

محبت کے شروع میں لیہی قسمت کرٹ بربیرمین کے حق میں سخت نامہربان تھی لیکن اب اس کا دل کچھ پگھلتا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا کروزر ایک پوشیدہ روسی سرنگ سے ٹکرا گیا اور اس معجزہ حملہ سے پہلے ایک اٹھوارہ کے لئے لیباؤ میں مرمت کی خاطر وہ واپس جانے پر مجبور رہا۔ یہ کہنا بے سود ہے کہ اُس نے اپنا خالی وقت اپنے مفید مطلب خوب استعمال کیا۔

اینا اُس پر کچھ مہربان ہوتی معلوم ہوتی تھی باینہمہ ایسا نظر آتا تھا کہ اُسے اُس پر پورا اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ کرٹ بربیرمین جو اپنے طریقہ سے عورت کا دل بڑھنے میں ماہر تھا صاف دیکھ رہا تھا کہ اُس کے دل میں کوئی بات ہے اور کچھ ایسی بات ہے جو اُس میں اور اُس کی فتح میں آڑ بن کے رہ گئی ہے۔

اُس نے بار بار پُر جوش آواز میں اُس سے کہا۔ مجھے تمھارے راز کی حقیقت سے کوئی سروکار نہیں۔ تمھاری پچھلی زندگی سے میرا کیا تعلق — میں تو تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ میں تمھیں کس قدر چاہتا ہوں۔ ذرا بتاؤ کہ میں یہ کس طرح کر کے دکھا دوں۔

آخر اُس کے عزم میں جنبش ہوئی۔ اُس نے سسکیوں اور آنسوؤں کے تلاطم میں اپنی درد کہانی کی تفصیل بیان کی . . . . .

•

وہ اٹھارہ سال کی ایک خوبصورت بے یار و مددگار لڑکی تھی۔ دو سال ہوئے اُسے

اس زمانہ میں جب لیباؤ پر روسیوں کا ہی قبضہ تھا ایک خوبصورت روسی بحری افسر ملا۔ وہ الھڑ تھی اور دنیا سے بے خبر اُن میں باہم محبت ہوگئی۔ اُس نے سادگی سے اُس کی بات کا اعتبار کیا کہ وہ اس مقام کے روسی قبضہ سے خالی کئے جانے کے بعد ہی جس کی عرصے سے توقع تھی اس سے شادی کرکے اور بیوی بناکے اُسے روس لے جائے گا۔ اُسے اُس افسر سے محبت تھی عشق تھا۔ اُس نے اُسے بتایا کہ وہ اُس کے لئے جان دیدے گا۔ اپنی جوانی کی ترنگ اور اس نئی نئی محبت کے نشہ میں مخمور ہوکے اُس نے اُس پر اعتبار کر لیا اور تن بدن سب کچھ اُسے سونپ دیا۔ چند ہی ماہ میں اُسے پتہ چلا کہ وہ حاملہ ہے لیکن شادی ابھی اُس سے کنارہ کش ہی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ اس مسئلہ پر گفتگو کرتی اُس کا عاشق زار کوئی نہ کوئی ایسا عذر گھڑ کے کھڑا کر دیتا کہ اُس کا سادہ بے لوث دل فوراً مان جاتا۔ اُس میں اپنی ہنگامی لطف کے سحر کو توڑ ڈالنے کی مطلق ہمت نہ تھی۔ — آہ یہ ایسا خوشگوار اور پُر لطف تھا! آخر لیباؤ کے خالی کرنے کا بھی دن آگیا۔ اُس کے نزدیک یہ دن روس کی سرزمین پر ایک نئی زندگی کے طلوع کا دیباچہ تھا۔ وہ سوچا کرتی کہ بچہ والی بننے میں دل کا کیا حال ہوگا — روس میں ہونے سے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔ اُس نے اپنی چیزیں، اپنی اور افسر کی، باندھ لیں کیونکہ اب وہ کھلے بندوں ساتھ رہنے اور لیباؤ چھوڑنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔

وہ اُس روز آیا اور اُس نے اپنے نوکر سے کہا کہ اُس کا سارا سامان لے چلے اور جب اس بیچاری نے اپنے متعلق پوچھا تو وہ اُس پر ہنسا اور کہنے لگا کہ جب تک یہ تماشہ رہا بڑا پُر لطف تھا اور اب ؏
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔

اُس نے اس کی بات سُن تو لی مگر پھر بھی کچھ نہ کہہ سکی جب اُس نے اُسے روانہ ہوتے دیکھا تو اُسے اپنی پر درد حالت کا احساس ہوا۔ وہ روئی، گڑگڑائی، اُس نے منت کی...... وہ کم سے کم اس بچہ پر ہی ترس کھائے۔ چھوڑنے سے پہلے شادی ہی کرلے — اُس نے اُس کی ہنسی اُڑائی۔ اور بولا۔ ایسا کیوں کروں۔ میرے تو پہلے ہی بیوی اور دو بچے پیٹرو گراڈ میں موجود ہیں۔ رہا یہ تحفہ جو تمہارے پیٹ میں ہے۔ مجھے کیا اعتبار تم جیسی عورت کا جو اس کی ماں ہو کہ وہ میرا ہی ہے۔

وہ مجنونانہ جوش سے چلا کے بولی۔ شیطان! میں تجھے ہرگز نہ جانے دوں گی۔ اور اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ اُس نے لات مار کے اپنی ٹانگیں چھڑا لیں۔ جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کرکے چل دیا اور اُسے ہمیشہ کے لئے ایک ذلیل عورت بنا کے چھوڑ گیا۔ بعد میں ایک بچہ ہوا جو اس وقت ایک یتیم خانہ میں ہے اور اب وہ اپنے بچہ اور اپنے انتقام کے لئے زندہ ہے!

یہ اینا لیبا ڈ کی کہانی تھی۔ کرٹ برمیرمین فضول طبیعت کا آدمی تھا ہی اُس پر اس کہانی نے بڑا اثر کیا۔ اُس نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔ تمہیں پتہ ہے وہ کون تھا؟ اُس کا نام کیا تھا؟ اُس نے جواب دیا میں اُسے سرج کہا کرتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ ساحلی دفاعی فوج کا افسر ہے۔ بس مجھے اتنی خبر تھی۔

اُس نے کہا۔ تمہارے پاس اُس کا کوئی خط ہے؟ شاید اس سے اُس کا کچھ پتہ چل جائے۔

اُس نے کچھ دیر بظاہر سوچا اور تامل کیا۔ پھر کہا۔ میرے پاس اُس کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے اُس کا کھوج لگ سکے۔ مگر ہاں۔ وہ جلدی میں اپنا سفری چرمی تھیلہ بھول گیا۔ میں نے بعد میں اُسے ٹٹول کے دیکھا تھا۔ اس میں کچھ نقشے اور کچھ ہندسے معلوم ہوتے ہیں جو میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آئے لیکن اگر تمہاری سمجھ میں کچھ آسکیں تو لو دیکھ لو۔

یہ کہہ کے وہ اندر اپنے سابقہ عاشق کا تھیلہ لینے گئی۔ کرٹ برمیرمین نے دل میں کہا۔ ساحلی دفاعی فوج کا افسر..... چند نقشے..... کچھ ہندسے..... ہوں اُوں..... کام کی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ تھیلہ لانے اور کاغذ باہر نکالنے میں کچھ بھی دیر نہ لگی۔ برمیرمین نے نقشوں اور مخفی ہندسوں پر سرسری نظر ڈالی۔ اُسے بحری چالبازیوں کا اتنا علم تھا کہ وہ فوراً تاڑ گیا کہ یہ انہیں نبرنگوں کے نقشے ہیں وہی کاغذات ہیں جن کے لئے سارا جرمن جاسوسی کا محکمہ سرگرداں ہے۔ قسمت نے اُسے فوری ترقی کا موقع دیدیا ہے۔ وہ کاغذات کو اُن کے مناسب مقام پر پہونچا دے گا۔

اُس نے احتیاط کے لہجہ میں کہا۔ میرے ایک دوست کو ایسی خفیہ تحریروں کا علم ہے۔ میں انھیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔ اگر ان میں کچھ ہوگا تو ان سے پتہ چل جائے گا۔ اور اب اینا، جو کچھ بھی تمہیں پیش آیا اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ تم میری بن جاؤ۔ کیا تم مجھ سے شادی کرلوگی؟

اس کا اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اپنی طرف سے پھرتے دیکھا۔ وہ عورتوں سے واقف تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ موقع ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے اینا کے غیر مزاحم جسم کو اپنی بغل میں لے لیا اور اُس کے ہونٹوں پر اپنی حقیقی محبت کا پہلا بوسہ ثبت کر دیا۔

وہ اینا سے اُس روز رخصت ہوتے وقت بے حد خوش تھا۔ بلاشبہ وہ بازی ہار چکا تھا لیکن آج اُسے دو بہترین چیزیں ـــ یقینی ترقی اور حقیقی محبت ـــ میسر آگئی تھیں۔

ان قیمتی دستاویزات کو جیب میں رکھے ہوئے کرٹ برمیرمین شام کے وقت اپنے افسر اعلےٰ کے سامنے رکھنے کے لئے ہوا کے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ ان کاغذات میں کیا تھا؟ بہت بہت شکریہ ترقی۔ شاید کپتانی!

اور اس کی مسرت بالکل جائز تھی کیونکہ جب جرمنی کے بحری مبصروں نے ان کا غذات کی پڑتال کی تو ایک نقشہ میں ان سب مشتبہ مقامات کے نشانات تھے جہاں سرنگیں پوشیدہ تھیں اور جو معلومات خود اُن کو حاصل تھیں اُن کے وہ بالکل مطابق تھا۔

جرمنی کے بحری حکام نے خوشی میں تالیاں بجانا اور کرٹ بربیرمین کے شکریے ادا کرنا شروع کئے اب اُنھوں نے مجوزہ حملہ کی تدابیر شروع کیں۔ کرٹ بربیرمین کی تعریف ہر شخص کی زبان پر تھی۔ وہ اپنے وقت کا دیوتا بن گیا تھا۔

حملہ سے ۳۶ گھنٹے بیشتر جائزہ لیا گیا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا محفوظ راستہ سے آزمائشی پیش قدمی کی گئی۔ ہر بات اس نقشہ کی تصدیق کرتی تھی جو جرمنی کے حلقوں میں " بربیرمین کا نقشہ " کے نام سے زبان زد خاص و عام تھا۔

وقت مقررہ پر جرمن تباہ کن جہازوں کی لین ڈوری خلیج میں دھواں اُڑاتی پہونچی۔ سمندر پر پانی تک کہر چھایا ہوا تھا اور اس سے ان کی موجودگی بالکل پوشیدہ ہو گئی تھی۔ جہاز جب عین اندر پہونچ گئے تو روسی توپ خانہ نے گولہ اندازی شروع کر دی۔ مخفی نقشہ کی مدد سے جرمنوں نے جواب میں گولے پھینکے اور اس طرح دشمنوں کی توپوں کو اپنی طرف لگا کے تباہ کن اور دیگر جہاز خطرناک سرنگوں سے لبریز قطعہ میں چکر کھا کھا کے گذرنا شروع ہوئے۔ ہر بات اندازہ و تجویز سے کہیں بہتر پائی گئی۔ جلد ہی روسی توپ خانہ نے گولہ اندازی بند کر دی۔ (ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اتفاق سے کوئی نشانہ اس پر بیٹھ گیا۔ جرمنوں کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اب بظاہر اُنھیں ساحل پر فوج اُتارنے اور قبضہ کر لینے کی دیر تھی !

آدھا فاصلہ طے ہونے پایا تھا کہ جرمن بیڑہ پر قیامت نازل ہو گئی۔ جیسے ہی آگے کے تباہ کنوں نے نقشہ کے مطابق روسی سرنگوں سے بچ کے نکل جانے کے لئے دائیں طرف کو پلٹا کھایا دو بہرا کر دینے والے دھماکے ہوئے۔ پانی کے بھاری بھاری ستون آسمان میں اُٹھے اور جب وہ اپنی جگہ پر پہونچے تو دکھیا گیا کہ جہاز ڈوب رہا ہے۔

اب واقعات نے ظہور پذیر ہونا شروع کیا۔ نقشہ کے مطابق جو محفوظ پلٹا کھایا جاتا ایک دھماکا اور جہازوں کی غرقابی یا نقصان ساتھ لاتا۔ اور ان کی مصیبتوں اور ابتری میں اضافہ کرنے کے لئے پاس ہی ایک توپ خانہ نمودار ہو جاتا جو اس مخفی نقشہ میں نہ دکھایا گیا تھا۔ وہ گولہ باری شروع کرتا اور اس کے ساتھ اور توپیں بھی ہر طرف سے چلنے لگتیں۔ جرمن جہاز بھنور میں تھے۔

وہ نقشہ پر بھروسہ کرکے اور چل کے توپ خانہ کے گولوں کی عین زد میں آگئے تھے۔ اُن سے بچ کے نکلنا چاہتے تو وہ سرنگوں سے ٹکرا جاتے۔ یہ دوگونہ عذاب تھا۔ جہاز پہ جہاز ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ ڈوب رہا تھا۔ جو جرمن فوج ساحل پہ اُتر پڑی تھی۔ گاجر مولی کی طرح کاٹی جا رہی تھی حملہ سے کچھ بھی فائدہ نہ تھا۔ جرمن جمعیت تمام اُلٹے پاؤں بھاگی لیکن روسی گولوں نے اُن کا پیچھا کیا اور اُن کو سخت نقصانات پہونچائے۔

کرٹ بریمرین اور اُس کے بقیہ نقشہ کا بھلا ہو۔ بیڑہ بالٹک کی ہوا اُکھڑ گئی۔ اس کا امیر البحر اس بُلا لیا گیا اور جرمنی کے حکام کے غصہ کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ فوجی عدالت بیٹھی لیکن یہ بخوبی ثابت ہوگیا کہ کرٹ بریمرین نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا۔ اس کی معشوقہ، لیباڈ کی خادمہ اینا، کی ہر چہار طرف تلاش کی گئی لیکن وہ تو معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں اُڑ گئی کہ غائب ہوگئی۔ جنگ کے باقی ماندہ زمانہ میں صدر مقام کی ہدایات کے مطابق بیڑہ بالٹک کو مدافعت پر رہنا پڑا۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کے پی رہا تھا!

روسی محکمۂ جاسوسی کے اچھے دماغوں نے جرمنی کی روسی سرنگوں کے نقشہ کی جستجو کی سُن گن پالی تھی۔ اُنھیں کرٹ بریمرین عورتوں کے ماہر شکاری کا بھی حال معلوم ہوگیا تھا۔ اُنھوں نے دونوں کی آرزو پوری کر دینی چاہی۔ کرٹ بریمرین کو اس کا شکار اور جرمن بیڑہ کو اس کا مطلوب مخفی نقشہ۔ جن کی دونوں کو سخت تمنا تھی!

بلاشبہ یہ سب ماجرا ایک عیارانہ تھا جو صرف ایک حد تک صحیح تھا۔ اُنھوں نے کترینہ اصل میں کوجر ایک اچھے خاندان کی عورت تھی لیکن چند سال تک وہ بطور ایک ایکٹرس کے اور بعد میں پیٹرس برگ کے محکمۂ بحری میں بطور ایک سکریٹری کے کام کرچکی تھی اس تدبیر کو بروے کار لانے کے لیے مقرر کیا۔ اُس نے اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دیا اور اُن کا مصنوعی نقشہ اُن کی بڑی سے بڑی توقعات سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

کرٹ بریمرین فوجی عدالت سے بری ہوگیا اور وہ جنگ میں برابر شریک رہا لیکن اس قصہ کا ایک پُر لطف خاتمہ ہے۔ ریگا کی مصیبت کے مہینوں کے بعد اُسے نہر کیل میں برلن کی مہر لگا ہوا ایک خط ملا جس میں اس کی لیباڈ والی اینا نے لکھا تھا:—

"میرے مظلوم کرٹ! مجھے تمھارے اس دھوکہ سے آنکھیں کھُلنے کا بہت افسوس ہے لیکن اگر تمھیں مجھ سے ایسی ہی سچی محبت ہے جس کا تم بار بار دعوے کیا کرتے تھے تو یقین کرو کہ مجھے

تھیں دھوکہ دیتے کی کوئی دلی خوشی نہ تھی۔ جس طرح تم اپنے ملک کی خدمت انجام دے رہے تھے اُسی طرح میں بھی اپنا فرض ادا کر رہی تھی"

لڑائی کے بعد کرٹ بربیرمین ہیمبرگ میں جہازوں میں مال لادنے اور اُتارنے کے کام پر قلی بن گیا اور اُس کے قبضہ میں اپنا کا وہ خط ہے جسے وہ بہت قیمتی سمجھتا ہے۔ وہ اب تک اُسے بیا ہی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ عورتوں کے شکار کرنے کے مرض سے نجات حاصل ہو گیا ہے کیونکہ بہت تلخ نقصان کے بعد زندگی کی ایک بڑی صداقت اُس پر عیاں ہو گئی ہے ..... جو چیزیں ہمیں زندگی میں بالکل اصلی اور سچی معلوم ہوتی ہیں اکثر و بیشتر سب سے بڑا گر بہت درخشاں دخوشنما فریب اور جھوٹ ہوا کرتی ہیں ....

(ترجمہ)

کلامِ سرور

(از جناب سید سرور علی زیدی صاحب سرور الہ آبادی)

پردے میں رنگ و بو کے کس کی ہیں یہ ادائیں — کر جائیں محو حیرت لیکن نظر نہ آئیں
حسن ازل نے پائیں مخصوص کچھ ادائیں — مسحور کیوں نہ ہوتیں کونین کی فضائیں
اسرار کے کرشمے انوار کی ادائیں — دیکھیں جو ہر جگہ ہم تو کس طرح بھلائیں
آیا ہے موسم گل ناحق ہے اب تامل — بادِ سحر کے جھونکے کلیوں کو گدگدائیں
آیا ہوں میکدہ میں چشم کرم ہو ساقی — ایسی پلا قدم اب توبہ کے لڑکھڑائیں
یہ ان کی پردہ داری یہ اُن کا خاص پردہ — رہ کر مری نظر میں مجھ کو نظر نہ آئیں
میرے شکستہ دل کا اعجاز دیکھ لینا — پہونچیں گی لامکاں تک اس ساز کی صدائیں
محشر میں معصیت کی پرسش ہوئی نہ کچھ بھی — رحمت کو جوش آیا بخشی گئیں خطائیں
وہ میری جستجو میں نکلے ہیں اپنے گھر سے — مقبول ہو گئی ہیں اب بالیقیں دعائیں
اے پیکرِ محبت صرف اتنی آرزو ہے — میری نظر میں جلوے بس تیرے ہی سمائیں
اللہ رے کسی کی یہ شانِ دلربائی — ہر ناز سے نمایاں سحر آفریں ادائیں

احباب نے بنایا اب ان کو صدرِ محفل
سرور کو یہ ہے لازم اشعار کچھ سنائیں

یورپ پر اسلام کے احسانات

(از جناب مولوی شمس اشرف صاحب عباسی، بی۔ایس۔سی)

ہم لوگ اہل یورپ کی تحقیقات علمیہ سے اس قدر مرعوب ہو گئے ہیں کہ کبھی دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ مشرق مغرب کی گرفت سے آزاد ہو سکے گا۔ گرفت سے میری مراد سیاسی اقتدار و حکومت نہیں ہے بلکہ ہم لوگوں کے دل و دماغ ہمارے قابو میں نہیں رہے ہیں۔ یورپ ہماری قوت فکر کو جس راہ پر لگا دیتا ہے اُسی پر ہم چلنے لگتے ہیں۔

مغرب سے ہم نے بہت سی باتیں سیکھی ہیں اور اس لئے اُس کا ادب ہم پر فرض ہے لیکن یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ہم اس چیز کو نظر انداز کر دیں کہ خود یورپ نے اس بام رفعت پر پہونچنے کے لئے کس کس خرمن سے اپنے مطلب کی غذا حاصل کی ہے۔ یورپ والوں نے ایشیائی علوم و فنون میں دستگاہ بہم پہونچا کر اچھی باتوں کا اکتساب کر لیا۔ اور آج کمال عیاری سے (جو کہ ہر مغربی قوم کا خاصہ ہے) ہم کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب کے قابل تعریف نقوش کا اخلاق خود یورپ ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ کمال عاجزی سے اپنی تہذیبوں کو بھول کر مغربی تعریف کے راگ گانے لگے ہیں۔

لیکن اب بھی یورپ میں بعض ایسے انصاف پسند لوگ موجود ہیں جنھوں نے گذشتہ حالات کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کن کن اقوام کا مرہون منت ہے۔ انھیں میں سے ایک صاحب میجر ٹی، جی، لیونارڈ ہیں جنھوں نے ایک کتاب بعنوان "اسلام اُس کی اخلاقی اور روحانی قدر" لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے جگہ جگہ مغرب والوں کی عیاریوں کا پردہ فاش کیا ہے۔

اسی کتاب کے ایک حصہ کا ترجمہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ 'مترجم'

اسلام کے ساتھ یورپ کا طرز عمل احسان مندانہ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یورپ
سان فراموش ہے اور اُس نے آج تک کبھی اسلامی معاشرہ اور تہذیب کے اُن ابدی احسانات کا
ر نہیں کیا جنھوں نے یورپ کو آج یورپ بنا دیا ہے۔ محض قسم کھانے کے لئے اور چھیڑا اتارنے کی
طر وہ دبی زبان سے اس بات کا اقرار کر لیتا ہے کہ جب یورپ کے باشندے ازمنۂ تاریک کی
التوں میں غرق تھے تو اسلامی تہذیب، عربوں کے ہاتھوں عمرانی اور حکمیاتی Scientific
رکت کے اعلےٰ مدارج پر پہونچ چکی تھی۔ جس نے یورپین معاشرہ کی ٹمٹماتی شمع کو اپنی ضو باری سے دوبارہ
ور کر کے اُس کی لاج رکھ لی۔

کیا ہماری آنکھیں اس زعم میں کہ ہم نے تہذیب، ثقافت اور تمدن کا اعلیٰ ترین معیار حاصل کر لیا ہے، اندھی ہو گئی ہیں اور ہم یہ دیکھنے سے قاصر ہیں کہ اگر عربوں کی بلند ثقافت، اُن کی تہذیب اور ذہنی و معاشری شوکت اور اُن کے مدارس و مکاتب کا صحیح نصب العین ہماری مدد نہ کرتا تو یورپ آج بھی قعر ذلت کی اُن ہی تاریکیوں میں پڑا ہوتا جن میں چند صدیوں قبل تھا؟ کیا مسلمانوں کا یہ نصب العین ہمارے حافظہ سے اُتر چکا ہے کہ "کوئی شخص کسی خاص مذہبی مسئلہ میں کتنا ہی دقیق النظر کیوں نہ ہو جائے اُس کا تحقیقی نقد علم جس قدر عوام کے لئے مفید ہو سکتا ہے اس کی دقت نظری نہیں ہو سکتی"؟ نیز یہ کہ یورپ کے غیر روادارانہ برتاؤ کے مقابلہ میں مسلمانوں کی آزاد خیالی کس طرح کامیاب ہوتی رہی ہے؟ کیا یہ بات ہمارے دل و دماغ سے نکل چکی ہے کہ خلافت اُس زمانہ میں قائم ہوئی جب کہ روما اور ایران کی قدیم ترین تہذیبیں انتہائی پستی اور نکبت کی حالت میں اپنی زیست کے دن پورے کر رہی تھیں اور خود یورپ پر بربریت کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے؟ کیا عربوں کی غیر معمولی شجاعت — جو ایمان باللہ کے باعث اُن میں پیدا ہو گئی تھی — ہمارے لئے جاذب توجہ نہیں ہے؟-

انسانیت جس قعر مذلت میں پہونچ چکی تھی وہاں سے اُس کو نکال کر اعلیٰ علیین پر پہونچانے کا ایک شعلہ بداماں جوش تھا جو عربوں کو ہر دم نئی نئی فتوحات کے لئے ابھارتا رہتا تھا۔ لیکن اس کے باوصف اُنھوں نے مفتوح اقوام کے ساتھ اپنا جو معتدل اور روادارانہ برتاؤ قائم رکھا، کیا وہ بھی ہمارے لئے باعث غور و فکر نہیں ہے؟ خصوصاً جب کہ ایک ادنیٰ تامل سے ہم کو یہ بات یاد آ جاتی ہے کہ عیسائیت کے دور میں ظلم و تعدی اور شاہی سرگزشتوں نے، مذہبی جبر و استبداد اور سخر کے ساتھ مل کر حب الوطنی کا عملاً خاتمہ کر دیا تھا اور اُس کی جگہ نکبت زدہ کلیسا نے لے رکھی تھی۔

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ اسلام پر غور کرتے وقت یورپ نے خود اپنے ازمنۂ تاریک — ذہنی گمراہی کا وہ ہیبت ناک دور جو علوم متداولہ کے زوال کے ساتھ شروع ہوا تھا (یعنی اُس وقت جب کہ پانچویں صدی میں بربروں نے یورپ میں اپنے قدم مضبوط جما لئے تھے) اور نشاۃ ثانیہ یعنے چودھویں صدی کے آخر تک جاری رہا — کو بالکل فراموش کر دیا ہے؟ کیا یہ بھی واقعیت سے خالی ہے کہ یورپ نے عیسائیت کی اُس حالت کو بھی انسیاً منسیاً کر دیا ہے جو پندرھویں صدی کے وسط میں جب کہ نشاۃ ثانیہ اپنا نصف دور ختم کر کے شباب کے عالم میں تھی، اُس پر طاری تھی؟

علم کے جویا عربوں کی شاندار خدمات کیا یورپ میں اس قدر احسان فراموشی موجود ہے کہ وہ عرب علمائے سائنس و فلسفہ کی شاندار خدمات سے لاعلمی کا اظہار کرے۔ کیا اُسامہ۔ ابو غسان، البیرونی، البیطار۔ بوعلی سینا

(مشہور حکیم اور فلسفی) قرطبہ کا ابن رشد (جس نے ارسطاطالیس کے نظریات پر روشنی ڈالی تھی) اور بہت سے دوسرے اکابر ہمارے لئے کوئی قابل ذکر اہمیت نہیں رکھتے ؟۔

عربوں کے عظیم الشان کارنامے اور اُن کی وہ لازوال شہرت جو اُنھیں اپنی چھوڑی ہوئی کتابوں سے حاصل ہونا چاہئے، کیا یورپ کی بدنیتی اور احسان فراموشی کی بھینٹ چڑھا دیے جائیں گے۔ کیا الحزن Al hazen جیسے عالم کے بنیادی انکشافات ہمارے لئے کوئی قیمت نہیں رکھتے ؟ (الحزن نے علم المناظر Optics پر متعدد مجلدات تصنیف کئے۔ ہوا کا وزن دریافت کیا۔ بینائی سے متعلق یونانیوں کے غلط قیاسات و نظریات کی تصحیح کرکے، پردۂ قرنیہ Retina کے افعال دریافت کئے) کیا غزالی جیسے مفکر کا ہم پر کوئی احسان نہیں ہے، جس نے اپنے عنفوان شباب کے زمانہ سے قطع تعلق کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں نے اپنے آپ سے یہ کہا کہ میرا مقصد وحید اشیا کے حقائق کی چھان بین ہے۔ اور اس لئے میرے لئے اس امر کی دریافت ناگزیر ہے کہ علم کیا ہے ؟"۔

یہ بہانہ نہیں کیا جا سکتا کہ دنیائے اسلام کے ذہنی کمالات، بالخصوص دور عباسیہ کے ابتدائی عہد کے، ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکے ہیں اور نہ یہ بہانہ کارآمد ہو سکتا ہے کہ عیسائیوں کی تنگ خیالی اور بے جا جوش و خروش کی وجہ سے ہزاروں کتابوں کی بربادی سے عربوں کو خصوصاً اور کل دنیا کو عموماً جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے ہم اُس کو بھول چکے ہیں۔

تشکر اور امتنان کے جو ہدیے پیش کرنے کی میں فہمائش کر رہا ہوں، وہ یقیناً بہت کافی اہمیت رکھتے ہیں اور انھیں زیادہ عرصہ تک متعصب دلوں میں بند نہیں رہنا چاہئے۔ یورپ کو —— بلکہ کل دنیائے عیسائیت کو —— اپنی غلطی کا کھلم کھلا اعتراف کرنا چاہئے۔ اس کو خود اپنے ہاں علمی طبقوں میں خصوصاً اور پوری دنیا کے سامنے عموماً ببانگ دہل اپنی احسان فراموشی کا اور ساتھ ہی ساتھ اسلام کے ساتھ اُس بغض و عناد کا جن کا وہ اکثر مواقع پر اظہار کرتا رہا ہے، اقرار کرنا چاہئے۔ یورپ کے دامن پر احسان فراموشی کا جو بدنما دھبہ ہے اُسے صرف اس قسم کا علی الاعلان اعتراف ہی دور کر سکتا ہے۔ تاوقتیکہ یورپ خود اپنے عُجب و غرور پر ٹھوکر نہ مارے اس داغ سے چھٹکارا پانا محال ہے۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس نا انصافی کی بنیاد مذہبی کد اور قومی خود پسندی پر پڑی ہے اُس کا ثبات کا تذی ٹوپی کی طرح ناممکن ہے"۔

برطانیہ عظمٰے اور فرانس کا فرض　یورپ کے مدبرین اگر دنیائے اسلام کے ساتھ محض تہی انصافیت کے بجائے ہمدردی اور رواداری کا برتاؤ کریں تو خود اُن کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ خصوصاً برطانیہ عظمٰے اور فرانس کو

اس سلسلہ میں زیادہ حصہ لینا چاہیئے۔ ان دو حکومتوں کو آج جو سیاسی اقتدار اور سیادت و قوت حاصل ہے اُس کو پیش نظر رکھا جائے تو تدبر کا مقتضیٰ تو یہی ہے کہ اس دانشمندانہ سیاسی مقصد کے حصول کے لئے اُن کو اپنے اختیارات کا استعمال کرنا چاہیئے۔ کم عقلی اور ناعاقبت اندیشی کے طرز عمل (مثلاً تبلیغ کے سلسلہ میں پادریوں کا رویہ) کے بجائے اُن کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہر ممکن طریق پر اسلام کے کاموں کو خود اُس کے جائز حدود کے اندر پھیلنے کا موقع دیں اور ہمت افزائی کریں۔

اگر تھوڑا غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح صاف ہے کہ کسی عقیدہ کے نشو و ارتقا کو غیر رواداران برتاؤ اور ظلم و استبداد سے جس قدر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اُسی قدر اُس کی جڑیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر برطانوی مدبر کے لئے اسلامی تعلیمات کا غائر مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کی جو خصوصیت ہے یعنے مادیت اور روحانیت کا امتزاج، اتحاد اتصال اور تعمیر، اسی خصوصیت نے خود مملکت برطانیہ کے ارتقا میں مدد دی ہے۔ انگلستان آج برطانیہ عظمےٰ نہ ہوتا اگر یہی خصوصیت وہاں کارفرما نہ ہوتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان ہی قوتوں نے انگلستان میں کس قدر مختلف رجحانات، احول اور سماج میں کام کیا ہے۔ اگر یہی حالات امدا ایسے ہی جوشیلے رجحانات کے افراد اسلام کو ملتے تو اُس کے حیطۂ اثر اور حقیقی روح کی وسعت آج ہمارے اندازہ سے باہر ہوتی۔

یاد رکھو کہ پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کو جس حالت میں چھوڑا تھا اُس میں روحانی توانائی کی کمی نہ تھی البتہ اُن کے پیروؤں میں اس چیز کی بہت کمی تھی کیونکہ انھوں نے خود کو اس قابل نہ پایا کہ اپنے مالک اور آقا کے مقرر کردہ اعلیٰ معیار کے پابند رہ کر زندگی بسر کر سکیں —— پاکیزہ اور عظیم المرتبت اسلام۔

جواہر مخمسات

۱۳۵۶

تضمین بر غزل حضرت شاہ عبد العلیم صاحب آسی سکندرپوری قدس سرہ العزیز

(جناب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری سنٹ جانس کالج آگرہ)

جانتے ہو کہ ہے محبت کیا　　مانتے ہو کہ دل کی ہمت کیا
پھر قیامت کی شرط و حجت کیا　　ہم نہیں جانتے قیامت کیا
آج اگر تم ملو قباحت کیا

---

۱ نہ ہٹے اس کی چاہ سے کوئی　　نہ ڈرے اشک و آہ سے کوئی
نہ پھرے اس کی راہ سے کوئی　　نہ گرے اس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا، مصیبت کیا

۲ دل بھی کھویا، وفا میں جان بھی دی　　اک قیامت گذر گئی یعنی
سہل تھا جب نگاہ اس پر تھی　　نہ گرے اُس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا، مصیبت کیا

---

۱ گو سیہ کار ہم شرابی تھے　　مست و سرشار ہم شرابی تھے
تو تھا غفار، ہم شرابی تھے　　اس کے حقدار ہم شرابی تھے
اہل تقوے وابر رحمت کیا

۲ گرچہ آوارۂ خرابی تھے　　گرچہ رسواے بے حجابی تھے
قابل عفو و بے حسابی تھے　　اس کے حقدار ہم شرابی تھے
اہل تقوے وابر رحمت کیا

۳ جو زمانے کے پاکباز رہے　　اُن کو کیا آئیں مغفرت کے مزے
تیری بخشش تو تھی ہمارے لیے　　اس کے حقدار ہم شرابی تھے

اہل تقوے دا ابر رحمت کیا

کرتے جب ہم شراب کے جلسے منتظر رہتے تھے گھٹاؤں کے
اب تری رحمت ابر بن جائے اس کے حقدار ہم شرابی تھے
اہل تقوے دا ابر رحمت کیا

اہل دل کی نگاہ پیدا کر درد والوں کی آہ پیدا کر
چاہ والوں سے چاہ پیدا کر ملنے والوں سے راہ پیدا کر
اس کے ملنے کی اور صورت کیا

تو جو چاہے رسائی اس در پر بے وسیلہ وہاں نہیں ہے گذر
جانے والوں کو راہ کی ہے خبر ملنے والوں سے راہ پیدا کر
اس کے ملنے کی اور صورت کیا

ترک لذت کٹھن ہے شے آخر راہ طاعت ہو کیسے طے آخر
ہے مے سلسبیل مے آخر باغ رضواں بھی باغ ہے آخر
سیر گل کے لیے ریاضت کیا

زہد و طاعت میں ہے فقط یہ سر رنج سہنا ہے دوست کی خاطر
ورنہ یہ بات خود ہی ہے ظاہر باغ رضواں بھی باغ ہے آخر
سیر گل کے لیے ریاضت کیا

شوق جنت ہے پردۂ ظاہر وہ بھی دیدار یار کی خاطر
یہ نہ ہو تو بہار گل کیا پھر باغ رضواں بھی باغ ہے آخر
سیر گل کے لیے ریاضت کیا

چشم سر سے اٹھے گا پردۂ سر اس کو دیکھیں گے اپنی آنکھ سے پھر
یہ نہ سمجھیں اگر تو ہوں کافر باغ رضواں بھی باغ ہے آخر
سیر گل کے لیے ریاضت کیا

گو سمجھتا ہوں اپنی ہمت کو   سعی کرتا ہوں تم جو فرماؤ
بن پڑے گی نہ مجھ سے کچھ بھی تو   بس تمہاری حرارت سے جو کچھ ہو
میری سعی اور میری ہمت کیا

سخن معرفت نظام سنو   یادِ جم چھوڑ دو۔ ذکرِ جام سنو
ساقی درد کا پیام سنو   آسی مست کا کلام سنو
وعظ کیا۔ پند کیا۔ نصیحت کیا

چھوڑ دو حامدانِ اہلِ منبر کو   مے عرفاں سے جن کو مس بھی نہ ہو
تشنۂ جامِ بے خودی ہو تو لو   آسی مست کا کلام سنو
وعظ کیا۔ پند کیا۔ نصیحت کیا

کلامِ شاہد

(جناب مولوی عبدالشاہد خاں شروانی صاحب شاہد خیرآبادی)

...ا ہیں مہرباں مجھ پر کبھی الفت ہے دشمن سے   چلا آتا ہے یہ طرزِ عمل اُن کا لڑکپن سے
...ت جا نہیں سکتی۔ جدا ہو لاکھ سر تن سے   کہیں دل کی لگی بجھتی ہے۔ آبِ تیغِ آہن سے
...یہ یار۔ رہتی ہے کھنچی چشمِ تصور میں   ہمیں کیا کام آہ و نالہ و فریاد و شیون سے
...ہے کیا میں قفس میں ہوں۔ پڑیں پتھر گرے بجلی   تعلق ہے نشیمن سے نہ اب شاخِ نشیمن سے
...تشہ چاند کا ہوتا ہے سورج کے مقابل میں   وہی خورشید کو نسبت ہے اُن کے روئے روشن سے
...سوزِ ہجر سے جلتا ہوں شب بھر مثلِ پروانہ   لگی جب دن سے ہے لَو تیری شمعِ روئے روشن سے
...ں بھی چار تنکے جن کے رکھے گر پڑی ظالم   عداوت کس قدر بجلی کو ہے میرے نشیمن سے
آخر کچھ ایسا رحم آیا تیغِ قاتل کو   کہ رو دی خون کے آنسو لپٹ کر میری گردن سے

گلِ مضموں کھلائے کیوں نہ میری طبع اے شاہد
تلمذ مجھ کو حاصل ہے۔ ریاضِ ناہرن سے

قصیدہ نعتیہ

(جناب مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔وکیل، ایم۔ایل۔اے)

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیِ امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی

وہی کچھ جانتے ہیں جو ادا سنجِ محبت ہیں
کہ یکساں جاں گسل ہے ذوقِ وصل و دردِ ہجرانی

ابھی تک کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ دشت ایمن کا
قیامت ہے قیامت جلوۂ جاناں کی عریانی

اُدھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمت مشرق سے
اِدھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبستانی

اُدھر پھولوں کے جھرمٹ میں شعاعوں کی نظر بازی
اِدھر خود جلوۂ خور سے گلوں کی چاک دامانی

اِدھر شبنم کی ہستی کا فنا فی النور ہو جانا
اُدھر گل کا صبا سے ادعائے پاک دامانی

اِدھر سبزہ کا جاگ اُٹھنا خمارِ خواب نوشیں سے
اُدھر اشراق پڑھ کر زاہدوں کی سبحہ گردانی

کسی کے خندۂ دنداں نما کا کھنچ گیا نقشہ
لبِ گل برگ پر شبنم نے جب کی گوہر افشانی

یہ صبح و شام ہی کیا چشمِ عبرت بیں اگر وا ہو
تو اک درسِ بصیرت ہے سراپا بزمِ امکانی

چمن پیرائے کن صدقے تری نیرنگ سازی کے
لبِ ہر غنچہ پر ہے کل یوم ھو فی شانی

وہ تابستاں کے بعد ابرِ سیہ کا جوشِ تردستی
وہ آغازِ بہار اور رخصتِ فصلِ زمستانی

چمن کا جلوۂ رنگیں ہے یا اک شعرِ فطرت ہے
کہ جس پر ذوقِ فطرت خود ہے محوِ آفریں خوانی

نہ جانے حسن ہے یا عشق اتنا جانتے ہیں ہم
ہمیں کھینچے لیے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہانی

کمالِ عاشقی ہے آپ مرنا اپنے جلووں پر
مرے مذہب میں خود بینی کو کہتے ہیں خدا دانی

خود اپنی شکل دیکھی پردۂ برقِ تجلی میں
تعجب کیا ہوئی گر دیدۂ موسیٰ کو حیرانی

کہاں کا دشتِ ایمن طور کیا، برقِ تجلی کیا؟
یہ سب کچھ تھی جمالِ مصطفیٰ کی پرتو افشانی

محمدؐ وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی
محمدؐ وہ حریمِ قدس کا شمعِ شبستانی

محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستیں کلکِ فطرت کا
محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی

وہ فاتح جس کا پرچم اطلسِ زنگاریِ گردوں
وہ اُمی جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی

وہ ناطق جس کے آگے مہر برلب بلبلِ سدرہ
وہ صادق جس کی حق گوئی کا صادق ظلِ ربانی

وہ حاذق جس کا تنہا نسخۂ تنزیلِ فرقانی
دوائے جملہ علتہائے اخلاقی و روحانی

وہ عادل جس کے میزانِ عدالت میں برابر ہے
غبارِ مسکنت ہو یا وقارِ تاجِ سلطانی

وہ بادل جس کی گوہر باری جود و کرم سن کر
فضائے آسماں ہے شکوہ سنج تنگ دامانی

وہ گنجور معارف جس کے ہر ہر حرف میں نہاں
نکات فلسفی اسرار نفسی رازِ عمرانی

وہ شاہ بوریا مسند سکھایا جس نے دنیا کو
یہ انداز جہانگیری یہ آئین جہاں بانی

وہ درس آموز فطرت جس نے سب سے پہلے دنیا میں
مُبرہن کر دیئے آکر حقوق جنسِ نسوانی

مٹا کر خودکشی کی بزدلانہ رسم دنیا سے
بنایا مشہد توحید پر آئینِ قربانی

وہ نساخ مذاہب جس نے آکر کر دیا باطل
فروغ کیش زردشتی شکوہ دین نصرانی

وہ کشاف سرائر جس نے کھولا چند اشاروں میں
علوم اولین و آخریں کا گنجِ پنہانی

وہ سلطان الامم فخر دو عالم برزخ کبرے
رسالت جس کی تصدیقی جلالت جس کی اذعانی

تراشہ جس کے ناخن کا ہلال آسماں منزل
غسالہ جس کے تلووں کا زلال آب حیوانی

مبشر جس کے مقدم کا ظہورِ سیدِ عیسے مریم
مصدق جس کی عظمت کا لب موسیٰ عمرانی

تعال اللہ ذات مصطفےٰ کا حسن لاثانی
کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصاف امکانی

دعلے یونسی خلق خلیلی صبر ایوبی
جلال موسوی زہد مسیحی حسن کنعانی

تعال اللہ چہ می زیبد بفرقش تاج سلطانی
کہ مور درگہش را می رسد ناز سلیمانی

نہیں مہر درخشاں اس کے فیض جبہہ سائی سے
چمکتا ہے چرخ چارمیں کا داغ پیشانی

وہ چشم نرگسیں تھی بند لیکن چشم دل وا تھی
سرہانے طالع بیدار کرتا تھا نگہبانی

لب روح القدس سے سب کے پیغام خداوندی
اُٹھے اور دی براق پاک پرداد سبک رانی

چلے اور اس طرح گذرے سپہر لاجوردی سے
نظر جس طرح شیشے سے گذر جائے بہ آسانی

براق و رفرف آخر رہ گئے کچھ دور جا جا کر
نہ پا کر پائے ہمت میں مجال گرم جولانی

کسی نے خود لپک کر لے لیا آغوش رحمت میں
ہوا ملک قدم خلوت سرائے حسن امکانی

ملال و ذات میں پھر کیا ہوا اللہ ہی جانے
کہ ہے یہ مرحلہ ما فوق ادراکات انسانی

خرد عاجز نظر خیرہ زباں کج مج بیاں قاصر
زمینِ نعت میں کیا دیجیے دادِ سخن دانی

(بقیہ صفحہ)

اُس ساری جماعت میں جس سے اس وقت مسلم لیگ مراد ہے ایک فرد بھی ایسا نہیں جو صاحب فکر دماغ رکھتا ہو، جس کی گذشتہ زندگی کے اعمالنامے پر نظر کر کے مسلمان یہ امید کر سکیں کہ وہ کوئی مفید و کارآمد لائحہ عمل مرتب کر سکتا اور اُس کو کامیاب بنانے کے لیے دس یا پانچ سال ہمت، خلوص اور استقلال کے ساتھ اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نظرے خوش گذرے

گذشتہ پرچہ میں کلام رسا مکمل ہو گیا۔ اس دفعہ ایک نئی کتاب "لعنت خیالات" کی اشاعت شروع کی جاتی ہے۔ یہ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ اُس کا مکمل ترجمہ شایع کرنا دشوار ہے اس لیے لائق مترجم نے محض نمونہ کے طور پر اُس کا ایک جزو ترجمہ کیا ہے۔ کتاب اپنے مطالب اور فائدہ کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ ایک ہی موضوع پر مختلف ممالک کے نامور اہل قلم کے خیالات کا مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا اور کارآمد بھی ہو سکتا ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں کے لیے جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں یا انگریزی ادبیات میں زیادہ انہماک نہیں رکھتے۔ اگر یہ حصہ عام طور پر پسند ہوا اور مفید خیال کیا گیا تو ممکن ہے کہ کسی وقت پوری کتاب اُردو میں منتقل ہو جائے۔

"موضع ملک کی معاشی تحقیق" اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُن مضامین سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جو عام طور پر الناظر یا ملک کے دوسرے علمی و ادبی رسائل میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مضمون بہت بڑا نہیں ہے اور امید ہے کہ تین ہی پرچوں میں ختم ہو جائے گا۔ تاہم اسے بھی کتابی شکل دے دی گئی ہے۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور یہاں کی آبادی کا بہت بڑا حصہ دیہات میں رہتا ہے اور دیہاتی آبادی کی خوشحالی ہی پر اس ملک کے باشندوں کی اقتصادی فلاح کا بڑی حد تک انحصار ہے مگر تعلیم یافتہ طبقہ جو عموماً شہروں اور قصبوں میں رہتا ہے اُسے دیہات کے اصلی حالات سے زیادہ واقفیت نہیں۔ اس بنا پر اس قسم کی جانچ اور تحقیقات نہایت مفید ہوگی۔ کم سے کم اُن لوگوں کے لیے جو دیہات کی اصلاح و ترقی سے دلچسپی رکھتے اور اُس کو ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں۔

ملک کے نوجوان اہل قلم اگر برطانوی ہند کے مختلف صوبوں کے دیہات کے حالات بھی اسی اسلوب پر کافی جانچ کے بعد مرتب کریں تو کانگریسی وزارتوں کو جو دیہات کی اصلاح و ترقی پر خاص توجہ کرنا چاہتی ہیں اُن کی تحقیقات سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔

مرشدی و مولائی حضرت مولانا سید عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کردہ مدرسۂ قرأت مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ گذشتہ ربع صدی کے اندر ہندوستان میں علم تجوید و قرأت اور کلام پاک کی خدمت نشر و

اشاعت کا بہت بڑا محرک ہوا ہے۔ اسی مدرسہ کے ایک دیرینہ اور نامور استاد قاری محمد نظر صاحب ہیں جو چشم ظاہر اگرچہ نہیں رکھتے مگر دل بینا کی نعمت سے مالا مال ہیں اُنھوں نے حال ہی میں ایک رسالہ "تسہیل البیان فی رسم نظم القرآن" بزبان عربی تالیف کیا اور اُسے بالمقابل اُردو ترجمہ کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کرایا ہے اور اُس میں قرآن شریف کا رسم اور اُس کے جمع ہونے کی کچھ کیفیت اور شہروں میں پھیلنے کے حالات اور اُن صحابہ کرام کے نام جنھوں نے قرآن کو حفظ کیا تھا اور اس کے علاوہ وہ بحثیں جو اس فن کے لوگوں کے لیے قابل غور اور اُن کی لغزش قدم کے مقامات ہیں قدماے ماہرین کی کتابوں سے اخذ کر کے سہل اور سلیس عبارت میں مناسب ترتیب کے ساتھ درج کر کے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا حجم ۴ جزو، سرورق دبیز، طباعت روشن اور قیمت صرف ۱/ ہے۔

ملنے کا پتہ:- محمد راشد امروہوی۔ چوبداری محلہ۔ لکھنؤ یا دفتر الناظر

گذشتہ مارچ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بمقام دہلی ایک طویل تجویز منظور کی تھی جس کا ضروری حصہ یہ تھا:-

"کانگریس کمیٹی اُن صوبوں کے ممبروں کو جن میں کانگریسیوں کو اکثریت حاصل ہو گئی ہے اس بات کی اجازت اور اختیار دیتی ہے کہ وہ عہدے قبول کر لیں۔"

مگر اس کے ساتھ ایک شرط تھی جس کی تکمیل گورنروں کے اختیار میں تھی۔

پھر اپریل میں بمقام واردھا کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا تو اُس میں یہ قرار پایا کہ:-

"وزارت کی تشکیل میں دوسری جماعتوں کو شریک نہ کیا جائے۔ بجز اس صورت کے کہ کوئی شخص کانگریس کے معاہدۂ شرکت پر دستخط کر کے کانگریس کے نظم و انضباط کو قبول کرلے۔"

اس کے بعد اخباری بحثوں، وزیر ہند اور وائسرائے کے اعلانوں کی بنا پر جولائی میں مجلس عاملہ کی ہدایت کے بموجب مدراس، بمبئی، صوبہ متوسط، صوبجات متحدہ، بہار اور اڑیسہ میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔

انگلستان، فرانس، امریکہ اور دوسرے ممالک میں جہاں جمہوری یا دستوری حکومتیں ہیں عام رواج یہ ہے کہ انتخاب عامہ کے بعد جب وزارت کی تشکیل ہوتی ہے تو عموماً وہ اُس جماعت کے اراکین پر مشتمل ہوتی ہے جس کو انتخابات میں اکثریت حاصل ہو۔ دوسری جماعتوں کے اراکین وزارت میں شریک نہیں کیے جاتے تاآنکہ کوئی خاص ضرورت لاحق نہ ہو یا مخصوص مصالح پیش نظر نہ ہوں۔

اسی اصول کی بنا پر گذشتہ مارچ میں کانگریسی اکثریت والے صوبوں کے گورنروں نے کانگریس

پارٹی کے رہنماؤں کو وزارت بنانے کی سب سے پہلے دعوت دی اور جب اُنھوں نے وزارت نہیں قبول کی تو ملک کے اکثر و بیشتر غیر کانگریسی اہل الرائے حتےٰ کہ مختلف صوبجات کے اُن وزیراعظموں نے بھی جنھوں نے کانگریسی رہنماؤں کے انکار کے بعد آئین جدید کو تعطل سے بچانے کے نام پر اقلیت میں ہونے کے باوجود وزارت قبول کر لی تھی اس رائے کا بڑے شد و مد کے ساتھ اظہار کیا کہ وزارت بنانے کا حق صرف کانگریس کو ہے اور بعض ماہرین قانون نے تو اقلیت کی وزارتوں ہی کو ناجائز قرار دیا۔

جن صوبجات میں دوسری جماعتوں کی اکثریت تھی کانگریس والوں کو وہاں کی وزارتوں میں شریک ہونے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ اور جب مسٹر سرکار نے کانگریس کمیٹی کی ہدایات کے علی الرغم اور اُس کی اجازت کے بغیر بنگال کی وزارت میں شرکت کر لی تو اُن کو اس خودرائی کی یہ سزا دی گئی کہ آئندہ بیس سال تک وہ کسی کانگریس کمیٹی کے رکن نہ بنائے جائیں گے۔

ان حالات میں ملک کی کسی دوسری مجلس کو خواہ وہ لبرل فڈریشن ہو یا نیشنلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی ہندو سبھا ہو یا مسلم لیگ یا کوئی اور ہرگز یہ توقع نہ کرنا چاہیے تھی کہ کانگریس اپنی اکثریت والے صوبجات میں تشکیل وزارت کے وقت کسی دوسری مجلس کو دعوت شرکت دے گی۔ چنانچہ دوسری جماعتوں کو اس قسم کا کوئی خیال بھی نہیں پیدا ہوا مگر خدا معلوم کس منطقی مغالطہ کی بنا پر مسٹر جناح اور بعض مسلم لیگ والے یہ غلط توقع پرورش کر رہے تھے کہ کانگریس جب وزارتیں بنائے گی تو مسلم لیگ کو بھی شریک کرے گی۔ درانحالیکہ کانگریس کے انتخابی اعلان میں یا اس کی کسی تجویز میں ایسی کوئی بات نہیں درج تھی جس سے یہ غلط توقع پیدا ہو۔

ممکن ہے کہ مسٹر جناح کو اس سے مغالطہ پیدا ہوا ہو کہ اُنھوں نے مسلم لیگ کے انتخابی اعلان میں بہت کچھ کانگریس کی نقل کی تھی یا اس سبب سے کہ کانگریس کے کارکنوں نے جگہ جگہ مسلم لیگ کے امیدواروں کی امداد کی تھی یا پھر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وزارتوں کی تشکیل کے موقع پر بعض صوبوں میں مسلم لیگ پارٹی کے رہنماؤں نے گورنر کی دعوت پر بھی وزارت بنانے سے انکار کیا تو کانگریس سے وہ اس انعام کے مستحق ہو گئے کہ جب کانگریس وزارت بنائے تو اُن کو ضرور یاد رکھے۔

اس توقع کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے مسٹر جناح نے تو صرف اظہار ناراضی و بیزاری ہی پر قناعت کی لیکن اپنی اور مسلم لیگ کی خودداری کو مجروح کر کے وزارت کے لیے دست طلب دراز نہیں کیا مگر صوبہ متحدہ کی مسلم لیگ پارٹی کے رہنما ہمارے دیرینہ دوست چودھری خلیق الزماں

صاحب نے تو کمال ہی کر دیا۔ کانگریس کی طرف سے دعوت شرکت وصول ہوئے بغیر وہ خود بہ نفس نفیس مولانا ابوالکلام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باوجود اُن کے صاف صاف یہ فرما دینے کے کہ ایک وقت میں دو کشتیوں پر سوار ہونے کا خیال چھوڑ دیجیے کسی طرح طلب وزارت سے باز نہ آئے اور لیلائے وزارت کے عشق میں اس حد تک سرشار ہوئے کہ مولانا کے ہر ارشاد کو ماننے اور کانگریس کی ہر شرط کو پورا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

مولانا اپنے رفقائے کار سے مشورہ کیے بغیر اس کا اختیار نہیں رکھتے تھے کہ مجلس عاملہ کی ہدایات کے خلاف ایک دیرینہ شناسا کی آرزو کو پورا کر دیتے اور چودھری صاحب گدائے مبرم کی طرح مولانا کا دامن نہیں چھوڑتے تھے اس لیے مولانا نے آخری تصفیہ کو برائے چندے ملتوی کر دیا۔ جب پھر لکھنؤ تشریف لائے تو رفقائے کار سے مشورہ کے بعد ایک باقاعدہ مرتب شدہ دستاویز ساتھ لائے اور چودھری صاحب کے حوالہ کر دی کہ اگر وزارت کا عشق صادق ہے تو لو اور مسلم لیگ پارٹی کے ارکین سے اس پر دستخط کرا لاؤ۔

چودھری صاحب کو جب یہ دستاویز ملی ہے تو اتفاق سے راقم الحروف پاس ہی کے کمرے میں موجود تھا اور چونکہ یہ دستاویز ایک دن قبل نظر سے گذر چکی تھی اس لیے ذہن بے اختیار غالب کے اس شعر کی طرف منتقل ہو گیا۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم خوشی سے ٹالیں گے　　بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

چودھری صاحب پر جو کچھ گذری اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اُن کے شوق بے پایان وزارت کا علم ہو یا جنھوں نے راقم الحروف کی طرح عین اُس موقع پر اُن کا رنگ سرخ دیکھا ہو۔

چودھری صاحب کے امکان میں ہوتا تو وہ اس دستاویز کی سخت شرطوں کو بھی مسلم لیگ والوں سے منوا دیتے۔ مگر نواب اسمٰعیل خاں نے اپنی اور لیگ کی آبرو رکھ لی اور ایک ناقابل قبول ترمیم تجویز کر کے گفت وشنید کو ختم کرنے کا پہلو پیدا کر دیا۔ اس طرح مولانا ابوالکلام کا پیچھا چھوٹا اور فوراً ہی بقیہ وزرا کا تقرر عمل میں آ گیا۔

اب مسلم لیگ کے حامی اور اُس کا پروپگنڈا کرنے والے اخبارات بجائے اس کے کہ صحیح صورت حال کو پیش نظر رکھ کر اپنے رہنما کی اس خفیف الحرکاتی سے منفعل ہوتے اور اپنی خودداری اور مسلم لیگ کے وقار کو اس بیدردی سے پامال کرنے پر اُن کو ملامت کرتے، آئے دن کانگریس کو گالیاں دیتے رہتے

اور مسلمانوں کو غلط مفروضات اور غلط تر اعتراضات کی بنا پر کانگریس کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔

کانگریس کی عمر اگر اس وقت ۵۲ سال کی ہے تو مسلم لیگ کو قائم ہوئے بھی ۳۱ سال کے قریب ہوئے۔ کانگریس کو اگر گیارہ میں سے چھ صوبوں میں بلا شرکت غیر وزارت کی تشکیل کا موقع ملا ہے تو مسلم لیگ کو ایک ہی دو صوبوں میں وزارت بنانے کے قابل ہونا چاہیے تھا مگر نہ مسلم لیگ کے حامیوں کو اس کی غیرت ہے اور نہ مسلم لیگ کے کرتا دھرتا مسٹر جناح کو اس سے عبرت حاصل ہوئی۔ جناح صاحب کے لیے جب تک صدارت و قیادت اور مرکزی اسمبلی کی رکنیت کا دلچسپ سامان فراہم ہو اُن کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی جان کھپائیں اور حامیان مسلم لیگ۔ تو صرف اس پر قانع رہنا چاہتے ہیں کہ کانگریس کا شیر شکار مار کر لائے اور ان کو اُس میں سے حصہ مل جائے۔ انگریزوں سے اختیارات حاصل کرنے کے لیے لڑنا، جیل جانا، لاٹھیاں کھانا اور ہر قسم کے جسمانی اور مالی نقصانات برداشت کرنا مسلم لیگ والوں کا کام نہیں ہے۔ اُن کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہیں نوابوں، راجاؤں اور دوسرے مالداروں کے دسترخوانوں پر دعوتیں اُڑاتے رہیں اور جب تقسیم حقوق کا وقت آئے تو کاسۂ گدائی لے کر سرکار کے دروازہ پر جا کے کھڑے ہو جائیں۔

مسلم لیگ کے حامی، عام مسلمانوں کو اس فریب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اُن کو اسلام کا حامی و ناصر اور حقوق اسلامی کا محافظ و نگہبان تصور کریں حالانکہ جن کو اللہ نے بصیرت عطا فرمائی ہے وہ اس منافقت اور بے حیائی کے مظاہرے سے بیزار و نالاں ہیں اور اُن کے لاف و گزاف کو سن سن کر شرم و غیرت سے کٹے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے جسمانی راحت و آرام کو زندگی کا ماحصل، اور عہدوں اور مناصب کو مطمح نظر قرار دے کر مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرنے اور زندگی کی دوڑ میں اُن کو ہرا دینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور اب بھی اس کے لیے تیار نہیں کہ اپنے کیے پر نادم ہوں اور اپنی غفلتوں اور خود مطلبیوں سے باز آئیں۔

مسلم لیگ میں کم و بیش ۱۹ سال تک راقم الحروف شریک رہا اور ۱۰ سال تک اُس کی کونسل یا مجلس انتظامی کا رکن رہا۔ اور مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں سے کہیں زیادہ اُس کی خدمت کرنے اور اُس کے اراکین اور عہدہ داروں کی ذہنیت اور لوگوں کے طریق کار کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اور ذاتی تجربہ کی بنا پر اور پوری بصیرت کے ساتھ یہ پیشین گوئی کرنے کے لیے تیار ہے کہ جب تک لیگ کی عنان اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی جو عیش و راحت کے بندے اور قیادت و جاہ طلبی کے بھوکے ہیں مسلم لیگ سے مسلمانوں کو کسی نفع کی توقع نہ کرنا چاہیے۔

تحریک خلافت کے زمانہ میں عملاً تجربہ ہو گیا کہ کانگریس نے اور اس کی رہنمائی میں کثیر التعداد ہندوؤں نے تو مسلمانوں کا ساتھ دیا مگر مسٹر جناح اور مہاراجہ محمود آباد وغیرہ سب دامن جھٹک کر علحدہ ہو گئے۔ مسٹر جناح کا یہ کارنامہ ہرگز قابل فراموشی نہیں کہ سنہ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہونے کے باوجود سنہ ۱۹۲۰ء میں جو مسلم لیگ سے وہ کنارہ کش ہوئے تو سنہ ۱۹۲۴ء تک اس کے پاس نہ پھٹکے حتے کہ لیگ کے سالانہ جلسے جب احمد آباد اور گیا میں منعقد ہوئے تو جناح صاحب ان میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ اور اب بھی جب کبھی مسلمانوں کو ایسا کوئی نازک وقت درپیش ہو گا کہ برطانوی شہنشاہیت سے ٹکر لینے اور ایثار و قربانی کا نذرانہ پیش کرنے کی ضرورت ہو تو مسٹر جناح اپنے بنگلہ میں محو آرائش نظر آئیں گے اور راجہ صاحب محمود آباد اپنے بٹلر پلیس میں داد عیش دیتے ہوں گے۔

مسلم لیگ والوں کی ذہنیت اور ان کے طریق کار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب سنہ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے رد و قبول کی بحث نہایت زور و شور سے جاری تھی اور کلکتہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا تو مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس انتخاب صدر کی غرض سے خاص طور پر لکھنؤ میں منعقد کیا گیا حالانکہ لیگ کا صدر مقام دہلی ہے۔ وہیں اس کا دفتر کئی سال سے قائم تھا اور وہیں کونسل کے جلسے برابر ہوتے تھے۔ صدارت کے لیے دو نام پیش ہوئے تھے ایک مولانا محمد علی کا اور دوسرا مہاراجہ محمود آباد کا۔ قابلیت اور خدمات، ایثار اور قربانی کے لحاظ سے مولانا محمد علی کا کون مقابلہ کر سکتا تھا۔ پھر نہرو رپورٹ جیسی دستوری دستاویز پر مولانا محمد علی سے بہتر کون تبصرہ کر سکتا تھا مگر مہاراجہ صاحب محمود آباد کی دولت و ثروت اور ان کے مقامی حوارین کے مقابلہ میں کس کی شنوائی ہوتی۔ بالآخر مولانا شوکت علی اور ان لوگوں کو جو مولانا محمد علی کے موید تھے کامیابی نہ ہوئی اور مہاراجہ صاحب صدر منتخب ہو گئے۔

اب مہاراجہ صاحب کے بجائے ان کے نوجوان صاحبزادہ کو غرضمند لوگ مسلم لیگ پر مسلط کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ گذشتہ سال مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں مولانا حسین احمد صاحب اور دوسرے بعض اصحاب مغالطہ کھا کر شریک ہو گئے تھے۔ ان کے جو بیانات بر وقت علحدگی اخبارات میں نکلے ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ راجہ صاحب کا اثر مسلم لیگ کو بے مصرف بنانے میں کیسا مصروف ہے۔

اسی پارلیمنٹری بورڈ میں راجہ صاحب سلیم پور اور حافظ محمد ابراہیم دونوں شریک تھے۔ ایک صاحب بورڈ کے صدر تھے۔ اور بورڈ کے اراکین خصوصاً علما و امرا کی کوششیں ان کے شریک حال نہ ہوتیں تو وہ اسمبلی کے رکن نہ ہو سکتے برخلاف اس کے حافظ ابراہیم پہلے بھی بلا مقابلہ کونسل میں پہونچے تھے اور اب کی بھی بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ لیکن جب راجہ صاحب سلیم پور نے مسلم لیگ پارٹی کی اجازت کے

بغیر بلکہ مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کے وزارت میں شریک ہونے سے انکار کرنے کے باوجود وزارت منظور کرلی اور وزارت سے الگ ہوجانے کے بعد نواب چھتاری کی آزاد پارٹی میں شرکت فرمائی تو نہ مسلم لیگ پارٹی کو اس کی جرأت ہوئی کہ اُن پر ملامت کرتی اور نہ مسلم لیگ کے حامی اخبارات کو اُن سے یہ مطالبہ کرنے کی ہمت پڑی کہ وہ استعفےٰ دے کر پھر سے اپنا انتخاب کرائیں۔ مگر حافظ ابراہیم کانگریس کے وزیر بن گئے تو اب اُن کے خلاف لیگ پارٹی اور لیگ پریس دونوں اپنے غصے اور بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ قصور دونوں کا یکساں ہے بلکہ سچ پوچھیے تو حافظ ابراہیم کا کم اور راجہ صاحب کا زیادہ۔ مگر راجہ صاحب کو کوئی نہیں پوچھتا اور حافظ صاحب پر سب شیر ہو رہے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ راجہ صاحب اول تو تعلقدار دوسرے قیصر باغ میں اُن کا محل لیگ کے خوشامدیوں اور غرضمندوں کا ملجا و ماویٰ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ راجہ صاحب محمود آباد کے ہم مشرب ہیں۔ حافظ صاحب بیچارے طبقۂ متوسط کے آدمی صوبہ متحدہ کی ایک بستی کے رہنے والے اور گذشتہ کونسل میں مدح صحابہ کی حمایت میں تقریر کرکے اپنی چار یاریت کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

پھر لیگ والوں کے سارے غم و غصہ اور موجودہ تمام جد و جہد کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکا کر اور اُن کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرکے کانگریس کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ تالیف قلوب کیلئے وزارت میں چودھری صاحب کے واسطے جگہ پیدا کرے۔ خواہ حافظ ابراہیم صاحب کو علیحدہ کرکے خواہ وزارت کی تعداد میں اضافہ کرکے۔ حالانکہ کانگریس کے ایک دوسرے مسلمان وزیر رفیع قدوائی صاحب جب بہرائچ کی اُس جگہ کے لیے امیدوار ہوئے جو مسلم لیگ کے ایک رکن کے انتقال کر جانے کی وجہ سے خالی ہوئی تھی تو مسلم لیگ کی طرف سے ان کا مقابلہ ہی نہیں کیا گیا۔ یہ کیوں، صرف اس بنا پر کہ اُس وقت چودھری صاحب کو ایک غلط چال کی بنا پر یہ توقع تھی کہ کانگریس کی وزارت میں اُن کو بھی جگہ ملے گی۔

مسلمانوں کی حالت کس قدر افسوسناک اور قابل رحم ہے کہ اُن کے بہت سے تعلیم یافتہ افراد جو اسمبلی میں موجود اور مسلم لیگ میں شریک ہیں اور ان سب باتوں کو جانتے اور اپنے لیڈروں کی خود مطلبی اور عیاری سے بخوبی واقف ہیں اس کھیل میں خود بھی شریک ہیں اور اپنے ساتھ مسلمانوں کو دعوت شرکت دے رہے ہیں۔

اگر مسلم لیگ کے روبرو کوئی ایسا نظام عمل ہوتا جو مسلمانوں کی اقتصادی، معاشرتی یا عمرانی زندگی پر اثر انداز ہوتا اور اس کی توقع ہوتی کہ اس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی دور ہوگی اور وہ فراغبالی و عزت کے ساتھ اور مضبوط و توانا بن کر رہ سکیں گے تو کسی کو اختلاف نہ ہوتا۔

مگر مسلم لیگ کے روبرو نہ کبھی عامۃ المسلمین کا مفاد رہا اور نہ اب ہے اور نہ آئندہ ہوگا اس لیے کہ (باقی صفحہ ۲۷ پر)

بنام خداوند جہاں آفریں

جامیت جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر ۱۳۲۷ھ خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر: ظفر الملک علوی

جلد ۲۲	ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۷ء	نمبر ۳ و ۴

فہرست مضامین

قیمت سالانہ عہ / قیمت فی پرچہ ۸

نئی کتابیں

آئینۂ بلاغت ۔ جناب مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی اے نے اس فن کی قدیم و جدید کتابوں کا ضرورت زمانہ کے مطابق نہ پاکر فن کے شائقین اور طلبا کے لیے یہ نہایت آسان اور جامع کتاب تالیف فرمائی ہے اور مطالب کو جلد ذہن نشین کرنے اور حافظہ میں محفوظ رکھنے کیلیے مناسب جدولوں میں تمام تعریفات تشریحات اور مثالیں ترتیب دی ہیں۔ انگریزی داں طبقہ کی آسانی کیلیے انگریزی اور اردو کی مصطلحات کا تطابق کرکے آخر میں ایک قابل قدر فرہنگ دیدی ہے۔ قیمت عا

پستالوزی ۔ جو یورپ کی تعلیمی دنیا کا نامور ماہر تھا اور جس نے تعلیمی طریقوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اس کی زندگی کے حالات اس کے فلسفہ تمدن اس کے تعلیمی نظریے اور تعلیمی کارنامے اس کتاب میں ڈاکٹر قاضی عبد الحمید ایم اے پی ایچ ڈی نے سلیس زبان اور دلکش انداز بیان میں پیش کیے ہیں۔ قیمت عہ

معاہدۂ عمرانی ۔ روسو انقلاب فرانس کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کتاب کے ذریعے سے اس نے اپنے سیاسی فلسفہ کو ایسی خوبی سے پیش کیا کہ باتوں باتوں میں سیاست مدن کے دقیق مسائل لوگوں کی سمجھ میں آ گئے اور حریت، اخوت و مساوات کی طلب ہر دل میں پیدا ہو گئی مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی۔ قیمت عا

میری کہانی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بسیط تبصرہ سمجھنا چاہیے جس میں ملک کی اُن سب تحریکوں اور رہنماؤں پر رائے زنی کی گئی ہے جو گذشتہ بیس سال کے اندر اس ملک کے سامنے رہے۔ مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات کے بعد یہ دوسری کتاب ہندوستان میں شائع ہوئی ہے جو اُن تمام لوگوں کے مطالعہ میں آنا چاہیے جن کو اپنے ملک کے مستقبل اور فوز و فلاح سے دلچسپی ہے۔ قیمت ہر دو جلد للعہ

کلامِ جوش ۔ حضرت جوش ملیح آبادی کے کئی مجموعے حال ہی میں بڑی آب و تاب سے شائع ہوئے ہیں۔ جن میں سے حسب ذیل حاضر ہیں :-

نقش و نگار عا ۔ شعلہ و شبنم سے ۔ فکر و نشاط ۱ ؏

میدانِ عمل ۔ منشی پریم چند کا قابل قدر ناول جس میں اُن لوگوں کی داستانِ زندگی بیان ہوئی ہے جو ہندوستان کے کروڑوں فاقہ کش اور جاہل انسانوں کی حالت بدلنے اور ملک کے مستقبل کو شاندار بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ قیمت عا

مضامینِ رشید ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے الناظر کے روٹھے ہوئے مضمون نگار کے مضامین کی پہلی جلد جو اُن کے مزاحیہ رنگ تحریر کا بہترین مجموعہ ہے۔ قیمت عا

غریب ۔ مسٹر محمد عارف علوی بی اے کے چند افسانے قیمت مہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بنام خداوند جان آفرین

الناظر لکھنؤ

نمبر ۳، ۴ جلد ۲۲ — ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء

عربوں کی خانگی زندگی

(مترجمہ جناب سید مولوی محمد حبیب الرحمٰن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

(بسلسلہ گذشتہ)

پہلی صدی ہجری کے نصف آخر میں مختار بن عبید ایک سیاسی فریق کا رہنما گزرا ہے جس نے مدت تک بنی امیہ کو پریشان رکھا۔ وہ مدینہ میں داخل ہوا، سیدھا مسجد پہونچا، اور منبر پر بیٹھ کر جو لوگ وہاں موجود تھے اُن کے سامنے ایک تقریر کی۔ اُس نے کہا کہ "اے اہل مدینہ تمہارے شہر کا ابتدائی دور نہایت اچھا تھا، لیکن وہ دور ختم ہوا۔ اب یہ آخری دور بدترین ہے۔ تم نے گانے والیوں کو اپنا جلیس و ندیم بنا رکھا ہے اور خواجہ سراؤں سے رغبت رکھنے لگے ہو"[1] اس تقریر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں خواجہ سرا بدعت سمجھے جاتے تھے[2]۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ بعد کے زمانے میں بھی عربوں کے پُرانے شرفا پرایران قابل نفرت لوگوں سے کراہت کا اظہار کرتے رہے[3]۔

گھروں کی حفاظت کے لیے خواجہ سراؤں کو مقرر کرنے کا طریقہ سب سے پہلے بنی امیہ میں شروع ہوا، اور یہ بازنطینی دربار کی نقل تھی، یا قدیم ایرانی بادشاہوں کے عیش و عشرت کی تقلید تھی۔ بہرحال اتنا ہمیں معلوم ہے کہ اُس زمانے میں خواجہ سراؤں کی تجارت بالکلیہ بازنطینی بردہ فروشوں کے ہاتھ میں تھی۔

---

[1] کتاب السرور (قلمی نسخہ) ج ۱۔ ورق ۱۴۸۔ [2] ابن تغری بردی۔ ج ۱ ص ۲۱۱۔ [3] فون کریمر۔ ج ۱ ص ۱۴۸۔

ممکن ہے کہ ابتداءً اونچے گھرانوں میں خواجہ سرا محض ظاہری شان و شوکت کی غرض سے زنانوں میں نوکر کی حیثیت سے رکھے گئے ہوں، اور رفتہ رفتہ تغیر زمانہ سے، یہی نوکر گھر کی بیبیوں کے ذی اقتدار پاسبان اور چوکیدار قرار دیے گئے ہوں۔ خواجہ سراؤں کے دور دورے سے قطع نظر، صنف نازک کی تذلیل و تحقیر کا سب سے بڑا سبب بردہ فروشی ہوا۔ شام و ایران کی فتح کے بعد غلام بہت بڑی تعداد میں عرب آنے لگے تھے۔ زمانۂ مابعد میں جب مرکز خلافت بغداد میں منتقل ہوا تو خلافت کے شمال مشرقی گوشے سے ترکی نسل کی نوجوان کنیزیں، جو خوبصورتی میں مہر و ماہ کو شرماتی تھیں، فروخت کے لیے ہزاروں کی تعداد میں وہاں لائی جاتی تھیں، اور انھیں حاصل کرنے کے لیے بردہ فروش بڑی بڑی مہمیں ان دور افتادہ ممالک میں لے جاتے تھے۔

اُس زمانے میں یہ تجارت بہت سود مند تھی، اور طرفہ یہ ہے کہ اس ذلیل کاروبار کو ناپسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ یہ نوجوان لونڈیاں دارالخلافہ پہنچائی جاتی تھیں۔ یہاں بردہ فروش انھیں گانے بجانے کی تعلیم دینے کے بعد کسی دولتمند کے ہاتھ بڑے داموں پر بیچ دیتے تھے۔ بردہ فروشوں کے گھر بے فکر، دولتمند نوجوانوں کے میعادگاہ ہوتے تھے، جہاں وہ انھیں لونڈیوں کے ساتھ خوش گپی میں اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ عشق و محبت کے افسانے وہیں شروع ہوتے تھے، اور اکثر وہیں ختم بھی ہو جاتے تھے۔ کیونکہ عاشق سے بیش بہا تحائف کی فرمائش ہوتی تھی، جسے پورا کرنے میں وہ گھر بار لٹا دیتا تھا، اور آخر یا تو اپنی معشوقہ کو بیش قرار رقم دے کر خرید لیتا تھا، اور یا مفلس و قلاش ہو کر بازار میں بھیک مانگتا پھرتا تھا[1]۔ بردہ فروش کی طرح لونڈیاں بھی لوگوں کو لوٹنے کی خوب خوب ترکیبیں جانتی

[1] کتاب لموشہ کے مصنف نے اپنی کتاب میں، جو بغداد کے معاشری حالات پر مشتمل ہے، ایک باب خاص طور پر گانے بجانے والی لونڈیوں کے چلتر پر لکھا ہے، اور اُن کے خطرات سے عوام کو آگاہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ: "کسی مجلس میں ان میں سے ایک لونڈی کی نظر کسی دولتمند نوجوان پر پڑتی ہے، اور وہ فوراً اُسے بیوقوف بنانے اور دھوکا دینے کی کوشش میں لگ جاتی ہے۔ وہ اُس کی طرف آنکھوں اور ہاتھوں سے اشارے کرتی ہے؛ اُس کے قریب سامنے ہو کر گانا شروع کرتی ہے؛ جب نوجوان اپنا شراب کا پیالہ خالی کر کے رکھتا ہے تو فوراً اُسے اُٹھا کر باقی ماندہ شراب خود پی جاتی ہے اور اُس کی طرف دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کی اور حرکتیں اس وقت تک جاری رہتی ہیں کہ وہ بدنصیب اُس کے دام الفت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ . . . . . . اب نامہ و پیام شروع ہوتے ہیں، اور لونڈی تمام فرصت اُس وقت ختم کر دیتی ہے۔ وہ اُسے کہلا کے بھیجتی ہے کہ تمھاری یاد میں میری نیند حرام ہو گئی ہے؛ تمھاری یاد ہر وقت مجھے بے چین کیے رہتی ہے۔ بعض دفعہ وہ اپنی انگوٹھی، یا سر کے بال، یا کٹے ہوئے ناخن کا ٹکڑا، (باقی صفحہ ۳ پر)

تھیں، بلکہ اس کی انہیں خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی، اور یہ سب مل کر لوگوں کو پیٹ بھر کر لوٹتے تھے۔ بغداد پر ہی منحصر نہ تھا، بلکہ عراق کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں بھی ایسے مقامات بہت کثرت سے تھے، جہاں بدا طوار و سبک سر بے فکرے، عیش و عشرت کے متوالے جمع ہوا کرتے تھے۔ اسی قسم کی ایک جگہ کا حال نہایت تفصیل سے ہم تک پہونچا ہے۔ خلیفہ منصور کے زمانے میں ابن ضامن نام ایک بردہ فروش نے، جو غالباً ہندوستانی یا ایرانی تھا، کوفہ میں اپنا بازار جمایا۔ اس شخص کا مکان تعیش کے بیش قیمت سامان سے بھرا ہوا تھا، اور اس کے پاس بہت سی قابل فروخت کنیزیں تھیں۔ یہ مکان عاشق مزاج نوجوانوں کا مرجع بن گیا تھا، اور ان کی آمد و رفت سے ابن ضامن کی آمدنی میں معتد بہ اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کی ہر لونڈی چندے آفتاب بے چندے ماہتاب تھی۔ نوجوان مہمانوں کے ساتھ میل جول میں ہر قسم کی پابندی اٹھا دی گئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے سامنے گاتی بجاتی، یا ان کی موجودگی میں تعلیم پاتی تھیں۔ اس گھر کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی سلامہ تھی، جو زرقا (نیلی آنکھوں والی) کہلاتی تھی۔ اس کے علاوہ دو اور لڑکیوں کا نام خاص طور پر لیا گیا ہے: سعدہ اور ربیحہ۔ یہاں

(بقیہ صفحہ ۲) یا اپنے رباب کی لکڑی، یا مسواک کا ٹکڑا یا تھوڑا سا لوبان؛ جس پر اس نے بوسہ دیا ہو، اس کے پاس بھیجتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے خط، جنہیں وہ خود ہی بند کر کے اپنے رباب کے ایک تار سے باندھتی ہے، اور ایک آنسو اس پر گرانے کے بعد غالیہ سے بند کر کے اپنی خاص مہر سے، جس پر مناسب و موزوں الفاظ کندہ ہوتے ہیں، مہر لگا کر اس کے پاس بھیجتی ہے۔ ...... آخر وہ غریب فریفتہ و مفتوں ہو کر اس کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ اب اس سے بیش بہا تحائف کی فرمائش ہوتی ہے۔ مثلاً عدن کے کپڑے؛ نیشا پور کی شالیں؛ الخباج کے لباس؛ رشیدیہ چادریں؛ موس کی پگڑیاں؛ ریشمی کمر بند؛ زنانے جوتے (الخفاف الزنانیہ)؛ کنبایہ کی نعلیں؛ مرصع بجواہر سرپیچ (العصائب المرصعہ)؛ طلائی چوڑیاں؛ اور قیمتی لعل کے نگ والی انگوٹھیاں وغیرہ۔ اکثر وہ جھوٹ موٹ بیمار بن جاتی ہیں، بے سبب تکلیف کی شکایت کرتی ہیں، بلا وجہ فصد کھلواتی ہیں، اور بغیر بیمار ہوئے دوائیں کھانا شروع کر دیتی ہیں یہ سب بہانے محض اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ بیمار بن کر اپنے عاشق زار سے اور زیادہ تحائف وصول کریں۔ مثلاً عنبر میں بسی ہوئی قمیصیں؛ مشک میں تر کی ہوئی انگیاں (غلائل)؛ قیمتی معجونیں؛ کافور کے ہار یا گلوبند، اور طرح طرح کی خوشبوئیں وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ ان فرمائشات کا سلسلہ نامتناہی ہوتا ہے، اور وہ اسی وقت ختم ہوتا ہے جب عاشق کی دولت و ثروت پر بالکل پانی پھر جائے۔ اب اس فتنہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بدبخت سے جو کچھ ملنا تھا مل چکا۔ چنانچہ وہ اس سے بے رخی سے پیش آنا شروع کرتی ہے، ہر بات پر جھگڑتی ہے، رفتہ رفتہ ظاہر کر دیتی ہے کہ اس کا دل پرانے عاشق سے بھر گیا ہے، اور بالآخر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اس سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔" (کتاب الموشہ قلمی نسخہ ورق ۹۱)

شرم وحیا کے سارے پردے اُٹھ گئے تھے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود لڑکیاں، اپنے چاہنے والوں سے ہر طرح کے خلا ملا کے لیئے تیار تھیں، بشرطیکہ ان کی جیبوں میں رقم وافر ہو۔ ابن ضامن کے جائے قیام کے پاس ہی اُس وقت کوفہ میں ایک اور ایسا ہی مکان تھا۔ اُس کا مالک زریق تھا، اور اُس کی سب سے زیادہ خوبصورت لونڈی سُحیقہ کہلاتی تھی۔ نام ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس قسم کی عورت تھی۔ ابن ضامن اور زریق میں ہمیشہ مقابلہ رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس مقابلے نے نہایت اہم صورت اختیار کر لی، یہاں تک کہ حاکم شہر بھی اس میں حصہ لینے لگا، مگر وہ بالعموم ابن ضامن ہی کی طرفداری کرتا تھا۔ ابن ضامن نے دوسرے طریقوں سے دولت پیدا کرنے کے علاوہ اپنے بیوپار سے بھی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں۔ مُنہجیہ کو اُس نے ایک لاکھ درہم میں، سعدہ کو نوے ہزار درہم میں اور حسین زرقا کو اسّی ہزار درہم میں فروخت کیا۔ زرقا کا خریدار والی بصرہ کا نوجوان بیٹا تھا۔ اس نالائق بیٹے نے کوشش کی کہ جب تک ہو سکے اس معاشقہ کو اپنے باپ سے خفیہ رکھے۔ لیکن نا بہ سکے؟ آخر یہ افسانہ انجام کو پہونچا۔ ایک دن اچانک باپ نے اس گنہگار جوڑے کو جا پکڑا۔ زرقا کو بمشکل اس کا موقع ملا کہ پس پردہ چھپ جائے۔ باپ نے تمام گھر سر پر اُٹھا لیا۔ بیٹے کو پیٹ بھر کر برا بھلا کہا۔ جب بیٹے نے دیکھا کہ باپ کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہی نہیں ہوتا تو اس نے زرقا کو اشارہ کیا وہ یک بیک پردہ سے باہر آئی، خسر کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کے سر کو بوسے دیئے طرح طرح کی خوشامد شروع کیں، اور آخر اپنی حرکات و سکنات سے اُسے ایسا گرویدہ کیا کہ وہ غصہ بھول گیا، اور بیٹے بہو کے تمام قصور معاف کر دیئے[۱]۔ اس قصہ سے قطع نظر اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ تمام عمائد دولت اس طرح کی دلفریب، نازک اندام چھوکریوں کے دام تزویر میں گرفتار تھے، اور وہ بھی ناز و ادا، اور عشوہ و غمزہ کی ایسی پتلیاں تھیں کہ ان کے جال میں جو ایک مرتبہ پھنس گیا، اُس کا آزاد ہونا ناممکن تھا۔ اب بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح اپنے طبقے کے شریف خاندانوں میں بیوی تلاش کریں لوگ ایسی ہی شوخ و شنگ گانے والیاں خریدتے تھے، جو حسین ہونے کے علاوہ فنون لطیفہ سے پوری طرح بہرہ اندوز ہوتی تھیں، اور لاابالی پن سے اپنے مالکوں کے دل لبھاتی تھیں۔ یہ واقعہ ہے کہ باوجود ان باتوں کے، ایک یا ایک سے زیادہ شادیاں کرنے میں بھی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن بالعموم بیویوں کی بہت ہی کم پرواہ کی جاتی تھی، اور صرف اس کی ضرورت سمجھی جاتی تھی کہ ان کی حفاظت نہایت احتیاط سے کی جائے، تاکہ اس طرف سے بے فکر ہو کر خاوندوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل جائے۔ اسی طرح خلیفہ مہدی نے

---

[۱] اغانی ج ۱۳۔ ص ۱۲۰، ۱۳۱۔

شہزادگی کے زمانے میں ایک خوبصورت حسین گانے والی سترہ ہزار دینار میں خریدی تھی۔ اسی لونڈی کے بطن سے اُس کی بیٹی علیہ پیدا ہوئی، جس نے آگے چل کر فنون لطیفہ میں بڑا نام پیدا کیا[۵۱]۔ مہدی کے جانشینوں نے بھی، ماسوا چند کے، یہی رویہ قائم رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیک سرا در بدا طوار عورتیں محلوں پر قابض ہو گئیں۔ ان کی وجہ سے اخلاق پر جو کچھ اثر پڑا ہو گا اُس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک زبردست غلطی تھی۔ متعدد مثالیں اس کی موجود ہیں کہ ان عورتوں نے اعلیٰ طبقے کے نوجوانوں کے اخلاق و آداب کو کس طرح تباہ کیا، اور ان میں کیسی آوارگی پیدا کر دی[۵۲]۔ اہل یورپ کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ جنسی تعلقات میں اس قدر آزادی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے، اور کس طرح ایشیائی زنان خانوں میں یہ تمام باتیں بلا روک ٹوک جاری رہ سکتی ہیں[۵۳]۔ ممکن ہے کہ تعدد ازدواج اس کا ایک سبب ہوا ہو اور منکوحہ بیویوں کے علاوہ متعدد عورتوں کے یک جا رہنے سے یہ بات پیدا ہوئی ہو۔ عام طور پر جنسی تعلقات ایک راز کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن جب زنان خانوں کے دائرے کو وسیع کر دیا جائے تو راز درحقیقت راز نہیں رہ سکتا، اور عورتوں کے شرم و حیا پر اُس کا نمایاں اثر پڑتا ہے، اور اُن کے اخلاقی احساس میں بھی کمی آ جاتی ہے۔

بہرحال اس قسم کی اور اس سے بھی زیادہ نقصان دہ کمزوریوں کے باوجود تعدد ازدواج کو صحیح نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا گیا، اور اس پر ہمیشہ غلط تنقید کی گئی ہے۔ اسلام کی تبلیغ کے وقت بھی تعدد ازدواج اُس زمانے کے لوگوں کی زندگی کا ایک جزو بنا ہوا تھا، اور معاشرہ اسی رسم کے مطابق ڈھل چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عہد قدیم کی تمام اقوام میں یہ رسم پائی جاتی ہے، اور ہر جگہ اور ہر قوم میں اس کے اسباب ایک ہی تھے۔

یہ سمجھنا آسان ہے کہ تاریخ اقوام کے اُس دور میں جب قبائلی نظام کا دور دورہ تھا، متعدد قبائل کو متحد کر کے ایک دولت عامہ پیدا کرنے کا جذبہ بالکل مفقود تھا؛ ہر قبیلے بلکہ ہر خاندان کو الگ الگ باقی تمام دنیا کے خلاف سینہ سپر رہنا پڑتا تھا۔ جب یہ حالت ہو تو ظاہر ہے کہ حفاظت خود اختیاری کی غرض سے کافی تعداد کی ضرورت پڑتی تھی، تاکہ کسی حادثے کے وقت فوراً میدان میں بڑی سے بڑی جمعیت لائی جا سکے۔ یہ اسی طرح ممکن تھا کہ قبیلہ جتنا ہو سکے مضبوط رہے، اور مستعد بہ جنگ اشخاص کی بڑی سے بڑی تعداد میدان میں لا سکے۔ اس کے لیے آسان ترین ترکیب یہ تھی کہ رشتہ داریاں

---

[۵۱] اغانی ج ۱۳۔ ص ۱۱۴، ۱۱۵۔ [۵۲] اغانی ج ۹۔ ص ۹۸، ۹۹۔ ج ۱۸۔ ص ۱۰۵۔

[۵۳] کیا آج کل کے یا کسی زمانے کے یورپ کے متعلق مصنف کا یہ بیان درست ہو سکتا ہے؟ (مترجم)

پیدا کی جائیں، یا کسی دوسری طرح کے تعلقات ہوں جن سے دوسرے قبائل سے مدد حاصل کی جا سکے، یا دوسرے قبائل سے امداد حاصل کرنے کے ذرائع بنائے جائیں۔ ہر قبیلہ اور ہر خاندان کے لوگوں کے لیے ضروری تھا کہ ہر ممکنہ کوشش اس امر کی کریں کہ ان کے ہمدردوں اور پیرووں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہے، کیونکہ اسی پر خاندان اور تمام قبیلے کی قوت و عظمت کا انحصار تھا۔ اسی وجہ سے عہد نامۂ عتیق کے ایک پیغمبر کو یہ دعا دی گئی تھی کہ ان کی اولاد اتنی لاتعداد ہو جتنے سمندر کے کنارے ریت کے ذرّے یہی دعا اگر موجودہ یورپ کے کسی شخص کو دی جائے تو وہ گھبرا کر غش کھا جائے گا۔ اول تو تعدادِ ازدواج کے ذریعے زیادہ اولاد پیدا کر کے خاندان اور قبیلے کو طاقتور بنایا جا سکتا تھا، اور پھر اس طریقے سے دوسرے قبائل کے ساتھ مصاہرت کے جو تعلقات قائم ہو جاتے تھے اس کی وجہ سے یہ قبائل بھی بوقتِ ضرورت مدد و معاون بن سکتے تھے۔ عہدِ قدیم میں حلیف بنانے کا یہی سب سے زیادہ موثر طریقہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس زمانے میں رشتہ داری کو بے انتہا وسعت دی جاتی تھی، اور دور دور کے عزیزوں کو چھوڑنا بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ مصاہرت کے ذریعے جو تعلقات دوسرے خاندانوں سے قائم ہوتے تھے انھیں قائم رکھنے کا بھی بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔[۱] رشتہ داری کو اس قدر وسعت دی گئی تھی کہ رضاعت کو بھی خون کے رشتے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ عزیز داریاں قائم کرنے اور انھیں وسیع تر بنانے کے لیے تبنیت کی ترکیب اختیار کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ رشتہ بھی، ہم کفو کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس کو بھی کافی نہ سمجھا جاتا تھا، بلکہ آزاد کردہ غلاموں کو بھی خاندان میں شامل کر کے موالی اور ان کے تعلقات اتنے گہرے بنائے گئے تھے کہ موالی اپنے پرانے آقا کی جائداد تک میں حصہ دار تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ تمام باتیں اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ اُس زمانے میں لوگوں کو اس کا کتنا احساس تھا کہ خاندان اور قبیلے کے ساتھ جہاں تک ہو سکے زیادہ لوگوں کو وابستہ کر لیا جائے، خواہ یہ استحکام مصاہرت کے ذریعے سے ہو، یا محض اجنبی لوگوں کو اپنے میں ضم کر لینے سے، تاکہ اس طریقے سے اپنی قوت میں اضافہ ہو جائے اور جنگ کے موقع پر پوری پوری حفاظتی تدابیر اختیار کی جا سکیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم تعددِ ازدواج اور حرم کی زندگی میں جس کا رواج زمانۂ مابعد میں مشرق و مغرب ہر جگہ پایا جاتا ہے، خلط ملط نہ ہونا چاہیے۔ عرب من حیث القوم شرافت پسند واقع ہوئے ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ شرافت پرست تھے، اپنے حسب و نسب پر جان دیتے تھے، اور اُس میں ذرا سی بھی خرابی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے

---

[۱] مصنف کی کتاب Geschichte der herrschenden Ideen das Islam. ص ۳۴۹۔

بے حیا و ناموزوں شادیاں اُن کے ہاں شاذ تھیں[۱] مختصراً ہوتا یہ تھا کہ ایک شیخ قبیلہ کے گھر یا خیمے میں بہت سی ایسی عورتیں نہیں رہتی تھیں جن کے اختیارات اور حقوق مساوی ہوں۔ ان میں سے صرف ایک گھر کی مالکہ سمجھی جاتی تھی، اور یہی شریف النسب، نجیب الطرفین بیوی ہوتی تھی۔ دوسری عورتوں کی حیثیت گھر کے نوکر چاکر اور بیوی کے بین بین ہوتی تھی۔ اس قسم کی مثالیں عہد نامۂ عتیق میں بھی ملیں گی۔

اشاعت اسلام کے بعد قدیم ازدواجی حالات نہ صرف بدستور باقی رہے، بلکہ اسلام کی وجہ سے ان میں اور بھی زیادہ قوت پیدا ہوگئی۔ کیونکہ اول تو اسلامی قانون کے مطابق بہت سی اولادیں پیدا کرنے، اور بے شمار عقب چھوڑنے پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا، اور دوسری معاشی اور سیاسی ضروریات بھی ایسی لاحق تھیں کہ عہد قدیم کی طرح اس وقت بھی تعدد ازدواج لازمی ہو گیا تھا۔ عربوں نے نہایت ہی مختصر سی مدت میں وسیع ممالک فتح کر لیے تھے، اور ایسے وسیع علاقوں میں بس گئے تھے، جن کے رہنے والوں کی تعداد فاتحین کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ مفتوحین پر حکومت کرنے اور انھیں قابو میں رکھنے کی صرف یہی صورت تھی کہ فوجی مرکزوں اور صدر مقاموں کا ایک جال تمام مفتوحہ علاقوں میں بچھا دیا جائے۔ ان چھاؤنیوں کی مثال ایسی تھی جیسے ریگستان میں نخلستانوں کی ہوتی ہے۔ مفتوحہ دنیا میں یہ چھاؤنیاں عربوں کے نخلستان تھے۔ انھیں کے ذریعے وہ مفتوحہ اقوام کی نسبتاً ایک بہت بڑی تعداد کو قابو میں رکھتے تھے، اور بغاوتوں اور شورشوں کو فرو کرتے رہتے تھے۔ لیکن اگر وہ آئندہ کی فکر نہ کرتے تو ان اقوام میں جلدی ہی ایسے غائب ہو جاتے کہ ان کا نام و نشان نہ ملتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ عرب اپنی آبادی بڑھائیں۔ اس کا طریقہ تعدد ازدواج سے بہتر نہیں مل سکتا تھا، اور اس ذریعے سے انھوں نے پورا پورا کام لیا۔ لہذا اس دور میں بہت سی شادیاں غلط اصول پر ہوئیں، جو عام حالات میں عرب کبھی گوارا نہ کرتے۔ صحیح النسب عربوں نے غیر اقوام میں خوب شادیاں کیں۔ اس سے اُس وقت تو صرف اُن کی نسل خراب ہوئی، مگر بعد میں اور بھی بہت سی خرابیاں پڑیں۔ جو حالات اُس زمانے میں تھے اُنھیں دیکھتے ہوئے عربوں پر تعدد ازدواج کا الزام لگانا غلطی ہے کیونکہ حکمراں قوم کی تعداد بڑھانے کا اس سے بہتر طریقہ ہو ہی نہ سکتا تھا۔

شرفائے مکہ میں قدیم زمانے کی روایات مدت تک زندہ رہیں۔ انھوں نے اپنی نسل کو خالص رکھنے پر بہت زور دیا، اور عرصہ تک اولاد کا زیادہ ہونا ان کے ہاں خاندان کی عظمت و جلال کی نشانی

---

[۱] مبرد۔ ص ۲۷۱۔

سمجھی جاتی رہی۔ ان کے لیے تنازع للبقا اور معاشی پریشانیوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ اُس وقت تمام عرب قوم کا گذارہ مفتوحہ ممالک کے محصول اراضی پر تھا۔ اس کے علاوہ حکمراں قوم نے فتوحات، مالِ غنیمت، اور بڑی بڑی آمدنی والی اسامیوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اس طرح اضافہ نسل میں کسی طرح کی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ لہذا جیسا کہ عام طور پر اس قوم میں ہوتا آیا ہے عربوں کی تعداد بڑھنے لگی، اور تھوڑی سی مدت میں اتنی بڑھی کہ جس کا شمار نہ رہا۔ اس کے برعکس مفتوحہ اقوام کی آبادی اسی نسبت سے گھٹنی شروع ہوئی۔ اس کی دو وجہیں ہوئیں۔ ایک طرف تو مفلسی اور فاقہ کشی نے ان کی تعداد کم کی، اور دوسری طرف تبلیغ و اشاعت اسلام کی وجہ سے بہ لحاظ تعداد انھیں نقصان پہونچا۔ کیونکہ مسلمان ہوجانے کے بعد مفتوحہ اقوام کے افراد حکمراں قوم میں شامل ہوجاتے تھے، اور اپنی قوم اور روایات کو بالکل ترک کر دیتے تھے۔ عربوں کی تعداد جس تناسب سے بڑھی اُس کے ظاہر کرنے کے لیے صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے ایک بیٹے کے صرف ساٹھ تو بیٹے تھے؛ اور بیٹیوں اور زنان خانے کے دوسرے افراد کی تعداد جن میں اُس کی بیویاں، کنیزیں، آزاد کردہ لونڈیاں اور موالی سب شامل تھے، ایک ہزار تک پہونچتی تھی[1]۔ اسی طرح بنی عباس کے ایک رکن خاندان کے ایسے ہی متعلقین کی تعداد چار ہزار بیان کی جاتی ہے[2]۔ حکمراں خاندان اس قدر سرعت کے ساتھ بڑھتے چلے گئے۔ یزید بن معاویہ کے عہد میں مدینہ میں ایک بغاوت ہوئی، اور بنی امیہ کے تمام افراد کو، موالی سمیت، شہر چھوڑنا پڑا۔ ان سب کی تعداد ایک ہزار بیان کی جاتی ہے، اور ایک روایت کے مطابق کل تعداد تین ہزار تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شمالی افریقہ میں جنگ وادی سبوا میں باغی بربریوں کے خلاف جو فوج بھیجی گئی ہے اُس میں دس ہزار بنی امیہ تھے[3]۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم مورخوں کے بیان کردہ اعداد کو بالکل صحیح مان لیں۔ لیکن اتنا تو ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ حکمراں خاندان میں اضافہ، خواہ وہ صلبی اولاد میں ہو، خواہ موالی میں، ناقابل تردید ہے۔

آخر الامر جب بنی عباس خلیفہ ہوئے تو تعدد ازدواج اور عرب خاندانوں کی مخصوص تنظیم کی بدولت حکمراں خاندان کی تعداد خلیفہ مامون کے عہد میں (تقریباً ۲۰۰ھ ۸۱۵ء) تینتیس[۳۳] ہزار سے کم نہ تھی[4]۔

---

[1] Fragmenta Hist. Arab. by De Goeje ج ۱، ص ۱۳۔

[2] معجم۔ ج ۲۔ ص ۱۱۸۔ [3] ابن عذاری۔ ج ۱۔ ص ۴۲۔ [4] مسعودی ج ۷۔ ص ۵۹۔ ڈخویہ کی کتاب مذکورہ بالا ج ۱، ص ۱۳۵ + ج ۲۔ ص ۴۳۰ + ابن اثیر ج ۲۔ ص ۲۲۵ + ابن تغری بردی۔ ج ۱۔ ص ۵۷۵۔

ان تمام واقعات اور اعداد سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانے کے معاشری حالات کس قسم کے تھے اور بالخصوص اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تعدد ازدواج کے کیا نتائج برآمد ہوئے تھے۔ لیکن اب تک ہم نے تصویر کا صرف روشن ترین رخ دیکھا ہے۔ جس طرح ابتدائی زمانے میں تعدد ازدواج حکمراں قوم کے استحکام اور طاقت کا سبب بنا تھا، اُسی طرح زمانۂ مابعد میں یہی رواج اُن کے انحطاط اور زوال کا باعث ہوا۔ اسلامی فتح کے ابتدائی زمانے میں ہر سپاہی، بلکہ ہر مسلمان، بغیر کسی دقت کے سامان خورد و نوش اور دوسری ضروریات زندگی سے مستغنی ہو سکتا تھا اُسے بیت المال سے فوجی وظیفہ ملتا تھا، اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ وظیفہ بہت کافی ہوتا تھا[1] اگر یہ نہیں تو وہ اُسی بیت المال سے سالانہ وظیفہ کا حق دار تھا۔ اس کے علاوہ ہر سپاہی کو مال غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔ ابتدائی جنگوں کے دور میں یہ بھی وافر آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ بنی امیہ کے عہد میں ہر مسلمان کو، اگر وہ چاہے تو جاگیر مل سکتی تھی۔ اس طرح تمام مسلمانوں کو نہ تو تنازع للبقا کا خوف تھا، اور نہ کسی تردد اور فکر کی ضرورت تھی۔ اُن لوگوں کی حالت اور بھی اچھی تھی جو حکمراں خاندان سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ یہ تعلق رشتہ داری کا ہو یا موالی ہونے کا۔ انھیں حکومت کی آمدنی سے بھی بڑا حصہ ملتا تھا، اور ان کا گذارا کم و بیش سرکاری رقوم پر ہی ہوتا تھا۔

جہاں کہیں ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں وہاں لازمی ہے کہ آبادی غیر متوقعہ طور پر بسرعت بڑھے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے غیر معمولی حالات ہمیشہ باقی نہیں رہتے۔ چنانچہ جوں ہی حالات بدلے تعدد ازدواج کی خرابیاں ظاہر ہونے لگیں۔ معاشرہ کی حالت تباہ ہوئی اور اُس میں انتشار کے آثار پیدا ہو گئے۔ یہ واقعہ ہے کہ حالات کے تبدیل ہونے میں دیر بھی نہ لگی۔ جیسے جیسے عربوں کی آبادی بڑھی، یہ قوم قریب و دور ہر طرف پھیلی، اور اراضی پر زیادہ تر انھیں کا قبضہ ہوا عوام میں ان کی مخالفت اور ان سے نفرت کے جذبات بھی بڑھنے لگے۔ خانہ جنگی اور مذہبی اختلافات کی وجہ سے خوش حالی میں کمی آئی۔ فاتحانہ جنگیں آخر ختم ہو گئیں، اور اُسی کے ساتھ وہ تمام منافع بھی ختم ہوا جو مال غنیمت کی صورت میں اب تک مسلسل مسلمانوں کو حاصل ہو رہا تھا۔ زندگی پر از تکلف و تردد ہو گئی، زمین کی پیداوار کم ہوئی، جس سے سرکاری آمدنی میں کمی آئی، اور جو کچھ آمدنی ہوتی اُس کا بڑا حصہ سپاہیوں کی تنخواہ اور دوسری فوجی ضروریات میں خرچ ہو جاتا۔ زندگی کی مشکلات روز بروز بڑھتی گئیں، اور تجارت اور صنعت و حرفت میں بھی پہلے کی سی آسانیاں نہ رہیں۔ ان حالات کے

---

[1] فون کریمر۔ ج ۱۔ ص ۲۱۳۔

تحت تعدد ازدواج کی وجہ سے جب خاندانوں کی تعداد بہت بڑھتی تو اور بھی مصیبت کا سامنا ہوتا۔ دولتمند خاندان روز بروز مفلس ہوتے چلے گئے۔ عام دولت میں بھی کمی آئی۔ پھر خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد تمام سیاہ وسفید کے مالک یا تو وہ عرب بنے جو ایران میں پیدا ہوئے تھے، اور یا وہ ایرانی جو معاشرت اور خیالات کے لحاظ سے بالکل عرب بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے خالص عربوں کو سرکاری عہدوں سے بالکل بے دخل کردیا۔ اب تعدد ازدواج کی وجہ سے ان عربوں کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا، اور جو قوم کسی زمانے میں حکمراں تھی، اُسے بہت جلد مفلسی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔ سیاسی حالات ایسے بدلے کہ عرب فاتحین کے جانشینوں کے ہاتھ سے رفتہ رفتہ زمینیں بالکل نکل گئیں، اور ان لوگوں کے ہاتھ آئیں جو دربار خلافت میں سب سے زیادہ وقعت اور رسوخ رکھتے تھے۔ یہ لوگ ایرانی اور ترک سپہ سالار اور وزرا تھے۔ اب ان نئے امرا کے موالی اور متوسلین عربوں کی آمدنی میں اُسی طرح کے حصہ دار بنے جیسے کہ کسی زمانے میں عرب اپنی مفتوحہ اقوام کی آمدنی میں بنے تھے۔

عربوں کی سیاسی اور معاشی زندگی پر تعدد ازدواج کے یہ اثرات بالکل بدیہی ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس قوم کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر بھی اس رواج کے اثرات اتنے ہی دور رس اور پر آفت و مصیبت زا تھے۔ ہم پہلے ہی اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ان تبدیل شدہ حالات کی وجہ سے نسل کی خوبی اور خون کے خالص ہونے پر جو زور کسی زمانے میں دیا جاتا تھا وہ بات اب باقی نہیں رہی تھی۔ عرب کی قدیم تاریخ میں اس بات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ بچے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شریف ہوں۔ لیکن اب اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعدد ازدواج میں تو پہلے کی طرح اب بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی، لیکن شرافت کے قدیم خیالات کی وجہ سے معاشرے نے جو پابندیاں قائم کر رکھی تھیں وہ بالکل اُٹھ گئیں۔ لہذا بے سوچے ازدواجی تعلقات قائم کیے جانے لگے۔ اب مجہول النسب اولاد کا دور شروع ہوا۔ ان میں اول تو یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ اپنے آبا و اجداد کی روایات کو زندہ اور باقی رکھیں، اور نہ ایسا اخلاق اور قوت ارادی ہی تھی کہ باوجود کوشش کے بھی ان روایات پر عمل کریں۔ مختصر یہ ہے کہ تعدد ازدواج نے انجام کار یہ صورت پیدا کردی کہ خاندانوں پر داشتہ عورتوں کی حکومت ہوگئی، باضابطہ اور منظم خانگی زندگی کا خاتمہ ہوا، اور اُس کی جگہ اخلاقی پستی اور ابتری نے اپنا تسلط جمایا۔ یہیں سے انحطاط و زوال کے مہلک جراثیم پھیلنے شروع ہوئے، جنھوں نے مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ اسلامی حکومتوں کو اوج فلک سے تحت الثریٰ میں پہونچا دیا۔ عہد وسطیٰ کے ہر اسلامی دربار میں، خواہ وہ بغداد ہو

یا قرطبہ یا کوئی اور چھوٹا دربار، ہمیں یہی حالات نظر آتے ہیں۔ ایک مشرقی حرم کا تصور کرو، جہاں تیس بیٹیاں، چالیس یا سو بیٹے، جو مختلف عورتوں کے بطن سے ہوں یک جا رہتے ہوں، اور پھر یہ تصور کرو کہ مختلف عورتوں میں رشک و حسد اور اسی قسم کے دوسرے جذبات کیسے کچھ نہ ہوتے ہوں گے، اور ان کی وجہ سے کیا عجیب و غریب حالات پیدا نہ ہوتے ہوں گے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس اولاد کے علاوہ عورتوں کی ایک فوج کی فوج موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر ان عورتوں اور ماؤں کے خیالات اور جذبات کا کیا اثر پڑتا ہوگا؟ جتنی زیادہ کسی خاندان کی تعداد ہوتی ہے اتنی ہی کم باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کے بجائے عورتوں کے فاسد اثر میں زندگی بسر کرتے تھے، اور ایک دوسرے کے خلاف سازش میں لگے رہتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ اس کا بھائی اس کا ایک طاقتور، خوفناک اور بے ایمان حریف ہے۔ آخر ان میں سے ایک بیٹا تخت و تاج یا جائداد کا مالک بنتا تھا، اور فوراً اس کے دوسرے بھائی اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے تھے، اور ہر شخص کا واحد مقصد یہ ہوتا تھا کہ کامیاب بھائی کو نیچا دکھا کر اس کی جگہ خود سب چیزوں کا مالک بن جائے۔ ابتدائی زمانے میں جب حسب و نسب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا تو شریف اور خاندانی عورت ہی کا بیٹا اصلی وارث سمجھا جاتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی جو عام عورتوں کے بطن سے ہوتے تھے، یہ سمجھ لیتے تھے کہ انھیں جھگڑنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ لیکن اب یہ خیال مٹ گیا تھا، اور ہر ایک بیٹا اپنے آپ کو وارث سمجھنے لگا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بے شمار بغاوتیں، بھائیوں کا قتل اور تخت کے لیے خانہ جنگیاں اور بغاوتیں شروع ہوئیں، جو مشرقی سیاسیات کا ایک خاص پہلو ہیں۔ یہ صورت انھیں حالات کے تحت پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ تمام خونریزی اس طرح ختم ہو سکتی تھی کہ جانشینی کے متعلق خاص قواعد و ضوابط بنا دیے جاتے؛ لیکن جو حالات بنا دیے گئے تھے ان میں ایسا کرنا ناممکن تھا۔

گو یہ بدیہی امر ہے کہ تعدد ازدواج کے یہ مہلک اثرات آبادی کے ہر طبقہ میں ظاہر ہو رہے تھے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ درمیانی اور ادنیٰ طبقے کے مقابلے میں اعلیٰ طبقہ ان سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ متوسط اور ادنےٰ طبقوں نے تبدیل شدہ حالات کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے جوں ہی دیکھا کہ اب حالات مساعد نہیں رہے، اور آئندہ حکومت کے جود و سخا پر گذارہ کرنا، اور بلا کسی تردد کے ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ناممکن ہے، تو انھوں نے اپنی زندگی بدل ڈالی۔ ان لوگوں نے تعدد ازدواج سے منھ موڑا اور پھر ایک بیوی پر قانع ہو گئے[1]۔ ایسی زندگی کی مثالیں اکثر ملتی ہیں جسے صحیح معنوں میں خانگی

[1] ایک مصنف نے لکھا ہے کہ خالص عربوں میں یعنے ان عربوں میں جو اب تک اپنے ریگستانوں میں رہتے (باقی صفحہ ۱۰ پر)

زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے بیانات کی کمی نہیں جن سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک خاندان نہایت خوش و خورم زندگی بسر کر رہا ہے؛ میاں بیوی میں مکمل اتفاق و اتحاد ہے؛ ان کی اولاد ان کی آنکھوں کے سامنے پلتی اور تربیت پاتی تھی، اور جہاں میاں بیوی کے تعلقات بالکل وہی ہیں جن کی توقع ایک مہذب قوم میں کی جا سکتی ہے۔ ایسے بیانات بھی ملیں گے کہ خاندان نہایت خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہے کھانے کے وقت باپ دستر خوان پر بیٹھا ہے، اور اُس کی تمام اولاد بیٹے اور بیٹیاں سب کھانے میں شریک ہیں، اور خوشی خوشی کھانا کھا رہے ہیں حالانکہ آج کل مشرقی ممالک میں یہ مذموم طریقہ رائج ہے کہ اس موقع پر بالعموم بیٹیوں، بلکہ عورتوں کو، بالکل بھلا دیا جاتا ہے۔ اس کا بھی ثبوت موجود ہے کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بیوی اپنے خاوند بلکہ کل خاندان کی بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھتی تھی، اور ان پر جس طرح چاہتی تھی حکومت کرتی تھی[51]۔ ایسی مثالیں بھی نایاب نہیں کہ والدین کو بچوں کے ساتھ بھی اور بے لاگ محبت ہو۔ چنانچہ ایک خارجی سردار اپنے ایک ہم خیال کو میدان جنگ میں حاضر ہونے کا حکم دیتا ہے، مگر وہ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ:- میری بچیوں نے مجھے زندگی سے محبت کرنی سکھا دی ہے۔ وہ بالکل بے یار و مددگار ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ میرے مرنے کے بعد ان پر طرح طرح کی مصیبتیں پڑیں گی اور صاف پانی پینے کے بعد انھیں گدلا پانی پینا پڑے گا[52]۔

اس کے علاوہ ایسی نظیریں بھی مفقود نہیں جن میں محبت صادق نے مرد و عورت کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے، اور اس محبت کی وجہ سے جنسی تعلقات تک کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ کیونکہ مصیبت کے وقت انسان کے اعلےٰ جذبات بالکل مٹ نہیں جاتے، بلکہ عرب عورت کا اصلی جوہر ایسے ہی موقعوں پر چمکتا اور ظاہر ہوتا ہے، اور جذبات اُسے اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ بوقت ضرورت اعلےٰ درجہ کی نفس کشی اور ایثار کے لیے تیار ہو جائے۔ چنانچہ ایک شخص کو موت کی سزا ہوئی۔ اُس کی بیوی نے اُسے یہ اطمینان دلانے کے لیے کہ وہ اُس کے بعد دوسرا نکاح نہیں کرے گی جان بوجھ کر اپنے چہرہ کو بدنما بنا لیا[53]۔

(بقیہ صفحہ ۱۱) ہوئے تھے، یہ قاعدہ اس وقت تک چلا آرہا تھا کہ وہ ایک بیوی کے ساتھ اپنی زندگی ختم کر دیتے تھے، اور یہی حالت عورت کی بھی تھی۔ لیکن بہت جلد ان تمام اصولوں کا خاتمہ ہو گیا اور مرد تبدیلی کے خواہاں ہوئے۔ چنانچہ یہ کیفیت ہو گئی کہ مہذب اور معزز وہی شخص سمجھا جاتا تھا جو بوقت واحد بہت سی عورتوں سے معاشقہ کرے۔ کتاب الموشہ۔ ورق ۷۷۔

[51] ابن خلکان: ابو عثمان سعید حیری؛ اور زین العابدین۔ [52] مبرد۔ ص ۵۱۹۔

[53] مبرد۔ ص ۷۷۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ نے ان کی بیوی سے نکاح کی درخواست کی انھوں نے بھی یہ ظاہر کرنے کیلیے کہ اب وہ نکاح نہیں کریں گی، اوپر کے دانت نکلوا ڈالے تھے۔ کتاب الموشہ ورق ۸۴۔

دولت سلجوقیہ کا آغاز اور اُسکا تدریجی نشو و نُما

(جناب مولانا مصطفی حسن علوی صاحب [illegible] مسلم لکھنؤ یونیورسٹی)

تاریخ اسلام میں سلاطین سلجوقیہ کا عہد حکومت ایسا پُر شوکت ہے اور ساتھ ہی اس قدر عظمت اور اہمیت رکھتا ہے کہ دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ محفوظ رکھنے کے قابل ہے انھوں نے نہ صرف اسلامی مقبوضات کو جن میں طوائف الملوکی بیرونی حملوں اور اغیار کی چیرہ دستیوں سے زوال اور انحطاط رونما ہوگیا تھا ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا بلکہ رقبۂ اثر و حکومت میں وسعت دے کر مسلمانوں کی فوجی قوت کی مغربی ایشیا میں دوبارہ دھاک بٹھا دی ان میں نہ بنی امیہ کی طرح خارجیت تھی نہ عباسیہ کی طرح اعتزال ان کا مذہبی شعار آل بویہ کے شعار سے الگ تھلگ تھا وہ خوارزمیوں اور غزنویوں کی طرح بد اصل و بدگوہر نہ تھے اور گو ان کا آفتاب اقبال بھی اور اقبال مندوں کی طرح غروب ہوگیا لیکن اس کی ہلکی ہلکی روشنی مدت تک باقی رہی۔

سلطنت بغداد کے زوال کے وقت ایران اور عراق میں جو شاندار حکومتیں یکے بعد دیگرے بنیں اور بگڑیں سب انھیں کی شاخیں تھیں اور شاہان روم جو ترکوں سے قبل ایشیائے کوچک میں حکمراں رہے انھیں کے لاحق اور منتسب تھے۔ خوارزمی سلطنت کا بانی نوشتگین اسی خاندان کا غلام تھا اور طشت داری کے منصب سے سربلند ہوا تھا۔ صلیبی محاربین میں سے نور الدین زنگی اور شعرا کی بدولت حیات جاوید پانے والوں میں سے قزل ارسلان اور اتابک ابوبکر سعد زنگی نے انھیں کے خوان کرم و احسان سے پرورش پائی تھی۔

خلافت عباسیہ کے ضعف و تنزل کا زمانہ تھا کسی دوسری حکومت میں قوت نہ تھی کہ ممالک اسلامی کو اپنے زور بازو سے ایک کڑی میں جوڑ سکے غیر آئینی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور جمعیت اسلامی کا شیرازہ پراگندہ اور منتشر ہو چکا تھا مصر میں سلاطین بنی فاطمہ کا گو وقار باقی تھا لیکن خلفائے عباسیہ کا زوال اُن کے لیے باعث حزن و ملال نہ تھا۔ اسپین اور افریقہ خلافت بغداد کی سیادت تسلیم کرنے سے مُنھ موڑ چکے تھے شام کے شمالی اضلاع اور الجزائر باغی اور سرکش عربوں کے تصرف میں تھے۔ رہ گیا ایران اس پر مختلف فرماں روا حکمرانی کر رہے تھے اور ان میں سب سے زیادہ طاقتور آل بویہ یا دیلمی تھے جو شیعی عقائد کے پابند تھے اور ان سے خلفائے بغداد کو کسی سہارے کی توقع نہ تھی قسطنطنیہ کے قیصروں نے کروٹ بدلی تھی اور ایک ایرانی الاصل خاندان نے سریر آرائے حکومت ہو کر

رومۃ الکبریٰ کے کھوئے ہوئے صوبوں پر دوبارہ تصرف کرنے کی نیت کی تھی رومیوں کے فوجی دستے حلب اور دمشق تک چھاپے مارتے تھے مگر یہاں کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ تھی تمام دنیائے اسلام پر غفلت اور جمود کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور اغیار و اجانب اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے آستینیں چڑھا چکے تھے۔ یکایک رحمت حق کو حرکت ہوئی ریاض اسلامی کے پژمردہ اور کمھلائے ہوئے پودھوں میں نئی کونپلیں نکلیں دقاق نامی ایک شخص کے یہاں جو ترکستان اور بلاد چین کے درمیان دشت قرقیز یا ترثیق کے ایک خود مختار سردار کا سپہ سالار تھا ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سلجوق[1] رکھا گیا کارکنان قضاء و قدر نے حدیقہ اسلامی کی باغبانی کی خدمت اس کے سپرد کی اس نے اسلامی حکومت کے جسم بیمار کو توانائی بخشی جسد بے جان میں تازہ روح پھونک دی منتشر حلقوں کو اکٹھا کیا اور متفرق کڑیوں کو جو ایشیائے کوچک افغانستان عراق عجم اور عرب وغیرہ میں بکھری پڑی تھیں پھر ایک دوسرے سے ملحق کر دیا۔

سلجوق کا باپ تدبیر و دانش شجاعت و بہادری کی وجہ سے غز قوم کے سردار[2] بیغو کا سپہ سالار تھا بیغو نے ارادہ کیا کہ اپنی جمعیت سے کر دار السلام بغداد پر حملہ آور ہو دقاق نے مخالفت کی اور بات یہاں تک پہونچی کہ مار پیٹ کی نوبت آ گئی دقاق نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ بیغو کے سخت چوٹ آئی اس کے خدام نے مکافات کی غرض سے ہجوم کیا لیکن سپہ سالار کی موافقین کی بھی خاصی جمعیت تھی کامیابی نہ ہوئی صلح ہو گئی اور بیغو نے عزت و حرمت سے زندگی بسر کی بہادری اور جاں بازی کے آثار بچپن ہی سے سلجوق کی پیشانی پر ہویدا تھے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

دقاق کی وفات کے بعد بیغو نے سلجوق کو اپنا مقرب بنا کر ساشی (قائد الجیش) کا لقب دیدیا یہ بات حرم سلطانی میں بنظر تحسین نہ دیکھی گئی ملکہ نے تدریجاً اس کی طرف سے بادشاہ کے کان بھرنا شروع کر دیے کیونکہ وہ دیکھتی تھی کہ سلجوق کے طرفداروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور ان کی سرفروشی اور اطاعت میں یوماً فیوماً ترقی ہے جب سلجوق کو معلوم ہوا کہ اس کی جان

---

[1] حمد اللہ مستوفی نزہۃ القلوب میں لکھتا ہے کہ سلجوق کا سلسلہ نسب چونتیسویں پشت پر افراسیاب سے ملتا ہے لیکن یہ قول استناد کے قابل نہیں گبن لکھتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی باوجود علم الانساب میں ماہر ہونے کے سلاجقہ کے نسب کے متعلق اپنی لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ زوال روم گبن جلد ۶ صفحہ ۵۲

[2] ترک مضبوط اور خوبصورت جانوروں کے نام پر انسانوں کے نام رکھتے تھے چنانچہ بیغو کے معنے بارہ سنگھے کے ہیں۔ ویمبری تاریخ بخارا صفحہ ۹۹

خطرہ[1] میں ہے تو اُس نے اپنے وفاداروں کو مع ایک ہزار پانچ سو اونٹوں اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ بکریوں کے گلے کے ہمراہ لیا اور سمرقند روانہ ہو گیا جند[2] نام ایک غیر مشہور بستی میں کچھ دنوں قیام کیا اور اسی دوران میں بہ تمنا[3] و رغبت سعادت اسلام سے بہرہ اندوز ہوا۔ جاڑوں کے دن بخارا میں گذارتا اور گرمیاں سغد سمرقند میں بسر کیا کرتا تھا یہ ملک اس وقت حاکم ترکستان ایلک خاں کے قبضہ میں تھا جس نے سلجوق سے خراج کا مطالبہ کیا سلجوق کو یہ بات پسند نہ آئی اُس نے والیٔ سمرقند کی مدد سے حاکم ترکستان کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دی۔ سلجوق نے اسرائیل میکائیل ارسلان موسیٰ چار فرزانہ فرزند یادگار چھوڑ کر سو برس کی عمر میں بمقام جند انتقال کیا۔ اس کی اولاد میں سے اسرائیل نے اپنی دانش اور ہوشمندی کی وجہ سے اہل بخارا پر خاصا اثر جما لیا تھا اس کی ہردلعزیزی اور شجاعت کا شہرہ سلطان محمود غزنوی تک پہونچا اس زمانہ میں ایلک خاں[4] ترک اور محمود غزنوی میں صلح تھی محمود ایلک کی ملاقات کے لیے ماوراءالنہر گیا جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی اور اخلاص اور مودت کی گفتگو ہونے لگی تو اُس نے محمود سے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ بے خبر نہ ہوں گے کہ سالہائے دراز سے ایک قوم ترکستان سے آکر اس سرزمین میں آباد ہو گئی ہے سغد اور بخارا اس کے قبضہ میں ہے اور ان کی جمعیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اسلحہ اور سامان جنگ کی بھی ان کے پاس کمی نہیں ہے مجھے خطرہ ہے کہ اگر وہ زمانہ آیا کہ آپ کو ہندوستان جانا پڑا تو میدان خالی دیکھ کر ملک گیری کی ہوس اُن کے دماغوں پر مستولی ہو جائے گی اور آپ کی قلمرو میں فتنہ و فساد برپا کر دیں گے آپ خاص توجہ منعطف فرما کر ان کا اس وقت سے پہلے ہی قلع قمع کر دیں محمود نے یہ گفتگو سُنی تو ایک ایلچی اسرائیل کے پاس بھیجا اور پیغام دیا کہ باوجودیکہ ہم تمہارے ہمسایہ ہیں لیکن تم نے ہم سے کبھی ملاقات نہ کی اگر سب نہ آسکو تو کسی ایک کو منتخب کر کے میرے پاس بھیج دو تاکہ آپس میں یگانگت اور اتحاد پیدا ہو اور بوقت ضرورت

---

[1] یہ ابن اثیر کا بیان ہے لیکن راوندی لکھتا ہے کہ مانند بود اور خورد و نوش کی قلت کی وجہ سے ماوراءالنہر کا یہ سفر اختیار کیا ممکن ہے کہ دونوں امور جمع ہو گئے ہوں [2] ابن خلکان لکھتا ہے کہ یہ جگہ بخارا سے بیس فرسخ پر ہے لیکن دمیری لکھتا ہے کہ قدیم ترین جغرافیائی نقشوں میں بھی باوجود تلاش مجھے یہ جگہ نہ ملی تاریخ بخارا ص۹ [3] یہ بیان اکثر مورخین کا ہے لیکن متاخرین میں جرجی زیدان لکھتا ہے کہ چونکہ اسلام لائے بغیر انکو کامیابی ممکن نہ تھی اس لیے مجبوراً مسلمان ہو گئے تھے۔ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان جلد ۳۔ اور دمیری لکھتا ہے کہ غالباً یہ لوگ عیسائی مذہب کے پہلے سے پیرو تھے لیکن یہ دونوں اقوال ثبوت کے محتاج ہیں اور ہم ان کو پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیتے ہیں [4] بخارا کا یہ مالک تھا لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہوا سلجوق نے اس سے جنگ کر کے بخارا کو واگذار کرا لیا تھا۔

ایک دوسرے کی مدد کر سکیں میں دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے مقیم ہوں یہ جگہ دور بھی نہیں ہے۔ سلجوق کے لڑکے سیدھے سادے تھے اس ڈپلومیسی کو نہ سمجھ سکے انھوں نے اسرائیل کو منتخب کر کے مع ایک فوجی دستہ کے محمود کے پاس بھیج دیا محمود کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک شخص کو فوراً اسرائیل کے پاس بھیجا اور یہ کہلایا کہ مجھے لشکر کی ضرورت نہیں ہے میں تو محض آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں لشکر کو جس مقام پر آپ ہیں چھوڑ کر یکہ و تنہا آجائیے چنانچہ اسرائیل نے فوج کو وہیں چھوڑا اور خود دربار محمودی میں پہونچا محمود اس کے پہونچنے پر تخت سے اُتر پڑا اور تعظیم و تکریم کے ساتھ اسرائیل کو اپنی جگہ بٹھا دیا رسمی مزاج پُرسی کے بعد محمود نے اسرائیل سے کہا کہ چونکہ ہم کو اکثر کفار سے جہاد کرنا پڑتا ہے اور اس غرض سے ہندوستان بھی آنا جانا رہتا ہے ہماری مملکت میں فوج کی کمی ہوجاتی ہے خیال ہوتا ہے کہ کہیں کوئی دشمن اس اثنا میں سر نہ اٹھائے کیا اگر ایسا اتفاق ہو تو آپ ہماری مدد کریں گے؟ اسرائیل نے جواب دیا کہ سر آنکھوں سے۔ محمود نے کہا کہ پھر اس کی صورت کیا ہوگی اسرائیل نے ترکش سے ایک تیر[1] نکال کر آگے ڈال دیا کہ جب ضرورت ہو تو آپ اس تیر کو میرے پاس بھیج دیں ایک لاکھ فوج آپ کی مدد کو آجائے گی۔ محمود نے کہا کہ اگر یہ تعداد کفایت نہ کرے اسرائیل نے دوسرا تیر سامنے ڈال دیا اور کہا کہ اس تیر کو میرے پاس بھیج دیجئے گا پچاس ہزار سوار آجائیں گے۔ محمود نے کہا کہ اگر یہ بھی کافی نہ ہوں تو آپ کیا کریں گے اسرائیل نے تیسرا تیر سامنے ڈال دیا اور کہا کہ اسے ترکستان بھیج دیجیے گا دو لاکھ فوج آپ کی مدد کو اور آجائے گی۔ اس گفتگو سے محمود کو سلجوقیوں کی طاقت کا اندازہ ہوگیا اس کے بعد ہی دسترخوان بچھایا گیا جس میں اور لوگ بھی شریک ہوئے غرضکہ اسی طرح تین شبانہ روز شراب اور کباب میں گذرے۔ محمود نے ایک خلعت بھی اسرائیل کو دیا اور اس کے بعد گرفتار کر کے راتوں رات غزنہ کی طرف روانہ کر دیا جہاں ایک قلعہ[2] میں سات سال تک محبوس رہا اور یہاں ہی اُس کا انتقال ہوگیا۔ اسرائیل کے بھائیوں اور محمود کے درمیان جنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا جس میں میدان کبھی ان کے ہاتھ رہتا اور کبھی اُن کے ہاتھ۔

---

[1] ویمبری تاریخ بخارا میں بوجوہ اس قصہ سے انکار کرتا ہے صفحہ ۹۱ [2] یہ صاحب اخبار الدولۃ السلجوقیہ کا بیان ہے اور ابن خلدون اسی کا موید ہے بیہقی قلعہ کالنجر میں محبوس ہونا لکھتا ہے ملاحظہ ہوں صفحات ۸۸ و ۱۰۲ اور ۴۶۶۔ ہندوستان میں اسی نام کے دو قلعے تھے ایک بندیلکھنڈ میں اور دوسرا ملتان کے نواح میں پروفیسر اقبال نے دوسرے کی تائید میں تاریخ جہاں آرا سے استناد کیا ہے ملاحظہ ہو ضمیمہ راحۃ الصدور صفحات ۹۰۴ و ۴۰۷ ہمارے نزدیک مصنف اخبار الدولۃ السلجوقیہ کا بیان مرجح ہے۔

محمود کے انتقال کے بعد مسعود جانشین ہوا تو اس سے بھی لڑائیاں رہیں آخر میں مسعود کو شکست ہوئی اسرائیل کے بھائی میکائیل کے بیٹوں میں طغرل بک کو محرم ۴۲۹ھ میں بمقام شاد باخ (نیشا پور) مسعود کے تخت پر بادشاہ بنا کر بٹھا دیا گیا اور یہاں اس کے نام کا خطبہ بھی جاری ہوا اس نے تخت سلطنت پر بیٹھ کر جہاں بانی شروع کی اس درمیان میں گو مسعود نے پھر مقابلہ کیا لیکن اُسے شکست ہی اٹھانا پڑی مسعود کے مرنے کے بعد بلخ جرجان طبرستان اور خوارزم عراق عجم پر سلجوقیوں کا قبضہ ہو گیا اُس نے مغربی ایران کو غزنویوں سے خالی کرایا اور مشرقی حصہ سے آل بویہ کو نکال باہر کیا۔

جب طغرل کو ادھر سے اطمینان ہو گیا تو اُس نے باتفاق آرا القائم بامر اللہ خلیفہ بغداد کو ایک عرضداشت بھیجی جس کا مضمون یہ تھا:۔

"ہم غلامان آل سلجوق مخلص مسلمان ہیں ہم کفار کے مقابلہ میں ہمیشہ لڑتے رہتے ہمارے چچا اسرائیل کو بے جرم محمود غزنوی نے قید کر لیا تھا محمود کے بعد اس کے بیٹے مسعود نے بھی ہم سے اچھا برتاؤ نہیں کیا اور ہم کو جنگ و جدل کے لیے مجبور کیا تا آنکہ ہم نے اس کی بھی قرار واقعی سرکوبی کر دی ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہمارے ہاتھوں ظلم و جور سرزد ہوا ہو اُس کی رب العزت سے معافی مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آئندہ ہمارا ہر قدم امیر المومنین کے اشارہ پر اُٹھے اور ہماری حرکات و سکنات شیوۂ دین کے موافق ہوں"

یہ عرضداشت ابو اسحاق فقاعی کے ہاتھوں بغداد روانہ کی جب گماشتہ بغداد پہونچا اور القائم کو مضمون کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ابو محمد ہبۃ اللہ بن محمد ماموتی کو طغرل کے پاس رَے بھیجا اور اُس کو تاکید کر دی کہ جس طرح ممکن ہو طغرل کو بغداد لے آئے ہبۃ اللہ نے پیغام طلب پہونچا یا تین سال رَے میں قیام کیا اور رمضان ۴۴۷ھ میں وہ مسعود گھڑی آئی کہ طغرل بغداد پہونچا خلیفہ کی طرف سے شایان شان استقبال کیا گیا بارگاہ خلافت میں پہونچ کر طغرل بک تعظیم و تکریم بجا لایا اور خلیفہ کی دست بوسی کا شرف پایا۔ طغرل جس وقت باریاب ہوا ہے تو کاندھوں پر سیاہ جبہ اور ہاتھ میں عصائے محمدی لیے تھا خلیفہ نے

۱؎ گبن ایک رومی مورخ کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اس کی بادشاہت کے لیے انتخاب قرعہ اندازی کے ذریعہ سے ہوا تھا اس طرح کہ چند تیر سکران پر مختلف خاندانوں اور امیدواروں کے نام لکھ دیے گئے تھے اس کے بعد تیروں کے مٹھے کو ایک بچہ کے ہاتھ میں دیدیا گیا کہ اس میں سے ایک تیر کھینچ لے اتفاق سے جو تیر اس نے کھینچا وہ طغرل کے نام کا تھا لہذا اسی کو بادشاہ بنا دیا گیا ۲؎ اس کے معنے ترکی میں عقاب کے ہیں ۳؎ یہ راوندی کا بیان ہے لیکن حمد اللہ مستوفی نے ۴۳۲ھ لکھا ہے ۴؎ دیبری ص ۹۵

فرمان جاری کیا کہ مساجد میں بحیثیت شاہ وقت اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور سکوں پر اس کا نام کندہ کرایا جائے اور السلطان رکن الدین یمین امیر المومنین کے القاب سے سرفراز کیا خلیفہ اور سلطان کے درمیان ایک تحریر لکھی گئی جس کو محمد بن محمد نے پڑھ کر سنایا اُس کے الفاظ یہ تھے:۔

ان امیر المومنین ولاک جمیع ما ولاہ اللہ تعالیٰ من بلادہ ورد الیک امر عبادہ فاتق اللہ فیما ولاک واعرف نعمتہ علیک[۵۱]	بلاد و امصار میں سے جو کچھ اللہ تعالےٰ نے امیر المومنین کو دے رکھا تھا وہ سب اُنھوں نے آپ کو عنایت کر دیا اور رعایا کے معاملات کی باگ بھی آپ کے ہاتھ میں دیدی لہذا آپ کو چاہیے کہ امور جہان بانی میں خدا سے ڈرتے رہیے اور اس احسان وکرم کو کبھی نہ بھولیے۔

ایک تلوار مع ایک طلائی نیام کے اور ایک گھوڑا مع سونے کی زین کے دربار خلافت سے عنایت ہوا۔ طغرل نے ادائے شکر کے لیے خلیفہ کی خدمت میں پچاس ہزار دینار اور پچاس ترکی غلام مع سواری کے گھوڑوں اور ساز و سامان کے بطور ہدیہ پیشکش کیے۔

تھوڑے عرصے کے بعد طغرل کو دوبارہ بغداد آنا پڑا جس کا سبب یہ ہوا کہ دیلمیوں کی طرف سے ایک شخص بساسیری[۵۲] نام سپہ سالار لشکر تھا اس نے فاطمیین مصر سے سازش کر کے ان کو بغداد آنے کی دعوت دی اور القائم بامر اللہ کو گرفتار کر کے مقام عانہ بھیج دیا چنانچہ ایک سال تک فاطمیوں کا خطبہ بغداد میں پڑھا گیا آیتگین سلیمان طغرل کی طرف سے بغداد میں کوتوال تھا وہ بھی بھاگ کر حلوان چلا گیا۔ القائم نے کسی طرح ایک تحریر لکھ کر اس کے پاس بھیجی کہ جس طرح ہو سکے اس کو طغرل کے پاس[۵۳] پہونچا دے اس تحریر کا مضمون یہ تھا:۔

"اللہ اللہ مسلمانی را دریاب کہ دشمن مستولی شد و شعار قرمطیاں ظاہر گردانید"

جب یہ تحریر طغرل کو پہونچی تو اُس نے عمید الملک کندری کو اس تحریر کا مختصر جواب لکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ فوراً اس کو کسی طرح خلیفہ تک پہونچا دیا جائے تاکہ اس سے انھیں اطمینان خاطر میسر ہو جائے۔ کندری کی طرف سے آیتگین کی تحریر کی پشت پر یہ آیت لکھا دی گئی:۔

ارجع الیھم فلناتینھم بجنود لا قبل لھم بھا ولنخرجنھم	تو اُن کے پاس لوٹ جا اور ان کو مطلع کر دے کہ ہم ایک ایسے لشکر سے ان پر چڑھائی کریں گے کہ جس کا مقابلہ

---

[۵۱] صبح الاعشیٰ جلد ۴ ص ۲۷۶ و ۲۷۷ - [۵۲] یہ بہاء الدین دیلمی کا غلام تھا انقلاب زمانہ نے اس کو اس رتبہ تک پہونچا دیا اس کا اصل نام ارسلان تھا۔ ابن الاثیر ص ۲۲۵ [۵۳] راوندی ص ۱۰۱

منها اذلة وهم صاغرون۔ اُن سے نہ ہو سکے گا ہم اُن کو وہاں سے ذلیل دخوار کر کے نکال دیں گے۔

اس خط کے پہونچنے کے بعد ہی طغرل ٹڈی دل فوج لے کر پہونچا بساسیری کو قتل کر کے اس کا سر بغداد میں لٹکا دیا اور عانہ سے ذی الحجہ ۴۵۱ھ میں القائم کو لاکر مسند خلافت پر دوبارہ متمکن کیا اس سے فراغت ہوئی تو کندری وزیر کو بغداد میں چھوڑ کر طغرل بک تبریز چلا گیا اور چلتے وقت کندری کی وکالت میں خلیفہ کی بہن[۱] کے ساتھ نکاح کا پیام دیا پیام سن کر خلیفہ کو تامل ہوا اس لیے کہ خلفائے عباسیہ کے یہاں کبھی ایسا ہوا نہ تھا کہ اجنبیوں کو لڑکیاں دی جائیں لیکن کچھ مجبوریاں ایسی لاحق ہوئیں کہ بالآخر اُس کو منظور ہی کرنا پڑا۔ طغرل ابھی تبریز میں تھا کہ قاضی بغداد نے ایک سو درہم اور ایک دینار مہر مقرر کر کے نکاح پڑھا دیا طغرل تبریز سے رے گیا تاکہ دلہن کا استقبال کرے راستہ میں طبیعت بگڑی موسم گرما تھا اس لیے طغرشت گاؤں میں خنک ہوا کے خیال سے قیام کیا وہاں نکسیر کا خون اس قدر بہا کہ جاں بری نہ ہو سکی اور انتقال ہو گیا۔ ؎

بکس بر نہ ماند جہاں جاوداں نہ بر تاج دارد نہ بر موبذاں

طغرل کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق الپ ارسلان تخت نشین ہوا جو طغرل کا بھتیجا داؤد چغر بک کا لڑکا تھا خلیفہ بغداد کی طرف سے اس کو عضد الدولہ کا لقب ملا اس نے ۱۰ سال حکومت کی پہلے وزیر عمید الملک کندری کو قتل کرا کے نظام الملک کو وزارت پر فائز کیا اس کے عدل و انصاف کی بدولت دجلہ بغداد سے لے کر جیحون تک سرزمین گلزار ہوئی اس کی مجلس میں علما اور فضلا کا مجمع رہتا تھا غزنوی تو پہلے ہی مغلوب ہو چکے تھے بغداد اور مضافات بغداد قبضۂ اقتدار میں آچکے تھے لیکن قسطنطنیہ کے بادشاہ کو شکست دے کر اس نے اپنا دبدبہ ساحل باسفورس تک پہونچا دیا اور تمام مغربی ایشیا میں سلجوقیوں کا کوئی حریف باقی نہ رکھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ طغرل کی تا وقت وفات اس کے اہم ارادوں کو پورا نہ ہونے دیا تھا خدا معلوم کیا تمنائیں ہوں گی جو اس کے عالی حوصلہ دل میں پیدا ہوئیں اور دل کی دل ہی میں رہیں۔ غزنوی شکست کھا کر کمزور ہو چکے تھے دیلمیوں کا سر کچلا جا چکا تھا اور خلافت عباسیہ آل بویہ کے تسلط اور اقتدار سے آزاد ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ایک ہم اور نہایت ہی اہم مہم سر کرنا

---

[۱] زبدۃ التواریخ ابن اثیر اور تاریخ گزیدہ میں دختر لکھا ہے لیکن بہن کے ساتھ پیام اور نکاح کی روایت راوندی کی ہے القائم کا نکاح طغرل کی بھتیجی سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ بنداری صلا

باقی تھی وہ دشمنان ملت اسلامیہ یعنے قیاصرۂ قسطنطنیہ کو قلع قمع کرنا تھا جن کی حکومت اور بادشاہت کی ہمہ گیری نے انطاکیہ اور آرمینیا کے مغربی حدود تک قبضہ جما رکھا تھا گو طغرل کے حملہ کی روسے ایک بار ادھر رُخ کیا تھا اور اس کے ٹڈی دل سواروں اور پیادوں کی فوج نے طور سینا سے ارض روم تک چھ سو میل کی سرزمین کو چھپا لیا تھا اور بقول گبن اس کے ایک[1] حملہ میں ایک لاکھ تیس ہزار نصرانیوں کے سر پیغمبر اسلام کے قدموں پر لوٹنے لگے تھے۔ تاہم یہ کامیابی ناتمام اور ناکمل تھی کیونکہ رومۃ الکبریٰ کی قوت اور زبردست حکومت کے لیے یہ کوئی موثر اور پائدار ضرب نہ تھی اور اس فتح کے باوجود طغرل کو بے نیل مرام آرمینیا کے محاصرہ سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ الپ ارسلان نے چچا کے بعد زمام حکومت ہاتھ میں لی تو اس نے ایک طرف اپنی بلند نظری اور سخاوت سے دلوں کو مسحور کیا اور دوسری طرف اپنی شجاعت اور بسالت سے بڑی بڑی جبار اور قہار ہستیوں کو مغلوب اور مقہور کر دیا وہ جب برسر اقتدار ہوا تو چچا کی یہ ناتمام سعی اور کاوش آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھی چنانچہ ایک جرار لشکر کی قیادت کرتا ہوا علاقہ سواحل کے دارالسلطنت میں داخل ہوا اس کی نظر انتخاب سب سے پہلے اس علاقہ پر اس لیے پڑی کہ یہاں عیسائیوں کا ایک مشہور گرجا تھا جس کی دولت کی فراوانی اور زر و جواہر کی افزونی کے شہرے کانوں سے سن چکا تھا یہاں سے فراغت پائی تو گرجستان اور ملک ارمن کا رُخ کیا اور ان حکومتوں پر ایسا کاری زخم لگایا کہ وہاں کی بادشاہت اور قومی وقار دونوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا اور وہاں کے نصرانیوں کو ایسا قعر مذلت اور رسوائی میں ڈال دیا کہ پھر اُبھرنے کے قابل نہ ہو سکے اس کے بعد سلطنت روم کی باری تھی۔

تاریخ اسلام بالخصوص الپ ارسلان کے عہد حکومت کا یہ ایسا مہتم بالشان واقعہ ہے کہ باوجود عصبیت اور اختلاف مذہب کے مسیحی مورخین کی زبان قلم سے خراج تحسین وصول کیے بغیر نہ رہ سکا اور صورت حال بھی یہی ہے کہ ایک وحشی اور غیر منظم جماعت ایک منظم اور مستحکم حکومت کے مقابلہ میں زور آزمائی کے لیے تیار ہوتی ہے حکومت کوئی معمولی حکومت نہیں ہے اس کی عظمت اور وسعت مملکت کا شہرہ زبان زد خلائق ہے اور اس کے شوکت اور دبدبہ سے ایک جہاں خائف اور ششدر ہے نیم مردہ خلافت عباسیہ کو قابو میں کر لینا سہل تھا وہاں نہ ایسی کچھ تلواروں کی پرش اور ہتھیاروں کی جھنکار سے سابقہ تھا اور نہ ایسے زبردست مقاومت اور مدافعت سے واسطہ اور اگر کچھ ہو بھی تو نہایت معمولی وہاں

---

[1] گبن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا اس حملہ کی ۱۰۵۰ء میں ہوئی لیکن تاریخ مورخین عالم میں اس کی ابتدا ۱۰۴۸ء سے لکھی ہے۔ [1] گبن صفحہ ۲۰۶

تو صرف تدبر اور سیاست یہ دو بڑے ہتھیار تھے جنھوں نے کامیابی اور کار برآری سے دوچار کر دیا یہاں سر بفلک اور مستحکم قلعے تھے تیروں کی بارش تھی اور تلواروں کی بوچھار دین و مذہب کے شیدائیوں اور عصبیت کی دو آتشہ شراب کے متوالوں سے مقابلہ تھا۔

جس وقت الپ ارسلان نے اس مہم کا آغاز کیا اس وقت سلطنت روم قیصر کی بیوہ "یڈوکیا"[1] نام کے زیر نگیں تھی جب اُس کو الپ ارسلان کے ارادوں کی اطلاع پہونچی اور معلوم ہوا کہ حملہ کی رو بلا مزاحمت بڑھتی چلی آرہی ہے اور نسوانی جرات اور بہادری تاب مقاومت نہیں لا سکتی تو تاج و تخت روما نوس نامی ایک فوجی سردار کے سپرد کر کے حکومت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی نئے بادشاہ کو تخت روم پر بیٹھے ہوئے ابھی دو ہی مہینے گذرے تھے کہ اس کی حب الوطنی اور شجاعت نے قسطنطنیہ سے نکل کر میدان جنگ میں آنے پر مجبور کر دیا جب تک اپنے دار السلطنت میں رہا تو اس کی حیثیت ملکہ وقت کے خاوند سے زائد خیال نہیں کی جاتی تھی لیکن وہی جب میدان جنگ میں پہونچا تو فوجی سپاہی اس کی تعظیم و تکریم شہنشاہ وقت کی سی کرنے لگے۔ بادشاہ کے میدان جنگ میں آنے سے سپاہیوں میں جرات اور شجاعت بڑھ گئی اور پبلک کی بڑی بڑی امیدیں اس کے ساتھ وابستہ ہو گئیں بلکہ اس کی صدائے بازگشت اسلامی کیمپ تک پہونچی اور ترکی فوجیں بھی روما نوس کے خوف و دہشت سے لرزہ براندام ہو گئیں۔

الپ ارسلان کے فوجی دستے ایشیائے کوچک تک پہونچ چکے تھے لیکن ان کی قیادت چند امیروں اور سرداروں کے سپرد کر کے الپ ارسلان خود دوسرے اطراف میں سرگرم پیکار رہتا ان ناآزمودہ سواروں نے فتح کے نشہ اور اپنے مقبوضات کو مستحکم کرنے کے شوق میں فوج کو کئی حصوں میں منتشر کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روما نوس کی پہلی ضرب سے اسلامی لشکر کا ایک بازو کمزور پڑ گیا

---

[1] یہ ڈوکس قسطنطین نام سابق شاہ روم کی بیوی تھی قیصر کی موت کے وقت اس کے تین لڑکے موجود تھے لیکن نوردسالی کی وجہ سے باپ کے قائم مقام نہ ہو سکے لہذا اس کی بیوی کو تخت پر بٹھا دیا گیا ابھی اس کو حکومت کرتے ہوئے سات ماہ ہی گذرے تھے کہ سلطنت کی ذمہ داریاں اسے سخت معلوم ہوئیں لہذا روما نوس نامی ایک فوجی سردار سے عقد کر کے حکومت کا بار اس کے سر ڈالا مورخین کا خیال ہے کہ روما نوس کی رعنائی اور دلفریب حسن نے ملکہ کے دل کو رام کر لیا تھا لیکن اتفاق سے کچھ ایسے اسباب بھی مہیا ہو گئے کہ وہ آسانی سے اعیان سلطنت کی منظوری اپنی دوسری شادی کے لیے حاصل کر سکی اور جدید شاہنشاہ نے ایسے رعب و داب سے حکومت کی کہ اپنے اور یکا نوس سب ہی اس کے اثر کا سکہ بیٹھ گیا۔ تاریخ مورخین عالم جلد ۲ صہ ۲۵۲

اور اول بار شکست نصیب ہوئی شاہ روم کی بذات خود موجودگی اور اس کی بسالت و جرأت کا خوف ترکوں کی رگوں میں خون کی طرح دوڑنے لگا باوجودیکہ اس فوجی دستے نے پسپا ہو کر پہاڑی علاقہ میں پناہ لی تھی لیکن جب روما نوس نے ادھر کا رخ کیا تو اس کی تلوار کی برانی وہاں بھی آنکھوں کو خیرہ کرتی رہی اور یکے بعد دیگرے تین لڑائیوں میں شکست پا کر علاقہ سواحل سے ترکی فوج بالکل ہٹ گئی شاہ روم کے پیش نظر اب آخری اور مختتم مہم آرمینیا کی تھی جس پر ترک قابض ہو چکے تھے یہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس میں ایک جرار لشکر اور اس کے خورد و نوش کا سامان اور اسلحہ کی بے انتہا ضرورت تھی چنانچہ شاہ روم نے دو مہینے کی رسد کا انتظام کر کے اور تخمیناً تین[1] لاکھ کار آزمودہ فوج اکٹھا کر کے اقدام شروع کر دیا ارض روم اور وان کے درمیانی قلعہ ملاذ قند کی طرف پہلے توجہ کی۔

یہ جنگ محض وسعت مملکت کے لیے نہ تھی بلکہ صلیب و ہلال کی ایک فیصلہ کن نبرد آزمائی تھی ارمانوس کا عزم تھا کہ وہ ترکی فوج کا قلع قمع کر کے بنفس نفیس دار السلام بغداد پہونچ کر دار الخلافت پر صلیب اپنے ہاتھ سے نصب کرے قرآن مجید کے جتنے نسخے ملیں ان کو (نعوذ باللہ) نذر آتش کر دے تاکہ عبادت خدائے وحدہ لاشریک کی جگہ دنیائے اسلام میں تثلیث کا ڈنکا بجنے لگے۔

الپ ارسلاں کو جب اس عظیم الشان حملہ کی اطلاع ملی تو اندیشہ ہوا کہ مبادا اپنے آبائی مقبوضات سے بھی ہاتھ دھونا پڑے اس نے داخلی امور کی باگ وزیر با تدبیر خواجہ نظام الملک کے سپرد کی اور گو کہ فوج ناکافی اور بے سر و سامانی کا عالم تھا تاہم ... [2]سپاہی لے کر میدان جنگ میں جا پہونچا اس کے قدم رکھتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا نصرانی کیمپ میں تہلکہ پڑا پہلے ہی معرکہ میں عیسائیوں کا ایک نامور جنرل ابسیلس گرفتار ہوا اور اس کی گرفتاری کے بعد نہ ہاتھوں میں تاب رہی نہ پیروں میں طاقت کہ مقاومت کر سکتے انگریز مورخین لکھتے ہیں کہ اس پسپائی کا سبب رومی فوج کی پہلو تہی اور نافرمانی تھی اس نے ہر چند

---

[1] مصنف اخبار الدولۃ السلجوقیہ لکھتا ہے کہ پیادے اور سوار ملا کر ۳ لاکھ فوج تھی گبن لکھتا ہے کہ رومی فوج کو علاقہ سواحل اور ایشیائے کوچک کے غیر منظم جتھوں سے بہت تقویت پہونچ گئی تھی اس کے علاوہ ممالک یورپ کے سپاہی بھی تھے مقدونیہ بلغاریہ کے سپاہی فرانسیسی اور نارمن کے بے قاعدہ لشکری بھی شریک تھے آخر الذکر سپاہی شاہ اسکاٹ لینڈ کے ایک عزیز سردار کی ماتحتی میں تھے اور یہ لوگ شمشیر زنی اور دوسرے قسم کے اسلحہ استعمال کرنے میں بہت مشہور تھے صفحہ ۲۷۱۔

[2] دمیری تاریخ بخارا و اخبار الدولۃ السلجوقیہ صفحہ ۴۲ [3] اس تعداد میں بھی اختلاف ہے مصنف اخبار الدولۃ السلجوقیہ لکھتا ہے کہ ۱۵ ہزار یا ۱۲ ہزار سپاہی تھے لیکن دوسرے مورخین اس بارے میں بالکل خاموش ہیں گبن صفحہ ۲۷۱۔

فرانسیسیوں سے مدد طلب کی لیکن بیکار ثابت ہوئی بعض دیگر اقوام کے آدمیوں نے بھی وقت پر دھوکا دیا لیکن واقعہ تو یہ تھا کہ ادھر ظاہری قوت پر غرہ تھا اُدھر باطنی فیض اور محض عنایت و امداد ایزدی پہ بھروسہ۔ کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ۔

مورخین کا بیان ہے کہ اس مختصر جنگ کے بعد الپ ارسلاں نے صاف اور غیر مبہم شرائط صلح پیش کیے تھے اگر قیصر روم اس پیام امن کی قدر کرتا تو بجائے ذلت آمیز شکست کے اعزاز کے ساتھ پسپائی ہوتی یا صلح ہی ہو جاتی لیکن اُس نے اپنے گھمنڈ میں الپ ارسلاں کی تجاویز کو کمزوری اور خوف پر محمول کیا اور نہایت ہی تحقیر اور ذلت کے لہجہ میں جواب دیا کہ اگر یہ وحشی صلح و آشتی کے جویا ہیں تو ان کو چاہیے کہ جس زمین پر وہ خیمہ زن ہیں اس کو یک لخت رومن فوج کے قیام کے لیے خالی کر کے چلے جائیں اس کے علاوہ شہر رے اور محل شاہی اپنی آئندہ مخلصانہ طرز عمل کی ضمانت کے طور پر دے کر جنگ سے دست بردار ہو جائیں۔ جب الپ ارسلاں تک یہ سخت جواب پہونچا تو وہ اس مطالبہ کی غیر سنجیدگی پر پہلے مسکرایا اور پھر اس خیال سے کبیدہ ہوا کہ ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون اس مغرور قیصر کی ہٹ دھرمی کی بدولت بہایا جائے گا بادشاہ کی تسلی کے لیے بقول صاحب اخبار الدولۃ السلجوقیہ امام اور فقیہ ابو نصر محمد بن عبد الملک بخاری نے عرض کی کہ آپ دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں اور انشاء اللہ آپ کو کامیابی ہوگی آپ حملہ کی ابتدا اُس وقت کریں جبکہ خطیب ممبر پر ہوں فتح آپ کے قدموں پر نثار ہوگی۔

اس نامہ و پیام کے بعد اب حالت منتظرہ کوئی باقی نہ رہی تھی اس نے عاجزی سے درگاہ رب العالمین میں سجدہ کرنے اور خشوع خضوع سے دعائیں مانگنے کے بعد بذریعہ اعلان عام منادی کرا دی کہ فوج میں سے جس کسی کو میدان جنگ کے بجائے اپنے گھر کی سرزمین محبوب ہو اُسے بلا مزاحمت واپسی کی اجازت ہے اور ترکی رسم و رواج کے مطابق اس نے اپنے ہاتھ سے گھوڑے کی دُم باندھی تاج اور کلغی اتار کر رکھی اور نیزہ اور کمان ہاتھ میں لے کر کفن بدن سے لپیٹا جسم پر مشک ملا اور امرا و اعیان سے بطور وصیت کہا کہ اگر اسی جنگ میں اُس کی موت مقدر ہے تو یہی جگہ اس کی قبر کے لیے شایاں اس کے بعد امرا اور اعیان نے

---

[1] القائم بامر اللہ نے حکم دیدیا تھا کہ خطیب منبروں پر کھڑے ہو کر یہ دعا مانگا کریں اللھم اعل رایۃ الاسلام و ناصرہ واخذل الشرک بجب غاربہ واقطع اواصرہ وامدد المجاھدین فی سبیلک الذین فی طاعتک بنو سھم سمحوا (آخ تاریخ اخبار الدولۃ السلجوقیہ ص ۴۲ ۵۲ اخبار الدولۃ السلجوقیہ ص ۴۹ ۵۳ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ الپ ارسلاں خود میدان جنگ میں موجود نہ تھا وہ لکھتے ہیں کہ فوج کی کمان ایک معمولی آدمی کے سپرد تھی خود کسی دور دراز مقام پر چلا گیا تھا لیکن یہ قول صداقت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیے گبن ص ۱۷۹

بھی اس کا اتباع کیا اور جنگ کے لیے کمربستہ ہوگئے اگرچہ الب ارسلان کی آرزو یہ تھی کہ اپنے ہتھیاروں کے بل پر جنگ کو فتح کرے لیکن اس کی امیدیں ان ترک جانبازوں کے تیر و تفنگ سے وابستہ تھیں جن کے جتھے حکمت عملی اور دانائی سے اس نے بشکل ہلال دشمنوں کی فوج کے دائیں بائیں پھیلا دیے تھے یونانی فوج کے پرے سامنے تھے اور ان میں فوجی تنظیم اور ترتیب کی کمی نہ تھی رومانوس نے اپنی فوج کو اجتماعی شکل میں آگے بڑھایا اور نہایت ہی جرأت اور بہادری سے الب ارسلان کی فوج کو پسپا کرنا چاہا باوجود شدت گرما کے تقریباً دن بھر اس نے ہمت قائم رکھی لیکن ترکوں کی عدیم المثال جاں بازی سے چاروناچار ہزیمت اٹھانا پڑی دشمن کی فوج کے سامنے منہ موڑنے اور واپسی کا ارادہ کرنے کے جو بد نتائج ہوتے ہیں اُن سے اسے دوچار ہونا پڑا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جوں ہی رومی فوج نے اپنے جھنڈے کا رُخ بدلا دیکھا اُن کے پاؤں[1] اُکھڑ گئے اب کیا تھا ترکی فوج نے تیروں کی بارش شروع کر دی اور اسلامی فوج کے ہلال کے دونوں سرے ایک دوسرے سے مل گئے اب عیسائیوں پر دوطرفہ چوٹ پڑنے لگی ہزاروں گرفتار ہوئے اور لاتعداد روسی فوج کے سپاہی کام آئے رومانوس کے دل میں کوئی تمنا تھی تو یہ کہ کسی طرح باقی ماندہ فوج کو منظم کر کے بچا لے جائے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، اسے اپنی ہی جان کے لالے پڑ گئے اس وقت شاہی صدر مقام کے اردگرد بجائے رومیوں کے محافظ دستہ کے فتحیاب ترکمانوں کی فوج کا محاصرہ تھا اور بادشاہ رومانوس مذبوحانہ حالت کے ساتھ اس چھوٹے سے دستے کو لیے ہوئے (جو وفادارانہ شغف سے شاہی جھنڈے کے ساتھ تھا) صبح سے شام تک نبرد آزمائی کرتا رہا لیکن جب یہ مٹھی بھر آدمی بھی کام آگئے حتیٰ کہ اس کا اپنا خاص گھوڑا بھی مارا جا چکا اور وہ خود بھی زخمی ہوگیا تو بے یار و مددگار کیا کرتا جب تک ہاتھ پیر چلے یکہ و تنہا میدان میں ڈٹا رہا تا آنکہ اسلامی فوج کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا۔[2]

---

[1] گبن لکھتا ہے کہ قیصر کے ایک رفتہ دار کی بزدلی کو اس میں بڑا دخل تھا جس نے عزت شاہی کو برباد کر دیا ص ۲۵۲

[2] مورخین لکھتے ہیں کہ الب ارسلان کو پہلے ارمانوس کی شخصیت پر شبہ ہوا کہ آیا یہ قیصر ہے یا کوئی اور لیکن ایک سفیر نے شناخت کی اور سب سے بڑھ کر یہ ثبوت ملا کہ جب گرفتار شدہ جنرل بیلیس رومانوس کے سامنے لایا گیا تو مجبور جنرل اپنے آقا اور ولی نعمت کو دیکھتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑا اب شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی اور سب کو یقین آگیا کہ یہ مجبور بلا قسمت کا مارا رومانوس ہے صاحب اخبار الدولۃ السلجوقیہ لکھتا ہے کہ اس کو گرفتار کرنے کے گوہر آئین کا وہ غلام لایا تھا جس کو اس نے نظام الملک کو ہبہ کر دیا تھا لیکن نظام الملک نے یہ ہدیہ واپس کر دیا گوہر آئین نے اس کے ساتھ برابر کا برتاؤ شروع کر دیا اس وقت نظام الملک نے کہا تھا کہ اس کو بنظر حقارت نہ دیکھنا چاہیے ممکن ہے کہ وہ کسی وقت بادشاہ روم کو گرفتار کر کے لے آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا ص ۴۶

وہی پر عظمت و شوکت بادشاہ جو کل تک جواہرات سے مزین تھا اور شاہی لباس زیب تن کیے ہوئے ہتھیار لگائے فوج کی کمان کر رہا تھا آج نہ اُس کے پاس وہ جواہرات ہیں نہ اُس کے جسم پر شاہی قبا اور نہ کسی قسم کا ہتھیار ایک غیر منظم اور غیر تعلیم یافتہ قوم کی پاسبانی اور حراست کے ساتھ ایک وحشت ناک میدان میں کالی اور ڈراؤنی رات گذار رہا تھا۔ صبح ہوئی تو الپ ارسلان کی حضور میں اسی ہیئت اور شکل کے ساتھ پیش ہونے کے لیے لایا گیا۔ وہ رومانوس جو کل تک ایک وسیع مملکت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور جس کے قبضہ اقتدار میں لاکھوں انسانوں کی جانیں تھیں آج ایک معمولی حیثیت کے آدمی کی طرح ترکی سلطان کے دربار میں پیش ہوتا ہے اور کل تک جس کے شرائط صلح کو تحقیراً ٹھکرا دیا تھا آج اُسی کے قدموں کی خاک پر جبیں سائی کے لیے مجبور کیا جاتا ہے[1]۔ کہتے ہیں کہ اپنے بدنصیب حریف کو دیکھتے ہی الپ ارسلان نے تخت شاہی سے اُتر کر شاہی قیدی کے سر کو زمین سے اُٹھا لیا مکرر سہ کرر جاں بخشی کا وعدہ کیا اور اُسے یقین دلایا کہ اس کا شاہی اقتدار ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ مستبعد ہے کہ اس کے اصلی وقار اور عظمت کو موجودہ زبوں حالی کے سبب صدمہ پہونچایا جائے چنانچہ رومانوس خیمہ شاہی کے قریب ایک آرام گاہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں الپ ارسلان کے امرا اور درباری اس کے شایان شان عزت و احترام سے پیش آتے رہے اور بادشاہ کا خود یہ معمول رہا کہ اپنے دسترخوان پر دو بار اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتا تھا۔

رومانوس نے آٹھ شبانہ روز اس طرح گذارے کہ ہر طرح کی آزادی اسے حاصل رہی لیکن قربان جائیے اس شریفانہ برتاؤ کے کہ کبھی بھولے سے بھی کوئی تحقیر کا جملہ الپ ارسلان کے منھ سے نہ نکلا بلکہ بادشاہ نے اُن لوگوں کو جنھوں نے نازک وقت میں اس کی امداد سے پہلو تہی کی تھی سخت مذمت کی اس کے علاوہ رومانوس سے مناسب الفاظ میں اُن غلطیوں کو بھی جتلا دیا کہ جن کا ارتکاب نقشہ جنگ کی تیاری میں اُس کی طرف سے ہوا تھا۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں الپ ارسلان نے دریافت کیا کہ کیوں رومانوس! آپ کو مجھ سے کس طرز عمل کی توقع ہے۔ رومانوس نے جواب میں کہا کہ اگر تم ظالم و جابر ہو تو مجھے اپنی زندگی کی خیر معلوم نہیں ہوتی اگر تکبر اور گھمنڈ نے تمھیں سرشار کر دیا ہے تو میرے لیے شاہی سواری کے پہیوں کے ساتھ

---

[1] مورخین لکھتے ہیں کہ جب ارمانوس جبیں بوس تھا تو الپ ارسلان تخت شاہی سے اُتر کر نیچے آیا اور ترکمانی رسم کے مطابق اپنے پاؤں رومانوس کی گردن پر رکھ دیے لیکن یہ بات حقیقت سے ذرا بعید معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ الپ ارسلان کا شریفانہ طرز عمل جیساکہ آئندہ چل کر واضح ہوگا اس کی نفی کرتا ہے چنانچہ عیسائی مورخین کو بھی یہ امر تیقن نہیں ہے اسلامی مورخین میں صاحب اخبار الدولۃ السلجوقیہ لکھتا ہے کہ دربان اسے سربسجود ہونے کے لیے مجبور کر رہے تھے لیکن بادشاہ مانع آیا کہ یہ منظر اس کے لیے کافی دافی ہے ص ۵۱

گمسٹنا ناگزیر ہے لیکن اگر تمہیں اپنے مفاد کا خیال ہے تو تم مجھے آزاد کر کے فدیہ قبول کرو گے۔ اس پر الب ارسلان نے رومانوس سے کہا کہ اگر میں اسی حال میں ہوتا جس میں تم گرفتار ہو تو تم میرے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرتے۔ رومانوس نے رعونت سے جواب دیا کہ اگر میں اس جنگ میں فتحیاب ہوتا اور تم گرفتار ہو کر میرے سامنے لائے جاتے تو میں کوڑوں اور چابکوں سے تمہارے جسم کو لہولہان کر دیتا اگرچہ الب ارسلان نے رومانوس کے اس گستاخانہ جواب کو ہنسی اور مسکراہٹ سے ٹال دیا تاہم دبی زبان سے کہا کہ حضرت مسیح کی تعلیمات میں زخمیوں کی دلداری اور دشمنوں سے تلطف و مدارا کا حکم ہے آپ کیسے مسیحی ہیں کہ اپنے مقتدا کے احکام سے سرتابی کی نیت رکھتے ہیں میں عیسائی نہیں ہوں لیکن آپ کے ساتھ ایسے ذلیل و مکروہ برتاؤ کا ہرگز روادار نہیں ہو سکتا۔ القصہ نہایت ہی غور و تدبر کے بعد اس نے یہ شرط آزادی رومانوس کے سامنے پیش کی کہ وہ ایک معینہ کثیر مقدار سونے کی بطور فدیہ ادا کرے اور ۳۶۰۰۰۰ زر سرخ سالانہ بطور خراج دیتا رہے علاوہ ازیں اپنے شاہی خاندان کی لڑکیاں الب ارسلان کے لڑکوں کے ساتھ بیاہ دے اور جتنے مسلمان قیدی اب تک گرفتار کیے گئے ہوں سب کو غیر مشروط رہائی دے۔ رومانوس نے ایک آہ سرد کھینچی اور تمام شرائط کو بے کم و کاست منظور کر کے رہائی کا پروانہ حاصل کیا۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد رومانوس کو خلعت گراں بہا دیا گیا اور وہ اپنے رفقا کے ساتھ مع تحائف ترکی باڈی گارڈ کی حفاظت میں اسلامی سرحد سے باہر کر دیا گیا ابن خلدون کا بیان ہے کہ الب ارسلان نے تقریباً ایک میل تک مشایعت بھی کی۔

رومانوس کی شومی قسمت کہ جوں ہی اس نے اپنی سرزمین پہ قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ رومیوں نے طے کیا ہے کہ صوبجات اور محلات شاہی کے لیے ایسا شخص باعث صد رسوائی ہے اور رومانوس کو روم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ جس طرح ہو سکا دو لاکھ اشرفیاں جمع کر کے مع ایک سونے کے طباق کے جو جواہرات سے پُر تھا معزول قیصر نے الب ارسلان کے پاس بھجوا دیں اور آئندہ کے لیے اپنی بے دست و پائی اور معزولی کا عذر کر دیا۔

جو شرائط الب ارسلان نے رومانوس کے سامنے پیش کی تھیں اُن میں بظاہر کوئی دفعہ ایسی نہ تھی جس سے یہ بات مترشح ہوتی کہ رومی بادشاہ کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر الب ارسلان کسی رومی شہر یا صوبہ پر قابض ہونا چاہتا ہے یہ غیر متوقع فتح ہی اس کی کامیابیوں کا کافی ثبوت تھی جو دلوں سے محو نہیں ہو سکتی تھی جو مال و متاع بطور غنیمت انطاکیہ سے لے کر بحر اسود تک ہاتھ لگا اس کا کچھ حساب نہیں اسی لیے کوچک کا بہترین حصہ خود بخود ترکی سلطان کے اقتدار میں آ گیا اور بارہ ہزار خود مختار رئیس اُس کے باجگذار ہو گئے۔

اصغر اور آزاد

(جناب منشی سراج احمد علوی صاحب ثنائی بی۔ اے)

(بسلسلہ گذشتہ)

شعر۔ میرے ساقی نے عنایت کی مے بے درد و صاف   رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے

مطلب تو آپ اس شعر کا ایک حد تک صحیح سمجھے ہیں لیکن آپ نے یہ حکم کیسے لگایا کہ مرغوب اور دل پسند شعر نہیں ہے۔ حالانکہ شاعر نے اپنے مخصوص انداز بیان سے ایک فرسودہ خیال میں جان پیدا کر دی ہے اور بیان میں کتنی سلاست پیدا ہو گئی ہے۔ جب آپ نے شعر سمجھ لیا تھا تو پھر اصلاح کی ناحق تکلیف اٹھائی آپ کا شعر تو شعر زیر بحث کے معنی سے ذرا بھی لگاؤ نہیں رکھتا۔

آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مے گلرنگ جو آپ کو عطا ہوئی اُس نے آپ کے پیمانے میں پہونچ کر شورش پیدا کر دیں یعنے آپ بحر محبت میں غوطے لگانے لگے، آپ کے شعر سے یہ بات کس طرح واضح ہوتی ہے؟ پیمانے میں موجوں کا طوفان نہاں تھا جو مے گلرنگ کے پہونچتے ہی اس میں موجیں مارنے لگا۔ پھر یہ کہ دونوں کا خیال بجا ہے۔ شاعر کچھ کہہ رہا ہے اور آپ اپنے ذہن میں کچھ سمجھے ہیں اور کچھ کا کچھ سمجھ کر ایک دوسرا شعر پیش کر رہے ہیں۔

شعر:۔ دیکھنے والے فروغ رخ زیبا دیکھیں   پردۂ حسن پہ خود حسن کا پردہ دیکھیں

اعتراض:۔ حسن پہ حسن کا پردہ فقیر کی فہم ناقص میں المعنی فی بطن الشاعر ہے۔ جب حسن خود پردہ بنایا جا چکا تو پھر "حسن کا پردہ" چہ معنی دارد، اور فروغ رُخ زیبا کیونکر دیکھیں۔ القصہ شعر پہیلی یا چیستان بن کر رہ گیا۔ عقل پر عقل کا پردہ ..... کیا معنے پیدا کر سکتا ہے۔

جواب:۔ اگر جناب نے لفظ "فروغ" پر غور کیا ہوتا تو یہ چیستان آپ کی سمجھ میں فوراً آجاتا۔ شعر بہت صاف ہے۔ شاعر صرف محبوب کے رخ روشن کے فروغ اور اس کی تابش کے وفور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ رخ زیبا پر نقاب پڑی ہوئی ہے۔ لیکن نقاب حسن رُخ یار کو چھپا نہیں سکتا اور حسن یار نقاب سے اس طرح سے پھوٹ رہا ہے کہ نقاب اس حسن میں نہاں ہو گیا ہے۔ اب پردۂ حسن پر حسن کا پردہ غالباً جناب کو نظر آگیا ہوگا۔

شعر۔ حسن ساقی کا تو مستوں کو ذرا ہوش نہیں   کچھ جھلک اس کی سر پردۂ مینا دیکھیں

اعتراض:۔ مصرعہ اولی میں "ذرا ہوش نہیں" مستوں کی بے ہوشی پر مہر صداقت ثبت کر رہی ہے

پھر مصرعہ ثانی میں جھلک کون دیکھ رہا ہے اور کیونکر۔ بیہوش کے لیے حسن دیکھنا اور حسن کی جھلک دیکھ لینا دونوں باتیں قطعی ناممکن ہیں۔ وہ کوئی چیز دیکھ ہی کب سکتا ہے۔

جواب :۔ اگر دیکھیں کے معنے "دیکھ رہے ہیں" کسی لغت میں دستیاب ہو جائیں تو اعتراض صحیح ہو سکتا ہے ورنہ شعر اپنی جگہ پر بہت بلیغ ہے۔ شاعر تو خود کہہ رہا ہے کہ مستوں کے لیے سر پردۂ مینا حسن ساقی دیکھنا ناممکن ہے کیونکہ وہ مدہوش ہیں ذرا دیکھیے تو کس لطیف پیرائے میں اس مضمون فرسودہ کو ادا کیا ہے کہ ہم شرابِ حقیقی سے ایسے سرشار ہیں کہ ہمیں کوئی شے نظر نہیں آتی حتے کہ محبوب خود بھی نظر نہیں آتا۔ شاعر کے انداز بیان کی داد دیجئے۔

آپ نے جو اصلاح فرمائی ہے وہ سوال از آسماں و جواب از ریسماں کے مصداق ہے۔ آپ کا شعر تو صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ وا دا دسلے ساقی (واللہ اعلم کون سی ادا) مست تو دیکھ نہیں سکتے جام و مے و مینا اس کا عکس دیکھیں (غالباً انگڑائی ہوگی)؟

شعر :۔ مرے نغموں سے صہبائے کہن بھی ہو گئی پانی تعجب کر رہے ہیں رنگ محفل دیکھنے والے

اعتراض :۔ کلام صوفیانہ رنگ اختیار کر چکا ہے اسی معیار سے ملاحظہ ہو :۔ صہبائے کہن کے معنے اسلام ہیں۔ وہ نغمے جو مئے اسلام کو پانی بنا دیں ایسے نغموں کی داد دینا ناممکن ہے۔

جواب :۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ عام اصطلاحات صوفیہ کے ماتحت یہ کیا ضرور ہے کہ اصغر نے صہبائے کہن سے اسلام ہی مراد لیا ہو میری نظر سے تو آج تک اصطلاحات میں بادۂ کہن اسلام کے معنے میں نہیں گذرا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اہل محفل جو اپنے خیال میں صہبائے کہن سے مست تھے یہ سمجھتے تھے کہ جو نشہ انھیں ان کی مے کہن سے حاصل ہو رہا تھا وہی نشہ کے مترادف تھا اور وہ اس پر اکتفا کیے ہوئے تھے۔ لیکن میرے نغموں کو جو تاثرات سے زیادہ پر تھے اور جن میں حقیقی درد اور کیف بھرا ہوا تھا سن کر اُن کے نشے ہرن ہو گئے اور اب جو اثر ہوا وہ میرے نغموں سے ہوا۔ یہ تصویر ہے حقیقت میں محبت کے جھوٹے دعویداروں کی اور حقیقی درد محبت رکھنے والوں کی محبت کا اثر دعویداروں کے بھرم کھول دیتا ہے اور وہ صحیح راہ نما کے آگے سپر ڈال کر اس کی راہ نمائی میں محبت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ آپ کی اصلاح اصلاحات ماسبق کی طرح بیکار محض ہے۔

شعر :۔ حشر سے زائد یہاں ہر چیز کا ہے فیصلہ لا کوئی حسن عمل۔ میری خطا کے سامنے

اعتراض یہ ہے کہ حشر کے دن جبکہ نفسی نفسی کا عالم ہے زاہد سے مکالمے کا کونسا موقع پیش آ سکتا ہے، اور زاہد سے اور اصغر سے کب کی ملی بھگت ہے کہ آپ کی خطائیں مسترد کرانے کے لیے کوئی

حسن عمل کہیں سے تلاش کر کے لائے فقیر کے نزدیک یہ شعر دیوان سے خارج کر دینے کے قابل ہے۔

جواب:۔ آخر آپ نے شعر کا مطلب نہ سمجھنے کی قسم کیوں کھائی ہے، شاعر تو طنزاً کہہ رہا ہے کہ زاہد کو جس اعمال حسنہ پر ناز ہے اور جنھیں وہ اعمال صالحہ سمجھتا ہے ان کو میرے گناہوں کے مقابلے میں پیش کرے تو اُس کو معلوم ہو کہ بوجہ میرے بے ریا ہونے کے میرے گناہوں کی زیادہ قدر ہے یا اس کے زہد ریا سے بھرے اعمال صالحہ زیادہ مقبول ہیں۔ اور اس طرح وہ عمل ریائی سے باز رہنے کا سبق دیتا ہے۔

شعر:۔ نمود جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

اعتراض:۔ بے رنگ کے معنے بے رونق ہیں جو ذات الٰہی کی شان مبارک میں کوئی استعمال نہیں کرتا۔ اگر جلوہ صد رنگ کہا جائے تو تجلیات اسماے صفات کے معنے پیدا ہو سکتے ہیں۔

جواب:۔ بے رنگ کے معنے تو میں پہلے گوش گذار کر چکا ہوں اعادہ غیر ضروری ہے۔ یہ اصغر کی اپنی اصطلاح تصوف ہے، اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اب معنی پر غور کیجئے تو شاید آپ کو اصلاح کی خامی نظر آجائے، شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے ذریعہ تو ذات باری تعالیٰ سے نظریں خوگر ہو گئیں اور اسے اس کے صفات کے ذریعہ پہچان لیا گیا۔ لیکن جب مشاہدہ صفات سے گذر کر مشاہدۂ ذات حاصل ہوتا ہے تو صفات کے ذریعہ اخذ کردہ تصویر سے بالکل جدا اور ایک نئی تصویر نظر آتی ہے جس کو صفات کی رنگینیوں والی تصویر سے کوئی نسبت نہیں اور یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ یہ تو کوئی نئی صورت ہے۔

شعر:۔ جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

اعتراض:۔ پہلا مصرعہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ تیرا جلوہ چشم بشر سے نہاں ہے اور دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی تکذیب کر رہا اور کہہ رہا ہے کہ نہیں ہر ایک بشر نے تجھے اپنی نظر سے دیکھا ہے۔

جواب:۔ سبحان اللہ کیا معنے آپ نے شعر کو پہنائے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کے دعوے کی تکذیب کر رہا ہے، میں کہتا ہوں کہ وہ تائید کر رہا ہے۔ شاعر صرف اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ حقیقت باری تعالیٰ تک کسی کی اب تک رسائی نہیں ہوئی اور ہنوز مستور ہے جو لوگ اس بات کا دعوے کرتے ہیں کہ وہ کنہ حقیقت تک پہونچ گئے وہ درحقیقت اصل تک نہیں پہونچے بلکہ وہ حد اُن کے ذہن اور عقل کی رسائی کی آخری حد تھی۔ جو جہاں تک بھی عقل پر پہونچ کر انھوں نے دیکھا اور جہاں تک ان کی پرواز فکر نے ساتھ دیا اسی کو وہ آخری منزل سمجھنے لگے "ہر ایک نے اپنی نظر سے دیکھا" کے یہی معنے ہیں۔ اصل حقیقت مستور ہے اور مستور رہے گی۔ اس لیے کہ لا انتہا کو گھیر لینا ناممکن ہے۔

اکبر:- جو ذہن میں گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا جو سمجھ میں آگیا وہ پھر خدا کیونکر ہوا

شعر:- مے دافع آلام ہے۔ تریاق ہے لیکن کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

آپ نے جو اعتراض کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کو طرز ادا نہیں پسند ہے۔ لیکن وجہ نہیں بتائی البتہ اصلاح دے دی ہے حالانکہ اصلاح کی ضرورت بتانا ضروری ہے۔ خیر آپ نے شراب کے جو اوصاف بتائے ہیں وہ صرف شراب مجازی کے اوصاف بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں یعنے اسے آتش او رفتنہ خوابیدہ سے تعبیر کرنا۔ بخلاف اس کے شاعر نے شراب سے مراد شراب محبت لی جو طبیب جملہ علتہا ہے اور تریاق ہے اس لیے کہ اسے اثر کرنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ لیکن یہ تو اس کے معمولی خواص ہیں جس وقت نگاہ ساقی اس پر پڑجاتی ہے اس کی ماہیت کچھ اور ہی ہو جاتی اور جو کیف سرور وہ بخشتی ہے اس کا اظہار "کچھ اور ہی ہو جاتا ہے" سے زیادہ صاف الفاظ میں محال ہے۔

شعر:- یہ سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

اعتراض:- صیاد قفس میں بند کر رکھتا ہے: قفس ایسا مضبوط ہوتا ہے کہ اسیر توڑ کر اڑ نہیں سکتے اسیران قفس کے پر پرواز کو بند قفس بیکار رکھتے ہیں۔ نا آشنائے پرواز ہوتے تو صیاد کے دام میں کیونکر پھنستے۔ آخر اڑ کر آئے کچھ ہوائی جہاز کے: زمین سے لاکر دام صیاد میں پھنسا دیے گئے تھے، فقیر کی ترمیم صرف ایک لفظ ہے یعنے 'بیداد' بجائے پرواز۔

جواب:- پرواز کو بدل دینے سے شعر ہوائی جہاز کی بلندیوں سے زمین کی گہرائیوں میں گر پڑتا ہے۔ مطلبِ شعر سنیے:- جب بقول آپ کے طیور اڑے نہیں تو گرفتار کیسے ہوئے طیور کا اڑنا ثابت ہو گیا تو ان کا لذت پرواز سے واقف ہونا ضروری ہے۔ لیکن شاعر انھیں لذت پرواز سے نا آشنا قرار دیتا ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ وہ صیاد کے ستموں کا شکوہ کرتے ہیں۔ اگر انھیں لذت پرواز کا اندازہ ہوتا تو اس لذت کی یاد اس قدر محو کن ثابت ہوتی کہ شکوۂ صیاد کا موقع ہی نہ ملتا۔

شعر:- ہوا کو موج شراب کردے فضا کو مست و خراب کردے یہ زندگی کو شباب کردے نظر تمہاری نظر نہیں ہے

اعتراض:- مست و خراب کے ایک ہی معنے ہیں " فضا کو رند خراب کردے" اصلاح ہے۔

جواب:- اس اعتراض کے جواب میں صرف ایک شعر اور ایک رباعی پیش کرنا چاہتا ہوں اور بس

حسرت موہانی:- رات پیر مغاں کی محفل سے جو اٹھا مست اٹھا خراب اٹھا

خیام:- چندان بخورم شراب کیں بوے شراب آید ز تراب، چوں شوم زیر تراب
تا بر سر خاک من رسد مخمورے از بوے شراب من شود مست و خراب

شعر:- نجد کی سمت سے یہ شور انا لیلےٰ کیوں شوخیٔ حسن اگر پردۂ وحشت میں نہیں

ذرا اعتراض ملاحظہ ہو:- لیلےٰ نجد کی رہنے والی تھی۔ نجد سے شور انا لیلےٰ اٹھنا ممکن ہے، (سبحان اللہ کیا شعر فہمی ہے) اگرچہ "یہ" اور "کیوں" طرزِ ادا کی غرابت کے شاہد ہیں۔ لیکن نہ حسن کا پردہ وحشت سمجھ میں آنے والی بات ہے اور نہ پورے مصرعہ ثانی کا مطلب (سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی جائے تو اس کا علاج؟) ..... اس شعر کی مہملیت تسلیم کرلی جائے تو بہتر ہے۔ یا پھر مصنف شعر کا مطلب ارشاد فرمائیں۔

جواب:- مضمون شعر تو بنا نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر ایک طرف طرزِ ادا نے اس میں جان ڈال دی ہے تو دوسری طرف آپ کی فہم میں نہ آنے کا سامان پیدا کر دیا۔ مضمون صرف یہ ہے کہ قیس یا مجنون لیلےٰ کے عشق میں اس مرتبہ پر پہونچ گیا تھا کہ اسے لیلےٰ اور اپنی ہستی میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور وہ "انا لیلےٰ" کے نعرے بلند کیا کرتا تھا۔ شاعر نے اسی مضمون کو باندھا ہے۔ چونکہ "انا لیلےٰ" کہلانے کا باعث "حسن" تھا اس لیے محبت کی اس منزل پر پہونچنے کے سبب کو اس نے "شوخیٔ حسن" سے تعبیر کیا ہے اور پردہ وحشت سے مراد مجنوں ہے جو سراپا وحشت ہے، مجنوں کی وحشت کا ثبوت جو "انا لیلےٰ" کی صداؤں سے پیدا ہوتا ہے اس کا سبب "یہ کیوں" کے استفہام اقراری کے ذریعہ پوچھتا ہے اور دوسرے مصرعہ کے ذریعہ اس استفہام اقراری کی مزید تقویت کرتا ہے، اور یوں کہتا ہے کہ اگر شوخیٔ حسن پردۂ وحشت میں کارفرما نہیں ہے تو پھر سوئے نجد سے "انا لیلےٰ" کے شور کے کیا معنے ضرور بالضرور یہ "حسن کی شوخی" کا کام ہے۔ دراصل حسن یا بالفاظ دیگر محبت کے اس درجہ کی تصویر پیش کی ہے جہاں من و تو کا امتیاز غائب ہو جاتا ہے۔

شعر:- کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

اعتراض:- مصرعہ ثانی رواں ہے، مصرعہ اول نثر ہے۔ نظم کی رعنائی شگفتگی اور دلکشی سے بالکل خالی ہے۔ کہ جو اس درد کو سمجھے۔ بالخصوص سمع خراش ہے۔

جواب:- جہاں ضرورت نہ تھی وہاں تو جناب نے اصلاح کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور جہاں واقعی آپ ضرورت سمجھتے ہیں وہاں کرم فرمائی سے کیوں دریغ کیا۔ ؟

شعر:- اٹھ رہی ہے مٹ رہی ہے موج دریائے وجود اور کچھ ذوق طلب میں ہے نہ کچھ منزل میں ہے

بجائے اعتراض کی پوری نقل کرنے کے شعر کا مطلب برا بھلا عرض کرتا ہوں ممکن ہے کہ ازالہ شبہات ہو جائے۔

موج دریائے وجود کے اُٹھنے اور مٹنے میں ذوق طلب اور منزل دونوں کا نقشہ موجود ہے موج کا

اُٹھنا اور پیچ و تاب کھانا ذوق طلب کا ثبوت ہے اور طلب ہے کس چیز کی ساحل یا منزل کی۔ موج کا ٹوٹ کر مٹ جانا اور اس کا متوجہ نہ ہونا منزل یا ساحل کے حاصل ہونے کا مترادف ہے کیونکہ ساحل اور منزل میں قرار لازمی ہے جو موج کے ختم ہو جانے میں موجود ہے۔ اس لیے منزل اور ذوق طلب کو اس کے ماورا سمجھنا عبث ہے انسان کے ارتقائے روحانی کی کتنی سچی تصویر ہے۔

شعر:۔ لباس زہد ہو پھر کاش نذر آتش صہبا کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأت رندانہ برسوں سے

مطلب ملاحظہ ہو:۔ لباس زہد سے مراد لباس زہد ریائی ہے جس کے پردے میں زاہد محبت حقیقی رکھنے کا دعوے کرتا ہے۔ شاعر اس قسم کے زاہدان پرفن کی سیہ کاریوں اور سالوس پرستی سے عاجز آکر یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش محبت حقیقی کی شراب ان کے اندر پیدا ہو جائے اور یہ لباس زرق ختم ہو جائے لیکن اس تبدیلی کو کیرکیٹر کی بہت بڑی علویت سمجھتا ہے اس لیے جرأت رندانہ سے تعبیر کرتا ہے کہ یہ آسان کام نہیں کہ لباس زہد ریائی کو اُتار پھینکا جائے۔

شعر:۔ یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے با خبر ہونا

جواب:۔ خواہ آپ اسے ایشیائی شاعری سمجھیں خواہ اپنی مفروضہ صوفیانہ شاعری سمجھیں مطلب شعر ہر حالت میں واضح ہے۔ اگر آپ نے غور کیا ہوتا تو مطلب صاف نظر آتا۔ جب شاعر یا قائل خود بدمست ہے یا بے خود ہے تو اُسے کیا خبر کہ ساقی و شاعر و صہبا موجود ہیں یا نہیں۔ اور اس صورت میں اگر اپنی بے خودی اور گم شدگی کے ساتھ ساقی ہے اور مینا کو بھی گم سمجھتا ہے تو کیا قباحت لازم آئی ہے، یہ تو اُس کے عین بے خودی اور فنائیت کی دلیل ہے اس سے ساقی اور مینا اور شراب کی تنقیص تو کہیں سے بھی لازم نہیں آتی۔

شعر:۔ وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

اعتراض:۔ عشق میں دم نہیں چھوڑ گیا، عاشق صادق کا عشق لافانی شے ہے اس کا کالبد خاکی بیشک فانی ہے۔ اسی طرح عاشق کی آرزو بھی زوال پذیر شے نہیں ہے جو اشعار ایسے خلاف فطرت اور دور از کار جذبات ظاہر کریں ان پر شعر کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔

جواب:۔ مشکل تو یہ ہے کہ "سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جا ست" آپ شعر سمجھنے کی کوشش تو فرماتے نہیں اور شعر کو لغو قرار دیتے ہیں۔ شاعر نہ تو آرزو کو فانی قرار دیتا ہے اور نہ عاشق صادق کے عشق کو باطل کرتا ہے۔ وہ تو صرف رعب حسن کے آگے حواس یا بالفاظ دگر آرزو اور عشق کے تعطل کی تصویر کھینچتا ہے:۔ غالب کہتا ہے:۔

کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

شعر:- بس اک سکوت سے طاری حرم نشینوں پر — صنم کدے میں تجلی ہے اور ہیم ہے

اس شعر میں حرم نشین اور صنم کدہ دونوں تعریضاً آئے ہیں۔ حرم نشینوں سے وہ زہاد و عباد مراد ہیں جو محبت ذات باری کے دعویدار تو ہیں لیکن حقیقت سے کوسوں دور ہیں اور ان کو محبت کی ہوا ہی نہیں لگی ہے۔ اور یہی وجہ ان کے سکوت کی ہے۔ یعنے محبت کے ہنگاموں سے ان کے قلوب عاری ہیں اور یہ افسوسناک امر ہے۔

صنم کدے سے مراد وہ ذاتیں ہیں جن پر اہل حرم بوجہ ان کی ظاہری وضع و قطع رندانہ ہونے کے تمسخر کرتے ہیں اور انھیں محبت الٰہی سے بے بہرہ سمجھتے ہیں دراں حالیکہ ان کے قلوب روحانیت سے مالا مال ہیں اور ان کے کیف میں روز افزوں ترقی ہے۔ شعر میں تقابل کے ذریعہ عبرت کا درس دیا گیا ہے۔ اور کیا چاہیے۔

شعر:- شکایت صدا یاں ہے اصغر میرا طرز کافری — میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اعتراض:- "میرا طرز کافری" اگر پسند آئے تو "رسم کافری" سے بدل دیجئے

جواب:- اگر آپ نے رسم بمعنے آئین و طریقہ استعمال کیا ہے تو "طرز" "رسم" سے زیادہ بہتر ہے اور اگر آپ نے رسم بمعنے عادت استعمال فرمایا ہے تو قطعاً غلط ہے اس لیے کہ "رسم" سے صرف نفس کافری مراد ہو سکتی ہے اور (طرز) تنوع "کافری" کو ظاہر کرتا ہے۔

شعر:- جمال یار کی صورت بڑھا دی رنگ و صورت نے — قیامت ہے قیامت میرا پابند نظر ہونا

شعر کا مطلب عرض کرتا ہوں اس کی روشنی میں اعتراضات پر غور فرمائیں۔ انسان کی نظر یا تعبیر محدود ہے اور انسان کی فطرت نظر وسیع اور بصیرت لامحدود کی تمنا رکھتی ہے اور انسان میں بصیرت بھی بتدریج پیدا ہوتی ہے پس جب انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے تو اس کو کائنات عالم میں جمال یار کی رنگینیاں نظر آنے لگتی ہیں اور جمال یار کی رنگینیاں اس قدر دلفریب ہوتی ہیں کہ آرزو یہ پیدا ہوتی ہے کہ نظر اتنی لامحدود ہو جائے کہ جمال یار کی لامحدود رنگینیاں اس میں سما سکیں، آرزو تنگی نظر سے مجبور ہو جاتی ہے اور مجبوری تاسف پیدا کر دیتی ہے۔

شعر:- خرمن بلبل تو پھونکا عشق آتش رنگ نے — رنگ کو شعلہ بنا کر کون یہ ڈھلنے میں ہے

مطلب شعر ملاحظہ ہو:- یہ شعر تو بہت صاف ہے، شاعر کے صرف طرز ادا نے آپ کو مشکلات میں ڈال دیا۔ شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ عشق کی کارفرمائی ہر طرف ہے ایک طرف اگر وہ بلبل کے

خرمن کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے تو دوسری طرف شعلہ میں سوز کا باعث بھی وہی ہے اور پروانہ میں شعلہ کے لیے جان نذر کرنے کا جذبہ بھی اس کا ایک کرشمہ ہے۔

شعر:- ترے قربان ساقی اب وہ موج زندگی کیسی   نہیں دیکھی ادائے لغزش مستانہ برسوں سے

آپ کو "موج زندگی کیسی" عجیب و غریب کیوں نظر نہ آتی۔ اصغر کی طرز ادا میں تو آپ کو ہر جگہ غرابت نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ ابھی تک پرانے سانچوں میں شعر ڈھلتے آئے ہیں لہٰذا جب نئے نئے نمونے اور سانچے نظر آئیں گے تو نگاہوں کا کھٹکنا لازمی ہے۔ نگاہیں کسی نئی چیز سے آہستہ آہستہ مانوس ہوا کرتی ہیں، اس قسم کے چند اشعار اور ہیں جنھیں آپ نے بوجہ غرابت طرز ادا مہمل قرار دیا ہے حالانکہ اگر نظر تعمق سے کام لیا جائے تو اشعار میں مہملیت کا شائبہ بھی نظر نہ آئے گا۔ صحبت طویل ہو گئی لہٰذا اسے ختم کرنا چاہیے۔

ہاں اتنا اور عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ آخر میں جناب نے اصغر مرحوم کو جن شعراء وقت سے صلاح و مشورہ لینے کے لیے مشورہ دیا ہے اگر آنجناب نے خود انھیں حضرات سے رجوع فرمایا ہوتا تو الناظر کے اتنے صفحات رنگین کرنے سے نیز بیکار زحمت سے آپ بچ جاتے۔ اور مجھے بھی یہ چند سطور ملاحظہ کے لیے پیش کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

نوائے اسیر

(جناب مولوی مصلح الدین احمد صاحب اسیر کاکوروی)

اُن کی نگاہ ناز کے قابل نہیں رہا   جس دل پہ مجھ کو ناز تھا وہ دل نہیں رہا

کیونکر اُڑاؤں جیب و گریباں کی دھجیاں   حسنِ جنوں نواز مقابل نہیں رہا

آمادۂ سکوں ہوئی دنیائے رستخیز   ہستی کو جس پہ ناز تھا وہ دل نہیں رہا

تیر نگاہ یار کا احسان ہے مگر   پہلو میں لوٹتا ہوا وہ دل نہیں رہا

بیگانہ دنیا ہوا ہر جاں فرو ز   دل جلوہ گاہِ حسن کے قابل نہیں رہا

صد شکر اہلِ عشق کی اللہ ری گرمیاں   مدت سے فرق قاتل و بسمل نہیں رہا

دل نے بھی اختیار کی ہستی سے روکشی   راز و نیاز حسن کے قابل نہیں رہا

کچھ ان دنوں عجب ہوئی بیگانگی اُسے   اب تک مری طرف سے وہ غافل نہیں رہا

تاثیر حسن سے ہوا ایسا اثر پذیر   دل ہی بدل گیا وہ مرا دل نہیں رہا

آزادیٔ خیال سلاسل بنی اسیر   حاصل کلام یہ کہ وہ حاصل نہیں رہا

توقیع

(مرحوم جناب منشی عبدالرفیع صاحب اثر کاکوری)

یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ اس لفظ کے استعمال کا موقع اور محل موجودہ صدی میں نوادرات سے ہے بلکہ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر سرسری نظر اسے غیر مانوس لفظ کے تحت میں شمار کر سکتی ہے صحیح زمانہ اس کے صرف کا وہ تھا جبکہ اسلامی حکومت کا دور دورہ تھا اور اُس کا شہباز اقبال اونچا اور بلند اُڑتا تھا تمام اسلامی فرقوں اور گروہوں میں اخوت اور اتحاد کی آگ مشتعل اور بھڑکی ہوئی تھی اُن کے ہر رگ و پے میں وہ خون جوش زن تھا جس میں اتفاق کے سوا کسی دوسری چیز کا پتہ ہی نہ تھا۔ زندہ دل نوجوان اور سرفروشان بازار شجاعت و بہادری درد اور درمان کے لیے اس خلش اور کشمکش میں وقت گذارتے تھے کہ کب ضرورت پڑتی ہے اور کب ہم اپنا خون پسینہ کی جگہ بہا دیتے ہیں۔ ہمت اور جوانمردی کا جوش و خروش ہر وقت قائم رہتا تھا۔ اُن کی خوشی کی کرنیں روشنی کی کرنوں کی طرح مختلف رنگوں سے روشن اور منور رہتی تھیں۔ پھرتی اور چستی دلوں اور جسموں میں برق رو کی طرح دوڑ دھوپ کیا کرتی تھیں۔ عیش و آرام کا خیال خواب میں بھی نہ آتا تھا۔ بہترین پوشاکیں اور ملبوسات زیب جسم ہونے کے بجائے صندوقوں اور الماریوں میں مقفل رہتی تھیں۔ چنانچہ توقیع کے معانی ہیں نشان کردن بادشاہ بر نامہ و منشور و بمعنے دستخط و نشانیِ بادشاہ و فرمان بادشاہ کہ مزین بہ مہر شد۔

دوائر حکومت اسلامیہ میں اور خصوصاً عہد خلفا میں اس سے صرف وہ عبارت مقصود ہوتی تھی جس کو خلفا درخواستوں اور استغاثوں پر اپنے قلم سے لکھا کرتے تھے۔ یہ عبارت بہت مختصر، جامع اور بلیغ ہوتی تھی اور جو صحیح جواب بھی ہوتا تھا اور اس کا اجرا لازم سمجھا جاتا تھا۔ دیوان الانشا ایک بڑا دفتر رہتا تھا جس میں صدہا فصیح اور بلیغ منشی ملازم ہوتے تھے مگر شاہی خطوں اور پروانوں کا لکھنے والا سب سے اعلےٰ اور مقدم سمجھا جاتا تھا اُسے کاتب السر کہتے تھے اور وہی خلیفہ کا دست راست بازو اور اُس کے تمام اہم رازوں کا امانت دار ہوتا تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس منصب کے نازک فرائض کو محفوظ رکھ کر خلفا یہ خدمت کسی غیر کے سپرد نہیں کرتے تھے بلکہ قریب عزیزوں یا مخصوص لوگوں کے سپرد کرتے تھے۔

جس وقت خلافت بنی عباس کے ہاتھ میں پہونچی تو ملک کی شان اور عظمت کا ستارہ چمک اُٹھا مراتب اور مناصب بھی شاندار ہوئے وزیر کا درجہ بھی بڑھا ملکی انتظام کی باگ بھی [illegible] دے دی گئی تمام بندوبست بحیثیت نائب خلیفہ ہونے کے وزرا کے ہاتھ میں انجام پانے لگے۔ اس کا سب سے پہلا

وزیر ابو سلمہ ہوا جو وزیر کے نام سے تاریخ اسلام میں نامزد ہوا تھا اس عہد میں وزارت نے کئی قالب بدلے اور کئی بار بڑے بڑے عظیم الشان انقلاب ہوئے اور اُس کا آخری نتیجہ ہوا کہ کئی صدیاں اسی صورت پہ گذرنے کے بعد حکومت کی قابلیت اُن سے زائل ہوگئی اور وہ حکومت کرنے سے بے انتہا عاجز اور لاچار ہوگئے۔

اسلامی حکومتوں میں وزارت کی دو قسمیں تھیں ایک وزارت تفویض اور دوسری وزارت تنفید۔ وزارتِ تفویض کے یہ معنے تھے کہ خلیفہ جس کو چاہے وزیر مقرر کرے اور تمام کاروبار و نگرانی اُس کی سمجھ پر چھوڑ دے مگر صرف تین باتیں وزیر کے ہاتھ میں نہیں تھیں۔ (۱) ولیعہدی۔ (۲) وزیر نے اگر کسی شخص کو مقرر کیا ہے تو خلیفہ اُسے برخاست کرسکتا تھا۔ لیکن وزیر خلیفہ کے مقرر کردہ کو علیحدہ نہیں کرسکتا تھا۔ (۳) صرف خلیفہ کو یہ حق حاصل تھا کہ قوم سے امامت کی معافی طلب کرے ۔ وزارت تنفید اُسے کہتے تھے کہ وزیر تازہ حالات اور واقعات خلیفہ کے گوش گذار کر کے اُن کے متعلق مناسب احکام حاصل کرتا تھا۔ خلیفہ کے مرتب کردہ قوانین جاری کرتا تھا۔ امیروں کا تقرر۔ فوجوں کی روانگی۔ ملک کی ضروری خبریں جو خلافت میں عرض کے قابل ہوتیں مع ہمایوں تک پہونچاتا اور اس قسم کی اور جو ضروری باتیں وقتاً فوقتاً پیش آجاتیں انجام دیتا تھا۔ وہ خلافت اور رعایا کا درمیانی واسطہ دار ہوتا تھا۔

ابتدائی دور میں یہ قاعدہ تھا کہ کاتب خلیفہ سے اجازت حاصل کر کے بہتر اور عمدہ طرز اور عنوان سے احکام لکھا کرتا تھا۔ مگر اُس کے بعد کاتبوں نے احکام کے لکھنے میں صرف بے اعتدالی ہی نہیں برتنا شروع کی بلکہ ایک مدت تک خیانت بھی برتنے لگے۔ پس خلفائے عباسیہ نے مجبوراً یہ خدمت بھی وزیر ہی کے سپرد کردی تھی۔ مگر وزیر اپنے ہاتھ سے رقعے اور خطوط نہیں لکھتا تھا بلکہ اُن پر صرف دستخط کردیا کرتا تھا۔ جس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ہوئی تو حضرت عثمان بن عفان اُن کے میرمنشی ہوئے عاملوں اور فوج کے سرداروں کو خطوط لکھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت کا جب آغاز ہوا تو سب سے پہلا اُن کے میرمنشی زید بن ثابت رہے۔ وزرائے خاندان عباسیہ میں فرمانوں اور خطوں پر سب سے پہلے جس شخص نے دستخط کیے وہ یحییٰ بن جعفر برمکی تھا۔ خلیفہ رشید نے جس وقت اُسے تمام امور میں سیاہ اور سفید کا مالک بنایا تھا تو تمام احکام یہ اپنے قلم سے لکھتا تھا۔ اس کے وسعت اختیاری کے بابت ایک واقعہ لکھا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کس قدر با اختیار اور خود مختار تھا۔ مگر اس میں یہ خاص بات ضروری تھی کہ وہ خلیفہ کے حضور میں بیٹھ کر تمام درخواستوں پر توقیع لکھتا تھا اور توقیع لکھنے کے بعد فوراً درخواستیں واپس بھی کر دیتا تھا۔ اور باوجود اس قدر عجلت اور جلدی کے اس کی توقیع کی عبارتیں اسالیب بلاغت اور تحقیق فنون کی حیثیت سے بڑے بڑے بلیغ لوگوں کو نیچا دکھلاتی تھیں۔ اور مشہور ہے کہ جعفر کی

توقیع کی ہوئی درخواستیں ایک ایک دینار کو بک جاتی تھیں۔

صدر اسلام میں خلفاء بذات خاص درخواستوں اور استغاثوں پر توقیع کیا کرتے تھے اور ان کی توقیعات میں اکثر کسی آیت۔ حدیث یا کسی مشہور مثل کا اقتباس ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ سعد بن ابی وقاص عراق کے عامل نے حضرت عمر بن الخطابؓ کی خدمت میں اپنی درخواست اس غرض سے بھیجی کہ اُسے ایک مکان بنانے کی اجازت دی جائے۔ حضرت نے یہ جواب لکھ دیا (ابن ما یکنک من الھواجر واذی المطر) ایسا مکان بناؤ جو آندھی اور پانی سے بچا سکے۔ عمرو بن العاص جو حاکم مصر تھے اُنھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خط کے جواب میں لکھا (کن لرعیتک کما تحب ان یکون لک امیرک) اپنی رعیت کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو جیسا کہ اپنے لیے اپنے امیر سے چاہتے ہو۔

کچھ لوگوں نے مروان بن حکم کے کسی حکم کے بابت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے شکایت کی آپ نے اُس پر حکم لکھا (فان عصوک فقل انی بریٔ مما تعملون) کہ اگر تیری بات اب بھی نہ مانیں تو اُن سے کہہ دے کہ تمھارے معاملے سے میں الگ ہوں۔ اور مروان کے پاس بھجوا دینا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے توقیعات بھی بہت مشہور ہیں۔ چنانچہ امام حسنؓ اپنے بیٹے کے خط کے جواب میں لکھا کہ ایک بڈھے کی رائے نوجوان لڑکے کی جوانمردی سے بہتر ہے۔ (رای الشیخ خیر من جلد الغلام)۔

ایک بار سلمان فارسی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا کہ قیامت کے دن لوگوں سے حساب کیونکر لیا جائے گا۔ حضرت نے جواب دیا۔ یحاسبون کما یرزقون۔

عبداللہ بن عامر نے امیر معاویہ سے درخواست کی کہ طائف کی آمدنی سے مدد خرچ کچھ میرا بھی مقرر کر دیں امیر معاویہ نے جواب لکھ دیا (عش رجبا تر عجبا) یعنے رجب تک زندہ رہو تو نتیجہ دیکھ لوگے۔

توقیع کا دستور اور طریقہ اُس وقت صرف خلفاء تک محدود نہ تھا بلکہ امیروں اور بڑے بڑے لوگوں میں بھی تھا۔ مثلاً شہر انبار کے لوگوں نے خلیفہ سفاح عباسی کی خدمت میں یہ شکایت لکھی کہ جس عمارت کی تعمیر کا حکم خلیفہ نے دیا ہے اُس میں ہم لوگوں کے مکانات بھی داخل کر لیے گئے ہیں مگر ابھی تک اُن کی قیمت نہیں دی گئی ہے سفاح نے توقیع لکھی (ھذا بناء اسس علی غیر تقوی) یہ ایسی عمارت ہے جس کی بنیاد پرہیزگاری پر نہیں ہے اور اُنکا باعث کی قیمت دے دی جائے۔

کوفہ کے لوگوں نے ابو جعفر منصور خلیفہ عباسی سے اپنے عامل کے بدل جانے کی شکایت کی۔ منصور نے عرضداشت پر لکھ دیا کما تکونوا یولی علیکم جیسے تم ہوگے ویسی ہی تم پر حکومت ہوگی۔

کسی شخص نے ناداری اور افلاس کی شکایت لکھی ۔ اُس پر لکھا خدا سے رزق مانگ سلِ اللہ من رزقہ۔

کچھ لوگوں نے مہدی سے شکایت کی کہ عامل خراسان کاہل ہے مہدی نے شکایت نامہ پر لکھ دیا کہ انا ساھر وانت نائم میں جاگتا ہوں اور تو سوتا ہے ۔

ہارون رشید نے اپنے عامل خراسان کو لکھا داوجرحک لایتسع اپنے زخم کی دوا کر کہ بڑھنے نہ پائے

جعفر بن یحییٰ برمکی نے ایک قیدی کی درخواست پر لکھا تھا ولکل اجل کتاب ۔

ایک شخص جس کو کئی بار انعام اور عطیات دیے جا چکے تھے اُس نے پھر درخواست کی کہ مجھے اب پھر کچھ دیا جائے تو لکھا دع الضرع یدر لغیرک کما در لک جب تو نے فائدہ اٹھایا ہے دوسروں کو بھی اُٹھانے دے ۔

سلطان محمود ابن سبکتگین نے جس وقت غزنی میں مستقل سلطنت قائم کر لی تو خلیفہ بغداد کو ایک نامہ لکھا اور یہ آرزو کی کہ خلیفہ اُس کے نام کو خطبہ میں داخل کر کے پڑھے اور سکوں پر بھی اُس کا نام مضروب کرائے خلیفہ نے ان امور سے انکار کیا ۔ تو محمود نے طیش اور غصہ میں اُس کے نام ایک خط لکھا جس میں بہت کچھ دھمکیاں تھیں اور آخر میں لکھا تھا کہ ”اگر میں ارادہ کروں تو بغداد کے پتھروں کو ہاتھیوں پر لاد کر غزنی لا سکتا ہوں“ خلیفہ نے اس طول طویل تحریر کے جواب میں جو خط بھیجا تھا وہ محمود کے سامنے کھولا گیا ۔ تو اس بات کو دیکھ کر وہ متحیر اور ششدر رہ گیا کہ خط میں کوئی اور عبارت نہیں لکھی ہے صرف شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے اُس کے بعد ایک الف ممدودہ (آ) اور خط کے بیچ میں لام (ل) اور آخر میں میم (م) تحریر ہے اور اس کے بعد صلوٰۃ و حمد خدا ہے ۔ سلطان اور اُس کے وزرا اور تمام حاضرین بہت حیران ہوئے ۔ اور اس تحریر کا مطلب کسی کے سمجھ میں نہ آ سکا یہاں تک کہ علامہ ابوبکر قہستانی جو اُس زمانہ میں بہت ذی علم اور فقیہ تھا محمود کے دربار میں زینت دربار کی مد میں داخل ہوا تو یہ خط اُسے بھی دکھایا گیا اُس نے دیر تک خط کو غور سے دیکھا اور کہا کہ اس خط کا مطلب میں سمجھ گیا سلطان نے کہا کہ تم صحیح مطلب اگر بیان کر دو تو اس کے صلے میں جو مانگو گے ملے گا ۔ ابوبکر نے کہا کہ آپ نے خلیفہ کو جو تحریر لکھی تھی اُس میں اس بات کی بھی دھمکی دی تھی کہ میں تم پر ہاتھی سے فوج کشی کروں گا اُس کے جواب میں خلیفہ نے یہ خط لکھا ہے اور اس میں الف لام میم تحریر ہے ان مقطعات سے اُس نے خداوند پاک کے ارشاد الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل الآیہ کی جانب اشارہ کیا ہے ۔ سلطان اس بات کو سن کر کانپ گیا اور اپنے بُرے خیال پر نادم ہو گیا اور اس کے بعد سوا حسن سلوک کے کوئی بُرا خیال خلیفہ کے بابتہ دل میں نہ لایا ۔

اسی طرح سدید الملک علی بن مقلد۔ حاکم قلعہ سیرز جو ایک دلیر شجاع۔ جنگجو فطانت میں بہت زیادہ مشہور تھا اور جو پانچویں صدی کے وسط میں گذرا ہے۔ سدید الملک سیرز کا مالک ہونے سے قبل حلب میں بہت زائد آمد و رفت رکھتا تھا۔ اُن دنوں حلب کا والی تاج الملوک۔ محمد بن صالح تھا۔ اتفاقات زمانہ سے سدید الملک اور تاج الملوک سے کسی ایسی بات میں رنجش پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے سدید الملک تاج الملوک سے خائف اور پریشان رہتا تھا۔ سدید الملک کو کسی ضرورت سے طرابلس جانا تھا۔ چنانچہ وہ براہ شام طرابلس پہونچا۔ اُس زمانہ میں طرابلس کا حکمران جلال الملک بن عمار تھا۔ سدید الملک اُس کے یہاں مقیم ہو گیا۔ تاج الملوک کو خبر ملی کہ سدید الملک طرابلس میں مقیم ہے تو اُس نے قصد کیا کہ کسی حیلہ سے اپنے یہاں بلاکر اُس کے ساتھ کوئی زبردست فریب کرے اپنے کاتب ابی النصر محمد بن الحسین کو اشارہ کیا کہ سدید الملک کو ایک نامہ شوقیہ لکھو اور یہ خط اور اس کا مضمون ایسا لطیف اور دلچسپ ہو جو فوراً اُسے میری طرف مائل کر دے اور وہ چلا آوے۔ کاتب ابو النصر تمام حالات سے من و عن واقف تھا وہ اس شوقیہ خط کی تہ تک پہونچ گیا۔ کاتب ابو النصر سدید الملک کا سچا دوست تھا وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہاں ہرگز نہ آئے مگر تاج الملوک کے حکم سے بھی مجبور تھا۔ فوراً تاج الملوک کے حکم کی تعمیل کی اور جس قسم کا مضمون اُس نے بتلایا تھا لکھ کر پیش کر دیا۔ لیکن کاتب لکھتے لکھتے جب مقام انشاء اللہ تعالےٰ تک پہونچا تو اُس نے نون کو تشدید اور فتحہ دے کر اِنَّ بنا دیا اور خط کو بند کر کے روانہ کر دیا۔

سدید الملک کو جس وقت یہ خط پہونچا تو یہ ابن عمارہ حاکم طرابلس کے دربار میں تھا اور اُس وقت دربار لگا ہوا تھا۔ اس نے خط کو پڑھ کر عمار کو دیدیا۔ غرضکہ خود عمار اور اُس کے وزراء نے خط کی عبارت دیکھ کر بہت پسند کی اور تاج الملوک کے اُس ذوق اور شوق کو جو سدید الملک سے ملنے کے بابتہ خط میں ظاہر کیا گیا تھا بڑی عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ مگر سدید الملک نے تمام اہل دربار کی رائیں اور مشورہ سن کر کہا کہ مجھے اس خط میں ایک بہت نازک اور باریک پہلو بھی نظر آتا ہے جسے آپ لوگوں کی نگاہ نے بالکل نہیں دیکھا۔ میں اس کا جواب خود لکھوں گا۔ چنانچہ اُس نے جواب خط لکھ کر جب ختم کیا تو آخر میں (انا الخادم المقر بالانعام لکھ کر (انا کے ہمزہ کو کسرہ اور نون کو فتحہ دے دیا جس کی وجہ سے یہ لفظ اِنَّا ہو گیا۔ اور خط کو روانہ کر دیا۔ جس وقت یہ خط تاج الملوک کو پہونچا اور کاتب ابو نصر کے ہاتھ میں آیا تو اُس کی مسرت کی کوئی حد اور انتہا نہ تھی اور اُس نے اپنے دوستوں اور رفیقوں سے کہا کہ میری تحریر آخرش کارگر ہو گئی اور سدید الملک کی سمجھ میں آ گئی۔ ابو نصر نے اَنَّ کے نون کو مشدد بنا کر اُس سے آیۃ ان الملاء یاتمرون بک لیقتلوک کی جانب اشارہ کیا تھا۔ جس کے جواب

سدیدالملک نے نون (انا کو مشدد کرکے اور ہمزہ کو مکسور کرکے اِنّا لکھ کر اِنّا لن ندخلھا ابدا ما داموا فیھا کی طرف اشارہ کیا تھا۔

عموماً اہل عرب (مسلمانوں) کو مراسلات کے وقت اختصار کرنے کا انتہائی شوق تھا جو بلاغت کے لیے ایک قابل قدر بات تھی۔ اس کی مثال حضرت عمر بن الخطاب رض کی وہ تحریر ہے جو انھوں نے عمرو بن العاص عامل مصر کو اہل مدینہ کے امداد غلہ کے لیے روانہ کی تھی۔ جو قحط سے سخت تنگ تھے۔

امیرالمومنین کی جانب سے عاصی بن عاصی کو بعد سلام واضح ہو کہ مجھے قسم ہے اپنی زندگی کی کہ اے عمرو تو اور تیرے ساتھی تو شکم سیر ہوں اور میرے ساتھی جو تیرے اہل ہیں بھوکے رہیں۔ فریاد۔ فریاد۔ اس کا جواب عمرو بن عاص نے یہ دیا۔ خدا کے بندے عمرو بن عاص کی جانب سے۔ ہم نے تیری فریاد سنی اور تیری طرف ایک قافلہ اونٹوں کا روانہ کیا ہے جس کا ایک سرا تیرے پاس ہے اور دوسرا میرے پاس ہے۔

ہم اوپر مختصراً ذکر کر آئے ہیں کہ عباسی خاندان کے عہد میں تمام جزو کل معاملات میں مختار کل وزرا ہو گئے تھے۔ اور بعض اوقات وہ خاتم خلافت بھی وزیروں کو دیدیا کرتے تھے تاکہ فرمانوں اور تحریروں پر بھی مہر لگانے کے لیے خلفاء کے دست نگر نہ رہیں۔ چنانچہ ایک بار رشید نے جعفر سے خلافت کی انگوٹھی لے کر فضل کے سپرد کر دی تھی اس کے علاوہ جعفر برمکی کا وہ عجیب و غریب واقعہ جو اُسے عبدالملک بن صالح سے پیش آیا تھا۔

جعفر مجلس نشاط میں بیٹھا تھا کہ عبدالملک بن صالح رشید کا چچیرا بھائی اُس کے پاس آیا۔ جب دونوں نشہ میں چور ہوئے تو جعفر نے عبدالملک سے پوچھا کہ کیا آپ کی کوئی ایسی غرض ہے جو میرے اختیار میں ہو تاکہ آپ کی تشریف آوری کے شکریہ میں اُسے پورا کردوں عبدالملک نے کہا کہ ہاں امیرالمومنین مجھ سے کچھ رنجیدہ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ مہربان ہو جائیں۔ جعفر۔ اچھا آپ سے خوش ہو گئے۔ اور کچھ۔ عبدالملک۔ اور مجھ پر دس ہزار قرض ہے۔ جعفر۔ وہ میرے مال میں سے حاضر ہیں اور امیرالمومنین کے یہاں سے بھی۔ کچھ اور۔ عبدالملک۔ امیرالمومنین مجھے اپنا سمدھی بنا کر ابراہیم میرے فرزند کو دامادی میں قبول کر لیں۔ جعفر۔ امیرالمومنین نے غالیہ کو اُس کے ساتھ منسوب کر دیا۔ کچھ اور۔ عبدالملک اور ابراہیم میرے لخت جگر کے سر پر نشان حکومت کا سایہ ہو اور اس کو شاہی مراتب کے ساتھ کسی ملک کی گورنری ملے۔ جعفر۔ بہتر ہے۔ امیرالمومنین نے اُسے ملک مصر کا والی مقرر کر دیا۔

اس گفتگو کے بعد عبدالملک اپنے گھر گیا اور جعفر نے بلا اجازت خلیفہ تمام باتوں کی تکمیل کر دی۔

دوسرے دن صبح کو جعفر خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے پوچھا کہ جعفر کل رات تم نے کیونکر بسر کی۔ جعفر نے ادب کے ساتھ پچھلی رات کا واقعہ مفصل عرض کرنا شروع کیا۔ خلیفہ جو تکیہ کے سہارے بیٹھا تھا سنبھل بیٹھا اور بولا جعفر تم کو خدا کی قسم سچ کہنا اُس نے تجھ سے کیا کیا مانگا تھا۔ جعفر۔ امیر المومنین پہلے اُنھوں نے آپ کی رضامندی چاہی۔ رشید۔ تو نے کیا جواب دیا۔ جعفر۔ میں نے حضور کی رضامندی دیدی رشید۔ بیشک میں اُس سے راضی ہو گیا۔ غرضکہ علے الترتیب یکے بادیگرے جعفر نے تمام باتیں بیان کیں اور رشید اُن پر صاد کرتا گیا۔ بالآخر خلیفہ نے اُن تمام باتوں کا سرانجام فرما دیا۔

مجذوب کی بڑ

(جناب خان صاحب حاجی خواجہ سید عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے انسپکٹر مدارس)

کسی کی دی ہوئی کیا چیز یادگار نہیں — دل فگار نہیں چشم اشکبار نہیں
گھٹا ہے برق ہے ساقی ہے مے ہے یار نہیں — بہار تو ہے مگر حاصل بہار نہیں
یہ تیرے بس کی تو گلکاریاں بہار نہیں — وہ حسن تو پس پردہ شریک کار نہیں
زہے نصیب کہ میری نظر بفیض جنوں — فریب خوردۂ رنگینئ بہار نہیں
یہ اپنی حد نگہ سے کسی کی دید کہاں — یہ عکس حسن نظر ہے جمال یار نہیں
وہ بیٹھے رہتے ہیں دیکھوں تو بت بنے کبتک — جو بے قرار نہ کردوں تو بیقرار نہیں
جنوں میں ہو گئی اللہ کیا مری حالت — کہ پھول پھول نہیں مجھ کو خار خار نہیں
زمانہ بھر میں تو شہرہ ہے میری رندی کا — میں حسب شوق مگر پھر بھی بادہ خوار نہیں
ہمارا جینا ہی کیا اور ہمارا مرنا ہی کیا — جیئے تو گر نہیں مرجائیں تو مزار نہیں
نہ چھیڑ مسئلۂ جبر و اختیار نہ چھیڑ — کچھ اختیار رہے جب دل پہ اختیار نہیں
کسی کا ہائے دم خودکشی یہ آ کہنا — نہیں نہیں ارے او میرے بیقرار نہیں
ابھی تو کپڑے بدل کر نہ جاؤ غیر کے گھر — ابھی کفن بھی تو میلا ترا مزار نہیں
کتاب عشق کے سارے ورق الٹ ڈالے — کہیں یہ مسئلۂ جبر و اختیار نہیں
ابھی تو گویا میں دنیا ہی میں نہیں آیا — یہ دن جو ہجر کے ہیں رات میں شمار نہیں

جو اہل عقل ہیں کیا تجھ کو مانیں گے مجذوب
وہ رازداں سہی لیکن وہ رازدار نہیں

محاکمہ

(جناب خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی۔ اے، ڈپٹی کلکٹر)

جولائی اور اگست ۳۳ء کے مشترکہ الناظر میں جناب منشی سراج احمد علوی صاحب فانی کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں اُن اعتراضوں کا جواب ہے جو مولوی اظہر علی صاحب آزاد نے حضرت اصغر مرحوم کے بعض اشعار پر عائد کیے تھے۔ میں اس محاکمہ میں اعتراضات و جوابات کی نوعیت اور خود اُن اشعار پر ناقدانہ نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ الناظر کا وہ نمبر جس میں آزاد صاحب کے اعتراض شائع ہوئے تھے موجود نہیں ہے بلکہ اُن کا ملخص فانی صاحب کا یہی مضمون ہے۔

شعر اصغر:- کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

اعتراض آزاد :- (۱) آگ دینا غیر محاورہ ہے ۔

(۲) ہوس اور عشق میں بعد المشرقین ہے۔ ایک نور ہے، دوسری نار۔ ہوس میں آگ کے اضافہ سے کیا حاصل؟ ہوس ترقی کر کے نارِ جہنم کا شعلہ بن جائے گی .... کیا ہوس بازی کے طوفانِ بے تمیزی کا نام عشق ہے؟

جواب فانی :- آگ دینا صحیح ہے۔ ثاقب لکھنوی کہتے ہیں ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

آگ دینے کے معنے چمکانا اور روشن کرنا، شعر میں دراصل محبت حقیقی کے مدارج دکھائے ہیں۔ محبت کی ابتدا ہوسناکیوں سے ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ تبدیل ہو کر عشق کی صورت میں جھلکتی ہے اور مجازی عشق سے موسوم ہوتی ہے، لیکن مجازی عشق بھی ہوس سے گزر کر (Refined) اصلاح پذیرفتہ، جس وقت یہ بھی ختم ہو جاتی ہے تو حقیقت کی سرحدیں نظر آنے لگتی ہیں اور ہوس کا خاتمہ ہو جاتا ہے یعنی وہ خاک ہو جاتی ہے۔

محاکمہ :- حضرت آزاد کا ایراد کہ آگ دینا بے محاورہ ہے یقیناً غلط ہے، آگ دینا بمعنے جلانا مسلّم، لیکن آگ کسی چیز کو دی جاتی ہے نہ کہ کسی چیز میں، لہٰذا اصغر مرحوم کے شعر میں زبان کی لغزش موجود ہے تو صورت بدل گئی۔ علاوہ بریں آگ کے قبل کچھ کا اضافہ شعر زیر نظر میں بالکل فضول اور بے محل ہے مرحوم کو غالباً سودا کا مصرع یاد تھا ع کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا۔ وہاں مقدار بتانا ضروری تھا، اصغر کے شعر میں اس کی کوئی شق نہیں۔ فانی صاحب نے آگ دینا کے معنے چمکانا، روشن کرنا

لیے ہیں حالانکہ دوسرے مصرع میں خاک کر دیا کا ٹکڑا اس کے منافی ہے، کوئی چیز جل کر خاک ہوتی ہے چمکنے یا روشن ہونے کا نتیجہ خاک ہونا نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ جلنے میں بھی چمک یا روشنی پیدا ہوتی ہے مگر اصل سبب چمکنے یا خاک ہونے کا جلنا ہی رہا، لہذا ہمیں کوئی حق نہیں کہ پہلے مصرع میں آگ دینا کے معنے چمکانا لے کر اسی سے دوسرے مصرع میں خاک ہونا مراد لیں۔ فانی صاحب کو مشکل یہ پیش آئی تھی کہ اگر ابتدا ہی میں آگ دینا کے معنی جلانا لیتے تو ہوس عشق کی صورت میں چمکتی کہاں سے؟ بلکہ فوراً خاک ہو کر عشق میں منتقل ہو جاتی اور اس صورت میں مجازی و حقیقی عشق کی تقسیم رونما نہ ہوتی اس لیے صنعت ایہام سے کام لیا۔ جب شعر کے الفاظ کسی مفروضہ مفہوم کی مساعدت نہیں کرتے تو ایسی ہی ترکیبیں اختیار کی جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اصغر مرحوم کو زبان کے نکات و لطائف پر کبھی عبور نہ ہوا اور اُن کے بیشتر اشعار اس خامی کے نوحہ خواں ہیں۔ میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو ہر اُپج کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے اور مخالفت کرتے ہیں، البتہ احتیاط اور سلیقۂ شعر چاہتا ہے کہ نئی ترکیبیں اور نئے اسالیب بیان شوق سے وضع کیجیے مگر موسیقی و رعنائی سے خالی نہ ہوں، اسی کے ساتھ سریع الفہم ہوں نہ کہ ایسے ژولیدہ و مبہم کہ شعر کا مطلب ہی خبط ہو جائے۔ نیز اُن بنیادی اصولوں سے انحراف نہ ہو جن پر زبان کی صحت و صفائی و سلاست کا دار و مدار ہے۔ انصاف سے کہیے کہ شعر زیر بحث میں "کچھ" حشو ہے کہ نہیں، ہوس کو آگ دی بولیں گے کہ ہوس میں آگ دی۔ دوسرے مصرع میں اُسے کی کیا ضرورت تھی۔ "تو تعمیر" کہنا نا فرسا معہ خراش ہے۔ عرفان کے معنے پہچاننے کے ہیں، بالخصوص معرفت باری، ہوس بیچاری عشق کا مرتبہ تو حاصل نہیں کر سکتی عرفان کیونکر بن جائے گی۔ تھوڑی دیر کے لیے "آفریدۂ ہوس" عشق کو ہوس کا بدل فرض کر لیجیے، اس صورت میں بھی اصغر صاحب کا ادعا غلط ٹھہرتا ہے کیونکہ عشق بھی عرفان نہیں بلکہ وسیلۂ عرفان ہے۔ عشق سے معرفت باری حاصل ہوتی ہے خود عشق عرفان نہیں بن جاتا۔ اور ترقی کیجیے تو عشق کو حاصل عرفان کہہ سکتے ہیں کیونکہ عرفان کے بعد یہ ثابت ہوا کہ جس حقیقت کی تلاش تھی وہ درحاصل خود عشق ہے۔ تاہم عشق عرفان تو نہ ہوا۔

فانی صاحب کا ارشاد ہے کہ محبت کی ابتدا ہوسناکیوں سے ہوتی ہے، بہتر، مگر شعر میں لفظ عشق ہے نہ کہ لفظ محبت اور عشق محبت کا ایک بلند تر درجہ ہے اُس کی ابتدا ہوس سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ آزاد صاحب کا اعتراض اصل ہے کہ ہوس کی آگ جس قدر بھڑکے گی عشق میں منتقل ہونے کے بجائے اور زباں مدانہ ہو جائے گی۔ اصغر صاحب کا ادعا ہے کہ ہوس کو آگ لگا دو تو عشق معرض وجود میں آئے گا، میں آزاد صاحب کا ہمنوا ہو کر عرض کرتا ہوں کہ ہوس کو جس قدر بھی جلائیے یا تپائیے کھوٹ

دو در نہیں ہو سکتی اور کندن نہیں بن سکتی، عشق کا چولا نہیں بدل سکتی۔ خاک ہونے پر بھی ققنس کی طرح
اس کی خاک سے ہوس ہی پیدا ہوگی، عشق کی آفریدگار نہیں ہو سکتی۔ ہوس میں خواہش نفس کا لگاؤ
ناگزیر ہے اور عشق ایک شورش بے مدعا و خلش بے مآل ہے۔ ہوس سے عشق کی تعمیر یا تربیت کی امید
رکھنا چیل کے گھونسلے میں ماس ڈھونڈھنا ہے۔ البتہ عشق وہ پارس ہے جو مس ہوس کو بھی زر ناب
بنا سکتا ہے ممکن ہے کہ عشق میں اول اول اجزائے ہوس شامل ہوں جو رفتہ رفتہ بفیض عشق فنا ہو جاتے
ہیں اور عشق خواہشات نفس سے پاک ہو جاتا ہے۔ اصغر مرحوم شاید یہی کہنا چاہتے تھے مگر ناکام رہے سنئیے

اللہ رے سوز عشق کہ جنس ہوس کو بھی　　سرمایۂ تجلی عرفاں بنا دیا

شعر اصغر:- اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن　　آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

آزاد:- "اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے محو خواب" فرمائیے "موجزن" تو اس وقت ہوئی
جب حسن و عشق کا ساماں بنی۔

جواب فانی:- برق کی رو ہمیشہ متحرک رہتی ہے، برق کی "محو خوابی" اس کی نیستی کے مرادف ہے
مثبت اور منفی برقیوں کی لہریں ہمیشہ اپنے Medium میں گذرا کرتی ہیں ان کا ایک دوسرے سے
ربط شعلہ گری وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

محاکمہ:- اعتراض جس طرح وارد کیا گیا ہے یقیناً کمزور ہے۔ برق کا محو خواب ہونا کیا معنے۔
غالباً آزاد صاحب کا منشا یہ تھا کہ فطرت کے ضمیر میں ایک برق پنہاں تھی جو آشکار ہونے کو بیقرار تھی
اور بالآخر حسن و عشق کا ساماں بن کر ظہور میں آئی۔

اصل یہ ہے کہ جو خیال نظم کرنا مقصود تھا اس کے لیے موجزن اور محو خواب دونوں ناکافی ہیں،
موجزن سے محض حرکت کا اظہار ہوتا ہے اور محو خواب میں حرکت سرے سے غائب ہے۔ ایسا لفظ درکار
ہے جس سے مترشح ہو کہ برق خود پر مائل ہے اس مطلب کی تکمیل لفظ بیقرار سے ہوتی ہے۔ ع

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے بیقرار

اصغر صاحب کا دوسرا مصرعہ ضعف تالیف کا ماتم کر رہا ہے۔ معنویت میں اضافہ کرنے والے الفاظ
نہیں ملے تو محض بھرتی کے الفاظ آج اور اس کو پر قناعت کی۔ اہل نظر اس ٹکڑے کی جگہ "شوخی سے"
پڑھیں اور فیصلہ کریں۔ پورا شعر یوں ہوا سے

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے بیقرار　　شوخی سے حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

حاصل وہی ہے جو میرے اس مشہور شعر کا ہے سے

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر میں ورنہ وہی خلوتیٔ راز نہاں ہوں
سینۂ فطرت میں ایک "جذبۂ بے اختیار شوق" مخفی اور خود کو بیقرار رکھتا۔ شوخی نے کہا کہ بہتر ادراس برق مضطرب یعنے اس جذبے کو دو حصوں میں منقسم کرکے (یہی شوخی ہے جس کے میر صاحب یوں شکوہ سنج ہیں سہ

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی)

ایک کو سامان حسن اور دوسرے کو سرمایۂ عشق بناکر دنیا میں بھیج دیا۔ اس طرح برق کی مثبت اور منفی، متضاد مگر متجانس لہروں کی بھی توجیہ ہوگئی۔ عشق میں ابرام (مثبت لہر) اور حسن میں رم (منفی لہر) ہے۔

شعر اصغر:- جز دل درد آشنا اور کو یہ خبر نہیں ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

اعتراض آزاد:- اگر یہ کے بجائے کچھ ارشاد ہوتا تو غالباً بہتر ہوتا۔

جواب فانی:- آپ ہی فرمائیے "کو کچھ" فصیح ہے یا "کو یہ"، نیز یہ خبر نہیں سے تکمیل بے خبری کا پتہ چلتا ہے اور کچھ خبر نہیں میں وہ معنوی جامعیت نہیں ہے۔

محاکمہ:- فانی صاحب کا جواب مسکت و دنداں شکن ہے۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ عشق درد آشنا ہوکر تغیرات عالم سے بے نیاز ہوگیا۔

شعر اصغر:- خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغر جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرز نظر ہے

آزاد:- طرز کی جگہ وہم چاہیے۔

فانی:- وہم کے معنے ہیں دماغ کی وہ باطنی قوت جو فاسد خیالات پیدا کرتی ہے یا پھر وہم کے معنے شک اور گمان کے ہیں اور یہ دونوں معنے یہاں چسپاں نہیں ہوتے اور پہلی صورت میں نظر تابع وہم ہوتی ہے، لہذا جو کچھ نظر آتا ہے اس میں نظر معطل ہے۔ طرز کے معنے انداز، طریقے اور روش کے ہیں۔

محاکمہ:- مجھے فانی صاحب سے اتفاق ہے کہ لفظ وہم قابل پذیرائی نہیں، لیکن وہم کی طرح لفظ طرز بھی اظہار مطلب میں قاصر ہے۔ فانی صاحب نے شعر کا مطلب بیان کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ میں جسارت کرتا ہوں:- دنیا ایک حیرت کدہ ہے یہاں مجال دم زدن نہیں کیونکہ حقیقت اشیا* علم نہیں ہوتا جسے جو کچھ نظر آتا ہے وہ اسی کی نگاہ کا عکس یا نقش ہے۔ کسی چیز کو حکیم کی نظر سے دیکھو اس میں حکمت نظر آنے لگی۔ موحد کی نظر سے دیکھو کلمۂ لا الہ الا اللہ پڑھتی ہوگی، ملحد کی نظر سے دیکھو بدنظمی و بے ترتیبی کی شہادت دے گی۔ نگاہ ارتقا سے دیکھو ترقی کے مدارج طے کرتی

ہو گی، نگاہ اہتزاز سے دیکھو خوش نظر آئے گی۔ آبدیدہ ہو کر دیکھو غمگین نظر آئے گی۔ اچھی نظر سے دیکھو اچھی نظر آئے گی۔ بری نظر سے دیکھو بری نظر آئے گی۔ نگاہ شاعر سے دیکھو حسن کا مرقع نظر آئے گی۔ نگاہ مشکک سے دیکھو بھوت پریت اور پرچھائیاں بن جائے گی۔

شعر کی بلاغت و معنویت تسلیم۔ مگر زبان کا ماہر کہے گا کہ نظر کے ساتھ لفظ طرز سے لفظ انداز بہتر اور اُس سے بہتر لفظ نیرنگ ہوتا۔ "جس نظر سے دیکھو" کا مفہوم انداز نظر سے جتنا اُبھر کر آتا ہے طرز نظر سے ہرگز نہیں ہوتا۔ طرز نظر سے آدمی خود نظر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور انداز سے مختلف اشیا پر غور کرنے لگتا ہے جن پر نظر پڑ رہی ہے۔ خود نظر اور نگاہ میں جو بلا امتیاز بطور مرادف استعمال ہوتے ہیں یہی نازک فرق ہے، اسی وجہ سے زبان کے اداشناس "طرز نگاہ" اور "انداز نظر" بولتے ہیں۔ نظر کا فعل غیر اختیاری ہے اور نگاہ میں ارادہ شامل ہے۔

لفظ نیرنگ نظر کے ساتھ آنے سے تنوع معانی اور بڑھ جاتا ہے۔ طرز یا انداز نظر میں اس مسئلے کا حل نہیں کہ ہم کسی خاص شے کو کسی خاص طرز سے کیوں دیکھتے ہیں، نیرنگ میں اس کا جواب موجود ہے، دیگر اشیا کی طرح ہمیں حقیقت نظر کا بھی علم نہیں ہائے میر ؎

عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے   کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

لفظ نیرنگ سے ایک اور فائدہ بھی متصور ہے "جو کچھ" کی تفہیم کے بعد مصرع میں لفظ "سب" زائد اور بیکار تھا وہ بھی نکل گیا۔ بعض حضرات حشو و زوائد کے جواز میں کہتے ہیں کہ ان سے زور پیدا ہوتا ہے دریا پر تنکے زور زور بہتے ہیں۔ ان کی رفتار سے دریا کی روانی کا اندازہ کرنا کوتاہ نظری نہیں تو کیا ہے یہ سب کچھ دوسرے مصرع کے متعلق عرض کیا گیا۔ اب پہلے مصرع پر غور کیجئے۔ پہلی چیز جس پر ذوق سلیم جبیں ہوتا ہے۔ اس مصرع کی سست بندش ہے۔ خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغر۔ گویا اصغر بھول گئے تھے یا علم نہ تھا کہ دہر حیرت کدہ ہے ایک واقف کار اُن کو متنبہ کرتا ہے۔ حالانکہ خاموشی کی تاکید اس بنا پر نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ جب کسی چیز کی اصلیت معلوم نہیں تو رطب زنی اور لب کشائی نادانی ہے خاموش رہنا ہی مناسب ہے۔ ذرا سی ترمیم لفظوں کے مرکز کشش کو بدل دیتی ہے:۔ خاموش کہ حیرت کدۂ دہر میں اصغر + جو کچھ نظر آتا ہے الخ۔ شعر میں تین سے تھے ایک کم ہو گیا۔ پہلے مصرع کا جھول ہی نہیں نکل گیا بلکہ دوسرے مصرع سے چسپاں ربط پیدا ہو گیا کیونکہ جس طرح اصغر صاحب نے موزوں کیا تھا دوسرے مصرع کے پہلے لفظ یہاں مقدر ماننے کے بعد آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اب لفظ حیرت کدہ پر غور کیجئے کہ تکمیل مطلب میں معین ہے کہ مخل۔ حیرت کدہ وہ مکان یا جگہ جو

حیرت سے بریز ہے۔ حیرت وہ جذبہ ہے جس کی موجودگی میں کوئی دوسرا نقش مرتسم ہی نہیں ہوتا۔ مقام حیرت مقام ہُو ہے۔ جب دہر کو حیرت کدہ کہا جہاں نقش حیرانی کے سوا کچھ بھی نہیں ع جیسے کوئی آئینے کو آئینہ دکھائے۔ تو دوسرے مصرع سے ایک عجیب اُلجھن پیدا کرنے والی نقیض پیدا ہوئی۔ یا تو نہ معلوم کیا کیا کچھ نظر آتا تھا اور ہر شے کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا اور یہ سب مناظر رنگا رنگ مع نظر دہر کے اندر تھے یا دہر کو حیرت کدہ کہہ کر اُس میں نقش و نگار یا تنوع مظاہر و مناظر کی گنجائش اور صلاحیت ہی نہیں رکھی۔ ع کارفرمائی نظر موقوف! ذرا اسی حیرت کدہ کو صورت کدہ کہہ دیجئے اور دیکھئے کہ چلتی پھرتی تصویریں ہجوم در ہجوم دعوت نظر دیتی ہیں کہ نہیں۔ دیدۂ بینا اُن پہ رائے زنی کرنا چاہتا ہے اُن کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے مگر ایک عارف کہتا ہے :-

خاموش کہ صورت کدۂ دہر میں اصغرؔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ نیرنگ نظر ہے

مایا کا جال بچھا ہوا ہے دیکھتا رہ جب تک دیکھ سکتا ہے اُس کے بعد آنکھیں بند کر لے۔ حیرت کدہ نے شعر سے حرکت سلب کر لی تھی۔ شعر ایک جسد بے روح تھا۔ صورت کدہ نے وہ کمی پوری کر دی۔ کم سے کم میرا صدق دل سے یہی خیال ہے۔

شعر اصغرؔ:- چاہیے داغ معصیت اُسکے حریم ناز میں پھول یہ ایک بھی نہیں دامن پاکباز میں

آزاد :- مصرعہ اولیٰ کے الفاظ "کہ مستحق کرامت گناہگارانند" کے حامل ہوتے نظر نہیں آتے۔

فانی :- کیا شعر کے اندر یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مصرعہ پورے شعر کے معانی کا حامل ہو؟ کیا شعر صوری اور معنوی لطافتوں میں سرمد کے شعر اور حافظ کے مصرعہ سے بالاتر نہیں ہے؟ اور کیا اُس کی حریم ناز میں داغ معصیت (کا پھول) چاہیے میں "کا پھول" کو مقدر مان کر مصرعہ کی نثر نہیں ہو سکتی۔

محاکمہ :- جیسا اعتراض ویسا جواب۔ محض نزاع لفظی۔

مجھے شعر پر جو اعتراض ہے یہ ہے کہ اس میں گناہ کو سراہا گیا ہے حالانکہ گناہ کی زشتی و زبونی محتاج شرح نہیں البتہ گناہ پر نادم ہونا ایک ایسی ادائے بشری ہے جو رحمت حق کو پسند ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کفر و زندقہ یا محض شاعری ہے جس کو حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ شعر کا تجزیہ کیجئے محبوب حقیقی کے حریم ناز میں داغ معصیت درکار ہے اُسی داغ کو باونیٰ ملابست پھول کہہ کر یہ کہا کہ ایسا ایک پھول بھی دامن پاکباز میں نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حریم ناز میں معصیت کار کا تو گذر ہو سکتا ہے مگر پاکباز محروم ہے اور ابدالآباد تک محروم رہے گا۔

دورِ حاضر کی شاعری کا اگر کوئی نیا کارنامہ ہے تو یہی ہے کہ عصیاں کو حسین اور دلکش بنا کر پیش

کرے۔ کسی کو شکایت نہ ہو اگر اعلان کر دیا جائے کہ ہمارا معشوق بازاری ہے اور اُس کو تجربہ کارو معصیت کوش و معصیت اندیش عاشق کی ضرورت ہے، پاکباز عشق اور عاشق سے واسطہ نہیں مگر قیامت تو یہ ہے کہ اُس تجلی گاہ میں جہاں جبریل کے پر جلتے ہیں عصیاں کا ڈھونگ بڑی ڈھٹائی سے پیش کیا جاتا ہے اور تصوف کی آڑ میں۔ اب تک زہد ریائی شاعروں کا نشانۂ ملامت رہا تھا مگر اب دامن پاکبازی کے لتے لیے جانے لگے۔ حالانکہ عشق کے تحت پاکباز اُس کو کہیں گے جس کی محبت میں آلودگیٔ نفس و ہوس کا شائبہ نہ ہو۔ اس شخص کا دامن گلہائے یاسمیں سے بھرا ہوا ہے اس امید پر کہ نہ معلوم کب حریم ناز کی آرائش کے لیے ان کی ضرورت ہو مگر یہاں گناہ گار پلّے پڑتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ انگارے کی طرح دہکتے ہوئے داغ یا گلہائے معاصی میرے پاس ہیں ان سے حریم ناز کی زینت کرا۔ غلاموں کے پھول اپنے خوش رنگ کہاں۔ وہ لے کر کیا کرے گا۔ یہ آج کل کی شاعری یا پارسا یا نہ عیاشی ہے جس کو ڈانٹے کے دوزخ کا نمونہ کہنا چاہیے جہاں احساس گناہ مٹ کر مایۂ نازش ہو گیا ہے

ع۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔

شعر اصغر:۔ گم ہے حقیقت آشنا، بندۂ دہر بے خبر ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

آزاد:۔ حقیقت آشنا یعنی اہل اللہ ذات باری تعالیٰ کے سوا دنیا و ما فیہا سے مطلب نہ رکھنے کے باعث گم کہے جا سکتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اب رہے دنیا دار جنہیں شاعر صاحب "بندۂ دہر" فرما رہے ہیں، وہ کیونکر بے خبر ٹھہرے؟ اگر اس وجہ سے بے خبر ہیں کہ وہ "حقیقت آشنا نہیں" قابل غور ہے، اگر وہ بیہوش ہیں تو اس کے ساتھ بندۂ دہر بھی تو ہیں۔ بیہوش ہوتے تو دنیا کے کاروبار بحیثیت بندۂ دہر ہونے کے نہ کیونکر انجام دے سکتے تھے۔

فانی:۔ ایک حقیقت میں گم ہو کر منزل ہوش سے گذر گیا، ایک حقیقت سے بے خبر با اپنے سے دونوں گذر گئے لیکن ایک کی بے خبری مبارک اور دوسرے کی غفلت عبرت خیز ہے۔

نگارندہ:۔ مجھے فانی صاحب سے بالکل اتفاق ہے۔

شعر اصغر:۔ موج نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے اور بھی جان پڑ گئی کیفیت نماز میں

آزاد:۔ نسیم صبح کی جگہ نسیم کعبہ ہوتا۔

فانی:۔ نسیم صبح کی ترکیب نسیم کعبہ سے لطیف تر ہے۔ اگر نسیم صبح کی جگہ نسیم کعبہ چلنے لگتی تو اول تو شعر کی شعریت فنا ہو جاتی اور ملائیت کی جلاہند آنے لگتی اور نسیم کے ساتھ بجائے لطافت کے کچھ مسواکوں کے تنکے اور کچھ "جبین ریا" کی گھسی ہوئی خاک آ جاتی۔

محاکمہ :- فانی صاحب نے بالکل سچ کہا۔ آخری جملوں کا لطیف طنز اور شاعرانہ انداز بیان داد سے مستغنی ہے۔ کاش مسواکوں کے تنکوں کے بجائے مسواکوں کے ریشے کہتے۔

شعر اصغر:- حسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے ملحد باخبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں

آزاد:- حسن ہزار طرز صفات الٰہیہ کے لیے لانا کہاں تک جائز ہے۔ ملحد بظاہر باخبر کہے جانے کے قابل نہیں اگر باخبر ہوتا تو ملحد رہنا گوارا نہ کرتا۔

فانی:- حسن ہزار طرز ترکیب نو کا اضافہ ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ملحد بھی جو بظاہر منکر خدا ہے حقیقت میں منکر نہیں۔ اس کے انکار میں اقرار نہاں ہے اس لیے کہ انکار اُسی وقت لازم آتا ہے جب شے موجود ہو۔ لا شے سے انکار کوئی معنے نہیں رکھتا۔ لہٰذا ملحد کا انکار گویا اثبات وجود باری تعالےٰ کا موید ہے۔ غرضکہ حقیقت اپنی حقیقت کسی نہ کسی طرح تسلیم کراتی ہے۔ خواہ اثبات میں خواہ نفی کے ذریعہ۔

محاکمہ :- فانی صاحب کا بیان کردہ مطلب اس قدر دقیق یا پھر ایسا اُلجھا ہوا ہے کہ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انکار اُسی وقت لازم آتا ہے جب شے موجود ہو۔ لا شے سے انکار کوئی معنے نہیں رکھتا۔ اگر کسی شے کا انکار اُسی وقت لازم آتا ہے جب وہ موجود ہو تو اسی طرح کہہ سکتے ہیں کہ کسی شے کا اقرار اُسی وقت لازم آتا ہے جب وہ معدوم ہو۔ یہ کسی منطقی مذہب کی دلیل وجود باری ہو تو ہو فہم عامہ سے خارج ہے۔ اگر لاشے یا معدوم کا انکار کوئی معنے نہیں رکھتا تو معدوم کا اقرار بھی اُس کے وجود کا انکار ہے یا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ اسے کہتے ہیں اعتماد نہ ہونے کا غماز فانی صاحب کا اس جملے میں لفظ گویا کا استعمال ہے :- "لہٰذا ملحد کا انکار گویا اثبات وجود باری کا موید ہے"

اب اصغر مرحوم کے شعر کا جو مطلب میں سمجھا ہوں، عرض کرتا ہوں۔ ملحد وجود باری کا منکر ہے لیکن دیگر موجودات عالم کا قائل ہے جو در اصل "حسن ہزار طرز" یا خدا شناسی کے شیون و مظاہر ہیں مگر وہ جلوۂ لا الٰہ یا ماسوا اللہ سمجھتا ہے۔ اکثر ملحد فطرت پرست اور تاریخی مناظر کے والہ و شیدا ہوتے ہیں اور ان کی لطافتوں اور رعنائیوں میں محو ہو جاتے ہیں اگر ... ہو جاتے ہیں، کھو جاتے ہیں۔ یہی بے خودی و وارفتگی اقرار وجود باری کا طرۂ امتیاز ہے جس کو فطرت کی نماز یا عبادت کہنا مناسب ہوگا۔ جب یہ کیفیت طاری ہو گئی تو زبانی انکار یا اعلان کفر کوئی وقعت نہیں رکھتا بلکہ اس انکار میں اقرار مضمر ہے کیونکہ اغراق مشاہدہ نے اشیائے موجودہ کو (تھوڑی دیر کے لیے سہی) معدوم کر دیا تو ثابت ہوا کہ ان اشیا کا وجود بالذات نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے وجود کا تابع ہے۔ ان کے ظاہر کا کوئی باطن بھی ہے۔

وہی وجودِ مطلق خدا ہے یا اور جو چاہے نام رکھ دو۔ مگر شعر میں ملحد کے ساتھ لفظ باخبر کا اضافہ کوئی خوبی پیدا نہیں کرتا، ملحد باخبر ہو یا بےخبر ملحد ہی ہے۔ تاہم پرستارِ فطرت ہونے کی حیثیت سے حسن کا ادا شناس ہے لہذا باخبر کی جگہ اُس کو خوش نظر کیوں نہ کہا جائے۔ ع ملحد خوش نظر بھی گم جلوۂ لاالہ ہیں۔

شعر صغیر:۔ مے بے رنگ کا سو رنگ میں رسوا ہونا کبھی میکش، کبھی ساقی، کبھی مینا ہونا

آزاد:۔ مے بے رنگ کے معنے صرف بےکیف و بےلطف اور بے رونق کے ہیں۔ یکرنگ زیادہ موزوں ہوتا۔

فانی:۔ مے بے رنگ کے معنے ظہور وحدانیت حق تعالے کے بھی ہیں۔

محاکمہ:۔ آزاد صاحب سے سخت فرو گذاشت ہوئی۔ بے رنگ اور بدرنگ دو مختلف چیزیں ہیں فانی صاحب کا جواب شافی ہے۔ البتہ دوسرے مصرع کی ترتیب اس طرح بہتر ہوتی۔ ع

کبھی ساقی، کبھی میکش، کبھی مینا ہونا

شعر صغیر:۔ ایک ایسی ہی تجلی آج میخانے میں ہے لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

آزاد:۔ مصرعہ اولیٰ کا مصرعہ ثانی سے کوئی ربط نہیں، تجلی ہوا میں معلق نظر آتی ہے، تجلی کا کام دیدہ و دل کو منور کر دینا ہو تو ممکن ہے، کھو دینا تجلی کا کام نہیں۔ یہ نہیں ارشاد ہوا کہ کیسی تجلی۔

فانی:۔ شاعر نے چکا چوند پیدا کرنے والی یا ہوشربا تجلی کے بجائے "ایسی" کو استعمال کر کے معنوی ہمہ گیری کا توسع دیا ہے۔ مصرعوں میں معنوی ربط موجود ہے۔ میخانے میں مے و مینا کے علاوہ جو اپنی جگہ پر لطف آفرینی کے سامان ہیں آج ایک اور تجلی بھی موجود ہے جس میں محو ہو جانے کا کیف مے و مینا کے سرور سے بڑھا ہوا ہے۔ باقی رہا یہ کہنا کہ تجلی منور کرتی ہے کھوتی نہیں غالباً سرسری نگاہ بلکہ تجاہل عارفانہ کے باعث ہے۔ حضرت موسیٰ پر جو تجلی کوہ طور پہ ہوئی وہ اُن کو کھو نہ سکی درامل شاعر نے اس شعر میں اُس فیضان انوار کا اور اُس انشراح قلب کا ذکر کیا ہے جو اُسے منازل عشق طے کرنے میں یک بیک حاصل ہو جاتے ہیں اور اُسے بےخود بنائے دیتے ہیں۔

"لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے" اور آپ کی اصلاح "کس کا پینا کیا پلانا لطف کھو جانے میں ہے" میں زمین اور آسمان کا فرق ہے آپ خود فراموشی کے باعث کھونے کا لطف اُٹھا رہے ہیں درانحالیکہ شاعر کے یہاں تجلی دعوت دے رہی ہے اور دو مختلف چیزیں اپنی اپنی کیفیت آفرینیوں کے ساتھ موجود ہیں اور ایک دوسری سے بڑھی ہوئی۔ سلوک کے طریقۂ فرسودہ کو شاعر نے پینے سے تعبیر کیا ہے اور تجلی اُس کیف کا نام ہے جو اُسے حاصل ہوئی اور اُس میں وہ غرق ہونا چاہ

محاکمہ :۔ آزاد صاحب کا اعتراض وقیع نہیں، فانی صاحب کے بیان کردہ مطالب میں بھی اکثر امور محل نظر ہیں۔ اُنھوں نے تجلی کو مے و مینا سے علیحدہ ایک چیز قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس تجلی میں محو ہو جانے کا کیف مے و مینا کے سرور سے بڑھا ہوا ہے، حالانکہ شعر کی ترکیب بتاتی ہے کہ یہ تجلی میخانے ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہے اور مے و مینا ہی سے وابستہ ہے ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تجلی کی نوعیت کیا ہے اور آئی کہاں سے؟ وہ فرماتے ہیں کہ شاعر نے سلوک کے طریقہ فرسودہ کو پینے سے تعبیر کیا ہے اور تجلی اُس کیف کا نام رکھا ہے جو اُسے (یک بیک منازل عشق سے طے کرنے میں پس انشراح قلب) حاصل ہوا اور جس میں وہ غرق ہونا چاہتا ہے۔ شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو اس تجلی اور اُس کی کیف آفرینی کو شاعر سے مخصوص اور دوسرے اہل میخانہ کے علی الرغم اُس تک محدود کر دے۔ پورا میخانہ تجلی سے معمور ہے اور سب حریفان بادہ پیما ایک ساتھ مکیف ہو رہے ہیں، ہر شخص محسوس کر رہا ہے کہ آج پینے میں لطف نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے۔ فانی صاحب کا یہ فرمانا بھی درست نہیں کہ شاعر نے سلوک کے طریقہ فرسودہ کو پینے سے تعبیر کیا ہے، شاعر بھی اُسی میخانے کا ایک رند ہے جہاں یہ تجلی کارفرما ہے اور تجلی کا ظہور پذیر ہونا بھی اسی میخانے کا تصرف ہے۔ لہذا شعر کے الفاظ فانی صاحب کے بیان کردہ مطلب کی تصدیق نہیں کرتے۔ اس اہمال کا ذمہ دار بڑی حد تک اصغر مرحوم کا پہلا مصرعہ ہے جس نے تجلی کی نوعیت کو غیر متعین اور غیر مرتبط چھوڑ دیا۔ اگر شعر میں تعمیم کے بجائے تخصیص ہوتی تو غالبًا یہ عیب دور ہو جاتا۔ مثلاً اس تجلی اور اس کی کیف آفرینی کو ایک پیمانے میں بند کر دیجئے جو کسی میخوار کے ہاتھ میں ہے اور وہ اُس تجلی کے پرتو سے حیران و مست و بیخود ہو کر پکار اُٹھے ع "لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے"۔ گویا اس تجلی کو اپنے دور خود را ایک ظرف مل گیا جس کے پردے میں اثر انداز ہوئی مگر اُس وقت جب ایک رند بادہ خراب ایک مدت کی مے نوشی کے بعد حقیقت مے و مینا کا محرم ہوا اب صرف جلوۂ مے و مینا مست کر دینے کو بہت ہے پینے کی ضرورت نہیں رہی۔

غور فرمائیے جو مصرع پیش کرتا ہوں شاید ان کیفیتوں کا حامل ہو۔ ع "مے یہ کیسی آج ساقی میرے پیمانے میں ہے"۔ میخوار کے ہاتھ میں لبریز پیمانۂ مے ہے، نہ معلوم خمار چشم ساقی شریک ہو گیا ہے یا کہ موج مے چشمک زنی کر رہی ہے اور ایسے انوار و تجلیات برسا رہی ہے کہ بے پئے مست کیے دیتی ہے میخوار جھوم جھوم جاتا ہے، مست و بیخود ہو جاتا ہے پھر ہوش میں آتا ہے، اس مستیٔ بے بادہ میں وہ لطف وہ لذت پاتا ہے جو اس سے پہلے مے نوشی میں بھی نہیں تھی۔ چاہتا ہے کہ اس شراب سے

جس کا جلوہ اس قدر حسین و دلفریب ہے کہ اس کا ہم و ذہن کو آشنا کروں، پینا چاہتا ہے پھر وہی بے خودی طاری ہوتی ہے، آخر کار ساقی سے پوچھتا ہے ع مے یہ کیسی آج ساقی میرے پیمانے میں ہے۔

دوسرے مصرعہ میں الفاظ بلکہ اور کھو اس بُری طرح جمع ہوئے ہیں کہ روانی و موسیقی کا گلا کُند چھری سے ریت رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ دمہ کا مریض کھوں کھوں کر رہا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں بھی تھوڑی ترمیم کی ضرورت ہے، مثلاً لطف پینے میں نہیں خود سے گذر جانے میں ہے۔ پورا شعر بعد ردو بدل یوں ہوا ؎

مے یہ کیسی آج ساقی میرے پیمانے میں ہے لطف پینے میں نہیں، خود سے گذر جانے میں ہے

اب اصل شعر پڑھیے ؎

ایک ایسی ہی تجلی آج مے خانے میں ہے لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

کس طرح بہتر ہے اس کا فیصلہ آپ کے ذوق پر ہے۔

شعر اصغر:۔ معنیٔ آدم کجا و صورت آدم کجا یہ نہاں خانے میں تھا اب تک نہاں خانے میں ہے

آزاد:۔ معنیٔ آدم کے معنے انسانیت اور شرافت وغیرہ کے ہیں اور یہ چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں لہٰذا شعر مہمل ہوگیا۔

فانی:۔ معنیٔ آدم سے مراد اس کی کنہ اور حقیقت ہے یا اس کا مقصد تخلیق، یہ چیز ہمیشہ زیر بحث رہی ہے۔ مذہب کچھ کہتا ہے، عقل کچھ کہتی ہے، فلسفہ سیکڑوں طرح اس کو سمجھانا چاہتا ہے لیکن یہ راز اب تک راز ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

محاکمہ:۔ مجھے حضرت فانی سے پورا اتفاق ہے، شعر کا مطلب وہی ہے جو انھوں نے بیان کیا، معنیٔ آدم سے مراد آدم کے ظاہر کا باطن ہے، اس کی حقیقت اور اس کا مقصد تخلیق۔

شعر اصغر:۔ رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جزو کل اب نہ کچھ شیشے میں باقی ہے نہ پیمانے میں ہے

آزاد:۔ جزو کل اُڑا بیٹھنا محاورہ نہیں ہے۔ ترمیم:۔ "رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُلٹ کر جام مے"

فانی:۔ اگر جزو کل اُڑا بیٹھنا محاورہ نہیں ہے تو خالی ہاتھ بیٹھنا پر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے (اس کے بعد اصلاح پڑھنا رنہ ہے اور بالکل درست ہے)۔

محاکمہ:۔ "اُڑا کر جزو کل" ایک عجیب مضحک اور کاواک فقرہ ہے۔ ایک طرف تو عامیانہ "اُڑا کر" پھر اس میں عالمانہ "جزو کل" کا پیوند۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فقرہ اصغر مرحوم کے قلم سے کیونکر نکلا۔ رندوں کی زبان میں پہلا مصرعہ یوں ڈھل سکتا ہے۔ ع۔ رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں چڑھا کر خم کے خم

محاکمہ ختم ہوا۔ حاشا اس تنقید کا مقصود اصغر مرحوم کی منقصت نہیں ہے بلکہ صرف اس لیے خامہ فرسائی کی کہ لوگوں میں نقد و نظر کا ذوق پیدا ہو اور اشعار کے حسن و قبح کو مختلف پہلوؤں سے پرکھنے کی کوشش کریں۔ اگر اصغر بلند پایہ شاعر نہ ہوتے تو اُن کے کلام پر قلم ہی نہ اُٹھاتا۔ ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ اچھا خیال اگر مناسب موقع الفاظ میں خوش اسلوبی سے نظم ہو تو شعر کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ اور غلط الفاظ کا انتخاب مفہوم کی خوبی کو بھی ایک بڑی حد تک مجروح کر دیتا ہے۔ میرا منشا یہ ہے کہ قوم کے نوجوان اپنی زبان کو باقاعدہ حاصل کریں اور اس کی باریکیوں کو سمجھیں یہ کہہ کر عہدہ برآ نہ ہو جائیں کہ اُردو تو ہماری زبان ہے اور اس کی تفصیل تحصیل حاصل ہے۔ اس پر بھی کوئی گالیاں دے تو یا نصیب! سنوں گا اور دعائیں دوں گا۔

ایک حسرت ناکام

(جناب مولوی محمد اسحاق صاحب ناگل انصاری خیرآبادی)

اگر تقدیر با ہمارے بت بے پیر مل جاتی — تجھے لیلیٰ کی مجھ کو قیس کی جاگیر مل جاتی
گلے سے آج اگر قاتل تری شمشیر مل جاتی — تو سب مل جاتی مراد عاشق دلگیر مل جاتی
کلیجے سے لگا لیتے کبھی ہم دل میں رکھ لیتے — کسی تدبیر سے اُن کی کہیں تصویر مل جاتی
نہیں معلوم کیا کیا بیخودی میں اُس سے ہم کہتے — جسے ہم ڈھونڈتے ہیں وہ اگر تصویر مل جاتی
کسی کے آستاں پر میں بھی کرتا شکر کے سجدے — کسی تقدیر والے سے اگر تقدیر مل جاتی
نظر آئی تھی صورت خواب میں اک شکل یوسف کی — خداوندا مجھے اس خواب کی تعبیر مل جاتی
ہمارے دل کی بیتابی بہت کچھ دور ہو جاتی — شب فرقت اگر اُس شوخ کی تصویر مل جاتی
ترے سر کی قسم ناوک فگن دونوں کو لطف آتا — اگر خون رگ جاں سے زبان تیر مل جاتی
خدا شاہد ہے جان و دل سے اس کی قدر اب کرتا — اگر مجھ کو مری کھوئی ہوئی تقدیر مل جاتی
اگر دو چار دن ہم اور میخانے میں ہو آتے — تو اے پیر مغاں کونین کی جاگیر مل جاتی

خوشی سے ہم بھی ہنستے بستے سب کی طرح ناگل
جو قسمت سے ہمیں اغیار کی تقدیر مل جاتی

منشورات۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے علمی و ادبی لکچروں اور مضامین کا مجموعہ حجم ۲۰۰ صفحے مجلد۔ قیمت فی جلد ۱۲؎ — الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

نظرے خوش گذرے

اس مشترکہ پرچہ کی اشاعت کے بعد امید ہے کہ آئندہ ماہ باہ الناظر شائع کیا جا سکے گا۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ ایک زمانہ میں کلیات قائم چاندپوری کی طباعت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حضرت قائم کے اہل خاندان میں سے ایک صاحب نے اُن کے کلیات کی ایک نقل عنایت فرمائی تھی خیال تھا کہ وہ مستند اور قابل اعتماد ہے۔ اسی بنا پر اُس کی کتابت کرائی گئی اور طباعت کا انتظام شروع کر دیا گیا۔ مگر جب تصحیح کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ نقل میں بہت غلطیاں ہیں۔ اس سے قبل مولانا حسرت موہانی نے ایک انتخاب شائع کیا تھا جو موجود تھا مگر وہ مختصر تھا اس لیے تصحیح میں اُس سے پوری مدد نہ مل سکی۔ ورنہ فکر ہوئی کہ مزید نسخے فراہم کیے جائیں چنانچہ مولانا حسرت سے اُن کا قلمی نسخہ حاصل کیا گیا اور مولوی عبدالحق صاحب نے ایک قلمی نسخہ اپنے کتب خانہ سے مرحمت فرمایا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے مرادآباد جانا ہوا اور وہاں ایک رئیس کے کتب خانہ میں بعض اجزا مل گئے۔ ان سب کی مدد سے کلیات طبع کیا جا رہا تھا۔ ایک اور ذریعہ سے زائد چھپ گیا تھا کہ کام رک گیا۔ لکھی ہوئی کاپیاں پڑی دھری رہ گئیں اور پھر مالی دشواریوں اور خانگی پریشانیوں کی بدولت اُس کی طرف توجہ کرنے کی نوبت نہ آئی۔ مثنوی جذب الفت اسی کلیات کا ایک جزو ہے جس کی تصحیح چار قلمی نسخوں کی امداد سے کی گئی تھی اور اب اس خیال سے الناظر کے ذریعہ شائع کی جاتی ہے کہ مکمل کلیات نہ سہی تو اُس کا ایک جزو ہی طبع ہو کر محفوظ ہو جائے۔ جب وقت آئے گا تو انشاء اللہ پورا کلیات بھی شائع ہو جائے گا۔

گذشتہ سال اکتوبر میں مولوی عبدالحق صاحب کی طلب پر خادمان و حامیان اردو کی ایک کانفرنس علی گڈھ میں منعقد ہوئی تھی اور اُس نے کچھ تجویزیں جلسۂ عام میں منظور کی تھیں۔ جب بعض اطراف سے جلسہ میں ان تجاویز پر بحث و تنقید کا ارادہ ظاہر کیا گیا تو لوگوں کی زبان یہ کہہ کر بند کر دی گئی تھی کہ ہمارا کام علمی ہے مباحثہ نہیں ہے اور لوگوں نے قدرتاً یہ امید کی کہ ان دعاوی کے بعد ہی علمی کام شروع ہو جائے گا مگر پورا ایک سال گذر گیا اور بظاہر ہم جہاں تھے وہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ اس ایک سال کے اندر صرف اتنا ہوا کہ ایک کانفرنس گذشتہ اگست میں پٹنہ کے مقام پر اس غرض سے منعقد کی گئی کہ وہاں کے احباب کو اردو کے بقا و تحفظ میں جو دشواریاں درپیش ہیں اُن کے رفع کرنے کی کوششوں میں خادمان انجمن ترقی اردو کا مشورہ شریک رہے۔ یا ذاتی طور پر مولوی عبدالحق صاحب نے جنوبی ہند کے

بعض حصص میں تشریف لے جاکر انجمن کی چند شاخیں قائم کیں اور اردو کے متعلق چند تقریریں فرمائیں۔
باقی جو تجویزیں علی گڈھ میں منظور کی گئی تھیں اُن پر کس حد تک عمل درآمد ہوا اس کا ہم سے کم ہیں کچھ علم نہیں ہے۔
انجمن کا دفتر اب تک دہلی نہیں پہونچا یہ ہم جانتے ہیں انجمن کے صوبہ داری مرکز پچاس شہروں میں قائم کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اب تک کہاں کہاں قائم ہوئے ہیں۔
اصلاح زبان کی کمیٹی اور ادبی کمیٹی نے اس بارہ مہینے کے اندر کیا کیا کام کیے اس کی بھی کوئی اطلاع ہمارے سامنے نہیں۔
کانفرنسیں کرنا، اُن میں دھواں دھار تقریریں کرنا، لمبی چوڑی تجویزیں منظور کرنا اور اخبارات کے ذریعہ اُن کو مشتہر کرنا تو ہم اپنے مغربی اساتذہ سے سیکھ گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قوم و ملک کی فلاح کے لیے وہ سب سامان جمع کر دیا گیا ہے جس کی اس زمانہ میں ضرورت ہے۔ رہا اپنے مشتہر کردہ عزائم پر عمل کرنا، اپنی تجویزوں کو عملی جامہ پہنانا اور قوم و ملک سے جو مواعید کیے تھے اُن کو پورا کرنا یہ سبق فی الحال ہمارے درس سے خارج ہے۔

ابھی حال میں لکھنؤ کے اندر مسٹر جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کا چھبیسواں سالانہ جلسہ بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوا۔ صدر کے جلوس کو کامیاب بنانے کے لیے اُن مسلمان نوجوانوں پر جو مسلم لیگ کی بے عملی سے بیزار تھے اور مسٹر جناح کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کر رہے تھے تشدد تک کیا گیا سارے ہندوستان کے سو ڈیڑھ سو اور خاص صوبہ متحدہ کے تقریباً ایک ہزار نمائندوں کو دل کھول کر پلاؤ زردہ کھلایا گیا اور چار دن تک بڑے جوش و خروش اور سرگرمی و مستعدی کا مظاہرہ ہوتا رہا مگر جب اس اجتماع کے نتائج و ثمرات پر غور کیجیے تو وہی ڈھاک کے تین پات۔
کچھ لوگ خوش ہوں گے کہ مسلم لیگ نے اپنا نصب العین پوری آزادی قرار دے دیا۔ اگر آزادی محض تجاویز سے حاصل ہو سکتی ہے تو اس تبدیلی پر ضرور مسرت ہونا چاہیے تھی مگر

جناب عشق را درگہ بسے بالاتر از عقل است　　کسے آن آستاں بوسد کہ جاں در آستیں دارد

اس معیار کو پیش نظر رکھ کر مسلم لیگ کی تجاویز کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ لیگ نے تھیٹر کے ایکٹرز کی طرح بہروپ تو بھر لیا مگر جو نصب العین اب مقرر کیا ہے اُس کے حصول کے لیے کسی قسم کی جد و جہد کرنا مقصود نہیں۔

جناح صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں واضح کر دیا ہے کہ ترک موالات اور قانون شکنی وغیرہ سب بیکار و بے سود ہے۔ رہی اسلحہ کی جنگ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سب ہی اس کو ناقابل عمل جانتے ہیں۔ ان دو کے سوا تیسری صورت حصول آزادی کی نہ جناح صاحب نے بتائی، نہ مسلم لیگ کی کسی تجویز میں بیان ہوئی۔

مگر مسلمانوں کو اس سے کیا بحث وہ تو اسی قسم کی ابلہ فریبیوں اور طفل تسلیوں کے عادی ہیں۔ انھیں سوانگوں میں انھوں نے ہندوستان کی حکومت کھو دی۔ انھیں تماشوں سے وہ گذشتہ بیس سال سے اپنا دل بہلاتے رہے ہیں۔ اگر مسٹر جناح اور ان کے تبعین کا بس چلے گا تو خدا نے چاہا وہ کم سے کم موجودہ نسل کی زندگی تک تو انھیں تسلیوں میں مصروف رہیں گے۔

لیگ کے ایک دلائی اور جوشیلے رکن نے ایک مفید تجویز پیش کی تھی کہ لیگ کے جملہ کارکن مسلمان پارچہ بافوں کا تیار کیا ہوا گاڑھا پہنا کریں۔ مگر مسلم لیگ کے سورما جو صرف کاغذی تجویزوں کے ذریعہ پوری آزادی حاصل کرنے والے ہیں اس قسم کی تجاویز پر غور کرنے میں اپنا وقت نہیں ضائع کر سکتے تھے۔ اس لیے [illegible] ہوئے دیا۔ حالانکہ اس تجویز پر عمل کرنے سے نہ صرف یہ نادر ہوتا کہ لیگ کے کارکنوں میں سادگی جفاکشی اور کفایت شعاری پیدا ہوتی بلکہ مسلمان پارچہ بافوں کی جو کثیر آبادی اس ملک کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہے اس کے کاروبار میں ترقی ہوتی اور اس طرح جماعتی مرفہ الحالی میں اضافہ ہوتا۔

گذشتہ اگست میں نواب مسعود جنگ سید راس مسعود نے جو مسلم یونیورسٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد سے بھوپال میں وزیر تعلیم ہوگئے تھے چند روز علالت کے بعد وہیں انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم اپنے نامور والد جسٹس محمود اور نامور تر دادا سر سید کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ کیا بلحاظ جسامت و تنومندی کے کیا بلحاظ اعلے ذہنی و دماغی قابلیتوں کے کیا بلحاظ قومی و ملکی دردمندی کے اور کیا بلحاظ خوش خلقی و شرافت کے۔ ایسی جامع الصفات ہستیاں اب ہندوستان میں مشکل ہی سے پیدا ہوں گی۔

ادب اردو سے مرحوم کو خاص شغف تھا۔ چنانچہ نظامی پریس بدایوں نے جو چند کتابیں قدرے اہتمام سے چھاپیں وہ انھیں کی توجہ و امداد کی رہین منت ہیں۔ خود بھی برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ گارسان دتاسی کے خطبات کو فرانسیسی زبان سے اردو میں منتقل کرنے کی خدمت انھیں نے شروع کی تھی۔ اس کے علاوہ خطوط سر سید، انتخاب زریں، روح سیاست اور وغیرہ کئی تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ نواب عماد الملک کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو کے صدر بنائے گئے تو انجمن کی مالی حالت کو مضبوط بنانے کیلیے سرمایہ محفوظ کی فراہمی میں ذاتی سعی سے تیس ہزار روپے سے زائد

بنام خداوند جان آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

جلد ۴۴	نومبر ۱۹۳۷ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

...چندہ سالانہ عہ

قیمت فی پرچہ ۴ر

کتب خانہ

میں حسب ذیل اُردو کتابوں کی ضرورت ہو تو ہم سے طلب فرمائیے۔ ادبی کتابوں کا اتنا عمدہ اور بڑا ذخیرہ ہندوستان بھر میں کہیں یکجا نہیں کیا گیا۔ قدردانوں کی توجہ سے ذخیرہ کو اور ترقی ہوگی۔

تاریخ ادب

- تاریخ زبان اردو
- تاریخ ادب اردو
- تاریخ نثر اردو (حصہ اول)
- تاریخ نظم و نثر اردو
- دکن میں اردو
- شعر العجم ۵ حصے
- سیر المصنفین ۲ جلد
- مرحوم دہلی کالج
- خطبات گارسن دتاسی
- شعر الہند ۲ حصے
- تاریخ ادبیات ایران
- عربی ادب کی تاریخ

ادب و شاعری

- مقدمہ شعر و شاعری
- موازنہ انیس و دبیر
- نیرنگ خیال ۲ حصے
- ایشیائی شاعری
- مباحثہ چکبست و شرر
- ہماری شاعری
- جدید اردو شاعری
- نقد الادب
- روح تنقید
- مراۃ الشعر
- مثنویات
- دو میرزا
- شرح دیوان غالب طباطبائی
- " " حسرت موہانی
- " " نظامی بدایونی
- " " آسی
- " " بیخود دہلوی
- " " سہا
- شرح کلام غالب
- غالب اور اسکی شاعری
- محاسن کلام غالب
- اقبال
- بزم خیال
- حسن خیال
- مشاطہ سخن

شعرا و مصنفین

- حیات انیس
- یادگار انیس
- حیات دبیر ۲ جلد
- یادگار نسیم
- یادگار غالب
- بہادر شاہ ظفر
- طرہ امیر
- تذکرہ رند
- حیات حالی
- حیات داغ
- حیات النذیر
- سوانح مولانا روم
- حیات سعدی
- خیام
- حیات حافظ
- حیات جامی
- حیات خسرو
- تذکرہ حزیں
- البیرونی

تذکرے

- آب حیات
- ارباب نثر اردو
- تذکرہ آب بقا
- تذکرۃ الخواتین
- تذکرہ کاملان رامپور
- تذکرہ خندہ گل
- تذکرہ مشاہیر کاکوری
- خمخانہ جاوید جلد سوم
- " " جلد چہارم
- سخن شعرا
- گل رعنا
- نگارستان فارس
- ہندو شعرا (بزبان فارسی)
- تذکرہ اردو (میر حسن)
- نکات الشعرا (میر تقی)
- چمنستان شعرا (شفیق)
- گلشن بیخار (شیفتہ)
- مخزن نکات (قائم)
- مخزن شعرا
- تذکرہ گردیزی
- تذکرہ ہندی (مصحفی)
- ریاض الفصحا "
- تذکرہ گلزار ابراہیم
- مجموعہ نغز (قاسم)

خطوط

- اردوے معلے
- عود ہندی
- ادبی خطوط غالب
- خطوط سرسید
- مکاتیب محسن الملک
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مکاتیب شبلی ۲ جلد
- خطوط اکبر
- اتالیق خطوط نویسی
- مرقع ادب ۲ جلد
- عورتوں کی انشا
- انشاے ہادی النسا
- انشاے بشیر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بنام خداوند جہاں آفریں

الناظر لکھنؤ

نمبر ۵ جلد ۴۴ — نومبر ۱۹۴۷ء

عربوں کی خانگی زندگی

(جناب پروفیسر محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے)

(بسلسلۂ گذشتہ)

عورتوں میں دینداری اور پرہیزگاری کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔ عرب عورت بھی اس جذبہ سے بیگانہ نہیں۔ جس طرح ازمنۂ وسطےٰ میں راہبات اور خانقاہوں کی دوسری رہنے والی عورتیں اپنے گرد آلود اور غلیظ حجروں میں بیٹھی ہوئی ایک دولھا کے خواب دیکھا کرتی تھیں، اور اس طریقے سے دنیوی نعمتوں اور خوشیوں کو بھول جانے کی کوشش کرتی تھیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی بعض عورتیں دنیا کو خیرباد کہہ کر ایک خدا کی محبت میں سرشار رہتی تھیں، اور اپنی راتیں نماز و استغفار میں گذارتی تھیں۔ ایسی عورتیں بھی تھیں جو علم اور خصوصاً مذہبی علوم حاصل کرنے میں مصروف ہوجاتی تھیں۔ انمیں سے بعض ایسا رتبہ حاصل کرلیتی تھیں کہ عوام انھیں شیخہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک عورت شہدہ ہے، جس کا ذکر اکثر آتا ہے، اور جس نے عالمہ و فاضلہ ہونے کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ وہ مشہور ترین اساتذہ کے درسوں میں شریک ہوئی تھی، اور ان سے خود بھی درس دینے کی اجازت لی تھی[1]۔ میرے مخطوطات کے مجموعے میں ایک نہایت ہی قدیم نسخہ ہے جس کا نام مصارع العشاق ہے۔ اس کے سرورق سے معلوم

---

[1] ابن خلکان۔ تحت: شہدہ + ابن اثیر۔ ج ۱۱۔ ص ۳۰۰ + مقری۔ ج ۲۔ ص ۷۵۷، ۸۷۷ +

ہوتا ہے کہ یہ کتاب مشہور مدرسہ ست الشہدہ کے درسوں کا مجموعہ ہے۔ ست الشہدہ کو عام طور پر فخر النساء کہتے تھے، اور اسی کے درس اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ خود شہدہ نے یہ درس ایک مشہور عالم سے سُنے تھے، اور پھر اُنھیں اپنے طالب علموں کے لیے دُھرایا تھا۔ وہ قلعہ بغداد کے قریب ایک مسجد میں جو اُس کے مکان کے پاس تھی درس دیا کرتی تھی۔ اُس کا انتقال ۵۷۴ھ (۱۱۷۸-۷۹ء) میں ہوا۔ خاتمۃ الکتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی موت سے ایک سال قبل تک برابر درس دیتی رہی۔ اسی طرح ایک اور مشہور عالمہ کا ذکر آتا ہے ان کا نام زینب تھا۔ وہ نیشاپور کے رہنے والے شاری کی بیٹی تھیں[1] اور ان کا انتقال ۶۱۵ھ (۱۲۱۸-۱۹ء) میں ہوا۔ ایک اور عالمہ تقی الدین واسطی کی بیٹی تھیں، اور ست الفقہا کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کا انتقال ۷۲۶ھ (۱۳۲۵ء) میں ہوا۔ وہ دمشق کے قلعہ کا سیون(؟) میں اپنے حجرے میں یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج پر درس دیتی تھیں۔ اس کتاب کا وہ قلمی نسخہ جو ان کے زیر نظر رہتا تھا اب تک پیرس کے مشہور مستشرق چارلس شیفر کے پاس محفوظ ہے۔

ایسی عالمہ و فاضلہ عورتیں صرف عربوں میں پیدا ہوئیں۔ ایرانیوں اور ترکوں میں ایسی مثال ایک بھی نہیں ملے گی۔ ان اقوام کی عورتوں کی قابلیت صرف شاعری تک محدود رہی اور وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ عرب عورتیں عدالتی عہدوں پر بھی فائز ہوتی تھیں۔ (فان کریمر ج ۱۔ ص ۴۲۰) +

تعجب یہ ہے کہ ابتدائی زمانے میں ایسی عورتوں کے نام بہت سننے میں آتے ہیں جو شاعرہ تھیں لیکن جلدی ہی (یعنے تقریباً دوسری اور تیسری صدی ہجری میں) شعر کہنے والی عورتوں کی تعداد یک بیک گم ہو گئی۔ یہ درست ہے کہ زمانہ مابعد میں بھی نہایت مشہور اور تربیت یافتہ عورتیں ملتی ہیں، خصوصاً کنیزکیں، جنھیں نہایت اعلےٰ تعلیم دی جاتی تھی اور جو فی البدیہ شعر کہتی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا کہ شعر و ادب میں عورتوں کا حصہ رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ صرف اندلس اس سے مستثنےٰ ہے۔ یہاں عربی تہذیب اپنے انتہائی عروج پر پہونچی۔ یہاں کی عورتوں میں شعر و شاعری کا چرچا بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے، اور ایسی عورتوں کی تعداد بھی وہاں بہت زیادہ ہے۔ ان کے اشعار انتہا درجے کے لطیف ہیں، اور ان میں عیش و عشرت اور بے فکری کی وہی شان پائی جاتی ہے جو قرطبہ اور طوائف الملوکی کے درباروں کی خصوصیت ہے۔ ان کے تمام اشعار کا موضوع یا تو حسن و عشق کے جذبات، وصل معشوق کا اشتیاق، جاے ملاقات کے تذکرے اور ہجر کے آلام و شدائد ہیں اور یا محض

[1] ابن خلکان۔ ج ۱۔ ص ۵۵۱۔

مدح۔ ان مہذب و شائستہ عورتوں میں بلاشبہ سب سے بڑا درجہ ولّادہ کا ہے، جو خوبصورت بھی تھی اور بنی امیہ کے خاندان خلافت سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا انتقال ۴۸۰ھ (۱۰۸۷ء) میں ہوا۔ اس کا باپ محمد بن عبدالرحمٰن الملقب بہ مستکفی، عبدالرحمٰن الناصر کا پوتا تھا۔ خاندانی لحاظ سے اعلیٰ مرتبت ہونے کے علاوہ اُس کی شہرت کا بڑا سبب اُس کا حسن اور اُس کی شاعری تھی۔ قرطبہ میں اُس کا محل، جہاں اُس کے باپ نے سولہ مہینے خلافت بھی کی تھی، شعرا، علما و فضلا کا مرکز تھا۔ یہاں عمائد شہر اس کے رحم و کرم کے طلبگار رہتے تھے، اور اُس کی خدمت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ مگر عام حسین عورتوں کی طرح وہ بھی متلون المزاج تھی۔ وہ اپنی زندگی کے رویہ کو پراسرار بنانے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھی۔ اُس کے اشعار میں اکثر ایسے خیالات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرطبہ کے اعلیٰ طبقہ میں عصمت و عفت کو وہی درجہ حاصل تھا جو آج کل ہم عام طور پر یورپ میں دیکھ رہے ہیں۔ ولّادہ کی صاف گوئی کا مقابلہ کرنے والی اگر کوئی عورت تھی تو "مُغنا" (؟) تھی، جو قرطبہ کی سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ لااُبالی عورت مانی جاتی تھی[1]۔ اسی وجہ سے اُس کے اکثر اشعار کا نقل کرنا بھی مشکل ہے۔ اس عورت اور اُس کے زمانہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے عمر بھر شادی نہیں کی، لیکن دل بہلانے کا سامان ہمیشہ مہیا رکھا۔ اپنے عشاق میں ایک کے پاس اُس نے حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے :۔

"جب شام کی تاریکی ہر طرف اپنا سکہ جما لے تو میرا انتظار کرو۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ رات کی تاریکی راز پوشیدہ رکھتی ہے۔ اگر سورج کو میری تڑپ کی خبر ہوتی تو نہ وہ نکلتا، نہ چاند اپنا مُنھ دکھاتا اور نہ ستارے رات کو آسمان پر چمکتے نظر آتے[2]"

اس خود رائے اور عاقل و فرزانہ عورت کے مقابلے میں مشرق صرف عُلیہ کو پیش کرتا ہے۔ وہ ایک کنیز کے بطن سے خلیفہ مہدی کی بیٹی، اور خلیفہ ہارون الرشید کی سوتیلی بہن تھی۔ موسیقی اُسے اپنی ماں سے ورثہ میں ملی تھی، مگر شاعری میں بھی اُس نے وہی نام پیدا کیا جو موسیقی میں۔ بہر حال عُلیہ موسیقی میں بے نظیر سمجھی جاتی تھی۔ وہ اپنے اشعار خود ہی موسیقی کے لیے تیار کرتی تھی اور خود ہی گاتی تھی۔ چنانچہ اُس کے گیت مدتوں تک لوگوں کے زبان زد رہے۔ اُس کی بذلہ سنجی اور دل خوش کن حرکات و سکنات نے مدتوں تک خلیفہ کے دربار کو متوالا بنائے رکھا، یہاں تک کہ کچھ عرصہ تک سیاسیات پر بھی اُس کا کافی اثر رہا۔ اُس کی پیشانی پر ایک خال تھا، جس سے اُس کے حسن میں نقص آتا تھا۔ اسے چھپانے کے لیے اُس نے

---

[1] مقری۔ ج ۲۔ ص ۱۱۴۴ (؟) [2] مقری۔ ج ۲۔ ص ۵۶۴

ایک خاص قسم کا مرصع جھومر ایجاد کیا، جس سے اُس کا حُسن دوبالا ہوگیا۔ یہ جھومر اس قدر مقبول ہوا کہ اعلےٰ طبقے کی عورتیں اسے استعمال کرنے لگیں۔ ہم پہلے ہی اس طبقے کی عورتوں کے حالات بہت کچھ پڑھ چکے ہیں۔ انھیں دیکھتے یہ کچھ تعجب خیز امر نہیں کہ عُلیہ بھی اُسی قماش کی عورت تھی۔ اُس کے حُسن وعشق کے قصے تاریخوں میں منقول ہیں۔ خلیفہ ہارون کے ایک غلام طل نامی پر عُلیہ جان دیتی تھی۔ اور اُس سے ملاقات کے لیے اتنی بے چین رہتی تھی کہ اُس نے ایک مرتبہ محل شاہی کے ایک خطرناک راستے سے بھی اُس کے پاس جانے میں تامل نہیں کیا۔ اُس نے اس واقعہ کا ذکر ایک نظم میں کیا ہے، جس میں کہتی ہے:

"اے طل تیرے فراق میں میں نے اب کافی صعوبتیں برداشت کیں، اور تیرے پاس آنے میں میں نے اُس خطرناک راستہ کی بھی پرواہ نہ کی جس میں جان جانے کا اندیشہ تھا[1]"

لیکن خلیفہ ہارون کو اس معاملے کی خبر ہوگئی۔ اُس نے رکاوٹیں پیدا کیں، اور بالآخر ان دونوں کی ملاقاتیں نہ صرف بالکل بند کردیں، بلکہ عُلیہ کو طلّ کا نام لینے کی بھی ممانعت کردی۔ لیکن یہ ممانعت بہت دن تک نہ رہی، کیونکہ دنیا کا کوئی شخص، خواہ وہ خلیفہ ہارون الرشید ہی کیوں نہ ہو، اس شوخ وشنگ کی دلربایانہ حرکات سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عُلیہ نے شادی کرلی تھی۔ مگر یہ پابندی بھی اُس کی زندگی پر کوئی اثر پیدا نہ کرسکی۔ اور اُس کا رد یہ آخر وقت تک نہ بدلا۔ وہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کی بھی کوشش نہ کرتی تھی۔ کیونکہ اُس کے یہ اقوال نقل کیے گئے ہیں: "وہ شخص جو صبح کو اُٹھے اور اُس کے گھر سوائے سوکھی روٹی کے ایک ٹکڑے کے اور کچھ نہ ہو، اور چاشنت بھی نہ کھاسکے اُسے چاہیے کہ وہ شیطان سے دوستی کرے" یا "جو رل گیت کا لطف نہیں اُٹھا سکتا وہ ایسا بے حس ہے جیسا کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا۔" عُلیہ کا انتقال سنہ ۲۱۰ھ میں ہوا۔

عُلیہ کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ہی ہماری نظر مشرقی حرم کی زندگی کے ایک اور پہلو پر پڑتی ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ ان میں غلاموں اور کنیزوں کے تعلقات کیا ہوتے تھے؟ جیسا کہ بغداد کی درباری زندگی کے حالات میں ہم بیان کرچکے ہیں، اُس زمانے کے مقتدر اور بااثر عمائد کے گھرانوں میں کنیزوں اور غلاموں کی تعداد سیکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہونچتی تھی[2] یہ ناممکن ہے کہ مرد وعورت کی اتنی بڑی تعداد یک جا رہنے اور ان میں باوجود ہر طرح کی احتیاط کے، میل جول کے موقعے پیدا نہ ہوں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اُس زمانے میں مشرق میں بھی اس قسم کے معاملات میں اتنی احتیاط نہیں برتی جاتی تھی جتنی آج کل نظر آتی ہے۔

[1] اغانی۔ ج ۲۔ ص ۸۳۔ ۹۵ + نوات۔ ج ۲۔ ص ۱۲۲ +

[2] خلیفہ مقتدر کے محل میں خواجہ سراؤں کی تعداد گیارہ ہزار بیان کی گئی ہے یونانی اور فرنگی لونڈیاں اسکے علاوہ تھیں۔ تغری بردی۔ ج ۱۔ ص ۲۴۸۔

کیونکہ عربی تمدن کے انتہائے عروج کے زمانے میں معاشرت ایک حد تک مخلوط تھی، یا کم از کم موجودہ زمانے کے اسلامی ممالک کے مقابلے میں میل جول کی آزادی بہت زیادہ تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب حرم کی زندگی اختیار کر لی گئی ہے اور عورتیں بالکل قیدی بنا دی گئی ہیں تو یہ آزادیاں بالکل ختم ہوئی ہیں۔ جب عُلیہ جیسی عورت، ایک خلیفہ کی بیٹی ہونے کے باوجود، اپنے ایک غلام سے تعلقات پیدا کر سکتی ہو تو غور کیا جا سکتا ہے کہ ایسے گھرانوں کے بے شمار نوجوان غلاموں اور لونڈیوں کو کہاں تک پارسایانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا[1]۔ اس میں شبہ ہی نہیں کہ جنسی تعلقات ان میں ضرور پیدا ہوتے تھے۔ بہت سے مصنفوں نے اس قسم کے مختلف قصے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ مشہور ادیب و فلسفی، جاحظ نے بیان کیا ہے کہ "میں محمد بن ابراہیم کے ساتھ، اسی کے بجرے میں، سامرہ سے بغداد جا رہا تھا۔ ابھی ہم نے لنگر اُٹھایا ہی تھا کہ محمد بن ابراہیم کے حکم سے عرشہ کے پردے گرا دیے گئے۔ پھر اُس نے حکم دیا کہ وہ لونڈیاں جو بجرے میں اُس کے ساتھ تھیں ساز کے ساتھ گائیں۔ ایک نے یہ شعر ستار پر گانا شروع کیا:-

> "میں رحم کی درخواست کرتی ہوں اُن عاشق و معشوق کے لیے جو کوئی مشفق اور دوست نہ رکھتے ہوں۔
> وہ کب تک ایک دوسرے سے الگ رہیں، ہجر و فراق کی صعوبتیں برداشت کریں، اور خاموشی سے اپنے درد دل کو سہے جائیں۔"

جب اُس نے گانا ختم کیا تو ایک لونڈی نے ہنس کر پوچھا کہ "یہ بتاؤ کہ اس حالت میں آخر عاشق و معشوق کا چارہ کار کیا ہے؟" اس کے جواب میں مغنیہ نے جواب دیا "یہ کریں" اور اچانک پردہ اُٹھا کر دریا میں کود پڑی۔ آقا کے پاس ایک نوجوان غلام کھڑا ہوا کھیا اُڑا رہا تھا۔ وہ حسن مردانہ میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ جب اُس نے کنیز کو دریا میں ڈوبتے دیکھا تو وہ بھی آگے بڑھا اور دریا میں چھلانگ ماری، جہاں عاشق و معشوق اب ایسے ملے کہ کبھی نہ بچھڑیں گے[2]۔

---

[1] ہاٹٹ لینڈ نے اپنی کتاب اگری کولا (ص ۲۶۸) میں بیان کیا ہے کہ رومۃ الکبریٰ میں بھی غلام ان جنسی تعلقات کی وجہ سے اکثر طرح طرح کے آلام و مصائب میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ قانوناً کچھ اجرت مقررہ دے کر انھیں لونڈیوں سے معاشرت کی اجازت دی گئی تھی۔ (حاشیہ صلاح الدین خدا بخش مرحوم)۔

[2] مسعودی۔ ج ۷۔ ص ۲۲۴۔ اُس زمانے کے خاص حالات کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ قدیم ترین مورخ جس نے یہ قصہ بیان کیا ہے لکھتا ہے کہ اس واقعے سے آقا کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ اسی حکایت کو ایک صدی بعد ایک مصنف نے بیان کیا ہے، اور لکھا ہے کہ جب ملاحوں نے اُس لونڈی کی جان بچانے کی کوشش کی تو آقا نے خفا ہو کر کہا کہ "ڈوبنے دو کمبخت کو۔ خدا کی اُس پر لعنت ہو۔" (مصارع۔ قلمی نسخہ ورق ۳۱) ان دونوں بیانوں کے مقابلے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی تباہی کے ساتھ لوگ کس قدر شقی القلب ہو گئے تھے۔

اسی نوعیت کی اور بہت سی حکایتیں بیان ہوئی ہیں۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حرم میں معاشقہ کے موقع ہر وقت موجود تھے؛ مگر افسوس ہے کہ اُن کا انجام اکثر بُرا ہوتا تھا۔ غلام اور لونڈی کے تعلقات معلوم کرکے صاحب خانہ غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا تھا، اور بالعموم دونوں کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ شاذ ونادر ہی ان قصوں کا انجام خوشی پر ہوتا تھا جیساکہ اس حکایت سے ظاہر ہوگا۔ خلیفہ مہدی کو ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ اُس کی ایک لونڈی ایک نوجوان سے ملتی جلتی ہے۔ یہ سُن کر خلیفہ نے کسی کو اس لونڈی کے کمرے میں بھیجا۔ وہاں ایک نوجوان پکڑا گیا۔ اُسے خلیفہ کے سامنے حاضر کیا گیا، اور حسب ذیل حالات کا انکشاف ہوا۔ یہ لونڈی پہلے مہدی کی والدہ کے پاس تھی، اور وہیں اُسے اس غلام سے محبت ہوئی تھی۔ پھر وہ خلیفہ کے حرم کے لیے خریدی گئی۔ یہاں بھی وہ نوجوان اپنی جان پر کھیل کر اُس سے ملتا رہا، کیونکہ اُس کے بغیر غلام کی زندگی اجیرن تھی، اور موت کو ہجر پر ترجیح دیتا تھا۔ یہ باتیں سُن کر خلیفہ نے حکم دیا کہ غلام کو بیس درے لگائے جائیں۔ لیکن اُس نے یہ سزا نہایت خودداری سے برداشت کی، اور جب سزا مل چکی تو صرف یہ کہا کہ "جب تک میں زندہ ہوں اپنی محبت سے باز نہیں آؤں گا۔" اب مہدی غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ اُس نے جلاد کو بُلا یا۔ اس کا بھی کوئی اثر جوان پر نہ ہوا۔ وہ بلا تامل نطع پر بیٹھ گیا، اور جلاد کے وار کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اس حالت میں خلیفہ کی طرف مخاطب ہوا، اور لونڈی سے ایک بات کرنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر اُس نے ایک شعر پڑھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ "وہ ہرگز اپنی محبت سے منھ نہ موڑے گا خواہ اُسے دُرے لگائے جائیں؛ خواہ جلاد اُسے قتل کر ڈالے" یہ سُن کر مہدی تھوڑی دیر سکتے میں آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اُس نے حکم دیا کہ وہ جوان لونڈی کو لے کر محل سے نکل جائے، اور دونوں جہاں جی چاہے چلے جائیں[1]۔

لیکن ایسی عنایت ومرحمت الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک مرتبہ غیرت کا جذبہ برانگیختہ ہو جائے تو عرب آنکھ جھپکتے بدترین قسم کے انتقام پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ ایسی صورت میں لونڈی کی جان کی خیر نہیں رہتی تھی۔ فقیہوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ مسلمان غلام کی جان بھی ویسی ہی قیمتی ہے، جیسی مسلمان آزاد آدمی کی۔ لیکن ان نظریوں کی بہت ہی کم پرواہ کی جاتی تھی۔ خاصکر حرم کی چار دیواری کے اندر، دنیا و مافیہا سے الگ تھلگ، اور پولیس کے حدِ اقتدار سے باہر، جہاں مطلق العنان مالک اور مالکہ حرم پر حکمراں ہوں، یہ نظریے بالکل کام نہ دیتے تھے، اور آقا اپنے غلاموں اور لونڈیوں کی زندگی کا پورا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ سوانح نویسوں نے ایک شاعر کا ذکر کیا ہے،

[1] مسارع۔ ورق ۴۸ (۲) +

جو اپنی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے ویک الجن کہلاتا ہے۔ اس نے غصہ و غیرت کی حالت میں اپنی ایک لونڈی کو اس شبہ میں قتل کر ڈالا کہ گھر کے ایک نوکر کے ساتھ اُس کے تعلقات تھے۔ لیکن قتل کا ارتکاب کرنے کے بعد اُسے ایسی شہادتیں ملیں، جن سے معلوم ہوا کہ غریب لونڈی بالکل بے گناہ تھی۔ اُس نے قتل کے بعد جفا سے توبہ کی، اور پھر اس معصومہ کے متعدد مرثیہ کہے جو بہت جلد زباں زد ہو گئے[۱]۔

اس طرح کی خونی کارروائیاں حرم کی چار دیواری کے اندر خفیہ طور پر اکثر ہوتی رہتی تھیں، اور بہت سے نوجوان مرد و عورت کا خاتمہ نہایت بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہوتا تھا۔ لیکن بیرونی دنیا کو اس کا علم نہ تھا، اور نہ علم کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔

حرم کی زندگی کا ایک اور نہایت ہی مذموم اور کریہہ منظر ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اور تمام معائب نے معاشرہ کو اتنا خراب اور اخلاق کو اتنا پست نہیں کیا جتنا کہ اس عیب نے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی ایک جرم نے رفتہ رفتہ اُس زمانے میں ایشیا کی خانگی زندگی کو گھن کی طرح کھایا، اور اخلاق و آداب کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ ہمارا مطلب خلاف فطری عشق و محبت سے ہے۔ اس جرم نے بھی حرم ہی میں نشو و نما پائی تھی۔ امیروں اور خوش باش لوگوں کے گھروں میں سیکڑوں نوجوان یکجا زندگی بسر کرتے تھے۔ ان گھرانوں میں دولتمندوں کے لیے عیش و عشرت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن جتنی انھیں آزادیاں حاصل تھیں اتنی ہی ان کے وابستگان کے لیے پابندیاں اور قیدیں تھیں ذرا سی بدعنوانی بھی بدترین سزا کی مستوجب سمجھی جاتی تھی، حالانکہ اُسی گھر کے اعلےٰ طبقے میں اخلاقی پستی حد کو پہونچی ہوئی تھی۔ اس طبقے میں نہ زبان کو لگام تھی، اور نہ اعمال و افعال پر پابندیاں تھیں۔ حکمراں طبقہ تو ان سب پر بازی لے گیا تھا۔ ان پابندیوں کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ایک ہی جنس میں تعلقات پیدا ہوں، تاکہ سزاؤں سے تو نجات مل جائے۔ یہ تو غلاموں کی کیفیت ہوئی۔ اعلےٰ طبقے نے یہ لعنت اس وجہ سے خریدی کہ انھیں حرم کی عیاشیوں اور اوباشیوں سے سیر ہو کر دل بہلانے کے دوسرے ذرائع کی تلاش ہوئی اور صرف یہی دکھائی دیا کہ اس غیر فطری جرم کے ارتکاب سے ہوا و ہوس کی آگ بجھائیں۔ اس عیب سے شروع میں عرب قوم بالکل ناواقف تھی۔ لیکن اب اُس نے اعلےٰ اور ادنیٰ آبادی کے ہر طبقہ کو سرطان کی طرح کھا لیا، اور تمام قوم میں اُس کا زہریلا اثر سرایت کر گیا۔ مشہور فلسفی مورخ ابن خلدون نے اس پر بحث کی ہے، اور اس کے تمام خراب نتائج تفصیل سے بیان کیے ہیں[۲]۔

---

[۱] ابن خلکان: تذکرہ دیک الجن۔

[۲] مقدمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۰۵۔

عرب چونکہ اس سے نا واقف تھے اس لیے ابتدائی زمانے میں یہ جرم سرعت سے نہیں پھیلا[51]۔ لیکن جب بالخصوص عہد عباسیہ میں، عجمیوں سے میل جول بڑھا، اور ایرانی اوضاع و اطوار عربی معاشرہ کے اعلٰے طبقے میں زیادہ مقبول ہو گئے تو یہ مذموم عادت بھی جڑ پکڑتی چلی گئی۔ کیونکہ قدیم زمانے ہی میں اہل ایران و اہل میدیا اس بداطواری میں مشہور رہے تھے۔ مامون کے عہد میں ایک نظم شائع ہوئی اور عوام کے ہاتھوں تک پہونچی: "ہمارا بادشاہ راشی ہے، اور ہمارا قاضی لواطت کے مرض میں مبتلا ہے۔ ہماری حکومت بھی کیا ہی بے غیرت ہے۔ زانی کو قاضی سزا دیتا ہے، لیکن جو لواطت میں مبتلا ہو اُس سے باز پرس نہیں کرتا ——— میرا خیال ہے کہ جب تک عباسی زندہ ہیں یہ خرابی کبھی دور نہ ہو گی[52]"

خلیفہ نے اس منہ پھٹ شاعر کو ہندوستان جلا وطن کر دیا۔ گرچہ الزام اُس نے لگایا تھا وہ غلط نہ تھا کیونکہ خود خلیفہ کا ایک ممتاز ندیم، یحیٰی بن اکثم، جو عرصہ تک بصرہ کا قاضی رہا تھا، اُس کی بداطواری شہرۂ آفاق ہو چکی تھی۔ اس نظم میں جس قاضی کی طرف اشارہ ہے، وہ یہی یحیٰی بن اکثم ہے۔ اس نے بصرہ میں اپنی اس بداطواری کا اس بے شرمی اور بے حیائی سے مظاہرہ کیا کہ آخر وہاں کے باشندوں نے اُس کے خلاف ایک عرضداشت دربار خلافت میں پیش کی۔ اس درخواست کا اثر یہ ہوا کہ یحیٰی بصرہ سے تو معزول کیا گیا، لیکن خلیفہ کے ندمائے خاص میں شریک ہو گیا، اور اُس کی عزت پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ اس کے بعد خلیفہ نے اسی یحیٰی کو نوجوانوں کی ایک جماعت بھرتی کرنے کا حکم دیا، جو خلیفہ کے احکام ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کریں۔ یحیٰی نے چار سو نوخیز لڑکے بھرتی کیے، اور ان کی وجہ سے ہمیشہ بدنام رہا[53]۔ مگر یاد رہے کہ یحیٰی ان خراسانی عربوں میں سے تھا، جنھوں نے عجمی اوضاع و اطوار اختیار کر لیے تھے، جو اب مامون کے دربار میں برسر اقتدار تھے، اصلی عربوں پر غالب آ گئے تھے، اور ایرانی معاشرت کے معائب اپنے ساتھ دربار خلافت میں لائے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اس جرم پر سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ امام مالک کی رائے ہے کہ ایسا شخص صرف سنگساری کی سزا کا مستوجب ہو سکتا ہے، اور امام شافعی اُن سے متفق ہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے اس جرم کو غالباً زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا اور صرف درّے لگانا کافی سمجھا[54]۔ بہرحال اتنا یقینی ہے کہ دربار بغداد میں، خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں یہ عیب خوب پھیل چکا تھا اور بداخلاقی کی یہ حالت

---

[51] کتاب الموشہ کے مصنف نے بیان کیا ہے (ورق ۱۰۲) کہ مجھے کسی ایک عرب شاعر کا حال معلوم نہیں جس نے عورتوں کے سوا کسی اور کی تعریف اپنے اشعار میں کی ہو۔ [52] مسعودی۔ ج ۷۔ ص ۴۶۔ [53] مسعودی۔ ج ۷۔ ص ۴۷۔

[54] ابن خلدون۔ مقدمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۰۵۔ اور قابل مترجم مقدمہ کا ایک حاشیہ۔

ہو گئی تھی کہ علانیہ طور پر اس کا مظاہرہ کیا جاتا تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسے عیب سمجھا ہی نہ جاتا تھا۔ اس زمانے کے درباری شاعر ابو نواس کا دیوان اس کا شاہد ہے۔ اُس نے بلا پس وپیش اپنی بداطواری کے تذکرے کیے ہیں اور امردوں کی تعریف سے گیت گائے ہیں۔ ہارون الرشید اس عیب سے پاک تھا۔ لیکن اُس کے بیٹوں نے یہ کمی پوری کردی۔[۵۱] امین کے پاس ایک غلام یسر نامی تھا۔ اُس کے سوتیلے بھائی نے یسر کے ساتھ تعلقات بڑھانے شروع کیے۔ مگر یسر کے مالک کی "غیرت" نے یہ گوارا نہ کیا۔ اُس نے اپنے معشوق کو عورتوں کی طرح حرم کی چار دیواری میں بند کر دیا، اور جب کبھی وہ باہر جاتا تو نگہبان اُس کے ساتھ لگے رہتے۔[۵۲]

اس قماش کے لڑکے اپنی ظاہری حرکات وسکنات سے پہچانے جاسکتے تھے۔ وہ عورتوں کی چال ڈھال اختیار کر لیتے تھے، اور عموماً زرد رنگ کے پھولدار کپڑے پہنتے تھے ....

بہرکیف اس واقعے سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب سے عورتوں کی قدیم عزت وتوقیر میں کمی آئی بداخلاقی اور بداطواری بڑھتی چلی گئی، اور خانگی زندگی بلکہ تمام معاشرہ گندگی میں پھنستا چلا گیا۔

تعلیم وتعلم بھی نہ خانگی زندگی کی برائیوں کو روک سکے اور نہ معاشرہ کو صحیح راستہ پر چلا سکے۔ کیونکہ یہ چیز بالکل سطحی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اسلام نے علم وفن کی اشاعت میں بالعموم بڑا حصہ لیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ قدیم یونان وروما سے بھی بہت آگے بڑھ گیا تھا، ابتدائی مسیحیت کا تو ذکر کرنا ہی اس ضمن میں بیکار ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسلام نے آبادی کے ہر طبقہ کو علم کی نعمت سے مالا مال کر دیا تھا۔ ابتدا میں اسلام کی جمہوریت پسندی کی وجہ سے ضروری تھا کہ ہر فرد وبشر بلا امتیاز خواہ وہ کسی طبقے کا ہو، قرآن پاک کی تعلیم سے بہرہ ور ہو۔ اس عمومیت سے نہ عورتیں مستثنیٰ تھیں نہ غلام، کیونکہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق نجات اخروی کا دروازہ کسی کے لیے بند نہیں، اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی نجات کا راستہ خود ہی تلاش کرے۔

اس کے علاوہ جب مسلمانوں نے بیرونی ممالک فتح کیے تو بے شمار غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ضروری تھا کہ قرآن پاک کی تعلیم سے انھیں بھی مستفید کیا جائے، اور اُسے حاصل کرنا جہاں تک ہوسکے آسان کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر اسلام ہی میں ابتدائی مدارس نہ صرف شام وعراق بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں قائم ہوگئے۔ صوبۂ عراق کا مشہور حاکم، اور عہد اموی کا زبردست مدبر، حجاج بن یوسف اپنی سیاسی زندگی شروع کرنے سے قبل، حجاز میں مکہ کے قریب طائف کے کوہستانی شہر میں معلمی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ مشہور سپہ سالار ابومسلم، جسے عربوں کا ولین سٹائن کہنا چاہیے، اور جس کا انجام

[۵۱] اغانی۔ ج ۶۔ ص ۲۹۷ +　[۵۲] اغانی۔ ج ۶۔ ص ۲۰۸ +

بہت بڑا ہوا۔ اسلامی سلطنت کے بعید ترین شمال مشرقی صوبہ خراسان کے ایک مدرسہ کا پڑھا ہوا تھا۔ دوسری صدی ہجری میں ایران کے شہر تستر میں ایک مدرسہ تھا۔ اس میں بچوں کی باقاعدہ حاضری لازمی تھی۔ چنانچہ ایک صوفی، جو بعد کے زمانے میں بہت مشہور ہوئے، بچپن میں اسی مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے۔ انھیں مدرسہ سے اٹھانے کے لیے خاص طور پر اساتذہ سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ اس مدرسہ کے حالات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بچے چھ برس کی عمر سے مدرسے جانا شروع کرتے تھے۔ مدرسوں سے غریب لوگوں کے بچے بھی پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ غلاموں کے لیے بھی مدرسوں کے دروازے بند نہ تھے۔ اور لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ غلاموں کی بچیوں کو آقا اپنے خرچ سے مدرسے بھیجتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ طلبہ کو جملہ ضروریات زندگی بھی مدرسہ کی جانب سے مہیا کی جاتی تھیں[1]۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لڑکیوں کی تعلیم ناقص تھی۔ جب عورتوں کی معاشری حالت پست ہوئی تو یہ خیال بھی دلوں میں جڑ پکڑتا گیا کہ تعلیم عورتوں کے لیے خرابی کا باعث ہوتی ہے۔ ابوالعلاء المعری اپنی ایک فلسفیانہ نظم میں کہتا ہے کہ: لڑکیوں کو کاتنا بُننا اور سوزن کاری سکھاؤ۔ لیکن لکھنے پڑھنے سے انھیں باز رکھو[2]۔

بچوں کی ابتدائی تعلیم بالعموم صرف لکھنا پڑھنا سیکھنے تک محدود تھی۔ سب سے زیادہ ضروری یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرآن شریف پڑھا دیا جائے، تاکہ بچے تمام مذہبی فرائض ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ انھیں چند سورتیں بھی حفظ کرائی جاتی تھیں۔ ذہین بچے پورا قرآن شریف حفظ کر لیتے تھے۔ ختم قرآن پر خاندان میں بڑی خوشیاں منائی جاتی تھیں، اور خوب دعوتیں ہوتی تھیں۔ یہ رسم اسلامی ایشیا میں اب تک جاری ہے۔ اس تعلیم کے ساتھ، جس میں زیادہ زور رٹنے پر پڑتا تھا، لکھنا بھی سکھا دیا جاتا تھا۔ فن تحریر ابتدائی عہد میں ہی اسلامی مدارس کی وجہ سے بہت عام ہو گیا تھا۔

اس مختصر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد خلافت میں تعلیم عام تھی؛ ہر شخص، چھوٹا بڑا، آقا اور غلام، لڑکے اور لڑکیاں، سب اس سے مستفید ہو رہے تھے۔ لیکن اس میں بڑا نقص یہ تھا کہ معاشرہ میں جو خرابیاں پڑ گئیں تھیں، اور بڑھتی جا رہی تھیں، اس تعلیم کے ذریعے انھیں روکنا ناممکن تھا، اور رسم و رواج میں جو خرابیاں پڑ گئی تھیں ان کی روک تھام بھی ان سے نہ ہوتی تھی ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا نقص یہ تھا کہ ان ابتدائی مدارس کے اساتذہ نے اپنے شاگردوں میں کبھی علوہمتی اور

[1] اغانی۔ ج ۱۴۔ ص ۱۵۰ [2] لزومیات۔

بلند خیالی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ صرف اتنی بات پیش نظر رکھی کہ بچے لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں، اور قرآن شریف پڑھ لیں یا حفظ کر لیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ کی ان سے توقع بھی نہ تھی۔ کیونکہ ان کی تنخواہیں کم تھیں، اور معاشرے میں بھی انھیں اونچا درجہ حاصل نہ تھا۔ بالعموم انھیں ماہانہ تنخواہ نہیں ملتی تھی، بلکہ ان کا گذارا شاگردوں کے والدین کے عطیات پر تھا، جو اکثر خوراک کی صورت میں ملتا تھا[1]۔

تعلیم کے متعلق حضرت عمرؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ لڑکوں کو شناوری، تیراندازی اور شہسواری سکھانی چاہیے۔ شاعری کی تعلیم بھی ہونی چاہیے مگر صرف زبانی۔ لڑکیوں کے متعلق آپ کا قول تھا کہ ان کی تعلیم و تربیت صرف چرخہ کاتنے تک محدود رہنی چاہیے[2]۔ لیکن یقین نہیں آتا کہ یہ قول حضرت عمرؓ ہی کا ہو، اور وہ ایسے ملک میں شناوری کی تعلیم پر زور دیں جہاں سمندر تو کجا، کوئی بڑا دریا بھی موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ حکایت بصرہ، کوفہ یا بغداد میں گھڑی گئی ہو، جو لسانیت کے بڑے مرکز تھے، اور جہاں کے علما قدیم عربی شاعری میں تبدیلیاں کر رہے تھے، اور ہر قسم کے افسانے گھڑنے میں مشاق تھے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عہد خلافت میں نوجوانوں کی تعلیم کے صحیح خیالات بالکل ہی مفقود تھے۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنے بیٹوں کے استاد کو ہدایت کی تھی کہ وہ انھیں قرآن شریف پڑھائے؛ ادنیٰ ترین طبقے سے میل جول پیدا کرنے سے روکے؛ انھیں زیادہ تر گوشت کھلائے، کیونکہ وہ مقوی ہوتا ہے؛ قدیم شاعری کی تعلیم دے؛ اس کا خیال رکھے کہ وہ منھ اور دانت صاف رکھیں؛ اگر سزا دینے کی ضرورت ہو تو تنہائی میں سزا دے، تاکہ بچے نوکروں کی نظروں میں ذلیل نہ ہوں[3]۔

آئندہ ہم اس بات پر غور کریں گے کہ تعلیم و تعلم کے اس طریقے کا اثر عوام کے خصائل پر کیا پڑا تھا۔ بہرکیف اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ خانگی زندگی میں جو انحطاط شروع ہو گیا تھا، اور حرم کے جو بُرے اثرات پڑ رہے تھے، اور اخلاق جس طرح خراب ہوتے جا رہے تھے، انھیں کم کرنے یا روکنے میں اس تعلیم سے کوئی مدد نہیں ملی۔

---

[1] کامل مبرد۔ ص ۲۹۱　[2] مبرد۔ کامل۔ ص ۱۵۰　[3] ابن حمدون۔ ج ۱۔ ورق ۲۱۶

نیاز کی جرأتِ بیجا

(جناب منشی نانک چند سریواستو صاحب عشرت ایم۔اے، منشی فاضل)

(بسلسلۂ الناظر ماہ مئی و جون ۳۷ء)

شعر مع فقرہ | وہ ازل سے تا ابد ہنگامۂ محشر بپا میں ادھر خاموش اک آفتِ ادا کے سامنے

اعتراض نیاز | شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی خاص وقت کا منظر پیش کر رہا ہے جس کی تصدیق (ہنگامۂ محشر) سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن پہلے مصرعہ میں "ازل سے تا ابد" کہہ کر اس تعین کو مٹا دیا گیا ہے۔ گویا مقصود محشر کا بیان نہیں ہے بلکہ ازل سے ابد تک کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس لیے دونوں صورتوں میں انداز بیان بدلنا ضروری ہے۔

عرض عشرت | آپ دونوں مصرعوں کو الگ الگ پڑھتے ہیں اور مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں۔ دو مصرعے مل کر شعر ہوتے ہیں۔ دونوں کو ملا کے مفہوم نکالنا چاہیے۔ اس شعر میں کسی ایک وقت کا منظر پیش نہیں کیا گیا ہے "گوشت و پوست والی معشوقہ" کے سامنے کوئی ازل سے ابد تک خاموش نہیں رہ سکتا۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ حسن حقیقی یعنی خدا نے ازل سے ابد تک ایک ہنگامہ بپا کر رکھا ہے جو ہنگامۂ محشر سے کسی طرح کم نہیں ہے مگر انسان (یعنے میں) اُس آفت ادا معشوق حقیقی کے سامنے خاموش ہے کہ جو اُسکی مرضی ہو وہ کرے۔

شعر مع فقرہ | کامیاب شوق کی ناکامیوں کو دیکھیے حرفِ مطلب محو ہے جوشِ دعا کے سامنے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں دو حالتیں ظاہر کی گئی ہیں۔ ایک "شوق کی کامیابی" اور اسی کے ساتھ اسکی "ناکامی" اور اس لئے اصولاً دوسرے مصرعہ میں ان دونوں باتوں کو ثابت کرنا چاہیے تھا۔ دوسرے مصرعے میں دو چیزیں پیش کی گئیں ہیں "حرف مطلب کا محو ہوجانا" اور "جوش دعا" لیکن پہلے مصرعہ سے ان کا تعلق ظاہر نہیں ہوتا اور شوق کی کامیابی کے ساتھ ہی اس کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ حرف مطلب ادا ہونے سے پہلے ہی "جوش دعا" شروع ہوگیا اور دل کی بات زبان سے ظاہر نہ ہوسکی۔

عرض عشرت | آپ شعر کو بالکل نہیں سمجھے۔ اسی لیے نہ آپ کو دوسرے مصرعہ میں کامیابی۔ ناکامیابی دونوں کا ثبوت ملا اور نہ پہلے مصرعہ سے دوسرے مصرعہ کا تعلق سمجھ میں آیا۔ مفہوم شعر یہ ہے۔ عاشق اپنے شوق میں کامیاب ہے یعنے اُس کا شوق پورا ہو رہا ہے۔ عاشق کا شوق عبادت پورا ہو رہا ہے اس لیے جوش دعا کی فراوانی ہے۔ مگر عاشق کا مقصد معشوق سے ہمیشہ کے لیے مل جانا ہے۔ اس مقصد میں وہ

ناکامیاب ہے کیونکہ حرف مقصد جوش دعا میں گم ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان جوش میں آتا ہے تو اکثر مطلب کی بات بھول جاتا ہے۔

شعر اصغر | خود جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں "جلوۂ بے رنگ" کا اقتضا یہ تھا کہ "صورت" کا وجود ہی سرے سے غائب ہو جاتا۔ حالانکہ دوسرے مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "صورت" تو سامنے موجود ہے لیکن پہچان نہیں سکتے۔ اس لیے اگر بجائے "جلوۂ بے رنگ" کے "جلوۂ نیرنگ" کہتے تو زیادہ موزوں تھا۔ اس طرح معنے یہ ہوتے کہ نیرنگیٔ جمال کا یہ عالم ہے کہ وہی صورت جس کو کسی وقت پہچانتے تھے اب شناخت نہیں ہو سکتی۔

عرض عشرت | آپ لکھتے ہیں کہ "جلوۂ بے رنگ" کا اقتضا یہ تھا کہ صورت کا وجود سرے سے غائب ہو جاتا" کیوں؟ اس کی کوئی توجیہ نہیں پیش کی جس پر غور کیا جائے حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جلوہ صورت سے پیدا ہوتا ہے چاہے وہ بارنگ ہو یا بے رنگ۔ شاید آپ کا کوئی نیا فلسفہ ہو جس میں صورت سے جلوہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔ مگر تمام عالم کا یہ روزانہ مشاہدہ ہے کہ صورت سے جلوہ پیدا ہوتا ہے اسی غلط فلسفہ کی بنا پر آپ نے اصلاح دی ہے کہ بجائے "جلوۂ بے رنگ" کے "جلوۂ نیرنگ" ہونا چاہیے۔ جس سے مفہوم شاعر یک لخت برباد ہو گیا۔ آپ "جلوہ نیرنگ"، "نیرنگیٔ جمال" کا مفہوم نکالتے ہیں مگر یہ مفہوم اس ترکیب سے قطعی نہیں نکلتا۔ ابھی تک میں سمجھتا تھا کہ جو دوسرے لوگ لکھتے ہیں وہی آپ کی سمجھ میں نہیں آتا مگر اب معلوم ہوا کہ جو آپ خود لکھتے ہیں اس کے بھی معنی آپ نہیں سمجھتے ہیں۔ آپ کے "جلوۂ نیرنگ" کے معنے ہوئے "نیرنگ کا جلوہ"، جس کو جمال معشوق کی نیرنگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ آپ کے اصلاحی مصرعہ "خود جلوۂ نیرنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں" کے معنے ہوئے کہ معشوق کے نیرنگ کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ لوگ اسے پہچان نہیں پاتے۔ اس اصلاح میں معشوق کے حسن وجمال سے بالکل تعلق نہیں رہ جاتا معشوق گویا ایک جادوگر ہے جس سے وہ پہچانا نہیں جاتا۔ اور شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ معشوق کا جلوہ بیرنگ ہے یعنے اس کے جلوہ کی کسی صفت کا تعین نہیں ہوتا جس سے پہچاننے میں مدد ملے۔ شعر میں انتہائی تابش حسن کا مفہوم ہے جس سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

شعر اصغر | یہ عارض پر نور، یہ زلفیں ہیں پریشاں — کمبخت نکل گر ہی شام و سحر سے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں لفظ (ہیں) بالکل بے محل استعمال ہوا ہے اور اس نے مصرعہ کو مہمل کر دیا ہے۔ (یہ عارض پر نور) کے مقابلہ میں (یہ زلف پریشاں) کہنا چاہیے تھا تاکہ ترکیب کے لحاظ سے دونوں ٹکڑوں میں توازن پیدا ہو جاتا لیکن مصرعہ پورا کرنے کے لیے لفظ (ہیں) بڑھا کر مصرعہ تباہ کر دیا گیا۔

عرضِ عشرت | توازن کے لیے شعر کی خوبصورتی برباد کرنا آپ کا شعار معلوم ہوتا ہے۔ (ہیں) زور دینے یعنی emphasis کے لیے رکھا گیا ہے۔ قطعی بے محل نہیں اور نہ اس کی وجہ سے مصرعہ مہمل ہو گیا ہے۔ معنے صاف ظاہر ہیں دیکھیے: ایک صاحبِ بصیرت کہتا ہے کہ دنیا میں نہ سحر ہے نہ شام ہے لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں۔ سحر حسنِ حقیقت کا عارض پر نور (ہے) اور شام اُسی کی پریشان زلفیں ہیں اس مفہوم میں آپ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ لفظ (ہیں) بالکل ضروری ہے۔ جب جملہ کے دو ٹکڑوں میں سے ایک میں 'ہے' ہو اور دوسرے میں (ہیں) تو ایک حرفِ ربط کو محذوف کیا جا سکتا ہے۔ شاعر نے پہلے ٹکڑے میں (ہے) محذوف کر کے دوسرے میں (ہیں) لکھا ہے اور یہ بالکل ضروری تھا۔

شعرِ عشرت | ہے دافعِ آلام ہے تریاق ہے لیکن کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

اعتراضِ نیاز | پہلے مصرعہ میں (دافعِ آلام) اور (تریاق) دونوں زبانِ تغزل سے علٰحدہ ہیں۔ ان کا استعمال صرف ایک طبیب ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے لفظ (لیکن) یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں مے کے دافعِ آلام و تریاق ہونے کی تردید کی جا رہی ہے حالانکہ مقصود اس کی ترقی ہے۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں (کچھ اور ہی) کے بعد جب تک لفظ "چیز" نہ بڑھایا جائے مفہوم پورا نہیں ہو سکتا۔

عرضِ عشرت | میں اس سے پہلے ایک شعر کی تشریح میں واضح کر چکا ہوں کہ شعر میں استعمالِ الفاظ کا کیا اصول ہے۔ اصول یہ ہے کہ الفاظ مفہوم کی مناسبت سے لائے جاتے ہیں۔ پہلے مصرعہ میں شاعر کو مے کے بارے میں وہی کہنا تھا جو طب کی کتابوں میں درج ہے۔ اس لیے وہی الفاظ استعمال کیے ہیں جو ایک طبیب ہی اکثر استعمال کرتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں شاعر مے کی وہ صفت لکھنا چاہتا ہے جو ایک میکش یا رند سمجھتا ہے۔ وہ اُسے اتنی بیش قیمت سمجھتا ہے کہ وہ مے کی کسی صفت کا تعین ہی نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ محض اتنا اشارہ کہہ کے خاموش ہو جاتا ہے "کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے"

آپ کا دوسرا اعتراض ہے کہ (کچھ اور ہی) کے بعد جب تک لفظ (چیز) نہ بڑھایا جائے مفہوم پورا نہیں ہوتا افسوس ہے کہ شاعر کا مفہوم جس بلندی پر ہے وہاں تک آپ نہیں پہنچ سکے۔ مفہوم یہ ہے کہ میکش مے کو دنیا کی کوئی مادی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اُسے ایک ملکوتی و آسمانی نعمت سے بھی بڑھ کر سمجھتا ہے۔ مگر آپ (چیز) اپنا چیز لفظ کا اضافہ کر کے شاعر کے نہایت بلند مفہوم کو پست بنا دینا چاہتے ہیں۔

آپ کا تیسرا اعتراض ہے کہ پہلے مصرعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے لفظ لیکن اسکی تردید کر رہا ہے گویا لفظ لیکن سے ترقی کے معنے ہی نہیں لیے جاتے۔ اس جملہ پر غور کیجیے "وہ انجمن کے سرگرم کارکنوں میں سے

تو تھے ہی لیکن اب وہ اس کے صدر ہوگئے ہیں۔" اس میں سرگرم کارکن ہونے کی تردید نہیں کی گئی ہے بلکہ صدارت کا اضافہ ہے۔ اسی طرح شعر میں "لیکن" دافعِ آلام اور تریاق ہونے کی تردید نہیں کر رہا ہے بلکہ چند صفاتِ اعلیٰ کا اضافہ کر رہا ہے جو نظرِ ساقی کی مرہونِ منت ہیں۔

شعرِ صفیؔ | نظارۂ پُر شوق کا اک نام ہے جینا — مرنا اسے کہیے کہ گذر تے ہیں ادھر سے

اعتراض نیازؔ | پہلے مصرعہ میں لفظ (اک) بالکل زائد ہے۔ دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان ناقص ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ "زندگی نام ہے صرف نظارۂ پر شوق کا۔ اس لیے جب ہم ختمِ نظارہ کے بعد ادھر سے گذر جائیں تو اسے مرنا کہنا چاہیے۔" دوسرے مصرعہ میں (گذرتے ہیں) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گذرنا ختم نہیں ہوا اس لیے مرنا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ بجائے (گذرتے ہیں) کے (گذر جائیں) کہنا چاہیے تھا۔

عرضِ عشرتؔ | اعتراض ہے کہ لفظ (اک) زائد ہے مگر آپ نہ جانے کیوں اپنی جانب سے شعر میں "صرف" کا مفہوم پیدا کر رہے ہیں یعنے "زندگی نام ہے صرف نظارۂ پُر شوق کا۔" شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ نظارۂ پُرشوق کا ایک دوسرا نام زندگی ہے۔ اس مفہوم کے لیے (اک) نہایت ضروری لفظ ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح۔ آپ کہتے ہیں کہ "گذرتے ہیں" کے بجائے "گذر جائیں" چاہیے کیونکہ (گذرتے ہیں) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گذرنا ختم نہیں ہوا ہے۔ بیشک گذرنا یعنے مرنا ختم نہیں ہوا ہے کیونکہ بیشمار آدمی مر چکے ہیں اور ابھی بیشمار آدمی مرنے والے ہیں۔ شاعر محض اپنی ذات کے لیے نہیں کہتا بلکہ تمام انسانوں کے لیے کہتا ہے۔ اس لیے وہ گذرتے ہیں یعنے جمع کا صیغہ لکھتا ہے۔ مگر آپ خدا جانے کیا سے کیا سمجھ کر اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ "اس سے مرنا بھی ثابت نہیں ہوتا۔" واضح ہو کہ "گذرتے ہیں" سے مرنا بالکل ثابت ہے بلکہ ماضی اور آئندہ دونوں کا مرنا ثابت ہے۔ مگر ہاں آپ کی اصلاح "گذر جائیں" میں مرنا ماضی کا قطعی ثابت نہیں ہوتا اور آئندہ کے لیے بھی مرنے میں شک ڈالتا ہے کیونکہ آپ اس کا مفہوم خود یہ نکالتے ہیں "جب ہم ختمِ نظارہ کے بعد ادھر سے گذر جائیں تو اسے مرنا کہیے"۔ یعنے ابھی ہم گذرے نہیں ہیں۔ کیا معلوم گذریں یا نہ گذریں۔ جب گذر جائیں گے تب مرنا کہنا۔

شعرِ صفیؔ | ذرا سی آس ملنا چاہیے دردِ محبت کی — کہ خود بے چین ہے ذوقِ نوا سے بزمِ فطرت کی

اعتراض نیازؔ | اس شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ دردِ محبت کی تمنا کس کو ہے شاعر کو یا بزمِ فطرت کو جو "ذوقِ نوا" سے بے چین ہے اس لیے بجائے (ملنا چاہیے) کے (مجھ کو چاہیے) نظم کرنا چاہیے تھا۔ تعیین بھی ہو جاتی اور (ملنا چاہیے) کا ثقل بھی دور ہو جاتا۔

عرض عشرت | افسوس ہے کہ آپ کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ درد محبت کی آس کس کس کو ملنا چاہیے گو کہ معمولی سے معمولی ذہن والا یہ سمجھے گا کہ گانے والے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے "ذوق نوا سے بے چین" کا ٹکڑا دلالت کرتا ہے کہ بزم فطرت گانے کے لیے بے چین ہے مگر وہ اس انتظار میں ہے کہ درد محبت کی آس اُس کو مل جائے۔ اس لیے شاعر عاشق سے کہہ رہا ہے کہ تو اپنے درد کا اظہار کر۔ بس اُسی دھن میں تمام فطرت محو ہو جائے گی "ملنا چاہیے" نہایت نرم و سبک الفاظ ہیں مگر آپ ان میں ثقل محسوس کرتے ہیں۔ اس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

شعر مضطر | نقاب رُخ اُلٹ کر آج کیوں گرم تبسم ہو — شعاعیں مجھ پہ کیوں پڑتی ہیں خورشید قیامت کی

اعتراض نیاز | بجائے (گرم تبسم) کے (سرگرم تبسم) ہونا چاہیے تھا۔

عرض عشرت | آپ شعر کے مفہوم کو حسب معمول نہیں سمجھے اور "گرم" اور "سرگرم" کا فرق شاید سمجھتے ہی نہیں ورنہ کبھی نہ کہتے کہ یہاں بجائے (گرم) کے (سرگرم) چاہیے۔ "سرگرم" کے معنے لغات کشوری میں چالاک محنتی۔ کسی کام میں دل سے مشغول کے ہیں۔ اُردو میں "سرگرم" کے معنے "چالاک" کے تو نہیں لیے جاتے مگر اور دونوں معنے مستعمل ہیں۔ شعر میں محنت و مشغولیت کا کوئی مفہوم نہیں ہے اس لیے "سرگرم" بالکل غلط ہے "گرم" "سرد" کا ضد ہے اور رونق یا ترقی کے معنے میں مستعمل ہے مثلاً مشاعروں کا بازار گرم ہے یعنے مشاعروں کی ترقی ہے یا مشاعروں میں بڑی رونق رہتی ہے۔ "گرم تبسم" سے شاعر کا مفہوم ہے کہ معشوق تبسم میں ایک خاص رونق پیدا کر رہا ہے یا حسن تبسم کو ترقی دے رہا ہے اس لیے "گرم تبسم" بالکل درست ہے۔

شعر مضطر | ہیں سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید — اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

اعتراض نیاز | یہ شعر بالکل مفہوم سے بیگانہ ہے۔ اگر اسیر شکوۂ صیاد کرتے ہیں تو اس سے ان کا نا آشنائے لذت پرواز ہونا کیونکر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں (ابھی تک) سے کیا مراد ہے؟ اس کو شاعر ظاہر نہ کر سکا۔

عرض عشرت | شعر کا مفہوم بہت بلند تھا وہاں تک آپ نہیں پہونچ سکے اس لیے آپ کو مفہوم سے بیگانہ معلوم ہوا۔ مفہوم ملاحظہ ہو۔ صیاد پرندوں کو اسی لیے اسیر کرتا ہے کہ وہ آزادی سے پرواز کرتے ہوئے تمام گلشن کی سیر کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی پرندا قعی آزادئ پرواز کا عاشق ہے تو وہ اسیری کی شکایت نہ کرے گا کیونکہ یہ اسیری اُسے اپنے محبوب پرواز کی خاطر ملی ہے۔ آجکل دیکھ لیجئے وہ حضرات جو آزادی وطن کے شیدا ہیں خوشی سے جیل جاتے ہیں اور اپنی اسیری کی قطعی شکایت نہیں کرتے جسے آزادی کا عشق ہو وہ اسیری کی پروا نہ کرے گا۔ اسی طرح جو پرند آزادی پرواز کی لذت سے واقف ہے وہ قفس یا

صیاد کی شکایت نہیں کرتا۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ شعر مفہوم سے بیگانہ نہیں ہے بلکہ مفہوم ہی اتنا بلند ہے جو ہر کس و ناکس کے مان کا نہیں ہے۔ اب رہ گیا آپ کا اعتراض کہ (ابھی تک) سے کیا مراد ہے۔ اسے بھی سمجھ لیجئے۔ وقتی جذبہ میں انسان کے منھ سے ایسے بھی الفاظ نکل جاتے ہیں جنھیں اس کا دل نہیں چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ غیظ و غضب کی حالت میں انسان اپنے لاڈلے بیٹے کو بھی کہہ گذرتا ہے کہ تو مر جا حالانکہ اُس کا دل چاہتا ہے کہ اُسے کوئی تکلیف نہ پہونچے۔ اسی بنا پر جب مُرغ اسیر ہوئے تھے تو وقتی جذبہ میں اگر کچھ صیاد کی شکایت کر جاتے تو چنداں حرج نہ تھا کیونکہ یہ اُن کے دل کی بات نہ ہوتی مگر جب "ابھی تک" یعنے اسیری کے بعد دیر تک وہ لوگ شکوۂ صیاد میں منہمک ہیں تو شاعر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ سب پرند لذت پرواز سے نا آشنا ہیں۔ مفہوم شعر بالکل عیاں تھا مگر ہاں سمجھدار کے لیے۔

شعر ضغر | مجاز کیسا، کہاں حقیقت، ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے　　یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں بجائے (کہاں) سے (کیسی) زیادہ مناسب تھا۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (سحر) بالکل بے محل استعمال ہوا ہے مدعا یہ کہنا ہے کہ "یہ سب خواب کی سی حالت ہے بیداری وحقیقت نہیں" اور یہ لفظ (سحر) سے ظاہر نہیں ہوتا۔

عرض عشرت | شعر کا مدعا جو آپ نے سمجھا ہے وہ قریب قریب صحیح ہے۔ آپ نے جو بیداری کا مفہوم سمجھا ہے شاعر نے اسی کے لیے "سحر" کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ سحر کا خواب کے ٹوٹنے اور بیداری سے خاص تعلق ہے۔ 'کہاں' اور 'کیسی' کے جھگڑے کیلیے شعر کا پورا مفہوم سمجھ لیجئے محض آپ کا 'مدعا' کافی نہیں ہے۔ سنئیے۔ دنیاوی علوم کا محقق اپنی تحقیق کی حد پر پہونچ کر کہتا ہے کہ میں خواب جہالت سے جاگ اٹھا ہوں اور اب سحر علم کی روشنی میں اپنے سامنے عین حقیقت دیکھ رہا ہوں اور مجاز اب میری نظروں سے غائب ہے مگر عارف کامل اس سے کہتا ہے "مجاز کیسا؟ (یعنے مجاز کی بات چیت چھوڑ) وہ حقیقت کہاں ہے جسے تو دیکھ رہا ہے ذرا مجھے بھی دکھلا۔ یہ سب محض خواب ہے۔ دراصل ابھی تو بیدار نہیں ہوا ہے۔ تو خواب ہی میں سحر دیکھ رہا ہے۔ اس لئے تیری سحر سحر نہیں ہے اور جو حقیقت تو اس سحر کی روشنی میں دیکھ رہا ہے وہ بھی غلط ہے۔" اس مفہوم کے لیے اب آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ لفظ 'سحر' کتنا ضروری ہے اور لفظ 'کہاں' بھی بے محل نہیں ہے مگر صرف آپ عدم توازن کے لئے "کہاں" کو کیسی بنانا چاہتے ہیں جو آپ کا شعار ہے۔

شعر ششم | یہ مجھ سے حسن نے تو راز یہاں سلامتی خود ہے دشمن جاں　　کہاں تک رہبری زندگی ہو کہ راہ حیات خطر نہیں ہے

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں لفظ (کہ) زائد استعمال ہوا ہے صرف وزن پورا کرنے کے لیے ہے۔

عرض عشرت | آپ کے اس اعتراض کا بھرم کہ شعر میں فلاں لفظ زائد ہے بار ہا کھول چکا ہوں emphasis یعنے زور دینے کے لیے اکثر الفاظ زائد لائے جاتے ہیں۔

شعر اصغر | ہوا کو موجِ شراب کر دے۔ فضا کو مستِ خراب کر دے — یہ زندگی کو شباب کر دے۔ نظر تمھاری نظر نہیں ہے

اعتراض نیاز | نظر نہیں ہے تو کیا ہے جو یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کا ذکر اشارۃً و کنایۃً بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔

عرض عشرت | اردو کی عام بول چال ہے کہ جب کوئی آدمی معمولی آدمیوں کی سطح سے بہت بلند کوئی کام کر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں "بھائی وہ آدمی آدمی نہیں ہے" اس جملہ میں انسانیت سے انکار نہیں کیا جاتا بلکہ مقصود صرف اس قدر ہے کہ وہ معمولی آدمیوں سے بہت بلند ہے۔ اسی طرح "تمھاری نظر نظر نہیں ہے" سے مراد یہ ہے کہ تمھاری نظر معمولی آدمیوں کی نظر نہیں ہے۔ یہ بڑی بڑی باتیں کر سکتی ہے شاید اب آپ کی تشفی ہو گئی ہو۔

شعر اصغر | دولت قرب کو خاصانِ محبت جانیں — چند اشکوں کے سوا کچھ مری قسمت میں نہیں

اعتراض نیاز | جب تک دوسرے مصرعہ میں لفظ (ہر چند) یا (گو) نہ لایا جائے مفہوم تشنہ رہتا ہے۔

عرض عشرت | یا تو آپ مفہوم کچھ بھی نہیں سمجھے اور یا آپ شعر کی نثر نہیں کر سکے۔ نثر یہ ہوئی کہ "دولت قرب کو خاصانِ محبت جانیں۔ میری قسمت میں (تو) سوا چند اشکوں کے (اور) کچھ نہیں" اس میں (ہر چند) یا (گو) کے بغیر نہ مفہوم تشنہ ہے اور نہ ان لفظوں کی کوئی ضرورت ہی ہے۔ بلکہ ان لفظوں کے داخل کرنے سے شعر کا مفہوم برباد ہوگا۔

شعر اصغر | لوگ مرتے بھی ہیں جیتے بھی ہیں بیتاب بھی ہیں — کونسا سحر تری چشمِ عنایت میں نہیں

اعتراض نیاز | یہ شعر ہندی کے اس مشہور دوہے سے ماخوذ ہے:-

امی ہلاہل مدبھرے سویت۔ شیام۔ رتنار — جیت مرت جھک جھک پرت جہہ چتوت اک بار

لیکن مفہوم کے لحاظ سے بجائے ترقی کے تنزل پایا جاتا ہے۔

عرض عشرت | مضمون شعر بیشک ہندی دوہے سے ملتا جلتا ہے۔ مگر دوہے سے شعر میں ترقی ہے۔ دوہے کا مضمون یہ ہے کہ "معشوق کی آنکھوں میں سفیدی۔ سیاہی اور سرخی ہے۔ سفیدی میں امرت کا اثر ہے جس سے لوگ جی اٹھتے ہیں۔ سیاہی میں زہر کا اثر ہے جس سے لوگ مر جاتے ہیں اور سرخی میں شراب کی کیفیت ہے جس سے لوگ مست ہو کر جھک جھک جاتے ہیں۔ اس لیے معشوق جب کسی کی طرف دیکھتا ہے تو اس پر یہ تینوں کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ اصغر صاحب کے یہاں بجائے (جھک جھک پڑنے) کے (بیتاب ہونا) ہے۔ جو نشہ معشوق کے جادوئے چشم سے ہوتا ہے وہ شراب کے نشہ سے

مختلف ہوتا ہے۔ اُس میں لوگ جھومنے نہیں لگتے اور لغزش کھا کھا کر گرتے نہیں۔ اس میں محبت یا تمنا کا نشہ ہوتا ہے جس سے انسان میں بیتابی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے دوسرے کا مضمون غلط ہے اور اس غلطی کی اصلاح اصغر صاحب کے شعر میں موجود ہے۔ مگر جو بیّن فرق شعر اور دوسرے کے مضمون میں ہے وہ الفاظ "چشم عنایت" میں مضمر ہے۔ یہ محبت کا بہت لطیف پہلو ہے۔ ظلم وستم سے تو معشوق غضب ڈھاتا ہی ہے مگر اُسکی عنایت و مہربانی میں بھی ایک قیامت ہے جسے نکتہ دان عشق ہی جانتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تیری چشم عنایت میں کونسا جادو نہیں ہے۔ اس تیری چشم عنایت سے لوگ مر سکتے ہیں۔ جی سکتے ہیں اور بیتاب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے کا یہ مضمون کہ معشوق کی آنکھ کی سفیدی کا اثر الگ۔ سیاہی کا الگ اور سُرخی کا الگ ہوتا ہے بالکل غلط ہے۔ کوئی عاشق محض سفیدی چشم دیکھ کر نہ جیتا ہے۔ نہ محض سیاہی چشم دیکھ کر مرتا ہے اور نہ محض سُرخیٔ چشم دیکھ کر مست ہوتا ہے۔ ان تینوں چیزوں کا مجموعی طور سے بلکہ اور سیکڑوں غمزوں اور کنایوں کی مدد سے ایک اثر پیدا ہوتا ہے جو مختلف لوگوں میں مختلف کیفیات پیدا کرتا ہے۔ آنکھ کے جادو میں بے شمار چیزیں شامل ہیں اس لیے اصغر صاحب نے مضمون کو محدود نہیں کیا بلکہ "کونسا سحر" کہہ کے سب کچھ کہہ ڈالا۔ اس لیے اس شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ علاوہ ان تین اثرات کے جو شعر میں بیان کیے گئے ہیں بیشمار اثرات ہیں یہ تین تو محض نمونے کے طور پر کہے گئے ہیں۔

شعر اصغر | سب سے اک طرز جدا سب سے اک آہنگ جدا رنگ محفل میں ترا جو ہے وہ خلوت میں نہیں

اعتراض نیاز | شاعر کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرے محبوب کا جو رنگ جلوت میں ہوتا ہے وہ خلوت میں نہیں ہوتا۔ پہلے مصرعہ کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر یہ صفت اپنے ہی محبوب میں پاتا ہے حالانکہ جلوت و خلوت میں کیفیات کا بدل جانا نفسیاتی طور پر ہر شخص کے لیے ثابت ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں بہتر ہوتا ہے

رنگ محفل میں جو تیرا ہے وہ خلوت میں نہیں

اس طرح (رنگ محفل) کے بجائے (تیرا) پر زور ہو جاتا اور مفہوم سے قریب تر۔

عرض عشرت | شعر کے معنے سمجھنے کے لیے آپ کا طریقہ نہایت عجیب ہے۔ آپ صرف دوسرے مصرعہ سے شعر کو سمجھنا چاہتے ہیں حالانکہ دونوں مصرعوں کے ملنے سے شعر ہوتا ہے۔ آپ محض دوسرے مصرعے سے اتنا سمجھ لیتے ہیں کہ معشوق کے جلوت و خلوت کے رنگ میں بڑا فرق ہے۔ پھر آپ اعتراض کرتے ہیں "شاعر یہ صفت صرف اپنے ہی محبوب میں پاتا ہے حالانکہ خلوت و جلوت میں کیفیات کا بدل جانا نفسیاتی طور سے ہر شخص کیلئے ثابت ہے" بھائی صاحب۔ پہلے مصرعہ سے بھی کام لیجئے۔ پہلا مصرعہ ہے "سب سے اک طرز جدا سب سے اک آہنگ جدا" یہ بات ہے جو شاعر کے معشوق میں خاص ہے اور دوسرے شخصوں میں نہیں پائی جاتی۔ نفسیات کا

اصول یہ بھی ہے کہ ہر شخص بالارادہ یا بے ارادہ دوسرے کی کچھ نہ کچھ نقل کرتا ہے اور محفل میں پہنچ کے کچھ نہ کچھ رنگِ محفل سے متاثر ہوتا ہے مگر شاعر کا معشوق ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا اس کا رنگ سب سے جدا رہتا ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح۔ اس میں اور اصغر صاحب کے مصرعہ میں کوئی فرق نہیں ہے سوا اس کے کہ اصغر صاحب کے مصرعہ میں لفظ (ترا) ہے اور آپ کے اصلاحی مصرعہ میں (تیرا) ان دونوں لفظوں میں معناً کوئی فرق نہیں ہے اور صورتاً بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ خدا جانے آپ نے اپنی اصلاح میں کیا بات پیدا کی۔ مگر ہاں آپ لکھتے ہیں کہ "اس طرح (رنگِ محفل) کے بجائے (تیرا) پُر زور ہو جاتا ہے اور مفہوم سے قریب تر" یہ نیا فلسفہ ہے کہ اگر بجائے (ترا) کے شعر میں (تیرا) لکھ دیا جائے تو وہ مفہوم سے قریب تر ہو جاتا ہے اور پر زور بھی۔

شعر اصغر | نشۂ عشق میں ہر چیز اُڑی جاتی ہے — کون ذرّہ ہے کہ سرشارِ محبت میں نہیں

اعتراض نیاز | چونکہ پہلے مصرعہ میں یہ کہا تھا کہ "نشۂ عشق میں ہر چیز اُڑی جاتی ہے" تو دوسرے مصرعہ میں یوں کہنا چاہیے تھا کہ "کونسی چیز ہے جو محبت میں سرشار نہیں" یا "ذرّہ ذرّہ سرشارِ محبت ہے"

عرض عشرت | صرف دوسرے مصرعہ پر اصلاح ہے۔ پہلی اصلاح یہ کہ بجائے "کون ذرہ" کے "کونسی چیز" ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ "ذرّہ" کُل ہے اور "چیز" جُز۔ کیونکہ ذرّوں ہی سے ہر چیز بنتی ہے۔ اس لیے "کونسی چیز" سے "کون ذرّہ" کہیں بہتر ہے۔ دوسری اصلاح آپ کی یہ ہے کہ "کون ذرّہ" کے بجائے "ذرہ ذرہ" ہونا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ زور دینے کے لیے سیدھی بات کو استفہام بنا دیا جاتا ہے۔ انگریزی ادب میں یہ ایک صنعت ہے جسے Interrogation کہتے ہیں "ذرہ ذرہ محبت میں سرشار ہے" کو زوردار بنانے کے لیے ایک اچھی ترکیب یہ تھی کہ اس کو استفہامیہ کر کے یوں کر دیا جائے "کون ذرہ ہے کہ سرشارِ محبت میں نہیں" اس طرح ظاہر ہے کہ اصغر صاحب کا مصرعہ آپ کے اصلاحی مصرعہ سے زیادہ زوردار ہے۔

شعر اصغر | لالہ و گل تم نہیں ہو ماہ و انجم تم نہیں — رنگِ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے

اعتراض نیاز | لالہ و گل کا تعلق تو رنگِ محفل سے ہے لیکن ماہ و انجم کو رنگ سے کیا تعلق؟ محفل کے ساتھ کوئی ایسا لفظ لانا چاہیے جو مصرعہ اول کی رعایت سے لالہ و گل اور ماہ و انجم دونوں سے متعلق ہو سکے اس لئے بجائے "رنگ" کے "تاب" زیادہ مناسب تھا۔

عرض عشرت | بھائی صاحب "رنگِ محفل" کوئی نیلا، پیلا یا سُرخ رنگ نہیں ہے کہ جس کو لالہ و گل کے رنگین ہونے کی وجہ سے تعلق ہو اور ماہ و انجم کے تابندہ ہونے کی وجہ سے نہ ہو۔ "رنگِ محفل" ایک کیفیت ہے

جو سیکڑوں چیزوں کا مجموعہ ہے جس میں رنگین اور بے رنگ بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ جس طرح "لالہ و گل" سے رنگ محفل چمک سکتا ہے اسی طرح "ماہ و انجم" سے بھی دوبالا ہو سکتا ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح کہ بجائے "رنگ محفل" کے "تاب محفل" ہونا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ ایسا کر دیا جائے تو یہ صریحًا اُردو محاورہ کا خون ہوگا۔ رونق محفل۔ رنگ محفل۔ گرمیٔ محفل مشہور محاورے ہیں۔ انھیں معنوں میں "تاب محفل" غلط اور محاورہ کُشی ہے۔

شعر اصغر | ہو کے رازِ عشق افشا بن گیا اک راز اور　　　سب زباں پر آچکا ہے سب ابھی تک دل میں ہے

اعتراض نیاز | رازِ عشق کا ظاہر ہو کر اور راز ہو جانا اور زبان پر آنے کے بعد بھی اُس کا بالکل ناگفتہ حالت میں رہنا ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل کرنا آسان نہیں۔ یہ شعر بھی تصوف کے اُن اشعار میں سے ہے جہاں جمع اضداد ہی انتہائے کمال خیال کیا جاتا ہے۔

عرض عشرت | شعر نہایت بلند ہے اس لیے مجھے کوئی تعجب نہیں کہ آپ کو مجموعہ اضداد معلوم ہوا۔ لہذا آپ اس کے معنی سمجھ لیجیے انشاء اللہ آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ فراوانیٔ تمنا اور فرطِ شوق میں اکثر عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے کہہ جانے پر بھی محسوس کرتا ہے کہ میں نے گویا کچھ نہیں کہا اور بار بار کہتا ہے مگر پھر بھی اس کی سیری نہیں ہوتی۔ اس طرح دوسرے مصرعہ کے اضداد کا حل ہو گیا۔ معنی بہت صاف ہیں مگر ہاں سمجھدار کے لیے۔ اب پہلے مصرعہ کے اضداد کو سمجھ لیجیے۔ دل میں جو کچھ تھا وہ زبان پر آنے سے رازِ افشا ہو گیا مگر اس سے ایک راز اور بن گیا۔ وہ راز کیا ہے؟ آپ اسے سمجھ نہ پائے۔ وہ راز شعر کا مصرعہ ثانی ہے یعنے بہت کچھ کہہ جانے پر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا سب کچھ دل میں باقی ہے۔ کیا یہ راز نہیں ہے؟۔

شعر اصغر | حسن بن کر خود کو عالم آشکارا کیجیے　　　پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردا کیجیے

اعتراض نیاز | ایں ہم منجملۂ مفروضات لغویۂ تصوف ہست کہ شاعران کم سواد تغزل را پریشاں ساز می کنند و تراکیب حاملۂ اضداد را حسنِ شاعری می نامند۔

عرض عشرت | اس سے پہلے آپ نے اصغر صاحب کے ۱۸ شعر مجموعی طور پر درج کر کے انھیں یکسر مفہوم سے بیگانہ بنایا تھا اُسی سلسلے میں یہ شعر آپ کو سمجھا چکا ہوں۔ دوبارہ زحمت اُس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مگر ہاں ایک بات کہنا ہے کہ آپ نے اب کی اپنی فارسیت کی لیاقت دکھادی۔ فارسی ادیب لفظ "ایشاں" اب تک انسانوں یا بڑے جانوروں کے لیے لاتے رہے ہیں مگر آپ نے اس لفظ کو "مفروضات" کے لیے لاکر "سیسی علم دریاو" کا تماشا دکھا دیا۔ اس پر تو مجبورًا مجھے بھی لکھنا پڑتا ہے کہ ایں ہم منجملۂ امراض تنقیص لغویۂ جماعت

ہمچو من دیگرے نیستاں ہست کز و معترضان کور سواد اعتراضات ایشاں پیدا می کنند و ایں ہمہ مزخرفات را انتقاد ادب می نامند۔

شعر اصغر | دیکھتا ہوں میں کہ انساں کش ہے دریا کا وجود — خود حباب و موج بن کر اب تماشہ دیکھئے

اعتراض نیاز | اگر دریا کے وجود انساں کش ہے تو حباب و موج بن کر تماشہ دیکھنے سے کیا فائدہ مترتب ہوسکتا ہے۔ اگر مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب دریا کے وجود خود فنا کر دینے والا ہے تو پھر کیوں نہ ایسی چیز بن کر تماشہ کیا جائے جو خود بہت جلد فنا ہو جانے والی ہے تو اس کے لیے (حباب) بن کر تماشہ کرنا تو صحیح ہوسکتا ہے مگر موج سے اسے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ موج کا وجود دریا سے علیحدہ نہیں ہے اور نہ حباب کی طرح فنا ہو جانے والی۔

عرض عشرت | یہ شعر بھی منجملہ اُن ۱۸ شعروں کے ہے جنھیں میں سمجھا چکا ہوں۔ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ جب آپ شعر کے مفہوم کو سمجھ لیں گے تو کچھ آپ نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے وہ از خود لایعنی معلوم ہوگا۔

شعر اصغر | حسن کی بیگانگی و بے نیازی سب بجا — اس پہ چھپ کے پردۂ گل سے اشارہ کیجئے

اعتراض نیاز | شاعر اپنے مفہوم کو ظاہر نہیں کر سکا۔ مقصود یہ کہنا ہے کہ اگر حسن بے نیاز ہے تو وہ پردۂ گل سے کیوں اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا مصرع یوں ہوتا تو ابہام دور ہو جاتا:۔

چھپ کے پھر کیوں پردۂ گل سے اشارہ کیجئے

عرض عشرت | شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ معشوق کہتا ہے میرا حسن بیگانہ اور بے نیاز ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ میں نے مان لیا کہ جو آپ کہتے ہیں درست ہے۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ آپ اپنے حسن کو بیگانہ اور بے نیاز بھی کہیے اور باوجود اس کے پردۂ گل سے اشارہ بھی کیجئے۔ مگر آپ یا تو شاعر کا پورا مفہوم سمجھتے نہیں۔ یا جان بوجھ کر مفہوم شاعر میں کتر بیونت کر کے اعتراض پیدا کرتے ہیں۔

شعر اصغر | کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے — نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

اعتراض نیاز | اس شعر میں بھی (کہ) بالکل بیکار ہے۔ اصغر صاحب وزن پورا کرنے کے لیے "یہ" "کہ" "لا" "کچھ" کے الفاظ اکثر و بیشتر استعمال کرتے ہیں جس سے اُن کی بے مشقی ظاہر ہوتی ہے۔ پہلا مصرع یوں بھی ہوسکتا تھا۔ ع کوئی ایسا نہیں یارب جو اس کے درد کو سمجھے۔

عرض عشرت | اس شعر میں (کہ) بیکار نہیں لفظ "جو" پر زور دینے کے لیے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر آپ (emphasis) کے راز کو نہیں سمجھے کیا کیا جائے۔

شعر اصغر | دے مسرت مجھے اور میں مسرت مجھ کو — چاہیے غم بھی بہ اندازۂ راحت مجھ کو

اعتراض نیاز | مسرت اور عین مسرت میں "غم و راحت" کا سا تفاوت نہایت لغو تخیل ہے۔ اول تو مسرت و عین مسرت کو علٰحدہ علٰحدہ دو چیز قرار دینا ہی لغو سی بات ہے۔ چہ جائے کہ عین مسرت کو غم سے تعبیر کرنا۔ علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ غم کا تقابل راحت سے نہیں ہوا کرتا بلکہ مسرت سے ہوا کرتا ہے۔

عرض عشرت | یہ شعر منجملہ ۸ اشعروں کے تھا اور اس کے معنے بھی سمجھائے گئے ہیں۔ دوبارہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مفہوم سمجھنے کے بعد آپ کا اعتراض آپ کو خود لایعنی معلوم ہوگا۔

شعر صفر | خود میں اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے دیکھنا ہے کسی عنواں تری صورت مجھ کو

اعتراض نیاز | یہ شعر بیان و معنی دونوں حیثیت سے ناقص ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے پہلے مصرع کا انداز بیان یوں ہونا چاہیے تھا کہ "میں خود ہی کیوں نہ اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے" اسی طرح دوسرے مصرع میں جب تک "عنوان" کے بعد لفظ (سے) نہ لایا جائے مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ "کسی عنوان دیکھنا" خلاف محاورہ ہے۔ عنوان کا اعلان (نون) اور اس کے بعد (سے) لانا ضروری ہے۔ معنًا یہ نقص ہے کہ خود اُٹھ جانا اور پردۂ ہستی اُٹھ جانا ایک ہی چیز ہے ان دونوں کو علٰحدہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے امتیازات ممکن ہے تصوف کی لایعقل دنیا میں کوئی مفہوم رکھتے ہوں لیکن تغزل سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔

عرض عشرت | خدا جانے وہ کون لایعنی مفہوم ہے جس کی بنا پر آپ پہلے مصرع میں یہ چاہتے ہیں کہ "خود ہی کیوں نہ اُٹھ جاؤں کہ یہ پردہ ہستی اُٹھ جائے"۔ شاعر کا قطعی کوئی ایسا مفہوم نہیں ہے جس کی بنا پر ایسی اصلاح بے جا کی جرات کی جائے۔ خیر اس کے بعد آپ لفظی حیثیت سے کہتے ہیں کہ "کسی عنوان دیکھنا محاورہ نہیں ہے "کسی عنوان" سے ہونا چاہیے۔ اُردو میں "عنوان" بمعنے "طرح" زبان زد عوام و خواص ہے۔ یہ لفظ "سے" کے ساتھ اور بغیر "سے" دونوں طرح مستعمل ہے۔ جیسے "میں نے کسی طرح اُن کا پتہ چلا یا" اور "میں نے کسی طرح سے اُس کا پتہ چلایا" دونوں جملے صحیح اور با محاورہ ہیں۔ انھیں جملوں میں بجائے "طرح" کے "عنوان" لکھ دیجیے جب بھی دونوں جملے صحیح اور با محاورہ رہیں گے۔ گو کہ بغیر "سے" کے زیادہ خوبصورت ہے۔ کیونکہ "سے" زائد معلوم ہوتا ہے۔ اس کے آگے آپ فرماتے ہیں کہ "خود اُٹھ جانا" اور "پردۂ ہستی اُٹھ جانا" ایک ہی چیز ہے۔ شاید لفظ "ہستی" سے آپ کو دھوکا ہوا۔ "ہستی" کے معنے یہاں "عالم" یا "کونین" کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ "خود" اور "عالم" دونوں ایک ہی چیز نہیں ہیں بلکہ دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ معشوق حقیقی کی صورت دیکھنا چاہتا ہے مگر اس پر ہستی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یا تو یہ پردہ ہستی ہٹ جائے یا شاعر خود اُٹھ جائے یعنے اُس کی خودی جاتی رہے جب خودی جاتی رہے گی تو حسن حقیقت پر کوئی پردہ نہ رہ جائے گا۔ کیونکہ عقل انسانی ہی دھوکا دے کر حسن حقیقت کو کچھ کا کچھ بنایا کرتی ہے۔ اب شاید آپ مفہوم سمجھ گئے ہوں۔ تغزل سے

اس مفہوم کو بڑا خاص لگاؤ ہے۔ کیونکہ اس میں معشوق کو بے نقاب دیکھنے کی تمنا ہے جو تغزل کی جان ہے۔

شعر اصغر | آ گئی سامنے اک جلوۂ رنگیں کی بہار — عشق نے آج دکھا دی مری صورت مجھ کو

اعتراض نیاز | اس شعر میں بھی تصوف کا وہی فرسودہ و پامال اور لغو اور مہمل نظریہ پیش کیا گیا ہے "یہ جو صورت ہے مری صورت جاناں ہے وہی"

عرض عشرت | اس شعر میں لغو یا مہمل کوئی بات نہیں ہے مگر ہاں اُس کے لیے یقیناً یہ شعر لغو اور مہمل ہے جو ویدانت یا موجودہ فلسفہ (Subjectivism) سے جس کے علم بردار دوں میں سے برکلے ہے قطعی ناواقف ہے۔ اصغر صاحب نے بارہا یہ مضمون کہا ہے کہ معشوق کا حسن اپنے وجود کے لیے نظر عاشق کا مرہون منت ہے اس کے متعلق اس سے پہلے میں کئی اشعار اصغر پیش کر چکا ہوں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں

شعر اصغر | نگہ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا — اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کا انداز بیان بالکل غلط ہے۔ اگر دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) برقرار رکھا جائے تو پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے۔ ع "نگہ ناز کو وہ بھی تو گوارا نہ ہوئی" اور اگر پہلا مصرعہ اپنے حال پر قائم رہے تو دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے "اک ذرا درد میں مل جاتی تھی راحت مجھ کو"

عرض عشرت | آپ نے غلطی سے یہ سمجھا کہ "جو" راحت کے لیے آیا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ شعر کی نثر ملاحظہ ہو:۔ "اک ذرا درد میں جو راحت، مجھ کو ملتی تھی۔ یہ (امر) بھی نگہ ناز کو گوارا نہ ہوا" لفظ "امر" "یہ" کے بعد محذوف ہے۔ راحت سب کے لیے گوارا ہوتی ہے۔ معشوق کو راحت ناگوار نہیں ہوئی بلکہ مجھے راحت کا ملنا معشوق کو ناگوار ہوا۔ اس کے بعد آپ کی اصلاح "جس میں ملتی تھی" کے بجائے "مل جاتی تھی" ہے یہ "مل جاتی تھی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ درد کبھی کبھی ہوتا تھا اور جب کبھی ہوتا تھا تو اک ذرا راحت مل جاتی تھی۔ مگر شاعر کا مفہوم اس سے کہیں اعلیٰ ہے یعنی درد مستقل تھا۔ اس لیے اُس نے لکھا کہ ملتی تھی۔ اصلی شعر اور آپ کی اصلاح میں "کل" اور "جزو" کا فرق ہے، اصغر صاحب کے شعر میں دوام ہے اور آپ کی اصلاح میں چند روزگی اور ظاہر ہے کہ دوام کل ہے اور چند روزگی اُس کا جزو۔ اور ہر سمجھدار کل کو جزو پہ ترجیح دے گا۔ (باقی)

خواب

(مرزا سلطان احمد، خان بہادر، پنشنر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر)

ایک زمانہ تھا کہ مرزا سلطان احمد کے مضامین سے اردو کا کوئی رسالہ بمشکل خالی ہوتا۔ الناظر میں بھی شروع سے اُن کے مضامین نکلتے رہے مگر ضعیفی اور عوارض کی بنا پر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔ کئی سال ہوئے وہ اس دنیا سے بھی رخصت ہوگئے۔ اُن کا انداز تحریر جس طرح مخصوص تھا اُسی طرح اُن کا خط بھی ایسا تھا کہ ہر شخص صحت کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا تھا اور آخر عمر میں تو یہ اور بھی مشکل ہوگیا تھا۔ اسی سبب سے اُن کے بعض مضامین شائع ہونے سے رہ گئے۔ یہ مضمون بھی پُرانے مسودات کے انبار میں تھا۔ اور کوشش کے بعد اس قابل ہوا ہے کہ نذر ناظرین کیا جاسکے۔ ایڈیٹر

خواہ کوئی رویا یا خواب کی صداقت کا قائل ہو یا اس پر اعتبار نہ رکھتا ہو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ مجھے خواب نہیں دکھائی دیتا۔ ہر شخص جو کرتا ہے کبھی نہ کبھی خواب میں بھی دیکھتا ہے۔ انسان کبھی خوش ہوتا ہے اور کبھی اُس پر وحشت طاری ہوتی ہے۔ خواب کا نظر آنا کسی کنبہ کسی خاندان اور کسی ملک اور قوم سے مخصوص نہیں ہے یہ جدا بات ہے کہ اُن میں سے کسی کو خواب دیکھنے کا کم موقع ہوا اور کسی کو زیادہ۔ شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس نے کبھی خواب نہ دیکھے ہوں۔ جو لوگ اس کی حقیقت کے کسی نہ کسی رنگ میں مقر ہیں وہ بھی دیکھتے ہیں اور جو معترف نہیں ہیں وہ بھی دیکھتے ہیں۔ جسے نیند آتی ہے ضرور ہے کہ وہ کسی نہ کسی رنگ میں خواب دیکھے گا۔ یہ جدا بات ہے کہ وہ اس سے متاثر ہو یا نہ ہو
ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا کیفیت ہوتی ہے مگر ہر شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ خواب کیوں دکھائی دیتے ہیں اور بعض دفعہ کیوں نہیں دکھائی دیتے اور اُن کی کیفیات کیوں مختلف ہوتی ہیں اور ان کی تاثیرات کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

خواب کیوں دکھائی دیتا ہے

یہ مقدم سوال ہے کہ خواب کیوں دکھائی دیتا ہے اور پھر یہ کہ ہر کسی کو کیوں دکھائی دیتا ہے۔ کمی و بیشی کا کوئی سوال نہیں ہے جب آدمی نیند میں ہوتا ہے تو عموماً اس کے حواس ظاہری میں کچھ نہ کچھ تعطل ہوجاتا ہے اگرچہ بعض لوگوں پر خواب کی حالت میں بھی بیداری کی سی کیفیت طاری رہتی ہے جسے کیفیت یقظہ نومی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہی حالت نیم خوابی کہلاتی ہے۔
ہم جو کچھ بیداری میں مشاہدہ کرتے ہیں وہ مشاہدات خیال اور حافظہ میں ایک بڑی حد تک محفوظ

رہتے ہیں اور اسی طرح لوح حس مشترک میں بھی ایک حد تک اس کا عکس اُترتا رہتا ہے اور حس مشترک سے لوح خیال میں منعکس ہوتا ہے جب انسان سو جاتا ہے تو بوجہ حواس ظاہری کے تعطل کے حواس باطنی سہولت سے کام میں لگ جاتے ہیں۔ حس مشترک اور تخیل میں جو کچھ اندوختہ عالم بیداری کا منقش یا موجود ہوتا ہے وہ رویا یا خواب میں مختلف صورتوں میں نظر آنے لگتا ہے۔

بعض حکیم کہتے ہیں کہ چونکہ بوجہ خواب کے نفس اپنے فعل کے خاصہ سے باز رہتا ہے اس واسطے طبیعت رویا میں مصروف ہو جاتی ہے اور انسان نیند میں بھی کبھی کبھی بیداری کی اشکال دیکھتا ہے اور ان کی رویت میں مصروف ہو جاتا ہے۔

میری رائے میں نفس خود بھی رویت میں مصروف ہوتا ہے وہ حالت خواب میں بھی معطل نہیں رہ سکتا جیسے کہ حواس ظاہری معطل ہو جاتے ہیں۔ نفس اپنے کام سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس کی مصروفیت کسی نہ کسی رنگ میں جاری ہی رہتی ہے۔

تعطل حواس ظاہری

جب نیند میں پانچوں حواس ظاہری کم و بیش معطل ہو جاتے ہیں تو پھر وہ خواب میں کیونکر کام دے سکتے ہیں؟ کیونکہ جب ان کی حس ہی مفقود ہو جاتی ہے تو وہ پھر کس طرح ادراک کر سکتے ہیں۔

یہ سوال بے شک قابل بحث ہے کہ انسان خواب کی حالت میں نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ چکھتا ہے اور نہ سونگھتا ہے اور نہ چھوتا ہے لیکن پھر بھی یہ سب حواس حالت بیداری کی طرح کام دیتے ہیں اگرچہ بعض اوقات ان میں ایک قسم کی کدورت سی بھی پائی جاتی ہے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ قوتیں ان حالات میں بھی مدرک رہتی ہی ہیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ قدرت نے یا تو ان حواسوں میں ہی یہ طاقت رکھی ہے کہ وہ باوجود کسی حد تک تعطل کے بھی نیند میں کام دیے جاتے ہیں جیسے کہ بعض وقت نیم خوابی میں بھی ان میں کچھ نہ کچھ درک رہتا ہے اور بالخصوص حالت یقظے نومی میں دیکھا جاتا ہے کہ باوجود نیند میں ہونے کے بھی انسان بعض اوقات چلنے پھرنے لگتا ہے۔ بعض لوگ ایسی حالت میں لکھتے پڑھتے بھی ہیں اگرچہ نیند سے اُٹھ کر انہیں یہ حرکات اپنی یاد نہیں رہتیں مگر کرتے ضرور رہیں۔

دوسرے یہ کہ ان حواس ظاہری کی پانچ وجدانی قسمیں اور بھی ہیں یعنے انسان کو ہر قسم کے دو دوھرے حواس دیے گئے ہیں جس کا ثبوت یہ کم نہیں ہے کہ باوجود ان حواس ظاہری کے تعطل کے بھی وہ خواب میں بیداری کی طرح کام دیتے ہیں۔ رویت، سماعت، ذائقہ، شم اور لمس میں سر مو فرق نہیں

ہوتا بعض لوگ خواب میں جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں یا جو کچھ کھاتے، پیتے، سونگھتے یا چھوتے ہیں
جاگ کر بھی وہ یہی کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ جو کچھ خواب میں دیکھا، کھایا، پیا اور سونگھا وہ
عالم بیداری میں بھی محسوس ہوتا رہا ایک شخص نے مثلاً یہ کہا کہ رات کو خواب میں ایک لذیذ میوہ کھایا تو جاگ کر
بھی میں وہ مزا نہ بھولا اور اُسی مزہ سے منھ اور زبان متلذذ رہی اور ایسا معلوم ہوا کہ ابھی ابھی میوہ حلق
سے اُترا ہے۔

یہ کیفیت بتاتی ہے کہ یا تو یہی حواس ظاہری خواب اور نیند میں بھی کام دیتے ہیں یا اُن ہی کے رنگ
میں اور اُن ہی کے نقش پر اسی قسم کے دوسرے حواس بھی باطن میں موجود ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس
طرح انسان دوربین اور خوردبین سے دور کی چیزیں اور چھوٹی چھوٹی اشیار خوبی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے
اسی طرح خواب میں بھی انسان کے حواس اور آنکھوں کی قوت اور بصارت بڑھ جاتی ہے اور انسان سوتے میں
بھی بیداری کی طرح حواسوں سے کام لیتا ہے۔

نفس ہی یہ رنگ بھی دکھاتا ہے کیونکہ جب بعض حکیموں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ روح ہی سب کچھ کرتی
اور کراتی ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ایک پرانا ہندی قول ہے:—

جاگرت سوپن سکوپت نریا   آتم کی یہ چاروں پہریا

سبب یہ کہ بیداری، سونا، گہری نیند اور مدہوشی یہ سب کیفیات روح ہی کے کوائف اور کرتب ہیں۔
چنانچہ مسٹر برکلے مشہور فلاسفر بھی کہتے ہیں کہ ظاہر اور باطن میں روح ہی سب کام کر رہی ہے ظاہر اور
باطن پر وہی حکمراں ہے۔

خواب سے مُراد

حواس ظاہری کے کچھ وقفہ کے لیے معطل ہونے اور روح کے ظاہر سے الگ ہو کر خصوصیت کے ساتھ
باطن سے وابستہ اور پیوستہ ہونے کا نام خواب ہے۔ اس ضمن میں بعض لوگ روح سے مراد وہ روح لیتے
ہیں جو اخلاط عناصر اربعہ سے وجود پذیر ہوئی ہے اس کے ساتھ ہی کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ
روح بہ نسبت حواس ظاہری کے حواس باطنی سے زیادہ تر پیوستہ اور مرتبط ہے اور اس حالت یا کیفیت
کو دوسرے الفاظ میں خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔

جب بخارات رطوبت بدنیہ کی وجہ سے دماغ کی جانب بلند ہوتے ہیں اور اس وجہ سے حواس ظاہری
میں کسی حد تک تعطل نافذ ہوتا ہے تو بحیثیت ایک قسم کی فراغت پانے کے ظاہری کوائف مائدہ سے
کچھ دیر کے لیے نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے تمام قوتوں اور جذبات میں ایک قسم کی

حدت ثانی رونما ہوتی ہے۔

خواب نوم اور خواب بیداری

بعض وقت جب ہم حالت بیداری میں آنکھ بند کر لیتے ہیں تو بھی کچھ کچھ کوائف پیش نظر ہوتے ہیں اور انھیں ہم ایک حد تک محسوس بھی کرتے ہیں اور ان کی ایک ہیئت و شکل قائم ہو جاتی ہے پھر ایک وقت تک ہمیں یہ کیفیات یاد بھی رہتی ہیں۔

اکثر پاگل اور مجنون بحالت جنون اپنے حواس ظاہری سے کسی حد تک بیگانہ ہو کر حواس باطنیہ کے زور سے کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں اور منھ سے کچھ بڑبڑاتے بھی ہیں ان میں سے بعض باتیں کسی قدر ٹھکانے کی بھی ہوتی ہیں لیکن پھر بھی یہ گویا ایک مجنونانہ خواب ہی ہوتا ہے۔ کچھ حکیموں نے ان کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ ایسے مجانین کی باتیں کبھی کبھی درست بھی نکلتی ہیں۔ اگرچہ وہ اصل میں صرف چند غیر مربوط الفاظ ہی ہوتے ہیں۔

رویائی کوائف

جو کچھ ہم خواب میں دیکھتے ہیں اس کا اکثر حصہ وہ ہوتا ہے جو ہم عالم بیداری میں پہلے دیکھ چکتے ہیں یا جو ہمارے مشاہدہ اور سماعت میں آچکا ہوتا ہے۔ بعض خواب اس قسم کے بھی ہوتے ہیں کہ جن میں ہم جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں وہ بحالت بیداری ہماری رؤیت اور سماعت میں بہت کم آچکا ہوتا ہے مثلاً ہم ایک ایسا ہوشربا حیرت افزا سماں دیکھتے ہیں کہ بیداری میں عمر بھر ایسا نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ گو اسباب کیفیت اور عناصر رؤیت بیداری ہی کے ہوتے ہیں لیکن بایں ہمہ اس سماں کی ہیئت اور کیفیت بیداری کی ہیئت اور کیفیت سے قطعاً متغائر ہوتی ہے۔

تصدیق خواب

بعض خواب راست ہوتے ہیں یعنے عالم بیداری میں وہ کلیتاً یا ادنیٰ تغیر جزئاً صادق اور ٹھیک اترتے ہیں اکثر خواب اس قسم کے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی تعبیرات اور کوائف رؤیت میں کچھ کچھ فرق تو ہوتا ہے مگر ان کی حقیقت وہی نکلتی ہے جو خواب میں مشاہدہ میں آئی تھی۔

اضغاث احلام

بعض خواب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ محض متوحش خیالات ہی کا نتیجہ کہے جا سکتے ہیں اُن کی اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی اس قسم کے خواب اُن لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں جن کے نفوس درازدہان ہیں بعض اوقات خیالات میں محو رہنے کی وجہ سے آلودگی اور ایک گونہ تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اکثر خواب اسی

ذیل میں آتے ہیں۔

بعض حکمائے دہر نے صداقت خواب کی یہ وجہ بتائی ہے کہ نفس موجودات، اور جو کچھ کہ مقدر ہوتا یا ہو سکتا ہے جواہر عقلیہ اور عالم معقولات کے صفحات پر ثبت رہتا ہے اور اس عالم معقولات سے مراد عالم روحانی ہے اور اہل شرع اس سے مراد لوح محفوظ لیتے ہیں۔ خواہ لوح محفوظ ہو اور خواہ جواہر عقلیہ اور خواہ کوئی اور صورت ہو۔ حس مشترک یا تخیل پر کسی ایسی صورت یا کسی ایسے مواد کا اثر ضرور ہوتا ہے اور انطباع خیالات سے ذہن نیند کی حالت میں حافظہ کی بدولت ان سے دوچار ہو کر خواب، دیکھتا اور یا خواب میں مختلف صورتوں کا تماشا کرتا ہے۔

جملہ مذاہب کے صحائف میں مختلف خواب درج پائے جاتے ہیں توریت کے صحائف میں بھی مختلف لوگوں اور مشاہیر وقت کے خواب درج ہیں کوئی کسی رنگ میں اور کوئی کسی رنگ میں۔ خواب بینی کا سلسلہ اس وقت یا اُس عہد سے ہے جب سے انسان دنیا میں آیا اور یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ خواص کو ہی خواب نظر آئیں اور عوام کو نہ آئیں اس سے کوئی بھی خالی نہیں ہے کم و بیش کی بات دوسری ہے۔

تعبیر خواب

خوابوں کی تین قسمیں ہیں:-

(۱) خواب صحیح۔

(۲) خواب معتدل۔ کچھ صحیح اور کچھ غلط۔

(۳) خواب محض خیال۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ خواب صحیح ہے یا اس میں کچھ غلطی بھی ہے اور کچھ صحت بھی تو اُس کا مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بہ لحاظ واقعات کے کچھ صحیح اور کچھ غلط ہے بلکہ یہ کہ وہ یا تو پوری طمانیت طبیعت اور صحت کی حالت میں دیکھا گیا ہو اور یا طبیعت پر انتشار کی کیفیت طاری ہو۔

وہی خواب قابل تعبیر و غور ہوتا ہے جو کسی وقت میں بہ حالت طمانیت طبیعت نظر آیا ہو۔ مدہوشی میں اول تو خواب دکھائی نہیں دیتا اور اگر دکھائی دیتا ہے تو گویا ایسا خواب اس حالت میں دیکھا جاتا ہے کہ جب حواس باطنی بھی کسی حد تک مختل ہوتے ہیں۔

بہت سی نظیریں اور ذاتی شہادتیں بتلاتی ہیں کہ اکثر خواب سچے بھی نکلتے ہیں اور اکثر محض اضغاث احلام ہی ہوتے ہیں بہر صورت یہ طلسم خواب بھی انسانوں کی زندگیوں کا ایک حیرت افزا طلسم ہے۔ خواب پر غور کرنا اور اُس کی حقیقت کی جستجو بھی ایک علمی مشغلہ ہے۔

جوہر

(حافظ منشی احمد علی علوی صاحب نکہت کاکوروی دبیر کامل و منشی کامل وغیرہ)

فیضان قدرت سے حضرت انسان کو ہزاروں قسم کی قوتیں اور طاقتیں حاصل ہوئی ہیں انھیں قوتوں میں سے ایک قوت متخیلہ بھی ہے۔ اور یہی قوت، انسان کی بلندیٔ نظر و شرف و عظمت کو ثابت کرتی ہے اور اسی قوت کی وجہ سے صدہا انسان ایسے بلند مراتب پر پہونچ گئے ہیں کہ جہاں بو علی سینا سا حکیم طارق جیسا جنرل اور محمود غزنوی جیسا شہنشاہ اپنی علمی و عملی و تدبیری طاقتوں سے بمشکل پہونچے۔ اسی قوت کی ترتیب و تہذیب کا نام شاعری رکھا گیا۔ سعدی، خیام، شیکسپیر، فردوسی اور اقبال کی عظمت کا راز اسی قوت کا کرشمہ ہے۔

شعر کیا ہے؟ اس کے متعلق کچھ لکھنا اگرچہ بہت مشکل ہے تاہم چند اکابر سلف کے خیالات یہ ہیں:-

رسول اللہ صلعم نے فرمایا اِنَّ مِنَ الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا (بعض شعر حکمت ہیں) اور بعض بیان جادو)۔

حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا "شعر ایسی چیز ہے کہ اُس کے پڑھنے سے بخیل فیاض، نامرد بہادر اور جاہل عالم ہو جاتے ہیں"۔

ارسطو کا خیال ہے کہ شعر جذبات کی صحیح مصوری کا نام ہے۔

افلاطون نے کہا کہ احساس کی نزاکت شاعری ہے۔

ملٹن کے نزدیک ادراک و احساس کی سچائی و سادگی کا نام شاعری ہے۔

شیکسپیر کہتا ہے دیوانہ، عاشق، شاعر، قوت تخیل کے تنزل، بے حسی اور تہذیب کے جدا جدا نمونے ہیں اور بقول حسرت موہانی سب سے زیادہ موثر شئے شعر ہے۔

محمد علی جوہر کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر اُن کی سوانح عمریوں میں روشنی ڈالی جا چکی ہے، اُن کی عظمت اور بلندیٔ مرتبت سے ایک عالم روشناس ہے مگر اُن کی شاعری کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لیے اگلی سطور میں اُن کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

جوہر کی شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے شعر کی اصلی تعریف کا خیال رکھا جائے۔ جوہر نے جو کچھ کہا وہ اگرچہ بہت مختصر ہے مگر ان کے اشعار میں اُن کے صحیح خد و خال نمایاں ہیں اور اُن کا ہر شعر اُن کی زندگی کی تصویر اور اُن کے قلبی تاثرات کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اُن کا ہر شعر سرگرمی، جد و جہد اور عمل کا آئینہ دار ہے۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو — خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

محمد علی (روحی فداہ) کی فطرت میں قوت شاعری ودیعت کی گئی تھی، بچپن ہی سے اُن کو شعر سننے اور کہنے کا شوق تھا اُن کے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر کی صحبت اور امیر و داغ و جلال جیسے باکمال اساتذہ کی ہمنشینی سے اس قوت میں ترقی ہوئی مگر وہ مجسمۂ عمل تھے لہذا جس وقت وہ جیل کی چار دیواری میں محبوس ہوتے یا کسی اور وجہ سے عمل سے مجبور و معذور ہو جاتے تھے تو اُن کے اشعار دنیا کے لیے پیام عمل بن کر ظاہر ہوتے تھے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

محمد علی کی شاعری حقیقتاً قوم کے لیے درس زندگی ہے اور اُن کا ہر شعر ہمارے لیے جہاد زندگی، تحفظ شرف انسانی اور حیات قومی کی جد و جہد کا پیام ہے، وہ ہر مسلمان کو بتلاتے ہیں کہ قوت ایمانی کیا ہے اور کتنی مستحکم ہونا چاہیے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اکثر اردو شعرا کی رسم قدیم کے مطابق جوہر کی جولانگاہ بھی صرف صنف غزل ہے، آج کل کے تعلیم یافتہ مغربی مذاق شعر سے متاثر ہو کر غزل کی پابندی ردیف و قوافی کو کتنا ہی بُرا کہیں مگر یہی وہ صنف ہے جس کی محدود دسر زمین پر حافظ نے بادیہ پیمائی کی سعدی نے صدہا رنگ کے پھول اسی خشک و بنجر زمین پر کھلائے اور اُن کی خوشبو آج تک باقی ہے، میر نے حقائق حیات اور زندگی فانی کے اسرار و رموز اپنی پرسوز وگداز لے میں اسی باغ کے اندر سنائے، غالب نے اسی سرزمین میں موت و زیست کے فلسفہ کی عقدہ کشائی کی اور اسرار زندگی کی گرہیں سلجھائیں۔ جوہر نے بھی زیادہ تر اسی بدنام صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنی خوش فکری سے دنیا کے لیے ایک درس عمل کا اضافہ کیا۔

محمد علی کی شاعری میں عشق کی چاشنی بھی موجود ہے اور عشق بھی کیسا کامیاب، آپ دیکھیں کہ واقعی جوہر کی نظر عشق کی بلندیوں اور اُس کے تمام پہلوؤں پر پہونچی ہے یا نہیں۔

پہلی جھلک: اسیری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں — بندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے
دوسری جھلک: تجھے تسکین دل پایا تجھے آرام جاں پایا — نہاں بھی ہے تو کیا تجھ کو جہاں ڈھونڈھا وہاں پایا۔

ہمیں ہر چیز میں آئی نظر یارب ادا تیری — وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے تجھ کو بے نشاں پایا

ساتھ ہی ساتھ جب کبھی شورش پیدا ہوتی ہے تو بارگاہ حسن میں دیدار کی تمنا بھی کی جاتی ہے مگر آپ دیکھیں

کہ کس انداز کے ساتھ۔

رونمائی کے لیے لایا ہوں جاں — اب تو شاید چہرۂ انور کھلے

اور جب یہ شورش زیادہ ہوتی ہے تو بالکل اچھوتے طرز سے عرض کرتے ہیں

تاخیر میں کچھ حرج نہیں، یہ تو بتا دو — ہے مدنظر وصل بھی یا اور ہی کچھ ہے

مگر پھر عشق کے زریں تاج پر نظر پڑتی ہے تو مودبانہ عرض کرتے ہیں۔

کرنا نہ گماں ہم پہ گماں اہل ہوس کا — عشاق کی نیت بخدا اور ہی کچھ ہے

حسن و عشق کی جنگ ہمیشہ ہوتی رہتی ہے مگر عشق کا طریقہ جنگ صبر و رضا ہے اور حسن کا طریقہ رزم ظلم و جفا لیکن جوہر نے اپنے عشق میں صبر و رضا کے ساتھ شوخی بھی پیدا کی ہے۔

ہم تو سمجھے تھے کہ ہوں گے اور بھی ظلم و ستم — حوصلہ کچھ بھی نہ نکلا آپ کے بیداد کا

جوہر زندہ دل تھے ناکامی کا خیال بھی اُن تک نہ آتا تھا گر آرزوئیں بھی بہت تھیں، ہر کامیابی کے بعد دوسری آرزو پیدا ہوتی تھی مگر اس کا اظہار کنایۃً و اشارۃً ہوتا ہے اور عجیب نرالے پیرائے میں۔

سنگ در تک تو بہر کیف رہائی بخشی — دیکھوں کیا کیا مرے سرکار کو منظور ہے آج

اسکے بعد ہمت کی بلندی ورنرالے پیرائے میں ظاہر ہوتی ہے۔

رقص بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجئے — حسن مسئول نہیں، عشق بھی مجبور ہے آج

موت و حیات کا فلسفہ ایک پامال مضمون ہے گر جوہر نے جو سدا بہار پھول اس سرزمین پر لگائے اُن کی مہک آج تک بدستور باقی ہے۔

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ جس میں نہ ہو تیری آرزو — باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

شاید کہ آج حسرت جوہر نکل گئی — اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

حیات جاوداں کے معنی جوہر نے خوب سمجھے تھے۔ دیکھیے کتنی سچی بات کہی ہے۔

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے — ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لیے ہے

ہم عیش دو روزہ کے بھی منکر نہیں لیکن — ایمائے رشہ کرب و بلا اور ہی کچھ ہے

ملٹن نے شاعری کی بنیاد جوش، سادگی اور اصلیت پر قائم کی ہے۔ جوہر کے کلام کو پڑھیے یہ تینوں چیزیں کمال کے ساتھ اُن کی غزلوں میں ملیں گی۔

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی — ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی — اب دورِ اعتدال میں دار و رسن کہاں
جنسِ گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہ جاں — لائے ہیں ہم بھی رونقِ بازار دیکھ کر
مستوجبِ دار کو حکمِ نظربندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی
تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھیے — کب درِ میخانۂ کوثر کھلے

مرثیہ کی صنف بھی شاعری کی ایک قسم ہے۔ میر انیس و مرزا دبیر اسی بحرِ شاعری کے شناور تھے مگر اُن کے مرثیے اہلِ بیت و اصحابِ اہلِ بیت کے لیے مخصوص ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں امام حسینؓ اور اُن کے اہل و اصحاب کی شہادت ایک ایسا واقعہ ہے کہ اُس سے زیادہ پُراثر و دردناک سانحہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ نیز مسلمانوں کو اہلِ بیت سے جو محبت و عقیدت ہے اُس نے اس واقعے کے متعلق مراثی کو اور زیادہ پُراثر بنا دیا۔ مراثی اہلِ بیت کے علاوہ بھی بعض اشخاص کے مرثیے لکھے گئے ہیں جن میں محمود غزنوی کا مرثیہ فرخی کے قلم سے اور شہزادہ محمد کا مرثیہ حضرت امیر خسرو کے قلم سے فارسی شاعری کا سرمایۂ ناز ہیں۔ اُردو میں بھی بہت سے اشخاص کے مرثیے ہیں جن میں غالب و حالی اور شبلی کے مرثیے بہت خوب ہیں۔ جوہر نے بھی اپنے دوست غلام حسین مرحوم کے مرنے پر ایک مرثیہ کہا ہے اُس کو پڑھیے اور دیکھیے کہ اس میں مرثیہ کی خصوصیات کس حد تک پائی جاتی ہیں۔ غالب و جوہر کے مرثیے ایک ساتھ پڑھیے تو جوہر کی قوتِ سخن گوئی کا اندازہ ہوگا:—

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعامِ حق پرستی کے
ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
تم تو دل بھی فگار کر کے چلے
زخم ہائے جگر سیے ہوتے
یوں نہ دامن چھڑا کے چل دیتے
تم گر اس بزم کے لیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی
کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کھلتا بہشت کا رستہ
ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

ناداں ہو جو کہتے ہو کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

آج جوہر ہیں دل کے قاش فروش
کاش کچھ اور قافیے ہوتے

اب ہم جوہر کے چند متفرق اشعار پیش کرتے ہیں جس سے ارباب سخن کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کا یہ رُخ بھی اُن کی زندگی کے اور رخوں کی طرح کتنا شاندار ہے۔

وہ ساقی جس نے مچھٹ تک نہ چھوڑی فکر فردا میں اُسے کوثر پہ ہم نے تشنہ لب گاہے کشاں پایا
نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پر اتنا ہے کہ اُن کا نام محمدؐ مرتے دم ورد زباں پایا
جب اپنی پوری جوانی پہ آ گئی دنیا تو زندگی کے لیے آخری نظام آیا
بچ گیا بھی جو انا الحق سے تو انت الحق ہے میرے نالے میں بھی کچھ مستیٔ منصور ہے آج
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
ہے کس کے بل پہ حضرت جوہر یہ روکشی ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد
گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں مارو دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور
آساں نہ تھا تقرب شیریں تو کیا ہوا تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر ڈرتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
شدت غم سے زباں گر بند ہے تو ہی کہہ دے چشم گریاں الوداع
کیا ڈھونڈھتے ہو فصل خزاں میں بہار کو اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگ چمن کہاں
سن لیجے خلوتوں میں انا الحق کا ادعا سولی پہ چڑھ کے سُنائے وہ اب نعرہ زن کہاں
سنتے ہی جس کے اُن کے بھی آنسو نکل پڑے جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو
اک تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں اور یوں نہ ہو بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو
ہم کو تو ایک تجھ سے دو عالم میں ہے غرض سب بدگماں ہوا کریں تو بدگماں نہ ہو
ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو
جوہر اس ایک دل کے لیے اتنے مشغلے کی ہے خدا کی چاہ تو عشق بتاں نہ ہو
[illegible] کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ
[illegible] اللہ کے بندوں کو نہ اس درجہ ستا دیکھ
[illegible] ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی

رسب با عزت کیلیے بھی کوئی رہنے دو خطاب — تم خداوند ہی کہلاؤ "خدا" اور سہی

لو وہ آ پہونچا سب ہنوں کا قافلہ — پاؤں زخمی ناک منہ پر سر تھکے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر — مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا — اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر — کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو — خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

خود خضرؑ کو شبیرؓ کی اس تشنہ لبی سے — معلوم ہوا آب بقا اور ہی کچھ ہے

بجھ گئی تو یہ جو گرمی ہے تو کیا — سوچتا ہوں ساتھ بر سا ہے کم

شمع ایماں کو خدا روشن رکھے — قبر میں جوہر کی تو بس ہی را ہے کم

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے — خضرؑ کیا جانیں بھلا راہ نمائی کے مزے

سمجھے ہر سجدے کو معراج جو زاہد چکھ لے — در تو بہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے

جوہر نے چند نظمیں بھی کہی ہیں مگر وہ بالکل غزل مسلسل کے طور پر ہیں اور بعض مقامات کی تعریف میں اس لیے اُن کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتا اور آخر میں اُن کی ایک غزل لکھ کر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔ جوہر کی ساری زندگی خانہ ویرانی کی زندگی تھی اُن کی داستان درد اُن کی زبان سے سنیے:-

گھر چھٹا یوں کہ چھوٹنے والے — تھے نہ ہم اور کے آ تلنے کے

ایک اک کر کے سب کے سب تنکے — ہوئے برباد آشیانے کے

کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا — ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے

دیکھیے اب یہ گردش تقدیر — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

اس کے باوجود اُن کی زندہ دلی اور طبیعت کی شگفتگی اب بھی باقی ہے۔

قید میں اور اتنی بے باکی — سبب یہ پھنس کر اور کھلنے کے

کلام جوہر۔ مع مقدمہ مولوی عبدالماجد بی۔ اے ۸ر الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

خون خوبان

(جناب حکیم منشی انوار علی صاحب جگر صدیقی بسوانی)

بجز خاک خوباں دریں دشت نیست — بجز خون شاہاں دریں طشت نیست

سلطان بایزید کا زمانہ ہے اسلامی مغربی فتوحات بڑے شد و مد سے جاری ہیں۔ بروسا پایۂ تخت سے سلطان مغربی سرحدی لڑائیوں میں مشغول ہیں۔ سلطان کے دو صغیر سن لڑکے ہیں اور ایک خوبصورت بھتیجی صالحہ سلطانہ پوری جوان ہو چکی ہے اس کی قابلیت شجاعت حسن انتظام کی وجہ سے سلطان اس سے بیحد محبت کرتا ہے اور تمام انتظامات سلطنت اس بہادر سلطان کی عدم موجودگی میں صالحہ کے سپرد کیے جاتے ہیں صالحہ کی شادی کا تذکرہ کسی ترکی شاہزادے کے ساتھ چھیڑا گیا لیکن دور اندیش شاہزادی نے اس حیلے سے ٹال دیا کہ میں شادی کے لوازم سے دینی تعلیم کے فرائض کو مقدم سمجھتی ہوں جب تک درس دینیات سے فارغ التحصیل نہ ہو جاؤں گی اس مہمل خیال سے معذور رہوں۔

ہم جس وقت کا حال بیان کرتے ہیں صالحہ بروسا کی سلطانی محلسرا میں مخملی کوچ پر آرام سے بیٹھی ہے اس کی ترکانہ سیاہ دلفریب آنکھیں اس گلاب کے شاداب پھول پر جھکی پڑتی ہیں جو سامنے کے خوشنما گلدستے میں اپنی زندگی کی آخری بہار دکھا رہا ہے۔ خواص سامنے آکر دست بستہ عرض کرتی ہے۔

خواص۔ حضور کے چچا زاد بھائی توفیق آفندی سرکار کے سامنے باریابی چاہتے ہیں۔

صالحہ۔ ہاں ہاں۔ توفیق کو بلاؤ۔

توفیق آکر سلام کر کے سامنے دوسرے کوچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

صالحہ۔ آپ اس وقت خوب آگئے میں بلوانے والی تھی۔ شہر میں خبر مشہور ہو رہی ہے کہ مغلوں کا کوئی لشکر ہمارے مقبوضات پر حملہ آور ہوا ہے۔

توفیق۔ جی ہاں یہ خبر بالکل صحیح ہے تیمور لنگ بیشمار مغلوں کا لشکر لے کر ہماری سلطنت کی شمالی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔

صالحہ۔ تو آخر اس طوفان کو روکنے کا کوئی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

توفیق۔ میں فوجی حلقوں سے سب حالات دریافت کر کے آرہا ہوں۔

صالحہ۔ کیا انتظام کیا گیا ہے۔

توفیق۔ چچا جان مغربی سرحد پر جرمنی اور فرانسیسی فوجوں سے لڑ رہے ہیں اور وہاں سے عنقریب لشکر کا

ایک زبردست حصہ اپنے ساتھ لے کر تیمور کے مقابلے کے لیے روانہ ہونے والے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ پہلے ہی حملے میں دشمن کو پیس ڈالیں گے۔

صالحہ۔ اور اگر یہ سیلاب رو کے نہ رکا تو کیا حشر ہوگا؟

توفیق۔ شیر دل شاہزادی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سلطان بایزید کا اقبال زبردست دشمن کو ضرور خاک میں ملائے گا۔

صالحہ۔ میرا خون خود بخود جوش کھا رہا ہے میں بھی ان حدود کی طرف روانہ ہو جاؤں گی جہاں میرے اقبالمند چچا کو اپنے زبردست دشمن سے سامنا کرنا پڑے گا۔

توفیق۔ لڑائی کا ہر پہلو خطرناک ہوا کرتا ہے آپ کا جانا ہرگز قرین مصلحت نہیں۔

صالحہ۔ تعجب ہے، ایک بہادر ترک جوان کی زبان سے میں ایسے الفاظ سنتی ہوں۔

توفیق۔ ہم جانبازان سلطنت جاں نثاری کے لیے کافی ہیں آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

صالحہ۔ کیا یرموک کی لڑائی میں خولہ بنت ازور اور ام ابان مشہور اسلامی بہادر خواتین نے جو کچھ کیا تاریخی صفحات پر آب زر سے نہیں لکھا گیا۔

توفیق۔ ایسی حالت نہیں ہے یرموک میں کئی لاکھ پیروان صلیب تھے۔ اور مجاہدین اسلام صرف چالیس ہزار اس طرح تھے گویا بڑے تالاب پر روغن کا ایک داغ۔ بیشمار صلیبی ذہن کبھی کبھی چھا لیتی تھیں اور کبھی اسلامی تلواروں کی چمک اسے نمایاں کر دیتی تھی پھر بہادر عورتیں تلوار سونت کر کیوں نہ سامنے آ جاتیں۔

صالحہ۔ یہاں بھی وہی آثار ہیں۔ میرے پیارے چچا کے ہمراہ فوج بہت کم ہے میں نے سنا ہے تیمور کے ہمراہ تین لاکھ سپاہی آئے ہیں، ایسی حالت میں میری موجودگی بہت ضروری ہے میرے ہونے سے میرے چچا کی فوج میں ایک سپاہی بڑھ جائے گا۔

توفیق۔ اگر چلنے کا ارادہ ہے تو مجھے آپ حکم دیں تاکہ دار السلطنت کی محافظ سپاہ میں سے چھٹے ہوئے لوگ ساتھ لے کر میں بھی چلوں۔

صالحہ۔ ترکوں میں انتخاب کی ضرورت نہیں ہر ترک نے بہادر ماں کی گود میں پرورش پائی ہے صرف سلطانی محل سرا کا ترکی محافظ دستہ میرے ہمراہ جائے گا۔ سلطانہ جہاں پناہ کے ہمراہ ہیں میرے ملنے سے انھیں بعید مسرت ہوگی چھوٹا شاہزادہ سخت بیمار ہے بڑے شاہزادے صاحب یہاں اس کے نگراں حال رہیں گے۔

توفیق۔ میں پھر کہوں گا آپ کا سفر خطرے سے ہرگز خالی نہیں لیکن آپ جس وقت چلیں میں ہمراہ ہوں اور آپ کے قدموں پر اپنی جان قربان کرنا فرض سمجھتا ہوں۔

(جگر) جو ہم کہیں تم کبھی نہ سننا جو ہم کہیں تم کبھی نہ کرنا جو کچھ کہو تم وہی کریں ہم جو ہم کہیں تم وہی نہ کرنا

میدان جنگ

(جگر) دیکھ سے شوخ نگاہوں سے ادھر اے قاتل تیر جو پڑتے ہیں دل پر وہ مزا دیتے ہیں

فرانس اور جرمنی کی متحدہ فوجیں ترکی لشکر کے سامنے صف آرا ہیں۔ سلطان بایزید یلدرم (برق جہندہ) اپنی فوج کی ترتیب میں مشغول ہے سواروں کے دستے الا اللہ کے نعرے لگا کر حملے کر رہے ہیں اور دشمن پوری قوت سے ان حملوں کو روک رہے ہیں۔ میدان جنگ میدان قیامت کا نمونہ بنا ہوا ہے کہیں زخمی زمین پر پڑے سسک رہے ہیں کہیں مقتولوں کی لاشیں گھوڑوں کے زبردست سموں سے پامال ہو رہی ہیں۔ بہادر سلطان اپنے شجاعان لشکر کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ شیر دل ترکو مجھے سخت تعجب ہے دشمن ہمارے حملے روک رہا ہے کیا ترکی تلوار کی باڑھ کند ہو گئی۔ آؤ۔ بڑھو۔ ہمت سے کام لو اور بات کہتے بساط جنگ کو الٹ دو۔ اس حملے میں سلطان کے ساتھ لشکر دریا کی تیز دھار کی طرح بڑھتا ہے اور دشمنوں پر گرجتے ہوئے بادل کی طرح پھیل جاتا ہے یہ پر جوش طوفان جرمنی اور فرانس کی فوجوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ترک میدان جنگ کے مالک ہو جاتے ہیں۔

سلطان بایزید کھانا کھا کر شاہی خیمے میں قہوہ پی رہا ہے وزیر حاضر ہو کر عرض کرتا ہے۔

وزیر۔ خدا ہمارے سلطان کی عمر دراز کرے دار السلطنت سے آج جو کاغذات آئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ تیمور ایک بڑا لشکر لے کر ہمارے مقبوضات پر حملہ آور ہوا ہے اور بہت زیادہ فوج اس کے ساتھ ہے۔

سلطان۔ اس لنگڑے ڈاکو نے بڑا اندھیر مچا رکھا ہے مگر بایزید کی تلوار کی آنچ سے ناواقف ہے۔

وزیر۔ تو حضور والا کیا حکم فرماتے ہیں۔

سلطان۔ پچاس ہزار ترک ہمراہ لے کر میں علی الصباح روانہ ہو جاؤں گا باقی فوجوں سے تم یہاں کا انتظام کرو۔ خدا چاہے گا تو ترکی مقبوضات پر حملہ کرنے کا مزہ اس کو چکھا دوں گا۔

وزیر۔ سلطان عالم پچاس ہزار فوج بہت کم ہے۔ آپ دار السلطنت جا کر زیادہ جمعیت فراہم کریں اس کے بعد دشمن کے مقابلے میں تشریف لے جائیں۔

سلطان۔ جس طرف زیادہ فوج ہو گی زیادہ مارے جائیں گے میرے پچاس ہزار لڑنے والوں کو دشمن کا ٹڈی دل لشکر ہرگز روک نہ سکے گا۔

وزیر۔ یہاں ہماری فوجیں عرصہ سے لڑ رہی ہیں اور پھر صعوبت سفر برداشت کر کے دشمن کے سامنے جانا ہے ہمارا لشکر تھوڑا آرام کرنے کے بعد مقابلہ کرتا تو خوب ہوتا۔

سلطان۔ یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ترک سپاہی کیسے ہی تھکے ہوں دشمن کو دیکھ کر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

وزیر۔ کیا سلطانہ بالقابہا دارالحکومت تشریف لے جائیں گی۔

سلطان۔ وہ میرے ساتھ جائیں تو اچھا ہے اگر انھیں مکان بھیجتا ہوں تو کچھ فوج انکے ساتھ بھیجنا پڑیگی۔

وزیر۔ ہاں یہ تو ضرور ہے اس وقت ایک سپاہی کو بھی جہاں پناہ کی ہمراہی سے علیحدہ نہ ہونا چاہیے۔

سلطان۔ توفیق کو لکھ دو کچھ منتخب فوجیں اپنے ساتھ لے کر ہم سے سرحد پہ ملیں۔

وزیر رخصت ہوتا ہے۔

(جگر) کشش دل ہے جو کام اپنا کیے جاتی ہے　　موت کھینچے در قاتل پہ لئے جاتی ہے

صحرائی ترکانہ لڑکی

(جگر) تو دل آرا ہے تری زلف رسا اچھی ہے　　لمبے بالوں کے بکھرنے کی ادا اچھی ہے

ایشیائے کوچک میں جو پہاڑی راستہ دمشق کی طرف گیا ہے اس کی ایک سرسبز وادی میں صد ہا بکریاں چرتی ہوئی نظر آتی ہیں، پندرہ برس کی ایک حسین لڑکی ان بکریوں کی محافظ ہے وہ صحرائی وضع کا رنگین لباس پہنے ہے۔ قدرت نے اُس کے گلابی گالوں میں جوانی کا رنگ بڑی کارگیری سے بھرا ہے۔ شباب کا نشہ اُس کی جان بیوا آنکھوں میں دلفریب خمار پیدا کیے ہے۔

(نفا) ہم نے دیکھی ہے کسی شوخ کی مستی بھری آنکھ　　ملتی جلتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

شباب کی مسرت اس کے معصوم دل کو باغ باغ کیے ہے اُس کے حسن کا بے لوث پھول ایسا ایک پھول ہے جس کو قدرت نے ایسی جگہ شگفتہ کیا ہے جہاں کسی کا ہاتھ نہ پہونچا ہو تناسب اعضا نے اُسکا تمام جسم سانچے میں ڈھال دیا ہے

(جگر) قاتل عالم ستمگر تیری انگڑائی ہوئی　　کیا کرے گی یہ جوانی جوش پہ آئی ہوئی

آزاد آب و ہوا کی پروردش یافتہ لڑکی کس قدر خوش و خرم نظر آتی ہے کبھی صحرائی پھول توڑ توڑ کر ہار بناتی ہے اور کبھی میوے یکجا کر کے خود بھی کھاتی ہے اور اپنے رفیق بے زبان جانوروں کو کھلاتی ہے۔

(جگر) جانتے ہیں اُسے عشق قد بالا کا اسیر　　سرو آزاد کو وہ کہتے ہیں آزاد نہیں

دفعۃً گھوڑے کے سموں کی آہٹ کانوں میں پہونچ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ پہاڑی راستے پر ایک ترکی فوج گذرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ خوبصورت لڑکی بڑھ کر پوچھتی ہے کیا تم لوگ شکار کھیلنے جاتے ہو؟

ایک جوان عورت جو ہاتھ میں تلوار لیے ہے کہتی ہے۔

اے گل بدن لڑکی ہم تیمور کے لشکر کو چڑیوں کی طرح ذبح کرتے جا رہے ہیں۔

لڑکی۔ اے ہماری سرتاج خاتون کیا کسی دشمن نے ہمارے ملک پر چڑھائی کی ہے۔

جوان عورت۔ ہاں ایک لنگڑا دشمن ہمارے ملک کی طرف بڑھ رہا ہے۔

لڑکی۔ اے بی بی ہمارا سلطان آپ کا کون ہے؟

جوان عورت۔ تیرا سلطان میرا پیارا چھوٹا چچا ہے۔ وہ آگے جا چکا ہے میں بھی اُسے مدد دینے جارہی ہوں۔ صالحہ میرا نام ہے کبھی سلطانی محلسرا میں آکر مجھ سے ملنا۔

لڑکی۔ (بڑھ کر رکاب کا بوسہ دیتی ہے) آپ دم بھر ٹھہریں میں آپ کو اپنی بکریوں کا تازہ دودھ پیش کروں اور لذیذ میوے توڑ کر سامنے لاؤں۔

صالحہ۔ اچھا میں فوج کو یہاں کچھ دیر قیام کا حکم دیتی ہوں۔ تیرا کیا نام ہے؟

لڑکی۔ میرا نام سارا ہے۔ ماں باپ مر گئے ہیں صرف ایک بھائی ہے جس کا نام شہنواز ہے۔

سارا دودھ اور میوے لاتی ہے صالحہ خوشی سے کھاتی ہے اور کہتی ہے۔

صالحہ۔ کیوں سارا کیا اس وادی میں کچھ شکار نہیں ہے۔

سارا۔ سب جانوروں سے زیادہ شیر تھے لیکن معزز سلطانہ میرے تیروں نے سب کا خاتمہ کر دیا چند شیر باقی رہ گئے ہیں جو میری صورت دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ابھی جب میں سرکار کے لیے میوے چن رہی تھی ایک شیر دکھائی دیا جو سامنے آبشار کی طرف گیا ہے۔

صالحہ۔ تو چلو ہم تم چل کر تیر اندازی کریں۔

سارا۔ میری سرتاج تشریف لے چلیں۔

دونوں تیر کمان لے کر ایک اونچی پہاڑی پر سے نگاہ کرتی ہیں۔

سارا۔ سلطانہ وہ دیکھیے سامنے شیر پانی کے قریب ہے۔

صالحہ۔ اچھا ہم تم دونوں ایک ساتھ تیر لگائیں۔

سارا۔ میں پیشانی پہ تیر لگاؤں گی۔

صالحہ۔ اور میں دل پر۔

کمانیں کھنچتی ہیں اور دونوں تیر ایک ساتھ شیر پر پڑتے ہیں۔ زخمی شیر کئی ہاتھ اُچھل کر زمین پر غراتا ہوا گرتا ہے۔ دونوں خوبصورت شکاری شیر کو بے حس و حرکت دیکھ کر واپس آتے ہیں۔

(امیر مینائی) ملا کر خاک میں آئے ہو کس کو   یہ کیسی گرد دامن پر پڑی ہے

سارا صالحہ کو اپنے مختصر صاف مکان پر لے جاتی ہے جو سیب کے شاداب درختوں کی آڑ میں ہے۔

صالحہ کی [illegible] تیر کمان لیے ہوئے اُس کے ہمراہ ہیں۔

[illegible] دستے [illegible] ہیں آپ کہاں جائیں گے   ہم بھی جائیں گے وہاں آپ جہاں جائیں گے

عساکر تیموری

سنہ ۱۴۰۲ء کے پہلے مہینے کا دوسرا ہفتہ ختم ہو رہا ہے شام کے آفتاب کی ٹھنڈی روشنی میں ایک چھوٹے دریا کے کنارے تیمور کا ٹڈی دل لشکر میدان میں بہت دور تک پھیلا ہے۔ سپاہی صبر اور اطمینان سے اپنی شب باشی کے انتظام میں مصروف ہیں۔

تیمور ایک بلند چبوترے پر جس پر شامیانہ نصب ہے بھاری پوستین پہنے اپنے فوجی افسر قرا خاں سے گفتگو میں مشغول ہے۔

تیمور۔ کیوں قرا خاں تم نے جاسوسوں سے کیا حال دریافت کیا؟

قرا خاں۔ (ادب سے سر جھکا کر) حضور والا کے اقبال سے سب حالات معلوم ہو گئے۔

تیمور۔ بایزید اس وقت کس مقام پر ہے۔

قرا خاں۔ ہم سے اس سے تیس فرسنگ کا فاصلہ ہے اور ہم بہت اچھے مقام پر اس کے منتظر ہیں وہ صبح کو یہاں پہونچے گا اور اسی وقت زبردست تازہ دم دشمن سے مقابلہ کرنا پڑے گا حضور والا اس کی تھوڑی سی فوج ہمارے سامنے گھڑی بھر بھی نہ ٹھہر سکے گی۔

تیمور۔ لیکن بایزید کو اپنی ذاتی شجاعت اور اپنے ساتھیوں کے کارناموں پر بڑا ناز ہے۔

قرا خاں۔ خداوند نعمت ہمارے بہادروں نے بڑے بڑوں کا غرور خاک میں ملا دیا ہے۔ بایزید کی لاش بھی کل زمین پر تڑپتی ہوگی۔

تیمور۔ نہیں قرا نہیں ایسا نہ خیال کرنا چاہیے۔ جنگ دو سر دارد۔ بایزید کے ساتھ بہت تجربہ کار فوج ہے۔

قرا خاں۔ وہ کچھ ہو۔ اقبال تیمور ہمارے ساتھ ہے تو ہمیں دشمنوں سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

تیمور۔ یاد رکھنا بایزید اور اس کا ایک ایک سپاہی جان لڑا کر لڑے گا پھر نتیجہ چاہے جو کچھ ہو۔

قرا خاں۔ سرکار والا تبار آپ کے غلام آپ کے جاں نثار کیا کوئی بات اٹھا رکھیں گے۔

تیمور۔ ہاں کوشش کرنا ہمارا کام ہے فتح دینا دوسرے کے اختیار میں ہے۔ اچھا ذرا لطیف خاں سمرقندی افسر کو میرے سامنے بلاؤ۔

لطیف خاں ادب سے سر جھکا کر سامنے حاضر ہوتا ہے۔

تیمور۔ کیوں خان تم ایک مسن تجربہ کار سردار ہو تمہاری کیا رائے ہے ہمارے تین لاکھ بہادروں کو بایزید کے چالیس ہزار ہمراہی جن کی وقعت چیتھڑوں کے بنے ہوئے گڈوں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی میدان جنگ سے ہٹا دیں گے۔

لطیف خاں۔ (غور اور فکر سے تردد آمیز لہجے میں) حضور کے عمر و اقبال میں ترقی ہو میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ کمزور دشمن کو زبردست دشمن سمجھ کر مقابلہ کیا ہے اور زبردست دشمن سے اس وقت تک مقابلے میں تامل کیا ہے جب تک اُس کے برابر قوت نہیں پیدا کر سکا ہوں۔

تیمور۔ آپ کا تجربہ بہت سچا تجربہ ہے قراخاں کا خیال ہے کہ وہ پہلے حملے میں بایزید کو برباد کر دیں گے۔

لطیف خاں۔ ہم کو خواب میں بھی ایسا خیال نہ کرنا چاہیے۔ ہاں کثرت اکثر قلت پر غالب ہوتی ہے لیکن ایسے بھی سامان پیدا ہو جاتے ہیں کہ قلت کو کثرت پر غلبہ ہو جاتا ہے ہم کس بنا پر کل کا فیصلہ آج کر سکتے ہیں

قراخاں۔ آپ تو ایک تجربہ کار افسر ہیں ہم لوگ اگر بایزید کی فوج کو پتھروں سے ماریں گے تو وہ سنگسار ہو جائیں گے۔

تیمور۔ میری یہ غرض نہیں ہے کہ میں بایزید کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دوں۔ میرا صرف یہ منشا ہے کہ تیموری جھنڈا ہفت اقلیم پر نصب ہو جائے۔

لطیف خاں۔ اکثر ممالک فتح ہو چکے صرف چین کا وسیع ملک باقی ہے۔

تیمور۔ اس مہم کے اختتام پر میں اپنی فوجیں چین کی طرف لے کر مراجعت کروں گا۔

قراخاں۔ (دست بستہ ادب سے) حضور والا کچھ فوجی جاسوس اور خبریں لے کر آئے ہیں۔

تیمور۔ کیوں بایزید کہاں ہے۔

افسر جاسوس۔ سرکار اُس کی فوجیں ہم سے بہت قریب پہونچ گئی ہیں۔ بایزید نے شام کو کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیام کیا اور پھر فوراً کوچ کر دیا۔

تیمور۔ فوج کا تم نے اندازہ کیا کس قدر ہوگی۔

افسر جاسوس۔ پچاس ہزار مضبوط غرق آہن جوان معلوم ہوتے ہیں۔

تیمور۔ کس وقت تک تم اُن کے یہاں پہونچنے کی امید کرتے ہو۔

افسر جاسوس۔ بعد طلوع آفتاب دن کے پہلے پہر میں وہ یہاں ضرور پہونچ جائے گا۔ ہم لوگ اپنے پہاڑی گھوڑوں کو بہت تیزی سے لائے ہیں۔

تیمور۔ (قراخاں سے) محافظ دستوں کو فہمائش کر دو بہت ہوشیاری سے صبح تک ہماری حفاظت کریں اب ہم کو کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔

(جگر) دل بیمار کی حالت نہیں دیکھی جاتی ــــ شمع بالیں ابھی رونا ہے مجھے ساری رات

مسلم رُسوا

(جناب پروفیسر محمد مسلم صاحب عظیم آبادی، ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل)

سینہ کا داغِ محبت سے فروزاں[1] ہونا — آنکھ کا اشک کے نظارہ سے گریاں ہونا
شرطِ توحید، مساواتِ عمومی کا نفاذ — اصلِ اسلام، خدائی کا نگہباں ہونا
مسلمِ احق وہ فدائی، کہ مرے قبل از موت — سمجھے معراج جو حق کے لیے قرباں ہونا
تختۂ دار پہ چڑھنا ہو جسے جلوۂ تخت — مصر کی بادشہی، قیدیٔ زنداں ہونا
نہ تو اے ننگِ خدائی کہ سمجھ رکھا ہے — ٹھیکہ کو نین کا اک نامِ مسلماں ہونا
جانا حق و صداقت کو اجارہ اپنا — چند قربانی و ایثار سے لرزاں ہونا
خون ہڈی کی دکاں، نسل کا کرنا بیوپار — اور پھر عدل و مساوات پہ نازاں ہونا
جاہ و زر کے کہیں معبود، کہیں زور کے بت — اُس کی پوجا، کبھی اِس کا کلمہ خواں ہونا
دین داریاں کا ہے تسبیح و وظائف پہ مدار — زہد، تن پرور و مفلوج و تن آساں ہونا
دولتِ علم، نہ اخلاق، نہ توفیقِ عمل — خاک مسلم ہو نہ آئے جسے انساں ہونا
اہلیت ہو نہ ہو، مخصوص ہوں جس سے عہدے — کسبِ دانش میں تقابل سے ہراساں ہونا
ڈر، بے ہمتی سے فقط موجوں کو تکتے رہنا — کشمکش سے دمِ سیلاب گریزاں ہونا
پوچھنا سب سے "کہاں دو گے ٹھکانا مجھ کو؟" — کرنا دق اوروں کو اور آپ پریشاں ہونا
دور سے کشمکشِ جنگ کی سیریں کرنا — خوانِ یغما پہ سرافروشوں کے مہماں ہونا
واسطہ دینا تہی دستی و لاچاری کا — عزت و شوکتِ اسلاف پہ نازاں ہونا
صرف اقلیتِ تعداد کا رونا رو کر — رحم کی بھیک کا اغیار سے خواہاں ہونا
نام اسلام ہے واللہ اگر اس خواری کا — کافری سے ہے بتر آج مسلماں ہونا
جھنڈے حریتِ اقوام کے گاڑے جس نے — ہائے اُس قوم کا رسوا سرِ میداں ہونا
بانٹی جن ہاتھوں نے آزادی کی دولت چپ و راست — اُن کا دستِ کرمِ غیر کا نگراں ہونا
خیر اس میں ہے کہ پردے میں حقیقت کو دیکھ — حشر سے کم نہیں اس برق کا عریاں ہونا
ہو چکی ننگی حقیقت، تو رہا کیا باقی — منہ چھپائے ہوئے رسوا و پشیماں ہونا

---

[1] معلوم ہے کہ گریاں اور فروزاں کے قافیوں میں ایطائے خفی ہے مگر "من شاعر عروضی نیستم" — مسلم

اب بھی اک لحظہ ہے باقی کہ مسلماں ابھریں — تہِ دریا جو نہ منظور ہو پنہاں ہونا
آبِ خاموش میں دیکھا ہے تلاطم ہوتے — بادِ خوابیدہ کا معلوم ہے طوفاں ہونا
کھیلنا آگ سے آساں نہیں ہر کیڑے کا — مل کے پروانوں میں جا سیکھ لے قرباں ہونا

عشق کامل ہو تو ہے رشک و رقابت معدوم
عید پروانوں کی ہے شمع پہ قرباں ہونا

دردِ دل آخر کو خود ہی اپنا درماں ہو گیا

(جناب منشی حافظ علی صاحب بیکس بلگرامی)

دل مرا جب سے اسیرِ زلفِ جاناں ہو گیا — تھا پریشاں اور بھی ظالم پریشاں ہو گیا
جوشِ وحشت میں یہ دلچسپی کا ساماں ہو گیا — ذرہ ذرہ میری نظروں میں بیاباں ہو گیا
وقتِ زینت تم نے اپنے حسن کا دیکھا اثر — تم بھی حیراں اور آئینہ بھی حیراں ہو گیا
یادِ رخ کے آتے ہی آتا ہے گیسو کا خیال — عشق میں یوں اتحادِ کفر و ایماں ہو گیا
قاتل و مقتول میں کیا جانیے کیا راز تھا — قتل کر کے خود بخود قاتل پشیماں ہو گیا
برہمی سی ہو گئی پیدا نظامِ عشق میں — حسن میں جب رنگ خودداری نمایاں ہو گیا
بڑھ گئی جب قوتِ احساس ربطِ عشق سے — دردِ دل آخر کو خود ہی اپنا درماں ہو گیا
اضطرابِ نفس کا آخر ہوا انجام یہ — دفترِ ہستی کا شیرازہ پریشاں ہو گیا
جب سمجھ ہی میں نہ آیا تیرے زلف و رخ کا راز — کوئی ہندو ہو گیا کوئی مسلماں ہو گیا
آرزوئے غیر کی اب دل میں گنجائش نہیں — حسن تیرا خود مرے دل کا نگہباں ہو گیا
حسرتِ دل کو مٹا کر تم کو کیا حاصل ہوا — بس یہی نا اک بھرا گھر تھا وہ ویراں ہو گیا
وسعتِ ذوقِ نظر کا صرف یہ اعجاز ہے — ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ نمایاں ہو گیا

ایسی سودائیں بھی ہوں گے تذکروں میں تم پہ نثار
کیا ہوا جو ایک بیکس تم پہ قرباں ہو گیا

نظرے خوش گذرے

دانستہ یا نادانستہ اخبارات میں ہر روز اتنی غلط باتیں چھپتی ہیں کہ اگر غلط بیانیوں کی تصحیح و تردید کرنا چاہیں تو خاص اس مقصد کے لیے ایک مستقل ادارہ قائم کرنا پڑے گا۔ اور اُس میں ایک دو نہیں درجنوں باخبر اصحاب متعین کرنا ہوں گے جن کا سارا وقت اسی کام پر صرف ہوگا۔ ہندوستان میں حق کی اشاعت کے لیے افسوس ہے کہ کوئی ادارہ نہیں ہے جو اس اشاعت کذب کا سدباب کرنا بھی اپنے ذمہ لے لیتا۔ اور اخبارات جو بظاہر اسی مقصد کے لیے نکالے جاتے ہیں، ہوا و ہوس کی بدولت عموماً خود ہی اس مقصد کو سب سے زیادہ پامال کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ملک میں آج جتنی اخلاقی پستی نظر آتی ہے اُس کے اسباب کی جانچ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک بہت بڑا سبب ہمارے اخبارات کی اشاعت کذب بھی ہے۔ بحیثیت اخبار نویس کے ہم اس کے دل سے حامی ہیں کہ پریس بالکل آزاد ہو اور حکومت کی جانب سے اخبارات کی تحریروں پر کوئی پابندی نہ ہو مگر ملک و ملت کے ایک خادم ہونے کے لحاظ سے دل اس بات پر کڑھتا ہے کہ اخبارات ہی کے ذریعہ اخلاق عامہ کی بربادی ہو رہی ہے۔

کبھی کبھی مشہور علمی رسائل میں بھی غلط باتیں چھپ جاتی ہیں گو اسے محض بھول چوک کا نتیجہ جاننا چاہیے تاہم ان کی اصلاح کی کوشش بھی ضروری ہے ورنہ ان کی بنیاد پر آئندہ زمانہ میں ممکن ہے کہ غلط تاریخیں مرتب ہونے لگیں۔ اتفاق سے حال ہی میں معارف اور جامعہ کے جو نومبر کے پرچے وصول ہوئے ان میں واقعات معاصرہ سے متعلق دو شدید غلط بیانیاں نظر آئیں [illegible] دلانا بے محل نہ ہوگا۔

(۱) معارف میں "ہماری زبان بیسویں صدی میں" کے عنوان سے جو قابل قدر مقالہ مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے اس میں تحریر ہے کہ

"نئی صدی کا پہلا سال (۱۹۰۱) تھا کہ لکھنؤ کے پرانے گنگا پرشاد ورما لائبریری میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو زبان کی حمایت کا جلسہ ہوا تھا" صفحہ ۳۲۷

حالانکہ لکھنؤ کی یہ اردو کانفرنس اگست سنہ ۱۹۰۰ء میں قیصر باغ کی مشہور سفید بارہ دری میں [illegible] تھی۔ چند ہی سطروں کے بعد یہ عبارت ہے:—

"اور اس کے نتیجہ کے طور پر سنہ ۱۹۰۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں انجمن ترقی اردو کی — —

بنیاد پڑی۔" صـ۳۲۷

سنہ ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا۔ دہلی میں ایک سال قبل یعنے سنہ ۱۹۰۲ء میں کرزنی دربار کے زمانہ میں کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا اور اسی موقع پر شعبۂ اردو قائم کیا گیا تھا جس کی تشکیل انجمن ترقی اردو کی صورت میں ہوئی۔

(۲) جامعہ میں م، ع، خ (غالباً محمود علی خاں صاحب) کے مضمون "مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس" میں تحریر ہے کہ

"لیگ کا اجلاس یہ دوسری مرتبہ لکھنؤ میں ہوا اور مسٹر جناح بھی دوسری مرتبہ لیگ کے صدر ہوئے اس سے پہلے سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں اجلاس ہوا تھا اور اتفاق سے مسٹر جناح ہی اس کے صدر تھے۔ لیگ کا یہ بالکل پہلا اجلاس تھا جس میں مسٹر جناح شریک ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے پہلے وہ کانگریس کے نہ صرف معمولی ممبر تھے بلکہ اس کی مجلس منتظمہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن تھے اور لیگ کی شرکت سے ہمیشہ اس لیے انکار کرتے تھے کہ وہ اسے ایک فرقہ وارانہ جماعت سمجھتے تھے۔ جب سنہ ۱۹۱۶ء میں لیگ کا اجلاس بھی کانگریس کے ساتھ ہی لکھنؤ میں ہونا طے پایا۔ اور آنے والے دستور کے لیے لیگ اور کانگریس کمیٹی کے امکانات معلوم ہوئے تو مسٹر جناح نے اس شرط پر لیگ کی شرکت اور صدارت منظور کی کہ لیگ بھی وہی نصب العین منظور کرلے جو کانگریس کا ہے۔ چنانچہ مسٹر جناح کی تحریک پر مسلم لیگ نے سنہ ۱۹۱۶ء میں درجہ نوآبادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا۔" صـ۹۶۹

صحیح واقعات یہ ہیں کہ لیگ کے چار اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ پہلا سنہ ۱۹۱۳ء کی تعطیلات ایسٹر میں زیر صدارت سر محمد شفیع مرحوم منعقد ہوا تھا۔ اسی موقع پر لیگ میں پہلی بار مسٹر جناح شریک ہوئے اور اس کا نصب العین "سلف گورنمنٹ مناسب حال ہندوستان" قرار پایا۔ "درجہ نوآبادیات" کو لیگ نے کبھی اپنا نصب العین نہیں قرار دیا۔

مسٹر جناح لیگ کو فرقہ وارانہ جماعت سمجھنے میں تو یقیناً حق بجانب تھے مگر ابتدائی چند سال تک ان کی علیحدگی خاصکر اس بنا پر تھی کہ وہ انتخاب جداگانہ کے مخالف تھے لیکن جب انتخاب میں اسی مخالفت کی بدولت ان کو شکست ہوگئی تو انھوں نے "رضینا بالقضا" کہہ کر لیگ میں شرکت فرمالی اور اگرچہ دل سے انتخاب جداگانہ کو برا جانتے رہے اور شاید اب بھی جانتے ہوں مگر چونکہ اسمبلی کی ممبری اسی ذریعہ سے حاصل ہوسکتی تھی اور ہوتی ہے اس لیے "گر ضرورت بود روا باشد" کی بنا پر وہ اس کے جواز کے قائل ہوگئے یا کم از کم اس کو

عملاً کیا ابادرجا ہلاس ترکیب کو صحیح قرار دیں گے؟ ایڈیٹر

قابل برداشت اور لائق استفادہ سمجھنے لگے۔

دوسرا اجلاس سنہ ۱۹۱۶ء میں ہوا جس کے صدر مسٹر جناح تھے۔ لیگ اور کانگریس کے درمیان اُس میں جو سمجھوتا ہوا تھا اُس کا بڑا سبب مسٹر جناح ہی ہوئے تھے۔ اور اب بھی وہ امید اسی کی کرتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے دوستانہ گفت و شنید کے ذریعہ یہ مقصد حاصل کیا گیا تھا اب کی روٹھنے اور جھگڑنے کی راہ سے یہ کام نکالنا مقصود ہے۔

تیسرا اجلاس سنہ ۱۹۲۳ء کے ایسٹر میں مسٹر جناح ہی کی صدارت میں منعقد ہوا مگر نصاب (کورم) پورا نہ ہونے کی وجہ سے اجلاس عام ناجائز قرار پایا اور بغیر کسی کارروائی کے ختم ہو گیا۔

چوتھا اجلاس سنہ ۱۹۲۴ء میں منعقد ہوا جس کے حالات سُن کر زمین و آسمان دونوں پناہ مانگ رہے ہیں۔

مسٹر جناح سنہ ۱۹۲۰ء میں تنہا کانگریس ہی سے نہیں بلکہ لیگ سے بھی علٰحدہ ہو گئے تھے اور اُن کی علٰحدگی نصب العین کی تبدیلی کے باعث نہ تھی بلکہ وہ براہ راست کارروائی کے مخالف تھے۔ البتہ کانگریس اور لیگ کے ساتھ اُنھوں نے یکساں برتاؤ نہیں کیا۔ کانگریس میں اُن کی توقیر بہت ہوتی تھی مگر کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہ تھی اور اُس کی رفتار بتا رہی تھی کہ مسٹر جناح کے لیے آئندہ ذمہ دارانہ مقام حاصل کرنے کا امکان بھی نہیں رہا اس لیے ناگپور میں علٰحدہ ہونے کے بعد سے آج تک اُنھوں نے اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔ مسلم لیگ کے وہ ۱۹۱۹ء ہی میں صدر منتخب ہوئے تھے اور صدارت ایسی چیز نہیں کہ محض کسی اصولی اختلاف پر قربان کر دی جائے۔ خصوصاً جب اس کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی لگا ہو کہ قوم مشتعل ہو کر انتقام لینے کی غرض سے اسمبلی کی کرسی سے بھی نہ محروم کر دے لہذا جب مسلم لیگ نے بھی ترک موالات کی تحریک منظور کر لی اور اپنا نصب العین بدل دیا تو اُنھوں نے اپنی با اصولی کا ثبوت دینے کے لیے صرف اتنی کارروائی مناسب جانی کہ دو سال تک یعنے سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ضابطہ کی رو سے مسلم لیگ کے صدر تو رہے لیکن نہ اُس کے کسی انتظامی جلسہ میں شریک ہونے کی زحمت گوارا کی اور نہ سالانہ اجلاس کی رونق افزائی کا سبب بنے۔ اور جب اس بات کا پورے طور پر اطمینان ہو گیا کہ لیگ میں شرکت کی بنا پر کسی طرح کی آنچ اُن کے جسم و ضمیر پر نہیں آنے لگی تو سنہ ۱۹۲۳ء میں وہ پھر لیگ کی صدارت کے فرائض کی انجام دہی کے لیے لکھنؤ تشریف لے آئے۔

کانگریس اور لیگ کے تعلق میں مسٹر جناح نے ایک نازک فرق اور بھی ملحوظ رکھا جس سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جو کانگریس اور لیگ کے اُن خاص اجلاسوں کی کارروائیوں میں شریک تھے جن میں ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں بمقام کلکتہ ترک موالات کی تجویز منظور کی گئی تھی۔

کانگریس کی مجلس مضامین میں اُس تجویز پر چار پانچ دن مسلسل بحث ہوئی۔ مسٹر جناح نے پنڈت مالوی اور

اور دیگر کانگریسی سرداروں کے ساتھ مل کر مخالفت میں پورا زور تقریر صرف کیا۔ اور جب مجلس مضامین میں اُن کو شکست ہوگئی تو وہیں اعلان کر دیا گیا کہ اجلاس عام میں بھی مخالفت کی جائے گی اور وہاں بھی مسٹر جناح نے بڑی زوردار تقریر کی۔

برخلاف اس کے مسلم لیگ کی مجلس مضامین یا جلسۂ عام میں جناح صاحب نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ البتہ جلسہ عام میں وہ صرف تھوڑی ہی دیر کے لیے تشریف فرما ہوئے تھے۔ آنریبل مسٹر فضل الحق اپنا خطبۂ صدارت ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ مسٹر جناح اُٹھ گئے۔

مارچ سنہ رواں میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب کے موقع پر علی گڈھ میں اُردو پریس کے کچھ نمائندے جمع کیے گئے اور اُن کے روبرو یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک اُردو پریس ایسوسی ایشن قائم کی جائے۔ ہم نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور اسکے متعدد وجوہ عرض کیے مگر داعیان جلسہ کی بارگاہ میں شنوائی نہوئی جلسہ میں اکثریت انکے ہم خیالوں کی تھی اسلیے طے پا گیا کہ ایسوسی ایشن ضرور بنے۔ دوسرے جلسہ میں اُسکا دستور العمل بنا، عہدہ داروں و مجلس منتظمہ کا انتخاب ہوا، چند تجاویز منظور کی گئیں اور باوجود اختلاف رائے کے ہم نے ایسوسی ایشن کی رکنیت ہی نہیں بلکہ اُسکی مجلس منتظمہ کی رکنیت بھی قبول کی لیکن جو اندیشہ پہلے جلسہ میں بطور وجہ اختلاف ظاہر کیا گیا تھا وہ صحیح ثابت ہوتا معلوم ہوتا ہے۔

آٹھ مہینے گذر چکے اس ساری مدت میں سکریٹری صاحب کی جانب سے صرف بنیادی جلسہ کی روداد تو وصول ہوئی اُسکے بعد کچھ نہیں معلوم کہ نوزائیدہ ایسوسی ایشن سکریٹری صاحب کے اقامت خانہ واقع سلطان جہاں منزل میں مصروف استراحت ہے یا پاس والے آزاد علاقہ میں دفن کر دی گئی۔

پٹنہ میں جناب نظامی صاحب ایڈیٹر ذوالقرنین نائب صدر سے دریافت کیا تو وہ بھی معلومات میں کوئی اضافہ نہ فرما سکے، اب الناظر کی وساطت سے جناب نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ صدر مجلس کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے کہ وہ یا اُنکے ایما سے جناب سکریٹری صاحب ایسوسی ایشن کی خیریت مزاج سے مطلع فرمائیں تو جملہ اراکین پر احسان عظیم ہوگا۔ اور اگر اس مدت میں یہ مسئلہ قرار پا گئی ہو کہ علیگڈھ کی آب و ہوا ایسوسی ایشن کیلیے مفید نہیں بلکہ مہلک ہے اور علیگڈھ سے باہر کوئی صاحب اس کی میزبانی اور خدمت کے لئے آمادہ و مستعد نہیں تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جیسے طمطراق سے ایسوسی ایشن کی بزم ولادت ترتیب دی گئی تھی ویسے ہی شاندار طریقہ پر اُس کی تجہیز و تدفین بھی کر دی جائے۔ تاکہ ہم سب سوگواروں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

۳۰ نومبر ۳۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لغت خیالات

کتاب "لغت خیالات" جس کا ایک جزو بطور نمونہ کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ عالی جناب راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر والئ ریاست محمود آباد نے مجھ کو دیکھنے کو دی تھی۔ یہاں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ راجہ صاحب موصوف کو عمدہ کتابیں خواہ وہ کسی زبان کی ہوں جمع کرنے کا خاص شوق اور سلیقہ ہے۔ اسی دو ہی تین برس کے عرصہ میں موصوف نے پندرہ بیس ہزار کتابیں عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی کی جمع کی ہیں۔ اور اب ایک عمارت محمود آباد میں تعمیر کرا کے وسیع پیمانہ پر ایک بڑی لائبریری اور ریڈنگ روم کھولنے کا ارادہ ہے۔ الغرض جب میں نے کتاب "ڈکشنری آف تھاٹس" جو زبان انگریزی میں ہے اور امریکہ میں چھپی ہے دیکھی تو مجھ کو یہ بہت پسند آئی اور فوراً دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر اس کا اردو ترجمہ ہو جائے تو بہت مناسب ہے کیونکہ اردو داں اصحاب بھی اُن خیالات سے باخبر ہو جائیں گے جو اہل یورپ نے مختلف الفاظ و مضامین پر بصورت مختصر اقوال کے ظاہر کئے ہیں۔ میں نے اسی غرض سے یہ کتاب جناب راجہ صاحب سے چند دن کے لیے عاریتاً لے لی اور اس کا ترجمہ شروع کر دیا۔ کتاب کا حجم بڑی تقطیع کے تقریباً آٹھ سو صفحات کا ہے اور اس کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔ میں نے بھی ترجمہ میں یہی ترتیب قائم رکھنا چاہی۔ افسوس ہے کہ اپنی مسلسل علالت اور کمزوری کی وجہ سے صرف تین حروف انگریزی یعنے اے، بی، سی کا ترجمہ مکمل ہوا ہے جس میں اردو کی پوری حروف تہجی کے اکثر الفاظ آ گئے ہیں۔ اگر یہ ترجمہ مقبول ہوا تو انشاء اللہ بشرط صحت اس کے جاری رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

کتاب میں ہر ہر قول کے بعد اُن لوگوں کا بھی نام دے دیا ہے جن کی طرف وہ قول منسوب ہے۔ بعد ختم کتاب ان تمام لوگوں کا ایک مکمل انڈکس ترتیب وار انشاء اللہ دیا جائے گا۔

محمد عسکری عفی عنہ

ابتدا Beginning.

ہر چیز کی ابتدا کا خیال رکھو۔ نتائج اپنا خود خیال رکھیں گے۔ (الگزینڈر کلارک)

قدما کا قول تھا کہ کسی کام کی ابتدا اگر اچھی ہو تو وہ گویا آدھا پورا ہو جاتا ہے۔ (بائیبیں)

ہر چیز میں پہلا قدم مشکل ہے۔ (میڈم ڈی سٹیل)

نقصان کو ابتدا ہی میں روکو تاکہ وہ وقت کے ساتھ بڑھنے[1] نہ پائے۔ (شیکسپیر)

ابر Clouds

وہ آسمان کی رنگ آمیزیاں[2] ہیں۔ (البرٹ اسمتھ)

ابر ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا کسی فرشتے نے اپنی رنگین قبائیں ہوا میں معلق چھوڑ دی ہیں۔ (جوانا بیلی)

اے اللہ! یہ (ابر) تیری گاڑیاں ہیں۔ ان پر تو سوار ہو کر اپنے کھیتوں، اپنے باغوں، اپنی چراگاہوں اپنے جنگلوں اور میدانوں کی سیر کرتا ہے۔ یہ وہ پردے ہیں جن کو تو جب تیرا جی چاہتا ہے درختوں پر ڈال دیتا ہے تاکہ وہ دھوپ کی تپش سے محفوظ رہیں اور مرجھائیں نہیں۔ کبھی وہ تیرے توپ خانوں کا کام دیتے ہیں جن سے تو اپنے قہر و غضب کے رعد برق سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ اور کبھی اُن کو اسی سے سزا بھی دیتا ہے۔ (رگا ٹھولڈ)

اتفاق (حادثہ) Accident (ت) Chance.

خدا کے نزدیک کوئی امر اتفاقی نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ (لانگفیلو)

ہر بُرے سے بُرے امر اتفاقی سے عقلمند کوئی مفید نتیجہ نکالتا ہے اور ہر اچھے سے اچھے امر اتفاقی سے بیوقوف اپنے واسطے نقصان تصور کرتا ہے (روکی فوکو)

عقل اور تدبیر جن چیزوں کو آہستہ آہستہ اور محنت سے جمع کرتے ہیں اُن کو اتفاق بعض وقت ایک لمحہ میں مہیا کر دیتا ہے۔ (شلر)

جس کو ہم اتفاق کہتے ہیں وہ خدا کی عین مشیت ہے۔ (بیلی)

اتفاق کوئی چیز نہیں۔ جو چیز ہم کو اتفاق معلوم ہو وہ تقدیر کے گہرے پردوں سے نکلتی ہے۔ (شلر)

---

[1] مقابلہ کرو ۔ سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل — چو پر شد نہ شاید گرفتن بہ پیل (سعدی)

[2] ایشیائی شاعروں نے بھی ابر کی خوبصورت رنگ آمیزیوں کا ذکر اپنے کلام میں بہت کیا ہے۔ مثال کے لئے میر کا ایک شعر کافی ہے ۔

گلستاں کے ہیں دونوں پلے بھرے — بہار اس طرف اُس طرف ابر ہے

شاعر روئے زمین کو جو موسم بہار میں ایک باغ ہو جاتی ہے ترازو سے تشبیہ دیتا ہے جس کے ایک پلے میں رنگارنگ کے خوبصورت پھول اور دوسرے پلے میں ابر کی خوشنما رنگ آمیزیاں ہوتی ہیں۔

لفظ اتفاق کسی واقعہ یا نتیجہ کے اسباب کے جہل پر دلالت کرتا ہے نہ یہ کہ ہم خود اتفاق کو سبب قرار دیتے ہیں۔ (ہنری فرگس)

اتفاق ضرور ایک چیز ہے مگر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ تعالےٰ اُس سے کیوں کام نہ لے۔ (ہیس)

اس سے بڑھ کر کون خیال بیوقوفی کا ہو سکتا ہے کہ اتنا بڑا کارخانہ۔ زمین و آسمان اتفاق سے وجود میں آیا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی سیپی کا خلق بھی ہمارے امکان سے باہر ہے۔ (جیرمی ٹیلر)

اتفاق کو خدا کا دوسرا نام سمجھنا چاہیے اُن صورتوں میں جب کہ خدا اپنا اصلی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ (کولرج)

اکثر اتفاق سے علم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ (سٹیر)

اکثر کارنمایاں اتفاق سے ہوتے ہیں مگر تعریف کسی بڑے آدمی کی ہو جاتی ہے۔ (ہوم)

کسی کام کی کامیابی پر پورا بھروسہ نہ کرو کیونکہ دنیا میں سلسلہ اتفاقات کی ایسی نظر میں نہ آنے والی کڑیاں پھیلی ہوئی ہیں کہ اگر وہ سب خود تمھارے اختیار میں ہوتیں تب بھی کامیابی یقینی نہ تھی۔ (ہربرٹ)

اتفاق نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی، کوئی خوبصورت مکان نہیں تعمیر کیا، کوئی عمدہ تصویر نہیں بنائی پھر بھی یہ چیزیں بمقابلہ ایک پھول یا ایک درخت کی آفرینش کے ہیچ ہیں۔ (بیرڈ)

اتفاق بہت قوی چیز ہے تدبیر کے کانٹوں سے ہر وقت کام لو تو ماہی مراد کبھی نہ کبھی ضرور مل جائے گی۔ (اووڈ)

اتفاق ایک بے معنی لفظ ہے۔ کوئی چیز دنیا میں بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔ (والٹیر)

اتفاق بھی ذی فہم کی مدد کرتا ہے۔ (جوبرٹ)

احتیاط Caution

دوسروں کے مصائب سے احتیاط سیکھنا عقلمندی ہے۔ (پبلیس سائرس)

جب ہر چیز فانی ہے تو ہر چیز سے ڈرنا چاہیے۔ (بائرن)

احتیاط یعنے گفتگو سمجھ بوجھ کے کرنا اور اپنے خیالات بہت کم لوگوں سے ظاہر کرنا اس امر کی ضامن ہے کہ تم دنیا سے بھی اچھے رہوگے اور اپنے نفس کو بھی مطمئن رکھوگے۔ (ٹامس اے کیمپس)

کوئی شخص اُس سے ہمدردی نہیں کرتا جو کسی جال میں بعد آگاہ کئے جانے کے پھنس جاتا ہو۔ (ہیر)

اپنی زبان اور اپنی روپیہ کی تھیلی ہمیشہ احتیاط سے کھولا کرو کہ اس سے تمھاری دولت اور تمھاری شہرت ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ (زمرمین)

جب تمھارے پڑوس میں آگ لگے تو تھوڑا پانی احتیاطاً اپنے مکان پر بھی ڈلواؤ۔ اس سے ممکن ہے کہ بعض لوگ تم کو وہمی خیال کریں گے مگر احتیاط میں

افراط بہ نسبت تفریط کے بہتر ہے۔ (برک)

جو شخص تمھارے ساتھ ایک مرتبہ بد عہدی کرے اُس پر کبھی اعتبار نہ کرو کیونکہ جس نے ایک مرتبہ دغا کی وہ پھر دغا کرے گا۔ (شیکسپیر)

افراطِ احتیاط کمیِ عمل کا باعث ہوتی ہے۔ (شلر)

لوگوں کے مصائب سے سبق سیکھو تاکہ دوسرے تم سے مثال نہ حاصل کریں۔ (سعدی)

جو چیزیں کمال غور و فکر سے عمل میں آتی ہیں وہ خوف سے معرا ہوتی ہیں۔ (شیکسپیر)

میں کبھی ایسے محتاط لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اس خوف سے کہ کوئی بات غلط اُن کے مُنھ سے نہ نکلے زبان بند رکھتے ہیں اور اس خوف سے کہ کوئی کام غلط نہ کریں کوئی کام ہی نہیں کرتے۔ (بیچر)

اختصار فی الکلام Brevity.

اختصار روحِ ذہانت ہے۔ (شیکسپیر)

حقیقی خوش مذاقی زیادہ مطلب کم الفاظ میں ادا کرنا، اپنے خیالات کو جمع و منتخب کرنا، اپنی گفتگو میں ایک ترتیب و نظام قائم رکھنا اور جو کچھ ہم کو کہنا ہو اُس کو نہایت سکون و دلجمعی سے ادا کرنا ہے۔ (فنیلون)

جب کوئی شخص کوئی سچی بات کہتا ہے اور اُس میں اپنی کوئی غرض پوشیدہ نہیں رکھتا تو وہ بہت زیادہ مطلب چند الفاظ میں ادا کر سکتا ہے۔ (اسٹیل)

بہترین عقل و ذکاوت اختصار کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔ (امرسن)

تقریر کی بہترین اور شاذ ترین خوبی اور مقرر کی قدرت زبان کا راز یہ ہے کہ تقریر کلام مختصر ہو۔ (ہالیک)

اختصار تقریر کی بہترین خوبی ہے۔ عام اس سے کہ وہ کسی سینیٹر (ممبر کاؤنسل) یا کسی نصیح کی ہو۔ (سسرو)

مطلب کی بات کہو اور جب مطلب ختم ہو جائے تو تقریر کلام ختم کر دو۔ جو کچھ مُنھ سے کہو یا قلم سے لکھو وہ جامع و مختصر ہو۔ بے مطلب عبارت سے کتاب بھر دینا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ (نیل)

جتنے ہی الفاظ کم ہوں گے اُسی قدر دعا مؤثر ہوگی۔ (لوتھر)

الفاظ مثل پتیوں کے ہیں اور مطلب مثل پھل کے۔ جب کسی درخت میں پتیاں زیادہ ہوں تو اُس میں پھل کم و کمزور ہوتے ہیں۔ (پوپ)

اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری تقریر مؤثر ہو تو اُس کو مختصر کر دو۔ کیونکہ الفاظ مثل شعاع آفتاب کے ہیں۔ جتنی زیادہ وہ مجتمع ہوں گی اُتنی ہی تیز ہوں گی۔ (ساؤدے)

جو کچھ کہنا ہو اُس کو جہاں تک ہو سکے مختصر الفاظ میں لکھو ورنہ پڑھنے والا اُن کو چھوڑتا جائے گا اور جہاں تک ہو سکے سادہ الفاظ میں کہو ورنہ وہ اُن کا مطلب نہ سمجھ سکے گا۔ (رسکن)

جب کوئی اخلاقی سبق (یعنے وعظ) تم کو دینا ہو تو اُس کو مختصر کرو۔ (ہاریس)

اتنا اختصار ناپسندیدہ ہے کہ مطلب خبط ہو جائے۔ (اڈورڈس)

اخفا (دیکھو رازداری)

Concealment

جن سے میں محبت کرتا ہوں اُن سے میں کوئی بات نہیں چھپاتا جن کے واسطے میرا دل کھلا ہوا ہے اُن کے لیے میرے ہونٹ بند نہیں ہوسکتے (ڈکنس)

جو اپنی خوشیاں چھپا سکتا ہے اُس سے بزرگتر ہے جو اپنے رنج چھپا سکتا ہے۔ (لیویٹر)

کسی چالاکی کا چھپانا بڑی چالاکی ہے۔ (رڈکی فڑکو)

اخوت Brotherhood

آدمی تنہا پیدا ہوتا ہے مگر تنہا رہنے کے لیے نہیں پیدا ہوتا۔ اُس کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی مدد کرے۔ (نمیا نڈر)

اگر خدا تیرا باپ (یعنی پیدا کرنے والا) ہے تو انسان تیرا بھائی ہے۔ (لامارٹین)

ہم سب ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ فطرتاً ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور ایک معاشرتی زندگی کے قابل ہیں۔ ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہر شخص کی عزت[1] آفرینش بنی نوع کا فائدہ ہے۔ (سنیکا)

اگر انسان امداد و استمداد چھوڑ دے تو وہ صفحہ ہستی سے فنا ہو جائے۔ ہمارا وجود بغیر ایک دوسرے کی مدد کے ناممکن ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ حاجتمند کو حاجت روا سے مانگنے کا حق ہے اور حاجت روا کو مدد سے انکار کرنا گناہ ہے۔ (والٹر اسکاٹ)

تمام عالم ایک بڑا شہر ہے جس میں ہمارے پیارے آباد ہیں اور فطرت نے محبت باہمی کا سبق ہم کو دیا ہے۔ (ایپکٹیٹس)

انسان گو کہ کیسا ہی ذلیل و خوار ہو پھر بھی آخر انسان ہے۔ (سنیکا)

ہمارے تمام مسائل مساوات و آزادی و انسانیت سب اس خیال کے نتیجہ ہیں کہ تمام انسان خدا کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ (کالون کولج)

استواری (ثابت قدمی) (دیکھو استقلال)

Constancy

استواری تمام فضائل انسانی کی تکمیل ہے (مزینی)

مقصد کی استواری کامیابی کا راز ہے۔ (ڈزرائیلی)

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو (غالب)

[1] مقابلہ کرو سے
بنی آدم اعضائے یک پیکر اند　　کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
گر عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوہا را نہ ماند قرار (سعدی)

کامل انسان تو مجھ کو کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ثابت قدم ہی مل جائے تو میں اُس کے قدم آنکھوں سے لگاؤں۔ (کنفیوشس)

کبھی تغیر رائے سے بھی استواری ثابت ہوتی ہے۔ (ہیول)

بغیر استواری کے نہ دنیا میں محبت کوئی چیز ہے، نہ دوستی اور نہ نیکی۔ (ایڈلیس)

حق اور اصول کی استواری اہل دنیا کی زبان میں بعض وقت عقل کی کمزوری کہلاتی ہے۔ (ڈورڈس)

اے اللہ! اگر انسان ثابت قدم ہوتا تو کیسا کامل و مکمل ہوتا۔ (شیکسپیر)

اشتراکیت Communism

کمیونزم کیا چیز ہے؟ وہ اس امر کی خواہش ہے کہ غیر مساوی محاصل مساوی طور پر تقسیم ہونا چاہیے۔ یعنے کوئی سست کاہل اپاہج اپنا پیسہ تو الگ رکھے اور تمہارا روپیہ اینٹھنا چاہے۔ (ابنز رالیٹ)

مساوات پسند یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے لوگ ایک سطح پر آجائیں مگر یہ نہیں چاہتے کہ جو اُن سے نیچے ہیں وہ اُن کے برابر پہونچ جائیں۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ کچھ لوگ اُن سے نیچے ضرور رہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ لوگ اُن سے اوپر کیوں نہ رہیں۔ (جانسن)

اشتہا Appetite

عقل کو حاکم اور اشتہا کو محکوم ہونا چاہیے۔ (سسرو)

اچھی غذائیں اچھی زندگی کی منافی نہیں ہیں۔ (ارسطیفوس)

بہتر ہے کہ تم اشتہا کو سزا دو نہ کہ اشتہا تم کو سزا دے۔ (میکسیمس)

جانور چرتے ہیں، آدمی کھاتا ہے مگر صرف عاقل و ہوشیار آدمی کھانا جانتا ہے۔ (ساوارن)

دسترخوان کا خرچ اپنی آمدنی کے رُبع سے کبھی نہ بڑھاؤ۔ غذائیں مقوی ہونا چاہیے نہ کہ مکلف۔ ان میں صنعت سے زیادہ قدرت کو دخل ہو۔ اُن کی تیاری میں اسراف مطلق نہ ہو۔ اگر تمہارے مہمان اچھے قسم کے لوگ ہیں تو تمہاری دعوت دعوت ورنہ تضیع زر ہے۔ دعوت میں اسراف نمائش ہے۔ (کوارلے)

دعوت میں بیجا تکلف اکثر جنازہ کے تکلف سے مشابہ ہوتا ہے۔ (ویلس)

اعتدال اور محنت انسان کے دو بہترین طبیب ہیں۔ محنت اشتہا کو بڑھاتی اور اعتدال اُس کو زیادتی سے ہمیشہ روکتا ہے۔ (روسو)

ایک محکوم اشتہا ایک عظیم خود آزادی ہے۔ (سنیکا)

اپنی خواہشات کو جتنا دباؤگے اُتنا ہی اُن پر قابو رکھوگے۔ خواہش اور عقل مثل دو ڈولوں کے

ہیں کہ جن میں سے ایک اگر اوپر ہوتا ہے تو دوسرا ضرور نیچے ہوگا۔ (کالیر)

جس طرح دوائیں تولہ ماشے کے حساب سے کھاتے ہو اسی طرح تندرستی کے واسطے غذائیں بھی تول ناپ کر کھایا کرو۔ (اسکلٹن)

اشتہار Advertising

اشتہار کا کمال یہ ہے کہ ایک ایسا مناسب طریقہ تحریر استعمال کیا جائے جس سے لوگوں کی آنکھ اشتہار پر ضرور پڑے۔ (ایڈیسن)

وہ کاروبار جو اپنے تئیں اشتہارات سے مستغنی سمجھتا ہے چند دن میں خود کاروبار سے مستغنی ہو جائے گا۔ (ڈربی براؤن)

پیشہ کی حیثیت سے اشتہار نویسی ایک جدید چیز ہے مگر قوت اور اثر کی روح سے وہ بہت قدیم ہے۔ آج کل کاروبار کا اصلی مقصد کثرت سے خریداروں کو جمع کرنا ہے۔ (بروس بارٹن)

اشتہار تجارت کی روح ہے۔ (کوریج)

اگر اشتہارات عقل کے ساتھ دیے جائیں تو دنیا کی حیثیت بدل سکتی ہے۔ (ایس۔ چیپر)

اشتہار ہی وہ جن ہے جس کے زور سے امریکہ کے کروڑوں آدمی دولت و عشرت، آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ (وہائٹ)

اگر کوئی شخص تجارت میں صفر رہنا چاہے تو وہ اشتہار کی بے قدری کر سکتا ہے۔ (کرٹنگ)

اشتہار دنیا کی دولت کی کنجی ہے۔ (کلین)

اشتہار تھوک فروشی کا بہترین ذریعہ ہے (ڈورنس)

اشتہار پبلک میں جول کا بہترین ذریعہ ہے (کرٹس)

اشتہار سے تجارت کی روحانی قوت بڑھتی ہے۔ (کوریج)

میں دس لاکھ روپیہ کی گڈ ول (تجارتی نام) بغیر جائداد کے لینا پسند کروں گا اور ایک لاکھ روپیہ کی جائداد بغیر گڈ ول کے نہ لوں گا۔ (مارو)

اطوار (ڈھنگ) (دیکھو کردار) Behavior

اطوار وہ آئینہ ہیں جن میں ہر شخص اپنی شکل دیکھ سکتا ہے۔ (گیٹے)

اطوار میں ہر وہ چیز جو مناسب ہے معزز ہے اور جو چیز معزز ہے مناسب ہے۔ (سسرو)

اپنی ذات کے علم سے اطوار میں استواری اور اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ (فلہلم)

چھچھوراپن ہر نیکی اور اچھی صفت پر بھی پانی پھیر دیتا ہے۔ (سنیکا)

بعض بڑے بڑے لوگ بھی ننگ اور عجیب عادتوں سے خالی نہ تھے لیکن یہ اُن کا قصور اور بدقسمتی کہی جائے گی۔ ہر بڑے شخص کے لیے ایسی چیزیں قطعاً معیوب ہیں اور کوئی معزز شخص اپنے تئیں کسی بری عادت یا خصوصیت سے ممتاز کرنا کبھی نہیں پسند کرے گا۔ (سرولیم ٹمپل)

اعتبار Confidence, Trust.

اُس شخص کا اعتبار نہ کر جس نے تم سے ایک دفعہ

بیوفائی کی ہو۔ (شکسپیر)

اعتبار ایک دیر میں بڑھنے والا پودا ہے خاصکر ایک سن رسیدہ دل میں۔ (جانسن)

اس شخص کا اعتبار نہ کرو جو بغیر جانچے ہوئے تمہارا ہر بات میں اعتبار کرے یا جانچنے کے بعد تمہارا کسی بات میں اعتبار نہ کرے۔ (لیویٹر)

جوانی میں ہم اعتبار زیادہ کرتے ہیں اور بڑھاپے میں کم۔ پس بے احتیاطی اور جلد بازی جوانی کی غلطی ہے اور مزید احتیاط بڑھاپے کی۔ (کولٹن)

سوسائٹی کا دارومدار اعتبار پر ہے اور خود اعتبار کا مدار دوسرے کی راستبازی پر ہے۔ (ساؤتھ)

اعتبار ناقص بہت مضر و خطرناک ہے۔ ہم کو چاہیے کہ اکثر موقعوں پر یا تو اظہار کامل کریں یا اخفائے کامل۔ (بروئیر)

ان لوگوں سے کبھی اپنا دل نہ کھولنا چاہیے جو اپنا دل ہم سے بند رکھیں۔ (برائٹ)

ہمارا دل صرف اسی سے کھلتا ہے جو ہم سے کھلتا ہے۔ (ہیریا ایجورتھ)

خود اعتباری روح شجاعت ہے۔ (امرسن)

گفتگو میں اعتبار کا جزو ظرافت سے زیادہ ہونا چاہیے۔ (روشی فوکو)

دوسرے کی نیکی پر اعتبار خود اپنی نیکی کا ثبوت ہے۔ (مانٹین)

جو دنیا بھر کی تعریف کرے اُس کا اعتبار کم کرو، جو دنیا بھر کی مذمت کرے اس کا اعتبار اس سے کم کرو اور جو ان دونوں سے بے تعلق ہو اُس کا اعتبار سب سے کم کرو۔ (لیویٹر)

اعتبار کرنا اور اُس میں نقصان اُٹھانا مطلق بے اعتباری سے بہتر ہے کیونکہ ایک صورت میں تم کو اپنے دوست سے نقصان پہونچے گا اور دوسری صورت میں تم کو خود اپنی ذات سے نقصان پہونچے گا۔ (سمس)

ایسے آدمیوں پر اعتبار نہ کرو جو دوسرے پر اعتبار نہ کریں۔ اس وجہ سے کہ جو دنیا کو ناقص سمجھے وہ گویا دنیا میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ (ہیئر)

Belief اعتقاد (یقین)

کوئی چیز اس سے زیادہ آسان نہیں کہ انسان اپنے تئیں آپ دھوکا دے۔ ہماری خواہشیں ہی ہمارے اعتقادات ہیں۔ (ڈیماستھنیز)

بہت سے اہم حقائق ہیں جن سے ہم انکار تو نہیں کرتے مگر پوری طرح اُن پر یقین بھی نہیں رکھتے ہیں۔ (الگزینڈر)

وہ شخص جو صرف اُن چیزوں پر اعتقاد رکھتا ہے جن کو وہ پوری طرح سمجھ لیتا ہے یا تو اُس کا سر بہت لمبا ہے اور یا اُس کا مذہب بہت چھوٹا ہے۔ (کولٹن)

ممکن ہے کہ کوئی شخص حق کو مان کر بھی ملحد ہو یعنے اُس کے معتقدات کی بنیاد صرف دوسروں کی

تاویلات ہوں۔ پس ایسی صورت میں اُس کا اعتقاد تو ٹھیک ہوگا مگر وہ تاویلات جن کو وہ مانتا ہے الحاد سے کم نہیں ہیں۔ (ملٹن)

یاد رکھو کہ تمہارے معتقدات تمہاری خواہشات کا پرتو ہیں۔ (نوح پورٹر)

ہم اُن چیزوں کو آسانی سے نہیں قبول کرتے جن کے ماننے میں ہمارے احساسات کو ضرب لگے گی۔ (اُڈورڈ)

اعتقاد کا عملی اثر اُس کی صداقت کا اصلی معیار ہے۔ (فرود)

اُن چیزوں کا اعتقاد بہت آسان ہے جن کی ہم دل سے اُمید رکھتے ہیں۔ (ٹرنس)

بعضوں کے معتقدات وہی ہوتے ہیں جو اُن کے والدین استادوں اور عزیزوں کے ہوتے ہیں اُن کے نزدیک معتقدات بھی ایک جائداد ہے جو ورثہ میں ملتی ہے اور وہ اپنے تئیں اُن کا وارث حقیقی سمجھتے ہیں۔ (ڈانٹس)

جس طرح میں اپنی روٹی اپنے نانبائی سے اپنے کپڑے درزی سے، اور اپنا جوتا موچی سے لیتا ہوں اُسی طرح اپنے معتقدات اپنے مذہبی پیشوا سے حاصل کرتا ہوں۔ (گولڈاسمتھ)

اعتقاد میں ہر قیمتی سعی کا راز مضمر ہے (ٹلبور)

ایک نوجوان آزاد خیال آدمی نے مشہور ڈاکٹر پار سے اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں ہرگز اُن چیزوں کو نہیں مانتا جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ جواب دیا کہ میاں! تب تو تمہارا مذہب بہت ہی مختصر ہوگا۔

میں اُن نازک اور مشکل پسند ضمیر والوں سے جو اپنے معتقدات کے تسلیم کرنے میں بہت احتیاط برتتے ہیں ہرگز ناامید نہیں ہوں بلکہ ان کی غلطیوں سے درگذر کر کے ان کی راستبازی کی عزت کرتا ہوں۔ مگر اُن لوگوں سے بہت ڈرتا ہوں جو ہر چیز کو مانتے ہیں، ہر چیز پر یقین رکھتے ہیں اور ہر چیز کی موافقت میں اپنی رائے بے سمجھے بوجھے دے دیتے ہیں۔ (شیلی)

جو شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعتقادات کے موافق نیک ہوگا وہ ایک فضول امید رکھتا ہے اور جو شخص یہ امید رکھتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعتقاد کے موافق بد ہوگا وہ فضول خوف رکھتا ہے۔ (کیفز)

یہ عجیب بات ہے کہ بہت سے بڑے بڑے صاحب عمل لوگ جبر کے اور بڑے بڑے صاحب فکر لوگ تقدیر کے قائل تھے۔ (بالزیک)

نیوٹن، پاسکل، بوسوے، ریسین، فینلون یعنے دنیا میں یہ جو بڑے بڑے روشن خیال لوگ گذرے ہیں اور ان کا زمانہ فلسفہ کی بہترین ترقی کا دور تھا یہ سب خدا اور اپنے پیغمبر کے ماننے والے تھے اور کانڈرسے نے تو مرتے وقت خوش ہو کے یہ الفاظ کہے تھے کہ اب میں خدا کو بالمشافہ دیکھوں گا۔ (وادینارگس)

اقوال مختصر (انداز) (ڈکیومنٹل) Apothegms.

عقلمند اور نیک لوگوں کے اقوال بہت
قیمتی ہوتے ہیں۔ اُن کو سونے کی خاک یا ہیرے
کے ذرّے سمجھنا چاہیے۔ (ٹلاٹسن)

عقلمندوں کے نزدیک سلف کے اقوال
ایسے بیج ہیں جن سے نئے خیالات کے وسیع
مزرعے تیار ہوتے ہیں جن میں آئندہ ترقی و
تزئین کی بڑی گنجائش ہے۔ (ریمسے)

تاریخ سلف میں مختصر اقوال کی یہی حالت ہے
جیسے موتی بالو میں یا سونا کان میں۔ (ارامس)

اقوال مختصر کو متحرک عقل یا خیالات وجذبات
کا عطر سمجھنا چاہیے۔ (الگر)

وہ شخص بنی نوع انسان کا بڑا محسن ہے جو
اعلیٰ اصول حیات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں
لکھ دے تاکہ وہ آسانی سے یاد ہو جائیں اور وقت
ضرورت کام میں لائے جائیں۔ (جانسن)

ایک مختصر جملے سے زیادہ کوئی چیز حافظۂ انسانی
پر منقش نہیں ہوتی اور نہ یاد رہ سکتی ہے۔ (مرے)

مختصر مقولہ وہ ہے جس میں کوئی اہم اور مسلمہ
امر حق ٹھیک اور عمدہ الفاظ میں ادا کیا جائے۔ ایسے
مقولے نیکی کے تخم ہیں کہ جو اگر حافظہ پر اچھی طرح
منقش ہو جائیں تو ارادے کو بہت قوی کر دیتے
ہیں۔ (جو برٹ)

اقوال کی حقیقی عمدگی یہ نہیں ہے کہ اُن میں
کوئی نادر دعویٰ یہ بات یا کوئی پیچیدہ و دقیق
مضمون بیان کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ کوئی مفید و
سچی بات چند الفاظ میں ادا کر دی جائے۔ (جانسن)

اقوال سے ادب کی صرف تحسین و تزئین ہی
نہیں ہوتی بلکہ اُن سے بہت مفید کام بھی نکلتے ہیں
اُن کو تقریر کے تیز اوزار سمجھنا چاہیے جن سے معاملات
کی پیچیدہ گرہیں اکثر سلجھ جاتی ہیں۔ (بیکن)

علوم مجردہ میں خاصکر بہت بڑا اور سب سے
زیادہ قیمتی حصہ ہمارے علم کا مختصر اقوال پر موقوف
ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دنیا میں خود بڑے اور
بہترین آدمی کچھ نہیں ہیں مگر اقوال مختصر۔ (کولرج)

ان مختصر جملوں میں اخلاق کے تخم چھپے ہوئے
ہیں جن سے فلسفہ کے استادوں نے لاتعداد
بڑی بڑی کتابیں تیار کر لی ہیں۔ (پلوٹارک)

شاید ہی کوئی ضرب المثل ایسی ہو جو سچی نہ ہو
کیونکہ وہ تجربہ پر مبنی ہوتی ہے اور تجربہ ہی
ام العلوم ہے۔ (سروینٹیز)

عقلمند لوگ اپنی عقل کا اظہار مختصر اقوال
میں کرتے ہیں۔ اگر عمدہ افعال زندگی کا خلاصہ
ہیں تو عمدہ اقوال یقیناً اُس کی زینت ہیں (رسکن)

افکار Cares. Worry.

فکر کو بطور مہمان کے بلاؤ تو وہ جلد تمہارے
گھر کی مالک ہو جائے گی۔ (بودی)

فکر سے کسی مرض کا علاج نہیں ہوتا بلکہ وہ
لاعلاج مرضوں کو اور زیادہ خراب کر دیتی ہے (شیکسپیئر)

افکار دور کرنا آلام کے دور کرنے سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ وقت سے آلام مر جاتے ہیں اور افکار کو ترقی ہوتی ہے۔ (رکرٹ)

جو لوگ افکار سے دنیا مول لیتے ہیں وہ گویا دنیا کو کھو بیٹھتے ہیں۔ (شکسپیر)

فکر سے نہ صرف ہماری نیکیاں اور خوبیاں بڑھتی ہیں بلکہ ہماری دائمی مسرتیں بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ (سیمس)

شب کو افکار مثل اپنے لباس کے اُتار ڈالا کرو۔ اس سے دن کی محنت آرام سے بدل جائے گی اور دوسرے دن کا م بہت مزے سے ہوگا۔ (گوارسلے)

اگر افکار کے ساتھ بستر پر جاؤ گے تو اس طرح سوؤ گے کہ گویا کوئی بوجھ تمھاری پیٹھ پر ہے۔ (ہیلی برٹن)

خدائے تعالےٰ نے امید اور خواب کی نعمتیں اس لیے بخشی ہیں کہ افکار دنیوی کا معاوضہ ہو جائیں۔ (والٹیر)

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آج کی فکریں دوسرے دن تک نہیں رہتیں لہذا رات کو جب سوؤ تو اپنے افکار سے کہہ دیا کرو کہ "جاؤ کل میں انشاء اللہ تمھاری صورت نہ دیکھوں گا"۔ (کاؤپر)

صرف انسان ہی میں یہ عیب ہے کہ اپنی مسرت کو افکار سے بدمزہ کرتا اور موجودہ چیزوں کو امکانات کے خیال سے غارت کرتا ہے۔ (ڈرائیڈن)

یکے مرغ دیدم نہ بال و نہ پر نہ از بطن مادر نہ پشت پدر
نہ بر آسمان و نہ زیر زمیں ہمیشہ خورد گوشت آدمی

(چیستان فکر)

انسان کے افکار ہی اُس کے لیئے باعث تسلی ہیں جو شخص افکار سے خالی ہے وہ کمبخت ہے۔ افکار شغل ہیں اور بغیر کسی شغل کے روح کو ہمیشہ تکلیف رہتی ہے شغل و حرکت روح کی زندگی اور سکون اُس کی موت ہے۔ (ینگ)

دنیا افکار سے پُر ہے اور وہ شخص جو دوسروں کے افکار پر غور کرتا ہے وہ اپنی افکار اُسی قدر کم کرتا ہے۔ (کمبرلینڈ)

ہم بہت آسانی سے افکار کا انتظام کر سکتے ہیں۔ ہم یہ کریں کہ ہر روز کی فکریں اُسی دن ختم کر دیں۔ اگر روز گذشتہ کی فکریں آج جوڑیں اور پھر اُن میں روز آئندہ کی افکار شامل کریں تو یہ بوجھ نا قابل برداشت ہو جائے گا۔ (جان نیوٹن)

اپنے حقوق کو ایک مایوسانہ نظر سے دیکھنا فکر ہے۔ (سر والٹر اسکاٹ)

فکر کرنا گویا اقرار کرنا ہے کہ خدا ہمارے معاملات سے بے خبر ہے اور اُن کی اصلاح کی قوت ہم میں خدا سے زیادہ ہے۔ (میکلیرن)

جو شخص فکر کرتا ہے وہ بیکار کا بوجھ اپنے سر پر لیتا ہے۔ میں تو اپنی افکار کو اللہ تعالےٰ کے

سلہ مقابلہ کردہ کارساز ما بہ فکر کار ما فکر ما در کار ما آزار ما

حوالہ کرتا ہوں اور آپ آرام سے رہتا ہوں ۔
(بشپ ہال)

فکر زیادہ تر بڈھوں کی آنکھوں میں پہرا دیتی ہے اسی وجہ سے اُن کو نیند کم آتی ہے ۔ (شیکسپیر)

ہرچند کہ انسان کو حکم ہے کہ اپنے افکار خدائے تعالےٰ کے حوالے کرے مگر بعض لوگ ایسے ہیں کہ یہ بوجھ خدا کو حوالہ کرکے پھر واپس لینا چاہتے ہیں اور افکار کے بوجھ سے سر جھکا کے چلنا اُن کے نزدیک کوئی عزت و شرف کی بات ہے ۔ (بیچر)

اقرار گناہ Confession.

انسان کو چاہیے کہ اپنی غلطی کے اقرار میں کبھی نہ شرمائے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آج اُس کو بہ نسبت کل (گذشتہ) کے زیادہ عقل ہے ۔ (پوپ)

بدیوں کا اقرار نیکیوں کی ابتدا ہے ۔ (آگسٹن)

اس کی کیا وجہ کہ کوئی شخص اپنی برائیوں کا اقرار نہیں کرتا ؟ وجہ یہ ہے کہ وہ بُرائیاں ہنوز اُس میں موجود ہیں ۔ صرف ایک جاگتا آدمی اپنا خواب بیان کرسکتا ہے ۔ (سنیکا)

جو شخص گناہ کا اقرار کرے وہ نجات کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے ۔ جو شخص گناہ پر سچے دل سے نادم ہو وہ اپنا راستہ جلد طے کرتا ہے ۔ اور جو گناہ سے تائب ہو وہ اپنی منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے ۔ (کوارلے)

صرف اقرار گناہ کے واسطے جرأت ضروری نہیں بلکہ اقرار حماقت کے واسطے اُس کی اُسی قدر ضرورت ہے ۔ (روسو)

اُمراء Aristocracy.

امراء کے باپ دادا کا حال خدا ہی کو معلوم ہے ۔ (ڈیفو)

دنیا میں ہمواری نہیں ہے ۔ بعض آدمیوں کو بعض پر ضرور تفوق ہوتا ہے ۔ اگر آج یہ ناہمواری مٹا دو تو کل پھر یہ پیدا ہو جائے گی ۔ (امرسن)

جمہوری بھی اگر دولت کی پرستش کریں یا سوشل امتیاز قائم رکھیں تو در حقیقت وہ امارت پسند ہیں ۔ (لا اعلم)

سیاسی تبدیلیوں کے دوران میں بھی امراء ضرور باقی رہتے ہیں ۔ اگر پُرانے امیر طبقے کو مٹاؤ تو دار العوام (ہاؤس آف کامنس) کے دولتمند اور صاحب اختیار ارکان اُن کی جگہ لے لیں گے اور اگر یہ ہٹیں تو کارخانوں کے منیجر اور مالک اُن کے قائم مقام ہوجائیں گے (گنیز)

میرا یہ ہرگز اعتقاد نہیں کہ خدا نے چند بوٹ پہنے ہوئے اور مہمیز لگائے ہوئے آدمیوں کو سوار اور کروڑہا مخلوق کو زین و لگام سے آراستہ گھوڑے بنا کے اُن کی سواری کے لیے پیدا کیا ہے ۔ (رمبولڈ)

امارت کے تین دور ہوتے ہیں (۱) فوقیت کا (۲) حقوق کا (۳) شیخی کا ۔ پہلے دور سے گذر کر اُمرا

دوسرے میں ذلیل اور تیسرے میں فنا ہو جاتے ہیں۔ (شتوبریاں)

انتخاب۔ (پسند) Choice.

انتخاب صحیح کا معیار یہ ہے کہ آدمی اُس انتخاب سے کتنا فائدہ حاصل کرتا ہے۔ (ریب)

جب علم کسی نقصان کی طرف مُنجر ہو تو جہل اختیار کرو۔ (بی۔ ایٹی)

اس دنیا میں نیکیوں سے زیادہ ہم کو بُرائیوں میں انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ (کولٹن)

ہمیشہ وہ راستہ اختیار کرو جو بہترین ہو گو کہ دشوار ہو۔ رواج اُس دشواری کو دور کر کے راستہ کو آسان اور آرام دہ کر دے گا۔ (فیثا غورث)

اگر دو بدیوں میں انتخاب ہو تو کوئی بدی پسند نہ کرو اور اگر دو نیکیوں میں ہو تو دونوں پسند کرو۔ (اڈورڈس)

ایذا رسانی (مظالم) Persecution

ایذا رسانی اس وجہ سے بُری نہیں کہ وہ بے رحمی ہے بلکہ چونکہ وہ بُری ہے اس وجہ سے بے رحمی ہے۔ (وہیٹلی)

تاریخ مظالم ایک تاریخ ہے فطرت کے خلاف کوششوں کی۔ اس سے کچھ غرض نہیں کہ مظالم کرنے والا ایک شخص تھا یا ایک جماعت۔ (امرسن)

مذہبی اور اعتقادی معاملات میں ہر قسم کا جبر و تشدد اور ظلم و ستم قطعاً ناجائز ہے۔ (ملٹن)

جب تعصب اور نامعقولیت کو اپنی غلطی محسوس ہوتی ہے اور دلائل کے زور سے وہ خاموش ہو جاتے ہیں اُس وقت وہ اپنا ظلم و ستم شروع کرتے ہیں قدیم زمانے میں یہ کام آگ اور تلوار سے لیا جاتا تھا۔ اب زبان سے لیا جاتا ہے۔ (ٹمنس)

ہر زمانے میں اور ہر ملک میں مذہبی مظالم اُنہیں لوگوں سے عمل میں آئے جن میں مذہب کی زیادتی تھی نہ کہ اُن سے جن میں مذہب کی کمی تھی۔ (کولٹن)

جب کبھی تم کوئی ظلم دیکھو تو یقین جانو کہ حق مظلوم کی طرف ہے۔ (بشپ لیٹیمر)

شہیدوں کے خون سے مذہب سینچا گیا ہے۔ (جیروم)

دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ مردہ ولیوں کی قدر ہوتی ہے اور زندہ ولیوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ (ان۔ ہو)

ایکٹر (نقال) Actor

ایکٹر مثل مصوروں کے فطرت کے نقال ہیں جن کے وسائل مسرت اور مقصد فضیلت ہونا چاہیے۔ (شینسٹون)

تمام دنیا ایک اسٹیج ہے اور تمام مرد اور عورتیں محض تماشہ گر ہیں جو اسٹیج پر آتے جاتے رہتے ہیں اور بعض وقت ایک آدمی بہت سے پارٹ کرتا ہے۔ (شیکسپیر)

بعض ایکٹر اپنے پارٹ ایسی عمدگی سے ادا کرتے ہیں کہ ہم کو اُن کی اصلیت اور اُن کی پرائیویٹ زندگی کا یقین مشکل سے آتا ہے۔ (ریمب)

نوجوان لڑکیوں کو تھیٹر کبھی نہ جانا چاہیے۔ [illegible] صرف اس وجہ سے کہ ڈرامہ خلاف تہذیب [illegible] ہے بلکہ وہ مقام بلا ہے۔ (الگزینڈر ڈوما)

کامیڈی میں سب سے مشکل کام فول (مسخرہ) کا ہے۔ مگر وہ شخص جو اس پارٹ کو کھیلے اُس کو ہرگز بیوقوف نہ ہونا چاہیے۔ (سروینٹیز)

Cruelty بے رحمی (ظلم)

بے رحمی سخت دلی اور دل کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ (سنیکا)

بے رحمی اور خوف ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (بالزیک)

ایک آدمی کی شقاوت دوسرے کے ساتھ ہزاروں کو رُلاتی ہے۔ (برنس)

جیسا کہ اور بدیوں کا خاصہ ہے بے رحمی کا بھی کوئی بیرونی محرک نہیں ہوتا۔ وہ صرف موقع کا انتظار کرتی ہے۔ (جارج ایلیٹ)

بے رحمی کا بہت بُرا اثر یہ ہے کہ اُس کے تماشا دیکھنے والے بھی بے رحم ہو جاتے ہیں (رکسٹن)

Children بچے (اطفال)

بہت بچے بہت فکریں۔ بچے نہیں دل کو چین نہیں۔ (ہیروی)

بچپن سے جوانی کا حال اسی طرح کھل جاتا ہے جیسے صبح سے دن کا۔* (ملٹن)

بچہ آدمی کا باپ ہے۔* (ورڈسورتھ)

ہم کہیں جائیں ہمارے رشتۂ تقدیر کا سرہمارے پالنے میں بندھا ہوتا ہے۔ (رکرٹ)

بچوں کو ناصحوں اور ناقدروں سے زیادہ اچھے نمونوں کی ضرورت ہے۔ (جوبرٹ)

بچے کو زیادہ ٹھیک ٹھاک نہ بناؤ۔ اگر بچوں کو محاسن و اخلاق تم جبر و ظلم سے اور ڈراؤنی صورت میں سکھلاؤ گے اور آزادی اُن کو حسین و خوبصورت نظر آئے گی تو تمہاری محنت بالکل رائگاں جائے گی۔ (فنیلون)

بچوں سے محنت ہلکی مگر مصیبت زیادہ گراں ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کو بڑھاتے مگر موت کی یاد دل سے بھلاتے ہیں۔ (بیکن)

بچوں کی تربیت میں اُن کے بڑھاپے کا خیال رکھا کرو۔ (جوبرٹ)

بچے کی آئندہ قسمت ہمیشہ اُس کی ماں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ (نپولین بونا پارٹ)

بچپن اور جوانی کے مقاصد انسانیت کے اعلیٰ مقاصد ہیں۔ (جینیس)

جب والدین بچوں کو خراب کرتے ہیں تو بچوں کا دل خوش کرنے سے زیادہ خود اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ بچوں کی خرابی ماں باپ کی انانیت ہے۔ (دلا [illegible])

* [illegible] دونوں مقولے ایک مفہوم کی صورت رکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ بچپن [illegible] پتہ [illegible] سکتا ہے کہ بڑا ہو کے آدمی کس طرح کا [illegible] اسی مضمون کے اردو میں دو مقولے یا مثلیں مشہور ہیں۔ بچہ کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں اور ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

تمھارا چھوٹا بچہ صحیح معنوں میں بادشاہ ہے
(مسز اسٹو)

اُس شخص کو بد نصیب نہ کہو گو کہ کتنا ہی وہ
فلاکت زدہ ہو جو محبت کرنے کے لیے ایک بچہ
رکھتا ہو۔ (ساؤدے)

میں اکثر خیال کرتا ہوں کہ دنیا کس قدر سونی
ہوتی اگر اُس میں بچے نہ ہوتے اور کس قدر بے رحم
ہوتی اگر اُس میں بڈھے نہ ہوتے۔ (کولرج)

بچوں سے زیادہ دنیا میں کیا کوئی دوسری
نعمت اچھی ہے؟ (سسرو)

بچوں کی آفرینش کی غرض صرف یہ نہیں ہے
کہ نسل انسانی بڑھے بلکہ ہمارے دل بڑھیں۔ ہم
بے غرضی، ہمدردی اور محبت کی صفتیں سیکھیں۔
ہماری روح کے مقاصد بلند ہوں۔ (میری ہاوٹ)

بچے اللہ تعالیٰ کے پیام رساں ہیں اور
محبت، امید اور امن کا پیغام پہونچاتے رہتے ہیں
(لاول)

بچے کا پھٹا ہوا کرتہ درست ہو سکتا ہے مگر
اس کا ٹوٹا ہوا دل کبھی نہیں جُڑ سکتا۔ (لانگفیلو)

کیا مبارک وہ ہاتھ ہے جو بچوں کے لیے
سامان راحت مہیا کرتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ
یہ خوبصورت کلیاں کس وقت اور کس جگہ شگفتہ
ہوں گی۔ (جیرولڈ)

بچہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اُس وقت
تک نہ سیکھے گا جب تک وہ خود سے اپنے پاؤں پر
نہ کھڑا ہو۔ بیشک وہ شروع میں غلطیاں کرے گا
مگر اُنھیں غلطیوں سے اُس کو عقل آئے گی۔ (بیچر)

بچوں کی بیس غلطیوں سے اُنیس کی پروا نہ کرو
مگر اُس ایک کے متعلق جو حکم دو وہ ضرور منوا لیا کرو۔
(اڈورڈس)

بچے کی تمام خواہشیں پوری کرنا اس کو ضدی
بنانا ہے۔ اس وجہ سے کہ خواہشات جتنی پوری
ہوتی جاتی ہیں بڑھتی جاتی ہیں اور تمام خواہشات
پوری کرنا تمہارے امکان سے باہر ہے۔ (روسو)

بچوں کی تربیت میں نرمی اور سختی دونوں ملی
رہنا چاہیے۔ نہ اُن کو بالکل مطلق العنان کر دو اور
نہ اُن کی ہر خواہش مار دو۔ گو کہ اُن کو ڈانٹ
میں رکھنے سے ہمارا دردِ سر کم ہوگا مگر جب اُن کا
سن بڑھے گا تو اُن کی وجہ سے ہمارا دردِ دل زیادہ
ہوگا۔ (اسپرجن)

بچے طبعاً سستی و بیکاری سے نفرت کرتے
ہیں۔ پس تمھارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ مفید کاموں
میں اُن کو ہر وقت مشغول رکھو۔ (لاک)

کون شخص بچوں کی موہنی صورت نہیں دیکھنا
چاہتا۔ اُن کی پیاری باتیں نہیں سننا چاہتا۔
اُن کے ساتھ دوڑنا اور کھیلنا نہیں چاہتا؟ (ڈکینس)

بچے بھی اپنی خوشی و غم اسی طرح رکھتے ہیں
جیسے کہ بڑے بوڑھے۔ بچے کو اپنا کنکوا اُڑانے
یا باجا بجانے میں اتنی ہی مسرت حاصل ہوتی ہے
جتنی بڑے آدمیوں کو بڑے بڑے منصوبے

لگا نٹھنے اور شہرت کی تلاش میں ہوتی ہے (شاپین)

بچوں کو فطرت کی طرف سے ایک زبردست قوت مشاہدہ عطا ہوئی ہے لہذا وہ تمھاری چھوٹی سی چھوٹی غلطیاں دریافت کر سکتے ہیں۔ پس ہم کو چاہیئے کہ بچوں کی معیت و صحبت میں بجائے اُن کے عیبوں کے خود اپنا خیال رکھیں۔ (فینیلون)

ہمارا پہلا اور سب سے بڑا فرض بچوں کے ساتھ یہ ہے کہ اُن کو خوش اور مسرور رکھیں۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو بچوں پر سخت ظلم کیا جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی۔ (بکسٹن)

جس شخص کا بچپن مہربانی اور محبت کے ساتھ گذرا ہے وہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی اُسی مہربانی و محبت سے ضرور پیش آئے گا۔ (جارج ایلیٹ)

جب کسی بچے کی آنکھ سے آنسو نکلیں سزا کے خوف سے نہیں بلکہ خطا کی پشیمانی سے تو پھر اُس کو کچھ سزا نہ دو اس لیے کہ جب کوئی اپنے کردہ پر آنسو بہائے تو یقین جانو کہ کوئی فرشتہ اُس کے دل میں جاگزیں ہے جو اُس کی خطا بھولواتا ہے۔ (زین)

جو چیز سب سے بہتر اور سب سے عقلمند آدمی اپنے بچے کے لئے چاہے وہی ایک جماعت کا فرض ہے کہ اپنے بچوں کے لیے بھی چاہیں۔ (جان ڈیوی)

قبل اس کے کہ کسی بچے کو سزا دو اس بات کا یقین کر لیا کرو کہ اُس خطا کے تم تو باعث نہیں ہو۔ (آسٹن اوسلی)

ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اللہ تعالیٰ کا ایک عہد خیال ہوتا ہے۔ اور ایک تازہ و درخشاں امکان۔ (سکے، ڈی، ڈگن)

بچے کا دل خاموشی میں زیادہ جوش کھاتا ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک قوی کا دل غصہ میں کھاتا ہے۔ (براؤننگ)

جب ہم کسی بچے کی تعریف یا اُس سے محبت کریں تو اُس کی موجودہ حالت کی نہیں بلکہ آئندہ حالت کی کرتے ہیں جس کی ہم اُمید اُس سے رکھتے ہیں۔ (گیٹے)

جتنا ہی چھوٹا بچہ ہوگا اُسی قدر خدا سے قریب ہوگا جس طرح چھوٹے تارے آفتاب سے قریب ہوتے ہیں۔ (رکسٹر)

بچوں کو ضبط نفس سکھلانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن کو کام کرنے دو۔ اگر وہ غلطیاں کریں گے تو کوئی حرج نہیں اُن کا غلطیاں کرنا بہ نسبت نہ کرنے کے بہتر ہے۔ (ریچر)

جس طرح شاخ جھکے گی ویسی ہی قطع درخت کی ہو گی۔ (پوپ)

بچوں کی تعلیم ایک ایسا پیشہ ہے جس میں یہ جاننا ضروری ہے کہ وقت کیونکر کھونا چاہیے تاکہ وہ آئندہ حاصل ہو سکے۔ (روسو)

بچوں کو جو کام دیا جائے وہ معتدل ہو۔ زیادہ بوجھ اُن پر ڈالنا جسمانی، دماغی، روحانی طریقہ سے مضر ہے مگر یہ بہت ضروری ہے کہ جس قدر کام اُن کو دیا جائے اُس کو وہ نہایت صحت

اور پابندیٔ وقت کے ساتھ پورا کریں۔ اس سے آئندہ
اُن کو اپنے فرائض صحیح طور پر پورا کرنے کی عادت
پڑے گی۔ (ہیر)

بچپن میں جنت ہم سے بہت قریب رہتی ہے
(ورڈسورتھ)

بچے بڑے قیافہ داں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے
دوستوں کو دشمن سے خوب پہچانتے ہیں (سڈنی اسمتھ)

جو لوگ بچوں کو تعلیم دیتے ہیں اُنکو یہ ہمیشہ یاد
رکھنا چاہیے کہ لڑکے بڑھ کے مرد ہوں گے اور لڑکیاں
بڑھ کے عورتیں اگر اس اہم خیال پر عمل نہ کیا گیا تو
آئندہ نسل اخلاقی مخنثوں کی ہوگی۔ (ہیر)

میں نے اپنے طویل پیشۂ وکالت میں ایسے
بہت سے لڑکے دیکھے جنھوں نے پریشانی و مصیبت
میں اپنے باپوں کو چھوڑ دیا مگر ایک باپ بھی ایسا
نہ دیکھا جس نے اپنا آخری روپیہ بھی خوشی خوشی
اپنے بچے کی حفاظت میں خرچ نہ کیا ہو (ڈیوڈ ڈڈیگٹ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ بچے کی تعلیم زیادہ
تر اُس مشاہدہ پر موقوف ہے جو وہ بچہ خود اپنے پاس
رہنے والوں کے افعال و الفاظ اور اُن کی بولی
اور صورت کا ہر وقت کیا کرتا ہے۔ پس اُس کے
ساتھیوں اور بہی خواہوں کا یہ فرض ہے کہ اُس کی
موجودگی میں، ہر قسم کی بدی اور عیب سے بچتے رہیں (جبیں)

بچوں کو اپنے والدین کی محبت کا صحیح اندازہ
نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے جب تک کہ اُن کے
والدین مر نہ جائیں یا خود اُن کے بچے نہ پیدا ہوں
(رسکن)

جہاں کہیں بچے ہوں وہیں زمانہ طلائی ہے
(نووٰلیس)

بچپن سے بڑھاپے میں کبھی کبھی ملاقات
ہو جاتی ہے مگر جوانی سے کبھی نہیں ہوتی (مسز جیمسن)

بار[1] Bore (فضول گو)

لوگ کسی کی صحبت سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا
کہ اُن لوگوں کی جن کے پاس وقت ہوتا ہے مگر اُسکو
صرف کرنا نہیں جانتے بلکہ اُس کو دوسروں کی تضیع
اوقات میں صرف کرتے ہیں۔ وہ جن کا منھ کبھی
باتوں سے نہیں تھکتا۔ (اڈورڈس)

اگر کوئی شخص بار ہو تو اُس کا اصلی سبب یہ
ہوتا ہے کہ وہ اپنی گفتگو کو روکنا نہیں جانتا۔ (والٹیر)

دنیا میں بعض آدمی ایسے ہیں جو اپنا وقت
اکیلے نہیں کاٹ سکتے۔ ہمیشہ دوسروں کے وبال
جان ہوتے ہیں۔ (بونالڈ)

کسی جنگلی جانور سے بھی اتنا ڈر نہیں معلوم ہوتا
جتنا کہ اُس شخص سے جو باتیں بہت کرتا ہے مگر اُن
میں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ (سوِفٹ)

[1] انگریزی میں بور (Bore) اُس شخص کو کہتے ہیں جس کی صحبت یا گفتگو لوگوں کو بار خاطر ہو۔ بالفعل یہ لفظ ایسا عام ہوگیا ہے کہ زبان میں
بے تکلف رائج ہے یہاں تک کہ اس سے ایک اسم صفت بھی بنا ہے جس کو "بوریت" کہتے ہیں۔ میں نے اس کا ترجمہ فارسی لفظ "بار" سے
کیا ہے جس کو ایک جدت سمجھنا چاہیے ان دونوں لفظوں میں ایک قسم کی تجنیس بھی قابل ملاحظہ ہے۔ (مولف)

خدا کرے کہ جدید علمی ترقیاں کوئی ایسی چیز ایجاد کریں جن سے ایسے "بار" لوگوں سے جان بچے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو شخص تمہاری چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً رومال یا دستانہ وغیرہ چرالے تو اس چوری کے جرم میں اُس کو سزا ملے اور وہ جو تمہارا وقت عزیز چرائے، تمہاری خوش مزاجی اور صبر و تحمل پر حملہ آور ہو۔ تمہارے عمدہ عمدہ خیالات تم سے چھینے اور اس پر بھی سزا یاب نہ ہو۔ (بائرن)

ہم کو ہمیشہ اُن لوگوں کی صحبت گراں معلوم ہوتی ہے جن کی گرانیٔ صحبت کی ہم شکایت نہیں کر سکتے۔ (رو کی فوکو)

بستر Bed

بستر ایک عجیب معمہ ہے۔ ہم اُس پر خوشی خوشی جاتے ہیں اور افسوس کے ساتھ اُس کو چھوڑتے ہیں۔ ہر شب کو دل کو مضبوط کرتے ہیں کہ صبح سویرے اُٹھیں گے مگر صبح کو ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیتے ہیں کہ دیر تک سوتے رہیں۔ (کولٹن)

آرام کیا اچھی چیز ہے۔ میرا بستر میری آرام گاہ ہے۔ میں اُس کو ساری دنیا کے معاوضہ میں بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوں۔ (نیپولین)

بستر میں ہم ہنستے ہیں۔ بستر میں ہم روتے ہیں۔ بستر ہی پر ہم پیدا ہوتے ہیں اور بستر ہی پر مرتے ہیں۔ بستر ایک بیّن نشان شادی و غم کے توام ہونے کا ہے۔ (بنسراڈی)

سویرے سوؤ اور سویرے جاگو اس سے تم دولتمند، تندرست اور عقلمند ہو گے۔ (فرینکلن)

بحث Discussion

(مباحثہ) Argument

بحث اگر تقریری ہے تو بدترین تقریر اور اگر تحریری ہے تو بدترین تحریر ہے۔ (سوئفٹ)

بحث میں ملائمت اور نرمی کا خیال رکھو کیونکہ غصہ سے غلطی قصور، اور سچی بات بے تمیزی ہو جاتی ہے۔ (ہربرٹ)

بحث میں شاعرانہ تشبیہات و استعارات عاشقانہ غزلوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے یعنے اُن میں الفاظ تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر مطلب کچھ نہیں ہوتا۔ (پرایور)

عقلمند اسباب سے بحث کرتے ہیں اور احمق نتیجہ نکالنے میں جلدی کرتے ہیں۔ (اینا کارسس)

جو شخص اپنے دلائل غصہ اور تحکم سے قائم کرنا چاہتا ہے وہ اپنی خفت عقل ثابت کرتا ہے (مانٹین)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ دلائل کی قوت و حسن اور نیز اُن کا افادہ اُن کے اختصار پر مبنی ہے۔ (پوپ)

جب کوئی شخص احقاق حق کی غرض سے نہیں بلکہ حریف پر فتح پانے کے لیے بحث کرتا ہے تو اُس کو صرف ایک مددگار ملتا ہے یعنے شیطان۔ یاد رکھو کہ روح کی تلوار سے لڑنے کی غرض اصلی یہ نہیں ہے کہ کسی کی عقل کو شکست دی جائے بلکہ یہ کہ کسی کا دل اپنے قبضہ میں آجائے۔ (میکڈانلڈ)

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے دلائل سے صرف اُن کی خواہشات معلوم ہوتی ہیں۔ (کولٹن)

تعصبات پر بحث کبھی غالب نہیں آسکتی۔ چونکہ اُن کی بنیاد عقل پر نہیں قائم ہوتی لہذا تعصبات کا قلعہ منطق سے نہیں ٹوٹتا۔ (ایڈورڈس)

کسی امر کا صاف صاف بیان ہی بحث ہے۔ (سِشلڑ)

اگر بعض وکلا مجھ سے بحث پر آجائیں تو آج اُن کا فیصلہ یہ ہوگا کہ میں دہری ہوں اور کل یہ کہ میں چور ہوں۔ (ملبور)

دسترخوان پر کبھی بحث مباحثہ نہ کرو کیونکہ جو شخص بھوکا نہ ہوگا وہ جیتے گا اور بھوکا ہمیشہ ہارے گا۔ (لا اعلم)

اکثر کمزور دلائل سے مجھ کو سابقہ پڑتا ہے مگر گو کہ وہ کمزور و بے بنیاد ہوتے ہیں پھر بھی اُن کو رد کرنا مجھ کو آسان نہیں معلوم ہوتا۔ انسان کے لیے اس سے زیادہ کوئی مشکل کام نہیں کہ کسی ملائم تکیہ کو تلوار سے کاٹے۔ (وہیٹلی)

قوی سے قوی دلیل بھی خالی دماغ پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ ایک ہلکا پر اور ایک گنی یکساں قوت کے ساتھ خلا میں گرتے ہیں۔ (کولٹن)

سلہ ایک کمزور دلیل اگر متانت و تہذیب سے پیش کی جائے تو زیادہ دلنشیں ہوتی ہے بہ نسبت اُس قوی دلیل کے جو غصہ و گستاخی سے بیان کیجائے (لاک)

غصہ اور طیش سے ممکن ہے کہ ذہانت کچھ بڑھ جائے (گو کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے) مگر عقل میں پختگی نظر میں وسعت، ذہن میں استقامت اور قلب میں قوت کبھی نہیں حاصل ہوتی۔ (لینڈور)

لا ئبڑی امور میں بحث کرنا بے سود ہے۔ جب ٹھنڈی ہوا چلے تو بہترین دلیل اُس سے حفاظت کی یہ ہے کہ اپنا بارانی کوٹ پہن لو۔ (لاول)

پہلا فرض ایک عقلمند وکیل کا یہ ہے کہ وہ فریق مخالف کے یہ ذہن نشین کرے کہ وہ اُس کے دلائل خوب سمجھتا ہے اور اُس سے ہمدردی رکھتا ہے (کولرج)

ہر تنازع انفصال کے لیے ایک جذبہ چاہتا ہے اور سچ پوچھو تو کوئی تنازع دنیا میں جذبہ کے قابل نہیں ہے۔ (شرلاک)

مباحثہ کا یہ زریں اصول ہے کہ الفاظ نرم ہوں اور دلائل سخت اور مباحثہ کی یہ غرض نہ ہو کہ حریف خاموش یا پریشان ہو جائے بلکہ یہ کہ امر حق کو وہ تسلیم کرے۔ (ولکنس)

جو شخص کسی معاملہ کا ایک رُخ جانتا ہے وہ اُس معاملہ کو بالکل نہیں جانتا۔ (جان سٹورٹ مل)

ضدی اور کج فہم ہرگز مباحثہ کے قابل نہیں۔ (وہیٹلی)

جو شخص کوئی مسئلہ مذہبی ہو یا سیاسی آزاد بحث کے معیار پر رکھنا نہیں چاہتا وہ حق سے زیادہ اپنی رسائی کو پسند کرتا ہے۔ (واٹسن)

سلہ [illegible] کہ برہان قوی باید و معنوی ٭ نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی (سعدی)

بحث سے عقل کی تیزی کا خوب پتہ چلتا ہے
جیسے دو ہیرے آمنے سامنے رکھ دیے جائیں اور
ایک دوسرے پر ضیا باری کریں۔ (شنسٹون)

مباحثہ کی تکلیف اگر سچ پوچھو تو اُس کے
فائدے سے زیادہ ہے کیونکہ مباحثہ عقل کو بہرا
کر دیتا ہے اور جب حریف بہرا ہو جائے تو مجھ کو
سوائے گنگ ہونے کے کیا چارہ ہے (جوبرٹ)

جب کسی بحث میں زبردستی اور دھینگا دھینگی
شروع ہو تو یہ معاملہ کی کمزوری اور مباحث کی ہار
کی علامت ہے۔ (جونیس)

اگر لوگ کسی مسئلہ پر آزادی سے بحث
کریں تو اُس کا کبھی صحیح تصفیہ نہ ہوگا۔ (میکالے)

بحث میں حریف کے دلائل کو خوب قطع
کرو قبل اس کے کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ ایسا
ہی ہے جیسا کہ حریف کے ملک پر فوج کشی کی جائے۔
(فیلڈنگ)

اگر تم کو فضول بحث و مباحثہ کا شوق ہے
تو تم سوفسطائیوں سے خوب بحث کرو مگر تم اُن پر
کبھی غالب نہ آؤ گے۔ (سقراط)

متین سوالوں کا جواب ظرافت کے ساتھ اور
ظرافت آمیز سوالوں کا جواب متانت کے ساتھ
دینا مناسب ہے۔ (کولٹن)

خود اپنے دلائل کو کبھی نہ کاٹو تاکہ تمہاری
ذہانت معلوم ہو۔ اس سے تم کو حق و باطل کا امتیاز
جاتا رہے گا۔ نہ کسی سے محض اُس کو دق کرنے کی
غرض سے یا اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لیے بحث
کرو۔ یاد رکھو کہ بحث کی اصلی غرض کسی کو واقفیت
بخشنا یا کسی سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ (مِین)

مباحثہ میں بھی مثل جنگ کے جب کوئی فریق
کمزور اور شکست کھانے کو ہوتا ہے تو وہ چالاکی سے
ایسی دکھلاوے کی حرکتیں کرتا ہے جس سے حریف
اس دھوکہ میں آجائے کہ ابھی اس کی پوری قوت
صرف نہیں ہوئی اور اُس کی پشت پر بہت سے
مددگار ہیں۔ (سوفٹ)

بڑائی۔ (عظمت۔ بزرگی)

Greatness

حقیقی بڑے آدمی کی تین علامتیں ہیں۔ کام کے
ارادے میں ہمت، اُس کی تعمیل میں انسانیت، اور
اُس کی تکمیل پر اعتدال۔ (بسمارک)

سب سے بڑا آدمی وہ ہے جو حق کو ہمت کے
ساتھ منتخب کرے، شدید لالچوں کا خواہ اندرونی
ہوں یا بیرونی مقابلہ کرے، بڑے بڑے بوجھ
ہنسی خوشی سے اُٹھائے، حوادث کے طوفان
میں خاموش اور مطمئن رہے، دھمکی اور ناراضی کی
پرواہ نہ کرے، اور حق، نیکی اور خدا پر بھروسہ
رکھے۔ (چیننگ)

بڑا صرف وہی ہے جس میں بڑائی کی عادتیں
ہوں، جو ایسے کام کو انجام دے کہ جس کو دس ہزار
آدمیوں میں سے ایک بھی نہ کر پائے اگر اپنے باپ
ہاں تک سے اُس کا ذکر نہ کرے۔ (لیوبٹر)

سب سے بڑی نشانی بڑے آدمی کی یہ ہے کہ اپنے زمانے سے اُس کے خیالات آگے ہوں۔ (برد ہم)

اللہ تعالیٰ کے کاموں پر فکر و تدبّر، بنی نوع انسان کا فائدہ اور حقیقی انکسار، بڑائی کی یہی سچی علامتیں ہیں۔ (ایڈیسن)

کلام الٰہی کا عمیق مطالعہ جس سے اللہ تعالیٰ کی مرضی دریافت ہو سکے یہی خفیہ راز عظمت کا ہے۔ (جے، ڈبلیو الگزینڈر)

بڑائی قوت کا نام نہیں ہے بلکہ قوت کے صحیح استعمال کا نام ہے اور قوت کا صحیح استعمال اُس وقت نہیں ہوتا جب کہ کوئی آدمی اپنے ہمجنسوں پر اپنی شان و شوکت بڑھائے بلکہ اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اُسی قوت سے بہت سے دلوں کو اپنی طرف مائل کرے۔ مشکلیں بڑائی کی دایہ ہیں۔ ایسی سخت مزاج دایہ جو اپنے بچوں کو سختی سے ادھر اُدھر ہلاتی رہتی ہیں مگر اسی حرکت سے بچوں کے اعضا مضبوط اور توانا سب ہو جاتے ہیں۔ وہ دل جو بلند ارادوں اور سخت مزاحمتوں کا مقابلہ کرتا رہتا ہے لازمی طور پر بڑا اقدار ہوگا۔ (برائنٹ)

اگر کوئی شخص بڑائی کا متلاشی ہو تو بڑائی کا خیال دل سے نکال کر سچ کی تلاش کرے۔ اس تلاش میں دونوں اُس کو مل جائیں گے۔ (ہارس مین)

کوئی ایسا دل نہیں ہے جو حقیقی [illegible] بڑا ہو اور حلیم و رحیم نہ ہو۔ (ساؤتھ)

بعض لوگوں کی عظمت مقامی ہوتی ہے یعنی وہ بڑے اس لیے نظر آتے ہیں کہ اُن کے ساتھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ (جانسن)

کسی قوم کی بڑائی اُس کے مادی ساز و سامان میں نہیں بلکہ اُس کی ہمت، اُس کے ایمان، اُس کی عقل اور اُس کی اخلاقی قوت میں ہوتی ہے (ہوپر)

اس دنیا میں کوئی دن نہیں گذرتا کہ کوئی نہ کوئی چھوٹا آدمی، مرد یا عورت، کوئی بڑائی کا کام کرتا ہو، کوئی بڑا لفظ منہ سے نہ نکالتا ہو یا کوئی بڑا غم نہ سہتا ہو۔ ان گمناموں میں اکثر ہیرو، فلسفی اور شہیدان راہ خدا بھی ہوتے ہیں مگر ان میں سے اکثر کا حال اُس وقت تک نہیں کھلے گا جب تک وہ ساعت نہ آجائے جب کہ بہت سے بڑے چھوٹے اور بہت سے چھوٹے بڑے نظر آئیں گے۔ (چارلس ریڈ)

بڑا آدمی اُس عصر کا مجسم نمونہ ہوتا ہے جس کے واسطے اللہ اس کو خلق کرتا ہے مگر وہ اُس عصر کا خالق نہیں ہوتا۔ (ڈوسینے)

کوئی آدمی بھی بڑائی اُس وقت تک حاصل نہیں کرتا جب تک وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ اُس کی زندگی اُس کی قوم کے واسطے وقف ہے اور جو کچھ اللہ نے اُس کو دیا وہ اپنے بنی نوع کو دینے کے لیے تیار ہے۔ (فلپس بروکس)

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ سب سے بڑا آدمی کونسا ہے تو میں جواب دوں گا کہ وہ جو سب سے

بہتر ہے اور اگر دریافت کیا جائے کہ سب سے بہتر کون ہے تو میں کہوں گا کہ وہ جو سب سے زیادہ خلق کی خدمت کرتا ہے۔ (سر ولیم جونس)

سب سے بڑا آدمی وہ ہے جو دنیا میں رہ کر مسرت کے ساتھ تنہائی کی آزادی پسند کرے۔

(امرسن)

بڑائی کے اندازے میں مادی اشیار کی بڑائی اور عقلی و روحانی اشیار کی بڑائی جانچنے کا قاعدہ معکوس ہے یعنے مادی چیزیں فاصلہ سے چھوٹی اور عقلی و روحانی بڑی نظر آتی ہیں (شوپنہار)

بڑے آدمی انسانوں کے رہنما ہیں اور وہ اُن پر اس لیے حکومت کرتے ہیں کہ وہ اُن سے زیادہ عاقل ہوتے ہیں۔ (کارلائل)

کوئی چیز صحیح طور پر بڑی نہیں ہو سکتی جب تک وہ حق نہ ہو۔ (جانسن)

ایک بڑا، ایک نیک اور ایک صحیح نفس ایک قسم کی الوہیت ہے، جو گوشت و پوست میں جاگزیں ہو گئی ہے اور یہ برکت جس طرح ایک بادشاہ کو مل سکتی ہے اسی طرح ایک غلام کو بھی۔ وہ آسمان سے اُترتی ہے اور آسمان ہی پر لوٹ جاتی ہے وہ ایک ایسی آسمانی برکت ہے جس کو صاحب ظرف اور نیک نفوس دنیا میں بھی حاصل کرتے ہیں (سنیکا)

اس دنیا میں ہم کو اکثر آدمی ملتے ہیں جو بڑے ہیں اور اکثر جو نیک ہیں مگر ایسے کم ملیں گے جو بڑے اور نیک دونوں ہیں۔ (کولٹن)

بڑے آدمیوں سے وہی کام نکلتا ہے جو سڑک پر میلوں کے نشان سے۔ (مزنی)

اگر کسی کی بڑائی سے اُس کی زندگی کے اچھے اچھے مواقع، عمدہ اتفاقات، اُس کے دوستوں کی عقل اور دشمنوں کی بیوقوفی خارج کر دیے جائیں تو بڑائی کا دیو گھٹ کے ایک بونا رہ جائے گا۔ (کولٹن)

شہرت کو بڑائی کا مقصد کبھی نہ ہونا چاہیے بلکہ اُس کا نتیجہ۔ (آلسٹن)

کوئی کام کتنا ہی مشہور کیوں نہ ہو وہ بڑا نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ کسی بڑے ارادے کا نتیجہ نہ ہو۔

(روکی فوکو)

ہر بڑی چیز کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اچھی بھی ہو مگر تمام اچھی چیزیں بڑی ہوتی ہیں۔ (ڈیما ستھنیز)

بڑائی حاصل کرنے کی صرف ایک ہی راہ ہے یعنے سخت محنت۔ اگر کوئی شخص بڑائی اس گراں قیمت پر مول لینا نہیں چاہتا تو بہتر ہے کہ وہ لومڑیوں کا شکار کرے یا بلیوں کی گفتگو۔ (سڈنی اسمتھ)

بڑا آدمی زوال میں بھی بڑا ہی رہتا ہے اور کوئی اُس کی حقارت نہیں کر سکتا۔ ہم ایک مقدس مکان کے ڈھیر پر بھی اُسی ادب سے چلتے ہیں جس طرح اُس کے قیام و شان و شوکت کی حالت میں چلتے تھے۔ (سنیکا)

بڑے آدمی ہمیشہ شدید مصائب اور سخت اضطراب کے زمانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ خالص دھات دہکتی ہوئی بھٹی سے نکلتا ہے اور درخشاں برق ہمیشہ سیاہ ابر میں پیدا ہوتی ہے۔ (کولٹن)

حقیقی بڑائی صرف اللہ کے واسطے ہے۔

العظمۃ للہ۔ (عربی مقولہ)

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا (ذوق)

حقیقی بڑے نفوس پہلے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں پھر اپنے ضمیر کی اُس کے بعد اپنے ابنائے جنس کی۔ (کولٹن)

بڑے نفوس وہ نہیں ہیں جن میں معمولی آدمیوں سے جذبات کم اور نیکیاں زیادہ ہوں بلکہ وہ اور صرف وہ جن کے ارادے عظیم ہوں۔ (روکی فوکو)

ممکن ہے کہ بڑا نفس اپنا مقصد بدل دے مگر وہ اُس کو کبھی ترک نہ کرے گا کیونکہ اعلےٰ مقصد کی تلاش بڑائی کا خاصہ ہے۔ (کولٹن)

جو لوگ بڑے درجوں پر پہونچتے ہیں وہ تین چیزوں کے ملازم ہیں۔ (۱) کسی بادشاہ یا سلطنت کے (۲) اپنی شہرت کے (۳) اپنے کام کے۔ اور اس تہری پابندی کا یہ نتیجہ ہے کہ اُن کی ذاتی اور عملی آزادی بالکل سلب ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب معاملہ ہے کہ بڑائی اوروں پر تو اقتدار ڈھونڈھتی ہے مگر خود اپنی ذات پر اقتدار ضائع کر دیتی ہے۔ (بیکن)

بڑا وہ ہے جو کر سکتا ہے جو کچھ کہ وہ چاہتا ہے اور عاقل وہ ہے کہ وہی چاہتا ہے جس کو وہ کر سکتا ہے۔ (افلاند)

بڑا وہ ہے جو اپنے اوپر قابو رکھتا ہے۔
(بشپ ہال)

بڑے نفوس نیکی کرنے میں خوش ہوتے ہیں گو کہ ناشکری اُس کا ثمرۂ نیک اُن کو نہ دے۔ (رو)

لاکھوں کی جان اس وجہ سے بچ جاتی ہے کہ ایک شخص بڑا ہو جائے۔ (کیمبل)

بڑے آدمی کی تکلیفوں کا صحیح اندازہ صرف بڑا آدمی ہی کر سکتا ہے۔ (اینگ)

ملک کی رونق اور شان و شوکت صرف اُس کے بڑے آدمیوں سے ہے جو نیک بھی ہوں۔ (فشر ایمز)

بزرگ وہ ہے جو اپنے مٹی کے برتنوں کو سونے چاندی کے برتن سمجھے اور اُس سے بھی برتر وہ ہے جو اپنے سونے چاندی کے برتنوں کو مٹی کے برتن سمجھے۔ (سنیکا)

بعض لوگ عظمت لے کے پیدا ہوتے ہیں بعض عظمت حاصل کرتے ہیں اور بعضوں کو قبائے عظمت زبردستی پہنائی جاتی ہے۔ (شیکسپیر)

کوئی حقیقی بڑا آدمی اس وقت تک دنیا میں نہیں گذرا جو حقیقی نیک بھی نہ رہا ہو۔ (فرینکلن)

افسوس ہے کہ بڑے کیریکٹر کے لوگ شاذ و نادر ہی بغیر کسی عیب کے ہوتے ہیں۔ (واشنگٹن)

دنیا کو بغیر بڑے آدمیوں کے چارہ نہیں مگر بڑے آدمی ہمیشہ دنیا کے واسطے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ (گیٹے)

وہ ہرگز بڑا نہیں ہے جو نیکی میں بھی بڑا نہو۔
(شیکسپیر)

بڑے آدمی ہمارے ساتھ اپنی قربت سے اپنی بڑائی کھوتے ہیں اور معمولی آدمی زیادہ کرتے ہیں (ڈلینڈ)

کوئی آدمی اپنے معاصروں کی نظر میں بڑا نہیں معلوم ہوتا جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کی نظر میں بڑا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ (کولٹن)

ہر بڑا آدمی یا بڑی جماعت کبھی نہ کبھی انسانوں سے اپنی بزرگی منوا لیتی ہے۔ (تھیوڈور پارکر)

بڑے نفوس نہ صرف عمدہ موقعوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں بلکہ اُن کو وہ خود پیدا کرتے ہیں (کولٹن)

بڑا آدمی کوئی بڑا کام اس وجہ سے کرتا ہی کہ وہ کام بڑا ہے اور بیوقوف اس وجہ سے کرتا ہی کہ وہ اُس کو آسان معلوم ہوتا ہے۔ (داو نیارگس)

جو شخص خود ساختہ خیال عظمت پر عمل پیرا ہوتا ہے یقیناً کم مرتبہ عظمت کا سمجھتا ہے۔ (رسکن)

کوئی شخص کوئی کام کرے مگر اُس کو ایمانداری سے کرے۔ ایک معنی میں وہ ضرور بڑا آدمی ہے (میولاک)

صاحب عظمت لوگوں میں نیکی کی حکومت ہمیشہ علم اور عقل کے ساتھ ہوتی ہے۔ (سر فلپ سڈنی)

بڑھاپا Age

طبعی عمر سفید بالوں سے نہیں معلوم ہوتی بلکہ ایک خوبصورت اور معزز بڑھاپا حیات ابدی کا بچپن ہے۔ (پنڈار)

دقت اور نیکیاں انسان کو کس قدر خوبصورت بنا دیتی ہیں۔ (جیرولڈ)

فضیلت کی عزت بڑھاپے میں بڑھ جاتی ہے اگر کمینگی گھٹتی نہیں۔ (جے۔ پی۔ سن)

بڑھاپا تعداد سال پر موقوف نہیں بلکہ مزاج اور تندرستی پر موقوف ہے۔ بعض لوگ بڑھے پیدا ہوتے ہیں اور بعض کبھی بڑھے نہیں ہوتے۔ ٹی۔ (اڈورڈس)

بعض لوگ جو [illegible] بڑھتے ہیں جب وہ پہلی مرتبہ سنجیدگی سے یہ سنتے (!) کہ وہ بڑھے ہو گئے۔ (ہومز)

بڑھاپے کے عیوب میں بھی مثل بڑھاپے کے سختی ہوتی ہے اور چونکہ بڑھاپے میں نئی چیزیں سیکھنا دشوار ہے اس لیے سیکھ کر اُن کو بھلانا بھی بہت دشوار ہے۔ (ساؤتھ)

بڑھاپے کی بہت عزت کرنا چاہیے خاص کر اپنے بڑھاپے کی۔ (جے۔ پی۔ سن)

ہمارے بچپن اور جوانی کا ذمہ دار ہمارا ملک ہے مگر بڑھاپے کے ذمہ دار ہم خود ہیں (ملینی)

جب ہم جوان ہوتے ہیں تو اُن سب چیزوں کے جمع کرنے میں مستعد رہتے ہیں کہ جن سے بڑھاپا آرام سے کٹے مگر جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اپنے منصوبوں پر عمل نہیں کرتے۔ (پوپ)

کوئی عقلمند آدمی اپنے سے کمسن بننے کی خواہش نہیں کرتا۔ (سوِفٹ)

اگر ہم خوش رہنا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیے کہ فطرت کی پیروی کریں اور بڑھاپے کو بڑھاپے کی طرح گذاریں۔ (ہیزلٹ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

موضع ملگ کی معاشی تحقیق

موضع ملگ تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک میں شہر حیدرآباد سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر سڑک
سدی پیٹھ پر واقع ہے۔ اس کے حدود اربعہ حسب ذیل ہیں۔

مشرق میں نرسم پلی خالصہ، بھیم پور جاگیر، تاڑ واڑ پلی۔

مغرب میں بلارم جاگیر، تنکی خالصہ۔

شمال میں ورگل

جنوب میں چیلا ساگر خالصہ، چکک پلی جاگیر۔

موضع ملگ کی آبادی ۱۳۴۱ف کی رو سے ۱۹۴۹ ہے جس میں ۴۷۲ مرد، ۴۳۵ عورتیں
۳۶۴ لڑکے اور ۲۷۸ لڑکیاں ہیں۔ اس موضع میں برہمن، بقال، بڑھئی، جنگم، چمار، حجام، دھیڑ
دھنگر، دھوبی، سنار، کوٹھی، کنبی، کاملاں، لوہار، منوروار، مسلمان، بر کلا اور جولاہے آباد ہیں
۱۳۴۵ف کی خانہ شماری کی رو سے موضع میں ۴۵۱ مکانات ہیں جن میں سے ۳۰۰ گھر زراعت پیشہ
اور ۱۵۱ غیر زراعت پیشہ لوگوں کے ہیں۔

گاؤں کی عام حالت اور صفائی گاؤں پختہ سڑک سے ۲ ، ۳ فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مکانات
زیادہ تر سرخ مٹی کے ہوتے ہیں۔ اینٹ اور پتھر کے مکانات بھی بنائے جاتے ہیں۔ گاؤں کے
زیادہ مکانات سفالہ پوش ہیں مگر دھیڑوں اور دوسرے ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے مکانات پر چھپر
پڑے ہوئے ہیں۔ پختہ سڑک سے گاؤں تک جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ گرما میں [illegible]
کھیتوں میں سے راستہ بنا لیا جاتا ہے۔ مگر زمانہ کاشت اور برسات کے زمانہ میں [illegible]
کا کام دیتا ہے۔ آدمیوں اور جانوروں کی آمد و رفت سے پکنی مٹی اچھی [illegible] بن جاتی ہے۔ جو
مقامات پختہ سڑکوں سے اس قدر قریب ہوں وہاں ضرورت ہے کہ گاؤں کو پختہ سڑک سے

ملا دیا جائے۔ تاکہ آمد و رفت میں سہولت پیدا ہو جائے۔ گاؤں کے بعض اندرونی راستے بہت تنگ ہیں۔ یعنی وہاں سے ایک موٹی بھینس بھی نہیں نکل سکتی۔ گلیوں میں ہر مکان کے باہر ایک گڑھا ہوتا ہے جس کو معمولی پتھروں سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ اس گڑھے میں گھر کا تمام میلا اور گندہ پانی جمع رہتا ہے۔ اور مچھر بھنبھناتے رہتے ہیں۔ گرمی کے زمانہ میں تمام گندہ پانی ان گڑھوں میں جمع ہوتا ہے اور تمازت آفتاب سے بھاپ بن کر غائب ہوتا رہتا ہے مگر بارش میں یہ پانی گلیوں اور راستوں میں بہتا پھرتا ہے۔ مجھے بھوپال کے ایک گاؤں میں بھی یہی چیز نظر آئی مگر وہاں یہ گندہ پانی گڑھوں میں جمع نہیں ہوتا بلکہ چھوٹا گڑھا کھود کر اس میں ایک بڑا گملا رکھ دیتے ہیں۔ اور ۳-۴ روز میں جب وہ بھر جاتا ہے تو بھنگی اس کا پانی آبادی سے دور پھینک دیتا ہے۔ اگر یہاں بھی یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو مناسب ہے۔ صفائی کا کوئی انتظام یہاں محکمہ لوکل فنڈ کی جانب سے نہیں۔ حالانکہ بعض دیہات میں اس محکمہ کی جانب سے صفائی کا انتظام ہے۔ اس موضع سے لوکل فنڈ سالانہ مالگذاری سے ار فی روپیہ کے حساب سے وصول کرتا ہے چنانچہ ۱۳۴۵ف میں اس نے ۲۱۵ روپیہ وصول کئے۔ صفائی کا یہ انتظام ہے کہ ہر شخص اپنے دروازے کے آگے جھاڑو دے دیتا ہے اور اس طرح ان حصوں میں جہاں مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں صفائی ہو جاتی ہے مگر ان حصوں میں جہاں مکانات کچھ فاصلہ سے ہیں صفائی نہیں ہے۔ گاؤں کے کونوں اور مکانوں کے درمیان گھاس اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ کیونکہ تمام کوڑا یہیں جمع کر دیا جاتا ہے۔ جو برسات میں گل سڑ کر عفونت اور مہلک قسم کی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آبادی کے باہر چاروں طرف چند گڑھے کھود دیے جائیں اور ان میں گاؤں کا تمام کوڑا جمع کیا جائے اور ان ہی کو بیت الخلا بنا لیا جائے۔ کیونکہ گاؤں میں گھروں میں تو بیت الخلا ہوتے نہیں۔ لوگ اپنی ضروریات آبادی کے اطراف میں پوری کرتے ہیں اس طرح دو فائدے حاصل ہوں گے ایک تو گاؤں والوں کو اپنی فصلوں کے لئے کھاد مل جایا کرے گا جس کی آج کل سخت ضرورت ہے کیونکہ مسلسل کاشت سے زمینیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں اور اگر ان میں کھاد نہ دیا جائے تو وہ زمانہ قریب ہے جب کہ ان کی پیداوار بہت کم ہو جائے گی۔ دوسرے اس طریقہ سے پورا گاؤں صاف رہا کرے گا۔ اور دیہاتی ان تمام بیماریوں سے جو گندگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں محفوظ رہا کریں گے۔

اگرچہ لوگوں کے مکانات تنگ و تاریک اور بے ڈھنگے ہیں۔ جن میں تازہ ہوا اور روشنی کا گذر نہیں تاہم مکانات زیادہ تر ایک وضع کے نظر آتے ہیں۔ ۰۰ فی صدی کاشتکاروں کے پاس مویشیوں کے لئے الگ مکان ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مکانات ان کے مالکوں کے مکانات سے اس نسبت سے کہ یہ جانور ہیں اور وہ انسان، بدرجہا بہتر ہیں۔ عموماً شہروں اور قصبوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے محلوں اور ان کے گھروں میں بہ نسبت ان کے ہمسایوں کے زیادہ گندگی پائی جاتی ہے مگر اس گاؤں میں ان کے محلے اور گھر گاؤں بھر میں سب سے زیادہ صاف تھے۔

گاؤں میں دو مندر ہیں ایک شکستہ حالت میں ہے اور دوسرا درست ہے۔ ایک مسجد ہے جو آج کل خانگی جھگڑوں کی وجہ سے بند ہے۔ خانہ خدا کا ذاتی معاملات سے کیا واسطہ۔ گاؤں میں ایک عاشور خانہ ہے۔ یہاں تمام مواضعات میں اس قسم کے عاشور خانے موجود ہیں یہ گولکنڈہ راج کی یادگار ہیں۔ ریاست حیدرآباد کے اکثر مواضعات میں چاوڑی ہوتی ہے۔ آپ اس کو Village Hall کہہ سکتے ہیں۔ یہ جگہ پٹواری، پٹیل اور دوسرے دیہاتی عہدہ داروں کے دفتر کا کام دیتی ہے۔ جب گاؤں والوں کو کسی بات کے لئے جمع کرنا ہوتا ہے تو وہ بھی سب یہیں جمع ہوتے ہیں ڈھنڈورچی کا ڈھول بھی یہیں رہتا ہے۔ بعض دیہات میں یہ جگہ عمدہ اور خوشنما ہوتی ہے اور اس کے سامنے پختہ چبوترہ اور پختہ کنواں ہوتا ہے۔ بعض میں معمولی مکان اس ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ اس گاؤں میں بھی چاوڑی موجود ہے مگر آج کل بعض مصالح کی بنا پر سرکاری طور پر اس کو بند کر دیا گیا ہے۔

یہاں کی زمین کی رنگت لال ہے۔ مٹی نرم اور ریتلی ہے۔ یہاں سال میں چار فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ ان فصلوں میں جن چیزوں کی کاشت ہوتی ہے اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

خریف۔ مکا، رائی، ساما، باجرہ، تل، جوار۔

آبی۔ دھان۔

ربیع۔ رینڈی، کلتھی جو چارہ کی فصل ہے۔

تابی۔ دھان۔

اس کے علاوہ ایک اور فصل ہوتی ہے جس کو فصل باغات کہا جاتا ہے۔ یہ فصل ان چاروں فصلوں کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ اس میں ادرک، بیگن، پیاز، مرچ، ہلدی کی کاشت ہوتی ہے۔

گاؤں کی خاص فصل ربیع ہے جو خشکی کے زیادہ حصہ پر کاشت ہوتی ہے۔ رقبہ تری صرف دھان کے لئے مخصوص ہے۔

موضع کے متعلق اعداد و شمار جو ۱۳۴۵ف کے ہیں حسب ذیل ہیں:-

سالانہ مالگذاری	۳۸۵۹ روپیہ — ۷ آنہ — ۳ پائی (از فرد جمع بندی بابتہ ۱۳۴۵ف)
رقبہ کل نقشہ	۲۱۵ — ۰ — ۰ (" " ")
رقبہ موضع مانگ	۴۹۵۲ ایکڑ — ۲۷ گنٹے
رقبہ ناقابل کاشت	۲۹۰۴ — ۱۶ (اس میں جنگل، شکم تالاب، چراگاہیں اور گڑھے وغیرہ شامل ہیں)
رقبہ زیر کاشت	۲۰۴۸ — ۸
تری	۴۲۸ — ۲۴
خشکی	۱۶۱۹ — ۱۴
رقبہ انعامی زمینات	۶۷ — ۱۳
حاصل انعامی زمینات	۸۹۲ روپیہ — ۶ آنہ — ۸ پائی
تعداد کھیت	۶۲۱
تعداد پٹہ داران	۱۳۵
تعداد شکمی داران	۶۸

گاؤں کی اصلی مالگذاری ۶۰...۴ روپیہ ۱ آنہ ہے۔ مگر اس سال ایک تو کساد بازاری کی وجہ سے اور دوسرے گذشتہ سال بارش کی کمی کی وجہ سے اس قدر کمی ہوگئی۔ پٹہ دار وہ لوگ ہیں جن کے نام پر زمین کا پٹہ ہے۔ مالگذاری پٹہ داروں ہی سے وصول کی جاتی ہے۔ شکمی دار سے وہ لوگ مراد ہیں جو پٹہ داروں کے ساتھ مل کر کاشت کرتے ہیں۔ ان کو قول دار بھی کہا جاتا ہے۔ جن شرطوں پر "قول" دیا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) رقمی منافع۔ پٹہ دار قول دار سے کچھ رقمی منافع وصول کرتا ہے۔ جس کی مقدار مقرر نہیں ہے یہ پٹہ دار کے صواب دید پر منحصر ہے۔ اور عموماً ایک آنہ سے ایک روپیہ فی روپیہ تک وصول ہوتا ہے۔

(۲) غلہ بٹائی میں پٹہ دار قول دار سے کل پیداوار کا نصف، تہائی یا چوتھائی وصول کرتا ہے۔

(۳) رقمی بٹائی۔ قول دار جتنی زمین جوتتا ہے اس کی سرکاری مالگذاری ادا کرتا ہے اور پٹہ دار کو کچھ غلہ دیتا ہے۔

کھاد کاشت شروع کرنے سے پہلے زمینوں کو کھاد دیا جاتا ہے۔ گاؤں والے برسات کے زمانہ
میں گوبر کے اُپلے نہیں بناتے بلکہ اس کو گاؤں میں ادھر اُدھر اور کوڑے کرکٹ کے ساتھ جمع کرتے
رہتے ہیں۔ اس میں سے اچھی گھاس تو کمہار برتن، اینٹیں وغیرہ بنانے کے لئے نکال لیتا ہے اور
سب چیزیں سال بھر تک سڑتی رہتی ہیں۔ اور اس مرکب کو بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری
چیز بھیڑ اور بکریوں کی مینگنیاں ہیں۔ گاؤں میں ان دونوں کی تعداد کافی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ
کاشت کے شروع کرنے سے پہلے ان جانوروں کو ایک ایک کھیت میں دو دو رات کے لئے چھوڑ دیا
جاتا ہے۔ اس عمل کو "منڈے بھٹانا" کہتے ہیں جو نیا نیا پنڈے سے بٹھانے کی بگڑی ہوئی صورت ہے
ان ایام میں جانوروں کی مینگنیاں اور پیشاب وغیرہ کھیتوں ہی میں محفوظ رہتا ہے۔ بعد ازاں ہل
چلا کر اس کو مٹی میں ملا دیتے ہیں۔ تیسری چیز پتی کا کھاد ہے۔ یہ لوگ سیتا پھل اور کرنج وغیرہ کے
ہرے پتے جنگل سے کاٹ لاتے ہیں اور ان کو کھیت میں ڈال کر ملا دیتے ہیں۔ اس گاؤں میں
آموں کے درخت بکثرت ہیں۔ اور میں نے ان لوگوں کو آم کے سوکھے پتے بطور کھاد استعمال
کرنے کی رائے دی مگر انہوں نے کہا کہ سوکھے پتے کھاد کے لئے مفید نہیں۔ گاؤں کا تمام گوبر
سوائے برسات کے اُپلوں کی شکل میں جلتا ہے۔ گاؤں والوں کو اس کا احساس ہے کہ اس طرح
کھاد کا نقصان ہوتا ہے مگر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ جنگل قریب ہے مگر وہاں سے جلانے کی
لکڑی مفت نہیں ملتی بلکہ خریدنا پڑتی ہے اور اُپلے مفت ہاتھ آتے ہیں اسی وجہ سے اُپلوں کو ترجیح
دی جاتی ہے۔ دوسرے ان کی آگ دھیمی ہوتی ہے اور دودھ گرم کرنے کے لئے بہت عمدہ ہے
گاؤں والے اپنے مکان کی دیواروں، چبوتروں، صحن اور دروازے کے سامنے کی گلی میں
گوبر سے لیپنے کے عادی ہیں۔ اور اس سے بھی کھاد کا نقصان ہوتا ہے۔ مگر میرے اس خیال سے
گاؤں والوں نے اتفاق نہیں کیا کیونکہ ان کی رائے میں روزانہ جھاڑو دی جاتی ہے اور اس
طرح ہر روز جھاڑو کے ساتھ گوبر کے کچھ نہ کچھ ذرے اور ریزے کوڑے میں پہونچتے جاتے ہیں
اور چونکہ یہ کوڑا بطور کھاد استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے لیپائی سے کھاد کا نقصان نہیں ہوتا
ایک حد تک ان کی دلیل معقول ہے۔ بعض لوگ اُپلے کی راکھ اور دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر
بطور کھاد استعمال کرتے ہیں۔ جن کے پاس ذاتی کھاد نہیں ہوتا وہ دوسروں سے خریدتے
ہیں اور کھاد ۴ روپے ۶ روپے فی بنڈی تک فروخت ہوتا ہے۔ اس گاؤں میں جو کھاد کا استعمال تھوڑا
بہت نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں دھان کی فصل بوئی جاتی ہے اور دھان کی زمینوں کے لئے

کھاد ناگزیر شے ہے۔ دوسری زمینوں میں سوائے فصل باغات کے کھاد نہیں دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں استطاعت نہیں۔ دوسرے گاؤں میں اتنی رسد بھی موجود نہیں جو تمام زمینوں کی طلب پوری کر سکے۔

گاؤں کے کھاد کے مسئلہ کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ کاشتکار ایک سال جنگل سے لکڑی خریدیں اور گوبر کو جمع کرتے رہیں۔ اور اس کا کھاد بنا کر استعمال کریں۔ یہ ضرور ہے کہ پہلے سال ان کو مزید اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے مگر دوسرے سال ان کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور منافع بہ نسبت سابق کے بڑھ جائے گا اور اس سے لکڑی کی قیمت کی تلافی ہو جائے گی۔ کھاد نہ صرف دھان کی زمینوں کو دینا چاہئے بلکہ ہر زمین کو کھاد دینا اس کی پیداوار بڑھانا ہے۔

اس گاؤں میں ۱۲۱۶ کھیت ہیں۔ چھوٹے بڑے، گول، تکونے، چوکور، سب ہی قسم کے کھیت ہیں۔ اگر کسی بچہ کو اقلیدس کی مختلف شکلیں سکھلانا ہوں تو اس کو کسی ہندوستانی گاؤں میں لا کر کھڑا کر دو وہاں وہ سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔ گاؤں میں پٹہ داروں کی حالت حسب ذیل ہے۔

مقدار زمین	تعداد پٹہ داران
ایک ایکڑ سے کم	۱۵
ایک ایکڑ سے ۵ ایکڑ تک	۳۸
۵ " ۱۰ "	۲۴
۱۰ ایکڑ سے اوپر	۵۸

سب سے بڑے پٹہ دار کے پاس ۱۳۹ ایکڑ ۳۵ گنٹھ زمین ہے اور سب سے چھوٹا پٹہ دار ۱۴ گنٹھ کا مالک ہے۔ (ایک ایکڑ = ۴۰ گنٹھ) ایک شخص کے پاس ۲۰۶ ایکڑ ۱۲ گنٹھ زمین ہے مگر اس میں ۸ حصہ دار ہیں اور اس کی زمین ۱۱۳ مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی۔

زمین بہت انتشار کی حالت میں ہے اگر ایک مالک کا کھیت ایک طرف مشرق میں ہے تو دوسری جانب مغرب میں۔ اس کے علاوہ زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بھی منقسم ہے۔ اس تقسیم وانتشار کا بنیادی سبب وراثت کا طریقہ نہیں ہے کیونکہ قانون مالگذاری کی رو سے وارث پٹہ اولاد اکبر سمجھی جاتی ہے اور باقی وارث شکمی دار رہتے ہیں۔ اگر شکمی دار چاہیں تو علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اکثر اوقات یہ اپنی زمین کا پٹہ الگ لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں

بٹ گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زمین کی قلت ہے مگر اُس کی طلب زیادہ ہے اور چونکہ زمین مشکل سے خالی ہوتی ہے۔ اس لیئے جوں ہی کوئی زمین خالی ہوئی بہت سے کاشتکار اُس کو لینے کو دوڑتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ زمین اُس کے سابقہ کھیتوں کے پاس ہے یا دور۔

ایک کنوئیں کے رقبہ سیرابی کے لیئے کم از کم ۲ ایکڑ زمین ہونا چاہیئے۔ جن لوگوں کے پاس زمین اس سے کم ہے وہ کنواں نہیں کھود سکتے بلکہ یا تو تالاب سے پانی لیتے ہیں۔ اور اگر ان کی زمین پر تالاب سے پانی نہیں آسکتا تو خشکی میں کاشت کرتے ہیں۔

کاشتکار اس تقسیم و انتشار کو نقصان دہ ضرور بتلاتے ہیں۔ انتشار اراضی کا مسئلہ یہاں زمینوں کو ملاکر ان کو دوبارہ تقسیم کرنے سے طے نہیں ہو سکتا کیونکہ زمینیں مختلف قسم کی ہیں اندیشہ یہ ہے کہ اس طریقہ سے بعض لوگوں کے حصے میں بہت اچھی زمین آجائے گی اور بعض کو تمام خراب اور ناقص زمین ملے گی۔ چنانچہ گاؤں کے ان افراد نے اس تجویز کو بلاچون و چرا تسلیم کرنے کا وعدہ کیا جن کی فرد زمین اچھی اور آس پاس بھی اچھی زمینیں ہیں۔ بہرحال اس مسئلہ کو طے کرنے میں مختلف قسم کی عملی مشکلات کا سامنا کرنا ہے۔

زمین کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹنے سے روکنے کے لئے یہ طریقہ ہو سکتا ہے کہ حکومت ایک قانون بنادے کہ کسی شخص کو ایک معینہ مقدار سے کم زمین کا پٹہ نہ دیا جائے گا۔ چنانچہ ریاست بھوپال میں حال ہی میں ایک قانون نافذ ہوا ہے جس کی رو سے کسی شخص کو ۵ ایکڑ سے کم اراضی کا پٹہ نہیں دیا جا سکتا۔ قانون وراثت میں بھی اس قسم کی ترمیم کی ضرورت ہے کہ جب یہ نوبت آجائے کہ اراضی وارثوں میں تقسیم ہو اور ایک وارث کو ۵ ایکڑ سے کم زمین ملتی ہو تو اراضی کی تقسیم نہ کی جائے گی۔ زمین کی مقدار کو اس طرح محدود کر دینے سے مستقل ترقیات اراضی کی گنجائش بہ آسانی نکل سکتی ہے۔

فصلوں کی گردش | گاؤں میں فصلوں کی گردش کا رواج ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ تمام کاشتکار ایک زمین پر ہمیشہ وہی فصلیں اُگائیں جو ہمیشہ سے اُگاتے چلے آتے ہیں۔ مکا کے کھیت میں ارنڈی، دھان کے کھیتوں میں پانی نہ آنے کی صورت میں چنا بویا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس غرض کے لئے کہ زمین میں دوبارہ قوت نمو پیدا ہو اس کو افتادہ ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کیونکہ افتادہ زمین پر بھی لگان حسب سابق وصول کیا جاتا ہے اب کاشتکار میں اتنی سکت کہاں کہ وہ زمین کو افتادہ ڈال کر بھی اس کا لگان ادا کرے۔ اس لئے وہ کوشش یہی کرتا

ہے کہ جہاں تک ہو زمین سے تھوڑی بہت آمدنی حاصل کرے۔

آبپاشی آب رسانی کا کام دو ذریعوں سے لیا جاتا ہے۔ ایک تالاب اور دوسرے باولیاں۔ فصل کے لئے باولی کا پانی مفید سمجھا جاتا ہے مگر تالاب سے پانی لینا بہ نسبت باولی کے آسان ہے۔ کیونکہ باولی سے پانی کھینچنا پڑتا ہے اور تالاب سے زمین خود بخود سیراب ہوتی رہتی ہے البتہ بعض کھیتوں میں تالاب کے پانی کو حاصل کرنے کے لئے بھی محنت کرنا پڑتی ہے۔ ایک عمدہ باولی سے ایک دن میں ۱½ ایکڑ رقبہ سیراب ہو سکتا ہے بشرطیکہ ۴ بیل ہوں تاکہ ہر تین گھنٹہ کے بعد ان کی جوڑ بدلی جا سکے۔ ایک موٹھ پر دو آدمی نوکر ہوتے ہیں ان کو ۶ ماہ تک کام کرنا پڑتا ہے۔ اور فصل پر ۱۰ من غلہ فی کس دیا جاتا ہے۔

گاؤں میں ۱۴ چھوٹے بڑے قابل کار تالاب ہیں۔ یہ سب گرمیوں میں خشک ہو جاتے ہیں اگر بارش (ہنگام) اچھی نہ ہو تو فصل کے زمانہ میں بھی پانی کافی مقدار میں نہیں آتا۔ اور پورا رقبہ سیراب نہیں ہوتا۔ وہ زمینات جو تحت تالاب ہیں اگر ان میں پانی نہ پہونچے تو سرکاری رقم میں کمی ہو جاتی ہے۔ مگر زمینات زیر باولی میں ایسا نہیں ہوتا۔ گاؤں میں ۳۰ پختہ باولیاں ہیں۔ پختہ باولیوں سے یہ مراد نہیں کہ وہ اینٹ اور چونے کی بنی ہیں بلکہ ایک چھوٹی سی دیوار پختہ ہوتی ہے جس پر موٹھ چلتا ہے۔ یہ باولیاں اگرچہ دیہاتیوں کے آباؤ اجداد نے ہی بنوائی تھیں مگر اب سرکار کے قبضہ میں ہیں اور ان سے پانی لینے والوں کو محصول دینا پڑتا ہے گاؤں میں ۲۰ کچی باولیاں ہیں۔ یہ کاشتکار خود کھود لیتے ہیں۔ کچی باولی میں ۲، ۱½ ہزار اور کبھی باولی میں ڈیڑھ دو سو روپیہ صرف ہوتا ہے۔ کچی باولی کی ہر سال مرمت ضروری ہے۔ اور ۵، ۶ سال کے بعد بیکار ہو جاتی ہے۔

یہاں آبی اور تابی فصلوں میں آبپاشی ہوتی ہے۔ آبی میں تالاب تمام وہ لوگ جن کی زمینات تری میں ہیں پانی لے سکتے ہیں مگر تابی میں مقدار آب کے لحاظ سے رقبہ سیرابی کا تعین ہوتا ہے۔ گاؤں میں رقبہ زیر آب بہت کم ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس کو بڑھایا جائے حکومت کی جانب سے ہر سال اگر ایک باولی بھی تیار ہو جایا کرے تو تھوڑے عرصہ میں گاؤں میں باولیوں کی تعداد کافی ہو سکتی ہے۔

ڈرینج وغیرہ گاؤں میں ایسی تو کوئی شکایت نہیں کہ بارش کے زمانہ میں پانی مسلسل کئی روز تک کھیتوں میں بھرا رہے۔ اور نہ ہی کوئی ایسی نشیبی زمین ہے جو پانی کے بہاؤ سے کٹ کر خراب ہو رہی ہو چند ایسے کھیت ضرور ہیں جہاں ۲۰۰ روز کے لئے پانی بھر جاتا ہے مگر اس سے فصلوں کو نقصان نہیں پہنچتا۔ البتہ پختہ سڑک کے کنارے جو کھیت ہیں ان میں سے سڑک کی درستی کے لئے ہر سال

مٹی کھود دی جاتی ہے۔ اس طرح کھیتوں میں گڑھے ہو جاتے ہیں اور آراضی ناقابل کاشت ہو جاتی ہے اور سر رشتہ انجینیری کی جانب سے مالکان اراضی کو کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا جاتا۔ یہ چیز کاشتکاروں کے حق میں سراسر غیر مفید ہے۔

آلات زراعت گاؤں والے تمام آلات و اوزار پرانے قسم کے استعمال کرتے ہیں، ہل، بکھر، اور دوسرے چوبی آلات ببول کی لکڑی سے تیار کئے جاتے ہیں جو قریب کے جنگل سے حاصل کر لی جاتی ہے گاؤں کا بڑھئی چوبی آلات اور لوہار آہنی اوزار تیار کرتا ہے۔ ان لوگوں کو نقد اجرت نہیں دی جاتی بلکہ فصل پر غلہ دیا جاتا ہے۔ جدید قسم کے آلات یہاں کے لوگ استعمال کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ ان کی قیمت کم ہو، وہ مفید ہوں اور ان کے استعمال سے واقف کرا دیا جائے، نیز ان کی مشینری پیچیدہ نہ ہو ورنہ اس کی درستی ان کے بس کی بات نہ رہے گی۔ اس کے علاوہ چند گاؤں کے درمیان ایک مرکزی ورکشاپ بھی قائم ہونا ضروری ہے تاکہ وہاں جدید آلات کی مرمت کرائی جا سکے۔ محکمہ زراعت کی جانب سے جو میلے، مظاہرے اور نمائش وغیرہ ہوتی ہیں اُن سے یہاں کے لوگ قطعاً ناواقف ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں ایک تو محکمہ کی جانب سے ان کو کوئی ترغیب نہیں دی گئی دوسرے ان میں خود شوق نہیں کہ ان میں شریک ہوں۔

تخم ہر کاشتکار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ خواہ اس کو کھانے کے لئے غلہ نہ بچے مگر تخم کے لئے غلہ بچ جائے۔ کیونکہ ذاتی تخم اچھا اور صاف ہوتا ہے۔ ساہوکار کا حاصل کردہ تخم پرانا اور آمیزش والا ہوتا ہے۔ تخم کے لئے جو غلہ رکھا جاتا ہے اس کو مٹی کے بڑے بڑے گھڑوں میں رکھا جاتا ہے۔ کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لئے نیم کے خشک پتے اور راکھ ڈال دی جاتی ہے۔ ہر مہینہ اس کو دھوپ دینا بھی ضروری ہے۔ اس طریقے سے دھان ۲ سال تک محفوظ رہتا ہے اور دوسرے غلے ۵ سال تک اچھے رہ سکتے ہیں۔ محکمہ زراعت کی جانب سے اچھے بیجوں کی تقسیم کا کوئی انتظام نہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے بیج گردش کرتے رہتے ہیں اور جس سے بتدریج فصلیں خراب ہوتی جاتی ہیں۔

فصلوں کا تحفظ گاؤں کے پاس جنگل ہے مگر جنگلی درندے اس طرف کم ہیں اس وجہ سے ان سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا البتہ گیدڑ، سور اور چوہے فصلوں کو کافی نقصان پہونچاتے ہیں۔ کوئی کاشتکار اندازاً بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کو ان جانوروں سے کس قدر نقصان پہونچتا ہے۔ کھیتوں کے چاروں طرف کانٹوں کی باڑ لگائی جاتی ہے۔ سور اور گیدڑ بھگانے کو آدمی بھی رکھے جاتے

ہیں مگر چوہوں سے رہائی پانے کی کوئی تدبیر ان کے پاس موجود نہیں۔ چوہوں کو موسم سرما میں مارا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ان سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

ایک بارش ہونے کے بعد زمینوں کو صاف کیا جاتا ہے اور مٹی کے ڈلوں کو توڑا جاتا ہے۔ پھر ہل چلا کر تخم پاشی کی جاتی ہے۔ دھان کے بیج دو طریقے سے بوئے جاتے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بیج پہلے باڑیوں کے پاس لگا دیے جاتے ہیں اور جب پودے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کو کھیتوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے ابتدا ہی میں بیج کھیتوں میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ اور دوسرے تمام غلے بکھیر کر بوئے جاتے ہیں۔ بیج نالیوں میں ہاتھ سے ڈالے جاتے ہیں اس وجہ سے بعض مقامات پہ زیادہ اور بعض پر کم ہو جاتے ہیں۔ دھان کے کھیتوں میں چونکہ ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے اس وجہ سے خود رد گھاس نکل آتی ہے اور اس کو اکھاڑنے کی ضرورت ہے ورنہ فصل پر برا اثر پڑتا ہے چنانچہ دھان کی فصل میں ۳، ۴ مرتبہ کلچائی کرنا پڑتی ہے۔ تل اور رائی کی فصلوں میں بھی ایک مرتبہ کلچائی ضروری ہے۔ جو مزدور کلچائی کرتے ہیں ان کو اگر صبح سے شام تک کام کریں تو ۲ روپیہ اور اگر دوپہر سے شام تک کام کریں تو ا روپیہ یا اس سے کم اجرت ملتی ہے۔ بعض اوقات فصلوں میں کیڑا لگ جاتا ہے۔ جس کا کچھ علاج دیہاتی اپنے طور پر جانتے ہیں بعض مرتبہ ان کا یہ طریقہ کامیاب ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ درد فصل اسی پرانے طریقے پہ ہوتی ہے جس کا ہندوستان میں بہت قدیم زمانہ سے رواج ہے۔ یعنی چند مرد اور عورت ہنسیے سے کر چند پودوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کرتے رہتے ہیں اس کے بعد بیلوں کے پاؤں سے روند کر غلہ صاف کیا جاتا ہے اور پھر "اڑانی" کر کے غلہ کو بھوسہ سے الگ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی طریقہ یہاں بھی رائج ہے۔ اس میں غلہ کا کافی نقصان ہوتا ہے چونکہ مویشیوں کا منہ نہیں باندھا جاتا اس لئے وہ متواتر غلہ کھاتے رہتے ہیں۔ پھر اسی میں پیشاب اور گوبر کرتے ہیں جس سے غلہ خراب ہوتا ہے۔ پھر مٹی کافی مقدار میں مل جاتی ہے ضرورت ہے کہ غلہ کو صاف کرنے والی گرنیاں گاؤں میں قائم کی جائیں تاکہ کاشتکار ان میں اپنا غلہ صاف کرا لیا کریں۔

بازار۔ گاؤں میں ۹ دکانیں ہیں جن میں خوردنی اشیا اور دوسری ضروری چیزیں فروخت ہوتی ہیں ان میں سے اکثر دکاندار مہاجن لین دین کرتے ہیں۔ یہاں سے ½ ا کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے جہاں ہفتہ واری بازار بھرتا ہے اور گاؤں والے اپنی ضروریات کی چیزیں یہاں سے جا کر خرید لیتے ہیں۔ اسی گاؤں میں چاول صاف کرنے کی ایک گرنی ہے مگر کاشتکار اپنی قدامت پسندی

سستی اور کم استطاعتی کی وجہ سے وہاں تک غلہ لے جانا گوارا نہیں کرتا۔ گاؤں اگرچہ پختہ سڑک پر واقع ہے مگر اس سے گاؤں والوں کو زیادہ فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ عموماً ان کا غلہ گاؤں کا مہاجن ہی خرید لیتا ہے۔ البتہ بعض ترکاریاں یا اور معمولی چیزیں وہ شہر میں لاکر فروخت کر دیتے ہیں۔ مالگذاری کیا مالگذاری زیادہ ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں اس نے صرف کسی گاؤں، ریاست یا صوبے میں ہی اہمیت نہیں حاصل کی ہے بلکہ پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ دقت طلب مسئلہ یہی ہے۔ نہ صرف قومی نمائندے بلکہ حکومت کے ذمہ دار افراد بھی اس مسئلہ کا صحیح حل تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

اس گاؤں میں مالگذاری کی شرح حسب ذیل ہے :-

زیر تالاب	زیر باولی	خشکی
ایک روپیہ تا ڈیڑھ روپیہ فی ایکڑ	۱۲ تا ۱۵ روپیہ فی ایکڑ	۱۵ تا ۲۰ روپیہ فی ایکڑ

خشکی کے متعلق شرح کو زیادہ نہیں کہا جا سکتا مگر زیر تالاب و زیر باولی شرح زیادہ ہے یا نہیں اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ لیکن میں نے ۱۲ مختلف آدمیوں کے بیانات حاصل کرکے ایک ایکڑ زمین پر جن اخراجات کو شامل کیا ہے ان میں دیکھ لیجئے مالگذاری کہاں آتی ہے اور کاشتکار کو کیا منافع ہوتا ہے۔

زمین ایک ایکڑ

	پائی	آنہ	روپیہ
۱۔ کھاد۔ ۲۰ بنڈی ۴ رنی بنڈی کے حساب سے			۵
۲۔ ناگرکشی۔ دو بیل اور ایک آدمی روپیہ روز کے حساب سے ۴ روز کے لئے کرایہ پر لیتا ہے۔	۰	۰	۴
۳۔ تخم۔ ۱/۲ ۱ من دھان	۰	۰	۲
۴۔ کلجائی۔ فصل میں تین مرتبہ کلجائی ہوتی ہے۔ پہلی اور دوسری میں ۲۰ آدمی ۲ روز، اور تیسری میں ۱۰ آدمی ایک روز تک کام کرتے ہیں ان کو ۸ پیسے یومیہ اجرت دی جاتی ہے	۸	۲	۴
۵۔ دردفصل۔ ۱۰ آدمی ۲ یوم فصل کاٹتے ہیں۔ ۱/۲ ۲ سیر دھان فی نفر یومیہ	۰	۰	۲
۶۔ دیگر اخراجات۔ صفائی دھان وغیرہ	۰	۰	۲
۷۔ مالگذاری	۰	۰	۱۵
کل اخراجات	۸	۲	۳۴

واضح رہے کہ یہ تمام اعداد کم سے کم لئے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی فرض کیا گیا کہ نہ تو وہ کسی مہاجن کا قرضدار ہے جس کا سود ادا کرنا پڑتا ہے اور نہ اس کے پاس زراعتی مویشی ہیں۔ اب دیکھ لیجئے ان تمام اخراجات میں مالگذاری کی رقم کتنے فی صد ہے۔

یہ صورت اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جبکہ ہم اس کے منافع پر نظر ڈالتے ہیں اگر بارش اچھی ہو اور فصل سولہ آنہ ہو (جو بہت کم ہوتی ہے عموماً فصل ۱۲ ہوتی ہے) تب ایک ایکڑ زمین سے ایک کھنڈی دھان حاصل ہوتا ہے۔ (ایک کھنڈی = ۲۰ من) ۲۰ من دھان سے قریب ۱۲ من چاول حاصل ہوتے ہیں جن کی قیمت ۶۰ روپیہ ہوتی ہے۔ گویا اس طرح کاشتکار کو ایک ایکڑ پر ۱۲ ... کی بچت ہوتی ہے۔ یہ منافع خام ہے اس میں اس کی محنت، تنظیم وغیرہ شامل ہے۔ یہ گویا ۶ ماہ کی اجرت ہے۔

اوسطاً ایک کاشتکار کے گھر میں ۴ افراد ہوتے ہیں اگر ان کے کھانے کے لئے ½ سیر چاول فی نفر ہی درکار ہوں تب بھی ۶ ماہ کے لئے اس کو ۲۴ روپیہ کے چاولوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ نمک، مرچ، مصالحہ الگ ہے۔ اس کو اور اس کے گھر والوں کو کچھ کپڑوں کی بھی ضرورت ہے کیسرا اور چند ضرورتیں بھی اس کے ساتھ لگی ہیں۔ اس طرح اگر اس کو ۶ ماہ کے لئے کم از کم ۶۰ روپیہ بھی درکار ہوں تو بھی اس کو ۳۸ روپیہ کے قریب مہاجن سے قرض لینا پڑتے ہیں۔ اور آئندہ سے اس رقم کا سود بھی اس کی آمدنی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس میں کفایت کرتا ہے اور یہ کفایت کھانے کی کمی، چٹائی اور دردمیں گھر والوں کی امداد وغیرہ کے ذریعہ پوری کی جاتی ہے اس تفصیل سے اس بات کا بھی بخوبی پتہ چل جاتا ہے کہ آیا ہمارے یہاں زراعت کوئی نفع بخش پیشہ ہے یا نہیں اور کاشتکار جن حالات کے تحت زندگی گذارتا ہے اس میں اس کی سستی، کاہلی قدامت پسندی کو دخل ہے یا افلاس کو۔

مہاجنی کاروبار اور قرضہ | گاؤں میں کوئی بڑا مہاجن نہیں ہے۔ البتہ دس چھوٹے بڑے مہاجن ہیں جو روپیہ کا لین دین کرتے ہیں۔ ۵ بڑے مہاجن ہیں جن کا اوسطاً ۴ ہزار روپیہ فی مہاجن قرض میں ہے۔ اور ۵ چھوٹے مہاجنوں کا ایک ہزار فی مہاجن کے حساب سے کاروبار میں لگا ہے۔ اس طرح کل گاؤں کے قرضہ کی مقدار ۲۰ ہزار ہوتی ہے جو اس کی سابقہ مقررہ مالگذاری کا ۲½ گنا ہے۔ مگر یہ وہی رقم ہے جس کا لین دین مہاجنوں کے ذریعے سے ہوتا ہے خانگی طور پر بھی ذی حیثیت لوگ قرض دیتے ہیں آج کل حسب فرمان خسروی کاشتکاروں کے قرضہ کی تحقیق ہو رہی ہے۔ صیغۂ مالگذاری سے مختلف

سوالات مرتب کرکے ان کی دو فہرستیں تیار کی گئی ہیں۔ ایک کی تکمیل پٹواری کرے گا اور دوسری کی تکمیل تحصیلدار کے سپرد ہے۔ ہر تعلقہ کے تین مختلف قسم کے مواضع اسی غرض کے لئے چنے گئے ہیں تحقیق کی تکمیل ہونے پر کل حیدرآباد کے زرعی قرضہ کی تعداد کا کچھ اندازہ ہو سکے گا اور اس بار کو ہلکا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ اس گاؤں کے کل قرضہ کی ⅔ مقدار غیر پیداوار کاموں کے لئے لی گئی ہے۔

گاؤں میں مہاجن کو اجارہ حاصل ہو گیا ہے کیونکہ قرض حاصل کرنے کا یہاں کوئی اور ادارہ نہیں سرکاری تقاوی سے یہاں کے لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ انجمن یہاں موجود نہیں۔ حالانکہ اس کی ضرورت کو خود گاؤں والوں نے محسوس کر لیا ہے چنانچہ انھوں نے انجمن کے قیام کے لئے درخواست بھی دیدی ہے۔ اس لئے قرضہ صرف مہاجن سے ملتا ہے اور وہ قرض گیرندہ کی ساکھ اور اعتبار کو دیکھتے ہوئے ایک روپیہ سے ۲ فی صد ماہانہ تک سود وصول کرتا ہے۔ شرح سود کا یہ فرق ان لوگوں کے لئے اور زیادہ مضر ہے جن کی مالی حالت بھی اچھی نہیں اور شرح سود بھی زیادہ ادا کرنا پڑتی ہے۔

قرض لینے کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) بیل خریدنا (۲) سرکاری مالگذاری ادا کرنا

(۳) کلچائی کے اخراجات (۴) رسومات۔ شادی بیاہ اور غمی و موت

اس طریقہ کی حسب ذیل خرابیاں ہیں۔

(۱) سود در سود وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح بعض اوقات مجموعی قم اصل رقم سے دوگنی تگنی ہو جاتی ہے

(۲) موروثی قرضوں کا سلسلہ۔

(۳) آسامیوں کی فصلیں خریدنا اور اُن کے پاس کچھ نہ چھوڑنا۔

(۴) غلہ ان ہی لوگوں کے ہاتھ گراں قیمت پر فروخت کرنا جن سے کہ ارزاں قیمت پر خریدا تھا۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی کاشتکار مہاجن سے روپیہ لینے جاتا ہے تو وہ اس سے یہ شرط طے کر لیتا ہے کہ فصل پر تمام غلہ اسی مہاجن کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا۔ چنانچہ جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو کاشتکار سے تمام غلہ خرید لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فصل کے موقع پر غلہ کا بھاؤ گر جاتا ہے۔ چنانچہ دھان کا بھاؤ دروفصل پر ۲، ۳ روپیہ فی کھنڈی سے ۲ ½ ۲ ماہ بعد ۵، ۶ روپیہ تک پہونچ جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاشتکار کیوں کچھ دن ٹھہر نہیں جاتا تاکہ زیادہ نفع کما سکے۔ اس کے دو سبب ہیں ایک تو اس کو مہاجن کو غلہ دینا ہے۔ دوسرے سرکاری مالگذاری ادا کرنا ہے یہ دونوں مصیبتیں ناگزیر ہیں۔

جن لوگوں پر قرضہ زیادہ ہوتا ہے ان کو مہاجن کھانے، اور تخم کے لئے بھی غلہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتا چنانچہ یہ غریب تخم کے لئے چوری سے غلہ رکھتے ہیں۔ مہاجن نہ صرف بڑی فصلیں خریدتا ہے بلکہ چھوٹی فصلیں مثلاً لہسن، ادرک، پیاز، رائی بھی خرید لیتا ہے۔ کاشتکار کو کھانے کے لئے غلہ مہاجن سے خریدنا پڑتا ہے۔ اور اب وہ گراں بھاؤ سے فروخت کرتا ہے۔ کیا یہ کاشتکار کی بدقسمتی نہیں ہے کہ وہ اپنا غلہ تو ارزاں نرخ پر فروخت کرے اور آپ گراں نرخ غلہ خریدے۔ اس طرح اس کو دوہرا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

مہاجن ۸ر سے ۲۰۰ روپیہ تک یکمشت قرض دیتا ہے۔ اس کا قرضہ پیداوار اور غیر پیداوار دونوں کاموں کے لئے لیا جا سکتا ہے۔ وہ قرض اس نقطہ نظر سے نہیں دیتا کہ اس کا مصرف کیا ہوگا بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ قرض لینے والا کتنی زمین کا مالک ہے۔ قرضہ کی رقم کھاتہ پر درج کرکے آسامی کو ایک پرچہ دے دیا جاتا ہے۔ پھر سالانہ یا ششماہی حساب کا پرچہ دیا جاتا ہے جس پر پورا حساب درج ہوتا ہے۔ قرضدار اصل اقساط سے ادا کرتا ہے۔ کیونکہ یہاں کے مہاجن زیادہ متمول نہیں ہیں اس لئے وہ اپنے قرضداروں پر مقدمات بہت کم دائر کرتے ہیں۔ کیونکہ مقدمہ دائر کرنے میں بھی کچھ اخراجات ہوتے ہیں۔ دوسرے چونکہ گاؤں میں قرض دینے والے یہی مہاجن ہیں اس وجہ سے ان کو ناراض کرنا کاشتکاروں کے بس کی بات نہیں کیونکہ پھر اس کو کہیں سے روپیہ نہ ملے گا اور اگر اس کو روپیہ نہ ملے تو کاشت کرنا ناممکن ہے اس وجہ سے وہ بھی حتے الامکان اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر مہاجن کو خوش رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ گاؤں میں چند آدمی روپیہ کی تجارت بھی کرتے ہیں۔ یعنے وہ خود بلارم اور سکندرآباد کے بڑے مہاجنوں سے ۱۴ر فی صد ماہانہ کے حساب سے قرض لیتے ہیں۔ اور یہ رقم دوسروں کو ۲ر کی شرح سے قرض دیتے ہیں گویا درمیانی حیثیت سے ۱ر فی سیکڑہ ماہانہ خود وصول کرتے ہیں۔

گاؤں کا اصل | گاؤں کے اصل میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں اور ان کی تعداد بھی حسب ذیل ہے۔

مویشی

بیل	۵۵۸	گائے	۷۴۵	بھینس	۳۱۳	بھیلے	۷۷۱
بکریاں	۱۱۴۷	بھیڑ	۵۲۱	گھوڑے	۳	گدھے	۱۶

کل مویشی ۳۴۷۰

بنڈیاں	۶۵	ہل	۲۴۵	بکھر	۲۳۵	چرس	۵۱

یہاں کے مویشی میانہ قد اور معمولی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور دودھ بہت کم دیتے ہیں چنانچہ ایک بھینس ۲½، ۳ سیر دودھ یومیہ دیتی ہے۔ یہاں کی گاؤں سے دودھ حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ ان سے بیل پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ جو گائیں دودھ بھی دیتی ہیں اُن کی مقدار روزانہ ۲، ۳ پونڈ سے

زیادہ نہیں ہوتی۔ دیکھ ریکھاؤ کی خرابی، چارہ کی کمی اور ناواقفیت اس کے اسباب قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ یہاں سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر سکندرآباد ڈیری فارم کا وہ مزرعہ ہے جہاں ایک گلئے سے ۴۲ پونڈ دودھ بھی روزانہ حاصل کیا جاتا ہے۔ مویشی اطراف واکناف کے علاقوں سے خریدے جاتے ہیں۔ غرض مند یہاں آکر بھی مویشی خرید لیتے ہیں۔ غرضیکہ مویشیوں کا کوئی بازار نہیں ہے۔ اور نہ کسی مقام پر اچھے قسم کے مویشی پیدا کرنے کا انتظام ہے۔ حالانکہ اگر اچھے مویشی پیدا کرکے فروخت کئے جائیں اور ان کی قیمت بہت گراں نہ ہو تو ان کا اچھا خاصہ بازار پیدا کیا جاسکتا ہے۔ مویشیوں کی بیماری کا کوئی معقول انتظام نہیں۔ ڈاکٹر حیوانات سال میں ایک مرتبہ یہاں آتا ہے اور اس زمانہ میں اگر کوئی مویشی بیمار رہو تو اس کا علاج کردیتا ہے یا وباؤں کے زمانہ میں مویشیوں کے ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ چند گاؤں کے درمیان کسی مرکزی مقام پر ایک چھوٹا سا شفاخانہ بیطاری کھول دیا جائے تاکہ کاشتکار اپنے مویشی وہاں تک لاسکیں۔ سال کا ایک دورہ یا وباؤں کے زمانہ کا دورہ مفید نہیں کیونکہ اس سے قبل کہ ڈاکٹر گاؤں میں پہونچے بہت سے مویشی ختم ہوجاتے ہیں۔

مویشیوں کے لئے چارہ کی فصلیں اُگانے کا اس گاؤں میں دستور نہیں۔ کاشتکاروں کا افلاس انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی زمینات میں سے تھوڑا بہت حصہ چارہ کی فصلوں کے لئے وقف کردیں۔ مکا کی کڑوی، رائی اور سلمے کا گھاس، دھان کا گھاس، گیہوں اور دھان کا بھوسہ ان کو کھلایا جاتا ہے۔ گھاس تو محفوظ نہیں رکھی جاسکتی البتہ اور دوسری چیزیں بغیر کسی اہتمام کے محفوظ کی جاتی ہیں اور ان کا زیادہ حصہ خراب ہوکر بیکار بھی ہوجاتا ہے۔ گاؤں میں تل بھی پیدا ہوتے ہیں اور تیلی بھی ہے جو تیل نکالتا ہے مگر اس کے باوجود کھلی کی زیادہ مقدار باہر چلی جاتی ہے اور وہ شہروں میں جاکر فروخت ہوتی ہے اور یہاں کے مویشیوں کو نہیں ملتی۔ محصور اور غیر محصور جنگلات میں چرائی وصول کی جاتی ہے مگر محصور علاقوں میں اس کی مقدار زیادہ اور غیر محصور میں کم ہے۔ کاشتکار مویشیوں کے چارہ کے لئے حد بندی کے سلسلہ میں بھی کوئی چوڑی جگہ نہیں چھوڑتے۔ تاکہ وہاں کچھ گھاس اُگ آئے اور کام کے بعد دوپہر کو مویشی وہاں چر سکیں۔ حالانکہ ممالک متحدہ، پنجاب اور ممالک متوسط کے اکثر اضلاع میں اکثر کئی کئی فٹ کی جگہ اس غرض سے چھوڑی جاتی ہے۔

کم استطاعت کا شتکار اپنے مویشیوں کو اپنے رہائشی گھر میں ہی باندھتے ہیں مگر معمولی استطاعت والے کاشتکاروں کے پاس مویشیوں کے الگ مکانات ہوتے ہیں۔ ان میں پتلے پتلے دالان اور صحن ہوتے ہیں تاکہ گرمی و سردی اور برسات تینوں موسموں میں مویشی آرام سے رہ سکیں۔ مویشیوں کی

چوری اس اطراف میں تقریباً معدوم ہے۔ اور نہ گاؤں میں جانور ذبح ہوتے ہیں۔ جب جانور مر جاتا ہے تو اُسے دھیڑوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے وہ اس کا گوشت کھا لیتے ہیں اور چمڑا پکا کر کسی باہر کے گاؤں میں جا کر فروخت کر دیتے ہیں۔ جو قیمت ملتی ہے اس میں سے آدھی مالک کو دینا پڑتی ہے اور آدھی یہ لوگ رکھ لیتے ہیں۔ گاؤں کی تمام ہڈیاں سال بھر تک جمع ہوتی رہتی ہیں اور سال میں ایک مرتبہ ہڈیاں جمع کرنے والا آتا ہے تو اس کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی ہیں۔ گاؤں میں دودھ کا استعمال بہت کم ہے۔ زیادہ تر دودھ سے گھی بنایا جاتا ہے جو شہروں میں فروخت کیا جاتا ہے۔

گاؤں میں مویشیوں کی کثرت ہے چنانچہ ۱۰۸ مویشی فی صد افراد اور ۱۷۰ مویشی فی صد ایکڑ آتے ہیں۔ ایک شخص جس کے پاس ۱۲ ایکڑ زمین ہے اس کے پاس ۵۰ مویشی ہیں جن کی صورت حسب ذیل ہے

بیل ۲۰ گائیں ۲۰ بھینس ۴ بھینسے ۴ بچھڑے ۲

ان مویشیوں کے مالک کی یہ حالت تھی کہ نہ تو اس کے پاس قمیص تھی اور نہ چپل، وہ ایک دھوتی باندھے ہوئے تھا اور سر پر ایک پگڑی۔ جس کے اوپر ایک کمبل ڈال رکھا تھا۔ مویشیوں کی اس تعداد میں ناکارہ مویشی بھی شامل ہیں۔ بھیڑ اور بکریوں کا تو خیر یہ ہے کہ ان کی مینگنیوں اور بھیڑ کی اُون سے ہر وقت فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ مگر دوسرے زراعتی اور دودھ دینے والے جانوروں کا یہ حال ہے کہ وہ ایک مدت کے بعد نہ تو کام کر سکتے ہیں اور نہ ان سے دودھ حاصل کیا جا سکتا ہے اور چونکہ گاؤں میں ذبیحہ کا رواج نہیں ہے اس وجہ سے ان کی تعداد کو کم کرنے کا سوائے قدرتی موت کے اور کوئی ذریعہ نہیں۔ مثال کے طور پر ایک معمولی بیل ۵ سال کے بعد ہل چلانے کے قابل نہیں رہتا اور مزید ۴، ۵ سال کے بعد اس سے کوئی دوسرا کام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ مگر ایک بیل کی اوسط عمر ۲۰ سال ہوتی ہے اس حساب سے اس کو ۷، ۸ سال بیکار رہنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس گاؤں میں خود کاشتکاروں کو مشکل سے کھانے کو ملتا ہو، جہاں مویشیوں کے لئے چارہ کی فصلیں نہ اُگائی جاتی ہوں وہاں ان کی خوراک کا مسئلہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مقررہ چارہ کارکردہ اور ناکارہ دونوں قسم کے مویشیوں کو کھلایا جاتا ہے اس سے لازماً کارکرد مویشیوں کی کارکردگی پر بُرا اثر پڑتا ہے کیونکہ ان کی حقیقی خوراک میں ناکارہ مویشی ساجھے دار بن جاتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں کاشت کا انحصار مویشیوں پر ہی ہے۔ اس لئے کاشتکار اس کارکردگی کو بڑھانے یا بالفاظ دیگر اپنا کام پورا کرنے کے لئے مویشیوں کی تعداد بڑھاتا ہے۔ اس گاؤں میں مویشیوں کی

تعداد کو کم کرنا ہرگز ہرگز مفید نہیں۔ بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی کارکردگی بڑھائی جائے جس کا لازمی نتیجہ خود بخود ان کی تعداد کی کمی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ یہاں زرعی کمیشن کا وہ عام اصول کہ "ہم اپنی زراعت کو نقصان پہونچائے بغیر مویشیوں کی تعداد کم کرسکتے ہیں" ہرگز صادق نہیں آتا۔

کارکردگی بڑھانے کی حسب ذیل تدابیر ہوسکتی ہیں۔

(۱) ناکارہ مویشی الگ کردیے جائیں تاکہ چارہ کی مقدار بڑھے اور کارگذار مویشیوں کو بافراط چارہ مل سکے۔

(۲) مویشیوں سے وہ کام لیا جائے جس میں کام کی تکمیل بھی پوری طرح ہو اور ان کو زیادہ محنت بھی نہ کرنا پڑے۔

ہندوستان کے تمام حصوں میں سوائے ممالک متحدہ اور پنجاب کے بعض اضلاع کو چھوڑ کر کنوؤں اور باولیوں سے پانی لینے کا ایک خاص قدیم طریقہ رائج ہے یعنے پانی چرس کے ذریعے کھینچا جاتا ہے اور بیلوں کے آنے کا راستہ ڈھالو ہوتا ہے۔ جب وہ پانی لے کر آتے ہیں تب تو انھیں ڈھال پر اترنا نسبتاً آسان ہوتا ہے مگر وہ پھر چڑھاؤ پر الٹا چڑھنا ان کے لئے سخت ہے۔ مجھے ایک گاؤں میں (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) ایک جدید بات نظر آئی۔ یعنے وہاں دو جوڑ بیلوں سے بیک وقت کام لیتے ہیں۔ اس کنوئیں پر موٹھ تک جانے کے لئے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب بیل پانی کھینچ کر نیچے آجاتے ہیں تو ان کو کھول دیا جاتا ہے اور دوسرے بیلوں کو دوسرے راستے سے سیدھا اوپر لے جاکر پھر موٹھ میں جوت دیتے ہیں۔ اس طریقہ سے بیلوں کو الٹا چڑھنا نہیں پڑتا مگر اس میں وقت زیادہ ضائع ہوتا ہے اور ایک موٹھ پر ایک آدمی کے بجائے دو آدمی کام کرتے ہیں۔ مفید طریقہ یہ ہے کہ بجائے چرس کے Persian Wheel استعمال کیا جائے۔ اس میں بیلوں کو نشیب و فراز پر چلنا نہیں پڑتا بلکہ وہ ایک ہموار زمین پر دائرہ کی شکل میں گھومتے رہتے ہیں۔ اس طریقہ سے ان کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی اور ان کی کارکردگی زیادہ عرصہ تک قائم رہتی ہے۔ ان تمام دیہات میں جہاں دیہی اصلاح کا کام شروع ہوا ہے پانی نکالنے کا یہی طریقہ رائج ہوچکا ہے۔

ضمنی صنعتیں زراعت پیشہ افراد کے پاس آمدنی حاصل کرنے کا سوائے زراعت کے اور کوئی ذریعہ نہیں۔ البتہ بڑھئی، لوہار، چمار، کمہار اپنے کاموں کے علاوہ زراعت بھی کرتے ہیں۔ گاؤں میں ۴ گھروں میں مرغیاں پلی ہوئی ہیں جن کے انڈے سکندرآباد میں فروخت کئے

جاتے ہیں۔ دھنگر بھیڑ اور بکریاں پالتے ہیں۔ ان سے منڈے بٹھا کر کچھ آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ دوسرے بھیڑ کے اون سے کمبل بنائے جاتے ہیں۔ جن کی قیمت عہ سے سے تک ہوتی ہے۔ دیہاتیوں کی زندگی میں یہ کمبل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سرما میں سردی سے بچنے کے لئے برسات میں بارش سے محفوظ رہنے کے لئے، اور گرمیوں میں دھوپ سے محفوظ رہنے کے لئے ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا یہ لحاف، چھتری اور برساتی کا کام دیتے ہیں۔ اور دیہات میں اس صنعت کو فروغ دینے کے کافی امکانات موجود ہیں۔ گاؤں میں ۱۶ جولاہوں کے گھر بھی ہیں جو زراعت کے علاوہ کپڑا بھی بنتے ہیں۔ ان کے کام میں ان کے گھر والے ان کو مدد دیتے ہیں اور ان کا تیار کیا ہوا کپڑا خود مقامی ضرورت اور آس پاس کے دیہات کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اگر ان لوگوں کو تعلیم دے کر موجودہ فیشن کے مطابق ترمیم و تبدیلیاں کرنے کا مشورہ دیا جائے تو دیہات میں یہ صنعت بھی کافی ترقی کر سکتی ہے۔

یہ گاؤں سکندرآباد و حیدرآباد جیسے بڑے شہروں سے بہت قریب ہے۔ یہاں کی زمین بھی عمدہ ہے اور پرانے آم کے درخت بکثرت ہیں۔ اگر کاشتکاروں کو پھل باغ لگانے اور مرغیاں پالنے کا مشورہ دیا جائے اور تھوڑے سے سرمایہ سے ان کی مدد کی جائے تو یہ دونوں چیزیں اس گاؤں میں کافی ترقی کر سکتی ہیں کیونکہ پختہ سڑک کی وجہ سے پھل اور انڈے بہ آسانی شہروں تک لائے جا سکتے ہیں۔

مدرسہ لوکل فنڈ کی جانب سے یہاں ایک مدرسہ قائم ہے جس میں ۴ درجوں کی تعلیم ہوتی ہے آخری درجہ دوم ہے۔ اس مدرسہ میں ۸۵ طالب علم درج رجسٹر ہیں۔ گاؤں میں مدرس عموماً اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے کچھ فرضی طالب علموں کے نام بھی رجسٹر میں لکھ لیتا ہے۔ اور ان کی حاضری بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس گاؤں کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے طالب علم حقیقتاً مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔ جب میں مدرسہ دیکھنے گیا تو وہاں ۳۰، ۳۲ بچوں سے زیادہ نہ تھے یہاں ایک مدرس ہے جس کو ۱۵ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ وہی بچوں کو اردو، حساب، تلنگی، جغرافیہ، اسباق الاشیا، دیہی تنظیم اور حفظان صحت کے اصول پڑھاتا ہے۔ مدرسہ ایک کرایے کی عمارت میں ہے۔ دیواروں پر غالباً خود مدرس کی بنائی ہوئی چند جانوروں کی تصویریں اور دو چار جدولیں لٹک رہی تھیں۔ بیٹھنے کے لئے ٹاٹ کے چند ٹکڑے پڑے تھے۔ اردو اور تلنگی کی وہی کتابیں دیہات میں پڑھائی جاتی ہیں جو شہری مدارس کے نصاب میں داخل ہیں

حالانکہ شہروں اور دیہاتوں کا تعلیمی نصاب ایک نہیں ہونا چاہیئے۔ نصاب ہمیشہ بچے کے ماحول کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس غیر یگانگت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیہاتی بچے ان کو پڑھ کر اپنے ماحول سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور ۲، ۳ سال کسی ادنیٰ مدرسہ میں پڑھنے کے بعد وہ اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے اعلیٰ وارفع تصور کرتے ہیں۔ دیہات سے ان کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے اور وہ شہروں میں آکر زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان کو جو کتابیں بھی پڑھائی جائیں خواہ ان کا مقصد ایک زبان سکھانا ہی کیوں نہ ہو اس میں ایسی باتیں ہوں جن سے کہ ان میں زراعت کا شوق پیدا ہو، نئی نئی صنعتیں قائم کرنے کا خیال ہو، قدامت پسندی کو ترک کریں، رسومات کا خاتمہ کریں اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اصلاح کی طرف مائل ہوں۔ یہ مدرسہ ۷ سال سے اس گاؤں میں قائم ہے اس کی وجہ سے گاؤں میں ۵، ۶ آدمی نوشت وخواند سے واقف ہوگئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عموماً بہت کمسن بچے یہاں تعلیم کے لئے آتے ہیں اور جوں ہی کہ وہ ذرا بڑے ہوئے اُن کے والدین ان کو کام پر لگا دیتے ہیں اور اس طرح ان کی یہ تعلیم بھی پوری نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے کہ دیہات میں ایک مقررہ عمر تک کے بچوں کے لئے جبری تعلیم کا قانون نافذ کیا جائے۔ مدرسہ میں بچوں کے لیئے ڈرل اور دیسی کھیلوں کا انتظام ہے۔ مدرسہ میں بچوں کو صاف ستھرا رہنے کی تعلیم بیشک دی جاتی ہے مگر میں نے سوائے چند لڑکوں کے باقی تمام کو میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا۔ یہ قصور ان معصوم بچوں کا نہیں ہے بلکہ اس کے وجوہ ان کے والدین کا افلاس، نادانی اور کاہلی ہے۔

دیہی انتظام اس گاؤں میں حسب ذیل سرکاری عہدے دار اور ملازم ہیں۔

(۱) پٹواری۔ گاؤں کا مطلق العنان حاکم۔ جس کے خلاف چوں کرنے کی گاؤں والوں کو مجال نہیں ہوتی۔ ان علاقوں میں جہاں زمینداری طریقہ رائج ہو وہاں اس کی شان اور بڑھ جاتی ہے۔ اس گاؤں میں چونکہ رعیت داری طریقہ ہے۔ دوسرے یہاں مالی پٹیل پٹواری کی مدد کے لیئے رہتا ہے اس وجہ سے اس کا وہ زور نہیں پٹواری کو تنخواہ نہیں ملتی بلکہ اس کو فی صدی ملتی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ہزار سے حکومت ۱۰ فی صدی دوسرے سے ۵ فی صدی اور تیسرے سے ۳ فی صدی خود نہیں لیتی بلکہ پٹواری کو دیتی ہے۔ اس میں پٹواری، پولیس پٹیل اور مالی پٹیل شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ نصف تو پٹواری خود رکھتا ہے اور نصف ان دونوں کو دیتا ہے

تقسیم ہوتاہے۔ گویا اس طرح پٹواری کو پہلے ہزار پر ۵ فی صد، دوسرے پر ۲½ فی صد اور تیسرے پر ۱½ فی صد رقم ملتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۳۵ف میں اس گاؤں کے پٹواری کو ۹۴ روپے ۱۰ آنے ملے گویا اس کو ۷ روپے ۱۴ آنے ماہوار تنخواہ ملی۔ ظاہر ہے کہ اس قلیل تنخواہ میں وہ کیا کر سکتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دھوکہ اور فریب سے کام لیتا ہے اور اپنی آمدنی بڑھاتا ہے اور حکومت کی آمدنی کو نقصان پہونچاتا ہے۔

(۲) پولیس پٹیل۔ اس کے سپرد پولیس کا انتظام ہوتا ہے۔ گاؤں میں ایک پولیس کا ناکہ ہے جس کا ذمہ دار یہی ہے۔

(۳) مالی پٹیل۔ یہ پٹواری کے ساتھ مل کر مالگذاری وصول کرتا ہے۔

یہ سب عہدے موروثی ہوتے ہیں اور باپ کے بعد بیٹے کو ملتے ہیں۔ اکثر دیہات میں پٹواری کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ (۱) اصل دار یا وطن دار۔ یہ وہ شخص ہوتا ہے جس کو پٹواری کا عہدہ وراثت میں ملتا ہے۔ بعض وقت اپنی مصروفیات کی وجہ سے یہ اپنا عہدہ کسی دوسرے کو دے دیتا ہے اور اس کو گماشتہ کہا جاتا ہے۔ اب گماشتہ پٹواری کے تمام فرائض انجام دیتا ہے۔ مگر اس معاوضہ میں کہ وطن دار نے اس کو اپنی جگہ دی، وہ وطن دار کو اپنی آمدنی کا ½ حصہ دیتا ہے۔

(۴) مذکوری۔ اس کو گاؤں کا سپاہی کہنا موزوں ہے۔ اس کے کام سرکاری مالگذاری وصول کرنے میں مدد دینا، سرکاری عہدہ داروں کی سربراہی، تحصیل اور تھانہ میں کسی بات کی اطلاع، گشت لگانا، چوری کا سراغ لگانا وغیرہ ہیں۔ اس کو تین روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے یا اس رقم کی زمین معافی میں دے دی جاتی ہے۔ اکثر اوقات پٹواری اپنی شرارت سے اس کو بنجر اور بیکار زمین دے دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کو بڑی پریشانی اُٹھانا پڑتی ہے۔ اس گاؤں میں ۶ مذکوری ہیں۔

(۵) نیرڑی۔ اس کا کام تالاب کھودنا ہے۔ تالاب سرکاری ملکیت میں داخل ہیں۔ اور چونکہ ہر سال ان میں مٹی وغیرہ بھر جاتی ہے اس لئے مٹی کھودنا اور کٹھ کی مرمت ہونا لازمی ہے۔ اس وجہ سے اس کو مستقل طور پر ملازم رکھا جاتا ہے اس کو بھی تین روپیہ ماہانہ یا اس رقم کی زمین دی جاتی ہے۔

(۶) ڈھنڈورچی۔ اس کا کام ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ گاؤں میں سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ خبروں کو مشتہر کرنے کا ہے ہی نہیں۔ اس کی تنخواہ بھی تین روپیہ ماہانہ ہوتی ہے۔

پہلے گاؤں میں نسکہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور مالی پٹیل کا کام یہی کیا کرتا تھا۔ مگر اب

حکومت نے یہ عہدہ ختم کر دیا ہے۔ چونکہ اب ان کے سپرد کوئی کام نہیں ہے اور ان کا اچھا خاصہ اثر اب تک گاؤں میں موجود ہے اس وجہ سے اب وہ لوگوں کو بھڑکا کر فتنہ و فساد کرتا رہتا ہے۔ جس کسی گاؤں میں کوئی دنگا فساد ہوا گر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں دیسکھ کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔

چند عام باتیں گاؤں میں جہالت عام ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ان کے گرد و پیش کے حالات کیا ہیں۔ غالباً گاؤں میں کوئی کاشتکار ایسا نہیں جو اپنی زمین ایکڑ کے حساب سے آپ کو ٹھیک ٹھیک بتل سکے۔ بعض کاشتکار ایسے ہیں جن کو یہ بھی خبر نہیں کہ ان کی سالانہ مالگذاری کیا ہے کیونکہ ان کی طرف سے مالگذاری ان کا مہاجن ادا کر دیتا ہے۔ اگر ان سے دریافت کیا جائے کہ تم کتنی مالگذاری ادا کرتے ہو تو وہ یہی جواب دیں گے کہ " ہمارے ساہوکار سے پوچھو"۔ یہ بات صرف اسی موضع کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ مجھے دوسرے مواضعات میں بھی اس کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اس امر کی تصدیق ان سرکاری امثلہ سے بھی ہو سکتی ہے جن میں ضرورت کے وقت کاشتکاروں کے بیانات قلمبند کیے گئے ہیں۔ گاؤں میں ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ ایک کھیت کی مالگذاری ۶۰ روپیہ ہے مگر پٹواری ۷۰ روپیہ وصول کرتا ہے اور رسید صرف ۵۰ روپیہ کی ہی دیتا ہے۔

گاؤں والوں کی عام غذا مکا کا دلیا، رائی اور مکا کی روٹی ہے۔ چاول کھٹے سالن اور ترکاری کے ساتھ کھاتے ہیں۔ گاؤں میں ایک سیندھی خانہ ہے جہاں روزانہ اوسطاً ۵ سیر سیندھی فروخت ہوتی ہے اس کا بھاؤ ۸ آنہ فی سیر ہے۔ گویا اس طرح ایک سال میں ۹۱۲ روپیہ سیندھی پر صرف ہوتے ہیں۔ سیندھی پیسوں اور غلہ دونوں سے خریدی جاتی ہے۔ بعض دھیڑ جو عموماً ۴ گنڈے روزانہ اجرت پاتے ہیں ۲ گنڈے روزانہ کی سیندھی پی لیتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کو سال کے بعض دنوں میں دونوں وقت اور بعض میں ایک وقت کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔

شادی بیاہ میں حسب حیثیت خرچ کیا جاتا ہے لڑکے کی شادی میں ۲۰۰ سے ۲ ہزار تک اور لڑکی کی شادی میں ۴۰۰ سے ۴ ہزار تک رقم صرف ہوتی ہے۔ گاؤں میں ایسے افراد موجود ہیں جو یہ انتہائی رقوم اپنی اولاد کی شادیوں میں صرف کر چکے ہیں۔ موت کے موقعہ پر ۶۰، ۷۰ روپیہ خرچ ہوتے ہیں۔ غالباً بعض حضرات ۶۰، ۷۰ یا ۲۰۰، ۳۰۰ کو معمولی رقم تصور کریں۔ مگر یہ

ہمارے آپ کے نقطۂ نگاہ سے معمولی رقمیں ہوں لیکن ان لوگوں کے لئے جن کی سالانہ آمدنی ۵۰، ۶۰ روپیہ ہو ان کے لئے ان کی قدر بہت زیادہ ہے۔

گاؤں میں اجرت نقد پیسوں میں بہت کم ادا کی جاتی ہے۔ حجام، دھوبی، بڑھئی، لوہار، چمار اور کمہار کو ان کے کاموں کے معاوضہ میں فصل پر غلہ دیا جاتا ہے۔ زرعی مزدور بگمیلے ہیں ان کو اجرت نہیں دی جاتی بلکہ ان کو ۵۰ روپیہ قرض دیے جاتے ہیں اور پھر ۴ روپیہ ماہوار قسط سے یہ رقم ادا کرتے ہیں۔ تاوقتیکہ یہ رقم ادا نہ ہو اس وقت اُن کو قرض دہندہ کے یہاں کام کرنا پڑتا ہے۔ مہینہ میں ان کو ۴۸ سیر جوار کھانے کو ملتی ہے۔ بعض جگہ پکا ہوا دلیا کھانے کو دیا جاتا ہے۔ یہ دلیا ان لوگوں کے لئے خاص طور پر الگ پکایا جاتا ہے۔ اور کاشتکاروں کی اپنی غذا سے جو خود معمولی ہوتی ہے اور بھی معمولی ہوتا ہے۔ ایک دن کا پکایا ہوا دلیا ۳، ۴ روز تک ان میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بگمیلا دوران محنت میں چھٹی نہیں لے سکتا۔ اگر وہ چھٹی لے یا کسی اور وجہ سے کچھ دن کام نہ کرسکے تو اس کو اپنی مدت معینہ ختم ہونے کے بعد ان ایام کی مجرائی کرنا پڑتی ہے اس گاؤں میں ۵۰ اب بگمیلے ہیں۔ جو اسی طرح کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صریح غلامی ہے چنانچہ حال ہی میں حکومت نے قانون کی رو سے اس کی ممانعت کردی ہے اور اب کسی شخص کو اس قسم کے معاہدہ کا حق نہیں رہا۔ اور حکومت نے ایک سال کی مدت مقرر کردی ہے اس کے بعد وہ تمام معاہدے جو اس وقت ہو چکے ہیں منسوخ ہو جائیں گے۔

یہاں کے لوگوں کی صحت زیادہ اچھی نہیں۔ یہ لوگ طاقتور، جاندار اور سکت والے نہیں۔ سال کے زیادہ حصے میں گاؤں میں ملیریا پھیلا رہتا ہے۔ ہیضہ، پلیگ بھی چند سال میں آکر اپنا زور دکھا جاتے ہیں۔ چیچک تو عام بیماری ہے اور لوگ اس کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کو زیادہ اہمیت ہی نہیں دیتے۔ نہ گاؤں میں کوئی سرکاری یا حنائگی دواخانہ ہے۔ البتہ ایک وید ضرورت جو جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا ہے۔ سرکاری دواخانہ یہاں ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے گاؤں میں کوئی ٹرینڈ دایہ نہیں ہے۔ زچگی کے وقت دھیڑوں کی عورتیں کچھ مدد دیتی ہیں۔ زچگی کے وقت عورت کو نجس اور ناپاک سمجھ لیا جاتا ہے [illegible] اعلےٰ ذاتوں کی عورتوں کا رجحان دایہ گری کی طرف ہے بھی نہیں۔

اول تو گاؤں میں لوگوں کے پاس سرمایہ جو [illegible] کے پاس تھوڑا بہت موجود ہے وہ بیکار رہتا ہے کیونکہ سرمایہ کو مشغول کرنے کے ذرائع مفقود ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ خرچ

ہوجاتا ہے یا بیکار اور فضول رسومات میں اُٹھ جاتا ہے۔ اگر دیہات میں کوئی ایسا ادارہ قائم ہوجائے
جو لوگوں کے زائد سرمایہ کو کسی مفید کاروبار میں لگائے تو بہت اچھا ہے اس طرح ایک بیکار شدہ
سرمایہ کام میں لگ جائے گا دوسرے جب ترغیب ہوگی تو کچھ ایسی مقدار مزید جمع ہوسکے گی جو
اس وقت جمع نہیں ہورہی ہے۔

گاؤں میں کوئی پنچائت نہیں ہے۔ جب سے دیہی پنچایتوں کا طریقہ اُٹھ گیا ہے مل جل کر
غور و فکر کرنے کا شوق، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، اور ایک دوسرے کی مدد کرنا بہت
کم ہوگیا ہے۔ انفرادیت اور موجودہ اقتصادی حالات نے دیہاتیوں کو خود غرض بنا دیا ہے۔
مواضعات میں ایسی ہستیاں بہت کم رہ گئی ہیں جن میں چھوٹے اور معمولی کسانوں اور دستکاروں)
کی اصلاح و ہمدردی کا سچا درد ہو۔ کاشتکاروں میں باہم مل جل کر کام کرنے کا مادہ بالکل نہیں!
ہر شخص اپنی حالت میں مگن ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیہات سے سماجی زندگی
بالکل مفقود ہوچکی ہے۔

ایک زرعی گاؤں کے حالات کا ایک مختصر سا خاکہ میں نے آپ کے سامنے پیش کردیا۔ مجھے
اس کا اعتراف ہے کہ میں ان سب چیزوں کے بیان کرنے کے بعد بھی دیہات کی سچی اور حقیقی
تصویر آپ کے سامنے پیش نہیں کرسکا اور بہت سے تلخ واقعات نظر عام پر نہ آسکے۔ وجہ اس کی
یہ ہے کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا اندازہ گاؤں کے چند روزہ قیام میں ہرگز نہیں ہوسکتا
میں نے جہاں جس بات کا ذکر کیا ہے وہیں اس کی برائیوں پر روشنی ڈالی ہے اور اصلاح
کے طریقے بتلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دیہات میں بہ حیثیت مجموعی اصلاح کی ضرورت ہے۔
بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ خیال فرمائیں کہ اب ان کی
اصلاح ناممکن ہے تو میں ان کی رائے سے اتفاق نہ کروں گا۔ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں
ہے لیکن کوشش شرط ہے حالات اتنے مایوس کن نہیں ہیں جتنے سمجھ لئے گئے ہیں۔ اب اس
بات کی سخت ضرورت ہے کہ دیہاتی زندگی میں انقلاب پیدا کیا جائے انقلاب سے میرا مطلب
Revolution نہیں ہے بلکہ Change ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان کی زندگی میں
اس طرح کا یا پلٹ کردی جائے کہ انھیں یہ محسوس ہونے لگے کہ انھوں نے دوبارہ جنم لیا ہے
اور وہ ایک نئی دنیا میں زندگی بسر کررہے ہیں۔

ہر بات کو قانون کے ذریعے سے منوانا صحیح اور عمدہ طریقہ نہیں ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ خود

لوگوں میں اس کا احساس پیدا کرا دیا جائے کہ کیا چیز بری ہے اور اس کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ دیہات میں جبر و تشدد سے اصلاحی پروگرام اتنا زیادہ کامیاب اور دیرپا ثابت نہیں ہو سکتا جتنا کہ نرمی و آشتی سے اگر ہمارے متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ آزاد اور روشن خیال، عملی زندگی کے نشیب و فراز سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے نوجوان زراعت کی جانب اپنی توجہ مبذول کر لیں تو اصلاح بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اگر یہ لوگ مرکزی دیہات کو اپنا مستقر بنا لیں اور وہیں رہ کر زراعت شروع کر دیں خواہ وہ چھوٹے پیمانہ پر ہی کیوں نہ ہو۔ خود نمونہ بنیں اور دوسروں سے اس کی تقلید کرائیں۔ اس طرح ہر شعبہ میں تعمیری اور تدریجی اصلاحی کام ہو سکتا ہے۔ گویا اپنی زندگی وقف کر کے دوسروں کی زندگی کو بنایا جا سکتا ہے اور یہ ایک ناقابل فراموش قربانی ہے۔ میں ان اصحاب سے جن کے دل میں خدمت کا شوق ہمدردی کا مادہ، قوم کا درد موجود ہے اپیل کرتا ہوں کہ ملک کی اس سے زیادہ صحیح اور حقیقی خدمت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ دیہاتیوں کو انسان بنایا جائے اور ان کی معاشرت، تمدن اور کاروبار میں اصلاح کی ممکنہ کوشش کی جائے۔

بعدالت اسپشل جج درجہ اول آگرہ نمبر ۴۸ سنہ ۱۹۳۶ء

سید عنایت علی وغیرہ سائلان

فارم اطلاع نامہ حسب دفعہ ۱۱ - ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

ہرگاہ عنایت علی ولد واحد علی وعبدالجلیل ولد عبدالحمید و سید ابوالقاسم ولد سید القاسم ولد سید محی الدین
و مساۃ سعیدہ بیگم دختر عبدالغنی و محمد شفیع و محمد مسلم پسران عبدالرزاق و یوسف علی و یعقوب علی و یونس علی
پسران یعقوب علی و عاشق علی ولد کرامت علی وغیرہ وغیرہ ساکن بھرکول پرگنہ کرادلی ضلع آگرہ
کی جانب سے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے۔ (پیش ہوئی)
لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ضمنی ۱ دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکور اطلاع دی جاتی ہے کہ اس جائداد
کو جس کی تفصیل ضمیمہ ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندے حسب نقشہ یا حقداران نے حسب
دفعہ سائلان مذکور کی جائداد بتایا ہے۔

اگر کوئی شخص جائداد مذکور پر کوئی دعوے رکھتا ہو تو سے جو اس اشتہار کے گزٹ
ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اس حاکم کے روبرو
اپنی عرضی پیش کرے جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں اور تاریخ پیشی مقدمہ یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء مقرر ہے۔

ضمیمہ (الف)

قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلق اراضی

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱	آگرہ	معافی زمینداری	موضع تاجپور پرگنہ کرادلی ضلع آگرہ	قبضہ ۱ تھوک ۲ ½ بسوہ؛ قبضہ ۲ تھوک ۱۰ ½ بسوہ؛ قبضہ ۳ شاملات	۱ بیگہ ۲ بسوہ؛ ۱ بیگہ ۱۷ بسوہ؛ ۱ بیگہ ۱۸ بسوہ	ابواب ۱ سیر
۲	″	″	موضع بھرکول	معافی بست بسوہ پٹی سرکار قبضہ ۲۰	۱ بیگہ ۵ بسوہ؛ ۱ بیگہ (۶ بسوہ ۷ بسوانسی)	ابواب ۱ سیر

ضمیمہ (ب)

قرضدار کی جائداد جو بہ استثنائے حقوق مالکانہ متعلق اراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہو سکتی ہے۔

نمبر	نوعیت جائداد	وسعت حقیت درخواست دہندہ
۱	۲	۳
۱	مکانات زمینداری خام و آلات کشاورزی مویشی	آمدنی موضع تاجپور معافی ا عسارے سالانہ
۲	" " " "	آمدنی موضع بھڑکول معافی الدلعہ سالانہ بہ قبضہ مرتہن

دستخط انگریزی منصرم — اسپشل جج درجہ اول ضلع آگرہ